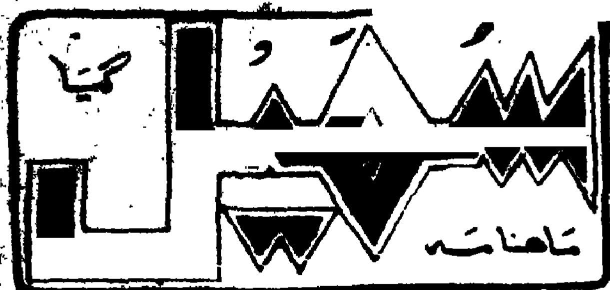
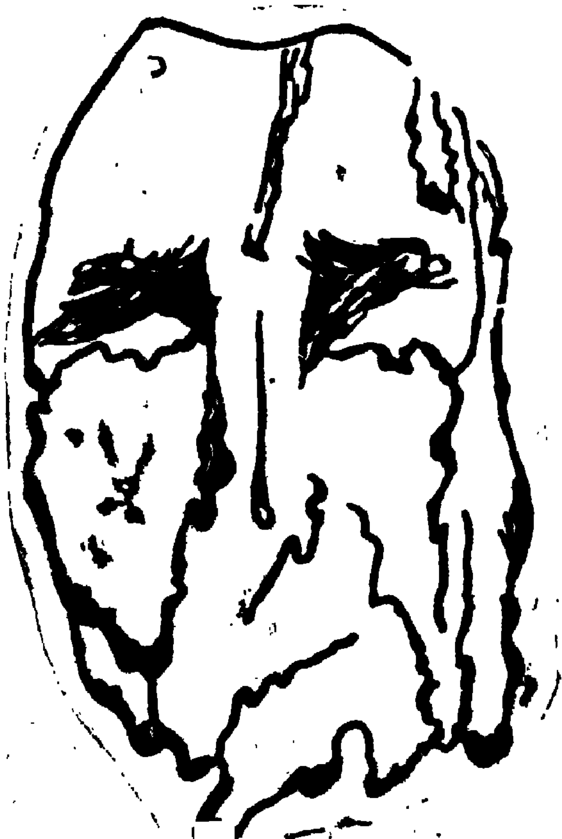

ماهنامه





ماہنامہ سہیل

مجلس مشاورت

- شمارہ ۱۲
- جلد ۵۶
- بدل اشتراک
- فی شمارہ ۔۔۔ روپے
- زر سالانہ ۔۔۔ روپے
- ۔۔۔ ۱۰۰ روپے

فہرست

▲ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سہیل
... ایڈیز ... گیا
فون ۔ ۲۱۵۲۳

بہار میں سماجی انصاف اور خواتین کی ترقی

- سماجی انصاف کے پیش نظر ریزرویشن کی حد کو آگے بڑھا کر مختلف شعبوں میں پھیلایا گیا۔
- سر پر غلاظت ڈھونے کے رواج کو قانوناً جرم قرار دیا گیا۔
- ایک لاکھ تراسی ہزار کمائے بیت الخلاء کو سلبھ بیت الخلاء میں بدلا گیا ہے
- بیک ورڈ کی ترقی کے لئے بیک ورڈ وکاس نگم کا قیام
- صوبائی بجٹ کا ساٹھ فی صد سماج کے کمزور طبقوں کے لئے ترقی اور فلاح پر خرچ کیا جائے گا۔

خواتین کی ترقی

- سماج میں خواتین کو باوقار زندگی کی سطح دینے کے لئے مختلف ترکیب کئے گئے ہیں
- مہیلا وکاس نگم کا قیام
- چار خواتین پولیٹکنک قائم کرنے کے لئے کاروائی شروع
- حاملہ خواتین کو دیئے جانے والے مالی امداد سے تمام طبقوں کی خواتین کو فائدہ
- خاندانی اختلافات کو سلجھانے کے لئے تجربہ کے طور پر ایک خاندانی کورٹ بنانے کا فیصلہ
- ہر تھانہ میں ایک خاتون داروغہ کی بحالی (جس میں تک بیک 60% ارعو جاننے والی عورتیں بحال ہوں گی) سلسلہ وار کرنے پر غور کیا جا رہا ہے جس سے خواتین کا اچھی طرح حفاظت ہو سکے۔
- مکان، زمین یا سرکار کی جانب سے کوئی جائداد، اگر کسی مرد کو بندوبست کی جائے گی، تو اس کی بیوی کا نام بھی ایک مالک کی شکل میں پرچہ میں درج کیا جائے گا۔

جاری کردہ

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ بہار

نمود

فن کاری، ایک انفرادی عمل

فن اور فنکار کے رشتوں کے سلسلے میں کئی نظریات سامنے آئے ہیں، کہیں اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ فن فنکار کی داخلی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ فن کار کی اندرونی شخصیت اس کے فن پارے سے جھلکتی رہتی ہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ فن پارہ فن کار کی شخصیت کا تکملہ ہے۔ اس کے خوابوں کی تفسیر ہے فن کار کی شخصیت میں جو کمی ہے اس کی تکمیل اس کے فن پارے کے ذریعہ ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فن پارہ دراصل فن کار کو اس نفسی پیچیدگی سے بچاتا ہے جس کے نتیجہ میں فن کار احساس کمتری کا شکار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ تصور بھی پیش کیا جاتا ہے کہ فن پارے کے ذریعہ فن کار کی شخصیت میں SUBLIMISION پیدا ہوتا ہے۔ تہذیب کے اس عمل میں فن کار اخلاقی قدروں سے قریب ہوتا ہے اور خوب و زشت کا ایک معیار بناتا ہے۔

فن کی ماہیت، اصلیت اور فن کار سے اس کے رابطے کی نوعیت کے بارے میں متعدد خیالات سامنے آتے رہتے ہیں۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ کسی تصور پر کچھ دیر تک غور کر لے جائیں تو اندازہ ہوگا کہ ان سارے تصورں میں فن کار اکیلا نہیں رہتا ہے اس کے ساتھ اس کا معاشرہ اس کا عہد اور اس کے پیچھے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی حالات و عوامل بھی فن کے آئینے میں جلوہ ریز ہوتے ہیں۔ دراصل فنکار کی اکیلی شخصیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح کسی شے کو ہم اس کے پس منظر کو علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتے اسی طرح فن کار کو بھی ہم اسی وقت تک فن میں دیکھ سکتے ہیں جب تک اس کے عوامل کو بھی پس منظر میں پیش کر سکیں۔ لہٰذا یہ کہ بات بیہودہ لگتی ہے کہ فن کار اپنے پورے معاشرے کے ساتھ فن میں منعکس ہوتا ہے اور لہٰذا فن کو انفرادی شخصیت کی میراث سمجھنے والوں پر یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے کہ فرد یا فن کار ایک ذریعہ اظہار ہوتا ہے جو کچھ شیشۂ ہنر میں آتا ہے ہمارا معاشرہ تھا [illegible] کے اور گرد پھیلے ہوئے خارجی حالات ہوتے ہیں۔

مسعود منظر

علی حماد عباسی
اعظم گڑھ

خلیل الرحمٰن اعظمی — سکّے کا اصلی رُخ

ماہنامہ سہیل (گیا) ۹، جلد ۵۵ میں جناب احتشام الدین (دربھنگہ) کا ایک مقالہ بہ عنوان "خلیل الرحمٰن اعظمی — سکّے کا دوسرا رخ" شائع ہوا ہے۔ اس مقالے میں جناب احتشام الدین نے جو تفہیمات قائم کی ہیں ان کی وجہ سے مقالے میں بہت سی بے بنیاد باتیں در آئی ہیں جن کی صراحت ضروری ہے۔ مقالے کا پورا ڈھانچہ خلیل کی ایک ابتدائی نظم "آئینہ خانے میں" کے بعض الفاظ پر کھڑا کیا گیا ہے۔ اگر اس سے جناب احتشام الدین کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ خلیل نے عنفوان شباب کے جذباتی ہیجان کے زیر اثر لکھا ان کو وہیں رک جانا چاہئے تھا اور فکر و تامل کی اگلی منزلیں طے کرنے سے گریز کرنا چاہئے تھا اور یہ کہ ادراک و شعور، افکار و نظریات کی جس ڈور میں وہ ایک بار بندھ گئے اس حبل متین کو انھیں چھوڑنا نہیں چاہئے تھا۔ یہ بات صریحاً طور پر نہ صرف نظریۂ ارتقا کی نفی ہے بلکہ تنقیدی اخلاقیات کے منافی ہے۔ طباع، ذہین اور باشعور فن کار کوئی تیلی کا بیل نہیں ہوتا جو ہمیشہ کولہو کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ آنکھوں پر بندھی پٹی (BLINKERS) اس کو اپنے ارد گرد دیکھنے سے محروم رکھتی ہے اور ایک ہی ڈگر پہ چلتے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ فن کار تو اپنی کھلی آنکھوں سے اپنے چاروں طرف دیکھتا ہے، اپنے ماحول کا مطالعہ و مشاہدہ کرتا ہے۔ اس سے متاثر ہوتا ہے، ہر آن بدلتی دنیا کے حالات و افکار کو اپنے فکر و محسوسات کے دامن میں سمیٹتا ہے تب کہیں جا کر کچھ کہنے کی نوبت آتی ہے۔ شعور میں تغیر و تبدل عین فطرت ہے۔

اور ویسے بھی اردو میں تو شعوری اور ذہنی تبدیلی کی پوری روایت موجود ہے۔ اس ذہنی تبدیلی کی وجہ سے مولانا حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" لکھا

تھا۔ "مقدمہ" سے پہلے اور بعد کی شاعری میں زمین و
آسمان کا فرق ہے اس کا مطلب تو یہ نہیں ہوا کہ "مقدمہ"
سے پہلے کی شاعری کو ہم حالی کا اصلی کارنامہ گردانیں اور
"مسدس" کو نذر انداز کردیں۔ صاحب "محشر خیال"
سجاد انصاری کو "مقدمہ" سے پہلے کی شاعری پسند تھی۔
لیکن وہ مجموعی طور پر حالی کی عظمت کے قائل تھے۔

آج کے دور میں ذہنی تبدیلی (بلکہ تبدیلیوں) کی
ایک اچھی مثال محمد حسن عسکری ہیں۔ وہ کہاں سے
چلے تھے اور کہاں پہنچے۔ اگر موت کے ہاتھوں نے
ان کو ہم سے چھین نہ لیا ہوتا تو منزل راہ تمنا میں وہ
نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے۔ اس کا اندازہ
صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو محمد حسن عسکری
کے ذہنی سفر سے بہ خوبی واقف ہیں۔ ذہنی رویے میں
تبدیلی کو تضاد نہیں ذہنی ارتقا کہا جاتا ہے۔ ارتقا
کی طرح تضاد بھی ایک نامیاتی عمل ہے۔ تضاد تو
ہر بڑے فنکار کا مقدر ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں
شیکسپیر سے لے کر اسپنڈر (SPENDER) تک
ذہنی و فکری تضاد کا شکار ہونے سے نہ بچ سکے۔ اس
سے ان کے ادبی سرمایے میں بوقلمونی اور نیرنگ نظر پیدا
ہوا۔ یہ تضاد سماج کے اندرونی تضاد کا پرتو ہوتا
ہے اور یہی تضادات سے متحارب ہو کر ایک تیسری شکل
میں فن کار کے جذباتی جواب کا عکس بنتا ہے

جناب احتشام الدین نے خلیل کے ذہنی و
فکری تبدیلیوں کو "سراسر مصلحت کوشی پر مبنی بتایا
ہے۔ اور یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی کہ :-

" انہوں نے ترقی پسندی سے انحراف ایک بنے
بنائے منصوبے کے تحت کیا۔ کیونکہ اس تحریک سے
وابستہ کمیونسٹ پارٹی میں رہتے ہوئے (اس وقت)
کسی طرح کے مراعات حکومت سے حاصل نہیں کی جاسکتی
تھی اور نہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے۔ حکومت نے
کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دیدیا تھا اور رشید
احمد صدیقی کی جمالیاتی حس ترقی پسندی سے میل نہیں کھاتی
تھی۔"

اس اقتباس کے سرسری جائزے سے تین باتیں
صاف طور سے ذہن میں آتی ہیں۔ (۱) خلیل کا ترقی پسندی
سے انحراف کرنے کا سبب مصلحت کوشی تھا۔ (۲)
انحراف ایک بنے بنائے منصوبے کے تحت تھا اور (۳)
خلیل کمیونسٹ پارٹی میں رہتے ہوئے حکومت اور
یونیورسٹی سے کوئی مراعات نہیں پاسکتے تھے۔ لیکن
میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر اور خلیل کو بچپن
سے بہت ہی قریب سے جاننے کی وجہ سے پورے
وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ تینوں باتیں سراسر غلط،
بے بنیاد اور معروضی طور پر ناقابل تصدیق ہیں۔

سب سے پہلی بات کہ خلیل کا ترقی پسندوں
میں شامل ہونا اور پھر اس سے منحرف ہونا مصلحت
کوشی کی بنا پر تھا، حقائق سے عدم واقفیت سے پیدا
ہونے والی غلط فہمی پر موقوف ہے جس کا ازالہ ضروری
ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خلیل اپنے طور پر، گروہ
پسند نہیں تھے۔ وہ صرف یار پسند تھے۔ ان کی اس
یار پسندی بہ معنی دوست نوازی کا ذکر میں اپنے مضمون
" خلیل الرحمن اعظمی — کچھ یادیں، کچھ آنسو" میں

---

۵ مطبوعہ "شاعر" بمبئی خلیل الرحمن اعظمی نمبر ۱۹۸۰ء

تفصیل سے کر چکا ہوں۔ ان ساری باتوں کو دہرانا
مناسب نہیں ہے پھر بھی اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں:
"اسی دوست نوازی کا شاخسانہ ان کی ترقی
پسندی اور اس کے بعد کی جدیدیت پسندی بھی ہے۔
وہ ترقی پسند اسی بنا پر ہوئے کہ ان کے اس زمانے
کے سارے دوست مثلاً باقر مہدی، جاوید کمال،
مغنی رضوی، انجم اعظمی وغیرہ ترقی پسند تھے۔ ایک
طرف تو ترقی پسندوں کی انتہا پسندی سے اندر اندر
کڑھتے تھے لیکن ترقی پسندوں کے دفاع میں جیل یاترا
بھی کر آئے اور ہیرو بن گئے"[2]

"یہاں خاص طور سے میں باقر مہدی کا ذکر کرنا چاہتا
ہوں۔ باقر مہدی اس زمانے میں بہ قول فراق گورکھپوری
جل جلاتے ہوئے کمیونسٹ تھے اور اسٹالن ٹائپ بڑے
کالروں والا اوور کوٹ پہننے کی وجہ سے ہم لوگ انہیں
روسی کمیونسٹ کہتے تھے۔ لیکن وہ صرف نظریاتی طور
پر کمیونسٹ تھے۔ پارٹی ممبر کبھی نہیں بنے۔ وہ جس
شدت سے کوئی بات کہتے خلیل اسی شدت سے باقر
مہدی کی حمایت کرتے۔ ان کی اسی یار پسندی سے چڑ کر
ایک بار جاوید کمال نے خلیل سے کہا تھا کہ یار مولانا! تم
آدمی ہو کہ سفید چادر کہ جس نے جو رنگ اس پر ڈال دیا
تم اسی رنگ میں رنگ گئے۔ ان کی یار پسندی کے کئی مرحلے
تھے۔ وہ جس دوست سے ایک بار کھنچ جاتے اس
کی طرف دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھتے تھے۔ پہلے باقر مہدی
پھر انجم اعظمی، پھر محمد حنیف خاں ناشاد اور اپنے
آپ کو ہمیشہ ان ہی سانچوں میں ڈھالتے رہے جو

[2] مظہر امام "شاعر" بمبئی خلیل الرحمن اعظمی نمبر ۱۹۸۰ء

ان کے دوستوں [illegible]
[illegible]
نہیں تھے یا خلیل نے انہیں از راہ حماقت [illegible] بنا دیا
تھا۔ پھر وہ کہاں غائب ہو گئے؟ مجھے کچھ نہیں معلوم۔
لیکن خلیل نے ان کے ساتھ وہی کچھ کیا جس کو انگریزی
زبان میں PAINTING THE TOWN RED کہتے
ہیں۔ ناشاد کے ساتھ وہ کوئے ملامت کی سیر کو گئے کہ
شاید اس طرح کچھ "عشق رسوا" کی پذیرائی ہو جائے
لیکن حسن کی بزم عام (خاص تو ہرگز نہیں) میں جا کر وہ
صید زبوں ہو گئے۔ اس کا احساس خود خلیل کو بھی تھا۔
"نیا عہد نامہ" کے پیش لفظ میں خلیل نے اپنے رسوا
سر بازار ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ خلیل ترقی پسندی
کی منزل سے آگے بڑھے تو جدیدیت والے ان کو
لے اڑے۔ اس کے ذمہ دار ان کے نئے دوست تھے۔
لیکن جلدی ہی انہیں یہ احساس ہو گیا کہ جدیدیت کی
تحریک یا رجحان زیادہ دن چلنے والا نہیں۔ مظہر امام کے
نام اپنے ایک مکتوب میں انہوں نے اپنے اندیشوں کو
اس طرح بیان کیا ہے۔

"افسوس کہ مجموعہ اس وقت شائع ہوا
جب ۱۹۶۰ء والی جدیدیت اپنے آخری
نقطے پر پہنچ گئی ہے اور نئی سمتیں ابھی
تک وجود میں نہیں آئی ہے"[1]

خلیل نے جدیدیت کی سانس اکھڑتے دیکھا لیکن اب

[1] "رشتہ گونگے سفر کا" از مظہر امام
"شاعر" بمبئی خلیل الرحمن اعظمی نمبر ۱۹۸۰ء ص ۲۴۹۔
مکتوب مورخہ [illegible] اگست ۷۵ء

ان کی سانسیں اکھڑ چکی تھی۔ کیا کرتے۔ اگر موت کے
ظالم ہاتھوں نے انھیں مہلت دی ہوتی تو پھر وہ
نہ جانے کن دوستوں کے ہاتھ لگتے اور کون سا ذہنی
کروٹ لیتے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خلیل کی ترقی پسندی
مصلحت کوشی نہیں بلکہ دوست نوازی تھی۔ وہ ترقی
پسندی سے منحرف اپنے دوستوں کی وجہ سے ہوئے
تھے۔ وہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں رہے۔ اس
کے برخلاف ان پر تو یہ الزام تھا کہ وہ کمیونسٹوں کو
بہکاتے ہیں۔ ان کے انحراف (DEVIATION)
پیدا کرتے ہیں اور انہیں کنفیوز کرتے ہیں۔ مجھے اسی
بنا پر یعنی خلیل کے حلقۂ احباب میں شامل ہونے کی
وجہ سے پارٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ اور تو اور انجم
اعظمی کو (جو پہلے مشتاق انجم عثمانی تھے اور جماعت
اسلامی کے سرگرم کارکن تھے) جماعت سے الگ
ہونا پڑا۔ ان کا یہ انحراف ان کے لئے کیا کیا مصیبتیں
اپنے ساتھ لایا، کیا کیا بدنامیاں ان کے سر تھوپی گئیں
اس کی ایک معمولی مثال تو یہی ہے کہ جب خلیل اپنے
"یاران نجد" کے ساتھ سڑکوں پر گھومتے پھرتے
نظر آتے تو کمیونسٹ [illegible] کیاں ان کا مذاق اڑاتیں،
طرح طرح کے جملے کستیں اور انھیں منحوسوں کا گروپ کہتیں
شاید اسی سے متاثر ہو کر خلیل نے کہا تھا۔

چاہے اب نجد کا ہر ذرہ مخالف ہو جائے
قیس ہم ہیں تو بہر حال ہیں لیلیٰ کی طرف

ایک [illegible] نے خلیل سے علی گڑھ کی زبان
میں کہا تھا یار تم [illegible] کمیونسٹ [illegible] زبردست کرنے
کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں لیکن سنا ہے کہ تم اور تمہارے
ساتھی کمیونسٹوں کو ٹھیک کرنے میں لگے ہیں۔ یہ بات
میرے ماننے کی ہے۔

اب رہی "بنے بنائے منصوبے" والی بات تو
میں پورے زور دار طریقے سے اس کی تردید کرتے ہوئے
کہنا چاہتا ہوں کہ اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ
نہیں ہے۔ جب خلیل علی گڑھ ضلع جیل میں مقید تھے تو
اس زمانے کے ضلع مجسٹریٹ مسٹر رینا سے میں خود ملا تھا۔
مسٹر رینا نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر اعظمی معافی مانگ لیں
تو انہیں بلا شرط اور باعزت طور پر رہا کیا جا سکتا
ہے۔ جب خلیل نے یہ سنا تو الٹے مجھ پر برس پڑے
اور معافی مانگنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر ان کو
علی گڑھ سے لکھنؤ ضلع جیل میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔
وہاں کمیونسٹ وکیل فضل عباس کاظمی بھی نظر بند
تھے۔ ان ہی کی مدد سے خلیل نے ہائی کورٹ میں رٹ
داخل کی اور رہا ہوئے۔ اگر خلیل ذرا بھی مصلحت
کوش ہوتے تو وہ گرفتاری کے وقت ہی معافی مانگ
کر قید و بند کی مصیبت سے بچ سکتے تھے یا وہ ایسے لوگوں
کے پاس جاتے ہی کیوں جن سے ان کی مصلحت کوشی کو
شہ ملتی۔

اب خلیل کے شعبہ اردو میں لکچرر ہونے کی
بات تو یہ جان لینا ضروری ہے کہ رشید صاحب کی نظر
انتخاب ان پر پہلے ہی سے تھی۔ وہ خلیل کی ذہانت
اور علمی استعداد سے بخوبی آگاہ تھے۔ بی اے کی
طالب علمی کے زمانے میں جب خلیل کے مضامین [illegible]
پر نگار، لکھنؤ میں [illegible] شائع ہوئے تو خود رشید

صاحب نے بہ نظر استحسان خلیل سے کہا کہ میری دلی
خواہش ہے کہ آپ اردو میں ایم اے کریں اور شعبۂ
اردو کی خدمت کریں۔ (کم و بیش یہی بات آل احمد سرور
کے پہلے مجموعۂ کلام "سلسبیل" کے خالق کے لئے کہی جا سکتی ہے
سرور صاحب نے انگریزی میں لکچرار ہونے کے بعد رشید
صاحب کے مشورے سے اردو میں ایم اے کیا تھا اور
شعبۂ اردو سے منسلک ہوئے تھے) خلیل کے لکچرار
ہونے کے بعد جب اردو میں پی ایچ ڈی کرنے کی بات
آئی تو رشید صاحب نے کہا کہ ڈاکٹریٹ کر لینے سے
ان کے ادبی قد کو کوئی اضافہ نہیں ہوگا، لیکن پروموشن
لینے کے لئے اب پی ایچ ڈی کرنا ضروری ہو گیا ہے
(بلا وجہ) اس لئے ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی کر لینا ان ہی
کے مفاد میں ہوگا۔ معاً رشید صاحب نے یہ بھی کہا
تھا کہ ویسے تو بی اے کے طالب علم کی حیثیت سے
جو مقالے انھوں نے آتش پر لکھے تھے تو اگر ان ہی
کو اکٹھا کر کے مقالۂ تحقیق کی صورت میں پیش کر دیں
تو ڈگری انھیں یقیناً مل جائے گی۔ لیکن خود رشید
صاحب نے انھیں کوئی وسیع کام کرنے کی ترغیب
دی۔ تب خلیل نے رشید صاحب کی نگرانی میں
"اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" کے عنوان سے
مقالۂ تحقیق لکھا۔ خلیل ترقی پسندی سے انحراف
کی وجہ سے شعبۂ اردو میں استاد مقرر نہیں ہوئے
بلکہ اپنی قابلیت کے بل بوتے ان کا انتخاب
ہوا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک جوہر قابل تھے اور
صدر شعبہ رشید صاحب ایک جوہر شناس کی حیثیت
سے انہیں شعبے میں لائے تھے۔ عام طور سے دیکھا
گیا ہے کہ لوگ لکچرار ہونے کے بعد ادب و شعر کی
دنیا میں نام پیدا کرنے کے لئے جد و جہد کرتے ہیں۔ خلیل
تو پہلے ہی سے بہ حیثیت شاعر و نقاد شہرت کے
بام عروج پر پہنچ چکے تھے۔

جناب احتشام الدین نے اس بات پر بھی
اعتراض کیا ہے کہ خلیل نے سردار جعفری اور کیفی اعظمی
پر ماضی میں کہی ہوئی باتوں سے انحراف کیوں کیا۔ میرے
خیال میں یہ کوئی قابل گردن زدنی جرم نہیں ہے۔
سردار جعفری اور کیفی کا ادبی زاویۂ نظر بھی اب وہ
نہیں رہا جو پہلے تھا۔ وقت کے ساتھ اب ان کی
شاعری کے تیور بدل گئے ہیں۔ اب وہ براہ راست
اپنی شاعری میں انقلاب زندہ باد کے نعرے نہیں لگاتے۔
اور نہ اب شاعری کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال
کرتے ہیں۔ اب وہ نئے پیرایہ اظہار اور نئی لفظیات
کو اپنانے پر مجبور ہوئے ہیں۔ وقت کے ساتھ شعر و ادب
کے سانچے بدل چکے ہیں۔ حالات بدل چکے ہیں — خود
کمیونسٹ پارٹی کا زاویۂ نظر اب وہ نہیں رہا جو بی۔
ٹی۔ رندیوے کے زمانے میں تھا۔ شاید زاویہ نظر کی اسی
تبدیلی کی بنا پر کئی اہم ترقی پسند اور ٹھیٹ کمیونسٹ
شعرا نے سرکاری خطابات قبول کرنے میں کوئی جھجک
نہیں محسوس کی اور سرکاری عہدوں پر فائز ہونے اور
اسٹیبلشمنٹ "ESTABLISHMENT" کا ایک
انگ ہونے پر ان کا ضمیر انہیں نہ روک سکا۔ کمیونزم
کوئی جامد اور غیر متحرک نظریہ نہیں ہے۔ روس اور مغربی یورپ
میں اشتراکیت کے زوال کے بعد کمیونزم بالکل WIPE OUT
نہیں ہو سکا وہ اب بھی زندہ ہے لیکن ایک بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ۔

عبدالمنان
کلکتہ

شیخ محمد بخش مہجور اور ان کی تصانیف — ایک جائزہ

شیخ محمد بخش مہجور ایک قابل قدر انشاپرداز تھے جن کا زمانہ ۱۹ویں صدی کا تھا۔ ان سے منسوب اردو نثر کی تین تخلیقات ہیں جو لکھنوی تہذیب کے پس منظر کو ظاہر کرتی ہیں ان کا بنیادی مقصد رنگین بیانی اور جادو طرازی تھا۔ چونکہ اس دور میں لکھنوی تہذیب پر تکلف و تصنع کا غلبہ تھا۔ آرائش و زیبائش کو مقدم سمجھا جاتا تھا۔ ایک لخت پرفریب وادی میں غرق آب ہونا اہم شیوہ تھا۔ غم غلط کرنے کے اسباب کثرت سے مہیا تھے۔ منظر فریب ...اری کا سماں آنکھوں میں کھیل رہا تھا۔ مافوق الفطری عناصر کے ...ے شہزادے اور شہزادیوں کی سوگ آرائیاں طے ہوتی تھیں اور سپہر فلک کی مدد سہلیا کرتی تھی۔ تعویذ گنڈوں کی بہتات تھی۔ زندگی کی جہد کا فقدان تھا۔ اس لئے ایسی داستانیں وجود میں آئیں جن پر مذکورہ تمام چیزوں کا اثر تھا اور فکر کی بلندی عود کر نہیں آئی تھی۔

ادب زمانے کی خارجی کوائف سے غذا حاصل کرکے ایک ایسا جلوہ دکھاتا ہے جو نہ صرف ایک خاص دور سے متعلق ہوتا ہے بلکہ ہر عہد میں اس کا مقام بلند ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ایسا فنکار اپنے قلم کا جادو جگائے جس کے ذہن میں انفرادیت کے نقوش جھلکتے ہوں۔ شیخ محمد بخش مہجور کا شمار ایسے فنکاروں کی صف میں ہوتا ہے۔

ان کی تصانیف میں "گلشن نوبہار" کو بڑی اہمیت حاصل ہے جو ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء میں وجود میں آئی۔ عندلیب شادانی اور گیان چند جین نے لکھا ہے کہ ۱۸۴۵ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ گیان چند جین کا خیال ہے کہ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر شہناز انجم کو شیگور لائبریری لکھنؤ میں ایک قلمی نسخہ ملا تھا جس کی تاریخ تصنیف مہجور نے "ہے یہ فرح بخش" میں پیش کی ہے جس سے ۱۲۲۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ ہے یقین سے طبع زاد تخلیق کا گمان ہوتا ہے لیکن دیباچہ کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ پوری داستان کسی سے سن کر لکھی ہے یوں بھی اس دور کی بیشتر داستانیں فارسی سے ترجمے

کی صورت میں وجود میں آئیں لیکن داستان گو نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا اور طبعزاد تخلیق کی سند عطا کی۔

اس داستان میں ملکہ ماہ و پرور اور مہر افروز کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ قصہ کا پلاٹ عام طور پر داستانوی رنگ لئے ہوئے ہے۔ زبان پر رنگین بیانی کا غلبہ ہے۔ اس کا مقصد سبق آموزی نہیں بلکہ رنگین داستان سنانے کا شوق ہے۔ مہجور نے یہ لکھا ہے کہ انشے تو طرز مرصع سے متاثر ہو کر تخلیق کا ہے۔ اس زمانے میں دہلی اور لکھنؤ کی زبان دانی کے درمیان جو فرق تھا اور نتیجہ کے طور پر دونوں دبستانوں کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی تھی اور اہل قلم صف آرا ہو گئے تھے اس کی ایک کڑی ہے۔ "نو طرز مرصع" سے متاثر ہونے کا ذکر یوں ہے۔ " ایک قصہ غم اندوز شہزادہ مہر افروز اور ملکہ ماہ پرور خورشید الوز کا پیچ گوش ہوش اس احقر کے پڑا۔ بے اختیار ایک بار گلزار طبیعت میں بلبل خیال شیریں مقال یوں ترنم سرا ہوا کہ اس قصہ فصیح و بلیغ کو بجنہ گلزار، یہ صفحہ رنگین زبان ہندی میں بہ طرز نو طرز مرصع لکھے اور نام نیک انجام کا اس دل آرام کا باغ جہاں میں "گلشن نو بہار" سر سبز و شاداب کیجئے۔"
اس سے دو باتوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ داستان مصنف نے کہیں سنا اور اردو میں منتقل کیا اور دوسری بات قابل غور ہے کہ نو طرز مرصع کے طرز پر تخلیق ہوئی۔ لیکن جیسے کہ صنائع و بدائع کے استعمال سے خالی نہیں ہے اور پر تکلف زبان، رعایت لفظی اور تخیل کی بلند

جس کو اس مناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسے جیسے سال کے عرصے میں زبان مقابلتاً صاف ہوئی تھی یہاں دو طرز کی آویزش اور آمیزش کے نتیجے میں ایک تیسری شکل نمودار ہوئی جس کی ارتقائی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ متقدمین ان کر لکھنوی انشا پردازی کی چھاپ جا بجا ملتی ہے جو پر تکلف اور پر تصنع ہے۔ اس عبارت کو دیکھئے "۔۔ جب کہ اس تحمل سے شاہزادہ مہر افروز برائے شکار ہو کر چلا تو بقدر حوصلہ اپنے ہر کسی نے خوان جواہر زر رید کے اس یکتا سے دریا نے دل پر نثار ایک بار کئے اور کسی نے اشرفیاں اور روپے اور کسی نے گل ہائے سیمیں و نقرئی نثار اس رشک گلزار فضیلت پر بہار ہے کئے۔"
نورتن، محمد بخش مہجور کی دوسری کتاب ہے جو ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۱۹ء میں عالم وجود میں آئی اور زیادہ مقبولیت سے سرفراز ہونے کی بنا پر متعدد بار شائع ہوئی۔ ۱۹۶۲ء میں خلیل الرحمٰن داؤدی کے مقدمہ کے ساتھ مجلس ترقی ادب لاہور نے دوبارہ شائع کیا۔ پوری کتاب نو ابواب میں منقسم ہے جو میں مربوط قصہ نہیں ہے جس کی نثر مربوط رنگین اور پر تصنع ہے۔ مصنف دعویدار ہے کہ وہ مشکل پسندی اور رنگین بیانی سے دور نہیں جا سکا جس کا اندازہ متن سے ہوتا ہے اور تقویت پہنچانے کی خاطر اشعار لکھے گئے ہیں اور واقعات کی جزئیات کی خاطر منظر کی عکاسی تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے

کی تحریر کی یاد تازہ کرتے ہیں کہ اس میں ۱۹ ویں صدی کی ابتدا کی لکھنوی تہذیب کا عکس ہے۔ انشار کے ٹھیکڑیں کو ابھی مناظر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ [illegible] کے آثار نمایاں ہو رہے تھے اور نئی تہذیب میں عجب ابتذال اور [illegible] در کر آئی تھی۔ اور جہد مسلسل کا سرے سے فقدان تھا اس لئے نورتن میں ان تمام باتوں کی عکاسی ملتی ہے جس نثر میں اپنے دور کی عکاسی کے زیادہ تر عناصر موجود ہوں۔ اور جس میں زندگی کی خصوصیات کے علاوہ دعوت افکار اور دل و دماغ کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہو تو وہ نثر معیاری اوصاف کی حامل قرار دی جا سکتی ہے۔ نورتن میں مذکورہ خصوصیات کا عکس موجود ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے کہ نورتن میں لکھنوی خوش مزاجوں کی جھلک نظر آتی ہے اور رنگینی اور سادگی کے درمیان ایسا توازن ہے جو قدیم و جدید کے مابین ایک مخلوط دیوار بن گئے ہیں جو ارتقائی مناظر پیش کرتے ہیں۔

" نورتن " نوبہار کے دس سال بعد لکھی گئی اس لئے زبان میں مقابلتاً جو فرق ہونا چاہئے وہ یہاں موجود ہے کہ اس میں گلشن نوبہار کے مقابلے میں نثر کی سادگی اور صفائی موجود ہے۔ یہاں بھی انشا پردازی کے جادو نے ایسا رنگ قائم کیا ہے کہ واقعات پس پردہ چلے گئے ہیں لیکن پوری کتاب پر انشا غالب نہیں ہے۔ گلشن نوبہار کی بہ نسبت واقعات کے متحرک نقوش ملتے ہیں جو اسے خواص کی دلچسپی کی چیز واضح کرتے ہیں۔ یہاں انشا پردازی کے قابل قدر نمونے ہیں۔ مثلاً

" یہ گفتگو بادشاہ تند خو کی سن کر سب خواتین دست بستہ عرض کرنے لگیں کہ اے شاہ بحر و بر والا گہر ہم پرستاروں جاں نثاروں کا کیا زہرہ ہے جو حضرت کی امانت میں خیانت کریں "

الفاظ کا استعمال نئی مہارت کا پتہ دیتا ہے۔ اس میں رنگین بیانی کا غلبہ ہے لیکن اوق اور غیر فہم طریقہ نہیں۔ یہاں سلاست اور مشکل پسندی کا ایسا امتزاج ہے جو دلچسپی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ نورتن کی نثر پر [illegible] کے نقوش [illegible] ہوئے ہیں۔

[illegible]

جواب کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریں۔

افکارِ پریشاں

جگن ناتھ آزاد

★

تو میری بزم سے افسردہ و ملول نہ جا
یہ میرا شعر ہے تو اس کو پڑھ کے پھول سا جا

★

گر شیشۂ پندار سلامت ہے تو آزاد
تو خود بھی سلامت ہے ترا فن بھی سلامت
کیا لوگ ہیں کرتے نہیں جو دعویٰ بھی جنوں کا
رکھتے ہیں گریباں بھی دامن بھی سلامت

★

اک عجب جلوۂ مبہم تھا کہ آنکھوں میں رہا
ہائے کیا حسنِ مجسم تھا کہ آنکھوں میں رہا
رات بھر یوں تو تری یاد نہ آئی لیکن
تیرتا پھرتا کوئی غم تھا کہ آنکھوں میں رہا
رات بھر نیند بڑی دیر سے آئی آزاد
کیا خبر کون سا عالم تھا کہ آنکھوں میں رہا

★

آوارہ نہ پھرنے دل! صحرا و بیاباں میں
آیا [illegible] دنیا دامن سے گریباں تک

★

★

ساتھ اُن کے تصور تھا گلستاں ہی گلستاں
بچھڑے تو بیاباں ہی بیاباں تھا نظر میں

★

پڑ گئی ہے جہاں بس وہاں ٹھہر ہی گئی
نگاہ کر ہی نہ پائی ترے بدن کا طواف

★

خود ہے کہیں خیال کہیں ہے نظر کہیں
کچھ اس طرح وجودِ بشر کا بکھر گیا

★

بیٹھا تو ہوں بہتے ہوئے دریا کے کنارے
پوچھو نہ مگر مجھ سے مری پیاس کا عالم

★

کبھی جس کا تصور میرے دل سے جا نہیں پایا
وہی میرے تصور میں ابھی تک آ نہیں پایا
اب اس سے کیا زیادہ ہو کمالِ فن مجھے حاصل
تجھے پیراہنِ الفاظ میں پہنا نہیں پایا

★

بندل

منتقل :- سیف رحمانی

اردو :- یوسف جمال
راج گانگ پور (اڑیسہ)

تم کیوں آنسو بہا رہے ہو ——— ؟
یوں رونے سے رنج و مصائب کی برکھا کیا رک جائے گی
آنسو،
غم کی دوا نہیں ہے
اشک بہانے سے بولو، کیا دکھ کی چنتا ڈھل جائے گی
میرا کہنا مانو، سن لو ——— میں کہتا ہوں
خوب ہنسو، کلکاری مارو، غم کے دو پیر اپنے آپ پر اور سماج پر
آنسو کو کچھ اور نہ سمجھو، یہ پانی ہے
کچھ بھی نہیں ہے، اس کا حاصل !
آگ کو اپنا سب کچھ سمجھو
آگ سے کھیلو
آگ بہاؤ
آگ بچاؤ
ساری دنیا سیہ ہو جائے
اور ——— سیہ تاثر والے کل چہرے آجائیں اپنے اصل رنگ میں
خون بھی جل کر آگ بنا ہے
پھر کیا آنسو بہہ سکتا ہے اور سکڑ سکتا ہے سمندر ؟
کیا اس کھارے پانی سے پھر شناچار دور ہو سکتا ہے ؟
رنج و مصائب، دکھ کی چنتا ..... ؟
چھی چھی !!
اب پھر آنسو بہا رہے ہو
جاؤ ——— تم جو ہو
ہاں،
صرف وہی ہو

غزلیں

جگنو تمہاری یاد کا یا جام چاہیے
روشن کوئی چراغ سرِ شام چاہیے
کل قہقہوں کے بیچ یہ آواز دے گئی
مجھ کو حضور بھیک نہیں کام چاہیے
خود سے ملے ہوئے تو زمانہ گزر گیا
مہلت ذرا سی گردشِ ایام چاہیے
روشن تو ہے چراغ چلو درد کا سہی
اب اور کیا بلا سے تیرگیٔ شام چاہیے
ساحل نہ مل سکا تو سفینہ ڈبو دیا
ہر داستاں کا کوئی تو انجام چاہیے
ساگر میں ہر ندی کو اترنا ہے ایک دن
جو بھی سفر میں ہے اسے آرام چاہیے

شروِن کمار ورما

چراغ

عقل ناز اور وفا کے چراغ
کب جلے سامنے ہوا کے چراغ
بڑھ رہی ہے دلوں کی تاریکی
آؤ روشن کریں دعا کے چراغ
ایک امید عمر کی راہوں میں
آگے چلتی رہی اٹھا کے چراغ
روشنی بھی تھی جن کی خوشبو بھی
یاد آتے ہیں وہ حنا کے چراغ
ایک عادت سی انتظار کی ہے
بیٹھے رہتے ہیں ہم جلا کے چراغ
کیوں یہ پلکیں جھکائے بیٹھے ہو
کون رکھتا ہے یوں چھپا کے چراغ
ہم سے روشن نہ ہو سکے ورنہ
اپنی راہوں میں التجا کے چراغ

محمد ظفر اعظمی

[illegible]پور

چاندنی سے گذر رہا تھا کیوں
اپنے سائے سے ڈر رہا تھا کیوں
وہ تھا طائرِ بلندیوں کا مگر
پستیوں میں اُتر رہا تھا کیوں
وہ مسیحائے وقت تھا لیکن
قسط در قسط مر رہا تھا کیوں
وہ زباں رکھ کے بھی ظفر صاحب
شکوہ آنکھوں سے کر رہا تھا کیوں

●

یہ خوف کیسا ذہن کے اندر اُتر گیا
میں چلتے چلتے اپنے ہی سائے سے ڈر گیا
مغرور تھا پرند جو اونچی اڑان کا
وہ ریزہ ریزہ ہو کے ہوا میں بکھر گیا
اونچی حویلیوں کے مکیں صاف بچ گئے
الزام قتل سارا غریبوں کے سر گیا
اے دوست تو نے چشمِ کرم جس پہ ڈال دی
اس شخص کا جہان میں مقدر سنور گیا
اس نے صداقتوں کا بھرم رکھا ہے ظفر
جو کل صلیب و دار کی حد سے گذر گیا

●

خواب آنکھوں میں لئے پھرتا ہوں میں
شہر میں اک اجنبی چہرہ ہوں میں
مجھ کو پڑھئے بھر کے آنسو آنکھ میں
زرد موسم کا کوئی قصہ ہوں میں
حسن کی رعنائیوں میں گم ہیں سب
اس بھری محفل میں کیوں تنہا ہوں میں
[illegible] ملامت میری سمت
ٹوٹ جاؤں گا ظفر شیشہ ہوں میں

●

لیق

غزلیں

ڈاکٹر ساقی مچھلی شہری

بیاباں کو گلستاں، زرد پتوں کو ہرا لکھنا
ہمارے ہمنشیں اس کو سمجھتے ہیں نیا لکھنا
یہی کرتا ہے وہ، اور اس کو اچھی طرح آتا ہے
گدا کو شاہ لکھنا اور سلطاں کو گدا لکھنا
زمانہ اور تھا وہ جب اسے اصول کہتے تھے
بہت آساں ہے سکوں پہ اب شرم و حیا لکھنا
ہم اپنا خون بہائیں چاہے اپنی جان ہی دیدیں
مگر ہرگز نہ بھولے گا وہ ہم کو بے وفا لکھنا
ہماری کند ذہنی کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے
کہ بچپن میں یہاں سیکھا نہ بندے کو خدا لکھنا
خدا حافظ، مگر تم سے مری اتنی گزارش ہے
کہیں آباد ہونا تو مجھے اپنا پتہ لکھنا
ہمارے شہر میں ساقی بہت سے ایسے شاعر ہیں
کہ جن کا فن فقط ہے خود اپنے کو بڑا لکھنا

ہر آدمی وطن میں مرے بے اماں ہے
جنت نشاں یہ پھر بھی ہے، اللہ کی شان ہے
اس کی چھچھوری حرکتوں پر لب ہلائے کون
بستی میں اس کا سب سے بڑا خاندان ہے
محنت کشوں کا اور لہو کون چوسے گا
اس گاؤں میں بس ایک ہی پختہ مکان ہے
سارا جہان دوست بنائے نہ کیوں اسے
سب جانتے ہیں اس کی بہن نوجوان ہے
قسمت سے چن لیا گیا جو صدر مملکت
ہندوستاں میں وہی اصلی کسان ہے
نخرے تو ناگوار ہیں اس کے بہت، مگر
میں چپ ہوں اس لئے کہ مرا میہمان ہے
دیتا ہے پانچ پیسے میں سب کو دعائے خیر
ساقی وہ شیخ آدمی کتنا مہان ہے

غزلیں

کرشن پرویز
ضلع روپڑ

اب کسی بشر میں بھی حوصلے نہیں ملتے
جاں لٹانے والوں کے کچھ پتے نہیں ملتے

کاش ہم دکھا پاتے سب کے اصلی چہرے کو
آجکل مگر ایسے آئینے نہیں ملتے

ایک اک اکائی میں سب ہی بٹتے جاتے ہیں
اب گھروں میں نسلوں کے سلسلے نہیں ملتے

فاصلے دلوں میں بھی اب تو بڑھتے جاتے ہیں
بائی بائی کرتے ہیں اب گلے نہیں ملتے

یوں سمٹتے جاتے ہیں لوگ ایسے ایسے بھی
دل تو دل گھروں کے بھی در کھلے نہیں ملتے

ایک سب کا مقصد ہے ایک سب کی ہے منزل
پھر بھی کیوں کسی کے بھی راستے نہیں ملتے

متین انصاری
پونا

ہجرت کا کوئی داغ بھی من میں نہیں رکھا
ہم نے تو کسی رام کو بن میں نہیں رکھا

وہ پھول جو خوشبو کی تجارت میں مگن تھے
ہم نے انہیں اپنے چمن میں نہیں رکھا

بستر پہ تڑپتا رہا میں ماہیِ بے آب
پھر وصل کا کانٹا بھی بدن میں نہیں رکھا

جس لفظ سے پڑتی ہوں سماعت میں خراشیں
اس لفظ کو پھر ہم نے سخن میں نہیں رکھا

غزلیں

محبوب نظر
نیو گودام، گیا

تمام صحنِ گلستاں پہ تم نظر رکھیو
خزاں نہ چپکے سے آئے ذرا خبر رکھیو

بہت سنبھال کے رکھیو تم اپنے دل میں اسے
عزیز جان سے بھی [illegible] معتبر رکھیو

یہی ہے عشق سنورتی ہے زندگی جس سے
یہ آگ سینے میں تم اپنے عمر بھر رکھیو

چراغ شوق جلاتے رہو ہواؤں میں
یہ کام سخت ہے جاری عمل مگر رکھیو

کبھی نہ ہو کے نشانہ تمہارے قاتل کا
سبھی کے سامنے اس کے دل و جگر رکھیو

اسی سے محفل ہستی میں جگمگاہٹ ہے
دل و نگاہ میں تصویرِ شیشہ گر رکھیو

یہ ان کا در ہے، کوئی بتکدہ نہیں ہے نظر
یہاں خلوص سے رکھیو جو اپنا سر رکھیو

رضی احمد تنہا
ارریہ (بہار)

نونہالِ چمن انتہاؤں میں ہیں
شہر آشوب کی قتل گاہوں میں ہیں

چشمِ عبرت کی سنگیں نگاہوں میں ہیں
دل میں ہر پل سلگتی چتاؤں میں ہیں

لاکھ طوفاں اٹھے، لاکھ بجلی گرے
بجلیوں کی طرح ان گھٹاؤں میں ہیں

خوں اگلتی ہو دھرتی تو کچھ غم نہیں
زہر آلود رنگیں فضاؤں میں ہیں

دشمنوں کی طرح دشمنوں سے نہ ملا
اجنبی شہر کے آشناؤں میں ہیں

تنگ ہو جائے ارضِ وطن غم نہ کر
بے وطن تو وطن کی سزاؤں میں ہیں

اپنی معصومیت بھول جا، بھول جا
اب زمانے کی ظالم اداؤں میں ہیں

بے زباں آجکل تو ہی تنہا نہیں
لے دعا لے تو ان دعاؤں میں ہیں

عہد عکاس غزلیں

شبیر احمد قرار، بمبئی

لطف و کرم کی آس تھی لا دی گئی زمیں
کیا کچھ نہ تھا نظر میں تھما دی گئی زمیں

وہ عزم دے دیا کہ فلک نقش پا لگے
یہ کیا کہ راستے میں بچھا دی گئی زمیں

اس کھیل کا مزہ تو قیامت اٹھائے گی
بارود کے پروں پہ سجا دی گئی زمیں

ہم خود ہی اپنی موت کا اعلان کیوں کہیں
اپنے گلے کا طوق بنا دی گئی زمیں

پریاں کہانیوں سے بھی پرواز ہو گئیں
یہ کیسی گردشوں میں پھنسا دی گئی زمیں

شمس و قمر کی راہ میں آنکھیں بچھا رہیں
کیا سوچ کر نظر سے گرا دی گئی زمیں

وعدوں کی کہکشاں نے کہیں کا نہیں رکھا
سو بار آسمان بنا دی گئی زمیں

یوں اختصار پھیل گیا دور دور تک
چٹکی میں بھر کے آج دکھا دی گئی زمیں

اشکوں کے پھول آہ کی چادر چڑھایئے
انسانیت کی قبر بنا دی گئی زمیں

شبیر احمد قرار کی چند غزلیں ایک ساتھ شائع کی جا رہی ہیں اور نئے فنکاروں نیز غزل کے قارئین سے خصوصی گزارش کی جا رہی ہے کہ قرار کے لہجے کی اجنبیت اور موضوعات کی منفرد پیش کش پر توجہ دیں۔ یہ دیکھیں کہ آج نئی غزل کتنے DIMENTIONS سے ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ الفاظ پر مکمل دسترس اور چونکانے والی تخلیقیت شبیر احمد قرار کی انفرادیت ہے۔ غزل کی امکانی وسعتوں اور اس کے صد پہلو حسن کا جائزہ لیتے ہوئے آج کے بہت سارے تخلیق کاروں کے درمیان شبیر احمد قرار نہ صرف DISTINCT ہیں بلکہ اکثر و بیشتر تخلیقی INSPIRATION کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔

— مسعود منظر

غزلیں

ضمیر احمد قمر

کبھی کو خاک سے لگا کوئی کھنڈر مجھ میں
کہ آفتاب سجانا ہے بام و در مجھ میں
ہوا دھوپ کو کھلونا بنائے گی کیونکر
سلگ رہا ہے سلیقے سے کوئی گھر مجھ میں
نہال میں کئی شاخ ڈالیاں مرے دم سے
ابھی تلاش نہ کر شاخ بے ثمر مجھ میں
خزاں شباب پر آئی تو ملاقات میں پھیلا
ہرا بھرا ہے گلشن آس کا شجر مجھ میں
سوادِ شام کا احوال مت سنا رہ دی
سسک رہی ہے لہو رنگ دوپہر مجھ میں
زمین کیوں مسلسل طواف میں رہتی
فلک بھی رنگ جماتا ہے ڈوب کر مجھ میں
کبھی تو دن کو اجالوں کی جستجو مجھ سے
کبھی تو شام سے جھگڑا ہے سحر مجھ میں

تیرے رخ کی بات چلی تو ساحل بھی منجدھار لگا
تجھ کو کیا سمجھوں سمجھاؤں تو ہی بیڑا پار لگا
نفرت کی دیوار اٹھی تو چھت گھائل ہو جائے گی
پیار محبت کے پودے بھی آنگن میں دروچار لگا
رشتے ناطے بھی سودائی پل پل بکتے رہتے ہیں
جب جب شہر کو تول کے دیکھا بے چارہ بازار لگا
ساحل، رستے، بھنور، تلاطم اب تو سب آرام سے ہیں
سانس کی کشتی ڈوب گئی تو رونا دھونا پار لگا
دھوپ کنڈی کھٹے میٹھے پھلوں کی باتیں چلنے دے
پیاس جواں ہے اب تو رسیلے وعدوں کی بوچھار لگا
کس بستی کی شادابی کو الٹ پلٹ کر دیکھوں اب
بستی ایسا شہر بھی مجھ کو بوسیدہ اخبار لگا

اوج زور بیاں چھپانا ہے
دیکھنا آسماں چھپانا ہے
دھوپ کیا آبرو کو ڈس لے گی
پیڑ ہوں سر کہاں چھپانا ہے
آتش وقت پڑھ نہ لے سب کچھ
حرف توقیر جاں چھپانا ہے
بوئے گل کے لئے بھی زنجیریں
کیا ہوا کا بیاں چھپانا ہے
قہقہوں کی چھتوں پہ مت جانا
یہ تو کچا مکاں چھپانا ہے
یہ تبسم چھپلے چلائے کیا
پائے جو بھی زیاں چھپانا ہے
ہر اذاں امتحاں ہے بابا
حاصل امتحاں چھپانا ہے

شہاب دائروی
بہار شریف (نالندہ)

سراب

جاوید اقبال نے اپنی بیوی ثمرین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔ اداس اور پریشان چہرے نے جاوید اقبال کے ذہن کو جھنجھوڑ دیا۔ بے اختیار ہو کر بولے۔

"کیا ہوا ہے ثمرین ــ؟ تم اس قدر اداس اور فکرمند کیوں ہو؟ بچوں کے خطوط بھی کل ہی آئے ہیں۔ سب مزے میں ہیں، کوئی انہونی بات ہوئی بھی نہیں، پھر یہ فکر کی پرچھائیاں تمہارے چہرے پر کیوں؟ کیا بات ہے، مجھے نہیں بتاؤ گی، اکیلی تم تو نہیں ہو، میں تمہارے سکھ دکھ کا ساتھی ہوں پریشانیاں بانٹ لی جائیں تو ہلکی ہو جاتی ہیں، تم اکیلی اپنی الجھنوں سے کیوں الجھ رہی ہو؟ چلو اندر بیٹھتے ہیں۔"

جاوید اقبال کے لہجے میں اتنا اپناپن بھرا تھا کہ ثمرین ان کا ہاتھ تھامے اندر آگئیں لیکن وہ وجہ ظاہر کر کے اپنے شوہر کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھیں اس لئے طبیعت کی گرانی اور تھکن کی باتیں بنا کر اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ بستر پر لیٹتے ہی جہاں وہ پلک جھپکتے ہی نیند کے ساگر میں ڈوب جاتی تھیں، آج ان کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا ــ دماغ میں طوفانی ہلچل مچی تھی اور دل بے چین تھا۔ وہ جہاں رہتی تھیں وہ امیروں کی کالونی تھی۔ ہر طرف خوشحالی تھی ــ دور کالونی سے الگ جھونپڑیاں بسی تھیں جن میں زندگی گزارنے والی عورتیں کالونی کے اندر کام کرنے والی عورتیں کالونی کے اندر کام کرنے آتی تھیں۔

ثمرین کو شروع سے ہی زیادہ گھومنے کا شوق نہیں تھا۔ وہ اپنے فرصت کے اوقات اپنی گھریلو زندگی کی خوشیوں کے بیچ گذارتی تھیں۔ چاہنے والا شوہر ملا تھا اور پیار کرنے والے تین بچے۔ زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں کا سامنا صرف چند بار انہوں نے کیا تھا اور وہ الجھنیں وہی تھیں جو ایک عام عورت کو اپنی گھریلو زندگی میں ہوتی ہیں۔ لیکن آج اپنے یہاں کام کرنے والی شوبھا کی باتوں کو سن کر انہیں اپنے ماضی کی بات ذہن میں گھومنے لگی تھی۔

"عورت بڑی بدنصیب ہوتی ہے ــ ماں لڑکی کو جنم تو دے سکتی ہے لیکن تقدیر نہیں دے سکتی۔ عورت اپنی تقدیر میں بدنصیبی جنم سے ہی لکھوا کر لاتی ہے یہ اور بات ہے کہ بدنصیبی کی

حصوں میں بٹ جاتی ہے اور وقت اور حالات
کے تحت سفر کرتی رہتی ہے۔"

دادی کی باتیں پہلے انہیں دقیانوسی لگتی
تھیں ۔ انہوں نے اپنے ماں باپ، بھائی بہن
کا بھرپور پیار پایا تھا اور جب بیاہ کر سسرال
آئیں تو انہیں ایسا لگا کہ جنت صرف آسمان پر
ہی نہیں دنیا میں بھی ہے اور وہ جنت بسی ہے
شوہر کے گھر میں ۔۔۔ شوہر کا بھرپور پیار اور
پیار سے بچوں کی دیکھ ریکھ کی ذمے داریوں
نے ماں باپ سے جدائی کے غم کو بھی بھلا دیا
تھا۔ وقت نے کئی کروٹ بدلے ۔۔ زندگی میں کئی
اتار چڑھاؤ آئے اور انہیں جتنا خدا سے اپنی دعاؤں
کے اثر اور قبولیت کا یقین تھا اتنا ہی اپنے شوہر
کے پیار کا بھروسہ بھی تھا ۔۔ زندگی کے موڑ پر
ان کے شوہر ان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رہے،
وقت اڑتا ہوا ہواؤں کی طرح گذرتا چلا گیا۔
اپنی جوانی بچوں کو سونپ کر ان کی تمام ذمے
داریوں سے خود کو نجات دلا کر سکون سے
جی رہی تھیں ۔۔ لیکن آج کام کرنے والی شوبھا
کی باتوں نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا ۔۔
انہوں نے پہلے سوچا بھی نہیں تھا کہ دنیا میں دو طرح
عورتیں کس طرح جیتی رہتی ہیں ۔۔ اسی سوچ کے
بیچ انہیں بچپن کی باتیں بھی یاد آنے لگیں ۔۔
انہوں نے اپنے پاس پڑوس میں بسنے والی عورتوں
کی اکثر پٹتی ہوئی راتوں میں سسکیاں اور
چیخیں سنی تھیں، مردوں کے عتاب کا شکار
عورتیں ہوتی تھیں ۔ جب ان کی سمجھ میں کچھ نہیں
آیا تھا۔ ان کے ذہن میں تصویر کا دھندلا سا
عکس ضرور ابھرا تھا لیکن سوال کا جواب نہیں۔
ایک تو لاشعوری کی عمر تھی ۔۔ وہ ان سوالوں
کا جواب کس سے اور کہاں سے طلب کرتیں ۔ گھر کا
ماحول بھی ٹھیک ہی تھا۔ بس کبھی کبھی رات کو ماں
کو روتے دیکھتی تھیں اور ان کے پوچھنے پر ان کی
ماں سر کے درد کی بات کہہ کر انہیں ٹال گئیں تھیں۔
پھر وقت بھاگتا گیا۔ لاشعوری عمر نے شعور دیا تو
گھر کی دہلیز پار کر کے وہ ایک جنت میں آ بسی تھیں
زندگی کی ساری خوشیوں کو پانے کی دعائیں
رخصتی کے وقت جو ان کے ماں باپ نے دی
تھیں وہ ان دعاؤں کی چھاؤں میں زندگی گذار
رہی تھیں ۔۔۔ وہ اپنی عمر کی منزل کے ٹھہراؤ پر تھیں
تو زندگی نے نیا رنگ دکھانا شروع کیا۔

بچپن سے ذہن میں تصویروں کے جو ہلکے
ہلکے عکس تھے ۔۔ جو سوالات تھے وہ واضح اور
نمایاں ہونے لگے۔ عورت اپنی زندگی کے آخری دنوں
کا انتظار اتنی شدت سے کرتی ہوئی ملے گی؟ ان کے
وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ شوبھا بھی ایک مظلوم
عورت تھی ۔ سترہ سال کی عمر میں وہ لڑکی بھی تھی اور
عورت بھی ۔ بھوک سے زرد چہرہ، بدن پر کپڑے
کئی شکل میں کئی جگہوں پر پیوند لگی میلی کچیلی سی
ساڑی پہنے شروع میں جب وہ نئی نئی کام پر لگی تھی
تو کچھ عجیب سا رویہ رکھتی تھی۔ کبھی تو بہت خوش

دکھائی دیتی تھی اور کبھی معمولی سی بات پر رونا شروع کر دیتی تھی۔ جب انہوں نے اس کے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا تھا کہ وہ دنیا میں اکیلی ہے اپنا کوئی نہیں ہے۔ بچپن میں ماں کے مرنے کے بعد باپ نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں کے ظلم کے سائے تلے اس کا بچپن نہ جانے کہاں کھو گیا۔ باپ شرابی تھا، بھائی بہن بھی کوئی نہیں تھا۔

ایک رات سوتیلی ماں کے ظلم و ستم سے وہ فرار ہو گئی اور ایک نئے شہر میں پہنچ گئی۔ نئی جگہ تھی، لوگ انجانے تھے۔ وہ جوان تھی ۔۔۔ کہاں جاتی۔ کس کے نشیمن میں پناہ لیتی ۔۔۔ عزت کے لٹ جانے کا خطرہ لاحق تھا ۔۔۔ ایک عمارت زیر تعمیر تھی۔ بہت سی مزدور عورتیں کام کر رہی تھیں۔ اس نے اپنی دکھ کی کہانی ایک کو سنا کر اس کے ساتھ کام کرنے لگی اسی مزدوری کرنے کے دنوں اس کی زندگی میں ایک لڑکا جھانکنے لگا۔ وہ پیار، ہمدردی اور سہارے کی بھوکی تھی۔ اس نے اس کے اعتماد کے سہارے کو اپنا لیا۔ اس نے شادی کر لینے کا وعدہ کیا ۔۔۔ دونوں مزدوری کرنے لگے، ساتھ رہنے لگے اور ایک رات دونوں کے جوان جذبات نے تمام حدود کو توڑ ڈالا ۔۔۔ پھر بھی وہ پچھتاوے کی آگ میں نہیں سلگی۔ اس کو پورا بھروسہ تھا کہ وہ اپنا وعدہ ہر قیمت پر پورا کرے گا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اب نہ وہ کنواری رہی، نہ بیاہی اور نہ بیوہ ۔۔۔ دھیرے دھیرے اس نے مزدوری پر جانا چھوڑ دیا ۔۔۔ اس کی زندگی تاریکیوں میں بھٹکتی رہی ۔۔۔ مار کھاتی رہی ۔۔۔ لیکن فرار کی ہمت نہ کر سکی

ثمرین کا دماغ چھن سے ہو گیا۔ اس نے جب شوبھا سے کہا تھا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کیوں نہیں دیتی تو شوبھا نے زہر پیتے ہوئے کہا تھا۔

"کیسے چھوڑ دوں مالکن، کئی سال سے اس کے ساتھ بیوی کی طرح رہ رہی ہوں ۔۔۔ آس پاس کے سب لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ میرا آدمی ہے آج اس کو چھوڑ دوں گی تو کل ہر آدمی بھوکے بھیڑیے کی طرح میری طرف دوڑ پڑے گا۔ آج وہ پی کر مجھے مارتا ہے یا گالیاں دیتا ہے پھر بھی دوسرا کوئی مجھے نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں کسی کی بیوی ہوں۔ لیکن اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے تو میں ہر رات کسی نہ کسی کی خالی تھالی کا کھانا بنتے بنتے اتنی جوٹھی ہو جاؤں گی کہ پھر وہی لوگ مجھے جوٹھی تھالی کا بچا ہوا کھانا سمجھ کر کچرے میں پھینک دیں گے اور کتے کے کھانے کے لئے چھوڑ دیں گے۔ یہی سچائی سوچ کر اس کی مار سہتی ہوں ۔۔۔ آپ سب کے گھروں میں کام کر کے اس کا اور اپنا پیٹ پالتی ہوں، کیا کروں؟ اوپر والے نے نصیب ہی ایسا لکھا تھا۔"

اس کی باتیں سن کر ثمرین کو اس کے ماں باپ پر شدید غصہ آیا تھا۔ وہ اس کی بدبختی جان کر اس کے لئے کچھ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن شوبھا ان پڑھ تھی پھر بھی انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شوبھا کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گی۔ اس کی زندگی میں پھیلے ہوئے اندھیروں کو کسی نہ کسی طرح دور کر کے رہیں گی ۔۔۔ اسی کی وجہ سے انہوں نے شوبھا سے صاف لفظوں میں

کہا تھا کہ وہ آج کے بعد رو رُسکی نہیں ۔ عورت کا جنم اس لئے نہیں ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھر ٹھوکریں کھائے صرف اس وجہ سے کہ وہ اکیلی اور بے سہارا ہوتی ہے ۔ اپنی عزت کے بچاؤ کے لئے وہ صرف آدمی کے سہارے کی محتاج بنی رہے ۔ عورت کا اپنا کیا ہوتا ہے؟ یہ سوچتے سوچتے ثمرین کا ذہن تھک کر بھاری ہو گیا ۔

اگلے دن ثمرین نے ایک لیڈی ڈاکٹر کے کلینک میں شوبھا کو صفائی کرنے کے کام پر رکھوا دیا ۔ اور اس کو زندگی کا ایک نیا روشن پہلو دکھایا جہاں وہ صرف اپنے ہونے والے بچے کے لئے زندہ رہے گی ۔ اور خوشی کے ساتھ ہر آنے والے دن کا انتظار کرے گی ۔ اس کے آدمی کو یہ معلوم ہونے نہ دیا کہ شوبھا بھاگ گئی ہے

اس طرح شوبھا کو ایک نئی زندگی تو ضرور مل گئی لیکن یہ زندگی ادھوری ضرور تھی پھر بھی اس ادھورے سہارے سے اچھی تھی ، جس میں وہ جی رہی تھی ۔ ثمرین اکثر کلینک جا کر شوبھا کا جائزہ لیتی رہتی ۔ بظاہر وہ خوش نظر آتی تھی لیکن اس کے دل میں چھپے ہوئے کانٹے کا چبھن اس کے چہرے پر عیاں رہتا تھا ۔ شاید وہ اپنے ہونے والے بچے کے مستقبل سے فکر مند رہتی تھی ۔ وہ اکثر سوچتی اس طرح کی زندگی گذارنے والی اکیلی شوبھا ہی نہیں تھی اور نہ جانے کتنی عورتیں شوبھا کی طرح جینے پر مجبور ہیں ۔

شوبھا کو نئی دنیا دکھا کر ثمرین مطمئن ہو گئیں کئی دنوں بعد ایک دن وہ اپنے برآمدے میں بیٹھی ہوئی شطرنج کی بساط پر سیاہی گھوڑوں کی چالیں دیکھ رہی تھیں کہ ایک نوجوان میلی کچیلی دھوتی قمیض پہنے ان کے سامنے آکر شرمندے اداس لہجے میں بولا ۔

" شوبھا آپ کے یہاں بھی کام کرتی تھی نا بی بی جی ؟

" ہاں ! " ثمرین نے چونکتے ہوئے کہا

" دس گیارہ دنوں سے وہ اپنی کھولی میں لوٹی نہیں ہے بی بی جی " نوجوان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں

" تو گئی کہاں ۔ ؟" ثمرین نے انجان بن کر کہا ۔

" ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے کوئی رشتہ دار کے پاس چلی گئی ہو ۔"

" نہیں بی بی جی ، دنیا میں میرے سوا اس کا کوئی نہیں ، وہ مجھ سے خوش نہ تھی ، روٹھ کر کہیں چھپ گئی ہے ۔" نوجوان شکستہ دل ہو کر برآمدے پر بیٹھ گیا ۔

" تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے ؟" ثمرین نے پوچھا

" میں اس کا آدمی ہوں بی بی جی ، لیکن آپ سے جھوٹ کیا بولوں ، بیاہ رچانے کا جو میں نے اس کو وچن دیا تھا وہ نبھایا نہیں ، شراب کی لت پڑتے ہی سب کچھ بھول بھال گیا ، یہ بھی بھلا دیا کہ وہ میرے سُکھ دکھ کی ساتھی ہے ۔ بی بی جی سچ تو یہ ہے کہ نشہ میں آدمی ہو کر بھی آدمی نہیں رہتا ۔ جانور بن جاتا ہے اور جانور بن کر میں نے بھی اس کو دکھ ہی دیا تھا ۔" وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانک کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔

ثمرین تذبذب میں پڑی چپ رہیں ، وہ سوچنے لگیں نئی دنیا پا کر بھی شوبھا ادھوری ہے ۔ کوئی بھی عورت مرد کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی ۔ وقت کے بخشے ہوئے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچ کر انہوں نے کہا ۔

"اگر شوبھا مل جائے تو تم اس کی مانگ میں سیندور بھر دوگے ؟"

"ہاں! بی بی جی، ایشور کی سوگند میں آپ کے سامنے اس کی مانگ کو سیندور سے بھر دوں گا، یہ بھی وچن دیتا ہوں کہ شراب منہ سے نہیں لگاؤں گا اور ہمیشہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کروں گا۔" اس کا چہرہ جذبات کے بہاؤ سے تمتما اٹھا۔

مسز نیّر دور اندیش تھیں۔ شرابی کی باتوں پر یقین کر لینے کے لئے ان کا دماغ آمادہ نہ تھا۔ پھر یہ بھی سوال لاحق تھا کہ شوبھا کا ردعمل کیا ہوگا۔

"تم اپنی تلاش جاری رکھو۔ میں بھی کوشش کرتی ہوں کہ اس کو ڈھونڈ نکالوں۔ تم کل آکر ملو۔"

نوجوان نے اٹھ کر سلام کیا اور سر جھکا کر خاموش چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی وہ کلینک پہنچ گئیں اور شوبھا کو دیکھتے ہی دم بخود رہ گئیں۔ وہ سرخ ساڑی میں ملبوس تھی۔ اس کی پیشانی پر سیندور بھرا تھا۔ وہ بڑی خجالت سے بولی۔

"معافی چاہتی ہوں میم صاحب، آپ کو خبر نہ کرسکی۔ بن باپ کے بچے کا جیون اندھیروں میں ڈوب جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے اپنے ہونے والے بچے کی خاطر میں نے اسی کلینک کے دربان کو اپنا جیون ساتھی بنا لیا ہے۔ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا ہے۔ اپنا ہر بھلا، ہر غلطی، ہر قصور کر کے اس کو آگاہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی اس نے بڑی چاہت سے مجھے اپنانے کا اظہار کیا تو میں انکار نہ کرسکی۔ وہ صحیح معنوں میں انسان ہے میم صاحب۔"

مسز نیّر کے لبوں پر خوشیاں بکھر گئیں۔ اب شوبھا ادھوری نہ رہی تھی۔ پوری طرح مکمل تھی۔

دہلی

● بقیہ :- شناسائی

سے ڈر رہا ہو۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بریف کیس کھولا پھر بند کرے میں ــــ دھائیں ــــ دھائیں ــــ کی دو آوازیں گونجیں اور کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔

دہلی

ادبی رسالہ "تکلم" کا اجرار

ادبی حلقوں اور ادب نواز احباب کے لئے یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے مقصد کے تحت "بزم ادب پونہ" کی جانب سے ماہ مارچ ۹۶ء میں ادبی رسالہ "تکلم" کا اجرا عمل میں آرہا ہے۔ ادبا و شعرا حضرات سے درخواست ہے کہ اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات مع تصویر مندرجہ ذیل پتے پر ارسال فرمائیں۔

مدیر ماہنامہ "تکلم" ۷۴۲ ساچا پیر،
پونہ - ۴۱۱۰۰۱

حکیم رازی ادیبی
صدر بزم ادب پونہ

پرنٹر پبلشر ... سے چھپوا کر دفتر ... سے شائع کیا۔

ویریندر پٹواری



یہ سارا شہر جانتا تھا کہ اورنگ زیب
حاجی غلام رسول کا اپنا بیٹا نہیں ہے مگر وہ کون ہے
یہ فقط میرے پتا جی کو معلوم تھا۔ مگر وہ اس کے بارے
میں کسی سے بھی ذکر نہیں کیا کرتے تھے۔ اگر ۱۹۶۵ء میں
پاکستان پھر کشمیر پر حملہ نہ کرتا اور میرا ایک چاچا جنگ
میں نہ مارا جاتا شاید وہ یہ راز اپنے سینے میں دفن کر لیتے
اور میری ماں کو کچھ بھی نہ بتاتے۔ راز اگلنے کی وجہ صدمہ
تھا جس کو وہ برداشت نہیں کر پائے تھے۔ ہوا یوں
تھا کہ اس بار حاجی صاحب پاکستان کو حملہ آور
نہیں کہہ رہے تھے حالانکہ چاچا کی موت کی خبر جب
انہوں نے سن لی تھی تو سڑک پر بے ہوش ہو گئے تھے۔
بقول ان کے میرا چاچا بالکل اسی طرح شہید ہو گیا
ہے جیسے دوسری جنگ عظیم میں مارے گئے۔ ہندوستانی
[illegible] جنگ کے ہندوستان کے دو ٹکڑوں میں
[illegible] سے یہ دو جگری دوست
[illegible] ایک اسی [illegible] بنانے میں کامیاب ہو گیا

حالانکہ دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں محسوس
کرتے ہوئے اپنے آخری وقت تک تڑپتے رہے۔
اتفاقاً دونوں سنہ ۱۹۹۰ء میں اللہ کو پیارے
ہو گئے۔ تب ہم دونوں یعنی میں اور اورنگ زیب
۴۳-۴۴ سال کے ہو گئے تھے اور ایک دوسرے
کو تقریباً بیس سال بعد تب ملے تھے جب میں اپنے
گھر کو فروخت کرنے سری نگر گیا تھا۔ اس روز
شاید اورنگ زیب مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا
مگر کسی بھی قیمت پر پھر سے رشتے ناطے توڑنے کے
حق میں نہیں تھا۔ بلکہ اپنے مکان کو بیچ کر اپنے ہی
پرکھوں سے الگ ہو کر ایک نئے مقام کی تلاش
میں تھا۔ اور ایسے حالات میں ہمارا پھر کبھی نہ ملنے
کی قسم کھا کر بچھڑنا ایک فطری عمل تھی۔ لیکن جب
گھر کی چابیاں مکان کے خریدار کو دے کر میں
نے پلٹ کر دیکھا تھا تو اورنگ زیب کی ماں
جس کو میں بچپن میں زرولی اماں کہا کرتا تھا [illegible]

کھلی کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی
آنکھیں بہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بہہ رہی تھی۔
شاید اس لئے کہ وہ مجھ سے بھی اتنا ہی پیار کرتی تھی
جتنا وہ اورنگ زیب سے حالانکہ نہ وہ اس کی
کوکھ سے پیدا ہوا تھا اور نہ میں۔ مگر ماں کا پیار
کیا ہوتا ہے۔ شاید مریم بھی وہ نہ بتلا سکتی تھی
جو رونی اماں ہم دونوں کو سینے سے لگا کر احساس
دلاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میرے قدم رک گئے تھے
اور مجھے وہ دن یاد آ گئے جب میں اور اورنگ زیب
یہاں اسی جگہ کھیلا کودا کرتے تھے

میں پندرہ سال بعد وہاں گیا تھا۔ کچھ بھی
تو نہیں بدلا تھا۔ وہی ہمارے دیوار سے دیوار ملے
نیم کچے نیم پکے مکان۔ جہلم کے کنارے۔ ایک پکے
نہانے والے گھاٹ سے ساتھ۔ مندر اور مسجد
کے درمیان۔ ایک لمبی گلی جو ایک متمول بازار کے
ساتھ ملتی ہے۔ وہاں نجاّر پیر رحمان قصاب کی
دوکان۔ حسن دودھ والے کی دوکان اور اس دکان
پر ہوتی گرما گرم سیاسی بحث۔ فٹ پاتھ پر بیٹھی
نوری گوری مچھیرن نوری جو تب بھی گھاس میں
روسٹ کی ہوئی مچھلیاں بیچا کرتی تھی۔ یہاں
یہاں ہر طرف سبزیاں بیچنے والوں کی قطاریں
اور پھیری والوں کی آوازیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے
وہ سب میرا نام لے کر مجھے لوٹ کر آنے کی صدائیں
دیئے جا رہے تھے۔ اور ان میں اورنگ زیب بھی تھا۔
تب جانے کیوں مجھے یوں لگا تھا جیسے دریا میں ڈبکیاں
لگانے والے بہت سارے بچوں میں ہم دونوں بھی
شامل تھے اور میری ماں گھر کی تیسری منزل سے یہ منظر
دیکھ کر چلا رہی۔ آگے مت جاؤ۔ آگے پانی بہت گہرا ہے
لیکن ہم کہاں کسی کی بات ماننے والے تھے۔ پانی سے
نکل کر ہمارا "سمندر ننگ" (کشمیر کا ایک مشہور کھیل
جو لڑکے یا لڑکیاں زمین پر خانے بنا کر ایک ٹانگ پر
کھڑا ہو کر کھیلتے ہیں) یا گلی ڈنڈا کھیلنا۔ یا پھر
محلے کے لوگوں کی نقلیں اتار کر گھاٹ پر کپڑے
دھونے والی عورتوں کو ہنسانا۔ یہ سب ہمیں صبح سے
شام تک ایک دوسرے سے الگ ہونے کا موقع ہی
نہیں دیتے تھے۔ وہ بیمار ہوا تو میں بھی اسکول نہیں
جاتا تھا۔ اور اگر میں نے اسکول نہ جانے کا بہانہ
بنا لیا تو اورنگ زیب بھی بطور گواہ جھوٹ کو
سچ بنا دیتا تھا۔ بارش ہوئی تو ہم دونوں ایک ہی
کمبل اوڑھ کر بارش میں دوڑتے بھاگتے۔ گرتے
سنبھلتے لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ برف
گرتی تھی تو ہم دونوں اپنے قدموں کے نشان چھوڑ
کر گانے گایا کرتے تھے یا پھر برف کے بت بنایا کرتے
تھے۔ وہ بھی کیا دن تھے۔

ان دنوں یعنی جب گرمیوں میں بھی ہماری ناک
میونسپلٹی کے نکڑ کی طرح بہتی رہتی تھی اور ناک کو بار بار
صاف کرنے کا کام یا میری ماں کیا کرتی تھی یا پھر رونی
اماں۔ ہم ایک ساتھ ایک ہی تھالی میں کھایا کرتے
تھے۔ میری ماں جب بھی مچھلی پکاتی تھی تب سب سے
نظریں بچا کر ہمیں مکان کی سب سے اوپر والی منزل
میں ہمیں اپنے ہاتھوں سے مچھلی کھلاتی تھی۔ ایسے ہی رونی
اماں کیا کرتی تھی۔ جب کبھی اس کے گھر [illegible]

کیونکہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے کچن میں کھانا نہیں کھایا کرتے تھے مگر ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرنے کا اظہار ہوا کرتا تھا۔ نفرت کا دکھاوا نہیں۔ اس لئے جب ہمیں زونی اماں نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو وہ مسکرا کر بولتیں۔ بچے ہیں کھانے دو۔ اور جب کبھی میری ماں نے ہمیں دیکھ لیا تو کھڑکی بند کر کے زونی سے کہہ دیتیں۔ وہ دیکھو وہ موتی پنڈتانی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے۔ بچوں کو ساتھ ساتھ کھاتے پیتے دیکھ لیا تو سمجھو کل مندر میں آرتی بعد میں ہوگی اور اس بات کا چرچہ پہلے۔ جب یہ بات میرے پتا جی نے سن لی تب ہمیں پتہ چلا کہ جب وہ اوڑی کے کسی دور دراز پسماندہ علاقے میں اسکول ماسٹر تھے اور اورنگ زیب کے ابا جنگلات میں فارسٹر تھے تب دونوں ساتھ رہتے تھے۔ ساتھ کھاتے پیتے تھے بلکہ ایک دوسرے کے کپڑے پہنا کرتے تھے۔ وہیں دونوں نے ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں بہت جانکاری حاصل کی تھی اس لئے وہ ہر مذہب کو پیار و محبت بڑھانے کا ایک بہت ہی خوب صورت عمل سمجھ رہے تھے۔ اب جبکہ گھروں کی دیواریں ایک دوسرے سے لپٹی ہوں اور دل بھی دل سے جڑا ہو تو مہاتما گاندھی کو کشمیر میں روشنی کی کرن کیوں نہ نظر آتی۔ ان دنوں ہم کتنے خوش ہوا کرتے تھے۔

ہم کیوں موتی پنڈتانی اور محلے سے مولوی صاحب کے علاوہ سبھی خوش ہوا کرتے تھے اور ان خوشیوں کا اظہار اس پکے گھاٹ پر ہوا کرتا تھا کس کی شادی کب اور کہاں ہو رہی ہے۔ تپ دق کے مریض غلام رسول کا کیا حال ہے۔ گوپی ناتھ کی بیٹی کو کل شام کس نے چھیڑنے کی جرات کی ہے۔ سلیمہ کو آخر سلیمان کیوں طلاق دے رہا ہے۔ راشن میں دیئے گئے چاول کیوں بدبودار ہیں۔ ہر مسئلے پر جب بحث ہوتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے گھاٹ کی بڑی بڑی اور چھوٹی چھوٹی پتھر کی بنی ہوئی سیڑھیاں ہمارے اپنے لوگ نہیں بلکہ اسمبلی میں بیٹھے ممبران ہیں۔ ہاں ایک مسئلہ وہ بھی تھا جو تقریباً سبھی کو پریشان کرنے کی بجائے تفریح کا سامان پیدا کرتا تھا۔ یعنی قصہ لاٹ صاحب کا۔

لاٹ صاحب کا نام سنتے ہی پہلے ہنسی آتی ہے پھر یہ بتانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ چوہا ہے جو کسی مہمان کے بستر بند میں چھپ کر اورنگ زیب کے گھر میں گھس گیا تھا اور روز ان کو تنگ کیا کرتا تھا۔ پہلے کپڑے کترتا تھا لیکن بعد میں دروازے کترتا رہا۔ تنگ آکر زونی اماں نے ہم سے چوہوں کا پکڑنے والا پھندہ منگوایا۔ سکیم کامیاب رہی اور دوسرے دن یہ باہر سے آیا ہوا چوہا پکڑا گیا۔

کشمیری عام طور پر کسی کو بھی جان سے مار نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سوچ سمجھ و عمل پر صوفی سنتوں کا اثر ہے اس لئے عام طور پر چوہے کو پھندے سے آزاد کر کے دریا میں ڈالا جاتا ہے۔ چوہا کبھی ادھر کبھی ادھر تیرتا رہتا ہے۔ آسمان میں اڑ رہی چیل چوہے کو دیکھ لیتی ہے اور اس کو اپنے پنجوں میں اٹھا کر

جاتی ہے۔ یوں یہ بھی ایک دردناک منظر ہوتا ہے
۔ چوہے کی گھر میں کی گئی تباہی دیکھ کر چوہے پر ترس
آتا۔ لیکن نہ جانے کیوں میں اور اورنگ زیب
ہے کی بے بسی کا منظر دیکھ نہیں پاتے تھے۔ اس
ہم تیر کر چوہے کو پکڑ کر کنارے پر چھوڑ دیتے۔
یوں چوہا جسے کو بار بار پکڑ کر ہم بچاتے تھے پھر
نی اماں کے گھر میں گھس جاتا تھا پھر ایک دن جب
دروازوں کو کتر کتر کر ایک گھر سے دوسرے
ے بلکہ ہمارے گھر میں گھسنے کا راستہ بنانے
میاب ہوا تو گھاٹ پر موجود لوگوں نے یہ
لہ کیا کہ اب جب لاٹ صاحب پھندے میں
س جائے گا اس کو پھندے کے اندر ہی مار دیا جائے۔
لیکن چوہے کو مارے گا کون ۔؟ وہاں موجود
میں ایک بھی ایسا نہیں ملا جو چھری اٹھا سکے۔
تو ہونا ہی تھا کیوں کہ کشمیری مرغا کھا تو لیتے ہیں
ن کاٹ کر دے۔

لیکن اگر ہم نے یعنی میں نے اور اورنگ زیب
ٹ صاحب کو بچایا نہ ہوتا تو شاید ہم اپنے گھروں
سکتے جو فقط اس چوہے کی وجہ سے اندر ہی اندر
لے ہو کر کمزور ہو گئے مطلب یہ کہ اس موٹے
نے گھر کے چوہوں کو بھگا دیا اور ہمارے گھروں
میان کئی سرنگیں بنانے میں کامیاب ہوا۔
اور پھر سرنگیں ہی دونوں گھروں کے درمیان
یں بن گئیں۔ اور ایک دوسرے پر الزامات کا
تب شروع ہوا جب میری ماں کی انگوٹھی زونی
کے گھر میں مل گئی۔

تب تک چوہا اتنا موٹا ہو چکا تھا کہ پھر پھندہ
چھوٹا ہونے لگا۔

پھر جانے کیا ہوا۔ حالانکہ ان حادثات سے
ہماری دوستی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا پھر بھی گھر
والوں کے ڈر کی وجہ سے دور دور رہنے لگے۔ مگر پھر بھی
دل کے پاس تھے۔ زونی اماں کی وجہ سے شاید حالات
معمول پر آجاتے۔ دراریں پر ہو جاتیں اور پھر بہاریں
آجاتیں مگر اچانک چار سو دھند چھا گئی۔ اور ہم
یوں بچھڑ گئے کہ پھر سے ملنا ایک ارمان بن کر رہ گیا۔
اس دن ہم اسکول سے لوٹ رہے تھے۔ اچانک
سڑک پر بندوق لئے سپاہیوں کو دیکھ کر ہم ڈر گئے
لیکن منہ سے بے ساختہ نکلا۔

حملہ آور خبردار ۔۔ مقابلے کے لئے ہم کشمیری تیار
شیر کشمیر کا کیا ارشاد۔ ہندو مسلم سکھ اتحاد
ہمیں کب اور کس نے وہاں سے اٹھا کر اپنے گھروں میں
لایا تھا یہ ہمیں معلوم نہیں۔ شہر میں اچانک کیا ہوا تھا
ہمیں کیا معلوم تھا۔ پھر سے قبائلی حملہ آور کیسے
گھس بیٹھے ہمیں یہ بھی تو معلوم نہیں تھا۔ کس کی حکومت
تھی اور کون حکمران ہے یہ بھی ہمیں کیسے معلوم ہوتا۔ اب
شیر شیروانی پر ہمیں ڈرامہ نہیں کھیلنا ہے یہ بھی اسکول
کے بچوں کو تب پتہ چلتا جب ماسٹر جی بتا دیتے
ہمارا دوست کون ہے اور دشمن کون یہ یا تو پتا جی
بتا دیتے یا اورنگ زیب کے ابا۔ مگر وہ اس
بات پر الجھ گئے تھے کہ اسکول سے نکلتے ہی میں
نے غلط نعرے لگا کر فوجیوں کو اکسایا تھا۔
حقیقت یہ تھی کہ ہمیں جو اسکول میں پڑھایا گیا

تھے ہم نے نوجیبوں کو تباہی کی حد تک اور سمجھ کر دبی کہا تھا
اس کے بعد ہم کبھی ایک ساتھ اسکول گئے اور نہ ساتھ
کھیلے۔ نہ ماں کے ہاتھوں پکی مچھلی کھائی اور نہ زونی
اماں کا پکایا ہوا لذیذ گوشت کھایا۔ پھر اورنگ زیب
مجھے جب بھی اور جہاں بھی دیکھا ایک الگ قطار میں کھڑا
پایا۔ میں سمجھا تھا کہ مکان فروخت کرکے ہماری کہانی
ختم ہو چکی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

آج بھی شہر میں کرفیو ہے اور نہ میں گھر جا
سکتا ہوں۔ اور نہ اورنگ زیب۔ اس لئے وہ بھی یہاں
اس تحقیقاتی کمیشن کے بہت بڑے مکان کے لمبے برآمدے
کے ایک کونے میں کھڑا ہوں اور دوسرے کونے میں اورنگ
زیب میری نظروں میں رہا جب کہ میں جیبوں میں رہا۔ میں ملاپ
نہ چاہ سکتا تھا۔ اور نہ ہی ہم میں کسی نے پہل کی تھی۔

وہ ان لوگوں کی زبان بول رہا تھا جو بقول
اس کے اپنے ہیں اور میں بھی اپنی سلامتی کے لئے اپنے
لوگوں کی زبان بول رہا ہوں۔ لیکن اس وقت
نہ وہ کچھ بول رہا ہے اور نہ میں۔ کیوں کہ نہ میرے
لوگ میرے ساتھ ہیں اور نہ اس کے لوگ اس
کے ساتھ ہیں۔ دیکھا جائے تو ہمیں کبھی یہاں کسی نے
نہیں بلایا ہے۔ ہمارا یہاں آنا ہماری اکثریت کا
ایک حصہ ہے۔ بچوں کا امتحان ہو داخلے کے لئے
انٹرویو ہو یا کسی تحقیقاتی کمیشن میں پوچھ تاچھ
باپ سمجھتا ہے کہ اگر میں ساتھ نا جاؤں غضب
ہو جائے گا میرا بیٹا اور اورنگ زیب کا بیٹا دونوں
سے پوچھ تاچھ ہو چکی ہے۔ اب فقط فیصلہ ہونا
باقی ہے۔ دونوں کو قتل کئے ہوئے بم بلاسٹ میں طرح

کرنے کے الزام میں تب گرفتار کیا گیا ہے جب وہ بھاگنے
کی کوشش کر رہے تھے۔ حالانکہ شک اور یقین کے
درمیان کا اذیت ناک راستہ دونوں ہی طے کر چکے
ہیں اور اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دونوں میڈیکل کالج
میں داخلہ لینے کے لئے بنگلور جانے والے تھے۔ ان کو معلوم
نہیں کیا جا رہا ہے۔ وہ بھی اس لئے کہ دھماکے میں شدید
زخمی ہونے والا ایک اور بد نصیب دم توڑ چکا ہے۔

یہ سنتے ہی اورنگ زیب یوں بڑبڑانے لگا گویا
مجھے اپنی اس ہونے والی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرا رہا ہو۔ میں
نے قریب جا کر پوچھا۔

تم نے کیا کہا میں نے سنا نہیں

وہ بوکھلا کر بولا۔

مرنے والا مسلمان ہے تو میں جانتا ہوں تب
یہ کہا جائے گا کہ وہ میرے بیٹے کا ساتھی تھا۔

اور اگر وہ ہندو ہو تو؟ میں نے غصے سے پوچھا

کہا جائے گا وہی میرے بیٹے کا ٹارگیٹ تھا۔

اورنگ زیب مجھے قہر آلودہ نگاہوں سے
دیکھ کر بولنے لگا۔ پھر ہندوؤں کے خلاف زہریلی باتیں
کرتا رہا اور اپنے اس موقف کو ثابت کرنے کی
کوشش کرتا رہا کہ مسلمان ہندوستان میں محفوظ نہیں
اور پھر دنیا بھر میں اپنی آواز اٹھانے کی جوشیلی باتیں
کرتا رہا۔

میں سمجھ گیا وہ یہ سب کیوں کہہ رہا ہے ہمارے
بچوں سے افسران نے ایک فارم بھروا لیا تھا۔ اس فارم
پر ہمارے بھی دستخط بطور گواہ اور سیکورٹی کے لئے
گئے تھے چونکہ ہر نقطے کا جواب وضاحت سے مانگا

اس لئے میرے بیٹے نے یہ لکھا تھا

- میں کشمیری ہوں کیونکہ میری جڑیں یہاں کے پانی اور زمین میں ہیں
- میں ہندو ہوں کیونکہ میرے والدین ہندو ہیں
- میں ایک ہندوستانی ہوں کیونکہ میں ایک ہندو ہوں۔

اچانک میرا ماتھا ٹھنکا اور اپنے آپ کو [illegible] ستا رہا۔ ہندو نہیں ہندوستانی لکھنا چاہئے تھا [illegible] پشیمان ہو کر میں نے بات جب اورنگ زیب کو [illegible] ادی تو وہ گرج کر بولا۔

رہنے بھی دو یہ مکاری۔ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ تم نے یہ جان بوجھ کر اپنے ہندوستانی کو ہندوؤں [illegible] ملک بتا کر مسلمان کو غیر ہونے کا ثبوت دیا ہے تم فرقہ پرست ہو!

تمہارے خون میں یہ کیڑے ہیں!

وہ بہت کچھ کہہ گیا۔ تب میں نے جذبات میں بہہ کر کہہ دیا۔

اورنگ زیب جب قبائلیوں نے کشمیر پر حملہ کیا تب سینکڑوں ہندو و سکھ عورتوں نے اپنی عزت [illegible] نے کے لئے مظفرآباد اور میرپور کے آس پاس کرشن [illegible] میں کود کر جان دی تھی۔ ان بدنصیب عورتوں میں ہمارے ابا جان کے افسر پران ناتھ سیٹھی کی بہن [illegible] ناسیٹھی تھی۔ تم انہی کے بیٹے ہو۔ ہندو کی اولاد

اورنگ زیب پر گویا بجلی گر گئی۔ وہ شاید کچھ [illegible] تھا۔ اپنے بزرگوں کے بارے میں۔ اپنی [illegible] کردگی کے بارے میں۔ اپنے جذبات کے بارے میں۔ حکومت کے بارے میں۔ مہربان افسر اعلیٰ ہمارے بیٹوں کو ہمارے حوالے کرتے ہوئے بولا کہ یہ دھماکہ بھی پاکستانی گھس بیٹھیوں نے کیا تھا۔ اسی دوران جب پاکستان کے [illegible] نے اورنگ زیب کے بیٹے کو پولیس کی فائرنگ میں مارے جانے کی خبر دی تو بیک وقت دو بجلیاں گر گئیں۔ ایک مجھ پر یہ جان کر کہ اورنگ زیب بھی گمراہ لوگوں کے ہجوم میں موجود ہے۔ دوسری اورنگ زیب پر یہ جان کر کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو بس دیکھتے ہی رہے اور گزرے ہوئے پچاس سالوں کی یادوں کو تازہ کرتے رہے جب ڈاکٹر صاحب [illegible] جیسے [illegible] معلوم ہوا کہ جب سے سارا شہر جل کر کھنڈر بن گیا تب سے [illegible] اور جس [illegible] محلے والے کبھی [illegible] سکتے تھے یا اپنے سکھ دکھ کی باتیں کیا کرتے تھے یا بچے کھیلا کرتے تھے وہاں پولیس کا [illegible] پھر جانے کیوں ہم دونوں رو پڑے۔ ان دو بچوں کی طرح جو ایک دوسرے سے بچھڑ کر پھر سے مل گئے تھے۔

اور رات پھر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر یہی کہتے رہے۔ یہ سوچ کر [illegible] جانتے۔ نہ جھوٹ تھا۔ نہ سچ تھا۔ سچ!

خط و کتابت کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریں

سید نفیس احمد سنبھلی
سنبھل، مرادآباد

تباہی

جب تاریکی نے دن کے جھروکوں سے باہر آنا شروع کیا تو اس نے دوکان کے اندرونی حصے میں پھیلے تھانوں کو جلدی جلدی تہہ کیا۔ وہ ابھی تہہ کر ہی رہا تھا کہ نہ جانے کیا سوچ کر بے اختیار رو دیا۔ پھر کچھ فاصلے پر بیٹھے اپنے وفادار نوکر کو بھرائی ہوئی آواز میں پاس بلایا اور دوکان کی تالیاں اسے دیکر سڑک پار اپنے گھر آیا اس کا گھر قدیم وضع کا ایک بڑا مکان تھا۔ جس کے صدر دروازے کے پاس ایک بیٹھک بنی تھی۔ مکان کے اندرونی حصے میں بڑے بڑے چار کمرے ان کے آگے ایک برآمدہ پھر کافی بڑا آنگن تھا۔ بیٹھک کی پچھلی دیوار میں ایک کھڑکی کھلی تھی۔ جو بیٹھک میں بیٹھے مہمانوں کی مہمان نوازی کرنے میں معاون ثابت ہوتی۔ برآمدے کے بائیں جانب کچن بنا تھا۔ باتھ روم دروازے کے نزدیک تھا۔ جب وہ برآمدے میں چارپائی پر آ بیٹھا تو تنہائی نے اس کا منہ چڑانا شروع کیا اور وہ گھر سے نکل کر چل دیا۔

بات دراصل یہ تھی۔ سلیم کانپور کا ایک بزاز تھا۔ اس کی دوکان [illegible] کالج کے نزدیک تھی۔ الہ آباد کے منور علی کی لڑکی شاہدہ سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ شادی کے آٹھ سال بعد بھی جب شاہدہ کسی بچے کی ماں نہ بن سکی تو سلیم کو بہت فکر ہوا۔ اس نے مولویوں اور ڈاکٹروں میں چکر لگانے شروع کر دیئے۔ جس کے نتیجے میں خدا نے اسے خوبصورت چاند جیسا بیٹا عطا کیا۔ اس کا نام نعیم رکھا۔ خوب جشن منائے گئے۔ عقیقہ کی تقریب میں کافی لوگوں کو کھانا کھلایا۔ خود رات کو ایک دوست کے ہمراہ بیٹھک میں بیٹھ کر شراب پی۔ شاہدہ کو اس کی اس گندی حرکت کا علم ہوا تو اس نے سمجھایا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دو سال بعد خدا نے ایک لڑکی اور دیدی۔ اس کا نام زاہدہ رکھا۔ سلیم کا پریوار چار جانوں پر مشتمل ہو گیا تھا۔ دونوں بچے والدین کے زیر سایہ پرورش پانے جب بڑے ہوئے تو دونوں کا قریب کے اسکول میں ایڈمیشن کرادیا۔ شاہدہ نے سلیم کو سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے ہرگز شراب نہ چھوڑی۔ وہ روز رات کو اپنے بیوی بچوں کے سامنے شراب پیتا۔

دونوں بچوں نے آٹھویں جماعت کا امتحان
امتیازی حیثیت میں پاس کیا تو سلیم نے نعیم کا داخلہ
کالج اور زاہدہ کا گرلز کالج میں کرا دیا۔ دونوں
بھائی بہن ایک دوسرے سے اچھے نمبر لانے کی کوشش
کرتے۔ نعیم بیٹھک میں اکیلا پڑھتا اور خالی اوقات
دوکان پر بھی جا بیٹھتا۔ زاہدہ گھر میں ہی پڑھتی اور
گھریلو کاموں میں اپنی والدہ کو مدد دیتی۔ نویں جماعت
کے ششماہی امتحان میں دونوں نمایاں نمبروں سے کامیاب
ہوئے۔ رات کو نعیم کے پاس اس کے ہم جماعت لڑکے
بھی آنے لگے تھے۔ ایک شب شاہدہ نے کھڑکی کے جھروکوں
سے نعیم کو بیٹھک میں لڑکوں کے درمیان واہی تباہی
باتیں کرتے سنا تو اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے نعیم
کو خوب ڈانٹ لگائی۔ بیٹھک سے کتابیں، بستر سب
اٹھا کر گھر میں رکھ لیا اور گھر میں ہی پڑھنے کا حکم دیا۔
اس کی برہمی کا سبب بنا۔ اس نے صبح کو ناشتہ
نہیں کیا اور نہ دوپہر کا کھانا کھایا۔ سلیم نے اس کی
ہمدردی میں شاہدہ سے لڑائی لڑی، کتابیں اور بستر
پھر بیٹھک میں ہی رکھوا دیا۔ اسے منا کر کھانا کھلایا۔
سلیم کے اس رویہ سے اس کی ذلیل حرکتوں کو پروان
چڑھنے کا موقع ملا۔ جن کو دیکھ کر شاہدہ ہر وقت
کڑھتی۔ آخرکار وہ دل کی مریض بن گئی۔ ایک شب
شاہدہ نے اسے بیٹھک میں شراب پیتے دیکھا تو اپنا
سر پیٹ لیا۔ صبح کو اسے دل کا زبردست دورہ پڑا اور
اللہ کو پیاری ہو گئی۔ لیکن نعیم کی حرکتوں میں پھر بھی
کمی نہ آئی۔ زاہدہ گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ نعیم
اپنے یار دوستوں کو بھی گھر میں لانے لگا۔ اس کے
اس کی حرکتوں سے زاہدہ ناخوش تھی۔ اس لئے ایک دن سلیم
سے شکایت کی تو اس نے تیوری چڑھا کر بہن سے سخت
لہجے میں کہا۔

"ڈائن تجھے شرم نہیں آتی۔ اکلوتے بڑے بھیا
کی شکایت کرتی ہے۔ آئندہ اس کی شکایت کی تو
بہت......"

زاہدہ اپنا منہ لے کر رہ گئی اور والدہ کو یاد کر کے
بہت روئی۔ کچھ دنوں بعد سلیم اپنے کاروبار کے سلسلہ میں
دہلی گیا۔ جب وہ دوسرے دن صبح کو واپس آیا تو اس
نے دیکھا گھر میں زاہدہ نہیں ہے۔ پریشان ہو کر وہ اس کی
تلاش کرنے لگا لیکن اس کا کہیں کوئی پتہ نہ چلا۔ اس
کی تلاش کرتے کرتے وہ بیٹھک میں کھڑکی سے داخل ہوا
اس نے اپنے لاڈلے کی لاش کو خون سے لت پت پایا۔
چیخ مار کر اس سے لپٹ گیا۔ بعد نماز عصر نعیم کو شاہدہ
کی برابر میں دفن کر دیا۔ پھر زاہدہ کی تلاش میں جگہ جگہ [illegible]
کھاتا پھرا۔ لیکن پھر بھی اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ہار کر
بیٹھ گیا۔ جو گھر پانچ ماہ پہلے آباد تھا ویران ہو گیا تھا۔
جس کے در و دیوار اپنے ماضی کو یاد کر کے آنسو بہا
رہے تھے۔ سلیم کبھی گھر آ کر لیٹ جاتا تو بیوی بچوں
کی یاد اسے ایک پل چین نہ دیتی۔ مجبور ہو کر گھر سے نکل
جاتا۔ اور طوائف میں جا کر دل بہلاتا۔ اس نے اپنی مدد
کے لئے دوکان پر ایک نوکر رکھ لیا تھا۔ مگر نعیم کی
یاد آتے ہی وہ زار زار رونے لگتا۔

سلیم کی شراب نوشی میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ
ساری ساری رات شراب کے نشے میں دھت طوائف
خانوں میں پڑا رہتا۔ اس کا گورا رنگ جل کر سیاہ

ہوگیا۔ جسم کی جوڑی جوڑی سبھی ہڈیاں سوکھ گئیں۔ اس کے جسم میں قوت دم توڑ چکی تھی۔ اجل کے فرشتے ہر وقت اس کے گرد حکم خداوندی کے منتظر رہتے۔ مگر ابھی بھی عیاشیوں میں ذرا کمی واقع نہ ہوئی۔ روز افزوں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ وہ بنارس، دہلی، احمد آباد وغیرہ شہروں میں بھی عیاشی کرنے جانے لگا تھا۔

ایک دفعہ سلیم کو آگرے میں کسی کم عمر طوائف کی خوبصورتی کا علم ہوا تو وہ بے چین ہوگیا۔ اس نے خاصی رقم بریف کیس میں رکھی اور آگرے پہنچا۔ شام کو جب وہ طوائف خانے میں داخل ہوا تو برآمدے میں بیٹھے حبشیوں نے اس کے کمزور جسم کو دیکھ کر قہقہے لگائے۔ مگر اس کے مردہ ضمیر پر ان قہقہوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ان کے درمیان سے ہوتا ہوا سامنے چوکی پر بیٹھی منو بائی کے پاس آیا جو اپنے آگے پاندان رکھے چھالیاں کاٹ رہی تھی۔ اس نے چوکی سے اٹھ کر مسکراتے ہوئے سلیم کا استقبال کیا۔ پھر اپنے نزدیک بیٹھاتے ہوئے شائستہ انداز میں بولی۔

"میاں جی! کہاں سے آئے؟"

"کانپور سے۔"

"شکریہ، آپ کے تشریف لانے کا۔ میرے قابل جو خدمت ہو حکم کیجئے۔" (اس کے لہجے میں عجیب سا طنز تھا)

"منو بھائی! تمہارے پاس کوئی ذکو بی ہے۔ اس کی تعریف کھینچ لائی ہے۔"

"میاں جی! پرانے شوقین معلوم ہوتے ہو۔" (اس نے مسکرا کر کہا)

اوہ [illegible] عمر گذری یہاں دشت کی سیاحی میں۔"

"میاں جی! ذکو آگے والے کمرے میں مجرا کر رہی ہے چلو جاؤ۔۔۔ لیکن کنجوسی مت کرنا۔"

"کیسی بات کرتی ہو، منو بائی!"

سلیم اس کمرے میں داخل ہوا جس میں ذکو رقص کر رہی تھی۔ اس نے دیکھا محفل شباب پر ہے۔ پائلوں کی جھنکار، ڈھولک کی کھنک، طبلے کی تال سے محفل کے سبھی خوش مزاج جھوم رہے تھے۔ انہیں کے درمیان وہ بھی بیٹھ گیا تھا۔ سب کے آگے۔ جام بھرے رکھے تھے، کبھی کبھی جاموں کے کھنکنے کی آواز بھی سنائی دیتی۔۔۔ خوش مزاج نقاب پوش رقاصہ ذکو پر نوٹوں کی اور پھولوں کے گجروں کی بارش کر رہے تھے۔ نوٹوں کی بارش کرنے والوں میں سلیم سب سے آگے تھا۔ جب محفل برخاست ہونے لگی تو سلیم نے شراب کا ایک پیگ اپنے گلے میں انڈیلتے ہوئے ذکو سے ایک غزل اور گانے کی فرمائش کی۔ جو اس نے قبول کر لی۔ ذکو نے درد بھری غزل گانی شروع کی۔

حال دل تم کو سناؤں تو سناؤں کیسے
راز کی بات ہے یہ راز بتاؤں کیسے
اک قیامت ہے شب ہجر بھی تنہائی بھی
دل پہ یہ بار اٹھاؤں تو اٹھاؤں کیسے
اب تو آنکھوں میں بھی آتا نہیں سیلاب کوئی
اشک پلکوں پہ سجاؤں تو سجاؤں کیسے
بوجھ [illegible] پہ احساس جدائی لیکن
دل پہ آجائے تو یہ بار اٹھاؤں کیسے

جبشم پرنم دل بیتاب پژمردہ چہرہ
حرف تحریر کا بھر بار اٹھاؤں کیسے

ختم ہوئی تو ذکو بہت روئی وہ روتے روتے بے ہوشی
ہونے لگی تو منو بائی کے لوگوں نے اسے فوراً اس کے کمرے
پہنچا دیا۔ سلیم اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت متاثر ہوا
س نے ذکو کی زبانی اس کے حالات جاننے کا مصمم ارادہ
۔ اس نے منو بائی سے ذکو کے ہمراہ ایک شب گزارنے
ت کی تو اس نے ذرا مٹکتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کے
بتر بھرے انداز میں اس سے کہا۔

" ایسا ہے۔ میاں جی! وہ تو ابھی نئی ہے۔ نتھ بھی نہ
ی ہے۔ تمہارے مقدر میں یہ شبھ گھڑی ہے تو پہلے نوٹ
ی کے رکھو۔"

منو بائی! معلوم ہوتا ہے شاید کسی مرد سے
طہ نہیں پڑا۔ لو سنبھالو۔"

(اس نے دس دس کے نوٹوں کی دو گڈیاں اس
منے ڈالتے ہوئے کہا)

" میاں جی! یہاں مرد آتے ہی کب ہیں۔"
ا نے گڈیاں اٹھاتے ہوئے طوطے کی سی آنکھ بدلتے ہوئے

" اور"

" یہاں تو مردار گوشت کے ٹکڑے کو بھنبھوڑنے
......"

" اس کا مطلب یہ ہوا ہم کتے ہیں۔" اس نے
سے کہا۔

" میاں جی! یہ فیصلہ اپنے گھر جا کر کیجئو۔ اب
ساری رات کے لئے تم [illegible] ہو۔ کونے والے کمرے میں

جاؤ۔ میں اسے وہیں لاتی ہوں۔" (اس نے انگلی کا اشارہ
کرتے ہوئے کہا)

سلیم کمرے میں چلا گیا وہ بیڈ پر بیٹھا سگریٹ
پی رہا تھا۔ ذکو کمرے میں نقاب لگائے لرزتی، کانپتی داخل
ہوئی۔ اس کا پھول جیسا چہرہ زرد تھا۔ منو بائی اسے کمرے
میں چھوڑ کر آگے سے کواڑ بند کر کے چلی گئی تھی۔ وہ اب ساری
رات کے لئے اس کی تھی۔ سلیم نے اسے اپنی حیوانیت
دکھانے میں قطعاً جلدی نہ کی۔ دونوں بیڈ پر بیٹھ گئے
درمیان میں شراب کی بوتل تھی۔ اس نے بوتل سے ایک
گھونٹ پیتے ہوئے ایک لمبی سانس لے کر ذکو سے
شرابی انداز میں کہا۔

" کہاں کی ہو، میری جان؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا تو سلیم نے دوسرا سوال
کیا۔

" یہاں کیسے آئی ہو؟"

" تمہاری وجہ سے۔" (وہ چونک گیا جیسے کسی نے اس
کے منہ پر زور دار تھپڑ مار دیا ہو۔)

" کیا مطلب؟"

اگر تم شراب نوشی نہ کرتے تو ہم برباد نہ ہوتے۔ مجھے
بھیا کے دوست نے یہاں لا کر بیچ دیا تھا اور آج تک آسمان
دیکھنے کو نہ ملا۔

سلیم پر سکتہ طاری تھا۔ اس کا نشہ ہرن ہو
گیا تھا۔ وہ نیچے کو گردن کئے نہ جانے کیا سوچنے لگا۔ شاید
وہ زمین کے پھٹ جانے کا منتظر تھا تاکہ وہ اس میں سما جائے
اس کا سر چکرانے لگا۔ اسے اپنے گرد ہر شے گردش کرتی دکھائی دینے
لگی۔ اس کے جسم کا ہر عضو لرزاں تھا جیسے وہ قہر خداوندی [illegible]

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے)

کتاب کا نام :- **ڈھانچہ**
افسانہ نگار :- محمود شاہد
صفحات :- ۱۲۴
قیمت :- ۶۰ ساٹھ روپیے
پتہ :- ۱۶۸/۱۲ ایم۔ آر۔ سٹریٹ کڑپہ اے پی
پن :- ۵۱۶۰۰۱

سادہ و پرکار سرورق، دلکش کتابت کے ساتھ بہترین انداز میں آفسیٹ پر شائع شدہ پندرہ افسانوں کا یہ مجموعہ نقش اول کا حسن رکھتا ہے۔ افسانوں کے عنوانات جدید ڈکشن میں لکھی ہوئی نظموں کی سی چاشنی رکھتے ہیں جیسے نیم کے پیڑ سے برآمد شدہ شہد، شکستہ قوس، غبار کائنات میں گم اک وجود، ہوا پر بیٹھا بہار تھی ۔۔۔ اور ۔ دیوار سے جھانکتی سرخ آنکھ وغیرہ

ان کہانیوں کا اسلوب جدید ہے۔ ان میں الجھے ہوئے شکایت آفاقی سچائی کا مظہر ہیں۔ ان کہانیوں میں روایتی اسلوب کے معتقدین کے لئے ماجرا بھی موجود ہے اور جدید افسانہ نگاروں کی تسکین کے لئے بے ماجرائیت بھی پائی جاتی ہے۔ کلاسیکی ذوق رکھنے والوں کو ان افسانوں میں سہل ممتنع کا سا لطف بھی ملتا ہے۔ اگر یہ عیب نہیں ہے تو اس کتاب میں ہر مذاق کے آدمی کی تسکین کا سامان ہے۔

مصنف کا یہ پہلا مجموعہ بغیر کسی تمہید کے شروع ہو جاتا ہے۔ نام نہاد نقادوں سے توصیفی اسناد حاصل کر کے کتاب میں ٹانکنا تو در کنار، افسانہ نگار نے پیش لفظ کا تکلف بھی نہیں برتا۔ حتیٰ کہ قاری کو افسانہ نگار کو ڈھونڈنے کے لئے بین السطور پر مدار کرنا پڑتا ہے۔ بعض فنکار تو یہاں بھی دامن بچائے رکھنا چاہتے ہیں مگر فن اور فنکار کے درمیان کیسا پردہ۔ فن کے دوسرے سرے پر فن کار بہر حال ہوتا ہی ہے۔ اس کی فکر کا آئینہ اگر اس کا فن نہ ہو تو پھر اس سے بڑا دھوکا اور کیا ہوگا کہ آدمی سوچتا کچھ ہو بولتا کچھ ہو۔ البتہ علامات و استعارات کے ذریعہ ابہام سے جہاں کہانیوں کا حسن بڑھ جاتا ہے۔ فن کار کے چہرے پر نقاب کی تہہ گہری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ "نیم کے پیڑ سے برآمد شدہ شہد" کی آخری سطور:

لوگوں میں تمہارے لئے ایک ایسا شور ہے

لانا ہوں جسے پی کر تمہارے سینوں میں صدیوں سے بھڑکتی ہوئی آگ کے خوفناک شعلے سرد پڑ جائیں گے تمہاری رگوں میں دوڑتا ہوا تیزاب شہد میں تبدیل ہو جائے گا۔"

پڑھتے ہوئے مولانا الطاف حسین حالی یاد آتے ہیں جنہوں نے ایسے ہی شفا اللناس مشروب کو حرا کی پہاڑیوں سے اترا ہوا نسخۂ کیمیا بتایا تھا۔

"سمندر کا قتل" دراصل انسانی زندگی میں نمک کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے بحری بیڑوں کی خون آشام کارروائیوں پر طنز ہے جو سمندر کو نمک بنانے کے قابل نہیں چھوڑتے اور انسانی زندگی بے نمک ہو کر رہ جاتی ہے۔

"ڈھانچہ" انسان کی بنیادی سچائی کی تلاش میں کھدائیوں کے تسلسل اور بے نتیجہ جد و جہد مگر پر امید کاوشوں کی ترغیب پر مشتمل ہے۔

اس مجموعے کی "بنت الغزل" جیسا حسن رکھنے والا افسانہ "شکستہ قوس" ہے با معنی علامات و دلچسپ کلائمکس کے ساتھ بالکل او ہنری O HENRY کے اسلوب میں لکھی ہوئی یا جرا کہانی میں ایک خاتون کی جمالیات و نفسیات پیش کیا گیا ہے۔ مکان کی زیبائش و آرائش جزئیات پر بڑی گہری نظر رکھنے والی اور ذرا سی کجی اور بدصورتی کو برداشت نہ کرنے والی بے انتہا دولت مند خاتون کی ذاتی زندگی سے نقاب اٹھتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کا مالدار شوہر تو نہایت بدصورت شخص ہے۔

"ہوا پر بیٹھا ہوا مہارشی" ریاکاریوں کے تابوت میں ٹھونکی ہوئی کیل ہے اور توہم پرست معصوم عوام کی سادہ لوحی کی تصویر بھی۔

"ماحول" ایک علامتی کہانی ہے۔ مصنف نے بڑے سلیقے سے اک بے روح ماحول کی عکاسی کی ہے ــــ اس تبدیلی و تغیر کے پس منظر میں ایک بات قابل غور تھی اور وہ یہ کہ موجودہ نسل کی اولادیں جسمانی اعتبار سے ژولیدگی کا شکار پیدا ہونے لگیں اور وہ درخت جو اس سرزمین کے واحد درخت تھے اور جن کی شاخوں پر انتہائی شدید گرمی میں ثمر نشو و نما پاتے تھے غیر محسوس طور پر نابود ہوتے چلے گئے۔

"جسم جسم" بھی بڑی خوبصورت کہانی ہے جو ازدواجی مسائل پر مبنی ہے

"ازل سے تا ابد" (شعری پیرائے میں ازل تا ابد لکھنا کافی ہے" سے" حشو شمار ہوتا ہے) ایک علامتی کہانی ہے جس میں اصطبل اور گھوڑے کے حوالے سے دنیا بھر کی باتیں کی گئی ہیں۔ اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ یک بارگی رخش گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے۔"

"تار عنکبوت" میں سماجی زندگی برتتے ہوئے جالوں اور ان میں پھنستے ہوئے شکار پر مکڑیوں کی علامتوں کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

"تکوین" اس مجموعے کی ایسی کہانی ہے جہاں افسانہ نگار قدرے گرفت میں آتا ہے کہ یہ کہانی بیشتر سوانحی حقائق پر مشتمل لگتی ہے۔ ایک متوسط گھر کی اونچ نیچ کی کہانی اس مجموعے

ایک کہانی "پہلی کتاب" میں ٹیچروں کی ذہنیت کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور یہ محبت سے زیادہ موہ INFATUATION پر مبنی ہے — ساتھ ہی ساتھ اساتذہ کی نفسیات پر طنز بھی ہے۔

ریاضی کے ٹیچر کو اپنے مضمون سے زیادہ انگلش میں دلچسپی تھی اور وہ کلاس میں یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے تھے کہ انہیں انگلش پر عبور حاصل ہے اور وہ انگلش ٹیچر سے بہتر انگلش پڑھانے کی اہلیت رکھتے ہیں دوسری طرف انگلش ٹیچر کو اس بات کا دعویٰ تھا کہ انہیں انگلش گرامر پر سند حاصل ہے — بعض ٹیچروں کے خیال میں ڈرائنگ ٹیچر اور کرافٹ ٹیچر مفت کی روٹیاں توڑ رہے تھے۔

یہ کہانی بھی افسانہ نگار محمود شاہد کی مشاہدانہ بصیرت کی عکاس ہے۔ بلکہ علم اور علمیت کے بارے میں ان کے احساسات کی ترجمان بھی ہے۔ کچھ لوگوں کو اس میں کہانی پن شاید کم لگے۔

رباعی کی آخری مصرعے کی طرح اس مجموعے کی آخری کہانی بھی بہت بھرپور اور بم کی طرح پھٹ پڑتی ہے۔ اکثر کہانیوں میں اختتامیہ الفاظ محمود شاہد کی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں اور وہی رباعی کے آخری مصرعے میں خیال کا لب و لباب بیان کر دینے کا حیلہ کا انہیں قاری کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ آخری کہانی "بازیافت" نسل انسانی پر آبا و اجداد کے تسلط کی کہانی ہے۔ باپ کی انگلی پکڑ کر چلنے والا لڑکا انگلی چھڑا کر بھاگ نکلنا چاہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ باپ اسے ذبح کرنے کے لئے لے جا رہا ہے۔ اس کہانی میں حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام کی زندگیوں کی معکوس صورت حال دکھا کر آج کی باغی نسل کا خاکہ کھینچا گیا ہے جو اپنے آپ کو گزشتہ پیڑھی کے جبر و استبداد کا شکار سمجھ کر سرکشی پر آمادہ ہے۔

محمود شاہد کی زبان بہت نکھری ستھری ہے۔ "ڈھانچہ" نقش اول ہے اور ظاہر ہے نقش ثانی اس سے بہتر ہی ہوگا۔

معروف خلیل

اسی عہد کی ایک کتاب

مصور سبزواری

فن اور شخصیت

مرتب:- ڈاکٹر نسیم الظفر

چند شرکاء:- شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، کرامت علی کرامت، ساجدہ زیدی، قیوم راہی، بلراج کومل، حامدی کاشمیری اور دیگر

ناشر:- ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

اردو فکشن کی تنقید

از:- ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

صفحات:- ۴۴۰ • قیمت:- ۲۵۰ روپے

انتظار حسین، ایک دبستان

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

صفحات:- ۷۰۲ • قیمت:- ۴۰۰ روپے

پتہ:- ماہنامہ سہیل، ریلوے سائڈ روڈ، گیا۔ [illegible]

شہر خیال

ماہنامہ سہیل پابندی سے مل رہا ہے۔ ایک
اص معیاری پرچہ خراب کتابت و طباعت کے
ث خوشنمائی سے محروم ہے۔ یہ ہم سب کو سوچنا
ہے کہ رسالے کی ظاہری تزئین کیسے ممکن ہو۔
تازہ شمارے میں سید احمد قادری کو
لب ایوارڈ دیئے جانے سے مسرت ہوئی کہ اعتراف فن
یہ بھی ایک شکل ہے۔ ورنہ بہت سی صلاحیتیں
پذیرائی کی وجہ سے برباد ہو جاتی ہیں۔ آپ
نثری حصہ حسب معمول ہے۔ رہی غزلیں وہ کم و
بیش سارے ہی پرچوں کا ایک سا حال ہے۔ برادرم
یم منظور کے شعری مجموعوں پر تبصرے جاندار
ر ایماندارانہ ہیں۔ حکیم منظور ہمیشہ سے ہی
بصورت اور منفرد لب و لہجہ کے شاعر ہیں۔ سادگی
ر معنی آفرینی ان کی غزلوں کا مزاج رہا ہے۔
خود سے متعلق ایک زیر اشاعت کتاب
اشتہار "سہیل" کے لئے بھیج رہا ہوں از راہ
م زیر ترتیب شمارے میں ہی شامل کر لیں۔
ے سال کی میری جانب سے آپ کو اور احباب
نیک خواہشات۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں

—— منظور سبزواری، ہریانہ

سہیل کے اکثر شمارے مجھے ملتے رہتے ہیں۔
جن کے لئے میں تہ دل سے آپ کا ممنون ہوں۔
اردو ادبی دنیا میں "سہیل" کا اپنا معیار ہے۔
اور اس میں شائع ہونے والے مضامین۔ نظمیں۔
غزلیں وغیرہ تمام معیاری ہوتے ہیں۔
بزرگوں کا کہنا ہے کہ ایک اچھا شاعر
ایک فقیر ہوتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے لئے کبھی داد
کا طالب نہیں ہوتا۔ وہ شعر کہتا ہے کیونکہ مجبور
ہے اور بنا کہے وہ نہیں پاتا۔ کوئی اس کی بات
سمجھ سکے تو اسے خوشی ہوتی ہے۔ اور اگر نہ سمجھ
پائے تو اسے اس کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ "سہیل"
کے شمارہ [illegible] جلد [illegible] کے [illegible] سے ۴۲ صفحوں
پر کچھ تلخ جملے پڑھ کر حیران ہوں کہ آج کے ادیب
ایک دوسرے کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرنا
بے جا نہیں سمجھتے۔ ایسا لگتا ہے کہ "سہیل" کے
کسی اس سے پہلے شمارے میں جناب رام پرکاش
راہی نے جناب پریم کمار اشک کے بارے میں کچھ
ایسی تنقید کی ہے جس سے شاعر کے کچھ دوست
اتنے ناراض ہوئے کہ انہوں نے رام پرکاش راہی کے
خلاف سخت سے سخت تلخ تر جملے استعمال

کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی۔ ایک دوسرے کی [illegible] میں اختلاف ہونا ممکن ہے لیکن ایسی صورت میں گالی گلوچ کا استعمال بہت ہی ناموزوں بات لگتی ہے۔ "سہیل" کا ادبی دنیا میں ایک خاص مقام ہے۔ میں آپ سے گذارش کروں گا کہ آیسی اختلاف کی صورت میں اس قسم کے ناواجب خطوط سہیل میں شائع کرنے سے گریز ہی موزوں ہوگا۔

● —— رگھوناتھ گھسی

شمارہ نمبر ۹ میں ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مضمون مدلل اور معلوماتی ہے قبلہ یقیناً داد کے مستحق ہیں۔ سید احتشام الدین صاحب کا مضمون خلیل الرحمٰن اعظمی بسکے کا دوسرا رُخ بھی پسند آیا ——
ضیاء الانجم مجھے بھول گئے ہوں گے مگر وہ مجھے یاد ہیں میری ان سے ملاقات جبلپور میں ہوئی تھی۔ اور خورشید طلب کی "نظم" کے ساتھ نشتر اکبرآبادی کا یہ شعر

آسماں پر ہے زمیں کی قیمت
گھر خلا میں کہیں تعمیر کروں

ذہن پر اپنا نقش چھوڑ گئے

ڈاکٹر ساقی مجیلی شہری، وارانسی

تازہ شمارے میں آپ کا اداریہ "نمود" بہ عنوان احتجاجی ادب / ادبی احتجاج نہایت وقیع، بروقت اور دو ٹوک ہے۔ امید ہے کہ ہم عصر قلم کاروں کو اپنی ذات کے حصار سے نکل آنے اور مشاہدات و تجربات کے حقائق کو منصۂ شہود پر لانے کی ترغیب دے گا۔

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی صاحب کا مضمون "م۔ حبیب خاں، ایک معروف مصنف" لائق تحسین ہے آج ان جیسے معدودے چند ہی لوگ نابغۂ روزگار رہ گئے ہیں جو سنجیدگی خاموشی، محنت اور لگن کے ساتھ اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت میں مصروف ہیں۔ دعا ہے کہ خدا انہیں ہمہ دم تازہ کار و حیات رکھے آمین۔

نسیم بن آسی کا افسانہ "سراب کا طلسم" ان کے گہرے مشاہدے کا غماز ہے تاہم بے سُول عجز و نگاری اور وضاحتی پیرائہ بیان نے افسانے کے حسن کو مجروح کیا ہے۔

● —— صابر رومانی، بھاگلپور

[illegible] ـ حافظ محمد عبدالرحمن جمیل سہسراوی

[illegible]

ماہنامہ سہیل گیا

فہرست

✱

- شمارہ [illegible] جلد [illegible]

[illegible]

- فی شمارہ ـ [illegible]
- زر سالانہ ---- [illegible] روپے
- [illegible] ـ [illegible] روپے

• خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ •

ماہنامہ سہیل

[illegible] گیا

فون نمبر [illegible]

ادب کا موضوع

ادب کا موضوع کیا ہونا چاہئے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر بڑی بحثیں ہوتی ہیں۔ ارباب فکر نے مذاکرے کئے ہیں۔ تقریریں کی ہیں، طویل ملاقات لکھے ہیں۔ ان تمام مباحث میں مختلف نظریات و افکار کی یلغار بھی دیکھنے میں آتی ہے۔

ایک طبقہ وہ ہے جو ادب کے موضوعات سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور سیاسی تغیرات سے اخذ کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ادب کے موضوعات ہماری اجتماعی زندگی کے وقوعوں سے سامنے آتے ہیں۔ اس کے برخلاف ایک جماعت وہ ہے جو فن کار کی ذات کو تخلیق کا منبع تصور کرتی ہے اس کا کہنا ہے کہ فن کار کے دل پر جو گزرتی ہے وہ اسی کو رقم کرتا ہے۔ اسے سماج سے ان معنوں میں کچھ لینا دینا نہیں کہ وہ اپنی جیتی گاتا ہے۔ اس طرح فن پارے کا موضوع معروضی نہیں ہوتا۔ یہ نجی جذبے اور احساس کا ترجمان ہوتا ہے۔

کچھ ارباب فکر تخلیق میں موضوع کے لئے تامل، غور و فکر اور DELIBERATION کے قائل ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جب تک فنکار فکر نہیں کرتا اور ارد گرد میں پھیلے ہوئے وقوعوں میں سے اپنی تخلیق کے لئے مناسب ترین موضوع کا انتخاب نہیں کرتا اس وقت تک کوئی فن پارہ عالم وجود میں نہیں آتا۔ گویا فن پارہ تخلیق کا SEL-ECTIVE عمل ہوتا ہے۔

اس سے ہٹ کر ایک گروہ موضوع کی SPONTANEITY کا قائل ہے۔ اس کا اصرار ہے کہ موضوع تخلیق کار کے ذہن میں از خود آتا ہے۔

ان تمام باتوں اور باہمی اختلافات کو سامنے رکھیں تو ایک بات بہرحال ثابت ہوتی ہے کہ ادب کی تخلیق کے لئے کوئی نہ کوئی موضوع کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ موضوع کہاں سے نکلے، کیسا ہو، کس حد تک اجتماعی ہو، کہاں تک نجی ہو — یہ بحثیں بعد کی ہیں۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ تخلیق کے لئے ایک موضوع ضروری ہے۔ جب اس اثبات کا یقین ہو جاتا ہے تو فن کار کا تخلیقی عمل شعوری اور لاشعوری بن جاتا ہے۔ محض الفاظ نہیں بلکہ خیالات کو سمیٹ کر فن کار کا فریضہ ہے۔

مشہود مظفر

نورالہدیٰ سید

جاذب قریشی کی شاعری، جدید شاعری

جدید اردو شاعری اور مثبت شعری قدریں
سے ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر انگیز خیالات واضح
نا ہیں۔ تاہم جاذب قریشی کی شاعری کے خصوصی
بعد ان کی شعری کاوشوں (شعری مجموعے
'پہچان' اور 'شیشے کا درخت' کی روشنی میں)
جدید شاعری کے مثبت شعری قدروں کی روشنی
نا ہے۔

ن۔ م۔ راشد کا خیال ہے کہ جب تک شاعر
یکھے گا وہ خود کو یا اپنے پڑھنے والوں کو
قید و سلاسل سے نجات نہیں دلا سکتا۔ اس
بھی سوچا جا سکتا ہے کہ خواب شاعری کے
یال کو زندگی عطا کرتا ہے۔ اور ایلیٹ
ور موسیقی گویا ہم پیوست محسوس کرتا ہے
خیال میں جدید اردو شاعری مجموعی طور پر
[illegible]
[illegible]
[illegible]

جدید شاعری کے ضمن میں یونگ کا ایک خیال یوں رقم
ہوا ہے کہ لفظ یا امیج یا شعری تصویر جب کسی معنی
کے تخم کو قبول کرتی ہے اور اپنے بطن میں رکھ لیتی ہے
تو معنی کا وہ تخم اس کے بطن میں بے شک علامت ہوتا
ہے مگر جیسے ہی وہ (لفظ، امیج یا شعری تصویر)
اس معنی کو خلق کرتی ہے اور وہ معنی جامد صورت
میں ظہور پذیر ہوتا ہے تو وہ تخلیق اپنے ایک اور مخفی
صورت کو حاصل کر [illegible] جس کی وجہ سے معنی کے امکانات
کو معدوم کر دیتی ہے۔ وزیر آغا شعر یا غزل یا نظم کے
مطالعے کے دوران اسی معنی کے امکانات کے حوالے
سے سمتیں یا تحریکات محسوس کرنے کو اہمیت دیتے ہیں
کیونکہ یہی عنصر گویا وہ ہے جو شعر یا نظم کو اپنی
حیثیت میں علامتی بنا دیتا ہے۔

مذکورہ بالا خیالات اور آرا، جدید اردو شاعری
کے حوالے سے رقم کرتے ہوئے جاذب کی شاعری سے
[illegible] ہے۔ ان کی شعری [illegible]

مسلم احمد نے لکھا ہے کہ وہ تخلیقی ارادے کے شاعر ہیں۔ قمر جمیل نے جاذب کو پرچھائیوں کا شاعر لکھا ہے اور سحر الفاظ کا خیال ہے کہ جاذب کی شاعری ایک نئے آہنگ کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ ان آراء میں جو مشابہت کی یکسانیت ملتی ہے یعنی جاذب کی شاعری کی پرخلوص تفہیم۔

جاذب قریشی کی شاعری کے مطالعے اور جدید اردو شاعری کے مزاج کی تفہیم کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جاذب قریشی کی شاعری (۱۹۷۴ء تا ۱۹۸۸ء) دراصل ہر لمحہ بدلتے ہوئے سیڈز اور پیٹرننگ شاعری ہے۔ جس میں خیال، خواب، تجربہ، خوف، چاہت اور تضادات کے تصادم سے نکلی ہوئی توانائی کے پہلے میں بولتی روحیں بھی داخل ہو گئی ہیں۔

جاذب کی شاعری کا تسلسل ۱۹۶۲ء سے قائم ہوا ہے۔ جب وہ لاہور سے کراچی آئے اور جب کراچی کی ادبی زندگی "ایک مخصوص خیال گروہ" کے قبضہ میں تھی اور اسی طرح معاشرتی زندگی دولت / نو دولت مندوں کے قبضہ میں۔ جو کچھ بھی فطرت کے ہاتھوں میں تھا اس میں سے دستیاب انہیں سمندر تھا، ریگ آلود زمین سے اڑتی ہوئی دھول تھی۔ اور ویران وسعتیں تھیں جو کہہ رہی تھیں کہ مجھے روند کر دیکھو سو جاذب قریشی نے حتی الامکان سب کچھ کیا کیونکہ وہ ایسا کر سکتا تھا۔ اس سے قبل دنیا کی حقیقی لمحوں میں زندگی کا قیمتی حصہ گزارا تھا پر لگتا ایسا تھا کہ اس کے پاس سب کچھ ہستے جیا ہارنے کے لئے تھا۔ ایک عرصہ تک سہانا کہلایا ہے۔ بس ایک حوصلہ ہے جو اس شاعر کے وجود میں، اس کے اپنے قدموں کی چاپ میں اندر ہی اندر شامل رہا ہے۔ اس دور میں جب جاذب کراچی کی ابتدائی زندگی گزار رہے تھے تو وہ وزیر آغا کے خیال کے مطابق باہر کی "دستک" اور اندر کی "چاپ" کی کیفیت سے دوچار ہونے لگے تھے۔ لیکن شروع شروع میں ان کے اندر یہ سوال پیدا ہوتا رہا تھا کہ "دستک" کیا کہتی ہے اور چاپ کس کی ہے، کیسی اور کیوں ہے؟ ان دونوں کو ایک نیوکلیس کیسے فراہم کیا جا سکتا ہے۔ جاذب قریشی ۱۹۷۴ء تک "چاپ" اور "دستک" کی ایک مخصوص نوعیت کی تبدیلیوں کو محسوس کر کے حیرت سے پلکیں بھی جھپکتے رہے تب ان کی سمجھ میں آنے لگا کہ دستک وہ آواز ہے جو کبھی ماضی کی ہوتی ہے اور کبھی مستقبل کی۔ اور چاپ اندر کا وہ تحرک ہے جو کبھی خواب ہوتا ہے یا کبھی آنسو۔ جاذب قریشی کی شاعری کے مطالعے سے محسوس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری چاپ اور دستک کے درمیان دھیرے دھیرے ان کے وجود کے نیوکلس سے منسلک ہوتی گئی ہے۔ اسی حوالے سے ان کی نظمیں امکان، آخری چیخ، بنت ہجر، دائروں کی صدا، کاغذ کا گھر، ہاتھ اور گلاب اور اندھیرے کی دیوار پر غور کیا جا سکتا ہے۔ اسی ضمن میں "آخری چیخ" جو جاذب کی ایک چھوٹی سی نظم ہے اور ان کے دوسرے مجموعے میں شامل ہے قاری کو بے حد متاثر کرتی ہے

جاذب کے آخری مجموعے "شیشے اور درخت" میں شیشے اور درخت کے علاوہ کئی ایسی حسین، استعاراتی نظمیں شامل ہیں جو جدید شاعری کے حوالے سے حرارت کی حامل ہیں۔ اور اردو شاعری کے مروجہ دھارے کی خوبصورت نظموں میں شامل کی جا سکتی ہیں۔

آ جس کی نظم "سچ" میں آپ ایسے درد کو محسوس کریں گے جو شاعر کے وجدان کو خلاقی سے ہمکنار کرتا ہے اور جس کے نتیجے میں آپ کے احساسات کو کچھ اس طرح باور کرایا جا سکتا ہے کہ شاعر کے اندر درد جیسے کروٹ لینے لگا ہے۔ ایسی تفہیم محض دیکھے ہوئے کو ہو بہو بیان کر دینے والی شاعری کی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دیکھے ہوئے کو ہو بہو بیان کر دینے کا عمل شاعری کی وسعت کو محدود بھی تو کر سکتا ہے۔ مثلاً ترقی پسند تحریک کے تحت لکھی گئی بہت ساری نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جاذب قریشی کی شاعری کے اندر امکانات کی بات چل رہی ہے تو جدید اردو شاعری سے متعلق شوکت سبزواری جو خود بھی ترقی پسند نقاد ہیں ان کے اس خیال سے بھی جاذب قریشی کی شاعری کو سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"شاعر کے قلب کی مثال نقرئی پردے کی سی ہے۔ اور شاعری کی تخئیل ایک ایسی مرکزی کارگاہ ہے جہاں قدرتی طور پر اس کے تمام شخصی تجربات کا اجتماع ہوتا رہتا ہے اور یہ تجربات عمل اور رد عمل امتزاج و اختلاط وغیرہ کے زیر اثر بدل بدلا کر کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔"

شوکت سبزواری صاحب نے شاعر کے تمام شخصی تجربات کی بات تو کہی ہے لیکن شاعر کے واردات قلبی (یعنی جذبات) کا تذکرہ نہیں کیا۔ گویا وہ اظہار کے قائل تو ہیں مگر وہ ہیں آرنلڈ ریڈ کی "EMBODIMENT" یا ز[illegible] کے لفظوں میں "یکجائی" کے قائل سے نہیں لگتے۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی مخصوص نظریے کو سوچے سمجھے مضمون کے ساتھ پیش کرنے کی حمایت کر رہے ہیں۔ حالانکہ شعر کو خلق کرنے کے عمل میں خود ایسے معنی پیدا ہوتے ہیں جو کسی مواد کی صورت میں پہلے سے موجود نہ تھا۔ اور شاعر کا کمال یہی ہے کہ جب وہ شعر خلق کر لیتا ہے تو وہ ایک نیا معنی وجود میں لاتا ہے اور اس کی شناخت بھی کرتا ہے۔ ایسی شناخت جو جمالیاتی تسکین کا باعث ہو۔

جاذب قریشی کی شاعری میں یکجائی کا رجحان اکثر اور احسن طور پر نظر آتی ہے ان کی نظم "شجر کے زخم" میں فرد اپنی چاہتوں کے ساتھ جزو کو ریت کے شجر میں تجسیم کر لیتا ہے اور اس کی چاہتوں کا حسین گلاب اپنی پہچان سے اسی طرح دور نکل جاتا ہے کہ وہ وحشتوں کے خنجر اگانے والوں کا سا نظر آتا ہے اس نظم میں خوف کی سرسراہٹ کا ایک ایسا لطف داخل ہو گیا ہے جو قاری کی جمالیات کے نہ عکس سے مربوط سا محسوس ہوتا ہے۔ جاذب کی کئی اور نظمیں اس ذیل میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

جاذب قریشی کی شاعری جدید شاعری کے تقاضے کس کس طرح پوری کرتی ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے سے قبل یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ جدید عہد کا فرد اپنی ذات سے کائنات تک جو پھیلا ہوا ہے تو اس پھیلاؤ سے مراد کیا کوئی مادی پھیلاؤ ہے۔ جدید عہد میں شاعری کے حوالے سے مادی پھیلاؤ محدودیت کا اشارہ ہے۔ کیونکہ اس صورت میں سماجی اور سیاسی حقیقت نگاری کا قضیہ کھڑا ہو جائے گا جو کہ آج کے عہد میں ادھوری حقیقت نگاری کے زمرے میں آتی ہے۔ فرد

اور کائنات باہم چولیوں میں جڑے ہوئے ہیں یا دائرہ در دائرہ پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر اس میں اہم ایک ابہام سامنے آتا ہے جو علیحدہ دائرہ صورت گیا ہوا سا ہے۔ ممکن ہے یہ ابہام روح عصر کی اپنی تہہ در تہہ کیفیات کا نتیجہ ہو [illegible] جدید شاعری کے اپنے مخصوص حد بندی میں ظاہر ہوتا ہو۔ کبھی تضادات کے رویوں سے، کبھی مغائرت کے ماحول سے کبھی معاشرے کی بے حسی سے کبھی خلاؤں کے رموز سے اور کبھی غالب کے تکرار سے، ـــــ جاذب کی شاعری فرد اور کائنات کے رشتے کی چولیوں کے حوالے سے اچھی طرح بحث کا موضوع بن سکتی ہے۔ مغائرت کے رویے کے حوالے سے جاذب قریشی کی نظم "سزا" کا تھیم قاری کو بے چین سا کر دیتا ہے۔ اس نظم میں جاذب نے اپنی سوچ کے حوالے سے مغائرت کی ایسی فضا بنائی ہے کہ کچھ کرنے لگتے ہیں۔

جدید شاعری کا موضوع یہ بھی ہے کہ آج کا انسان اس کرۂ ارض میں بے وقعتی کا شکار ہے یا دوسروں کو بے وقعت کر دینا چاہتا ہے۔ اس میں اضافہ اس طرح ہوا ہے کہ کچلنے اور کچلے جانے کے کھیل میں ایک طرف کھیل شامل ہو گیا ہے جو بنیادی طور پر جانب دار ہے نتیجہ میں فیصلہ سچائی مفادات کی مٹھیوں میں ہے۔ اور مفادات خود مٹھیوں کو جنم دینے میں مصروف ہیں۔ معاشرہ ہمیشہ کہاں ہے؟ انہیں سرمایہ کے پاس آج کے پاس جیسا کہ قوت ہے۔ ایسی حالت میں حکومت کوئی بھی ہو سرمایہ دار ہی اس کے اصل مالک ہوں گے۔ اصل مسئلہ جدید عہد کا [illegible] یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے اتنی پیچیدگی نے سامنے [illegible] کہ ان کی عقدہ کشائی بھی [illegible]

جاذب کے انداز میں نہیں ہو سکتی۔ اکتاہٹ کی سا[illegible] سے یہ پیچیدہ عقدہ نہیں کھولا جا سکتا تو پھر احسا[illegible] کا گہری سطح تلاش کرنی ہو گی۔ جو بے حد مشکل کام ہے۔ معمر آدمی بھی۔ جاذب قریشی انہیں حالات کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے عہد کی تخریب، منافقت اور اسی دیگر [illegible] کو محسوس کرتے ہیں۔ اور اسی پس منظر میں کبھی پرندہ آتا ہے اور کبھی آئینہ۔ آئینہ، عکس اور پرندہ جاذب کی نظموں کو گہری معنویت عطا کرتے ہیں۔

سلیم احمد نے جاذب کی شاعری کو آئینہ سازی کا عمل کہا ہے۔ آئینہ انتہائی تغیر کے بعد [illegible] سے قطعی مختلف ہو کر عکس دکھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے جاذب قریشی حیران ہیں آئینہ بھی دیکھتے ہیں لیکن غبار پھول میں ہے آئینہ خیال اہم ہے۔ ان کے امیجز، علامات اور استعارے کی زبان اور ڈکشن مختلف اور مخصوص ہوتے ہیں۔ وہ ان کے استعمال کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کا آئینہ ان کی شاعری مفاہیم کے جہات کی سیر کرا سکتا ہے۔ ان کے اس آئینہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ ان کے مزاج میں مخفی روح کی طرح کام کرتا ہے۔ اور وہ اپنے وجود میں د[illegible] اس آئینہ سے کیا کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ وہ دیکھتے ہیں پرندے کو، پرچھائیں کو، تہہ در تہہ حرف کو، بے رنگ چاند کو، بے چہرہ ساعت کو، بے صدا جسم کو، زرد [illegible] دھوپ کو، دھوپ کی سیاہی کو، چھاؤں کا نپتے شہر کو، اور زمین کی مٹی کو جو سب کی سب اس [illegible] متحرک ہیں جو جاذب کا خواب ہے، خیال ہے، حقیقت ہے جہاں جاذب کی تمنائیں زندہ ہیں اور جہاں وہ شکست

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شہرت حاصل کرنے کی ... جاذب کا وہ
... جدید ... شاعری میں جو ... پیدا کرتا رہتا
ہے ... خصوصاً جب وہ نظمیں کہتے ہیں تو
ان کی نظمیں اپنی ... مستقل ... کو عجیب سے
احساسات میں مبتلا کر کے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں
کہ وہ ان کے ... سے بہتر ہیں۔ ان
کی نظم پہچان کا آخری ... ملاحظہ فرمائیں۔

یہ بلندہ بدن ... مرا
جو ... میں رہ کر
آواز کی صورت دہکتا رہا
آنکھوں میں بھی سورج کا موسم مہکتا رہا

بظاہر سورج کے موسم کا مہکنا غیر منطقی سا
لگتا ہے (منطقی ہونا شعری کیفیت کے حق میں نہیں
جاتا) لیکن نظم کے تسلسل میں سورج کے موسم کی مہک
ایک عجیب سی معنویت اور محسوسات سے لبریز ہو کر
سامنے آتی ہے۔ اسی ضمن میں ان کی کئی اور نظموں کے نام
لئے جا سکتے ہیں۔ "مشغلہ" "تشکیک" "تیرا چہرہ میری آنکھیں"
"زرد زمین اور سورج" وغیرہ

جاذب قریشی کی شاعری میں جدیدیت کا آغاز
کب ہوا، یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ تاہم ان کے پہلے
شعری مجموعہ "شاخ ..." (جو پہچان کے بعد شائع ہوا)
... کے اس ... سے کسی حد تک اندازہ
لگایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے بارے
میں لکھتے ہوئے ... کراچی کی مستقل اور
... کے آغاز کے بارے میں لکھا ہے۔ انہوں
نے اپنی شاعری ... دوسرے شاعروں سے ملاقاتوں

کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ ... جدیدیت اور
جدید لمس کا تصور یوں ہے کہ آدمی آج کے عہد
میں ذہنی اور جسمانی صورتوں میں ... کی جنگ
سے نکل کر ... ہو گیا ہے۔ جہاں اکثر اس کی عادت
اس کا آقا ... ہیں اور ... کے خون کا
حصہ بن گیا ہے مگر جدید لمس کا محض اظہار کوئی
اہمیت نہیں رکھتا۔ جدید لمس یا مشین کا لمس اور
اس کی قربت بدل بدل کر مخلوق کا ہجر و وصال نہ
بن جائے تو پھر اس سے کیا حاصل۔ جدیدیت اچھی
شاعری کی متقاضی ہوتی ہے۔ عرض کرتا چلوں کہ جب بھی
جدیدیت، جدید لمس، جدید تلازمہ، اختصار
اور ایمائیت، لہجہ کا دھیما پن، درد اور کرب کی
گفتگو ہوگی سب سے پہلے بلکہ خصوصی طور پر جدید
غزل کا خیال ہی پیدا ہوگا۔ جدید شاعروں نے غزل کو
اندر اور باہر دونوں ہی صورتوں میں سنوارا اور بدلا
ہے۔ نظموں کی تکنیک کو غزلوں میں داخل کیا۔ ایسی
کی کارگزاریاں جدید غزل میں اہمیت کی حامل ہیں۔ جاذب
قریشی ایک ایسا شاعر ہے جو کئی اور جدید شاعروں کی
طرح اپنی نظموں کو غزلوں کے ساتھ ساتھ لے کر چلا ہے
اس کی غزلیں اس کی نظموں کی طرح جدید شعری
تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ غالب کی غزلوں کے چند
اشعار سنئے تو اندازہ ہوگا کہ جدید غزل سے متعلق
مذکورہ بالا باتیں جاذب قریشی کی غزلوں میں بدرجہ اتم
موجود ہیں۔ چند اشعار یہ ہیں۔

اڑانوں سے پلٹ آتے ہیں اور پھر غور کرتے ہیں
پرندے بھی سمجھتے ہیں شجر کے ٹوٹ جانے کو

ابر سائے میں چلتے ہیں پر ملتے بھی شجر بھی
[illegible] کے موسم پہ شکایت نہیں کرتے

کس بدن کس پہ ہیجانی کی حقیقت کیا
تمہارے پھول میں ہے آئینہ جہان میں ہے

میں بھی ریت کا رزق بنا ہوں
میں سمجھا تھا دریا ہوں میں

مجھ میں کون چراغ جلائے
اک ویران جزیرہ ہوں میں

مجھ میں کیا امکان ہے جاذب
کیوں دن رات سلگتا ہوں میں

جاذب قریشی کی شاعری ان کے ذاتی مشاہدات سے پُر ہے۔ اس طرح ان کے اندر موجود سچائیوں کی مختلف جہات بھی ان کی شاعری میں جھلکتی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ سچائی انسان کے عمل میں شریک ہوں، متشکل ہو سکتی ہے۔ وہ سچائی کو ہر جہت میں متشکل دیکھنے کے متمنی ہیں۔ سچا انسان ہمیشہ صاف گو ہوتا ہے جو صاف محسوس کر سکتا ہے۔ صاف سوچ سکتا ہے۔ اپنے لئے اوروں کے لئے اور حد تو یہ ہے کہ دشمنوں کے لئے۔ جاذب کے یہاں سچائی کا عنصر اپنی صورت میں توانا ہے۔ جاذب اپنی سچائی کی توانائی کو سچے حروف اور اجلے حروف کی شکل میں بھی محسوس کراتے ہیں۔ جاذب نے سچائی کو آتشِ شیشہ زمیں لکھا ہے کہ یہ ان کی شاعری میں

[illegible] کی طرح [illegible] ہے۔ وہ لفظوں کو سچائی کے لئے استعمال کرتے ہیں [illegible] شعلے کی طرح [illegible] ہیں۔ وہ ایک جگہ [illegible] طرح کہتے ہیں:

لفظ تو بھی ہو سکتے ہیں
جو کٹیں تو لہو سے لکھیں
جلیں تو [illegible] بن جائیں
پھر یہ کیسے لفظ ہیں
کہ جنہیں لکھنے والے خود
اپنا کتبے ہوئے پھرتے ہیں

([illegible])

جاذب قریشی نفرتوں سے ملول نہیں ہوتے بلکہ ان سے ان کے اندر حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس محبت پر عداوتوں کو ترجیح دیتے ہیں جن میں لوگ بچھڑ بھی جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں عداوت کا ایک جنون ہوتا ہے کہ فریقین [illegible] ہر صورت ایک دوسرے کے آمنے سامنے [illegible] ہوتے ہیں۔
جاذب کی ایک نثری نظم "دیوار اور دریچہ" پڑھئے تو محسوس ہوگا کہ جاذب کے [illegible] ان کو کس طرح [illegible] طور پر عداوتوں سے [illegible] کر دیتے ہیں۔ لیکن جاذب قریشی پھر ایسی کیفیت اس نظم میں سمو دیتے ہیں کہ جسے دیر تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔
انسان اور فطرت کے حوالے سے اردو شاعری میں خاصا لکھا گیا ہے۔ کہیں انسان فطرت کی گود میں پروان چڑھتا ہے اور فطرت انسان کو [illegible] سکھاتی ہے۔ لیکن جاذب قریشی کی نظموں [illegible] شاعری میں کچھ اور ہی طرح منکشف ہوتی ہے۔ [illegible]

نور پڑھے جانے کی دعوت دیتی ہے۔

جاذب کی شاعری کے مطالعے سے یہ بھی
س ہوتا ہے کہ وہ نامعلوم کے کرب میں مبتلا ہیں
ور دوسرے خوب صورت انسانوں کو نامعلوم کے کرب میں مبتلا
تے ہیں۔ اس لئے گویا ایسے ادھورے خواب آدمی
جود کے اس دروازے پر کھڑا کر دیتے ہیں جس
پیچھے نامعلوم کی پراسراریت رنگ رہا ہوتی ہے
رشانے کوئی دستک دینے اور در دینے کے تذبذب
مبتلا ہوتا ہے۔ دستک سننے کا انتظار اور نامعلوم
اسراریت دونوں ہی تجرب وجود کو مسمار کر دینے
لناک تجربے ہیں۔ جاذب قریشی کی کچھ نظمیں ایسے
ک محسوسات بھی فراہم کرتی ہیں۔ انہیں مثال
جاذب کی بعض نظمیں اپنی ساخت اور شاعر کے
ے اس طرح پیوست ہوئی ہیں کہ ان میں شاعر
یقی ایج کا گمان بھی گزرتا ہے۔ ایک عجیب دلکشی
ساس بعض نظموں میں شاعر کے تخلیقی ایج کی
بے ہی پیدا ہوتا ہے۔ جو کم کم ہی ہوتا ہے۔

یوں تو جاذب قریشی کی شاعری بے جہتی سے
نتک سفر کرتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس
ت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پہچان کے
بی فنا کا مرحلہ آتا ہے۔ اور فنا وجود کے حوالہ
دائمی سچائی ہے۔ جاذب وجود کے اس تحلیل
ملول بھی ہوتا ہے۔ جبکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ فنا
تبل تحرک کے بغیر بے انسانی وجود [illegible]
ہو سکتا۔ تحرک اور پیکار سچائی کے حصول میں
یز ہیں۔ شاید جاذب کو معلوم ہو کہ وجود سدا
پیکار میں ہے اور شاعری وجود کے [illegible] کا لفظی
عکس ہوتی ہے جو وجود کے [illegible]
کو اپنے انداز میں اس طرح اجاگر کرتی ہے کہ وہ عکس
محض جامد ہو کر نہ رہ جائے۔

جدید شاعری کے حوالے سے یہ تسلیم کرنا پڑے
گا کہ ناصر کاظمی، منیر نیازی، سلیم احمد، مجید امجد
اور عزیز حامد مدنی کے اس عہد میں قمر جمیل، احمد ہمیش،
لطف الرحمٰن، علیم الشرعانی، صبا اکرام، سلطان
اختر، برکاش فکری، شاہد احمد شعیب، یٰسین افضال
اور جاذب قریشی ایسے اہم شعراء میں جنہوں نے اپنے
طویل شعری سفر میں انسان کو اس کے وجود کے [illegible]
FACE TENSION ـــ پر تحرک کا خوگر کر دیا ہے
اور یہ جدید شاعری کا بڑا کارنامہ ہے جس میں جاذب
قریشی کی شاعری بھی بطور حوالہ اہمیت کی حامل ہے۔

بقیہ [illegible]

کی سبھی گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔
یہ تھی آج کی چینی جنگ [illegible] اور
میں غم کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا ۔ آخر تھا تو
وہ میرا کیا بچہ، جسے میں نے گود میں کھلایا تھا!

● پرنٹر، پبلشر [illegible] نے بیلا کمرشل پریس
پٹنہ ۴ سے چھپوا کر دفتر سہیل، ریلوے سائیڈ
روڈ، گیا سے شائع کیا۔

میکہ نواز بیگم

تھے اثر وہ اک ہچکی، نالۂ کفگیر بھی تھا
مجھ کو احساسِ جدائی تھا گلوگیر بھی تھا
بڑا بیٹا مری بیگم کا رخِ تقدیر بھی تھا
ہو گئی تاثیر کو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تجھ کو میکے کا مزہ مجھ کو فقط ہجر ملا
اب ترا اس میکہ نوازی سے مجھے طیش دلا
کیا یہی ہے مری دیرینہ محبت کا صلا
تجھ سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

سال چھ ماہ میں سسرال کو بھاگے تو کیا؟
تجھ سے ملنے کی دعا روز نہ مانگے تو کیا؟
رات دن تیرے خیالات میں جاگے تو کیا؟
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

جوابیہ تضمین بر کلامِ غالب

ہم نے سسرال پہ غصے کا جو گاڑا جھنڈا
چل گیا ساس سسر بن پہ ہمارا ڈنڈا
خوب روشن ہوا سسرال میں اپنا جھنڈا
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

ہم نے ہر تیرِ جدائی کے سہے صبر ہوئی
بھیگی بلی کی طرح ہم بھی رہے خیر ہوئی
اشکِ غم دریا کی مانند بہے خیر ہوئی
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

تو سمجھتا ہے ابھی اب بھی یقیناً احمق
چیک بک میں نہیں چھوڑا ہے کوئی سادہ ورق
میں سمجھنے سے ہوں قاصر یہ ترا طور ادق
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

تو نے گھر کو جو ٹھکانا نہ بنایا، نہ سہی
تیرے ابا نے جو ٹی وی نہ دلایا، نہ سہی
اس نے جنت کا مقدر نہ جگایا، نہ سہی
ہم سے مرتے ہوئے گھر سے پاس نہ آیا، نہ سہی
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

غزل

ـــــــ ساجدہ زیدی (علی گڑھ)

[illegible] کی طرح اظہار سے ہو جائے
کبھی احساس یہ ہو [illegible] گلگشت ہو جائے

خاک دل میں جلے [illegible] کبھی یادوں کے چراغ
تم سا [illegible] دلربا [illegible] ہو جائے

جھلملانے لگیں آئینے کے تابندہ نجوم
کہکشاں آج مری راہ گذر ہو جائے

پھر قدم دوری منزل کے طلب گار نہیں
پھر ہر اک خار سفر گرد سفر ہو جائے

پھر تقاضائے طلب [illegible] کشش
پھر ہر اک [illegible] ہو جائے

جرأت شوق کی [illegible]
[illegible] آشنا [illegible] ہو جائے

[illegible] جام
چند روز اور [illegible] بسر ہو جائے

[illegible] دل
دامن [illegible] ہو جائے

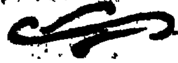
ہولی

شرر غازی پوری
انڈمان

برہن کا نہ جب بھاگ جلے ہولی میں
پی سنگ نہ جب راس رچے ہولی میں
منہ لگائے ہر آگ جہان میں تن میں
برہا کی وہی آگ سلگے ہولی میں

جاؤں نہ سکھی میں بھرن پنگھٹ پہ
بھولا ہے بہت ڈرتا ہے من پنگھٹ پہ
بیٹھا ہے وہاں چھیل چھبیلا پھاگن
رنگ دے گا مرا گورا بدن پنگھٹ پہ

پھاگن کی ہوا کتنی نشیلی سکھیو
جیسے کہ کوئی چھیل چھبیلی سکھیو
توڑے ہے نگوڑی مرے من کا سنیم
بدنام کرے گی یہ ہٹیلی سکھیو



مثلث

کوثر صدیقی، بھوپال

(۱)
ہم سرابوں کی گود میں ہیں پلے
دشت ہستی میں ڈھونڈتے ہیں کنول
تشنگی لے کے اک کھجور تلے

(۲)
جب مری داستاں لکھی جائے
اس طرح واقعات ہوں تحریر
ذکر اہلِ ستم نہ آپائے

(۳)
دھوپ ہے، بھوک ہے، پسینہ ہے
ہو رہی ہے عذاب کی بارش
آگ میں زیست کا سفینہ ہے

(۴)
مت کسی کو پکارتے رہیے
موج طوفان سے گر نکلنا ہے
ہاتھ اور پیر مارتے رہیے

(۵)
کارواں سے بچھڑ گیا ہوں میں
سایۂ زلف گرد وہم پہ دراز
آپ [illegible] رہا ہوں میں

(۶)
دور [illegible] دیکھتی ہے
[illegible]
جو اندھیرے میں ہار کر [illegible] ہے

(۷)
مقتدی ہیں مگر امام نہیں
خانقاہیں بھی ہو گئیں ویراں
اب کہیں مرشدوں کا نام نہیں

(۸)
فرش گل کچھ نہ پایا راہوں میں
کم سے کم اب نکال دو وہ خار
چبھ گئے ہیں جو میرے [illegible] میں

عہد عکاس غزلیں

جناب نصر قریشی کا فن اس منزل پر پہنچ چکا ہے جہاں نہ اسے تعارف کی ضرورت ہے نہ تعریف کی محتاجی۔ انہوں نے گذشتہ کئی دہائیوں میں غزل کے بدلتے منظر نامے میں اپنا نقش یوں ثبت کر لیا ہے کہ آج لہجے کی انفرادیت کے لئے نئی نسل ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی ہے طویل تخلیقی تجربے جہاں فن کار کے کلام میں پختگی پیدا کرتے ہیں وہاں اس بات کا اندیشہ بھی رہتا ہے کہ ایسا فنکار اپنے لہجے کی یافت اور ایک مخصوص پہچان کے بعد جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس پہلو سے جناب نصر قریشی کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ان کے یہاں متحرک انفرادیت کی جھلکیاں ملتی ہیں — ان کے اس تخلیقی رویئے پر غور کرنا چاہئے جہاں انفرادی اور مخصوص نسبت میں رواں اور متحرک تیور نظر آتا ہے۔ مندرجہ ذیل چند غزلوں میں دیگر خصوصیات کے ساتھ اس گوشہ کی عکاسی محسوس کی جا سکتی ہے۔

ادارہ

غزل

[illegible] جو [illegible] گیا ہے نہیں لکھا
سب کچھ لکھا جو بات کہی ہے وہ نہیں لکھا
ہم لوگ کہ محلوں کے مکیں [illegible]
سب جان کے رکھا در بدری ہے نہیں لکھا
[illegible]
حالات [illegible]
[illegible]
قاتل [illegible]
[illegible]
ہم [illegible]
[illegible]
یہ دنیا تو نفرت سے بھری ہے نہیں لکھا
ہم نصر کہاں جائیں، کسے شعر سنائیں
کیا قدر ہنر، ناقدری ہے، نہیں لکھا

نصر قریشی

غزلیں

قتل گاہوں میں تجھے اے زندگی ڈھونڈیں کہاں
لمحہ لمحہ زرد شاخِ عمر خوشبو ڈھونڈیں کہاں

پتھروں کے شہر میں ہر سمت ہے بے چہرگی
جسم چہروں سے الگ ہیں آدمی ڈھونڈیں کہاں

راستوں کے پیچ و خم میں کھو گیا ہے کارواں
رہبروں کا بھی پتہ اب رہبری ڈھونڈیں کہاں

نفرتوں کی آگ میں دل کے صحیفے جل گئے
پتھروں میں پیار کا وہ سلسلہ ڈھونڈیں کہاں

وقت چھین کر لے گیا ہر خواب آنکھوں کا بھی سب
خواب ٹوٹے ہیں تو ان کی روشنی ڈھونڈیں کہاں

ریگزاروں کا مقدر ہے فقط موسم کی پیاس
زرد پتوں کی قطاریں ہیں تو گل ڈھونڈیں کہاں

لفظ لفظ اب تو چہرے سبھی چپ چاپ
نصر کاغذ کے نگر میں شاعری ڈھونڈیں کہاں

ہر صدا، بے صدا ہے ترے شہر میں
زندگی بد دعا ہے ترے شہر میں

آدمی آدمی کا عدو بن گیا
ظلم کی انتہا ہے ترے شہر میں

مندروں مسجدوں میں بھی خاموش
چپ صنم اور خدا ہے ترے شہر میں

کوئی مریم لٹی، کوئی سیتا جلی
ہر نفس اک چتا ہے ترے شہر میں

رنگ اشعار کا زرد پڑنے لگا
ہر غزل مرثیہ ہے ترے شہر میں

آگ نفرت کی سب کچھ جلانے لگی
دیکھ لے کیا بچا ہے ترے شہر میں

نصر بھی بولنے کو ترسنے لگا
لب پہ پہرہ لگا ہے ترے شہر میں

دہلی

غزلیں

تسلیم خان تیغ

ہزاری باغ

بہت ہی سخت ہے جو امتحان سر پہ ہے
دہکتی دھوپ کا اک سائبان سر پر ہے

میں سوچتا ہوں، کہاں اس کو چھوڑ کر جاؤں
شعور و فکر کا جو اک مکان سر پہ ہے

بنا رہے ہیں بہت ظلم و جور کے پتھر
اسی لئے تو ہر انسان کا دھیان سر پہ ہے

اگر وہ چاہے تو تجھ کو کھلا دے صحرا میں
بڑا عظیم ہے، جو پاسبان سر پر ہے

ضمیر بیچ کے روٹی خرید لوں کیسے؟
کہ خاندان ہی نہیں آن بان سر پہ ہے

ہر ایک بات بری لگتی ہے خوش ہو کر
اسی لئے تو مرا [illegible] سر پہ ہے

یہی بہت ہے، ہر اک وقت ہی [illegible] تسلیم
زمیں پاؤں تلے، آسمان سر پہ ہے

لے کے کرنوں کا قافلہ سورج
صبح ہوتے ہی آ گیا سورج

ناز اس کو نہیں بلندی پر
جس نے دیکھا ہے ڈوبتا سورج

ذہن کے آسماں پہ روشن ہے
ہر جگہ میری فکر کا سورج

بانٹتا ہے یہ دھوپ کی چادر
گویا سب کا ہے رہنما سورج

روشنی یہ بھی سب کو دیتا ہے
[illegible] کو بجھتے رات کا سورج

زندگی بانٹنے کی خاطر خود
صبح سے شام تک جلا سورج

یہ بھی تسلیم کہتے ہیں کچھ لوگ
ہم سبھوں کا ہے دیوتا سورج

مانک ٹالا
بمبئی

چَپ ــــ دَھن

آج کے اخبار میں ایک چیختی ہوئی
خونچکاں سرخی کے نیچے یہ خبر پڑھی کہ دھراوی کا
سلم لارڈ (SLUM LORD) جگہ دھر مخالف
گروہ کے ایک آدمی کی گولی کا نشانہ بن کر لقمۂ
اجل ہو گیا ہے۔ ایسے واقعات بمبئی میں اکثر ہوتے
رہتے ہیں اور اخباروں میں بڑی بڑی شاہ سرخیوں
کے نیچے اس طرح کے قتل و غارت کی تفصیلات
شائع ہوتی رہتی ہیں۔ تاہم میں ان خبروں کو سرسری
طور پر پڑھ کر صفحہ الٹ دیتا ہوں لیکن یہ خبر
پڑھ کر میں نے اخبار بند کر کے رکھ دیا ہے اور میرا
ذہن چالیس پینتالیس سال پیچھے کی طرف مڑ گیا ہے
میں گریجویشن کے بعد نوکری کی تلاش میں
بمبئی آیا تھا۔ صرف چند سو روپے میری جیب میں تھے
دادر کی ایک گھٹیا سی لوج (LODGE) میں ٹھہرا
ہوا تھا۔ اگرچہ سستا زمانہ تھا۔ ایک روپیہ بھی بہت
دور اور دیر تک ساتھ دیتا تھا۔ پھر بھی جب
کافی عرصہ تک نوکری نہ ملی تو سسکتے روپیوں
کو دیکھ دیکھ کر دل میں ہول سا اٹھنے لگتا۔ پردیس
میں کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ لوج کا مالک بڑا گھسا
ہوا شخص تھا۔ میرے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ کر
میری بڑھتی ہوئی خستہ حالت کا اندازہ لگاتا رہتا
تھا۔ دراصل اس کی نظر میرے اس چھوٹے سے
سے سونے کے لاکٹ پر تھی جو بہت سال پہلے میری
اماں نے مجھے میرے کسی جنم دن پر دیا تھا۔ صرف یہی
ایک لاکٹ ہماری فارغ البالی اور مرفہ الحالی کی آخری
یادگار تھا۔ اس لئے مجھے جان سے عزیز تھا اور اسے
میں کسی بھی حالت میں کھونا نہیں چاہتا تھا۔

آخر اوپر والے کو میری حالت زار پر رحم آیا اور
مجھے ایک پرائیویٹ فرم میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ قبلہ
اکبر آبادی کے وقتوں میں کلرک کی تنخواہ میں ڈبل روٹی
کا خرچہ بھی نکل آتا تھا کیونکہ وہ انگریز کا زمانہ
تھا۔ لیکن آج کل کلرک کی صرف [illegible] روٹی، ہری مرچ
اور پیاز کا خرچہ ہی نکل پاتا ہے۔ بہرحال اس
پالنہار کا شکریہ ادا کیا اور اگلے روز فرم میں

[illegible] تھا [illegible]

[illegible] بھی [illegible] تھا۔ کھنڈروں اور [illegible]

[illegible] اور میں دن بھر [illegible]

[illegible] تنخواہ [illegible] اپنے

آپ [illegible] سے [illegible] تھا۔

پچھے [illegible] اور [illegible] سے پیٹ

بھرا کرتا تھا لیکن اس [illegible] کے طعام خانے میں

پہلی مرتبہ [illegible] کا [illegible] دیا اور خوب لطف

لے کر پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور پیٹ پر ہاتھ پھیر

[illegible] رہا۔

[illegible] کر [illegible] کے بعد اب کسی رہائش

[illegible] سستا زمانہ ہونے کے باوجود

موجودہ تنخواہ میں [illegible] کے اخراجات کا متحمل نہیں

ہو سکتا تھا [illegible] ایک رفیق کار سے مشورہ

[illegible] ایک [illegible] میں رہتا تھا [illegible]

[illegible] تھا اس نے [illegible]

[illegible]

[illegible] کرنے [illegible]

[illegible] سے [illegible]

[illegible] تھا [illegible]

[illegible] قریب [illegible]

کئی ماہ کی بیکاری کے بعد [illegible]

اس لئے [illegible] ایک چھوٹے سے خالی [illegible]

اپنی [illegible] کرلی [illegible]

حصہ کرائے پر [illegible] تھا۔

[illegible]

کافی [illegible] ہے۔ [illegible]

سے بڑھ کر [illegible] (slum) [illegible]

حاصل ہوگیا ہے۔ لیکن اس زمانے میں [illegible]

کم [illegible] تھا [illegible] زمین خالی [illegible]

[illegible]

آتی تھیں۔ [illegible] ایک منزلہ [illegible]

کچھ فارغ البال لوگوں نے [illegible]

بنائی تھیں تاکہ [illegible]

([illegible]) کا خرچ نکلتا رہے۔

[illegible] اس زمانے میں [illegible]

[illegible] ہی [illegible]

([illegible]) [illegible] اور [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کرتے گرفتاریاں کرتی اور اپنی خانہ پوری
[illegible] سے غائب ہو جاتی۔ چھاپہ مارنے سے
[illegible] روز پہلے سب کو خبر کر دی جاتی تھی۔ دارو
[illegible] والے دھاڑ والے روز اپنا بیشتر سامان
غائب کر دیتے اور اپنے اڈوں پر ایک ایک آدمی
چھوڑ کر غائب ہو جاتے۔ بہرحال گرفتار شدگان کے
گھروں میں ان کے حصے کا منافع برابر پہنچتا رہتا
عدالت میں کاروائی کے لئے وکیل مہیا کر دیئے
جاتے جو پولیس کے مہیا کردہ ثبوتوں کے پرخچے
ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ اور گرفتار شدگان چار چھ
ماہ بعد حوالات سے باہر آجاتے۔ اس طرح کاروبار
دھڑا چلتا رہتا۔ اور دھراوی میں دارو بنانے کا سلسلہ
بھی جاری رہتا۔

میرا دوست ایک روز مجھے اپنے کرم فرما کی
کھولی پر لے گیا۔ سائن ہسپتال کے عقب سے
کچا پکا راستہ جاتا تھا۔ درمیان میں سنٹرل ریلوے
کراسنگ پڑتا تھا۔ اس روز اتوار تھا۔ اور لوکل
گاڑیوں کا آوا گمن بہت کم تھا۔ اس لئے ہماری ٹیکسی
کو لیول کراسنگ پر رکنا نہیں پڑا۔ میرے کرم فرمانے
وٹھل راؤ والے کی کھولی کے باہر ٹیکسی رکھائی —
سامنے وٹھل راؤ اپنی کھولی کے باہر بڑی سراسیمگی
کی حالت میں کھڑا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
میرے دوست نے اس سے کھولی کا تالا کھلوانے کی
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ہے ایک پائی بھی نہیں ہے۔ تم جیسے کچھ بھی [illegible]
لیکن پہلے مجھے سائن ہسپتال پہنچا دو۔ ٹیکسی کا بھاڑہ
پاس میں ہے۔ اسے روکو، جانے نہ دو۔ میں ٹیکسی کو
بھاڑا دیتے دیتے رک گیا۔ تھوڑی دیر [illegible]
کی بیوی کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ میں نے نچلے اسٹاف
کی مٹھی گرم کر کے وٹھل کی بیوی کو زچہ خانہ میں داخل
کرایا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر سارا کام بخوبی انجام
پا گیا۔ وٹھل کی گھر والی کے لڑکا ہوا تھا۔ زچہ اور بچہ
دونوں کی حالت قابل اطمینان تھی۔ معمول کے مطابق
ہسپتال میں تھوڑی سی رقم جمع کرا دی گئی — اور
ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق میں دو ایک ضروری
دوائیاں سامنے والے کیمسٹ سے خرید کر لے آیا۔ ان
سب کاموں سے فارغ ہو کر سب نے سکھ کی سانس
لی۔ وٹھل راؤ کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو جاری
تھے۔ اس کا گلا رندھ گیا تھا اور بار بار میرے سامنے
ہاتھ جوڑ کر رندھے ہوئے گلے سے کہتا کہ آج تم
میرے لئے بھگوان بن کر آئے ہو۔ تم نہ آتے تو
میری بیوی بے موت ماری جاتی — اس نے مجھے
اور میرے دوست کو کتنی دعائیں دیں۔ ہمارے
پاؤں کو ہاتھ لگایا اور ہمارے ہاتھوں کو چوما —
اس قدر زیادہ کہ ہم خجالت سی محسوس کرنے لگے۔
وٹھل راؤ نے میرے لئے اوپر کا مالا خالی کر کے
اچھی طرح صاف صفائی کر دی تھی۔ میں چور بازار
[illegible]
[illegible]
[illegible]

چار بعد تک صبح شام وٹھل کے ساتھ ہسپتال
جاتا رہا۔ دودھ، پھل اور دوائیوں کے اخراجات
خود ہی برداشت کرتا رہا۔ وٹھل نے میرے دیئے ہوئے
پیسوں سے گھر میں راشن پانی ڈلوا لیا تھا۔ اور جب
ہم اس کی بیوی کو اسپتال سے واپس لائے تو وہ
دونوں بڑے خوش تھے۔ اور تشکر آمیز نگاہوں
سے بار بار مجھے دیکھ کر ہاتھ جوڑ دیتے تھے۔ اور میں
دل ہی دل میں شرمندہ ہو جاتا۔ اس کا بیٹا بڑا ہی
پیارا اور صحت مند تھا۔ میرے ساتھ بہت ہل مل گیا
میں اسے اپنی کھولی میں لے جاتا اور تادیر اس کے
ساتھ کھیلتا رہتا۔ میں نے اسے منو کہہ کر بلانا شروع
کیا تو وہ سبھی کے لئے منو ہو گیا۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ کپڑا مل میں پھنسا ہوا
وٹھل راؤ کا پانچ سو روپیہ بھی اس دوران میں اسے
واپس مل گیا۔ مجھ میں اس کی عقیدت اور بھی بڑھ
گئی تھی۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کے گھر میں میرے قدم
پڑتے ہی ان کے دلدر دور ہو گئے تھے۔ حالانکہ معاملہ
کچھ اور ہی تھا۔

وٹھل راؤ کی پاکٹ بھاری ہوئی تو اس نے
بچے کے نام کرن سنسکار کا انتظام کیا۔ وہ ایک پنڈت
کو بلا لایا۔ چند پڑوسیوں کو بھی دعوت دی۔ میں تو خیر
موجود تھا ہی ___ چائے ناشتے اور مٹھائی کا بھی
انتظام کر لیا گیا تھا۔ وٹھل کا بیٹا راجکماروں کی
وضع قطع کا لگتا تھا۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ کسی
مل مزدور کا چشم و چراغ ہے۔ وٹھل کی بیوی
نے مجھے اپنا بھائی بنا لیا تھا اور میں اسے تائی

(بہن) یا گنگو تائی کہہ کر بلاتا تھا۔ اس کا کوئی بھائی
نہیں تھا۔ چنانچہ ماماں ہونے کے ناطے میں نے بھی
اپنے فرائض انجام دیئے۔ بچے کے لئے کپڑے اور ماں
کے لئے چاندی کے دو کڑے بنوا لایا۔

پنڈت نے وید منتر پڑھنے شروع کئے۔ وٹھل بچے
کو گود میں لئے پنڈت کے قریب بیٹھا تھا۔ بچہ باپ کی
گود میں سرخوشی کے عالم میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ پنڈت
نے وید پاٹھ ختم کر کے بچے کی طرف دیکھا۔ اور چند
لمحے دیکھتا ہی رہ گیا۔ بلاشک بچہ بہت پیارا تھا اور
جو بھی اسے دیکھتا تھا دیکھتا ہی رہ جاتا تھا ___ لیکن
یہاں معاملہ کچھ اور ہی تھا ___ پنڈت چند لمحے اس
کے ماتھے کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بے ارادہ
طور پر اس نے بچے کے دائیں ہاتھ کی مٹھی کھول کر اس
کی انگلیوں کو غور سے دیکھا۔ ایک ایک انگلی غور
سے دیکھی۔ پھر بائیں ہاتھ کی مٹھی کھول کر دیکھی اور
پھر اس کے دونوں ہاتھ کھول کر ایک ساتھ ساری انگلیوں
کو دیکھا اور بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ بولا ___ وٹھل
راؤ۔ بھگوان کے گن گاؤ۔ خوشیاں مناؤ۔ تمہارا
بیٹا بڑا بھاگیہ وان ہے۔ تمہارے جنم جنمانتر کے دلدر
دور کر دے گا۔ یہ لڑکا چکرورتی ہے۔ اس کی دسوں
انگلیوں کے اوپر پوروں پر گول نشان ہیں۔ یہ بڑا
نامی ہوگا اور لکشمی اس کے چرنوں کی باندی ہوگی۔ پنڈت
نے اس کا نام چکردھر رکھ دیا۔

وٹھل نے دوبارہ نوکری حاصل کرنے کی کوشش
کی لیکن ناکام رہا۔ آخر اس نے دھاراوی ہی میں ایک
خالی پلاٹ [illegible]

[illegible] ایک نیا جھونپڑا تعمیر کروا لیا۔
[illegible] کشید کرنے کی بھٹی لگائی۔ جو سستا
[illegible]۔ چند سو روپیوں میں ہر چیز تیار ہو گئی۔ گڑ اور
[illegible] کے محلول سے دارو کا خمیر اٹھایا جاتا تھا۔
[illegible] ٹانک بھی رکھ دیا گیا۔ سامنے سے بازیر زمین
[illegible] تھا۔ اس کا ڈھکنا اٹھا کر محلول کے چھوٹے
[illegible] میں رکھ دیے جاتے۔ دو تین روز میں خمیر اٹھ جاتا
[illegible] کشید کرنے کی بھٹی میں ڈال دیا جاتا۔ پولیس
[illegible] بھی باندھ دیا گیا تھا۔ اور وٹھل راؤ نچنت
[illegible] کے فروخت کرنے لگا۔ اس کا جوڑا
[illegible] نجیو اور لک (کے، کے، کے) لگانے میں کسی بدخصال
[illegible] کے دولت سے کم نہ نکلا تھا۔ چنانچہ اس کی دکان
[illegible] چل نکلی۔ اب وہ وٹھل راؤ کی بجائے محمد وٹھل
[illegible] تا تھا۔ کچھ عرصے بعد، تھوڑے سے فاصلے
پر اس نے ایک اور کھولی تعمیر کرائی۔ اس میں میز
کرسیاں ڈال دیں۔ مچھلی اور بھجیا تلنے کا بھی انتظام
کر دیا۔ اور دارو گلاسوں میں بھر کر پلائی جانے لگی۔
[illegible] وہ لوگ خریدتے تھے جن کا جگہ ٹھکانا
[illegible] دوسری قسم کے لوگوں کے لئے وٹھل دادا
[illegible] رحمت بن کر برسنے لگا۔ اور وٹھل کے گھر میں ہُن
برسنے لگا۔

حالانکہ اس کی بخت آوری کا تعلق اس کے
[illegible] کی پیدائش سے تھا۔ لیکن وٹھل راؤ پھر
[illegible] کے اہل پوجتا تھا۔ میری بروقت مدد
[illegible] میری [illegible] پیدائش کا دھیان
[illegible] تائی [illegible] نے [illegible]

سیوا کیا کرتی تھی۔ آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ
کھولیوں کا بھاڑا بھی بڑھنے لگا تھا۔ لیکن انہوں
نے کبھی مجھ سے کرایہ بڑھانے کی تکرار نہیں کی تھی۔
بلکہ وہ سرے سے بھاڑے کا تقاضہ ہی نہیں کرتے
تھے۔ اور جب میں ہر ماہ کرایہ ادا کرنے جاتا تو وہ
لینے سے انکار کر دیتے۔ میں بڑی مشکل سے انہیں
کرایہ لینے پر مجبور کرتا۔ آخر انہوں نے مجھے جوگ
مایا کی قسم ڈال دی کہ اب میں کبھی کرایہ ادا نہیں کروں
گا۔ اس پر طرہ یہ کہ صبح کی چائے ناشتہ اور چھٹی
کے روز اصرار کر کے مجھے دوپہر کا کھانا بھی کھلاتے۔

چکرو ھر بھی بڑا ہونے لگا تھا۔ چشم بد دور بڑا
خوبصورت اور گول مٹول شکل آیا تھا۔ جب ذرا
بڑا ہوا اور اپنی توتلی زبان سے جب مجھے ماماں کہہ
کر پکارتا تو مجھے ایسا لگتا کہ دنیا کی ساری نعمتیں میری
جھولی میں پڑ گئی ہیں۔ شام کو گھر لوٹتے وقت میں اس کے
لئے ٹافی، چاکلیٹ یا اس کی پسند کی کوئی نہ کوئی چیز
ضرور لے آتا۔ تیج تہوار کے موقعوں پر اس کے لئے اپنی
حیثیت کے مطابق بڑھیا سے بڑھیا کپڑے خرید کر
لاتا۔ وہ لاکھ منع کرتے لیکن میں ماموں بھانجے کے رشتے
کا واسطہ دے کر ان کا منہ بند کر دیتا۔ دراصل منّو
کا چہرہ دیکھ کر مجھے اپنے دو سال کے بھانجے ششی
یاد آجاتی۔ میری ایک ہی بہن تھی۔ مسرت کی بیٹی تھی۔
بیٹا ابھی دو سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ بیوہ ہو گئی
اور ہمیشہ کے لئے میکے آ گئی۔ افلاس کے باوجود
میرے [illegible] اور [illegible]
کیا۔ میں نوکری کی تلاش میں کئی جگہ [illegible]

[illegible] ہوگئی تھی۔ اسے بھی ان ہی کے خوفناک
شکنجے سے جوڑا گیا تھا۔ چھ کی فٹ پاتھ پر قریب
ہو گئی۔ نالو بھائی کو جب بھی کتابوں سے فرصت
ملتی وہ ساحل پر مٹھی میں ریت بھر بھر کر سمندر میں
ڈالتے۔ اندھیرا گہرا ہو جاتا تو ہیرو میلا کی زلفوں
میں انگلیاں پھنسا کر میلوں لمبے ویران سپنے دیکھتے
سپنے جو مسلسل جاری رہتے اس کے تلوے کانٹوں
سے چھلنی ہو جاتے لیکن وہ کہیں نہیں پہنچتا۔ کتابوں
نے ہی انہیں تیئیس (۲۳) سال کی عمر میں براہ راست
انکم ٹیکس آفیسر بنا دیا۔ پیار کے سادے رہبر سل
نے ہیرو میلا کا شوہر بنا دیا اور جس سماجی ڈھانچے
کو وہ مکمل طور پر بدل دینا چاہتے تھے اس میں خود
اپنی انفرادیت کھو کر، شامل ہو گئے۔۔۔۔۔ بڑے
آدمی ہو گئے۔ لوگ ان کے قلم کی نفی کرتے ہوئے
نوٹ خود ہی اندر سرکا جاتے۔۔۔ لیکن اچانک ہی
انہیں لگتا کہ عیسائی بن کر بھی ان کی شخصیت سے
کسی پرانے کباڑ کو ڈھو رہی ہے۔ زندگی کے مہابھارت
میں وہ گھن کی طرح کھلے گئے ہیں۔۔۔ ان کے عنصر
کو جگہ نہیں ملی ہے! لوگ ان کے ماضی کے بارے میں
ہنس سکتے ہیں۔ عہدے کی ترقی کے ساتھ ساتھ گھر کے
سب لوگ فخر محسوس کرتے۔ لیکن نالو بھائی کے ماحول
[illegible] گھری والوں میں راکھ کا ٹیلہ بن جاتے۔ دھوئیں
سے گلا بھر جاتا۔ گجرات کے اس شہر میں انکم ٹیکس
کمشنر بن کر بھی ان کا گلا رندھا رہتا۔۔۔۔ خاموش
ہونٹوں کے درمیان ٹھنڈی آتش۔ کئی بار تاریک

کوٹھی والی حویلی کے سامنے سے گزرتے گزرتے
جی میں آیا کہ اندر جھانک کر اپنے بچپن کے میدان کو دیکھ
لیتا۔۔۔ ایک بار دہلیز پر ٹھوکر [illegible] اور [illegible]
بھائیوں کو اس ٹھوکر کو خوشی خوشی چاٹتے ہوئے
دیکھیں لیکن سانس بھاری ہو گیا۔ اور انہوں نے رخ
موڑ دیا۔۔۔۔ سوچا کسی دن اس گھر کے بچوں کو
کھانے کھلوا کر اسے نیلام ہی کروا دیں گے۔
کار کی بتیاں کھڑکی کے سامنے ملکی بھائی کو
کوٹھی کے سر سبز لان اور پھولوں کو بھی دیکھا تھا۔ پھر
لگا یا نہیں۔۔۔۔ بت شکن بھائی اچانک ہی دکھائی
دے جائیں گی اور تب وہ گیٹ سے گاڑی سنتا کے
ہوئے لے جا کر ان پر چڑھا دیں گے۔۔۔۔۔ کیا ہوگا
دو چار سال کی سزا۔۔۔۔ یا معافی۔ بس
اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے اچانک لگتا
ہے کہ کال بیل بجی تھی اور ملازم پوچھ گیا ہے۔
"کوئی سروجا بین میں صاحب!"
نالو بھائی کی نسیں تڑک اٹھتیں۔
کسی سے نہیں ملنا۔۔۔ کہہ دو کہ پھر کبھی نہ آئیں۔"
چیخ سن کر ہیرو میلا دوڑی آتی ہے۔ کبھی
شوہر کی قابل رحم حالت دیکھ کر سارے انگریزی
ایٹی کیٹ بھول کر شوہر کو سینے سے چپکا لیتی۔
کوئی ڈراؤنا سپنا دیکھا ہے کیا؟"
نسوانی جسم کی دلکش مہک سے نالو بھائی
کچھ راحت محسوس کرتے۔۔۔۔ اور گہرائی میں ڈوب
جاتے۔۔۔ ماں کے نوجوان بدن سے اٹھنے والی مہک

تھے۔ دھراوی میں اس کے اتنے جھونپڑے تھے کہ
[illegible] کا بے تاج بادشاہ کہلاتا تھا۔ عرفِ عام میں
وہاں کا سلم لارڈ (SLUMLORD) تھا۔
وہ مجھے اب بھی ماماں کہتا تھا لیکن اس کے
ایسے لگتا تھا کہ گالی دے رہا ہے۔ ویسے تو پیار اس کا
بہت ہی کم ہوتا تھا کیوں کہ شام کو جب میں گھر لوٹتا
وہ دھراوی کے باسیوں کو اپنے درشنوں سے کرتارتھ
کرنے کے بعد اپنے سائمن کے فلیٹ میں بڑے لوگوں
کی خاطر مدارات میں مصروف ہو گیا ہوتا تھا۔

دھراوی میں اس کے بیوڑے کے کئی اڈے
بن چکے تھے۔ جن کا مال ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا
تھا۔ اب ان اڈوں پر کام کرنے کے لئے کئی نوکر رکھ
لئے گئے تھے۔ اس نے وٹھل راؤ کو بھی دارو کشید کرنے
یا کسی دوسرے اڈے پر بیٹھنے کے لئے بڑی سختی سے منع
کر دیا تھا۔ وہ بھی جگر دھر کی طرح ان اڈوں کی نگرانی
کرنے کے لئے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دو ایک
چکر لگا آتا تھا تاکہ سند رہے۔ ویسے بھی اسے
دارو کی لت تو تھی ہی، رات بھیگتے بھیگتے وہ اپنے کسی
ایک اڈے سے ایک بھری بوتل اٹھائے آتا اور فرائی
مچھلی اور چکن تکوں کے ساتھ چھوٹی بڑی چسکیاں لیتا
رہتا اور بھگوان کی مایا کی کایا پر انتر دھیان لگائے
رہتا۔ گنگو تائی کو بھی بیوڑے کا چسکا لگ چکا تھا۔
وہ بھی کچھ دور تک اپنے پتی پرمیشور کا ساتھ دیتی۔
پھر چولہا سنبھال لیتی۔ کھانا تیار ہوتے ہوتے بوتل
ختم بھی ہو چکی ہوتی۔ دونوں میاں بیوی "برہم بھوج"
مزے لے کر لمبی تان کر سو جاتے۔

آخر ایک روز ہونی ہو کر رہی۔ ان کی ایک
بھٹی میں جو دارو کشید ہوا تھا وہ زہریلا ثابت ہوا۔
گنگو بائی اور وٹھل راؤ نے بھی اسی بھٹی کے کشید
کردہ بیوڑے کی ایک بوتل اندر انڈیلی تھی۔ دونوں
سیدھا سورگ کی سیڑھی پر چڑھ گئے۔ ان کے
ساتھ ساتھ جن گاہکوں نے یہ مال چکھا تھا ان
کی بھی بری حالت ہوئی۔ سائمن ہسپتال مریضوں
سے بھر گیا۔ زیادہ تر نے عدم آباد کا رستہ پکڑا۔
کئیوں کی آنکھوں کی بینائی ہمیشہ کے لئے جاتی
رہی۔ اور کئی زندگی بھر کے لئے ضعفِ نظر کے شکار ہو گئے۔

جگر دھر اس روز پونا میں تھا یا پھر ایسے ثبوت
تیار کر لئے گئے تھے کہ وہ پونا گیا ہوا تھا اور وہاں اچانک
بیمار ہو جانے کے باعث وہاں کے سسون ہسپتال
کے اسپیشل وارڈ میں زیرِ علاج تھا۔ کسی نے یوں
ہی نہیں کہا کہ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس
بڑی طاقت نے جگر دھر کو صاف بچا لیا۔ بے چارے
کے ماں باپ بھی اس حادثے میں چل بسے تھے۔ اس
لئے سب کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔ ویسے دارو
کے اڈے بھی تو اس کے باپ کے نام پر چلتے تھے اور اسے
عدم آباد سے تو واپس بلایا نہیں جا سکتا تھا۔ بہرحال
ماتا پتا کی چتاؤں کو آگ دینے کے واسطے وہ واپس
بمبئی پہنچ گیا تھا۔ روتے بلکتے ہوئے اس نے دونوں
کی چتاؤں کو آگ لگائی۔ اس کی اس بپتا پر آسمان
کے دیوتاؤں نے بھی جی بھر کر آنسو بہائے کہ دھراوی کا
علاقہ غرقاب ہوتے ہوتے بچا۔
والدین کے مرنے کے بعد جگر دھر نے اور بھی پیر

بھیجنے شروع کر دیئے۔ اب وہ سونے کی اسمگلنگ
اور منشیات کا دھندہ بھی کرنے لگ گیا تھا۔ دبئی،
سنگاپور، ہانگ کانگ اور دیگر اہم ملکوں کے اسی
قماش کے لوگوں سے اس کے براہ راست تعلقات قائم
ہو گئے۔ یہ سب اس کے چکردھر کی ہونے کے طفیل تھا۔
لیکن اس کی شہرت ملک کے باہر بھی پھیلنے لگی تھی۔
بھاگیے صاحب ایک اتوار کو صبح صبح ہی میرے
غریب خانے پر تشریف لائے۔ نیچے ہی سے آواز دے
کر مجھے نیچے بلایا۔ میں خدمت میں حاضر ہوا تو بڑی
رعونت سے مجھے ایک ماہ کے اندر اندر کھولی خالی
کرنے کا حکم دیا۔ چکردھر نے وہاں ایک ائرکنڈیشنڈ
ریستوران تعمیر کرنا تھا کیونکہ دھراوی کی ریل پیل
کے باوجود ایک اعلا درجے کے ریستوران کا وہاں فقدان
تھا۔ ادھر نشہ بندی کے قانون کی سختیاں ختم ہو چکی تھیں
اور وہاں بار کا لائسنس حاصل کر کے وسکی اور بیئر
کا منافع بخش دھندہ شروع کیا جا سکتا تھا۔ اس
نے پانچ ہزار کے نوٹ میرے منہ پر مارتے ہوئے کہا کہ
اس رقم سے میں پگڑی دے کر کھولی بھاڑے
پر لے لوں۔ میں نے شکریہ کے ساتھ رقم لوٹاتے ہوئے کہا
کہ پگڑی دینے کے لئے میرے پاس رقم موجود ہے اور کہ
میں وہ ہی ایک روز میں یہاں سے منہ کالا کر جاؤں گا۔
دو تین ہزار روپے میرے پاس تھے۔ لیکن جب کھولیوں کی پگڑی
کے بھاؤ معلوم ہوئے تو پتہ چلا کہ یہ رقم اونٹ کے منہ میں
زیرہ کے برابر ہے۔ چنانچہ شہر سے میلوں دور دکھرولی
کا پہاڑی علاقہ میں سنجے نگر کی جھونپڑپٹی میں وہاں کے
سلم لارڈ سے پانچ سو روپے پگڑی اور پچاس روپے
بھاڑے پر ایک کھولی حاصل کر کے چکردھر کی کھولی کو
الوداع کہی۔
میرے کھولی چھوڑتے ہی اس کی عزت، شہرت
اور دولت میں اضافہ ہونے لگا۔ بڑے بڑے نیتاؤں سے
اس کی گاڑھی چھننے لگی۔ دوسرے داداؤں اور سمگلروں
کے ساتھ اس کی رقابت بھی بڑھنے لگی۔ ایک دوسرے
کے کارندوں کے قتل و اغوا اور مار دھاڑ کی خبروں سے
بھی پتا چلتا رہتا کہ چکردھر اس وقت اپنے کاروبار کے
نصف النہار پر ہے۔ اور دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا
ہے۔ اخباروں کی خبروں سے یہ بھی پتہ چلتا رہتا تھا
کہ مندروں، خیرات خانوں، اسکولوں اور ہسپتالوں
کے لئے چکردھر دل کھول کر چندہ دیتا رہتا ہے۔
لیکن کچھ بدخصال اخبار نویس اس کے حریفوں
کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر اس کے لئے مشکلیں کھڑی
کرنے لگے تھے۔ اس نے کچھ لوگوں کا کانٹا تو نکال دیا
لیکن کچھ بڑی مچھلیاں زیادہ ہی منہ زور ہو رہی تھیں۔ ایک
بڑا ہی خبیث حریف اس کی آنکھوں کا روڑا بنا ہوا تھا۔
چکردھر نے اسے اپنے آدمیوں سے قتل کروا دیا۔ قاتل موقعہ
پر گرفتار ہو گئے۔ چکردھر کو روپوش ہونا پڑا۔ لیکن اس
قدر بارسوخ ہونے کے باوجود اس کی گرفتاری کے
وارنٹ نکل آئے تھے۔ ایک بہت بڑا وکیل اس کی
چاکری میں تھا۔ اس نے ضمانت کے سبھی انتظامات مکمل
کر کے ایک روز اسے عدالت میں پیش کر دیا۔
ضمانت کے بعد وہ بڑے ٹھسّے سے عدالت سے
باہر نکلا ہی تھا کہ اس کے حریف کے گروہ کے ایک آدمی
نے وکیل کے بھیس میں اس کے قریب آ کر اپنے پستول

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

[illegible] بجے

ترجمہ :- حمید جعفری سید

کن کا غصّہ

[illegible] سی. سلیپر کی رنگین کھڑکی پر کرنیں
[illegible] رستہ سجا رہی تھیں لیکن نانو بھائی
[illegible] تھا کر بے تفریق ان کے ماضی کے ٹوٹے ہوئے
[illegible] سے جو ان کے حال میں دوبارہ داخل ہونے
[illegible] بیتاب ہے. گاڑی کے اسٹیشن پہنچنے سے
[illegible] ہی انہوں نے کوپے میں ٹہلنا شروع کر دیا
[illegible] ایک سناٹا مسلط ہونے لگا۔ دل اندر ہی
اندر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اعلیٰ عہدے نے مضبوط
[illegible] میں توازن برقرار رکھا. پیشانی پر رعونت
[illegible] رہی لیکن اندر جو دل تھا اس کا نہ تو کوئی
[illegible] اور نہ وہ فولاد کا تھا۔ دل میں دہشت،
[illegible] جذبہ، نفرت، ہمدردی اور ماضی کی سیاہی کے
[illegible] نشانات ایک عام انسان کی طرح متحرک
[illegible]۔ عمر کے ساتھ شکل میں فرق ضرور آیا تھا لیکن
[illegible] بدستور تھے. مندر کی گھنٹی سے چرچ کی
[illegible] والی عمارت میں پہنچ کر بھی نانو بھائی کے

انداز بدلے زبان کی گجراتی شناخت ختم ہوئی صاحبی
ٹھاٹ باٹ کے پیچھے اچانک ہی گھی کے پیپوں سے بھرا
گودام اور اندھیری کوٹھری میں بھٹکتا توتلا ماضی ایک
بھوت کی طرح تنہائی میں نمودار ہو جاتا۔ اب تک بچا
رہا لیکن اب شہر میں واپس آکر مجھ سے کیسے بچو گے نانو
بھائی....؟ 'رشی' 'کودس' بول کر حقیقی وجود
کو آنکھوں سے اوجھل رکھنا ناممکن ہوگا۔

نانو بھائی تو اپنا نام بھی بدلنا چاہتے تھے لیکن
فادر نینکن نے منع کر دیا۔ "نانو بھائی اپنی مٹی سے
وابستہ ہو کر ہی تم خداوند کا کام ٹھیک سے کر سکتے ہو۔
جیکسن یا جوزف بنتے ہی تم اس زمین کے مظلوم طبقے
سے کٹ جاؤ گے ..... خداوند کے بیٹوں سے دوری
بڑھ جائے گی ...." نانو بھائی جھینپ کر رہ گئے
تھے۔

فادر نینکن نے نانو بھائی کا نام نہیں بدلا لیکن
نانو بھائی نے اپنی اولاد کے خالص انگریزی نام رکھے۔

پر بھی نانو بھائی اختر کو سمجھ جانے کی مہلت نہیں
...ال پاتے۔ جب کوئی خالص گجراتی لہجے میں نانو بھائی
...کو پکارتا ہے تو خوف کے باعث جیب کے نیچے دھڑکتا دل
بے لگام ہو کر دھڑکنے لگتا ہے۔ افسردگی، محرومی
...فرت اور بے بسی بیک وقت بیدار ہو جاتی ہے۔ اور
...ب نانو بھائی اپنے جذبات پر پردہ ڈالنے کے لیے چپ
...ا بہت نفاست سے تمباکو بھرنے لگتے ہیں۔ پھر دو کش
...تے ہیں اور تب کہیں جا کر پکارنے والے کی طرف مخاطب
...ہو پاتے ہیں۔ انہوں نے اکثر مریم کی تصویریں اپنی دنیا
دیکھا ہے۔ اور اس لئے وہ مریم کی تصویر کی جانب
...یکھنے سے گریز کرنے لگے ہیں۔ کئی بار انہوں نے بک
...سٹالوں پر مہا بھارت اور دیگر کتابوں کو الٹ پلٹ
...نتی کی تصویر دیکھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار صرف
...کی تصویر ہی نظر آئی۔ وہ ایک دن کنتی کی داستان
...ختم کرتے ہوئے کرن کے غصے پر ایک دستاویز
...ھنے کی متمنی ہیں لیکن ڈرتے ہیں کہ کسی عیسائی کے
...یف پر کوئی ہنگامہ نہ برپا ہو جائے۔ لیکن لکھنا تو
...ہی..... چھپوائیں گے نہیں، اور کیا؟ اسٹیشن
...تقریباً پورا عملہ استقبال کرنے کے لئے موجود تھا۔
...کمشنر سے لے کر انکم ٹیکس کے چپراسی تک.....
...کے پگڑی دھاری نامی گرامی تاجر، جن کے بہی
...توں کی ٹیڑھی زبان سے وہ بخوبی واقف ہیں، اپنی
...یا دکھانے کے لئے موجود تھے۔ اتنے بڑے دربار
...کی موجودگی نے اچانک نانو بھائی کو شاکی کر دیا
...تھا۔ ابھی کہیں کوئی بول اٹھے گا، پہچانا نانو
...نا..... ارے میں کاکا ہوں..... تمہارا دیا

..... پا..... کہاں گئے؟
"جی!..... نانو بھائی نے دل ہی دل میں اپنے
شک کو دھتکارا.....
کون کاکا..... کہاں..... پا..... ؟ یہ [illegible]
[illegible] انکم ٹیکس کمشنر [illegible]
[illegible] پہنچے ہوتے۔ [illegible]
[illegible] بالکونی میں
الجھے تو نانو بھائی نے اپنی بیوی پرمیلا کی جانب
دیکھا جس کی کرسی [illegible]
جاتی تھی۔ اور [illegible] اسکرٹ جیکٹ میں
[illegible] ہیپ برن کی مانند [illegible] تھا۔ بیٹا
فلپس اور بیٹی [illegible] انگریزی کے علاوہ
[illegible] تھے۔ خاندان [illegible] گجراتی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] سے نفرت
[illegible] "یہ میں [illegible]..... [illegible]
ہے [illegible] پاپ [illegible]
دلال..... انکم ٹیکس آفیسر ابھی [illegible]
[illegible] نانو بھائی [illegible] ہتھیلیوں [illegible]
میں گھماتے ہوئے اور [illegible] ہتھیلیوں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سمت ٹکلر کو ٹکٹ دے کر تیزی سے باہر نکلتے ہیں
گلے میں پڑے ہار بانہوں کا بوجھ لگتے ہیں تاجروں
کی چھپائی کاروں کو نظرانداز کرتے ہوئے جیپ کی
سمت پر ہار اتار پھینکتے ہیں۔ پردمیلا کو چھپائی لمبی
اسپورٹس جیپ کا دھکا لگایا جاتا عجیب سا لگتا
ہے۔ بچوں نے نانو بھائی کی عظمت بتا کر ماں سے
اخباروں میں کچھ پوچھنا چاہا لیکن پردمیلا نظر
انداز کر کے باہر دیکھنے لگتی ہے۔ بچے منہ بنا کر
جیپ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ جیپ سڑک کی دھول
میں دھنستی ہے۔ نانو بھائی ایک لمبی سانس لیتے
ہیں۔ وہ بیوی اور بچوں کے دل میں بیدار ہونے والے
تجسس سے واقف ہیں۔ لیکن وقت کے تیزی سے
گھومتے چکر نے اندر ہی اندر ایک بیچ سی باندھ دی
ہے کہ کسی کو بھی نہ تو اپنی دلی کیفیت بتانے کی ضرورت
محسوس ہوتی ہے۔ فاصلہ کبھی کم ہی نہیں ہوتا۔ اس
خلیج کو صرف پیسے سے بھرا جاتا ہے۔

وقت کی کمی نے نانو بھائی کو بچوں سے بہت
دور کر دیا ہے۔ بچوں سے ہی کیوں؟ پردمیلا اور ان
کے مابین بھی تو ایک سیاہ پردہ حائل ہو گیا ہے۔ پیار
اور پیاس کی مجبوری کا بھرپور احساس ہے۔ یہ
سوچ کر ہی انہوں نے صبا کی یتیم خانے سے نکلنے
والی پردمیلا کو منتخب کیا تھا لیکن وہی پردمیلا بھول
گئی کہ زندگی کے محل میں داخل ہونے سے قبل نانو بھائی
کے تلووں میں بے شمار کانٹے چبھے ہیں.... اور ان کے
زخموں کو سہلا کر ہی ان کے درد کو کم کیا جا سکتا ہے
پردمیلا کا فطری حسن کاسمیٹکس اور بیوٹی پارلروں

کی طرف مائل ہو گیا ہے کبھی بھی کی سوندھی مہک
تاج محل پسند نہیں آیا۔ نانو بھائی کو لگتا ہے کہ صاحب
بننے کے باوجود ان کا من شاید عورت کی نگاہ مستی نواز کا
ہے..... شاید یہ ان کے بچے کھچے احساس کمتری
خواب ہے۔ اور اسی لئے انہوں نے پردمیلا کو روکا تھا
اسے کلب، افتتاح، پکنک یا بیوٹی پارلر کی طرف جا
کی پوری چھوٹ دی۔ اس عرصے میں پردمیلا بھی بھول گئی
کہ ہر مرد کے اندر ایک اور مرد ہوتا ہے جو اس کے فطری
حسن، نسوانیت اور سپردگی کے لئے ترستا ہے۔ ا
ترسنے کی ایک الگ قدر ہوتی ہے۔ ایک الگ ا
ہوتا ہے، ایک الگ وابستگی ہوتی ہے۔ جیسے مانو
نانو بھائی اور منصوبوں میں گم پردمیلا کے مابین آج
کوئی خلیج یا دوری نہیں ہے لیکن ایک دوسرے
تک پہنچنے کے لئے صرف سیکس کے پل سے ہی کام ہو
جاتا ہے۔ نانو بھائی اپنی بات کہتے نہیں ہیں۔
اپنے مسائل کو مکمل طور پر کچل دینا چاہتے ہیں۔ پردم
کبھی کبھی جذباتی ہو کر سرا پکڑنا چاہتی ہے تو نانو
اس سرے کو کاٹ دیتے ہیں اور اسے بھی جسم کے
پر کھینچ لیتے ہیں..... اپنی آرزو کو بھول کر۔
خوابیدہ پردمیلا کی پلکوں میں انگلیاں
کرنا نو بھائی زندگی کی آخری گہرائی میں اتر جاتے
گھائل ہو جاتا۔ دہشت نسوں میں تناؤ پیدا کر دیتی،
میں تبدیل ہو جاتی۔ ہاتھ قلم پکڑنے کے لئے بے چین
ہو جاتے ہیں۔ لکھنا ہے۔ کیا ہوا اگر بات متنازعہ
کی ہے لیکن کہنے اور لکھنے کا حق سب کو ہے۔ گند
کے اسرار سے پردہ ہٹا دیں گے۔ ایک نئے سچ اور گند

رائے کی تقلید کریں گے۔

کتنی شاندار حویلی تھی ...... کمرہ در
رہ پار کرتے ہوئے آنگن کی دھوپ تک پہنچا جا
سکتا تھا۔ لوگ بھی کتنے سارے تھے لیکن اپنا
ون تھا؟ بڑے صاحب بھائی (سوتیلے بھائی)
لی سے اڑی مکھی کی طرح دور سے ہاتھ جھڑکتے
.... بھاگ .... بھاگ .... ادھر کیا ہے تیرا؟
بھابی کمر سے پھسلتے جانگئے کا ازار بند پکڑ کر
سی کھلونا گاڑی کی طرح سمت بدل دیتیں ... ادھر
یا۔ ہر کمرہ نانو بھائی کے بچپن کو جھڑک دیتا۔ نانو
بھائی آنسوؤں سے بھیگے ہوئے جانی پہچانی تاریک
کھڑی میں پہنچ جاتے ..... گلا پھاڑ کر چلاتے۔
! لیکن وہاں کے ہاتھ بہت کم ہی خالی ہوتے۔
اپنی بیٹی کو کھلاتی بھابی گلدان کو انہیں گھر سے
یا دھکا دیتیں۔ نانو بھائی نفرت سے فرش پر لگے
فرش پر گرے جانگئے کو گندہ کر دیتے اپنے
سد کے مقابلے میں انہیں ہاں کا چانٹا ہلکا لگتا ہے۔
اور بھابی کو ایک ہی وقت میں درد زہ ہوا تھا
ورنا تو بھائی اسی جنوبی کوٹھی میں نازل ہوئے
تھے۔ دائی بھی ولادت کے بعد پہنچی تھی ہاں کو پوری
تکلیف برداشت کرنی پڑی تھی۔ اسی لئے نانو
بھائی میں اندر ہی اندر درد برداشت کرنے کا
رجحان موجود تھا ..... شاید ہاں کی یاد کے روپ
تھا۔

سوراج بھائی پاریکھ نے بچپن کی عمر میں
گڑوا ہونے ہی حاتم طائی کی سخاوت کا مظاہرہ
کیا تھا۔ اپنی تنہائی بھرنے اور پیاسے بدن کی پیاس
مٹانے کے لئے بے سہارا بیوہ کی اکلوتی بیٹی کو ٹوٹی
پھوٹی جھونپڑی سے اٹھا کر سوراج محل میں پہنچا دیا
تھا۔ اس وقت سروجابین سولہ برس کی تھی۔
سوراج بھائی کا چھوٹا بیٹا بھی عمر میں اپنی نئی ماں سے
بڑا تھا۔ بڑے کی تو شادی بھی ہو چکی تھی۔ سوراج
بھائی کی مثالی شادی میں صرف ان کا چھوٹا بھائی،
مگن بھائی ہی گیا تھا۔ اپنے بھائی سے تقریباً بیس برس
چھوٹا تھا۔ کار میں سسرال آنے تک سروجابین مگن بھائی
کو ہی اپنا دولہا سمجھتی رہیں۔ جانے انجانے مگن بھائی
نے بھی انہیں چھونا چاہا۔ دولہا تو نقلی بتیسی لگائے
جھپکی لیتے رہے۔

نوکر کے بہت دیر تک کنڈی کھٹکھٹانے پر
دروازہ کھلا تھا۔ لیکن اپنے سے بڑے بیٹوں اور بہو
کو دیکھ کر سروجابین کی آنکھوں سے نکلے آنسو شکست
خوردہ ہو کر واپس لوٹ گئے۔ پورے گھر میں طنزیہ جملے
ربڑ کی گیند کی طرح اچھلتے رہے۔ کام کرتی تو
بیٹے کی بہو کہتی۔ "رہنے دو نئی ماں .... باپو نے دیکھ
لیا تو غصہ کریں گے۔ ابھی سے نئی دلہن سے کام لیا
جا رہا ہے۔" اگر کام نہ کرتی تو بیٹے کی بڑبڑاہٹ
سنائی دیتی۔ "پٹ رانی آئی ہیں گھر میں۔"

سروجابین کے پاؤں فرش سے چپک جاتے۔
قدم اٹھتا نہ بڑھتا۔ سوراج بھائی نقلی بتیسی سے
پستے، بادام کی جگالی کرتے ہوئے مائل بہ زوال جسم
کی مردانگی کا مظاہرہ ظلم و ستم کے ذریعے کرتے۔ سروجا
بین کو لگتا کہ اس کی نسوانیت دھوبی گھاٹ کی

[illegible] جسم [illegible]
[illegible] سو جاتے ہیں۔
لیکن سروجا بین کا تن من خود کو کوسنے کی
[illegible] جلتا رہتا تھا۔ رات سوتے اور خواب
دیکھے بغیر کٹ جاتی۔ دن میں گھر داری کی ایک آسیب
زدہ [illegible] کا عمل معلوم ہوتی۔ مگن بھائی بطور تحفہ بھیجی
گئی سامان آرائش سنگار میز پر سجا رہتا اور سروجا
میکے کے آنگن کے مطلق آسمان کی یاد میں کھوئی رہتی۔
آزادی سے لطف اندوز ہونا چاہتی لیکن پیسے اور
مقام کے رد عمل نے کیسا کیمیاوی فارمولہ تخلیق کیا ہے
اس کا پتہ ہی نہ چلا۔ پتہ چلا تو سیدھے جنوبی تاریک
کوٹھری میں پناہ لی اور وہیں ایک مٹیالی شام
کو نانو بھائی تولد ہوئے۔ تقریباً اسی وقت بیٹے کی
بہو نے لڑکی کو جنم دیا۔ گھر لوٹ کر طنز کرتے ہوئے شوہر
سے بہو نے کہا تھا "کچھ صحت بخش غذا کھایا کرو، ورنہ
ملاوٹ کی کمائی جہیز میں ہی نکل جائے گی۔" سروجا بین
نے نانو بھائی کو کس کر سینے سے چپٹا لیا تھا۔ سروجا
بین کو سہارا ملا تھا لیکن شوہر کی ہوس اس کا تعاقب
کرتی تھی جب نانو بھائی چوبیس کے تھے۔ جنوبی کوٹھری
میں ماں بیٹے کی دنیا دن بھر آباد رہتی متصل راہداری
سے ملحق کمرہ جس میں سوزیک اور تجوری لگی ہوئی تھی وہ
سوراج بھائی کا تھا۔ نانو بھائی با کی گردن میں باہیں
ڈالے سو رہے ہیں کہ یکایک کسی کی ہچکی آتی ہے۔ کوئی
چبھتی ہوئی انگلیوں سے ہٹاتا ہے۔ سوراج با کا جی کا
سے کھینچتا ہے۔ "ابھی کچی نیند میں ہے سو جائے گا تو
میں خود آ جاؤں گی . . . ."

سوراج بھائی کو یہاں [illegible]
ایک پیاس لگتی ہے۔ نانو بھائی ایک طرف چپک
دبکے جاتے ہیں اور با کے گلے سے ایک [illegible] سسک کر
جاتا ہے۔ نانو بھائی پھٹی پھٹی آنکھوں سے فضا میں
[illegible] جاتی کالک کو دیکھتے ہیں۔ دہشت اتنی زیادہ
ہے کہ چیخ بھی نہیں سکتے۔ رو بھی نہیں سکتے۔ نانو بھائی
اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ
راستہ بھی گوں گوں سنائی دیتی ہے۔ لوٹ کر سونے
کا بہانہ کرتے ہوئے پلنگ پر لیٹ جاتے ہیں۔ با نہ
جانے کب آ کر سسکتے ہوئے سینے سے لگا لیتی ہے
نانو بھائی کا ننھا کلیجہ آنسوؤں کے بہاؤ سے کتنا دہل
گیا۔ ایک دن 'با' سے رونے کی وجہ پوچھ بیٹھے تھے
با نے کہا تھا: "تو نہیں سمجھے گا نانو . . . ." تب با
چوبیس کی تھیں اور بابو جی ستر کے۔

شاید وہ پہلی بار تھا اور آخری بار بھی۔ با جی
نے نانو بھائی کا سر سہلاتے ہوئے، اندھیری کوٹھری
میں باتوں کی مصری با[illegible] تھی۔ "سروجا بین، تو چپ کیوں
رہے؟ ارے یہ گھر بار سب تیرا ہی تو ہے۔ تو تو
مالکن ہے۔ جیسا نانو تیرا ہے ویسے اور بھی تیرے۔"

دو چار دن سب بھائیوں کا رویہ بھی بدلا رہا
کسی نے لڈو کھلائے تو کسی نے چٹپٹا ڈھوکلا۔ نانو
بھائی کمسن سی [illegible] آنکھوں سے اس تبدیلی کو دیکھتے
رہے۔ سب بھائیوں نے با کہنا بھی شروع کر دیا تھا
لیکن رات میں اسے سویا ہوا سمجھ کر با دیواروں کو
کیا سناتی رہتی۔ "سب بے ایمان ہیں۔ اب دودھ
کے پیچھے کا خرچ [illegible]۔ اسی لئے دیور کو بھائی سے

[illegible]
[illegible]
سے [illegible]۔ ان دونوں کو گرفت میں
ہی بابا نے دونوں کو۔ تو جیسا ہوتا تو الگ راستے
دیتا۔

اس وقت نانو بھائی بابا کی بات سمجھ نہیں سکے
لیکن فقط کچھ بھی یاد ہے۔ حویلی میں وہی تو بابا
ساتھ اندھیری کوٹھری میں آخری رات تھی۔
کے بعد تو فادر منیکن کے کھلی کھڑکیوں میں
کمرے میں آ گئے تھے بابا کی انگلی چھوٹ گئی
تھی جس طرح کشتی کی ندی کنارے چھوڑ آتی
اسی طرح بابا نانو بھائی کو چھوڑ گئی تھی۔

طلوع آفتاب سے پہلے ہی بابا کو لاتوں
کروں کے ساتھ کوٹھری سے باہر نکالا
ا۔ نانو بھائی چیخ اٹھے تو بڑھے سا
نے نانو بھائی کو گیند کی طرح اچھال دیا
جوان آنکھوں سے آگ اور بوڑھے جبڑوں
ہاگ گر رہے تھے۔ بابا نے منہ ہی منہ میں کہا
بیٹا ۔۔۔ پھر [illegible] کتوں سے بے نیاز
بھائی نانو بھائی کی انگلی پکڑے سیلوں چلتی
[illegible] فادر منیکن کے سپرد کر کے
[illegible] بھول کر چھوڑا تھا [illegible] سے نکلے
پریشانی سے نانو بھائی دیکھ رہے تھے۔
یاد [illegible]
[illegible]
[illegible]

کر گئے تھے۔ خاندانی حویلی اور [illegible] محبت اور
[illegible] کے معانی جو نانا ابا نے اپنا مفہوم کھو چکا
تھا۔ صرف نانو بھائی اپنے ساتھ تھے۔ ان کے
لئے کوئی نہیں تھا۔ شاید زندگی کا آغاز اسی دن سے
ہوتا ہے جب انسان سمجھ لیتا ہے۔ وہ تمام زمین
پر متحرک کے درمیان اکیلا ہے۔۔۔۔ اس کا کوئی
نہیں ہے۔ اس تلخ حقیقت کا عرفان نانو بھائی
کو سات آٹھ برس کی عمر میں ہی ہو گیا تھا۔ سب
کی ممتا بھول کر گلے میں پڑے کراس سے اندر ہی
اندر باتیں کرنی شروع کر دی تھیں۔ کتابوں میں گم
ہو جانا اپنی منزل مقصود بنا لی تھی۔

انہوں نے ہائی اسکول میں فرسٹ کلاس فرسٹ
آ کر اپنی زندگی کی تعمیر شروع کی تھی۔ فادر منیکن
سے بھی رخصت مل گئی تھی۔ فادر منیکن کے سامنے
پوری داستان دہرائی تھی۔ بابا کا کاکا کے گھر بیٹھ
جانا اور بالو کا سڑ سڑ کر مرنا یہ سب کچھ بتا دیا تھا۔
بوڑھے راکشش کی جہنمی موت سے جہاں سکون نصیب
ہوا وہیں بابا کی شادی شدہ بن جانے کی خبر سے شدید
صدمہ ہوا۔ اندر ہی اندر رنج و الم میں ڈوبتے ہوئے
نانو بھائی آنسو پی گئے تھے۔ پھر مشن کی جانب
سے مزید تعلیم کے لئے بھیجے جانے کی تیاری کر رہے
تھے یہ خبر ملی کہ بابا اب کاکا [illegible] بھائی کی بیوی
کہاں ہے۔ نانو بھائی کو یہ محسوس ہوا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

مرجہ ہونا گیا ہوا تھا کہ وہاں میرا ایک جگری دوست
رہتا تھا اور نوکری دلانے میں میری مدد کر سکتا تھا۔
پونا میں مجھے کافی روز لگ گئے۔ اس دوران میا ماری
میں میرے بوڑھے والدین، بہن اور بھانجا بھی بھگوان
کو پیارے ہو گئے۔ منٹو کی شکل میں میں اپنے بھانجے جینو
کو دیکھ دیکھ کر دل کو تسکین دے لیا کرتا تھا۔

جگر دھر پانچ سال کا ہوا تو اسے قریب کے
میونسپل اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ویسے تو وہ بڑا
ذہین و فہیم تھا لیکن ماں باپ کے لاڈ پیار اور گھر میں دولت
کی ریل پیل کے باعث وہ تعلیم کی طرف کم دھیان دیتا۔
شرارتوں اور کھیل کود میں زیادہ۔ امتحان کے دنوں میں
ٹیوٹر پڑھاتا یا پڑھانے کی کوشش کرتا لیکن ان دنوں
میں بھی اس کا پڑھائی میں دل نہ لگتا۔ کبھی کسی کلاس میں
اور کبھی کسی کلاس میں فیل ہو جاتا۔ بہرحال جب اس
نے ساتواں درجہ پاس کیا تو وہ پندرہ سال کا گبرو
نوجوان نظر آنے لگا۔ اس کے بعد اس نے آگے
پڑھنے سے انکار کر دیا۔

دکھل رام نے اسے اپنے ساتھ دھندے میں
لگا لیا۔ چند ہی روز میں وہ دھندے میں باپ کے بھی
کان کاٹنے لگا اور ان کا دھندا دن دوگنی اور رات
چوگنی ترقی کرنے لگا۔ پیسے کی اور زیادہ ریل پیل ہوئی
تو جگر دھر نے ادھر ادھر کے خالی پلاٹوں پر کئی نئے جھونپڑے
تعمیر کرا لئے۔ اور پگڑی وصول کر کے کرائے پر چڑھا دیئے
ان دنوں ایک اچھے جھونپڑے پر دو سے تین ہزار
کا خرچ اٹھتا تھا۔ ڈیڑھ دو ہزار پگڑی کی صورت میں
وصول ہو جاتے اور پچاس سے سو تک بھاڑا وصول ہو
جاتا۔ بمبئی کی آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ جگہ
کی قلت کے باعث پگڑی اور کرایوں میں کافی اضافہ
ہونے لگا تھا۔ اور اسی حساب سے دھاراوی کی رونق
میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ نئے تعمیر ہونے والے مکانات
میں زیادہ تعداد جگر دھر کے جھونپڑوں کی تھی۔

سائین کے علاقے میں بھی نئی نئی عمارتیں تعمیر
ہونے لگ گئی تھیں۔ جگر دھر نے ایک بلڈر سے ایک
زیر تعمیر پوری کی پوری چار منزلہ عمارت کا سودا کیا
تھا۔ تین مالے اس نے پگڑی لے کر کرائے پر چڑھا
دیئے۔ وصول شدہ پگڑی کی رقم سے ساری بلڈنگ
کی قیمت نکل آئی تھی بلکہ کچھ منافع بھی ہو گیا ہوگا
پورا دوسرا مالا اس نے اپنی رہائش کے لئے رکھ لیا
اس کے فرنیچر اور آرائش پر اس نے پیسہ پانی کی
طرح بہایا اور اسے ایک رئیس ابن رئیس کی رہائش
کے قابل بنا لیا۔ لیکن اس کے والدین نے اپنا
جھونپڑا چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ ویسے جگر دھر
کی بھی یہی منشا تھا کہ وہ اس کے پاس نہ رہیں ورنہ
وہ انہیں مجبور کر کے بھی نئے مکان میں لا سکتا تھا
اس نے یہ فلیٹ بڑے بڑے لوگوں کی آؤ بھگت
کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ کیونکہ بڑے لوگوں
سے سنگت کے بغیر وہ خود بڑا لوگ، نہیں بن سکتا
اور بڑے لوگوں کی رنگ رلیوں کے لئے ہر طرح کے
جٹا دیئے تھے۔

جگر دھر جب مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا، اپنے
دو تین سے زیادہ درباریوں کی معیت میں دھاراوی
کے کوچہ و بازار کا چکر لگاتا تو بڑے بڑے دکاندار

بھی جینے کا احساس ہی ملتا ...... آنکھیں
بند کئے خوابگاہ کی مدھم روشنی میں پڑی رہتی۔
پرمیلا لوشن کے نیچے اپنی جلد کو محسوس
کرتی اور جسم کا لمس اس کے احساسات کے رتھ
کو، وقت کے چکر کو الٹا پہنچا دیتا ہے۔ دور بہت
دور۔ پرمیلا ڈسٹیمپر پر نظر جمائے نادیدہ سپنے
کھوئی کھوئی رہتی۔ کبھی اس غریب [illegible] کی
طرح حسرت بھری نظروں سے سابرمتی کے بھرے
بھرے پانیوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ دکانوں کے
شوکیسوں میں سجی چیزوں کو حسرت بھری نظر سے
دیکھتی تھی اور آج؟ جہاں جاتی ہوں ہر مقفل
الماری کا تالا اپنے آپ کھل جاتا ہے۔ سیلیں
میں ہر زیور، کپڑا یا کوئی اور شے میرے سامنے یوں
پیش کرتا ہے جیسے میں اسے لے کر ان پر احسان
کروں گی۔ بل مانگتی ہوں تو ہاتھ ملتے ہوئے شرمندگی
سے کہا جاتا ہے "شرمندہ نہ کیجئے میڈم، کہیں گھر
والوں سے بھی دام لئے جاتے ہیں؟" کبھی یہی دوکان
سیٹھ کے پاس کھڑے ہونے پر دھتکار بھی
دیتے تھے۔ جیسے غریب ہونے کا مطلب ہے چور
ہونا [illegible] ایک بدبو پیدا کرتا۔ ان کے
[illegible] آواز [illegible] پرانے
[illegible] پر مرہم کا کام کرتے ہیں۔ میرا [illegible] ایسے
وقت بہت [illegible] محسوس کرتا ہے۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]

آج وہ جو کچھ حاصل کر رہے ہیں ہم [illegible] حاصل
کر رہے ہیں ہم ان کے لئے [illegible] ہیں۔ ماضی کو
سلیٹ پر لکھے الفاظ کی طرح [illegible] پونچھ کر مٹایا
نہیں جا سکتا ہے۔ لیکن آدمی اسے اہمیت دے
کر اپنے سکھ کو برباد کر لے، یہ بھی مناسب نہیں
ہے۔ شاید چھپے سے جیا ہو جانا ہی تمہیں دکھی کرتا
ہے۔ لیکن گرہستی کے چکر میں اقرار کی حاضری
کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

"آج بھی تم دوسروں کو طعنے دے رہے ہو۔ پھر
اندر یہ ندامت کیوں؟ اگر تم چاہو تو ان کو سڑک پر
ننگا کھڑا کر کے تماشہ بنا سکتے ہو جنہوں نے تمہیں
ستایا تھا۔ پچھلے ماضی کو بھول کر تم ان کے حال
پر ہنس سکتے ہو۔"

لیکن پرمیلا کی آغوش میں ملی راحت عارضی
ہی ہوتی ہے۔ پرمیلا اپنا فرض ادا کر کے گہری نیند میں
کھو جاتی۔ نانو بھائی کو بھلانے کی کوشش میں یاد اور
زیادہ یاد آنے لگتی۔ لگتا کہ گنتی کی تاریخ ایک بڑا
جھوٹ ہے...... زمانہ کس کے غصے کو ترجیح
کیوں نہیں دیتا؟

دفتر سے نکل کر [illegible] کار [illegible] کی جانب موڑ
دیتے ہیں۔ [illegible] بھائی کی [illegible]
[illegible] ہے " [illegible] کہاں ہے حضور؟"
[illegible]
[illegible]
[illegible]

نانو بھائی [illegible] کون کون ہوتا ہے؟
[illegible] لڑکے ... ایک ہو
[illegible] اس کا بچہ" مگر [illegible] بڑی آواز سے کہتے
ہیں

"صرف دو لڑکے ہیں آپ کے؟ اور آپ کے
بھائی کے؟"

"بھائی سے کیا ... ان کے تو تھا ہی ... ایک
[illegible]" اس سے آگے مگر [illegible] کچھ نہیں کہہ
پاتے

"جو تھا بھاگ گیا کیا؟" نانو بھائی پوچھتے

"اس سے انکم ٹیکس کا کیا مطلب؟" جبڑا کسی
[illegible]

"سمجھا، وہی جو تھا لڑکا اپنے باپ اور اپنی
ماں کی جائیداد میں حصہ چاہتا ہے ... اسی لئے مجھے
[illegible]"

نانو بھائی پورے [illegible] کا جائزہ لیتے ہیں۔ لیکن [illegible]
کہاں رکتا ہے۔

"سنا تم نے ... تیرا نانو جائیداد میں حصہ مانگتا
ہے باپ کی جائیداد سے بھی ماں کی جائیداد سے ..."

سروجا بی اپنے چھریرے بدن اور [illegible]
[illegible] بے آواز آہٹ کے ساتھ آ کر پردے کے
پیچھے [illegible] ہیں۔ نانو بھائی کا [illegible] کا [illegible]
[illegible] ہوتا ہے کہ [illegible] کے سینے پر [illegible]

[illegible] آنکھیں [illegible]
ہے۔ ممتا آلود چہرہ ... دکھی اور وحشت زدہ
آنکھیں ... کیا تم سب کچھ حاصل کر کے اتنی ہی
مفلس اور تنہا ہو یا جتنا کہ میں ..."

نانو بھائی سر زدہ سے بیٹھے رہتے ہیں مگر
بھائی غصے کے ساتھ ہتھیلی پر مکا مار کر کہتے
ہیں: "جو میرا نہیں ہے اس کا جائیداد میں حصہ کیسا؟
وہ میرے بھائی کب سے ہوا میں نے گود کبھی نہیں لیا؟
پھر کیسا حصہ؟"

"لیکن ادھر والے کہتے ہیں کہ ماں کے ساتھ گیا
تھا ... یہاں چھوڑا ہوتا تو یہاں کا حصہ ہوتا۔ وکیل
کہتے ہیں کہ دونوں پر حق ہے" نانو بھائی جذبات کو
دبا کر غیر جانبداری سے کہتے ہیں۔

پردے کے پیچھے باکی کی نیچی، سسکتی آواز
کانوں میں پہنچتی ہے۔

"دے دو اسے بھی حصہ ... جیسے جگت اور
رجت ... ویسے ہی نانو بھی میرا ہے۔ میں ہی تو اسے چھوڑ
کر آئی تھی ... لیکن ایک بار بھی ملنے نہیں آ سکا
اسے [illegible] یاد نہیں ... یاد آیا تو صرف جائیداد
کا حق ... آخر اپنے باپ کا خون ہے ..."

نانو بھائی کو لگتا ہے کہ یکایک کسی کی اذیت
کے سامنے کسی کا غصہ ٹھنڈا پڑنے لگا ہے۔ وہ باطنی
ہیجان کو ضبط کر کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں: "یار
میں نانو [illegible] اپنے باپ کا [illegible]
ماں کا [illegible] ہے ... [illegible]"

لیک کر دروازے کی طرف جاتے ہیں تبھی
ای للکار سنائی دیتی ہے۔
" رک جا نانو، میں نے تجھے پہچان لیا ہے
... چھل مت کر"
نانو بھائی رکتے نہیں ہیں۔ ہکا بکا سگن بھائی
روازے کے سامنے ازلی رشتوں کے درمیان
یسے دشوار گزار چٹان کی طرح کھڑے تھے۔ نانو
ھائی اسے چھوئے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جانتے
یا کہ رک جانے کا مطلب ہے بندھ جانا۔ گاڑی
ے چلتے ہی ان کے غصے کی پرچھائیں پچھلی سیٹ
ے کو دکر او جھل ہو جاتی ہے۔ سابر متی آشرم کے
ہر کار روکتے ہیں اور ٹکٹ خرید کر اندر داخل
جاتے ہیں۔ جہاں لائٹ اینڈ ساؤنڈ کا انگریزی
چل رہا تھا۔ پردے کے پیچھے سے شبد کیرتی کا بھجن
بجتا ہے جس کا مطلب کچھ اس طرح ہے کہ انسان
ا کو سمجھئے جو دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کرے۔
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ماندے جسم کے
باعث راحت بن جاتے ہیں۔ اٹھتے ہی تو بھری
ہ سابر متی (ندی) میں چاند کو ہنستے ہوئے
یکھتے ہیں کسی بھی غصے کا نام و نشان نہ تو نانو بھائی
ند تھا نہ قدرت میں ایک بے پناہ سکون انہیں
آغوش میں سمیٹ رہا تھا۔

ختم

نئی کتابوں کا تعارف

[کت]اب :۔ متاعِ نورِ سحر (شعری مجموعہ)
[تخل]یق کار :۔ سید احمد سحر
[ضخا]مت :۔ ۱۴۴ قیمت :۔ ۵۰ روپے
[ملنے کا پتہ] :۔ مصنف، محلہ خلیل غربی، شاہجہانپور، یوپی ۲۴۲۰۰۱

سید احمد سحر کہنہ مشق شاعر ہیں اور اب متواتر [...] تجربات کی وجہ سے ایک 'سند' کی حیثیت اختیار کر [چکے] ہیں۔ ہمارے ان اساتذہ میں گنے جاتے ہیں جن سے [...]ت کا اعتبار مستحکم ہوتا ہے۔ پیشِ نظر مجموعہ کلام "[مت]اعِ نورِ سحر" ان کا چوتھا مجموعہ ہے اس سے پہلے [آئ]ینہ سحر "سحر رنگ" اور "سحر نشاں" کی اشاعت ہو چکی [ہے] اور شاعری کے قارئین ان مجموعہ ہائے کلام سے متاثر [ہوئ]ے ہوں یا نہیں مگر ان کے مخصوص تخلیقی مزاج سے باخبر [ضرو]ر ہو چکے ہیں۔

سید احمد سحر جیسے مشاق اور استاد شاعر کی تخلیق[...]ات کا تنقیدی تجزیہ اور ان کے خوب و زشت کا محاسبہ [...] معنی نہیں رکھتا کہ جو رنگ پکا ہو چکا ہے [...] اب ہمیں صرف اتنا حق رہ جاتا ہے کہ انہیں پڑھیں اور ان کے کلام کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کریں، "خذ ما صفا دع ما کدر" کے اصول پر جو کچھ حاصل کرنے کی چیزیں ہیں وہ حاصل کریں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ جناب سحر کے کلام کی معیاری درجہ بندی بحثِ فضول کی مصداق ہے ہاں یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ انہیں شاعروں کے کس قبیلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ روایت، انحراف، اظہار و بیان کے رویے، الفاظ و بیان کے استعمال نیز شعر کے کل تاثر کی حیثیت سے ان کی شاعری کس حد تک دلپذیر ہے۔ یہ ایسے امور ہیں جن پر مجموعہ کے ابتدائی [...] گرد پوش اور فلیپ پر ڈاکٹر تاما چرن رستوگی، کالی داس گپتا رضا، ڈاکٹر سعید عارفی، رباب رشیدی، عشرت قادری، پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر سیفی پریمی اور سید علی جواد زیدی نے اپنے تاثرات رقم کر دیے ہیں ان قیمتی آرا کا احترام کرنا چاہیے میں ان خیالات کی تائید کرتے ہوئے صرف اتنی بات کہوں گا کہ جناب سحر بنیادی طور پر شعرا کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو [illegible]
[illegible]

مشکل ہے کہ ہم معلومات کے بغیر زندہ بھی رہ سکتے
اور بعض معاملات میں بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس
مرکز میں رہ کر اس کے ارد گرد جتنے دائرے بنا سکے
بنا اس کی بات ہے۔

● — علیم اللہ حالی، گیا

تخلیق :- تاج المساجد کی کہانی (منظوم مجموعہ)
تخلیق کار :- کوثر صدیقی
قیمت :- تیس روپے
پتہ :- طیب ولا، ۵۰۷ گنوری ین روڈ بھوپال-۱-۲-۴۶

اس دور ادب کی یہ بدقسمتی روز اول سے رہی
ہے کہ اس کے شعراء و ادبا کی ایک خاص تعداد نام و نمود
کی حرص و ہوس سے نا آشنا ہو کر چھپنے کی بجائے چھپنے
کو ترجیح دیتی رہی ہے۔ کوثر صدیقی بھی ایسے ہی شاعر ہیں جو
ایک طویل خاموشی کے بعد اب حلقۂ احباب کے اصرار پر
اپنی تخلیقات کو کتابی شکل دے رہے ہیں۔ اس سے قبل
"پھول ایک ہی چمن کے" ان کے فنی بصیرت، قادر الکلامی
سلاست و روانی اور استادانہ رنگ سخن کی نشاندہی کرچکا
ہے۔

اردو میں منظوم حکایت گوئی اور واقعہ نگاری
کی مثالیں قدما کے یہاں بھی ملتی ہیں جس سے شعراء کی استادانہ
صلاحیت اور فنی گرفت کی پرکھ ہوتی ہے۔ "تاج المساجد
کی کہانی" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں بھوپال
کی عظیم الشان مسجد "تاج المساجد" کی تعمیر و تکمیل کے
پہلے واقعات قلمبند کئے گئے ہیں۔ داستان کی طرح
ہر اہم جزوی و ضمنی واقعہ سلسلہ بہ سلسلہ یکے بعد دیگرے
سامنے آتا ہے۔ از الف تا یے ان کے درمیان ربط
اور منظوم داستان کی خوبیاں موجود ہیں جو شاعر کی فنی
مہارت کی شاہد ہیں۔ اس ضمن میں کچھ ایسے حقائق
سامنے آئے ہیں جو اب تک پردۂ خفا میں تھے۔ بہر حال
اس کی فنی پرکھ بے سود ہے۔

اس کی قیمت بہت معمولی ہے جسے اس دور میں
مفت کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ ادب کے پروانوں کے
اس کا مطالعہ سود مند ہوگا۔

● — سید ابوالفیض سیدابادی، گیا

تخلیق :- سبزۂ خیال (مجموعہ نظم)
تخلیق کار :- شوکت علی صدیقی
پتہ :- مکتبہ دین واعظ امین الدولہ پارک امین آباد، لکھنؤ
زر تعاون :- چالیس روپے

"سبزۂ خیال" شوکت علی صدیقی کی [illegible]
سے ۱۹۹۰ء تک کی ... چنیدہ نظموں کا ..... صفحات پر مبنی
مجموعہ کلام ہے۔ جس کی اکثر نظمیں مختلف جرائد و رسائل میں
اشاعت پذیر ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ صنف
شاعری میں نظم نگاری کو ایک مشکل صنف مانا گیا
ہے کیونکہ اس کے لئے خیالات کی یکسوئیت و یکانگت
سے ہمہ وقتی وابستگی ترنم، موسیقیت اور دیگر لوازمات
شرط لازم ہیں۔ جبکہ غزل کے اندر مختلف النوع خیالات
کی عکس کشی کی آزادی ہے۔ نظم نگاری کے لئے ضروری ہے
فنکار کو فن پر مکمل عبور ہو اس کی فطرت میں یکسوئیت

اور کیف پرور مشق ہو۔ شوکت کی نظموں میں کیف و سرور

سرشارانہ، تسلسل و روانی، ترنم و موسیقیت اور

کیفیات و جذبات دل کا اظہار مکمل طور پر ملتا ہے۔

حسن فطرت سے ان کی والہانہ محبت و وابستگی ان کی نظموں

سے عیاں ہے۔ ان کے الفاظ و بیان میں بلا کا جادو ہے

جو قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ سحر انگیزی حرف اول سے حرف

آخر تک یکساں طور پر قائم رہتی ہے جو ان انفرادیت اور

طرۂ امتیاز ہے۔ منظر کشی میں تو انہیں کمال ید طولیٰ حاصل

ہے۔ ان کی یہی خوبیاں ان کی نظموں کو لافانیت بخشتی ہیں۔

یہ خوبیاں ان کی آزاد نظموں میں بھی کم و بیش ہیں۔ شوکت

نے انگریزی ادب کے شعراء سے استفادہ حاصل کیا ہے

اور ان کے انداز میں بڑی خوبصورت نظمیں کہی ہیں۔ مشمولہ

نظموں میں کسے سب سے عمدہ کہا جائے یہ امر محال ہے کیونکہ

ہر نظم اپنے صوری، صوتی اور تاثراتی زاویہ نظر سے اپنی

اپنی جگہ آفتاب ہے اور قاری کے قلب و جگر پر دیرپا تاثر

چھوڑتی ہے۔ قاری اس کی نغمگیت۔ موسیقیت، ترنم، الفاظ

لہجہ کی شیرینیت، وادیٔ حسن فطرت کی سیر و سیاحت اور

بیان کی جادوگری میں دیر تک کھو جاتا ہے وہ کچھ دیر تک

تمام غم و الام اور فکر و فجور سے آزاد ہو جاتا ہے اور پھر

ایک نئی تازگی و چستی کے ساتھ دنیائے عمل میں واپس

لوٹتا ہے۔ شاعری و موسیقی کے مقاصد میں ایک مقصد

یہ بھی ہے کہ اس کا قاری و سامع دل و دماغ کے لمحاتی کیف و

سرور اور قلبی آسودگی سے بہرور ہو۔ اس پیمانے پر ان کی

نظمیں کھری اترتی ہیں (فی الحقیقت مقصد متذکرہ

ایک خفیف اور ضمنی مقصد ہے)۔

شوکت صدیقی کی نظموں میں کچھ خامیاں بھی

ہیں۔ انہوں نے کہیں کہیں تعقید بیجا سے کام لیا ہے جس

سے گریز ممکن تھا۔ بعض نظمیں اپنے نقطۂ عروج کے بعد

بھی جاری و ساری ہیں جب کہ اختتام ممکن تھا۔ مثال

اس لئے نہیں دے رہا ہوں کہ شاعر ضرورت شعر کو خود

سمجھتا ہے اور نظر ثانی کا اختیار رکھتا ہے۔ شوکت

صدیقی نے کچھ شاعری کی زبانی، عنوان کے تحت شاعری

کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ حق بجانب

نہیں ہیں۔ ان سے میں اتفاق نہیں کرتا۔ شاعری کو وہ

ذریعہ تفریح مانتے ہیں جو اپنے قاری کو محض دنیائے

خواب و خیال کی سیر کراتا ہو۔ اس کے لئے وہ انگریزی

ادب کے مشہور نیچرل شاعروں کی مثال پیش کرتے ہیں

جبکہ ان شعرائے کرام نے بھی اپنی نیچرل شاعری میں زندگی

کے جن حقائق اور بشری نفسیات کو پیش کیا ہے وہ

لافانی ہیں۔ Oddson Solitude, 'Lucy

Gray' Rain in summer The rain

Bow Blow Blow Though winter

winds۔ یا اس طرح کی دوسری نظموں کے در پردہ

پیغامات کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اردو ادب میں اقبال کی

فطری نظمیں نیچرل شاعری کی اعلیٰ ترین مثالیں ہیں۔ خود

ادب نے ہر عہد میں اپنے عصری مسائل، حالات معاشرہ

اور زندگی کے حقائق کی ترجمانی کی ہے۔ اسے میں یا کوئی

صاحب فکر و نظر بطور مباحثے ماننے کو تیار نہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی صنف ادب بغیر ٹھوس

حقائق بے معنی و مہمل ہے۔ حقیقی ادب خواہ نثری ہو

شعر و ادب ہے جو ہماری زندگی احساس کے گوناگوں
مسائل و کرب و تپش کی عکاسی کرتا ہو۔ دلو ملائی قصے
یا فوٹو گرافی کی عکاسی و منظر کشی محض بیساکھیوں کی
کے سہارے نہ تو کوئی ادب پروان چڑھ سکتا ہے
نہ ہی اپنی افادیت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس
طرح کی شاعری ہمیں محض وقتی ریلیف دے سکتی ہے
جس سے ہمیں اسکے سہارے کسی کام کی نہیں۔

بہرحال اپنے نقطۂ نظر کے حساب سے انکی شاعری
بانہیں ہے اس کا مطالعہ تھکے ہوئے ذہن کی آسودگی
اور قلب بے چین کے سکون کے لئے کیا جا سکتا ہے۔
پر شاعری کی دلدادگاں کے لئے یہ ایک انمول
تحفہ ہے۔ زندگی کے حقائق کی گہری غوطہ زنی کے لئے ڈھونڈے
سکتے ہیں۔

کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ فہرست اغلاط
اور مطالعہ ہے۔ سرورق عمدہ اور قیمت مناسب ہے

● ——— سید ابوالفیض سیدابادی

تعلق: سوکھے جزیرے کی دعا

تخلیق کار: یوسف جمال

ملنے کا پتہ: یوسف جمال۔ راج گانگ پور واڑیسہ

"سوکھے جزیرے کی دعا" جواں فکر شاعر
یوسف جمال کا اولین شعری پیش کش ہے۔ جو ایک
نعت شریف (نذرانۂ عقیدت بشکل فریاد) ۸۰ غزلوں
نظموں اور ۱۹ آزاد غزلوں پر مشتمل ہے۔ جس سے
ظاہر ہے کہ شاعر کا رجحان غالب غزل کی طرف
ہے۔ اگرچہ نظموں پر بھی اسے یکساں قدرت حاصل
ہے اور اسلوب کی گرفت مستحکم ہے۔

"سوکھا پن" زندگی کی ناکامیوں، نا آسودگیوں
اور منفی عناصر حیات کی علامت ہے۔ یہی سبب ہے
کہ یہ خشکی، شعوری اور غیر شعوری طور پر یوسف جمال
کے اشعار میں در آتی ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ
ہوں۔

سوکھے جزیرے کی بھی دعا بے اثر رہی
رہ کر سمندروں میں بھی وہ تشنہ لب رہے

آنکھوں میں جتنا کرب کا پانی تھا بہہ گیا
تھا میرا جسم یا کوئی سوکھا درخت تھا

ہم سفر بن گئی جب "سوکھے جزیرے کی دعا"
منتظر طوفاں کی ہے مجھ کو رہنا ہے موجوں کی

میرے گھر میں سوکھے پیلے پتے تھے
لان میں اس کی بکھری ہوئی رنگینی تھی

سوکھی سڑک کی پیاس نہ بجھ سکی
پیاسی تشنہ کام ہے بارش کے باوجود

مجھ کو سوکھے ہاتھوں کی تقدیر سمجھو اور ڈرو!
میں آخرم کا باشندہ ہوں، میرے سائے سے بھاگو!

اپنا خاطر ہو یا غیر کے واسطے، خون باقی جو تھا سب نے دیا
کیا جانا ایسے ہی وقت دیکھا ہی [illegible]

جھوم کر کتنی گھٹائیں آئیں اور رخصت ہوئیں
پھر بھی سوکھی تھی ہمیشہ سے رہی سوکھی زمین

یہ سوکھی سڑک اصل میں پیمانۂ حیات ہے۔

اسی طرح نظموں میں بھی [illegible]

چھونے لگی ہے ایک ہتھیلی / مری سوچ کے کالروں
سے [illegible] لفظوں کا ہیولیٰ مرے سوکھے ہاتھوں
پر لپٹا ہے [illegible] نگاہوں تک / یہ بجھو تھکن کا / ابھی میں
اذیت کے دوزخ [illegible] جلتا ہوں۔

(شہادت [illegible])

میرا مقدر / سوکھے پتوں کی مانند لرزیدہ ہے /
اس پر لکھے ہیں میری زیست کے کل حالات
منقش کر دیا اس میں وقت کی دھوپ جلا کے ساری
عبارت / انگاروں کی سیاہیوں سے لکھی ہوئی ہے
ہر اک سانس لہو تھوکے ہے / جسم ہے میرا خون سے خالی /
سوکھی ہڈیاں جھانک رہی ہیں مجھ کو موت کی سرحد
تک لے جاتی ہے ... (جنم جنم = ؟)

خشک ہتھیلی پہ سرسوں کب جم پائے گی / رات
کی بوسیدہ ہتھیلی میں خواب کا چہرہ کب چمکے گا ؟
بیت جھڑ کے اوراق پہ اجلے حرفوں کا کیا جشن
مناؤں / خواب کے سوکھے کھیت میں کب تک نیندیں
بو کر میں آہٹ کی فصل اگاؤں

(لہو تھوکتے خواب)

اور — خواب کے رنگ منچ پر / بوڑھی ہوس
عریاں عریاں سی ناچ رہی ہے / رات پچھتاوں کی سوکھی
ہتھیلی پہ لے کر [illegible] / یہ کہتی ہے / "سو جا
میرے شہر تمنا کے شہزادے"

(ایک زرد پیلی نظم)

زندگی ہے کہ سلگتی ہوئی ریت / زیست
ہے یا کوئی تپتا ہوا صحرا سا ہے بے آب و گیاہ

خشک لمحات کا عنوان لئے۔

(آج کا اخبار [illegible])

رات آدھی ڈھل چکی تو سلوٹوں کی سیج
پر خواب ایک دیکھا کر
میں عجیب کرب میں لگاتار مبتلا رہا ہوں
آپ سے یوں تڑپ رہا تھا کہ
میری سوکھی انکھیاں فرش کے پاس سر ٹکرا
رہیں۔

(آخری رات کا خواب)

ایک جل سے بھری ندی دیکھا / پانی رستہ
ہوئے جو سوکھی ہے۔ پانی پیتے ہوئے جو پیاسا
ہے —

([illegible])

مندرجہ بالا غزلیات و نظمیات کے اقتباسات
سے یوسف جمال کے اس ایقان اور خود اعتماد
کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے، جس کا اظہار انھوں نے
"میں اور میری شاعری" میں جا بجا کیا ہے۔ مثلاً
"میرے اشعار میں میری جیتی جاگتی تمناؤں
کا بھرپور اظہار نیز داخلی و خارجی اور منفی و مثبت کیفیات
کا فطری انعکاس ہے۔ ان شعروں میں ندرت
فکر اور جدت اسلوب کی وہ جہتیں نظر آئیں گی
کہ تناظر میں کا دلکش فکر کے کرب ناک لمحوں کا ال
پس منظر ابھرے گا کہ قارئین کرام اس سے
ہوئے بغیر نہیں رہ پائیں گے۔"

"میری شاعری زندگی کی کلیات سے آراستہ
پیراستہ ہے [illegible] خارجی عوامل سے داخلی مسائل کو سمیٹنے
والی شاعری ہے۔"

• میری شاعری میری کرب ناک احساس کا شعور
[illegible]ن ہے، نیز اس سبب سے میری شاعری مجموعی
[illegible]وادات کی بازگشت کے درمیان شاعرانہ وجدان
[illegible]کی شناخت کرا لیتی ہے۔ میری شاعری سچے
[illegible]ت کی شاعری ہے:
• سوکھے شجر سے کی دعا" یوسف جمال کی
[illegible] سالہ ادبی، شعری اور فنی ریاضت کا ثمرہ
[illegible]ر یاشبہ انھوں نے نئے ادبی شعور اور جدید
[illegible]رجحان مواد اسلوب کے خیال اور اظہار خیال
[illegible] حاصل کر لیا ہے اور اپنے ہر شعر پر اپنی منفرد
[illegible]ت کر دیا ہے۔ یہی ان کی شناخت اور پہچان
[illegible]رہے گا۔ ان کا ایک مقطع ملاحظہ کیجئے ؎

شعروں کی تخلیق سے پہلے، سچ ہے جمال
فکر کو اپنے خون سے گرماتا ہوں [illegible]

[illegible]ت سے کہ یوسف جمال میں ایک غیر معمولی تخلیقی و
[illegible] خود اعتمادی جنم لے سکی اور وہ اپنے عہد کا
[illegible]ر سکے۔ کس یقین سے کہا ہے

پہچان لو کہ آئینہ ہوں اپنے عہد کا
احساس کا سفیر ہوں، اشکوں کا دوست ہوں

[illegible]ر شعر میں" اس صدی کا آئینہ ہوں" کا ادعا
[illegible] کیجئے ؎

اچھال سنگ جنوں، ٹوٹ ہی گیا [illegible]
[illegible] اس صدی کا میں آئینہ، سوچتا کیا ہے؟

[illegible]سنگ کا [illegible] یوسف جمال کے [illegible]
[illegible]

قابل داد ہے۔
ایک اور شعر میں یوسف جمال اپنا تعارف
ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں ؎

کیا تعارف ہو مرا، اک رمز ہوں میں اور [illegible]
کون ہوں اور کیا ہوں؟ پہلے خود کو جاننے دے مجھے

خود کو "اک رمز" قرار دے کر "خود یابی" کی تمنا خوش
آئند اور مبارک ہے۔ اس میں ان کے کلام کے ارتقا
کی بشارت بھی مضمر ہے۔ ایک حسین مطلع ملاحظہ کیجئے ؎

کب دائرے کی قید میں اپنی حیات تھی
لامتیت میں پھیلی ہوئی میری ذات تھی

ایک اور مطلع جو حقیقت پر مبنی ہے اور وہ عصر حاضر
کے تناظر میں خاص لطف دیتا ہے ؎

خود پسندی کا ہے عالم آنکھوں پر غلاف
کون کس کے فن کا کرتا اعتراف

یہ صدی کا المیہ ہے کہ کوئی اعتراف کرنے کو تیار نہیں
خود پسندی کا اعلیٰ ہے۔
یوسف جمال کی [illegible] تفہیم کے لئے درج
ذیل شعر کلیدی حیثیت رکھتا ہے ؎

[illegible] شعر میں اک مرکزی خیال
[illegible] سے کیسے علاحدہ کر لیا

[illegible] شعر میں نئے نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] آزاد غزل [illegible]
[illegible] غزل [illegible] آزاد [illegible]
[illegible]

... نہیں ہو سکتی۔ غزل
اردو شاعری کی آبرو ہے۔ میرے نزدیک ، غزل
یا آزاد غزل کے بہانے اس کی آبرو ریزی کی
ہے۔ اس میں کسی آزاد غزل گو کو کامیابی نہیں مل سکتی۔
... سے کہا جا سکتا ہے۔

"یوسف جمال" میں اور میری شاعری
... رقمطراز ہیں :۔ "کرامت صاحب کی ترغیب
... میں نے آزاد غزل کا تجربہ شروع کیا۔ گرچہ اس
... مجھے کچھ پریشان بھی ہو رہی" غیر شعوری طور
... نے کہیں گہرائی میں یہ محسوس کیا ہو گا کہ یہ
... روایت شکنی نہیں، تہذیب شکنی ہے اور
... موہوم سے احساس جرم نے پریشانیاں پیدا
... ہوں گی۔

آخر میں، میں یوسف جمال کو مبارکباد پیش
کرتا ہوں کہ سوکھے جزیرے کی دعا بے اثر رہی۔
اچھا ہی ہوا۔ اور اگر کہیں دعا قبول ہو جاتی
اور سوکھے جزیرے کی تشنہ لبی مٹ جاتی تو جزیرہ
ہی بے وجود ہو جاتا، سمندروں میں غرق ہو جاتا ہے
... ہی سوکھے جزیرے کی حیات کی ضامن
...

یوسف جمال کے شعری پر سوکھے جزیرے
کی دعا کو ختم کرتا ہوں ؎

میں بیسویں صدی کے المناک دور میں
پیدا ہوا ہوں، یہ میرا دوش ... ہوں

•—— جاوید وششٹ

سُہیل

ماہنامہ گیا



چیف ایڈیٹر

مسعود منظر

•

ایڈیٹر

جمیل منظر

•

کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی

جلد نمبر ۵ • شمارہ ۵۶

بدل اشتراک

فی شمارہ ـــــــــ ۵ روپے

زرسالانہ ـــــــــ ۵۰ روپے

لائف ممبری ـــــــــ ۱۰۰۰ روپے

فہرست



خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل

ریلوے سائیڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

فون نمبر :- ۲۰۵۷۳

نمود

روایت اور جدت

روایت اور جدت کی بحث بہت پرانی ہے — مگر یہ ایک ایسی بحث ہے جو آج تک جاری ہے اور شاید آئندہ بھی رہے۔ اس بحث میں صف آرائی کر کے حزب مخالف پر بڑی بوچھاریں ہوتی رہی ہیں۔ ان تمام جذباتی اور ادعائی تصورات سے ہٹ کر جو مخالف جماعتوں نے اپنے حربے کے طور پر استعمال کئے ہیں اگر ذرا سنجیدگی سے دیکھا جائے، تو روایت اور جدت میں اتنی دوری اور مغائرت بھی نہیں جتنی لوگوں نے دکھانے کی کوشش کی ہے۔

روایت اور جدت کی بحث کی شدت کو تخلیقی سطح پر سمجھا جائے تو معاملہ اتنا سنگین نہیں رہتا۔ روایت شعر و ادب کی ثابقہ اقدار سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ قدریں جو ایک زمانے سے شعر و ادب کی تخلیق کی محرک بنتی ہیں روایت کہلاتی ہیں اور ان سے انحراف یا اختلاف کر کے نئی راہ کی تلاش جدت ہے۔ اس تعارف سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جدت روایت کی نفی نہیں ہے بلکہ اسے ایک نیا رُخ دینے کا نام ہے۔ اصل یہ ہے کہ روایت کی حیثیت بنیاد کی سی ہے۔ جدید سے جدید ترین عمارت کی تشکیل کا تصور بنیاد کو قبول کئے بغیر نہیں کیا جا سکتا جو لوگ ادب کی بنیادی قدروں سے یکسر چھٹکارا حاصل کرنے کی بات کرتے ہیں وہ کہیں نہ کہیں سے اپنے وجود سے انکار کرنا چاہتے ہیں — اور یقیناً یہ بات مضحکہ خیز سا دگی ہے۔ نئے تصورات، نئے افکار و مسائل اور نئے احساسات اور نئے طرز حیات کی حامل نسل اپنے پرکھوں سے انکار تو نہیں کر سکتی۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو بہتر بنانے کے لئے اپنی پرانی قدروں میں تبدیلیاں پیدا کریں۔ یہ بھی سچ ہے کہ اپنی منفرد پہچان کے لئے نئی نسل کو نئے اقدار تلاش کرنے چاہئیں۔ کتنی سچی بات ہے کہ ہم روایت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے مگر ہم محض روایت میں بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔

مسعود منظر

پدم شری عسلی جواد زیدی

یاد نگاری اور قیصر عثمانی

یاد ——— ماضی کی رہ گذر میں جھلملاتے
وں کی روشنی ہے لیکن بہت سے خوابوں اور
تنوں سے زیادہ دلکش اور رنگین ! حال کو ماضی سے
تے ہوئے یہ مستقبل کے خوابوں کی درمیانی کڑی
اتی ہے۔ خواب اندر خواب اور حجاب اندر حجاب
ہ جانے والی ان یادوں کی بازیابی انفرادی عمل
لیکن ذاتی اہمیت کے علاوہ ان کی اجتماعی اور
معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ادب
ت سے شعبوں میں ان کا اہم مقام رہا ہے۔ شاعری
ا کی، جگہ جگہ سے ہر صنف سخن متاثر ہوئی ہے۔ نثر
ہ راست یادوں، یادداشتوں، رپورتاژوں،
شتوں، سوانحوں، روزنامچوں اور خاکوں کی شکل
ت سا سرمایہ محفوظ ہو گیا ہے۔ بالواسطہ تو ہمارے
ی ادب کے علاوہ تذکروں اور تاریخوں میں بھی
کچھ جاذب توجہ ہے۔ ان یادوں کا بڑا حصہ اس
ہے کہ اسے سنبھال کر رکھا جائے کیونکہ یہ داغ نہاں کے
ہ کو تازہ رکھتا ہے اور کسی حقیقت کو کبھی قصہ
ایہ بننے دیتا ——— یادوں میں کسی کا اجارہ بھی

نہیں ہے۔ ادبی شخصیتیں ہوں یا فلمی اور سیاسی ان سے
مختلف اصحاب کی مختلف یادیں وابستہ ہیں اور ان سب
میں ایک کشش ہے کیوں کہ سب مل کر ان تصویروں
میں رنگ بھرتی ہیں۔ اور ہم منزل بہ منزل ان سے قریب تر
آتے ہیں۔ ہر اچھا ادیب ان شخصیتوں کے منتخب پہلوؤں
پر اپنے مخصوص انداز میں رنگ آمیزی کر کے وہ اپنی عکاسی
اور مصوری کے لئے جواز پیدا کرتا ہے اور قارئین سے اپنے
فن کی داد پاتا ہے۔ مشاہدہ جیسا ہی وسیع اور گہرا ہوگا
اور جتنا فن کارانہ ہوگا اتنی ہی یادیں سحر
آفریں ہوں گی۔ قیصر عثمانی یہ ۔۔ دو جگانا جانتے ہیں۔
یادوں پر مبنی ادب ۔۔ یا خاص دل فریبی ہے۔ یہ
ہمیں گذرے ہوئے لمحوں ۔۔ ابھرے سانس لیتے، ہنستے
مسکراتے گرتے اور سنبھلتے کے موقعے فراہم کرتا ہے۔ ہم ان
یادوں کے پردے میں پھر سے گنگناتے ہیں۔ کبھی کبھی زور زور
سے قہقہے بھی لگا لیتے ہیں مگر اس احتیاط سے کہ دوسرا
سُن نہ لے۔ دل کے زخموں کو کریدتے ہیں لیکن ایسے
انداز سے کہ کوئی اور دیکھ نہ لے۔ ہم اپنی ان گنت لغزشوں
[illegible]

کہ اپنی خامیوں میں ایک رنگینی، فریب کار رنگینی
کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس وقت حقیقت کی اس
جاذبہ کا لطف اٹھاتے ہیں کہ گھنی آبادی والی، خود غرض
کم آشنا اور ہما گم بھاگ کی دنیا میں بھی اکیلے نہیں ہیں۔
ہم سفر اور بھی ہیں !!

یادوں کی بازآفرینی میں قیصر عثمانی کو خاص
ملکہ حاصل ہے۔ ان کے نثری کارناموں میں ہم کئی نسلوں
جماعتوں، طبقوں، شہروں، قصبوں، دیہاتوں بلکہ
محلوں تک کے رنگارنگ افراد و اشخاص سے متعارف
ہوتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک یکایک ہمارے سامنے
آکر شناسانہ اور دوستانہ سلام کرتے ہیں۔ ماضی و حال
میں تمام اختلافات اور تضادات زمانی کے باوجود، عام
تجربوں کی حد تک کتنی یگانگت ہے۔ ان کے دو مجموعے
'تاروں کا سفر' اور 'یادوں کے سائے' پہلے ہی شائع ہو کر
مقبول ہو چکے ہیں۔ اب وہ 'یادیں ہی یادیں' سمیٹ
کر اپنے دوستوں اور شناساؤں کے وسیع تر حلقے
سے ہمارا تعارف کرا رہے ہیں۔ قیصر عثمانی ادیب و شاعر
بھی ہیں اور فلمی دنیا کی ایک معروف شخصیت بھی حسب
دستور یادوں کی اس نئی قسط میں بھی وہ انہیں
حلقوں سے تعلق رکھنے والی ہستیوں کے بارے میں
دلآویز گفتگو کرتے ہیں۔ مستثنیات میں سید انیس الرحمٰن
مرحوم جیسے مجاہد آزادی اور صحافی اور سید نجیب اشرف
ندوی جیسے مستند ادیب اور محقق ہیں۔ ایک گجراتی شاعر
کی روداد اور پاکستان کے پہلے سفر کی داستان کو
رپورتاژ میں شامل کر لیجئے، آپ شاعر ہیں۔ میں ہلکے طنز کے
نشتر چبھے ہوتے ہیں اور عصمت چغتائی کے اردو مخالف
خیالات پر ناقد و صحافی ... وار ہے۔

ان سب سے مختلف ہے وہ خاکہ جو انہوں
اپنے والد محترم جناب حضرت سید شاہ عبدالعزیز آزاد
سے متعلق لکھا ہے۔ یہ خوبصورت خاکہ قیصر کی جرأت
اظہار، صداقت لہجہ، جزئیات نگاری، خلوص تعصبات
عکاسی کردار کا اچھا نمونہ ہے۔ سعادت مند مگر آزاد
بیٹے کا ایسے محترم باپ کا خاکہ لکھنا جو صوفی صافی، د
اور عالم دین ہونے کے ساتھ دوربین اور عہد شناس
ہو۔ ایسے پل سے گذرنے کے مترادف ہے جو بال سے
باریک، اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہو۔ قیصر
نے یہ منزل ثبات قدم سے طے کی ہے۔ ان کی اردو
فارسی شاعری کا ذکر تو کوئی بھی کرتا لیکن ہجو نگار
سے ان کے شغف اور پیارے بیٹے کے اصرار پر فرا
دلی کے ساتھ سنیما گھر تک چلے جانے کا ذکر کرتے ہو
عام لکھنے والا گھبراتا لیکن صاحبان سجادہ کی ...
حقیقت آشنا سے واقف خاکہ نگار جس میں اد
خود اعتمادی ہو وہی یہ خاکہ لکھ سکتا تھا۔ اس اعتم
جرأت کے بغیر یہ خاکہ بے رنگ و بے کشش ہی رہ جاتا
یہ تفصیلی جائزہ نہیں ہے۔ صرف مجموعے کی مشمو
کی طرف ایک مختصر اشارہ ہے۔ ناظرین کو اس تازہ
مجموعے میں ہر جگہ قیصر عثمانی کی مصورانہ چابک دس
ہمدردانہ کردار آفرینی، سماج اور طبقات کی توانائی
کمزوریوں اور خوبیوں کے حسین امتزاج کے ساتھ بلکہ
ہلکی، منکسر بھری، بے حد رواں، سنجیدہ مگر شگفتہ
زبان میں اس طرح ادا کر جاتے ہیں کہ قاری یادوں کے
لطافتوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ معمولی کارنامہ نہیں
ہے۔ اس کا معیار یادنگاری میں ان کے یہاں کوئی بند
ٹکا، منضبط ... ہے، بلکہ تازگی ...

(بقیہ در صفحہ ...)

ظفر ہاشمی

مظہر امام اور ان کی نصف ملاقات

مظہر امام کا ہر کام اپنے گوشے میں اپنے امام
ہونے کا اصرار کرتا ہے۔ یعنی یہ نام نہ صرف لغوی اور
معنوی بنیادوں پر اسم با مسمیٰ بن کر سامنے آتا ہے بلکہ
حقیقت یہ ہے کہ اس نام نے عملی طور پر بھی ہر محاذ پر اپنی
شناخت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ایک دہائی قبل
مظہر امام کو ہر رنگ میں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا
ان کے سحر انگیز سراپا کے علاوہ ایک عام انسان
کی حیثیت سے وہ کس طرح رہتے ہیں، ملتے ہیں، اٹھتے ہیں۔
بیٹھتے ہیں، چلتے ہیں، پھرتے ہیں، بات کرتے ہیں، ہنستے ہیں۔
مسکراتے ہیں۔ تمام عوامل اور مظاہر میں ان کی ایک
ادا اور حسن ملتا ہے۔ پھر دوستوں سے عزیزوں
اور رشتہ داروں سے کیا، کیسا اور کہاں تک تعلق
رکھا جائے، اس سلسلے میں بھی سبھوں سے الگ ان
کا رویہ ملتا ہے۔

ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے بھی وہ تمام
معاصر اہل قلم سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ چونکہ ان کی جمالیاتی
فکر، ان کی اخلاقی برتری اور ان کی ادبیانہ و شاعرانہ
بصیرتیں، ان سبھوں سے ایک شعور اور نئی شان کا
ظہور ہوتا ہے، جو ان سے ایکبار مل لے تو ان کو وہ بھلا
نہیں سکتا۔

مظہر امام ایسے شعبے سے منسلک رہے کہ وہاں
بھی مختلف علوم و فنون کے جاننے والوں سے ان کا
واسطہ پڑتا رہا۔ جن میں بیشتر سے ان کا رابطہ مضبوط
ہوتا رہا۔ پھر ان کے پہلے شعری مجموعہ "زخم تمنا"
کی اشاعت کے بعد تو ان کا لوہا ماننے والوں کا اضافہ
ہی ہوتا رہا۔ اس قافلے میں ان کے رفیقوں کے علاوہ دوسرے
اہل علم، اہل نگاہ اور دانشور سبھی تھے۔ پھر حاسد بھی
تھے اور منافق بھی تھے لیکن دل سے وہ تمام لوگ مظہر امام
کو قد آور شخصیت تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔

مظہر امام کی شخصیت کئی حصوں میں منقسم ہے۔ وہ
ایک مثالی انسان ہونے کے علاوہ جہاں صف اول کے
شاعر، ممتاز ناقد، منفرد محقق اور خاکہ نگار ہیں۔ وہاں
وہ آزاد غزل کے بانی بھی ہیں اور ان کی یادداشت بھی قابل
رشک ہے۔ وہ اردو زبان و ادب کے علاوہ ہندی،

فارسی اور انگریزی زبان وادب پر بھی عبور رکھتے ہیں۔
ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور مشاہدہ بہت تیز
پھر ان کا ہر تجربہ بھی نئی اڑان کا امکان رکھتا ہے۔ نثر و
نظم کے مختلف موضوعات پر زخم تمنا کے علاوہ ان کے
دوسرے مجموعے بھی شائع ہو کر مرکز اہل نگاہ بن چکے
ہیں۔ جیسے آتی جاتی لہریں، رشتہ گونگے سفر کا، پچھلے
موسم کا پھول، نئے ادب کا معمار، جمیل مظہری، بند
ہوتا ہوا بازار اور وہ اکثر یاد آتے ہیں۔

اہم مشاعروں، مذاکروں اور مباحثوں میں مظہر
امام کی شرکت، ادبی اور علمی حیثیت سے ہندوستان
کے علاوہ دوسرے ملکوں کا دورہ، غیر سیاسی تنظیموں
سے وابستگی بھی مظہر امام کی بے پناہ مقبولیت کے
اسباب سامنے لاتے ہیں۔ مظہر امام پر اب تک مختلف اخبار
اور رسالوں کے گوشے اور نمبر بھی نکل چکے ہیں۔ ان
کی شخصیت اور ان کے فن پر مختلف جہتوں سے بے شمار
مضامین بھی لکھے جا چکے ہیں جو کتابی شکل میں شائع
کئے جائیں تو وہ کئی جلدوں میں یکجا ہو سکیں گے۔ ان
پر اب تک کئی لوگوں نے ایم۔ فل اور پی ایچ ڈی کی
ڈگریاں بھی حاصل کرلی ہیں۔ مدیر کی حیثیت سے بھی
ان کی اہمیت رہی ہے۔ مختلف میڈیا سے ان کے بہت
سے انٹرویو بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔

مذکورہ خوبیوں کی بنا پر مظہر امام کی شخصیت
اور ان کی شاعرانہ وادیبانہ حیثیت کا جادو نہ صرف
برصغیر تک محدود ہے بلکہ وہ بین الاقوامی تناظر میں منور
نظر آتے ہیں۔ بہت سے دیگر انعام واکرام کے علاوہ جب
۱۹۹۴ء کے آخر میں ان کی مجموعی خدمات پر ہندوستان
کا سب سے بڑا ادبی انعام یعنی ان کو ساہتیہ اکاڈمی
ایوارڈ دیا گیا تو دوسرے اہل قلم کی طرح میں نے
بھی کافی مسرت محسوس کی اور ان کو مبارکباد بھی دی
اور یہ عرض کیا کہ اگر آپ کو کہیں کا بھی بڑا سے بڑا انعام
دیا گیا تو ذاتی طور پر مجھ کو کوئی تعجب نہ ہوگا۔

سطور بالا سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دوسرے
لوگوں کے علاوہ بے شمار مشاہیر ادب کو بھی مظہر امام
نے خطوط لکھے ہیں اور انہوں نے بھی مظہر امام سے
خط وکتابت کا سلسلہ شدت سے جاری رکھا ہے۔
لہٰذا نصف صدی کے عرصے میں ایسے خطوط کی تعداد
پندرہ بیس ہزار سے کم نہ ہوگی۔ ان میں سے ۷۵ مرحوم
شخصیات کے خطوط کا ایک انتخاب نصف ملاقات
کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ حروف تہجی کے
اعتبار سے وہ مکتوب الیہ اور ان کے مکتوب تاریخی لحاظ
سے بالترتیب ہیں۔ ان کے مکتوب کی تعداد بھی قوسین میں
ملاحظہ کیجئے۔

۱ اثر لکھنوی۔ (۴) ۲ اجمل اجملی۔ (۱) ۳
احتشام حسین۔ (۲) ۴ احمد جمال پاشا۔ (۴) ۵ اختر
انصاری۔ (۳) ۶ اختر اورینوی۔ (۲) ۷ اختر
قادری۔ (۲) ۸ ارشد کاکوی۔ (۴) ۹ اشک امرتسری
(۱) ۱۰ اطہر پرویز۔ (۱) ۱۱ اعجاز صدیقی (۲) ۱۲
امجد نجمی (۲) ۱۳ بانی (۴) ۱۴ پرکاش پنڈت۔ (۳)
۱۵ پرویز شاہدی (۹) ۱۶ جمیل مظہری۔ (۱۰) ۱۷ حسرت
الاکرام۔ (۱) ۱۸ حسن نعیم۔ (۸) ۱۹ خلیل الرحمٰن اعظمی
(۸) ۲۰ خواجہ احمد عباس۔ (۱) ۲۱ خیر بہوروی۔ (۱)
۲۲ ذاکر حسین (۲) ۲۳ راجندر سنگھ بیدی (۱)

۲۴ راجہ مہدی علی خاں۔(۲) ۲۵ راہی معصوم رضا (۲) ۲۶ رشید احمد صدیقی۔ (۴) ۲۷ رگھوویر سہائے (۴) ۲۸ رضیہ ثانی (۳) ۲۹ زکی انور۔ (۲) ۳۰ سجاد ظہیر (۲) ۳۱ سلام مچھلی شہری (۱) ۳۲ سلیمان ادیب (۲) ۳۳ سہیل عظیم آبادی (۲۴) ۳۴ سید حسن (۱) ۳۵ شاذ تمکنت (۸) ۳۶ شانتی رنجن بھٹاچاریہ (۲) ۳۷ شاہد احمد دہلوی (۱) ۳۸ شکیل بدایونی (۱) ۳۹ ظ۔ انصاری۔ (۸) ۴۰ ظفر پیامی (۲) ۴۱ عبدالمجید شمس (۱) ۴۲ عصمت چغتائی۔ (۳) ۴۳ علی عباس حسینی (۴) ۴۴ غیاث احمد گدی (۹) ۴۵ فراق گورکھپوری۔ (۱) ۴۶ کرشن چندر۔ (۱۰) ۴۷ کلیم الدین احمد۔ (۲) ۴۸ ل۔ احمد اکبرآبادی (۱۲) ۴۹ محمد طفیل۔ (۹) ۵۰ محمود احمد ہنر (۱) ۵۱ مخمور جالندھری (۵) ۵۲ مسیح الزماں (۲) ۵۳ ممتاز حسین (۳) ۵۴ مہجور شمسی (۱) ۵۵ نذر امام (۱) ۵۶ نریش کمار شاد (۲) ۵۷ نشور واحدی (۲) ان خطوط کی مجموعی تعداد (۲۱۴) دو سو چودہ ہوتی ہے۔ یہ تمام مکتوب نگار ہم پلہ نہیں ہیں لیکن سبھوں میں ایک خوبی ضرور مشترک ہے کہ ان میں ہر مکتوب نگار کسی نہ کسی خاص خوبی کا مالک ضرور ہے۔

نصف ملاقات کے مرتب معروف شاعر ڈاکٹر امام اعظم ہیں۔ علاوہ ازیں وہ محقق بھی ہیں اور ناقد بھی۔ انہوں نے مسلسل عرق ریزی، شب و روز کی جگر سوزی اور پوری چھان پھٹک کے بعد ہی اس پر معنی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ بہ حیثیت مرتب امام مسلسل بذاقت، وجاہت اور بصیرت سے انہوں نے اس کتاب میں اپنی بہترین صلاحیتوں کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔ امام اعظم بے حد فعال، زیرک، جفاکش اور مسلسل جہد و عمل کے نقیب ہیں۔ وہ نہایت مخلص اور سادہ الشان ہیں۔ پھر خوش گفتار، خوش رفتار اور خوش کردار کے حامل بھی۔

اردو ادب میں غالب سے اہل قلم کے خطوط کی اہمیت، ان کو محفوظ رکھنے اور ان کو منظر عام پر لانے کی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک بے شمار ادبی خطوط کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کو مختلف طریقے سے محفوظ رکھنے کے وسائل سے کام لیا جا رہا ہے۔ جن کی اپنی حیثیت اور اہمیت ہے۔ لیکن نصف ملاقات، ان سبھوں سے منفرد ہے۔ مظہر امام کی پوری زندگی اور ان کا فن دونوں اپنی انفرادیت اور اہمیت رکھتے ہیں اور سبھوں سے الگ ہٹ کر اپنی شاہراہ خود بناتے ہیں۔ نصف ملاقات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

نصف ملاقات سے جہاں مکتوب نگار کی اپنی حیثیت اور وجاہت کا پتہ چلتا ہے وہاں مکتوب الیہ کی شخصیت، محبت اور ادبی اہمیت کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ ان خطوط سے ایک ادیب کا دوسرے ادیب سے معاصرانہ چشمک اور ذاتی رنجش کا اظہار بھی ملتا ہے۔ لیکن کسی ادیب کا دوسرے ادیب کے خلاف کیچڑ اچھالنا، دل آزاری یا سازش کرنا جیسے معاملات سے احتراز ملتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ ملتا ہے کہ ان عوامل کو نہ مظہر امام پسند کرتے ہیں اور نہ ان کے مکتوب نگار۔ اس لئے اس مجموعے کی اہمیت بہت

بڑھ جاتی ہے
ادبی خطوط اپنے عہد کی تاریخ بھی ہوتے ہیں
ایسے تناظر میں بہت سی ادبی، نیم ادبی اور غیر ادبی تحریکات
رجحانات اور نظریات کے متعلق یہ مجموعہ بھی نہ صرف
اپنے عہد کی تاریخ پیش کرتا ہے بلکہ ایک نئی تاریخ بناتا
بھی ہے۔ قارئین یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان
کو اپنے پیش رووں سے روشنی لینی بھی ہے اور ان
کے اندھیروں کو چیر کر نیا سورج طلوع بھی کرنا ہے۔
اس طرح قوت، یقین، عزم اور عمل کے تانے بانے سے
اپنے مشن کی تکمیل کرنا ہے۔

نصف ملاقات سے علمی، تحقیقی، تنقیدی،
تخلیقی، معاشرتی، سماجی اور جمالیاتی رشتوں اور
نظریوں کا اظہار بھی ملتا ہے اور ان سے نئے نئے
افکار، عوامل و مظاہر کا انکشاف بھی ہوتا ہے۔ اگر
کسی ایک شخصیت کا ایک ہی خط اس مجموعہ میں شامل
ہے تو یہ خط دوسرے بہت سے خطوط پر بھاری پڑتا ہے
مثلاً فراق گورکھپوری کا ایک ہی خط ملتا ہے لیکن جس
طرح انہوں نے "زخم تمنا" پر داد دی ہے اس سے مظہر
امام کی شاعری کی اہمیت اور شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔
اور ان کے قد و قامت کی بلندی کا نیا معیار سامنے آتا ہے
بلکہ فراق جیسے انا پرست شاعر سے یہ توقع ہرگز نہیں
کی جا سکتی تھی۔ یہ دو دہائی پہلے کی بات ہے لیکن اس
کے بعد سے تو مظہر امام نے ادب کے بیشتر گوشوں میں نئی نئی
چھلانگ لگائی ہے۔ جیسا کہ مذکورہ سطور میں عرض کیا
گیا ہے۔

ان خطوط کے مطالعہ سے ایک تجسس، ایک کھوج
اور ایک والہانہ پن کی شدت کا احساس بھی قوی ہو جاتا
ہے۔ لطف انگیزی اور فکر انگیزی بھی کہیں قارئین کا
ساتھ نہیں چھوڑتی۔ بہترین منظر نگاری، متحرک پیکر تراشی
پھر مکتوب نگار کی چلتی پھرتی تصویریں، قارئین کو کہیں
تنہا نہیں چھوڑتیں۔ جس نے ایک بار بھی یہ کتاب دیکھ لی
اور چھو لی تو اس کو پوری کتاب ختم کئے بغیر سکون نہیں
مل سکتا۔

نصف ملاقات کے خطوط سے یہ دستاویز بھی ملتا ہے
کہ مظہر امام کی زندگی اور ان کے فن میں مسلسل ایک توازن،
ترتیب، تنظیم، عرفان، وجدان، فکری ہم آہنگی، اعلیٰ
ظرفی، خاص شعور اور جمالیاتی لہریں ملتی ہیں۔ ان کا یہی وصف
دیگر اہل قلم سے ان کو ممتاز بھی کرتا ہے۔ اس لئے وہ کسی
تخت پر بیٹھ کر حکومت نہیں کرتے بلکہ دلوں میں رہ کر اپنے
دستخط کرتے ہیں۔

چند جملوں میں اگر کہا جائے تو یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں
ہوگا کہ یہ کتاب نہ صرف ایک نایاب کتاب ہے بلکہ موجودہ
ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ یعنی یہ طلوع سحر کی شبنم
بھی ہے اور زندگی کی دھوپ بھی۔ اس کی چھاؤں میں
رات کا اندھیرا بھی اور اجالا بھی، سوز بھی، ساز بھی، نغمہ بھی
نوحہ بھی، دلکش، دلربا اور دلنواز۔

یقین ہے یہ کتاب ہر لحاظ سے ایک نئی گونج بن کر
تمام شائقین ادب اور اہل قلم کا پیچھا کرے گی۔

● پرنٹر پبلشر راحت منتظر نے نیبل آرٹ پریس شاہ گنج پٹنہ
سے چھپوا کر دفتر سہیل ریلوے سائڈ روڈ گیا سے شائع کیا۔ ●

احمد وکیل علیمی
کلکتہ

پروین شاکر
نسوانی شاعری کی ایک ناتمام آواز

بغیر کسی قیل و قال کے یہ حقیقت تسلیم
ا جائے گی کہ اردو افسانوں میں قرۃ العین حیدر
عصمت چغتائی کی طرح اردو شاعری میں پروین
ناکر ایک لازوال اور ناتمام آواز ہیں۔ اردو شاعری
بروۓ غزل کو مانا گیا ہے اور جب کوئی غزل "غزل
پہ مائل ہو اور تمام تر شاعرانہ صلاحیت اور
ت کے ساتھ جلوہ گر ہو تو پھر ہماری اردو شاعری
ودین شاکر جیسی ضوفشاں ادبی شخصیت کو
رعام پر لے آتی ہے لیکن افسوس و ملال اس
کا ہے کہ ایسی نادر شخصیت وکیل اختر مرحوم
ں ناوقت موت کا شکار ہو جاتی ہے وکیل اختر
قیقت کی ترجمانی کس قدر فصاحت کے ساتھ
ہے

ہنستا رہا تھا ابھی وہ ابھی مر گیا
موت اور زیست کا فاصلہ دیکھئے
اور زیست کے اس قدر کم فاصلے کا احساس

پروین شاکر کی موت پر شدت سے ہوتا ہے یہ سوچا
بھی نہیں جا سکتا تھا کہ پروین شاکر اپنے خواب کی
طرح خود بھی بہت جلد ریزہ ریزہ ہو جانے والی ہیں۔

جس طرح خواب میرے ہو گئے ریزہ ریزہ
اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی

پاکستان کے کراچی شہر کے وسیع و عریض سڑک پر
ٹرک حادثہ کا شکار ہونے والی پروین شاکر پاکستان
کے نئے نئے عہد میں ایک بہت ہی سنجیدہ اور پرکشش
شاعرہ تھی جو برصغیر میں پوری نسوانی شاعری میں ایک
ملکہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ پروین شاکر کے علاوہ کشور
ناہید، فہمیدہ ریاض، عشرت آفرین، شاہدہ حسن،
پروین فنا سید، عذرا عباس وغیرہ خاتون شاعرات
کے نام آتے ہیں جن کی ملی جلی آوازیں آٹھویں دہائی
کے دوران ابھری تھیں۔ پاکستان کی شاعرہ میں ترقی
پسندی اور جدید اسکولوں میں پہلے سے چلی
آرہی تار کجی گھمبا گھمی کے باوجود یہ ایک غیر روائتی اور

اچھوتی شروعات تھی جس نے وہاں کے قیدو بند میں
ڈر ڈر کر زندگی گزارنے والی خواتین کو ان کی گم گشتہ
اور شکستہ آواز کا احساس ہی نہیں دلایا بلکہ ان کے
سامنے ایک پڑھی لکھی ماڈرن عورت کا خاکہ بھی پیش
کیا جو ماں، بہن اور بیوی تو تھی ہی معلمہ ہونے کی
حیثیت سے برسرروزگار بھی تھیں۔ سماج کا ایک
حصہ بھی۔ سماجی اور سیاسی تغیر سے پوری طرح
باخبر یہ خاتون اپنے دور کی مردانہ برتری کے خلاف
آواز اٹھا رہی تھی۔ سماج کی ناانصافی اور عدم
مساوات کی شکایت کرنے والی ہزاروں خواتین کیلئے ان
کے دل میں نرم گوشہ تھا اور یوں وہ ہمدردی، روشن
خیالی اور استحقاق کی ایک نئی روشنی بکھیر رہی تھیں۔

اردو شاعری کا معشوق اس طرح اچانک
اٹھ کھڑا ہوگا اور قدیم روایتی عشق کے خلاف صدائے
احتجاج بلند کرے گا بلکہ الٹا مردوں کو عشق کے
گر اور ترکیبیں سکھائے گا ایسا اردو شاعری میں اس
سے قبل تصور بھی نہیں کیا گیا تھا۔ پروین شاکر اور
ان کی ہم عصر شاعرات نے اسی ناممکن العمل کو ممکن کر
دکھایا اور مذہب پرست ملاؤں کے ساتھ ساتھ آمرانہ
حکومت کی نیند بھی حرام کر کے رکھ دیا تھا۔ ریاض صدیقی
جیسے ترقی پسند بلا شبہ سطحی تہمت لگا کر پروین شاکر
کی شاعری کو دوسرے درجے کی شاعری قرار دیتے ہیں
لیکن گزشتہ دو ڈھائی دہائیوں میں اپنے مطالعہ،
مشاہدہ اور تجربات کے ذریعہ پروین نے عورت کی
زندگی کا جو نقشہ پیش کیا اور جس طرح مرد کے ساتھ
عورت کے رشتوں کی روشنی میں انہیں ان کی آزادیاں
کرائی اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ غور طلب بات
یہ ہے کہ یورپ سے آئی ہوئی عورت ذات کو وہ ناپسند
کرتی ہیں اور عورت کو اس کی گم گشتہ آواز کا احساس
ایشائی سماجی ڈھانچے کے اندر رہ کر کرانا چاہتی ہیں۔

اس خوف سے وہ ساتھ چھوٹنے کے حق میں ہے
کہ کر مجھے یہ لڑکی کہیں دکھ سے مر نہ جائے

اور یہ

میں کیوں اس کو فون کروں
اس کے بھی تو علم میں ہوگا
کل شب موسم کی پہلی بارش تھی

میا

کائنات کے خالق
دیکھ تو میرا چہرہ
آج میرے ہونٹوں پر
کیسی مسکراہٹ ہے
مجھ کو یاد کیا آیا
میری بھیگی آنکھوں میں
تجھ کو کچھ نظر آیا
اس حسین لمحے کو
تو تو جانتا ہوگا
اس سمے کی عظمت کو
تو تو مانتا ہوگا
ہاں ترا گماں سچ ہے
ہاں کہ میں نے بھی
زندگی جنم دی ہے!!!

پروین شاکر کی پیدائش ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء

میں ہوئی تھی۔ ان کے والد سید شاکر حسین ثاقب پٹنہ کے
رہنے والے تھے اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے
تھے۔ پروین نے اپنی پوری تعلیم کراچی میں حاصل کی۔
انہوں نے انگریزی ادب اور سائنس میں ڈبل ایم
اے کیا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد کراچی کے عبداللہ
کالج میں پڑھانے لگیں۔ ۱۹۸۲ء میں سول سروس
کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہیں سرکاری ملازمت
ہو گئی۔ پروین کی شادی عبداللہ کالج میں پڑھانے
کے دوران ہوئی اس کے بعد ان کا پہلا مجموعہ
"خوشبو" ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا ادب
اور شاعری کے حلقوں میں پروین شاکر کی واحد
شخصیت کو دراصل "خوشبو" کی غزل کے
ذریعہ ہی اول اول پہچانا گیا۔ لوک گیتوں کی زمین
کی "خوشبو" وارث شاہ کے "ہیر" کی روحانیت
اور ٹھمری دادرے کی موسیقی کی کھنک سے مزین
پروین کی شاعری نے غزلوں میں نیا پن ان کے چمن کے
گل و بلبل والے روائتی حصار سے الگ جنگلوں،
شہروں، دیہاتوں اور کھیتوں کا ایک ایسا ماحول
جھانکتا دیکھا گیا ہے جو غزل کے فارمیٹ میں اس
سے قبل نظر نہیں آتا۔

پروین کی غزلوں میں جنگل، پتھر، دھوپ،
گھر، برف، سورج، دھواں، آندھی، سانپ، منڈیر،
گلی، دھول وغیرہ بہت سے الفاظ کا استعمال بالکل
نئے اور اچھوتے قدرتی رنگ میں نظر آتا ہے ان چیزوں
اور الفاظ کا رشتہ زمین سے تھا، قدرت سے تھا۔
ان کے ماحول میں گاؤں تھا تو شہر بھی تھے۔ ریشمی سپنے
تھے تو ان خوابوں کو لہولہان کرنے والے ظالم
ہاتھوں کی پہچان کرنے والی آنکھیں بھی تھیں فرماتی
ہیں ؎

میں اتنے سانپوں کو راستے میں دیکھ آئی تھی
کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

دھنک کے رنگ کی ساڑی پہن تو لی میں نے
اور اب یہ دکھ کہ پہن کر کسے دکھانا ہوا

جو بادلوں سے بھی مجھ کو چھپائے رکھتا تھا
بڑھی ہے دھوپ تو بے سائباں چھوڑ گیا

کچھ تو تیرے موسم ہی مجھے راس کم آئے
اور کچھ مری مٹی میں بغاوت بھی بہت تھی

کہاں سے آتی کرن زندگی کے زنداں میں
وہ گھر ملا تھا مجھے جس میں کوئی در ہی نہ تھا

تم موج موج مثل صبا گھومتے رہو
کٹ جائیں مری سوچ کے پر تم کو اس سے کیا

وہ شہر چھوڑ کر جانا تو کب سے چاہتا تھا
یہ نوکری کا بلاوا تو اک بہانہ ہوا

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

• خوشبو کے بعد پروین شاکر کا دوسرا
مجموعہ کلام "صد برگ" (۱۹۹۰ء) اور تیسرا اور آخری
مجموعہ کلام "انکار" میں نظم کی فنکاری خاص طور سے
غور کی گئی۔ غزل کی فضا سے تھوڑا ہٹ کر یہاں ایک
ایسی گھٹی ہوئی اور مبہم زبان پروین نے استعمال کی ہے
جو ترقی پسند دور کی نظموں والے "جارگن" سے آزاد
رہ کر نظم اور سماج کے رشتے کو تلاش کر رہی تھی۔ مثال
کے طور پر ـــ

دانے تک جب پہنچی
چڑیا
جال میں تھی
زندہ رہنے کی خواہش نے مار دیا
(بیا)

دھوپ میں بارش ہوتے دیکھ کر
حیرت کرنے والے
شاید تو نے میری ہنسی کو
چھو کر کبھی نہیں دیکھا ـــ (!!)

اردو شاعری کی پوری تاریخ میں پروین شاکر سے قبل
ایسی کوئی شاعرہ نہیں جس کے یہاں جذبات کی اس
قدر حقیقی اور بیباک ترجمانی ملتی ہو۔ اردو شاعری میں
اب تک صنف نازک کو ہی مورد الزام ٹھہرایا جاتا رہا
لیکن پروین کے یہاں ہمیں محبوب ایک عاشق کی جگہ کھڑا
نظر آتا ہے اور عاشق محبوب کی جگہ۔ یہ ظاہر ہوا کہ
حسن و عشق کے معاملے میں محبوب ہی نہیں بلکہ عاشق
بھی وعدہ شکنی اور ستم شعاری رہا ہے۔ اردو
شاعری میں نئی خوشبو اور نیرنگ سازی کے لئے

بلاشبہ ہماری اردو شاعری پروین شاکر کی مرہون
منت ہے

پروین کی شاعری میں محبت ایک روائتی تصور
نہیں ہے بلکہ وہ محبت کو ایک طویل اور متواتر ملاقاتوں
کے ذریعہ سمجھنے کی تلقین کرتی ہیں ؎

حسن کے سمجھنے کو عمر چاہئے جاناں
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں

صنف نازک پر بے وفائی، بے دردی، استغنا، جیسی تہمتیں
ہماری اردو شاعری کا حصہ بن کر رہ گئی ہیں لیکن جب
عورت دھوکہ، فریب اور بے اعتنائی کا شکار ہوتی
ہے تو اس کے دل کی کیفیت نیز اس کے حقیقی احساسات
بھی پروین شاکر کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر
آتے ہیں جو پروین شاکر کی ندرت فکر کو واضح کرتے
ہیں۔ وہ عاشق کے چنچلانہ مزاج سے بھی واقف ہیں
اس لئے فرماتی ہیں کہ ؎

کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

پروین کے یہاں چاہت کا حقیقی عکس نظر آتا ہے لیکن
وہ اپنی چاہت کی تذلیل نہیں چاہتیں۔ انہیں رسوائی
محبت پسند نہیں ؎

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

اور پھر پروین شاکر کو یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کا چاہنے والا
مال و زر کا شیدائی اور تاجر ہے تو بڑی جرأت مندانہ
انداز میں گویا ہوتی ہیں ؎

سنتے ہیں قیمت تمہاری لگ رہی ہے آج کل

سب سے اچھے دام کس کے ہیں یہ بتلانا بھی

تاکہ اس خوش بخت تاجر کو مبارکباد دیں
اور اس کے لبو دل کو بھی یہ سمجھانا ہمیں

در پھر اسے دعا بھی دیتی ہیں کہ ؎

ہوا کے ہاتھوں اسے یہ پیام بھی پہنچے
کہ تیری عمر خدائے ازل دراز کرے

ہر چند کہ بے وفا محبوب بچھڑ گیا ہے لیکن جب عورت کسی سے محبت کرتی ہے تو بس "محبت" کرتی ہے اور اس کی حقیقی محبت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ یہ جذبہ بھی ان کے یہاں محسوس کیا جاسکتا ہے ؎

ابر کی طرح ہے وہ یوں نہ چھپو سکوں لیکن
ہاتھ جب بھی پھیلائے آگیا دعاؤں میں

لیکن پروین یہ بھی بتانا ضروری سمجھتی ہیں کہ ؎

قصور ہو تو ہمارے حساب میں لکھ جائے
محبتوں میں جو احسان ہو تمہارا ہو

پروین کو شاید "چاہنے والوں کی طرح" کوئی چاہنے والا نہیں ملا اسی لئے کہتی ہیں کہ ؎

میں اپنے حصے کے سکھ جس کے نام کر ڈالوں
کوئی تو ہو جو مجھے اس طرح کا پیارا ہو

بچھڑنے اور بے وفائی کرنے والے سے ان کو پھر بھی ایک امید سی ہے لیکن پروین شاکر کی زندگی ماہتاب [illegible] کے لئے قبر کی [illegible] وگیلے [illegible] اجالے کی [illegible] خوبصورت شاعرہ [illegible]

بقیہ :- یادنگاری اور قیصر عثمانی

رکھنے کے لئے وہ تازہ تر تجربے کرتے چلتے ہیں — یہ آزادہ روی بھی ان کے قبول عام کی ضمانت ہے — صوفیانہ نرمی، روایت دوست انحراف پسندی، تجربات زندگی کی رنگا رنگی، شرافت نفس کے محبت آمیز مظاہر، اپنی دنیا خود بنانے کا حوصلہ اور عمومی ترقی پسندی ان کی تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مجموعے کے ناظرین بھی میری ہی طرح محظوظ ہوں گے۔

قیصر عثمانی فلمی دنیا کے ستارہ ہیں، آرٹسٹ اور فنکار ہیں لیکن ستارہ نہیں۔ ستاروں کے دوست مگر ستاروں کے پروانے نہیں ہیں۔ انہوں نے اس دنیا کے سیاہ و سفید کو یہاں کی چمک دمک کو یہاں کے استحصال کو، یہاں کی فریب کاریوں کو سب کو قریب سے دیکھا ہے انہیں گدڑیوں میں لعل بھی ہے۔ اور سفید پوشی کے پیچھے سیاہی کے پیکر بھی، ان سب کو انہوں نے اپنی مشہور نظم "پرچھائیوں کے دیس میں" اس طرح لکھ دیا ہے کہ مدتوں سند رہے گی اور کام آئے گی۔ یہ نظم آج بھی نئی ہے۔ جیسے ان کے یادوں کے کردار ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں۔ دعا ہے کہ ان کا قلم اسی طرح رواں، اور مثیر پنہاں اور رنگینیاں بکھیرتا رہے۔

براہ کرم اپنی تخلیقات خوش خط

جگن ناتھ آزاد

سرینگر

کیا تمنائے دل خاک ہے خاموش رہو
آج ماحول خطرناک ہے خاموش رہو

درد سینے کا سبب اس کا ہے یا جوش بہار
کس لئے سینۂ گل چاک ہے خاموش رہو

رازدار و! یہ کہیں راز نہ رسوا ہو جائے
کس لئے دل مرا غمناک ہے خاموش رہو

نطق بے باک زمانے میں بڑی شے ہے مگر
وقت کچھ اور بھی بے باک ہے خاموش رہو

عنبر و عود کا ہر سمت دھواں ہے ورنہ
یہ فضا آج بھی ناپاک ہے، خاموش رہو

ہر فکر و ننگ و نام سے آزاد اٹھے ہیں ہم
مانا کہ تیری بزم سے ناشاد اٹھے ہیں ہم

تیرا کمال ہے نہ قفس کا کمال ہے
شاخ چمن سے آپ ہی صیاد اٹھے ہیں ہم

اس گلستاں میں کوئی ہمیں پوچھتا نہیں
جس گلستاں میں صورت شمشاد اٹھے ہیں ہم

لے تیری مشکلوں کو بھی آسان کر چلے
خود دام لے کے ہاتھ میں صیاد اٹھے ہیں ہم

خاک وطن سے آج فراق وجگر کے بعد
کہ وضع تو لئے ہوئے آزاد اٹھے ہیں ہم

غزلیں

رؤف خیر - حیدرآباد

ہر اک مقام پہ کچھ دل بدل تو ہوتے ہیں
بدلنے والے یقیناً سنبھل تو ہوتے ہیں

پتہ نہیں انہیں یہ بدگمانیاں کیوں ہیں
کہ رائگل سے مسائل بھی حل تو ہوتے ہیں

کھلانے والے بہت دشت و برف زار میں گل
نہ ہوتے ہوں گے مگر آج کل تو ہوتے ہیں

خفا خفا ہے بہت بے دلیل ہونے پر
خطا سرشت کے ماتھے پہ بل تو ہوتے ہیں

ذرا سنبھل کہ بڑی خوش نما ہے وہ دلدل
یہ اور بات ہے اس میں کنول تو ہوتے ہیں

یہ کیا ضرور ہے پتھر بھی مارتے جائیں
بھری بہار میں پیڑوں پہ پھل تو ہوتے ہیں

یہ خدوخال عروج و زوال کے البم
کہانیوں پہ کئی مشتمل تو ہوتے ہیں

لہولہان سہی حوصلے پرندوں کے
خیال و خواب کا نعم البدل تو ہوتے ہیں

یہ گولیاں تو ہر اک بات کا جواب نہیں
سوال اپنی جگہ برمحل تو ہوتے ہیں

نہ دیکھیے چشم حقارت سے ان بزرگوں کو
کھنڈر بھی حسب روایت محل تو ہوتے ہیں

رؤف خیر نہیں مرتے اولیائے غزل
یہ اور بات ہے نذر اجل تو ہوتے ہیں

غزلیں

ڈاکٹر سخاوت شمیم، کوڈنگی

لبوں پہ سرخ لکیروں کا جال جیسا تھا
ترا تبسم رنگیں خیال جیسا تھا

ملے ہو تم تو یہ احساس مٹ گیا ورنہ
مرا وجود کبھی اک سوال جیسا تھا

حسین خواب کا ٹوٹا طلسم رنگیں تو
تمام شہر ہماری مثال جیسا تھا

نفس نفس میں سمایا ہے کیفیت بن کر
وہ ایک جذبہ جو خواب و خیال جیسا تھا

فراق یار کا عالم، وہ جان و دل کا زیاں
مآل عشق تو کیا تھا، مآل جیسا تھا

شمیم پوچھ رہے ہو کہ کس طرح گذرا
تمہیں خبر ہی کہاں میرا حال جیسا تھا

غزلیں

سید احمد سحر

دل ہے جرم عاشقی ہے اور ہم
اک جہاں کی برہمی ہے اور ہم

تیغ زن ہے سر پھری قاتل ہوا
خون کی بہتی ندی ہے اور ہم

دل ہے اور خون وفا کا پیرہن
موسم گل کی ہنسی ہے اور ہم

روشنی طبع تو ہی ساتھ دے
جادہ جادہ تیرگی ہے اور ہم

آخر شب [illegible] شعلے ہیں سحر
ہچکیاں لیتی ندی ہے اور ہم

یادیں جو پکی ہوتی جاتی ہیں
چوٹیں ہیں گہری ہوتی جاتی ہیں

گلشن مسموم ہو گئی ہے فضا
وادیاں نیلی ہوتی جاتی ہیں

سر اٹھاتے ہی کیوں امنگوں کی
قامتیں چھوٹی ہوتی جاتی ہیں

صبح کے انتظار میں کلیاں
کیسی مٹ میلی ہوتی جاتی ہیں

پاؤں پھیلائے جا رہے ہیں لوگ
چادریں چھوٹی ہوتی جاتی ہیں

سچ کہوں تو برا لگے گا سحر
نیتیں ٹھنڈی ہوتی جاتی ہیں

عہد عکّاس غزلیں

عبدالمتین نیاز

غزل کی جملہ خوبیوں میں ایک خوبی الفاظ کا بے تکلف استعمال بھی ہے۔ عبدالمتین نیاز کے قارئین ان کی غزلوں کی اس خصوصیت سے واقف ہوں گے۔ عہد حاضر کے بے شمار غزل گو شعرا میں بے تکلف اظہار، لفظوں کے دروبست پر غیر معمولی قدرت اور اپنے منفرد لہجے سے شعر کی معنویت اور اس کے مفہوم میں اضافہ کرنے کی جو خصوصیت عبدالمتین نیاز کے یہاں بالعموم پائی جاتی ہے وہ خال خال دکھائی دیتی ہے۔ اظہار کی برجستگی کیسے کیسے نئے موضوعات جنم دیتی ہے۔ اس تصور پر غور کرنے کے لئے ہم جناب نیاز کی چند تخلیقات ایک ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ ممکن ہے قارئین سہیل شاعر کی ان خوبیوں کو بھی دریافت کرلیں جن کا اس مختصر شذرے میں ذکر نہیں ہو سکا۔

— ادارہ —

کشتیوں کو روندتی چلتی ہے دیوانی ہوا
پھر نئی صف بندیاں کرتی ہے طوفانی ہوا

سب رگیں ہیں جسم کی جھنکار میں ڈوبی ہوئی
چھو گئی ہم کو اچانک کیسی انجانی ہوا

پر نہیں کھولے تھے جب تک اس کا اندازہ نہ تھا
زخم کھا کر ہی مری عظمت کو پہچانی ہوا

فاتح عالم بنے گی مستند تو ہو ذرا
یہ قبیلوں میں بٹی نادان دیوانی ہوا

خاک اڑانے بھی نہیں آتا ہجوم دوستاں
اپنی گلیوں میں چلی ہے جب سے دیوانی ہوا

شہر کو تاراج کرنا چاہتی تھی، کر دیا
عاجزی، منت، خوشامد کچھ نہیں مانی ہوا

زخم دل پر بھی عنایت کی نظر ہوگی ضرور
پھر [illegible] نکلی ہے مستانی ہوا

عبدالمتین نیاز

برگ پیلے کیا ہوئے شورِ خزاں اٹھنے لگا
بے شرر ہی سینۂ گل سے دھواں اٹھنے لگا

نام پر ہم کو تحفظ کے لئے اتنے فریب
دھیرے دھیرے اعتبارِ آسماں اٹھنے لگا

رحمتیں شاید کہ ہم سے بھی گریزاں ہو گئیں
ورنہ کیوں اس شہر سے امن و اماں اٹھنے لگا

بٹ گئی اک دن جزیروں میں ہماری زندگی
اور کہانی سے شعورِ داستاں اٹھنے لگا

کہہ کے دیوانہ مجھے دنیا نے رسوا کر دیا
آنکھ سے جب پردۂ وہم و گماں اٹھنے لگا

کاش پہلے جاگتے تو دھوپ میں جلتے نہ ہم
نیند ٹوٹی سر سے جس دن سائباں اٹھنے لگا

آگ پھر لگنے لگی نفرت کی شہروں میں نیاز
دیکھئے چاروں طرف پھر سے دھواں اٹھنے لگا

مجھے وہ جاں سے گذرنے کا کیا صلہ دے گا
خبر اسے جو لگے گی تو مسکرا دے گا

یہاں سوال فقط میرے فیصلے کا نہیں
میں بھول جاؤں تو کیا وہ مجھے بھلا دے گا

جو دن طلوع بھی ہوگا تو اس قیامت سے
اداسیاں مرے ماحول میں سجا دے گا

مکان کے در و دیوار ہی ہیں جب دشمن
امید کس سے رکھیں کون آسرا دے گا

ہوا کا ہاتھ پکڑ کر بلندیوں پہ نہ جا
یہ اعتبار تجھے خاک میں ملا دے گا

بڑا ہی شوخ طبیعت ہے آج کا قاتل
جب آئے گا تو اک زخم کو ہنسا دے گا

ہماری پیاس کا حاصل ہے ایک ہی موسم
جو خوشبوؤں کا [illegible] دے گا

عبدالمتین نیساں

اک دشت ہے یہ شہرِ نگار اور طرح کا
کرتے ہیں ادھر لوگ شکار اور طرح کا

پھولوں کی جگہ زخم دیئے جاتے ہیں ہم کو
ہوتا ہے یہاں جشنِ بہار اور طرح کا

اشکوں سے یہ نکھرے گا نہ بارش سے دھلے گا
ہر شیشۂ جاں پر ہے غبار اور طرح کا

منزل کی خبر جان کے سب دوڑ پڑے ہیں
دیتی ہے پتہ راہ گزار اور طرح کا

بے خوف ہیں کوئے خس و خاشاک کے باسی
بستی میں ہے اب رقصِ شرار اور طرح کا

خوشیوں سے ملے رنج، محبت نے دیئے داغ
ہے اور طرح کی کتی، خمار اور طرح کا

سامانِ رسد لوٹ لیا ہم سے نہ کی جنگ
دشمن نے کیا اب کے تو وار اور طرح کا

یزید بن کے جو عزت مآب آئے گا
صد آفتوں پہ یقیناً عذاب آئے گا

ابھی تو راکھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں شرار
ہوا اڑائے گی جب انقلاب آئے گا

یہ بزدلوں کی ہے بستی پکارنے والے
صدائے حق کا کہاں سے جواب آئے گا

نگاہ راز حقیقت سے آشنا ہے بہت
ہمارے سامنے اب کیا سراب آئے گا

کوئی نجات کی منزل دکھا دے مولا
اب اور خاک پہ کتنا عذاب آئے گا

غموں کی آگ میں تپ کر حریف بن پہلے
اندھیرے گھر میں ترے آفتاب آئے گا

تم آئینہ لئے [illegible] کو [illegible]
[illegible] خا[illegible] آئے گا

غزلیں

کرشن پرویز
کھرڑ، پنجاب

دھند میں ہر چہرہ اٹ کر رہ گیا
خواب ذہنوں میں سمٹ کر رہ گیا

سوچ کر دل نے بچھائی تھی بساط
پھر بھی ہر پانسہ پلٹ کر رہ گیا

اب جلانے آئے ہوا اپنے چراغ
جب ہوا کا زور گھٹ کر رہ گیا

آگئی جب یاد ان کی دن ڈھلے
درد کا بادل بھی چھٹ کر رہ گیا

آج میری داستاں کا لفظ لفظ
مختلف ہجوں میں بٹ کر رہ گیا

کل تلک صدیاں رہیں میری اسیر
آج میں لمحوں میں بٹ کر رہ گیا

لٹ گئے پرویز جب ہم ہر طرح
دوستوں کا شور گھٹ کر رہ گیا

ایم مصطفیٰ فراز
وارانسی

جو کائنات کی حسن نظر میں رکھا تھا
کمال وہ مرے دست ہنر میں رکھا تھا

قدم جہاں سے تری رہگزر میں رکھا تھا
وہاں سے مژدۂ منزل سفر میں رکھا تھا

کسی کے لمس کی خوشبو کسی کی یاد کے گل
یہی تو سایۂ دل تھا کہ گھر میں رکھا تھا

اسے بجھا کے گنوایا سراغ منزل کا
چراغ دل جو تری رہ گزر میں رکھا تھا

غموں کی دھوپ میں اپنا بھی سی ٹھنڈک کو
کسی کی یاد کا سایہ سفر میں رکھا تھا

اسی کے فیض سے زیر قدم ہیں ہفت افلاک
تری طلب کا وہ سودا جو سر میں رکھا تھا

وہ بن کے بوند لہو کی ٹپک گیا ہے فراز
جو ایک خواب حسیں چشم تر میں رکھا تھا

قیدی شیخوپوری

ہماری بادہ کشی پر عتاب ٹوٹ گیا
ہمارے نام کا جامِ شراب ٹوٹ گیا

بیک نگاہ وہ اترا تھا شیشۂ دل میں
ذرا سی آیا تو مثلِ حباب ٹوٹ گیا

تھی آنکھ بند تو حاصل تھی ہر خوشی مجھ کو
کھلی جو آنکھ تو پل پل کا خواب ٹوٹ گیا

وہ اپنی زلفِ پریشاں سنوارتے ہی رہے
وفا کی شدت سے دل کا گلاب ٹوٹ گیا

نہ جانے کون سی الجھن میں پڑ گئے دونوں
نظر نظر سے ملی اور حجاب ٹوٹ گیا

پلٹ کے دیکھ نہ ایوانِ زندگی کی طرف
مکانِ شوق کا اک ایک باب ٹوٹ گیا

حساب کون چکاتا خوشی کے لمحوں کا
خوشی سے پہلے غم بے حساب ٹوٹ گیا

یہ کس کے دامِ محبت میں آ گیا قیدی
غرورِ ضبط پسِ اضطراب ٹوٹ گیا

نثار احمد نثار
حسنی پور

غزل ہر لفظ میں تاثیر چاہے
ہمارا دور بھی اک میر چاہے

ہوا کے دوش پر ہیں کچھ پرندے
کمان شوق سے کہ تیر چاہے

مرے اندر کی ٹوٹی چیز مجھ سے
ارادہ عزم وہ تدبیر چاہے

ابھی بھی رنگ نادانی ہے اس پر
سبھی خوابوں کی وہ تعبیر چاہے

کبھی آزاد رہنا چاہتا ہے
کبھی ہاتھوں میں خود زنجیر چاہے

مری آنکھوں میں کیسی آنکھ ہے جو
ہر اک ساعت تری تصویر چاہے

غزلیں

ویریندر پٹواری
دہلی ۹٦

سراب

میں جس شخص کے دروازے پر کھڑا ہوں اس کا نام کرانتی کمار ہی تو ہے اس لئے مجھے دروازے پر لگی نیم پلیٹ دیکھ کر حیران نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ طوطو تو ہمارا دیا ہوا نام ہے، حالانکہ وہ خود کو کرانتی کمار کی بجائے کبھی شاہی لکڑہارا اور کبھی عنقریب ہونے والی رسم تاج پوشی کا منتظر راج کمار بتاتا ہے۔ پھر بھی میرا گہری دوست ہونے کی وجہ سے تب ناراض نہیں ہوتا جب میں کبھی مذاقاً اور کبھی طنزاً طوطو کہہ کر مخاطب ہوتا ہوں۔ میں کچھ بھی کہوں خاموشی سے سنتا رہتا ہے اور پھر چائے پی کر یا کھانا کھا کر چلا جاتا ہے۔ ہاں جب میرے ساتھ کوئی اور بیٹھا ہو تو وہ ایک دانشور کی طرح مسکرا مسکرا کر، باتیں چبا چبا کر اور وقفے دے دے کر کسی دوسرے جہاں کی باتیں کرتا ہے۔ گویا ایک اجنبی کو اپنے وطن کے بارے میں بتا رہا ہو۔ دور بہت دور — اس دھرتی سے دور [illegible] دلوں کے پار — آکاش میں چاند ستاروں کی طرح۔ ایک ملک — دھرتی کی طرح خوبصورت — سمندر کی طرح پھیلا ہوا — چار سو خوشبو سے مہکتا ہوا۔

جہاں اناج اگانے کے لئے ہل نہیں چلانے پڑتے۔ گھر بنانے کے لئے پتھر نہیں توڑنے پڑتے۔ حکومت کے لئے جنگ نہیں لڑنی پڑتی ہے۔ حفاظت کے لئے نہ فوج کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہتھیاروں کی — بس چمتکاری باز کسی پہنچے ہوئے گورو کی غیبی طاقت سے جس کے کندھے پر بیٹھ جائے وہی شہنشاہ عالم بن جاتا ہے۔ اور طلسمی طاقت کا مالک بن کر، انگلی ہلا کر دھان پیدا کر دیتا ہے گرمی سردی ہوا برف۔ پودے، جنگل — اور عیش و عشرت کا سامان۔ فقط انگلی ہلا کر — پھر کسی کو کام کاج محنت و مشقت کرنے کی کیا ضرورت —! — ؟

پچھلے [illegible] سے ایسی باتیں کرنے والا جسمانی طور پر اپنے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہر وقت بیٹھے رہنے والا اور ذہنی طور پر آسمان میں اڑنے والا یہ سورما اچانک طلسمی گھوڑے سے اتر کر فیکٹری کا سائرن سنتے ہی دوڑتا بھاگتا کام پر جانے لگا ہے یہ جان کر یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ ایک اندھے نے خود جسم جلا کر اپنی ڈوبتی [illegible] لگا کر اپنے [illegible] کو گرداب کے منہ سے نکالا۔۔۔

اسی بات پر کوئی یقین کرے تو کیسے؟ یقیناً یہ سب طوطو کا کرشماتی طاقت کا احساس دلانے کا ایک نیا پبلسٹی سٹنٹ ہوگا لیکن نہیں —— ایسا ہوتا تو طوطو سمگلنگ کرتا۔ فیکٹری میں مزدوری کیوں کرتا؟ اور پھر اپنے یوسف میاں کی بات میں بھی دم ہے وہ ایک سچا مسلمان ہے اس لئے جھوٹ کبھی تو نہیں بولتا ہے۔ وہ سارے شہر کی خبر رکھتا ہے۔ ڈاکیہ جو ٹھہرا۔ مگر بات سے بات جوڑ کر یا باتوں کو توڑ موڑ کر کسی نے فتنہ فساد کا مواد بنانے کا فارمولہ اس نے کبھی سیکھا نہیں۔ اس لئے یقین کرنا ہی پڑا ورنہ میں یہاں ہرگز نہیں آتا۔ سچ پوچھئے تو مجھے اس بات کی خوشی بھی ہے اور حیرت بھی —— حیرت اس لئے کہ طلسمی پنجروں میں قید اور اپنے کمرے میں بدلتی ہوئی تصویروں اور پوسٹروں میں جکڑا ہوا یہ شخص کیسے آزاد ہوگیا ——؟ جو بات میں طوطو کو پچھلے ۱۸ سال سے نہیں سمجھا سکا وہی بات طوطو اب کیسے سمجھ گیا ہے ؟

طوطو اور میں جب اسکول میں پڑھتے تھے تب وہ پڑھائی کرنے کی بجائے امتحان کے دنوں مندر میں جا کر کتاب کھول دیتا تھا اور جو اس صفحے پر لکھا ہوتا تھا وہی طوطے کی طرح رٹ کر امتحان ہال میں چلا جاتا تھا یا کسی ننگے بابا کی سیوا کر کے اس سے کتاب کا صفحہ نمبر لے کر وہی سوال یاد کر لیتا تھا۔ پھر ہوتا وہی تھا جس کا غم اس کے باپ کو چاٹ گیا۔ وہ فیل ہوتا رہا —— اور جب میں نے کالج میں داخلہ لیا تب بھی طوطو اسی اسکول میں یوں پھنسا رہا جیسے ایک تنگ دروازے میں پھنسی ہوئی ایک موٹی بھینس —— ان حالات میں بھی وہ اپنی ناکامیوں سے دل شکستہ ہونے کی بجائے خود ہی اپنے بارے میں کہا کرتا تھا۔ بھات کیا ہوا۔ میری عمر ہی کیا ہے۔ بس صحت ٹھیک رہے۔ اور پھر وہ ہمارے گھر آکر یوں کھاتا رہتا تھا جیسے اونٹ دس دن کے لئے ڈٹ کر کھا پی رہا ہو —— اس پر یہ طرّہ کہ جہاں اس کا باپ اپنے آخری دن گنتا رہتا تھا وہاں طوطو ہر گذرے دن کے بعد یہ احساس دلاتا رہتا تھا جیسے اس کی تاج پوشی میں چند دن باقی رہ گئے ہوں۔ طوطو کا باپ ایک بہت ہی غریب مگر گیانی پنڈت تھا۔ ہمارے شہر کے بیرونی علاقے میں صدیوں پرانے کھنڈر ہیں اور ان کھنڈروں کے درمیان بھگوان شنکر کا ایک پراچین مندر ہے۔ پنڈت جی اسی مندر کے پجاری تھے۔ کہا جاتا تھا کہ پنڈت جی جس بھگت کو دل سے آشیرواد دیتے تھے اس کی مرادیں پوری ہو جاتی تھیں۔ مگر پنڈت جی کی دو مرادیں تھیں جو پوری نہیں ہوئیں۔ ایک تو یہ تھی کہ آس پاس کی بنجر زمین میں ایک ٹیوب ویل بن جائے تاکہ وہ دھان کی کاشت کر سکے۔ اور وہ مرنے سے پہلے کھیتوں کی لہک دیکھ سکے۔ فصلوں کی مہک سونگھ سکے۔ دوسری خواہش یہ تھی کہ طوطو پڑھ لکھ کر ایک افسر بن جائے۔ یا پھر ایک خوشحال محنت کش کسان مگر طوطو گھر بار چھوڑ کر سنیاس لینے والے ایک سمگلر کے جنگل میں پھنس کر اپنے آپ کو وہ شہی [illegible] سمجھنے لگا جس کے کندھے پر ایک جھنکاری باز بیٹھ گیا۔ اور وہ ایک چکرورتی مہاراجہ بن گیا۔ بس تب سے وہ آکاش میں اڑتی ہوئی چیل کو بھی باز سمجھ کر سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا ہو کر اپنے کندھے کو یوں جھکاتا رہتا تھا جیسے ایک چکرورتی مہاراجہ کی سواری کے لئے شاہی ہاتھی جھک گیا ہو یا پھر ایک راج کمار تاج پوشی

کے لئے اپنا سر جھکا رہا ہو۔

ایک بار وہ کلہاڑی ساتھ لے کر جنگل میں محنت کا تماشا اور آوازیں دیتا رہا — راج کماری میں یہاں ہوں۔ قریب آجاؤ تاکہ جھنکاری باز اپنا کام کر سکے۔ فارسٹ والوں نے پکڑ کر خوب مارا تو وہ مسکرا کر یہ احساس دلاتا رہا کہ وہ سپاہیوں سے جو اچھے برتاؤ کے لئے کسی کو بھی ایک دن کی بادشاہت دے سکتا ہے۔ اڑوس پڑوس کے لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ طوطو کوئی کام کاج نہیں کرتا ہے بلکہ یاروں دوستوں یا اجنبی لوگوں کے گھروں میں ڈھیٹ بن کر دو وقت کی روٹی کھاتا ہے۔ وہ اس کی احمقانہ حرکتوں پر ہنستے رہتے ہیں۔ یوں تو ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو بھی پکائی ملے۔ مگر کہاں ملے یہ بھی کوئی ان کو کندھے پر اٹھا کر لے جائے۔ یعنی ایک تو کرشماتی چراغ کا سراغ ملے اور پھر چراغ ہاتھ میں تھمانے والا بھی ملے تاکہ خود کچھ بھی نہ کرنا پڑے۔ طوطو بھی ایک ایسا ہی شخص ہے جو بچپن سے ہی ایک سہارے کو پانے کے لئے دوسرے سہارے کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ اسی لئے وہ جھنکاری باز کو تلاش کرنے کے لئے کبھی دیوی دیوتاؤں کبھی سادھو سنتوں اور کبھی سیاسی اور سماجی لیڈروں کو بطور سیڑھی استعمال کر کے یا ان کی انگلی پکڑ کر اپنا مقصد پورا کرنا چاہتا ہے۔ مگر اپنے آپ کو بہت چالاک آدمی جس کو یقین ہے کہ وہ چکرورتی راجہ بنے گا۔ جب سہارے کو زیادہ چالاک سمجھتا ہے تب وہ ہاتھ کھینچ کر دوسرے سہارے کا دامن پکڑ لیتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے کمرے میں نظر آتی تھیں اور وہ خود ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تصویر کے سامنے یوں بیٹھا نظر [illegible] جیسے ایک کسان آسمان کو ملتجی نظروں سے [illegible] بارش کا انتظار کر رہا ہو۔ اور

میں طوطو کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کو بہت سمجھایا کرتا تھا تاکہ وہ جھنکاری باز کو بھول کر اپنے آپ کو ان بدلتی تصویروں کے چکر سے دور رکھ کر محنت اور مشقت کر کے اپنے بدحال گھر کو تباہ ہونے سے بچائے۔ مگر وہ کہاں کسی کی بات مانتا تھا۔

طوطو میں اچانک یہ تبدیلی کیسے آگئی کہ وہ فقط اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچ کر تصویروں کے طلسم سے باہر نکل آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب وہ نہ تو جھنکاری باز کی تلاش کرنا چاہتا تھا اور نہ تصویروں میں کوئی دلچسپی لینا چاہتا ہے۔ دراصل وہ شاہی لکڑہارا جس کو باز فرش سے اٹھا کر عرش پر لے کر ایک بادشاہ بنا سکتا تھا۔ تین سال سے اپنے بھوکے بچوں کو پالنے کی خاطر پھر سے جنگل میں لکڑیاں کاٹ کاٹ کر شہر میں بیچنے کا دھندہ کر رہا تھا۔ یعنی طوطو اب فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ گھر کے اقتصادی بحران پر قابو پانے کی خاطر اوور ٹائم بھی کرتا آیا ہے۔ بیوی بھی کام کرتی ہے۔ طوطو کا چھوٹا بیٹا جو علاج نہ ہونے کی وجہ سے معذور ہو چکا تھا درزی کی دکان کرتا ہے۔ اور اب نہ طوطو عید پر فیس کر لوگوں کو جاگیریں بانٹتا رہتا ہے۔ نہ وہ میرے پھٹے پرانے کپڑے پہنتا ہے۔ نہ اس کے بچے لوگوں کے دان کے بسوٹے اور سائز یا انڈر سائز کپڑے پہن لیتے ہیں۔ بلکہ طوطو کو بھی محلے والے پنڈت کرانتی کمار کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور وہ اپنے بنجر زمین میں ٹیوب ویل لگوانے میں بہت دلچسپی لے رہے ہیں اور یہ سب بیان کر کے بہت خوش ہوں۔ کیونکہ پچھلے بیس سال سے میں اس کو یہی کرنے کو کہتا رہا ہوں۔ بلو دیر آید درست آید۔ اچھا ہوا جو اس نے یہ سب میرے کہنے پر نہیں بلکہ خود حالات کو سمجھ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ [illegible] کیا۔

کاش ہمارے ملک کے کروڑوں غریب لوگ محنت اور
مشقت کی قدر سمجھتے اور اپنی بہبودی کے لئے سیاسی
اور جینکاروں کے محتاج نہ رہتے۔
دکھ تو اس بات کا ہے کہ طوطو بھی یہ بات
پہلے کیوں نہیں سمجھ پایا۔ اور اگر وہ سمجھ پایا ہوتا
تو اس نے زندگی میں بہت کچھ کھویا نہ ہوتا۔ بادشاہت
کا خواب دیکھنے کی خاطر وہ عمر بھر سوتا رہا۔ نیند میں
چلتا رہا اور ایک سراب کا تعاقب کرتے کرتے اپنا
پا… جن کو وہ ہم سفر ہم نوا سمجھتا رہا وہ اس کی کمزوریوں
سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ کہ شاہی خواب یا سبز باغ دکھانے
والے دراصل محنت کش لوگوں کے ہاتھ پاؤں بلکہ ان
کی سوچ سمجھ بھی مفلوج کر کے ان کو اپنے حکم کا غلام
بنا دیتے ہیں۔ یوں کہئے ان کو روبوٹ بنا دیتے ہیں
اپنے نئے نئے تجربے کرنے کے لئے گنی پگس۔ جب
… نے یہ بات طوطو کو سمجھا دی تھی تب وہ بغیر
… کئے امتحان میں پاس ہونا چاہتا تھا۔ گمراہ
… والوں نے اس کو طوطے کے نکالے فعال۔
پھنس گئی۔ جنم جنم اور اپنے رنگین پوسٹر دکھا کر
… لکڑ ہارے سے چکرورتی راجہ یا ایک ہی
… ایم ایل اے ایم پی۔ منسٹر۔ چیف منسٹر
… منسٹر، صدر مملکت۔ یعنی مہاراجہ وکرمادتیہ
شہنشاہ اکبر بنانے کا یقین دلاتے ہیں۔ اور یہ
… تب ٹوٹ جاتے ہیں جب نیند میں چلنے والا
… ڈیل کر یا نعرے لگا کر یا اعلان جنگ کر کے
بندوق اٹھا کر خودکشی کھائی میں گر جاتا ہے۔ تب
اپنا بیٹا ہو دیکھ کر اپنے آپ کو سمجھ پاتا ہے اور
اپنے ہاتھ پاؤں پر بھروسہ کرنے لگتا ہے۔ طوطو کے
ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوگا۔ اسلم دادا کا اندازہ
صحیح ہے کہ طوطو ان تصویروں کے چکر سے تب آزاد
ہوگا جب وہ جان لے گا کہ ذات پات کی نفرت سے
نکالی ہوئی سیمی آل بیلاس کے ہونہار یونیورسٹی میں
اول آنے والے بیٹے کو جس جادوگر نے … کر دیا تھا وہ اسی
جادوگر نے نکالی تھی جو اس کو جیتا ہار کا سہرا …
جس … کہ اس کو ایم ایل اے بنانے کا وعدہ کر کے
اس کے گھر میں یوں براجمان تھا جیسے مندر میں کوئی
دیوتا کی مورتی۔ طوطو نے ایسے شخص کی پرستش کرنا
چھوڑ دی۔ میرے لئے یہ واقعہ اتنا ضروری نہیں تھا جتنا
یہ جاننا کہ طوطو نے تصویروں یا رنگدار پوسٹروں کی
پرستش کرنا چھوڑ دی ہے اور اس وقت تک جب طوطو
کے دروازے پر دستک دے رہا ہوں تو لگ رہا
ہے میں ہر محنت کش انسان کے ذہن پر دستک دے
رہا ہوں یہ بتانے کے لئے کہ اندھیرے میں رہنے والو
باہر آ کر اجالوں کو دیکھو ورنہ اندھے کہلاؤ گے
اور کولہو کے بیل کی طرح ہانکے جاؤ گے!
طوطو کے گھر کا دروازہ اس کے سب سے چھوٹے
بیٹے رام پرشاد نے کھولا تو گھر کی حالت دیکھ کر
مجھے از حد خوشی ہوئی جہاں دیوار پر ایک تصویر آویزاں
رہتی تھی اور گھر میں ایک عجیب سی اداسی طاری رہا کرتی تھی
وہاں کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ دیواروں پر فیملی کی اپنی
تصویر اور قدرتی مناظر کے حسین کیلنڈر لگے تھے
دو ایک بزرگوں کی تصویریں … کی۔ ہاں ایک
کونے میں بلیک اینڈ وائٹ کی ایک پرانی سی تصویر تھی۔
اور رام پرشاد میرے سوالات کے جوابات دینے کے
ساتھ بار بار اپنی آنکھیں بند کر کے ایک موٹی کتاب

کھول کر کتاب میں نشان لگا رہا تھا۔
[illegible] نہیں ہے ... گھر میں [illegible] کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اس [illegible] پریشان کر رہی ہے کہ جب [illegible] پریشان [illegible] پر جھوٹا مان لیا [illegible] طوطا [illegible] گرد [illegible] کا ہے اور اسی لیے اس گھر کو [illegible] بکھرنے سے بچایا ہے اور آگے بھی بچاتا رہے گا۔ [illegible] یقین تھا کہ امتحان [illegible] سوالات پوچھے جائیں گے جن پر وہ [illegible] کا نام لے کر نشان لگا رہا ہے۔
یہ [illegible] جسم پر ایک سا [illegible] گر چکی ہیں اور [illegible] بار [illegible] پانی ہی کر اب یہ سمجھ گیا ہے کہ طوطا بالکل نہیں بدلا ہے۔ لیکن اس بار بھی تصویر بدل گئی ہے اور فقط خوش قسمتی سے راستہ دکھانے والے بادلوں کی سیڑھی، چاند پر بنا طلسمی محل میں رہنے والی پری کے سنہرے پر اور ان پروں سے بنے ایک تاج کی جھنکاری طاقت کے بارے میں بتا دینے کی بجائے طوطو کو فیکٹری کا دروازہ دکھایا تھا اور میرا راستہ دکھانے والے کو ایک نیا اوتار سمجھ کر ایک جھنکار کا انتظار کر رہا تھا۔ گویا اس گھر میں پھر ایک شہی لکڑہارا پیدا ہو چکا تھا جو آنکھیں بند کر کے ایک سراب کا تعاقب کرنے لگا تھا یا پھر طوطو ہی ہے۔۔۔ کرانتی کمار نہیں۔
میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ اب کیسے آئے گا انقلاب؟ آخر یہ کون ہے جس نے پھر اس گھر میں قدم رکھ کر ان لوگوں کو اپنا غلام بنا کر ان کو نئی راہیں بتانے سے روک رکھا ہے۔
میں نے نہایت غم اور نفرت کے جذبے احساس سے جب چھوٹی سی تصویر کو غور سے دیکھا تب یوں لگا جیسے زمین پھٹ گئی اور میں ایک پیڑ کی طرح اکھڑتا ہوا ایک بہت ہی گہری کھائی میں گرتا جا رہا ہوں۔
یہ چھوٹی سی تصویر جو اب اس گھر کے وجود سے بھی بڑی بن گئی ہے۔ میری تصویر ہے۔ !
[illegible]

نسیم بن آسی
مغلسرائے

پرندوں کا جھنڈ

ایک تو وہ پرانا ٹوٹا ہوا چوبی تخت جس پر
بیٹھ کے چائے کی روایتی لطف کا گھونٹ رہا تھا
... وہ دودھ والی ـــ وہ دودھ لے کر آئی ٹھیک
... اس کا معدہ ـ اسے کبھی باتیں ہضم نہیں
ہوتیں، جیسے چائے ......

ایک بار [illegible] نے چائے کو معصوم دوشیزہ
تشبیہ دی تھی۔ لیکن [illegible] ان پی تنگ نے اعتراض
تھا۔ چائے کو کسی عورت ہی سے تشبیہ دینی ہے تو
... کے ساتھ اس طرح نسبت نہ جوڑا جائے
رنگ اور مہکتی ہوئی [illegible] والی نازنینوں کو حریری
... والے کمروں کی زینت بنتے دیکھئے۔ انہیں
... اور آبشاروں کو کیوں چھونے دیا جائے۔
... دونوں سے بھی آگے نکل جانا چاہتا ہوں۔
... میں بھول گیا کہ میں کسی [illegible] کی
... دوں ـــ؟

چائے کی خواہش تو بھی عجیب ہوتی ہے۔ پھر جاڑے
... میں یہ خواہش مزید تیز ہو جاتی ہے۔ اور جب
... پوری نہیں ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کچھ کھو گیا ہے

انسانی تہذیب کے پس منظر میں تمباکو نوشی، سگریٹ
نوشی اور چائے نوشی کی خاص اہمیت ہے۔ انسانی ارتقا
کے یہ اہم جز ہیں۔ جب آدمی خالی اور بے کار ہو، بیوی
سے بھی لڑائی جھگڑا کرنے کا کوئی بہانا نہ ملے تو ایسے لمحوں
میں چائے کا لطف لیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں تمباکو نوشی
کرتا نہیں ہوں۔ شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا ہوں۔ صرف
چائے پیتا ہوں۔ جو میرے لئے بادۂ صالحین سے کم
نہیں ہے۔ لیکن میں چائے کبھی کب پیتا تھا۔ چائے کا
شوق مجھے مولانا آزاد کی کتاب غبار خاطر پڑھ کر
ہوا۔ بڑے آدمی جو کرتے ہیں، چھوٹے اس کی نقل بہت
جلد کرنے لگتے ہیں۔ آج دنیا میں چوری، گھوٹالا اور
رشوت خوری جو عام ہو گئی ہے اس کی وجہ صرف
یہی بڑے لوگ ہیں ـ!

چائے کا رواج سب سے پہلے چین میں ہوا۔ اس
کے بعد دوسرے ملکوں میں۔ اب تو اسے ہر ملک کی قومی
عادت کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ چائے کے لطف
کو شبنم کی طلسمی خوشبو اور لطافت کے ساتھ وابستہ
کیا جا سکتا ہے۔ تاؤ فلسفے کی تعلیم کے مطابق انسان

کو فطرت کے ساتھ ہم آہنگ رہنا چاہئے۔ اور یہ کہ کائنات کی زندگی کا بقا نر اور مادہ قوتوں کے باہمی ملاپ پر منحصر ہے۔ اس کے خیال میں شبنم، آسمان اور زمین کا جوہر ہے۔ اس لئے کہ رات میں ان دونوں قوتوں کا آپس میں اختلاط ہوتا ہے۔ اس نظریہ سے شبنم ایک طلسماتی غذا ہے۔ جو بڑی لطیف، شفاف اور ہلکی ہوتی ہے۔ اور جو شخص اسے کافی مقدار میں پی لیتا ہے۔ اس کے لئے یہ آب حیات کا کام کر سکتی ہے۔

انگریز مصنف، ٹامس ڈی کوئنسی نے کہا تھا۔

چائے اہل دماغ کا محبوب مشروب ہے۔ کین چینی اس سے بھی آگے ہے جو دنیا سے الگ تھلگ گوشہ نشیں رہتا ہو ۔۔۔!

چائے میں دودھ ملا کر پینے کا رواج انگریزوں نے قائم کیا تھا۔ جس سے چائے کی تلخی کم ہو جاتی ہے لیکن مجھے تو تلخ ہی چائے پسند ہے۔ مجھے ملاوٹ سے سخت نفرت ہے۔۔۔ چائے ہو یا کسی ملک کی سرکار، میں سچ کے ساتھ جھوٹ کبھی برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔ ایسا کرنا اپنے ضمیر کے ساتھ ملاوٹ کرنا ہے۔ اس لئے لوگ مجھے برا کہتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں۔ لیکن اس کی پروا کئے بغیر اپنی صلیب پر لٹک رہا ہوں۔ شاید لوگ مجھے کوئی دیوانہ سمجھ رہے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہر دور میں دنیا ایسے لوگوں کو دیوانہ سمجھتی رہی ہے۔ لیکن آج دنیا میں ایسے ہی دیوانوں کی ضرورت ہے۔ جگر مراد آبادی نے کیا خوب کہا ہے ۔

کیا جانے کیا ہو گیا ارباب جنوں کو
جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد

'ح' نے کئی بار اکٹھ کر آنگن میں جھانکا بھی جیسے اسے بھی میری طرح چائے کی طلب پریشان کر رہی تھی۔ لیکن میں جانتا ہوں، اسے چائے کی اتنی طلب کبھی ہوئی تھی نہ کسی تلخی کی۔ تلخی کی طلب تو کم کسی کو ہوتی ہے۔ 'ح' اتنا میٹھا تھا کہ اس کے پانچ فٹ ایک انچ کے قد کو دیکھ کر ہی لوگوں کو اندازہ ہو جاتا تھا۔ جس سے اس کی کاٹھی کھلی نظر آتی تھی جس کا ذکر وہ لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے کرتا تھا۔ وہ سانولے رنگ کا انسان تھا۔ ہر کام اطمینان سے کرنے یا اس کی پروا نہ کرنے کی وجہ سے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر وقت سکون رہتا تھا اس پر جب وہ ہنستا تھا، اس کے دانت عجیب کثافت کا احساس دلاتے تھے۔ اور جو اس بات کے ثبوت تھے کہ وہ کثرت سے بیڑی خوشی کا عادی ہے۔

وہ صرف میرے لئے جھانک رہا تھا۔ ایک تو چائے آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ دوسرے وہ چوبی تخت جس پر ہم بیٹھے تھے مجھے بور کر رہا تھا۔ لیکن 'ح' کی بات کچھ اور تھی وہ تو کہیں بھی بیٹھ سکتا تھا اور اپنی لایعنی باتوں سے لوگوں کو بور کر سکتا تھا۔ اور صرف اس کی انہیں باتوں سے لوگ اس سے دور بھاگتے تھے۔

جب ہی میری نظر ٹیلی فون پر گئی جو 'ح' کے کمرے میں ایک میز پر رکھا ہوا تھا اور جس کا رنگ سبزی مائل تھا۔ اخباری نمائندہ ہونے کی وجہ سے ان کے لئے ٹیلیفون ضروری تھا۔ وہ اس کے ذریعہ دیگر جگہوں میں فون کر کے اطلاعات جمع کرتا تھا لیکن اس کا سب سے زیادہ فائدہ فوزیہ اٹھاتی تھی۔ اس کا فون ہی بر معاشقہ چلا تھا۔ یہ نہیں کہ 'ح' کو اپنی لڑکی کی اس حرکت کا علم نہ تھا لیکن ان کی جوانی کی پرورش کے آگے اس کے الفاظ گو

جاتے تھے جو اپنے آوارہ دوستوں کو بلا وجہ فون کرتے
تے تھے جس سے اس کا بل ہمیشہ بڑھ کر آتا تھا اور
'، ' سے ادا کرتے تھک گیا تھا۔

چائے میں دیر تھی تو ہم سامنے رکھا ہوا ٹیلی ویژن
یکھ سکتے تھے لیکن آج تیسرے دن بھی بجلی ٹھیک
ہا ہوئی تھی۔ میرا ذہن پھر چائے پر مرکوز ہو گیا اور میں
ے کا لطف اٹھانے کے لفظوں پر غور کرنے لگا۔ جہاں
ے نوشی کی جائے۔ وہاں کی جگہ صاف ستھری ہو۔ بچوں
ور دخل نہ ہو۔ ایسی جگہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے
نے پھولوں کا لان ہو۔ سبزوں کی باڑھ بھی ہو سکتی ہے
ں کی ہریالی آنکھوں میں کھب رہی ہو۔ گرد میں چائے
ں کی جا رہی ہو تو اس میں بڑی سی کھڑکی ہو جس سے خنک
ئیں آ رہی ہوں یا اس سے کھیت نظر آتے ہوں جن میں
ون کھیلی ہو اور نوجوان لڑکیاں اور خوبصورت عورتیں
ے درمیان کھڑی ہوں یا پھر ان میں چڑیاں پھدک رہی
- - - - - -

لیکن یہاں تو سب کچھ میرے تخیل کے برعکس تھا
رے کی چھت اور دیواروں کا چونا جگہ جگہ سے جھڑ گیا
جس سے وہ کرم خوردہ نظر آ رہے تھے۔ 'ح' نے ٹھیکہ
لی تھی۔ اس لئے اس نے فرش میں سمنٹ کم اور بالو
ملا دیا تھا جس سے وہ یہاں وہاں سے اکھڑ گئی
اور اب وہ جدید آرٹ کے نمونے آڑی ترچھی
پیش کر رہی تھی۔ فرش مرمت طلب تھی اور اسے
رج میں ڈال رہی تھی — کمرے میں صرف ایک
تھی جس پر اس نے کپڑے کا ایک بے رنگ پردا لگا
جس سے 'شی' ناراض ہو گئی۔ وہ جانتی ہے ہر
ن لڑکی پہلے بہن ہوتی ہے بعد میں معشوقہ —

لیکن مرد کب اس کی پروا کرتے ہیں۔ پروا کرتے تو 'ش'
میری بیوی ہو کر میرے ساتھ کسی غیر بیوی کا سلوک کرتی؟
معدے کی بات شاید آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں
آ رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم شاعر اور ادیب لوگ بات
ذرا دوسرے انداز سے کرتے ہیں۔ غالب کا کون شعر
جلدی سمجھ میں آتا ہے۔ بہت سر مارنے کے بعد جو ہم سمجھتے
ہیں اس کا وہ مطلب نہیں ہوتا جو ماہر غالبیات سمجھتے ہیں
شاعر بھی اپنے شعروں کو کب سمجھتے ہیں۔ وہ تو صرف
شعر کہتے ہیں، سمجھتے دوسرے لوگ ہیں۔ اب میں معدے
کی وضاحت کرتا ہوں — چائے پہلے ہی کپ میں نکل چکی
تھی۔ لیکن سوئے ہضم کی وجہ سے دودھ والی 'ح' کی بیوی
میم سے باتیں کرنے لگی۔ میم کو بھی باتیں ہضم نہیں ہوتی تھیں
وہ بھی اس کی باتوں میں شامل ہو گئی۔ اب جہاں دو عورتوں
کا معدہ شامل ہو جائے گا، چائے ٹھنڈی نہیں ہو جائے گی؟
میں نے چائے کا صرف ایک ہی گھونٹ پی کر کپ رکھ
دیا۔ لیکن 'ح' اسے دھیرے دھیرے چیتا رہا۔ میں نے
اسے کتنی بار کہا ہے — 'ح'! چائے کو عورت سمجھو۔ اور
اسے ٹھنڈی مت ہونے دو۔ لیکن میری بات اسے کب
سمجھ میں آتی ہے۔ ایک تو وہ پہلے ہی سے ٹھنڈی تھی۔ دوسرے
اسے گھونٹ گھونٹ پی کر اس نے اس کی ساری لطافت
غارت کر دی۔ لیکن 'ح' کی طرح اس کی عقل بھی موٹی ہے۔
اس کی کالی گھنی مونچھوں میں اس کے صرف دانت نظر
آئے جو کثیف ہونے کی وجہ سے مجھے متنفر کر رہے تھے۔
اور میں دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔

جب ہی وہ دودھ والی جانے لگی — اس کی
ناک میں سونے کا بلاق تھا۔ اور کانوں میں سونے کی
بالیاں۔ اس نے ضرور آئینہ دیکھا ہوگا۔ لیکن میں کہہ رہا

اس کے آئینے نے اسے دھوکا دیا تھا۔ جیسے بہت سے لوگوں کے آئینے دیتے ہیں۔ عورتیں سمجھتی ہیں۔ خوبصورتی صرف سونے کے زیور سے آتی ہے۔ لیکن یہ ان کا وہم ہے۔ عورت خود ایک خوبصورتی ہے جو کسی سونا یا چاندی کی محتاج نہیں۔ یہ راز عورتیں جان لیں تو سونے اور چاندی کا بھاؤ یکایک گر جائے۔

یہ دودھ والی میرے یہاں بھی دودھ دینے آتی ہے لیکن اس کا نام ——— مجھے معلوم نہیں۔ ایک دن ضرور اس کا نام پوچھوں گا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ وہ اپنا نام مجھے نہیں بتائے گی۔ عورتیں مردوں سے اپنا سب کچھ چھپاتی ہیں۔ اس لئے نام بھی ... لیکن وہ جتنا اپنا آپ چھپاتی ہے وہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ مردوں کی نگاہیں بھی تو ہیں جو انہیں ہر وقت عریاں کرتی رہتی ہیں۔

مغربی عورتیں، دنیا کی ساری عورتوں کے مقابلے میں آرائش اور خوشبوؤں پر زیادہ روپے صرف کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے آرائش کے لئے دن رات لگانے والی کریموں، جلد اور مسام صاف کرنے والی کریموں۔ سورج کی تمازت سے بچانے والی کریموں اور ہر قسم کی خوشبوؤں کا جتنا بڑا کاروبار مغربی ممالک میں ہوتا ہے کہیں نہیں۔ اور یہ سب اس لئے ہے کہ مرد خوش رہیں۔

لیکن دودھ والی کو حسن کی آرائش کے لئے اتنے سامان نہیں ملتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کے بلاؤز کا کالا رنگ اس کے گورے چہرے سے بدن پر نمایاں نظر آ رہا تھا۔ وہ ناک میں بلاق اور کانوں میں بالیاں نہ بھی پہنتی تو اس کی آنکھیں لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے کافی تھیں۔ جن پر سیاہ دراز پلکوں کا جھالر لٹک رہا تھا۔ جس سے وہ خود تو محفوظ تھیں لیکن دوسروں کو سے

سکون بنا رہی تھیں۔ اس کی ساڑھی کا آنچل ڈھلک کر اس کے شانے پر آ گیا تھا۔ جس سے اس کی سیاہ چوٹی نظر آ رہی تھی جو کالی ناگن کی طرح دور ہی سے پھنکار رہی تھی ——— اس کا بلاؤز چھوٹا تھا جس کے باعث اس کے گہرے خطوط کو جگہ جگہ سے ظاہر کر رہا تھا۔ یہ اسی بلاؤز ہی کی وجہ سے تھا کہ اس کے نیچے کا گداز سینہ صاف نظر آ رہا تھا۔ جس سے لوگوں کی نگاہیں اس پر جم جاتی ہیں۔ یہ نمائش کا زمانہ ہے جس سے دودھ والی مستثنیٰ نہیں ہے۔

انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک نمائش ہی نمائش ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو اس سے خالی نہیں۔ یہ نمائشیں نہ ہوں تو زندگی میں رہ ہی کیا جائے گا۔ شاید کوئی یہ سمجھے میں نمائشوں کا اشتہار دے رہا ہوں۔ ایسی بات نہیں اتنی بڑی کائنات کا میں بھی ایک حصہ ہوں اور اس کی جھلک کہیں نہ کہیں میرے اندر بھی ہے۔ لیکن حسن کی نمائش مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے ہاں کہیں زیادہ ہے۔ حسن اور عورت کا چولی دامن کا تعلق ہے لیکن چولی اب ختم ہو گئی ہے۔ صرف دامن رہ گیا ہے۔ وہ دن دور نہیں، جب دامن بھی نہیں رہے گا ———

دودھ والی جا چکی تھی اور باہر سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی ———

پگھلتے جاؤ ..... پگھلتے جاؤ ....

ایک زمانہ تھا جب نمائش کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن زمانہ بدل گیا ہے اور ایک زمانے کو دوسرے سے جوڑنا مشکل ہوتا ہے۔ جو نمائش پہلے گھر کی چہار دیواری تک ہی محدود تھی وہ باہر آ گئی ہے۔ گھر کی چہار دیواری کے اندر جو چیز کوئی نہیں دیکھ سکتا ہے اسے سڑکوں پر آ سر

کیا جا سکتا ہے۔ جب شام ہوتی ہے تو ایسا معلوم
ہے سڑکیں صرف خوبصورت عورتوں کے لئے ہیں۔
سڑکوں پر اس طرح کھلے عام چلنے کا رواج نہیں تھا
عاشق کو گلی کوچوں کے چکر لگانے پڑتے تھے اور [illegible]
ت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اب یہ پریشانی
ہے۔ عاشق بھی سڑک پر معشوق بھی۔

مس "ح" کے یہاں چائے نہیں پی سکا تو کیا
گھر بھی نہیں پی سکتا تھا۔ چائے کی طلب اسی طرح
شباب پر تھی۔ اور وہ مجھ کو پریشان کر رہی تھی جب
راستہ میں میری نظر اپنے کرتے پاجامے اور اوپر سے
رنگ کی جاکٹ پر گئی جو گندہ ہو گئے تھے اور میری
پسند طبیعت پر گراں گزر رہے تھے۔ جب سے
ئی میں اضافہ ہوا ہے دانش، کفایت شعاری سے
لے رہی ہے۔ اور کپڑوں پر کم صابن خرچ کرتی ہے اور
صاف کپڑوں کا بہت شوق ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں
لباس جدید زمانہ میں بھی قدیم لباس کیوں پہنتا ہوں
ہے کبھی وہ یہ بھی پوچھیں گے، میں صرف دو پہر، دو
اور ایک ہی سر کیوں رکھتا ہوں — کیا یہ ضروری
لوگوں کو سب سے زیادہ آرام دہ لباس پہننے
سے بھی بتائی جائے — جو شخص گھر یا باہر صرف
ر پاجامہ پہن کر گھومتا ہے اسے یہ بھی بتانا چاہیے
دہ کالر دار قمیض، جیکٹ پتلون، کوٹ اور گلے
نے والی ٹائی کیوں نہیں پہنتا ہے۔ میرا خیال
فرنگی لباس سے لوگ اس لئے مرعوب ہیں کہ ان کے
انسان کو تباہ کرنے والی نعمتیں ایجاد کی ہیں —!
ر پاجامہ جسم کے لئے زیادہ کارآمد اور صحت بخش
ان میں [illegible]

ہو۔ مجھے یقین ہے، تمام سارے لوگ جو انقلاب لائے
رکھتے ہیں میرے اس خیال سے اتفاق کریں گے۔

جیو ..... شاباش ....

میں لباس کے بارے میں صرف یہ دیکھتا ہوں، کہ
وہ صاف ستھرے ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ کپڑوں کی
خوبصورتی کا انحصار ان کی صفائی پر ہے۔ کپڑے
گندے ہوں تو اپنا آپ بہت حقیر معلوم ہوتا ہے۔ اس
وقت مجھے بڑھتی ہوئی مہنگائی کا اور اپنی محدود آمدنی پر
بے حد تاسف ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ ان کی وجہ سے
دانش میرے قومی لباس کی صفائی نہیں کر سکی تھی۔

کبھی کبھی میں عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہوں۔
اپنے کندھوں کو اونچا کر لیتا ہوں اور تخیل کی دنیا میں
نکل جاتا ہوں چاندنی رات ہے اور میں "ش" کو لے کر
تاج محل کی سیر کر رہا ہوں۔ جہاں جمنا کی لہروں میں "ش"
کا عکس پڑ رہا ہے اور میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ کبھی میں کشمیر
میں ہوں جہاں ڈل جھیل کا کنارہ ہے۔ پھر وہاں سے نشاط
باغ اور شالامار — اور وہاں میں "ش" کے ساتھ
اپنے ماضی کو تلاش کر رہا ہوں۔ کبھی میں "ش" کو
لے کر ایلورا، اجنتا اور کھجوراہو کی گپھاؤں میں
چلا جاتا ہوں — جہاں بودھ فلسفہ مصور ہیں۔ اور جو
آرٹ کے اعلیٰ نمونے پیش کرتے ہیں۔ یہی نہیں، میں تو
روس، امریکہ اور لندن کی بھی بات سوچتا ہوں۔ لیکن
جب مجھے اپنی محدود آمدنی کا خیال آتا ہے تو میرے
سارے ارادے کسی گندی نالی میں بہہ جاتے ہیں۔

[illegible] مروت ....

جاڑے کے اس موسم میں صرف سورج مہربان
تھا۔ جس کی کرنیں [illegible] کے مکانوں پر پھیلی

پھیل گئی تھی۔ اور رات کے ٹھنڈے کے بعد اپنی گرمی پہنچا رہی تھی۔
جب ہی سامنے دو گدھے نظر آئے جو قریب کے کھیت میں
گھاس چرنے کے بعد بیچ راستے میں کھڑے تھے اور آنے
جانے والوں کے لئے بلاوجہ رکاوٹ پیدا کر رہے تھے۔ لوگوں
نے انہیں ہانکا بھی۔ اس پر بھی وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے
تھے۔ پتہ نہیں وہ کس خیال میں غرق تھے۔ جب ہی ان کی
اس جسارت پر ایک آدمی نے انہیں زور سے ڈنڈا مارا
جس سے وہ گھبرا کر حرکت میں آ گئے۔ لیکن کچھ دور جا کر پھر
رک گئے۔ سامنے نالی تھی جو کھیت کا فالتو پانی نکالنے کے
لئے بنائی گئی تھی۔ لیکن لوگوں کے آنے جانے کے لئے اس
پر دو پتھر رکھ دیئے گئے تھے۔ گدھے چاہتے تو ان پتھروں
پر سے گزر سکتے تھے لیکن انھوں نے چھلانگ لگا دی۔
اصل میں گدھا کوئی جانور نہیں ہوتا ہے، وہ ایک
عمل ہوتا ہے جو کام کرنے کے طریقے میں حائل ہو جاتا ہے۔
کچھ دور جا کر وہ پھر کھیت میں اتر گئے اور گھاس پر منہ
مارنے سے پہلے ایک گدھا پوری طاقت سے اپنے اندر
کی آواز باہر نکالنے لگا جس کی نقل دوسرا بھی کرنے لگا۔
اب جہاں دو گدھے ایک ساتھ اپنی عجیب وغریب آوازیں
نکال رہے ہوں۔ وہاں آنے جانے والوں کی توجہ ان کی
طرف مبذول ہونا قدرتی بات ہے۔

میرے اندر چائے کی خواہش شدید ہو گئی تھی۔
جس سے دماغ اپنا کام کرنے لگا اور پاؤں اپنے۔ میں نے
سوچا، پہلے چائے کا گرم گرم گھونٹ حلق کے نیچے اتاروں
گا۔ اس کے بعد سگریٹ جو چائے پینے کے بعد ذائقہ بدلنے
کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ سگریٹ نہ ملے تو بیڑی بھی چل جاتی
ہے۔ یہ سوچتا اپنے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ میری نظر
سب سے پہلے دلشاد پر پڑی جو قمیض اور شلوار میں ملبوس

پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اس کی صندلی پیشانی پر بالوں کا ایک
لٹ لگا ہوا تھا۔ اتوار ہونے کی وجہ سے بیلو، پنٹو اور
اسکول نہیں گئے تھے اور ماں کے ساتھ ٹی۔ وی۔ د
رہے تھے۔ ان کے ساتھ میری ایک چھوٹی بہن بھی شامل

جب سے ٹی۔ وی چلا ہے انسان مکان میں ر
کی بجائے ٹی۔ وی میں رہ رہا ہے۔ اس کی پوری زند
ٹی۔ وی میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ جس کی وجہ سے
ملک میں ایک تبدیلی آ گئی ہے جو سینما ہال میں باپ، بیٹی،
بہن اور بھائی ایک ساتھ دیکھنے میں شرم محسوس کر
ہیں ٹی۔ وی پر بغیر سر جھکائے اسے ایک ساتھ دیکھ
ہیں۔ ٹی۔ وی سے فائدے اور بھی ہیں اس کی وجہ سے
بچوں کو لڑنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ بیویاں دن بھر ٹی
دیکھتی ہیں اور شوہر کا پرس خالی نہیں کراتی ہیں!

ٹی۔ وی پر کوئی فلم چل رہی تھی جسے دیکھنے
سب منہمک تھے۔ پڑوس کی عورتیں اور بچے بھی آ گئے
جس سے پورا کمرہ سینما ہال بن گیا تھا۔ میں کچھ دیر تک
گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ الماری میں رکھی دھیر
کتابوں اور چھت میں لگے بجلی کے پنکھے پر گرد جم گئی
جس سے میری طبع نازک مکدر ہو رہی تھی۔ ٹی وی میں د
فرسودہ اور بور کر دینے والا منظر تھا جس سے میں
متنفر ہو جاتا ہوں۔ اب میں زیادہ دیر تک چا
انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اضطرا
کے ساتھ دلشاد کی طرف دیکھا۔

"پہلے میرے لئے چائے بناؤ!"

"لیکن چینی کہاں ہے؟"

جب ہی مجھے خیراتی لال پر غصہ آنے لگا
[illegible] دلشاد کی وکالت سے چینی اور منہ کا تیل

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی)

خواب کنارے (کہانیوں کا مجموعہ)

سلیم سرفراز

سلیم بک ڈپو، بستی بازار، آسنسول

[illegible]

[illegible] روپے

سلیم سرفراز کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ قارئین کے سامنے ان کی تخلیقات کی پرکھ کے لئے پیش [illegible] کے بعد مجھے دو جملے یاد آرہے ہیں۔ [illegible] شام کا پتہ دیتی ہے - MORN- [illegible] -ING SHOWS THE [illegible] تاثیا" [illegible] تخلیقات: اگر سلیم سرفراز نے [illegible] تعلق [illegible] عالم کے عظیم کہانی کاروں کی کہانیوں کا [illegible] اور بار بار کہانیاں لکھتے ہو تو جلد ہی [illegible] فن میں نکھار، معنویت، گہرائیت اور گیرائیت [illegible] اور وہ عظیم کہانی کاروں کی صف میں شامل [illegible] کہانی کار [illegible] کے گہرے مطالعہ اور [illegible]

[illegible]

اور مسلسل کا طالب ہے۔ کہانی کا فن اتنا آسان نہیں کہ قلم اٹھایا اور ایک ہی نشست میں اسے ختم کر دیا۔ ایسی کہانیاں فنی خامیوں سے بھرپور ہوتی ہیں ان میں معنویت، گہرائیت و گیرائیت کا بھی فقدان ہوتا ہے۔ ہاں کہنہ مشقوں کے لئے یہ ممکن ہے۔ ایک اچھی کہانی بڑی آہستہ خرامی کے ساتھ اپنے پلاٹ کے سہارے منزل کی جانب گامزن رہتی ہے اس کے کردار اعمال متحرک رہتے ہیں اور کہانی کے واقعات کی مناسبت سے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ کہانی اپنے تمام تر فنی احتیاط کو ملحوظ رکھتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہتی ہے۔ اس میں کہانی پن کا جادوئی اثر ہر لمحہ نمایاں رہتا ہے۔ نقطۂ عروج جاندار اور کھلا ہوتا ہے جہاں کہانی ختم ہو کر قاری کو مکمل سوچ [illegible] قدیم و جدید دونوں طرز کی اعلیٰ کہانیوں [illegible]

[illegible]

جہاں تک سلیم سرفراز کی کہانیوں اور کہانی کاری کا تعلق ہے ان کی کہانیاں بہت حد تک فن کے معیار پر پوری اترتی نظر آتی ہیں۔ ان کے خیال میں انہیں اپنا مشق [illegible] کو رکھنا چاہئے۔ ان کی کہانیاں بھی آہستہ روی سے چلتی ہیں اور اپنے ساتھ ساتھ اپنے کردار کو فعال رکھتی ہیں۔ [illegible] اور [illegible] ہیں۔ قاری ان کے مطالعہ میں کہانی پن کی سحر آفرینی سے لمحہ بہ لمحہ محظوظ ہوتا رہتا ہے۔ کہانی کا اختتام اسے سیری بخشتا ہے۔ سلیم سرفراز کو کہانی کا عنوان دینے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ عنوان ایسا ہو جو کہانی کے واقعات سے جواز محسوس کیا جائے۔ کہانی کے لئے عنوان بھی ایک اہم چیز ہے۔ اس کا خیال رکھا جائے۔

میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ رسائل و جرائد میں چھپ جانا ہر تخلیق [illegible] ہوتی ہے اور وہ ہر لحاظ سے مکمل اور کامیاب ہوتی ہے۔ میرے نزدیک چھپنا بذات خود معیار نہیں ہے۔ معیار تو یہ ہے کہ فنکار اپنی تخلیق کے ذریعے اپنے قارئین کو کیا کچھ دیتا ہے؟ اس کے اندر سماج و معاشرت کے لئے کیا پیغام ہے؟ تخلیق کاری کے حسن کو کس قدر معیار کرتی ہے؟ اس کی زندگی کے مسائل کے حل کے لئے تخلیق میں کیا کچھ ہے؟ [illegible] مختلف اصناف ادب کی تخلیق [illegible]

[illegible] کے مطالعہ [illegible] پر توجہ دیں گے۔

[illegible] سلیم سرفراز کی تخلیق [illegible] ایک کامیاب تخلیق ہے [illegible] اپنی اپنی جگہ پر کامیاب ہیں [illegible] بخشے گا۔ زبان و بیان آسان اور عام فہم [illegible] خامیوں سے حتی الامکان گریز کیا گیا ہے۔ نوشتی کہانی [illegible] کہانی کے مطالعہ کا [illegible] رکھنے والوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ اردو اکادمی کو چاہئے [illegible] خصوصیت [illegible]
کتابت و طباعت اچھی اور اغلاط سے پاک ہے۔ قیمت اس وقت کے لحاظ سے موزوں ہے۔
میری دعا ہے کہ اللہ کرے زور قلم زیادہ۔

سید ابو الفیض [illegible]

کتاب کا نام:- برگ و ساز
شاعر کا نام:- فاخر جلال پوری
قیمت:- [illegible]
ملنے کا پتہ:- فاخر جلال پوری، محلہ [illegible]
[illegible]

برگ و ساز [illegible] جناب فاخر جلال پوری [illegible]

[illegible]

محبت کی تہذیب کا [illegible] مجموعہ [illegible]
[illegible] "اعتذار" اور "لغت" [illegible]
اشارہ ہوتا ہے کہ شاعر کا [illegible] عقیدہ و عشق
[illegible] اور رسول [illegible] عشق سے سرشار
[illegible] مجھے ان کی [illegible] نے بے حد متاثر کیا ہے۔
[illegible] یوں ہے

[illegible] ہم [illegible] سکا ایجاد تھا
[illegible] بھی [illegible] تھا

اگر تم سے بچھڑ [illegible] مقصد [illegible]
[illegible] سامنے [illegible]

ہائے وہ بات اشاروں میں جو نا ممکن تھی
اب وہی نامۂ پیغام تک آ پہونچی ہے

تمہیں ثبوت وفاداری میں تو کتنا دوں
مرا خلوص ہے وہ [illegible] کا آئینہ [illegible] میرا

خلوص و پیار، محبت، وطن کی خوشبو
ہر ایک ذرہ خاک وطن کہلاتا ہے

غم جہاں سے میں ہارا کبھی نہیں فاخر
کہ [illegible] ہے زندگی کی [illegible] میری
[illegible] صاحب کے مذکورہ اشعار سے [illegible] ہیں کہ
فاخری محبت [illegible] محبت وطن اور [illegible]

[illegible]

موجود تھا ہے۔ مایوسی [illegible] کا ذرہ احساس
تک نہیں ہوتا [illegible] ان کا [illegible] شاعر [illegible] تحقیق
[illegible] کا [illegible] مجھے امید ہے کہ
ان کا مجموعہ "[illegible]" اردو حلقوں میں پسند
کیا جائے گا۔ اور بہت جلد مقبول ہوگا۔ کتاب
صوری و معنوی اعتبار سے دیدہ زیب و خوبصورت
ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

——— کمال جعفری، [illegible]

نام کتاب :-
مصنف کا نام :- ڈاکٹر آفاق فاخری
قیمت :- [illegible] روپے
پتہ :- نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ امین آباد
لکھنؤ

اردو کے مشہور شاعر جناب فاخر جلال پوری کے
صاحبزادے ڈاکٹر آفاق فاخری ایک ذہین اسکالر
اور شاعر ہیں۔ آفاق فاخری نے "فکر اقبال کے سرچشمے"
پر مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے لکھا تھا اور لکھنؤ
یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض
کی۔ [illegible] کے مصداق آفاق فاخری نے
ترقی کی ایک [illegible] منزل طے کرلی۔

آفاق فاخری نے فکر اقبال کے سرچشمے کو چھ
ابواب میں تقسیم کیا تاکہ فکر اقبال کے [illegible]
[illegible] ہیں [illegible] حقیقت ہے کہ [illegible]
[illegible] اقبال [illegible] شاعری [illegible]

شہرِ خیال

سہیل کا شمارہ [illegible] موصول ہوا۔
سی پرآشوب رسالے کا ۱۵ سال تک مسلسل نکلنا اپنے
پ میں ایک "معجزہ" سے کم نہیں ——— اردو والے
پنی تہذیب اور زبان سے رشتہ توڑ چکے ہیں۔ ان کے
سوچنے کا انداز ان کے ذہنی دیوالیہ کی کہانی ہے۔
یسے سخت اور گرم موسم میں "سہیل" جیسا شگفتہ پھول
کھلا لینا آپ کی اور صرف آپ کی محنت ہے ——— اور
رگوں کا دیا ہوا اعتبار و اعتماد ——— آپ اس کے وارث
و امین ہیں۔

آپ کی ایمانداری، حوصلہ اور لگن کو دیکھتے ہوئے
م کہہ سکتے ہیں کہ سہیل کا مستقبل بہت روشن ہے۔
ہری حسن کتابت طباعت اور سرورق جاذب نظر
وگیا ہے۔ باطنی حسن اس کے مشمولات ہیں ——— "محمود"
ڑھ کر ایک علمی آسودگی ملتی ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا
ہا ہے۔ "انفرادیت کی تلاش کرنے والے صرف انسانی
[illegible] نہیں ہوتے بلکہ نئے مسائل کے تلاش میں بھی رہتے ہیں
یہی تلاش انہیں زندہ بھی رکھتی ہے۔ نہیں تو محض
وہ انسانی ارتقاء کی حیثیت سے خود [illegible] کی سی
رتی ہے"

اصغر علی انجینیر کا مضمون "ہندوستانی مسلمان
سماجی اور معاشی مسائل ——— ایک تجزیہ" پسند آیا۔
ان کا یہ کہنا کہ "دنیا کا کوئی ملک یا سماج ایسا نہیں ہے
جہاں کسی نہ کسی قسم کا تعصب نہ پایا جاتا ہو" آج ہم جتنے
ترقی یافتہ ہوتے جا رہے ہیں ہماری سماجی اخلاقی اور
معاشرتی پیچیدگی اور زیادہ بڑھتی جا رہی ہے۔ آج
انسان وحشت اور بربریت میں آخری سیما پار کر چکا ہے
محمد ایوب کا مقالہ "فن تاریخ گوئی" ایک اچھا
مضمون ہے۔ بسمل سنبھلی نے فارسی اور اردو میں
خوب تاریخ نکالی ہے۔ تبرک کے طور پر عاشق وارثی
اور عشرت مرحوم کی وفات کی تاریخ ملاحظہ فرمائیں ——
عشرت صاحب بسمل سنبھلی کے استاد بھی
تھے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

در لغاں کز مرگ استاد عشرت
جہاں [illegible] آمد
ازیں واقعہ [illegible] بسمل
پے سال وفاتش [illegible] آمد
[illegible] کرد [illegible]

[illegible] عشرت آمد

[illegible] مرحوم

تقریبات الرضا محافل میں باکمال وعقیدت رکھتے تھے ــــ سید محمد عاشق گیا کے بہت بڑے وکیل تھے۔ اور باکمال شاعر تھے۔

کوئی غم کرے یا منائے خوشی
کہ دنیا میں دونوں شے عارضی
جب آنکھیں ہوئی بند کچھ بھی نہیں
[illegible] کا ہے آدمی
کوئی [illegible] کرے اعتماد
[illegible]
کوئی اپنی جہاں میں کسی کا ہے ہم
بہار دو روزہ ہے یہ زندگی

. . . .

. . . .

[illegible]
[illegible]
ہوا [illegible] جسم پیوند خاک
[illegible]
سر [illegible] ہے یہ تاریخ سال
جناں کو گئے عاشق وارثی

۱۳۵۹ھ

خاص طور سے [illegible] کی غزل نے بہت متاثر کیا، جناب [illegible]، [illegible]، شاہد اختر، باقر [illegible] کرتی رہی۔

سید [illegible] کا [illegible] بیمار کون؟

بیچارے سماج جنہیں سماجی خرافات کا مسئلہ [illegible]۔ قیاس [illegible] آئینہ اگر عوام کی قیاس قسم کا شکار ہو جائے تو [illegible] عذاب بن جاتا ہے ــــ بیمار ذہنیت کا مالک کون ہے؟ ہمارے سماج کا سب سے معتبر پیشے کا پیشہ ور ڈاکٹر، جو چند سکوں کے لیے موذی سے موذی مرض کا بیوپار کرتا ہے ــــ کہاں بہت [illegible] مجبور [illegible] ہے کہاں کا [illegible] ہے۔

فیصلہ ممکن نہ ہو گیا ہو کالی میں کہانی ادھوری ہے۔

ــــ سہ ماہی انتخاب [illegible] دربھنگہ شمارہ [illegible] جلد [illegible] نظر نواز ہوا۔ منظومات پسند آیا۔ سرورق جدیدیت کا نمونہ ہونے کے ساتھ بصیرت افروز بھی ہے۔ کتابت اور طباعت بہتر ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے مطالعے میں دقت نہیں ہوئی۔

مسلم جاوید عباسی صاحب کا مضمون "خلیل الرحمٰن اعظمی ــــ سکے کا اصل رخ" پسند آیا۔ مضمون کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خلیل الرحمٰن صاحب کی اپنی کوئی پسند تھی ہی نہیں۔ وہ دوستوں کی [illegible] پسند ہوئے۔ [illegible] انحراف کیا۔ دوستوں [illegible] حبیب کے دام میں پھنسے اور [illegible] اگر وہ زندہ ہوتے تو دوستوں [illegible] کون سا [illegible] اختیار کرتے ــــ [illegible] سال نے خلیل الرحمٰن اعظمی سے کہا تھا۔

"یار مولانا تم آدمی ہو کر [illegible] جس نے

اقبال ایک وسیع النظر دانش ور اور شاعر تھے۔ وہ
ملک اور بیرون ملک کے مختلف مفکرین اور محققین
کے افکار و نظریات سے ہم آہنگ تھے۔ چنانچہ قرآن و
حدیث کے علاوہ دیگر مذاہب کا بھی انہوں نے
مطالعہ کیا تھا۔ وہ بحیثیت فلسفی اور دانشور اپنے
افکار کو دنیا کے عظیم مفکروں اور دانشوروں سے ہم
آہنگ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ قدیم و جدید دونوں ہی علوم
کے قائل تھے۔

"علم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں"
یہی سبب ہے کہ اقبال کے فکری سرچشمے کے سوتے
رواں دواں نظر آتے ہیں۔ وہ تنگ نظری اور تعصب
سے بالکل دور تھے۔ ان کی وسیع النظری کا یہ عالم تھا
کہ انہوں نے نہ صرف رومی، غزالی، ابن تیمیہ، ابن
سینا، فارابی، ابن عربی بلکہ ارسطو، افلاطون، برگساں،
نطشے، کانٹ، ہیگل، مارکس اور لینن تک کا مطالعہ
کیا۔ ڈاکٹر آفاق فاخری نے اپنی تصنیف "فکر اقبال
کے سرچشمے" کے ذریعہ نہایت محنت اور عرق ریزی
کے ساتھ اپنی تحقیقی بصیرت سے مطالعۂ اقبال کے سلسلے
میں ہماری معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔
لائق مصنف اور جواں سال اردو کے [illegible]
ڈاکٹر آفاق فاخری کا [illegible]
تحقیق و جستجو کے ساتھ پیش کرنے کی [illegible]
[illegible] یہ کتاب ان کی محنت اور [illegible]
مطالعہ کی مظہر ہے۔ ان کی زبان سلیس اور [illegible]
عبارت [illegible]

شعراء میں [illegible] غالب پر بے شمار کام ہوئے ہیں۔
اور ان سب کی اہمیت و افادیت مسلم ہے لیکن
فکر اقبال و غالب پر تحقیق و جستجو کی راہیں اب بھی
کھلی ہوئی ہیں۔ یہ مقام شکر ہے کہ ہمارے [illegible]
شاعر اور محقق ڈاکٹر آفاق فاخری نے اقبال
کے فکری سرچشموں کی تلاش کا عمدہ تحقیقی کام کیا
میں ایک گراں قدر اضافہ فرمایا۔
"فکر اقبال کے سرچشمے" کتابت، طباعت
اور صوری و معنوی اعتبار سے جاذب نظر ہے۔
اقبال پر کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک مستند
تحقیقی کتاب ہے۔ امید ہے کہ علم و
ادب میں یہ کتاب بے حد مقبول ہوگی۔
کمال جعفری، [illegible]

[illegible]

خلیل [illegible] تھے ....

خلیل تنقیدی [illegible] سے آگے بڑھ کر
[illegible] کے [illegible] اردو ادب کے
[illegible] ..... مت [illegible]
[illegible] جانے کی [illegible] کے بعد
[illegible] ہیں [illegible] ہے تو
[illegible] ہے لیکن احتشام
[illegible] ہے کیونکہ ان کے
[illegible] تھے

احتشام الدین کے مضمون [illegible] کے
[illegible] صاحب کی
[illegible] کیا ہے۔ عباسی صاحب نے
[illegible] کا شعر [illegible] ہے۔ خلیل
[illegible] فنکار زندگی کے
[illegible] بھی تھے۔

غالب کے استقبال کے لئے [illegible] آیا اور
[illegible] کے متعلق
[illegible] اور [illegible] حاصل
[illegible] کے سلسلے میں تعصب [illegible]

کیا اس [illegible] ہو جاتی
[illegible] کے مطابق [illegible] اگر خلیل نے
[illegible] جیسا کہ [illegible] میں احتشام
[illegible] ہے کیونکہ
[illegible] برعکس [illegible] ہوتی۔

[illegible]

[illegible] ہو سکے
[illegible] سے اس خط [illegible] کا
ننگ [illegible] صاحب [illegible] لیکن
(فن تاریخ گوئی) عبدالوحید (علامہ شبلی کی فارسی شاعری)
[illegible] قادری ([illegible]) [illegible] اور [illegible] ستارا
سندر ساغری۔ کریم الاحسانی، النور [illegible] اور قادری کے
یادی [illegible] کے مستحق ہیں۔

اصغر علی انجینئر صاحب ایک ایسے قلمکار ہیں
کہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے
ہیں۔ وہ چاہے ہندوستانی مسلمان اور ثقافتی تشخص
کا مسئلہ (سہیل، [illegible]) ہو۔

یا "قرآن کے [illegible]" (سہیل اگست [illegible])
یا ہندوستانی مسلمان" (سہیل خاص نمبر" جلد [illegible])
اس میں کوئی شک نہیں کہ انجینئر صاحب نے اپنے تازہ
مضمون میں جن نکات پر زور دیا ہے وہ قرون حاضر
میں مسلمانوں کے لئے بہت ہی کارآمد اور اہمیت کے
حامل ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ انجینئر صاحب اپنے
قلم کو اس موضوع پر [illegible] رکھیں گے اور [illegible]
[illegible] ایک [illegible] (۱)
[illegible] ہوگا۔ کیونکہ (علامہ اقبال کے [illegible])
[illegible] کو
[illegible]

[illegible]

ماہنامہ سُہیل گیا



چیف ایڈیٹر

مسعود منظر

★

ایڈیٹر

جمیل منظر

خوش نویس سید عبدالاحد گیاوی

شمارہ ۱۱ جلد ۱۲

بدل اشتراک

فی شمارہ ۔۔۔ ۵ روپے

زرِ سالانہ ۔۔۔ ۵۰ روپے

لائف ممبری ۔۔۔ ۱۰۰۰ روپے

فہرست

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سُہیل

ریور سائیڈ روڈ، گیا

فون نمبر ۲۱۵۷۳

بہار میں دیہی ترقی

- صوبائی منصوبہ کا دو تہائی حصہ دیہی علاقوں کی ترقی پر خرچ کرنے کا حکومت کا فیصلہ۔
- نئے پنچایتی راج قانون کے تحت دیہاتوں میں بسنے والوں کو کئی معاملے میں اقتدار سپرد کی جا رہی ہے۔
- گزشتہ پانچ برسوں میں لگ بھگ ۸۰ ہزار کیلومیٹر اینٹ سولنگ والی دیہی سڑکوں کی تعمیر اور ۹ ہزار سے زیادہ گاؤں کو ہر موسم کے مطابق راستوں سے جوڑا گیا۔
- صوبہ کے سبھی گاؤں کو پینے کا پانی کا ایک ذریعہ مہیا ہے۔
- صوبہ کے قریب ۲۷ ہزار صاف پینے کا پانی کے عدم ذرائع ٹولوں میں اگلے سال پینے کا پانی کا ایک ایک ذرائع مہیا کرا دینے کا نشانہ
- سمیکت بال وکاس، پروگرام کے تحت ستائیس ہزار پانچ سو اٹھاسی، آنگن باڑی مراکز کے ذریعہ غریب بچوں اور حاملہ خواتین مستفیض
- سمیکت گرامین وکاس پروگرام سے قریب سولہ لاکھ خاندانوں کو ٹرائسم یوجنا سے تینتالیس ہزار لوگ مستفیض

جاری کردہ۔ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار

सू. ज. स. वि. 25 म०(सू-5) 96-97

نمود ——————

امکانات

کیا ادبی تخلیق اپنی معنویت، اپنے مفہوم اور اپنی تاثیر کے اعتبار سے SATUR-ATION POINT تک پہنچ چکی ہے؟ یہ سوال گذشتہ دس برسوں سے ادب کے مفکرین کے لئے کابوس بنا ہوا ہے۔ شاعری مر رہی ہے۔ تحریری ادب کا زوال ہو رہا ہے۔ تخلیق کا CONTENT کم سے کمتر ہو رہا ہے۔ جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں اسّی ۸۰ نوّے ۹۰ فیصد تکرار ہو رہا ہے۔ اور ادب تخلیق کرنے والے لوگ تھوتی ہڈیاں چوس رہے ہیں ——— یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں آتی رہی ہیں ان کی وجہ سے ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک بے نام خوف میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ پژمردگی اور بے ہمتی کی خطرناک صورتحال کبھی کبھی سر اٹھانے لگتی ہے

دراصل جو لوگ شعر و ادب کی موت کی بات کرتے ہیں وہ دراصل یہ سمجھتے ہیں کہ تخلیق ادب کے لئے مواد و موضوع یا الفاظ و اسالیب جامد ہیں۔ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ایک بڑے بھنڈار کا خزانہ خالی ہوتا جا رہا ہے اور ماضی و حال کے فنکاروں نے اپنے مابعد کے تخلیق کاروں کے لئے اب کچھ نہیں چھوڑا ہے۔ یہ تصور ہی غلط ہے صحیح بات تو یہ ہے کہ شعر و ادب ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ خلق ہوتا ہے۔ جس طرح سمندر کی روانی کے بارے میں یہ اندیشہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ رک جائے گی۔ جس طرح یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ فضا میں بہتی ہوئی ہوا کا خزانہ ختم ہو جائے گا اسی طرح شعر و ادب کے موضوع و مواد اور اس کے انداز بیان میں بھی ٹھہراؤ نہیں آ سکتا ——— ہاں اس کے لئے ایک شرط ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم جامد تصورات سے گریز کریں۔ شاعری کو فطری بہاؤ اور قدرت کے کرشمے سے قریب کریں۔ تخلیق شعر کو اسی SPIRIT میں لیں جس کے تحت یہ کائنات ابھی مکمل نہیں ہوتی ہے ——— ظاہر ہے کہ جب کائنات ہی مکمل نہیں ہوتی ہے تو شعر و ادب کا سوتا کیوں کر خشک ہو سکتا ہے۔ زبان، بیان، تصورات، افکار اور اسالیب کو ہم فطرت کے جدلی نظام سے قریب تصور کریں تو محسوس کریں گے کہ شاعری جاوداں، پیہم رواں اور ہردم رواں رہنے والی شے ہے۔

مسعود منظر

مظہر امام
دہلی

خیالات

ادبی منظر نامے کے حوالے سے اکثر بعض خیالات ذہن کے دروازے پر دستک دیتے رہتے ہیں۔ انہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا جائے تو کسی باقاعدہ مضمون کی شکل نہیں بنتی۔ محض چند تاثرات، کچھ یادیں، کچھ منتشر افکار، کچھ تحقیقی نتائج، کچھ تنقیدی اشارے — ان میں کبھی کبھی کام کی باتیں بھی نکل آتی ہیں۔ اور جی چاہتا ہے کہ اپنے پڑھنے والوں کو ان خیالات میں شریک کیا جائے۔ قاری کا ردِ عمل ہمیشہ میرے لئے تحریک کا باعث رہا ہے۔ میں، بہ شرطِ حیات، وقتاً فوقتاً کبھی باقاعدگی سے اور کبھی بے قاعدگی کے ساتھ "سہیل" کے صفحات پر اپنے "خیالات" پیش کرتا رہوں گا۔ اگر یہ سلسلہ غیر ضروری سمجھا گیا تو اسے کسی وقت بھی منقطع کیا جا سکتا ہے۔

مظہر امام

دیوندر ستیارتھی: کچھ باتیں

دیوندر ستیارتھی کو اردو والے بھولتے جا رہے ہیں۔ اس میں شاید ان کا بھی کچھ قصور ہو۔ تقسیم کے بعد وہ اپندر ناتھ اشک اور بلونت سنگھ کی طرح زیادہ تر ہندی میں لکھتے رہے یا پھر پنجابی میں۔ "آج کل" (ہندی) کی ادارت بھی کرتے رہے۔ یوں بھی وہ شروع سے چار چار پاؤں پر چلنے کے عادی رہے ہیں — یعنی پنجابی، اردو، ہندی اور انگریزی چاروں زبانوں میں لکھنے کا انہیں شوق رہا ہے۔ اردو والوں میں شاید POSSESSIVENESS کچھ زیادہ ہے۔ وہ اپنے ادیب کو اردو سے غیریت برتتے اور دوسری زبان کی پتنگ بڑھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔

تقسیم سے پہلے ستیارتھی کا شمار اردو کے نمایاں ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ وہ میرے بھی دس

پسندیدہ ترین افسانہ نگاروں میں تھے۔ وہ کرشن
بیدی، منٹو، اشک سب کے دوست تھے۔ "چھیڑ
خوباں سے" والی بات دوسری ہے۔ فیض احمد فیض
نے بھی انہیں اپنا "دوست مکرم" ہی لکھا ہے —
صلاح الدین احمد نے ۱۹۴۵ء میں "ادبی دنیا"
میں لکھا تھا کہ "دیویندر ستیارتھی کو اپنے چھوٹے چھوٹے
مثالوں کی بدولت آخر افسانہ نگاروں کی پہلی صف
میں جگہ مل ہی گئی"۔ ۱۹۴۵ء تک اردو میں ان کے دو
افسانوی مجموعے شائع ہو کر مقبول ہو چکے تھے۔
پھر ایسا ہوا کہ ان کے افسانوں پر گفتگو کم ہوتی گئی۔
ان کی داڑھی، ان کی ہیئت کذائی، ان کی IDIOS-
YNCRASIES، ان کا ہر کس و ناکس کو افسانہ سنانے
کا شوق زیادہ موضوع گفتگو رہا۔ شاید خود ستیارتھی
کو بھی اپنی شخصیت کا عجب زیادہ اہم نظر آنے لگا تھا۔
ان کے افسانوں میں بھی فلسفیانہ اور دانشورانہ "پوز"
(POSE) زیادہ در آیا، "افسانویت" کم ہو گئی۔ "جدید
افسانہ نگاروں" کی "جارحانہ آمد" نے بھی انہیں [illegible] لگائی۔
ان دنوں اس بات کی بہت تشہیر ہوئی کہ "سویرا"
میں بلراج مین را کا افسانہ پہلے نمبر پر اور دیویندر ستیارتھی
کا تیسرے نمبر پر چھاپا گیا ہے۔ ان کے بارے میں لطیفے
مشہور ہوتے رہے۔ کچھ لطیفے خود انہوں نے مشہور
کئے۔ کہا جاتا ہے کہ پطرس نے ٹیگور اور دیویندر ستیارتھی
کی تصویریں ساتھ دیکھ کر کہا تھا کہ اس کے نیچے لکھ دینا
چاہئے "خضاب سے پہلے، خضاب کے بعد"
تین چار سال پہلے "ذہن جدید" نے ستیارتھی
ایک [illegible] کیا تھا۔ [illegible]

کبھی اکابرین کی آرا بھی تھیں۔ ان میں سے اکثر میں دیویندر
ستیارتھی کی لمبی داڑھی کا ذکر ہے، پھر ان کے لوک
گیتوں کے جمع کرنے کی دھن کا۔ ان کے افسانوں کی بات
بس ایک دو رائیں ہیں اور وہ بھی مبہم سی۔ میں سمجھتا
ہوں کہ اردو کے معتبر افسانہ نگار کی حیثیت سے ستیارتھی
کی بازیافت کی ضرورت ہے۔

دیویندر ستیارتھی کا "فراڈ" یا "مہا پوز" ہونا
یا نہ ہونا ان کی برائی کی دلیل نہیں ہے۔ ایک زمانے
میں ادیب یا شاعر کی بدنامی بھی اس کی شہرت کے
کھاتے میں ڈال دی جاتی تھی۔ اب تو ستیارتھی کی تعیین
قدر ان کے افسانوں کے حوالے سے ہی ہوگا۔ لوک
گیتوں کو جمع کرنا، نگری نگری ملکوں ملکوں گھوم کر
یقیناً ایک قابل قدر کام ہے، اور یہ وضاحت تر اس لئے
ہو جاتا ہے کیونکہ اس محنت طلب کام کے سرانجام
دینے کا حوصلہ کسی اور کو نہیں ہوا۔ یہ ستیارتھی کا ہی
حوصلہ، ہمت اور لگن تھی کہ یہ کام ہو سکا۔ اور اس کی
داد بھی انہیں بے حد وافر ملی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بحیثیت
افسانہ نگار ان کا درجہ کیا ہے؟

گذشتہ دنوں "آج کل" نے دیویندر ستیارتھی
نمبر شائع کیا ہے۔ اس خصوصی شمارے میں ستیارتھی کی
جو نئی تحریریں چھاپی گئی ہیں، وہ سرے سے افسانہ ہیں
ہی نہیں۔ مدیر محترم خود ان تحریروں کو افسانہ کہنے کے بجائے
گومگو میں ہیں کہ یہ انشائیہ، مجموعہ یا نثری نظمیں یا انہیں
مضامین کے زمرے میں شامل کیا جائے۔ میرا خیال ہے یہ
نہ افسانے ہیں، نہ انشائیہ، نہ نثری نظم، نہ مضمون۔
[illegible]

ہیں۔ جوگندر پال کہتے ہیں انہیں سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ عتیق اللہ کا خیال درست ہے کہ ان تحریروں میں آویزہ خیالی اپنی انتہا پر ہے۔ دیوندر اسر اپنی کتاب کا حوالہ دے کر بتاتے ہیں کہ کس طرح اس میں سے قابل لحاظ حصے نکال کر دیوندر ستیارتھی نے انہیں اپنے کردار سے کہلوا دیا ہے۔ ممکن ہے انہوں نے کچھ اور کتابوں/تحریروں کا بھی سہارا لیا ہو۔ کرداروں کی زبان سے "خیالات کے جواہر ریزے" ادا کرا دینے سے افسانہ معرض وجود میں نہیں آتا۔ یہ بات ستیارتھی یقیناً جانتے ہوں گے۔ مگر یہیں ان کا "فراڈ" ظاہر ہوتا ہے جب وہ قاری کو (بلکہ نقاد کو بھی) بے وقوف بنا رہے ہوتے ہیں!

دیوندر ستیارتھی کو یاد رکھنا ہو تو ان کی نئی تحریروں کو بھول جانا چاہئے۔ اردو افسانے کی حد تک ستیارتھی اپنا کام تقسیم سے پہلے پورا کر چکے تھے، اور ان کی تعیین قدر اسی دور کے افسانوں سے ہوگی۔ فراق کے بارے میں بھی میرا یہی خیال ہے کہ وہ اپنا قابل لحاظ کام ۱۹۴۷ء تک مکمل کر چکے تھے۔ اور اب عصمت چغتائی کی بابت بھی یہی کہا جا رہا ہے۔

"دیوندر ستیارتھی نمبر" میں پڑھنے کی چیزیں کنہیا لال کپور اور راجندر سنگھ بیدی کی پرانی تحریریں ہیں، یا امتیاز احمد کا نیا مضمون۔ بس عنوان محل نظر ہے۔ ستیارتھی کو شاید ترقی پسند مصنفین کے منشور کی اطلاع بھی نہیں رہی ہوگی جب انہوں نے وہ افسانے لکھے جن کا ذکر امتیاز احمد نے کیا ہے۔ ان دنوں ایسے موضوعات کا انتخاب کرنے کے لئے ادیب کا ایک خاص معنوں میں ترقی پسند ہونا ضروری نہیں تھا۔ منٹو نے اگر اسے افسانے کا عنوان "ترقی پسند" رکھا ہے تو محض طنزاً یا بطور استہزا۔ ہم لوگ بھی اپنی نوجوانی کے دنوں میں جب نئے نئے ترقی پسند ہوئے تھے، اگر کسی شخص میں کوئی کج روی پاتے تو بطور طنز کہتے کہ وہ "بڑا ترقی پسند ہے!"

سہیل عظیم آبادی نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ ستیارتھی کو اپنا افسانہ شروع کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اگر کوئی ابتدائی پیراگراف لکھ دے تو وہ چل پڑتے ہیں۔ سہیل بھائی کا کہنا تھا کہ انہوں نے ایک بار ستیارتھی کے لئے ابتدائی حصہ لکھا تھا۔ اس کی تصدیق ستیارتھی ہی کر سکتے ہیں۔ مشہور ہے کہ منٹو کہا کرتے تھے کہ بس عنوان بتاؤ اور مجھ سے افسانہ لے لو!

خیر، یہ تو ضمنی باتیں تھیں۔ ستیارتھی کے بارے میں بار بار کہا گیا ہے کہ انہیں افسانے سنانے کا خبط ہے۔ ایک بار میں بھی ان کا ہدف بنا ہوں۔ ستیارتھی کہتے ہیں کہ بیدی بھی اپنے افسانے سنانے کو بیتاب رہتے تھے۔ شعراء تو خیر اس سلسلے میں بدنام رہے ہی! یہاں میں فیض کی ایک تحریر کا حوالہ دینا چاہتا ہوں، جس میں اس طرح کا ایک لطیفہ درج ہے۔ مرزا ظفر الحسن نے فیض سے ان کی دیباچہ نویسی کے بارے میں ایک چھوٹا سا مضمون لکھوایا تھا۔ اس میں وہ اپنی ابتدائی دیباچہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اپنے دوست مکرم دیوندر ستیارتھی کی باری آئی جو پنجابی گیت جمع کرنے کی خاطر گاؤں گاؤں پھرنے کے علاوہ اردو میں افسانے بھی لکھتے تھے۔ ان کے بارے میں [illegible]

عشن حسرت مرحوم کا کہنا تھا کہ جب ستیارتھی
تانگے پر سوار ہوتے ہیں تو تانگے والے سے
پوچھتے ہیں کہ مرتنگ کا کیا لوگے؟ وہ کہتا
ہے چونی تو ستیارتھی صاحب فرماتے
ہیں کہ پانچ آنے ملیں گے لیکن افسانہ
سننا ہوگا۔ ان کے لئے بھی کچھ لکھ دیا
اور پھر قلم رواں ہوگیا۔"

فیض نے سب سے پہلے پطرس بخاری کے ایک ترجمے کا دیباچہ لکھا۔ پھر کرتار سنگھ دگل کے ایک پنجابی مجموعے کا۔ اس کے بعد دیویندر ستیارتھی کے افسانوں کے مجموعے "نئے دیوتا" کا۔ اور پھر ان کا قلم رواں ہوگیا۔ یعنی انہوں نے کئی اور دیباچے لکھے۔ ستیارتھی کے اس مجموعے کے افسانوں

"ہمارے یہاں خود نوشت کا رواج بہت
کم ہے۔ شاید اس لئے کہ ہماری زندگی
میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش ہی نہیں
آیا یا شاید اس لئے کہ ہم اپنی زندگی سے
مستقل طور پر بیزار رہتے ہیں۔ لیکن
زندگی میں اہم اور غیر اہم کا تعین بہت
مشکل ہے اور معمولی سے معمولی واقعات
بھی زندگی کے مجموعی نظام سے متصل ہونے
کی وجہ سے اہم ہو جاتے ہیں۔ دیویندر ستیارتھی
نے اپنی شخصیت کو ایسے ہی معمولی واقعات
کو کھونٹیوں پر سجانا سیکھ لیا ہے —
کوئی سرسری ملاقات، کسی گیت کے
بول، کوئی مضمون، کوئی افسانہ

اپنے ساتھ لے آتے ہیں"

بیدی کہتے تھے کہ ستیارتھی سات جنم میں بھی کہانی کار نہیں بن سکتا۔ کنہیا لال کپور اور بیدی دونوں اس بات پر متفق تھے کہ ستیارتھی کی پہچان لوک گیتوں کے جمع کرنے والے کی حیثیت سے ہوگی، افسانہ نگار کی حیثیت سے نہیں۔ یہ باتیں ستیارتھی نے ہی لکھی ہیں۔ تو کیا ستیارتھی بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں؟ میں ذاتی طور پر ایسا نہیں سمجھتا۔

مئی ۵۱ء کے "ادبی دنیا" میں دیویندر ستیارتھی کا ایک ڈرامہ "چیتی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ "اداریہ" میں صلاح الدین احمد نے لکھا تھا،
"لیجئے، دیویندر ستیارتھی اب ڈرامے بھی لکھنے لگے ہیں اور دنیا میں وہ کون سی چیز ہے جو اس بلانگار ادیب کی دسترس سے بچی ہے۔"

دیویندر ستیارتھی کی فن کارانہ شخصیت کے لئے "بلانگا" سے بہتر اور کون صفت ہو سکتی ہے!

دیش

بقیہ: حیض حیض میں گھرا مسافر

تو اس بات پر وہ گڑ بڑا گیا۔ غصے میں چڑ گیا۔ بالآخر دو دن کی لگاتار نصیحت کام آئی۔ اب باضابطہ جن سنگھ کا ممبر ہے۔ جلسوں میں شرکت کرتا ہے، جلوسوں میں جن سنگھ کا جھنڈا لے کر آگے چلتا ہے اور میرے ملنے والے مجھ سے کہتے ہیں کہ "ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کا سالا تو بالکل ملت کا غدار ہے۔ نام کا مسلمان کام کا مسلم دشمن!"

ڈاکٹر نکہت آرا
علی گڑھ

صالحہ عابد حسین بحیثیت افسانہ نگار

اُردو خواتین افسانہ نگاروں کی فہرست میں چند ایسے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ افسانہ نگار خواتین ہیں۔ جن کی تحریروں نے اپنا انفرادیت اور اپنی منفرد حیثیت کو ادب میں منوا لیا ہے ان کے رشحات قلم اس بات کے غماز ہیں کہ ان کے افسانے عالمی ادب کے مد مقابل رکھے جا سکیں۔ ان نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں میں صالحہ عابد حسین کا نام قابل ذکر ہے۔

صالحہ عابد حسین کا اصلی نام مصداق فاطمہ تھا۔

ان کے ذوق اور ان کی فکر کو جلا بخشنے والا ان کا ماحول بھی ہے۔ انہیں غلام الثقلین جیسے جیّد عالم اور مشہور زمانہ رسالہ 'عصر جدید' کے ایڈیٹر کی دختر نیک اختر ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ صالحہ عابد حسین کی والدہ مشتاق فاطمہ بھی اچھا ادبی ذوق رکھتی تھیں اور اس طرح صالحہ عابد حسین کو ایک ایسے گھرانے میں اپنے شعور اور ذوق کو جلا بخشنے کے مواقع آئے۔ جو تعلیمی فضیلت اور علم دوستی کے لئے مشہور و ممتاز تھا۔ صالحہ عابد حسین نے علی گڑھ سے بھی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد پانی پت میں حالی گرلس اسکول [illegible]

۱۹۳۳ء میں اردو کے نامور ادیب اور عہد ساز مصنف عابد حسین کی شریک زندگی ہونے کے بعد صالحہ کے تعلیمی شوق کو پایۂ تکمیل کے خواب مکمل ہوتے نظر آئے اور شادی کے بعد صالحہ نے بہت سی زبانوں کے ادیبوں کو پڑھا۔ مختلف ممالک کے سفر نے انہیں مشاہدات و تجربات کا خزانہ عطا کیا۔ بیرونی ممالک میں خاص طور پر یورپ اور امریکہ، عراق، ایران اور سعودی عرب کا بھی دورہ کرنے کا موقع ملا۔

صالحہ عابد حسین نے تخلیقی سرگرمیوں کا آغاز کم عمری ہی سے کیا تھا۔ خود صالحہ عابد حسین کے بیان کے مطابق غالباً نو برس کی ہوں گی جب انہوں نے باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ شروع شروع میں صالحہ عابد حسین کے افسانے اردو کے رسائل تہذیب نسواں، پھول، نیرنگ خیال، عالمگیر، سہیلی وغیرہ قسم کے رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۲۸ء میں رسالہ نور جہاں میں شائع ہوا اور پہلا ناول ۱۹۴۲ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔

صالحہ عابد حسین کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع تھا۔ اسی لئے انہوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ زندگی نے

[illegible]

وخود اتنے تجربے دیئے گئے ہیں سے ان کے
ون کے موضوعات اکٹھا ہو گئے تھے۔ انہوں نے
افسانوں کے ذریعہ سماج کی برائیوں اور خامیوں
بے نقاب کیا۔ صالحہ عابد حسین نے معاشرتی اور
حی افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں پر
، نذیر احمد، پریم چند اور عصمت چغتائی کا بھی
ہے۔ صالحہ عابد حسین کے موضوعات کا دائرہ
وسیع ہے۔ انہوں نے اپنے افسانے کے موضوعات
بہت قریب سے چنے ہیں اور دلی کے مسلمانوں کے
طبقے کی تہذیب و معاشرت کو فنکارانہ طور
ش کیا ہے۔ انہوں نے مذہبی و سماجی اور سیاسی
عات کو بھی اپنے نوک قلم کا نشانہ بنایا۔ ان کی
ییاں ان کے حقیقی زندگی کا آئینہ دار ہیں۔ صالحہ
حسین عورتوں کے مسائل، عورت کی زندگی، انسا
قا، مسلم معاشرے کی اصلاح، مسلمان متوسط طبقے
شرت اور زندگی کے المیے کو پیش کرنے میں خاص
ر رکھتی ہیں۔ ان کے افسانے انمول موتی، آخری
، عورت، دو شالہ، ایک سوال، متوالہ، ماں
نا وغیرہ میں ان کے مختلف النوع موضوعات
کئے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے عورت کی بے چارگی
ماجی حیثیت کو بھی پیش کیا ہے۔ تعلیمی نظام سیاست
صلاح معاشرہ وغیرہ حیات کے ایسے گوشے ہیں
پر صالحہ عابد حسین نے بطور خاص توجہ دی ہے
کہانیوں میں عشق چھپتا ہنستا اور رومانی
نہیں بلکہ انسان کے دکھ سکھ کی خاص تصویر کشی
نے سے ملک کے [illegible] خطات یا [illegible]

کی نمائش نہیں۔ انہوں نے جذبہ عشق کو کہانیوں کا موضوع
ضرور بنایا ہے۔ مگر اعتدال کے ساتھ۔ صالحہ عابد حسین نے
اپنے اکثر افسانوں میں آزاد ہندوستان کی عکاسی بھی
کی ہے۔ اپنے افسانے "خوشی کی چند گھڑیاں، ایک عالم
ہے اس رنگ میں، ملاپ، ماں تلا، ہم درد بابا، وغیرہ
میں غیر مسلموں کی طرز زندگی کو پیش کیا ہے۔ مجموعہ نراس
میں آس" کے تمام افسانوں میں آپ بیتی نظر آتی ہے اور اکثر
جگہ وہ گاندھی جی کا ذکر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ قمر رئیس
کا کہنا ہے کہ ــــــ

> صالحہ عابد حسین دلی کی نہیں لیکن ان
> کا تعلق اس بستی سے ضرور ہے جسے
> دلی کا ایک محلہ کہا گیا ہے۔ ان کا نقطہ
> نظر اصلاحی ہے وہ گھریلو زندگی کے
> مسائل کو نسبتاً ایک وسیع انسانی
> نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ بدلتی ہوئی قدریں
> دو نسلوں کے رویوں کا فرق ــــ یہ
> ان کے خاص موضوعات ہیں۔"

فن افسانہ نگاری بڑا ہی نازک فن ہے اور
افسانہ تراشنا آبگینوں کو تراشنے کے مصداق ہے
مصداق فاطمہ (صالحہ عابد حسین) نے اس نازک فن
کا پورا پورا خیال رکھا۔ اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ ہر افسانہ
لکھنے والا پل صراط پر چلتا ہے کیونکہ کسی افسانے
کے پلاٹ کی تشکیل کا محرک مخصوص جذبہ ہوتا ہے۔
اور یہ جذبہ صرف اور صرف اس وقت وجود میں آتا ہے
جب کوئی بھی حادثہ یا واقعہ یا مخصوص کردار افسانہ نگار
کے [illegible] دل پر [illegible] افسانہ ہوتا ہے۔ یہ [illegible]

ہے کہ صالحہ عابد حسین کے افسانے حقیقی زندگی کی کہانیاں ہیں اور ان میں موجود مواد ہمارے آس پاس بکھری ہوئی کہانی لگتے ہیں۔ صالحہ عابد حسین خود لکھتی ہیں کہ میرے افسانے الہام کا نتیجہ نہیں بلکہ تخلیقی عمل مجھے مدت دراز تک متاثر کرتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں عنوان چشتی سے ایک ملاقات پر انہوں نے کہا تھا کہ ــــ

"میری اکثر کہانیاں اور ناول زندگی سے
بہت قریب ہیں۔ اور اس کی وجہ سے
بعض لوگ یہ تہمت لگاتے ہیں کہ فلاں
کا قصہ یا کردار مینق کیا گیا ہے مگر
یہ تہمت یا الزام تو دنیا کے بڑے
بڑے ادیبوں پر بھی لگایا گیا ہے
دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر میرے
کردار زندہ انسانوں سے مشابہت
رکھتے ہیں تو میں اپنی کوشش میں
کامیاب ہوں" ؎

صالحہ عابد حسین کے افسانوں کا پلاٹ روزمرہ کی زندگی سے متعلق ہے۔ ان کے افسانوں میں ایک گھریلو فضا ہے اور طبقاتی کشمکش بھی، پلاٹ واقعات کی ترتیب کا نام ہے۔ صالحہ عابد حسین پلاٹ کے انتخاب میں واقعات کو ترتیب دیتی ہیں۔

صالحہ عابد حسین نے کردار عام زندگی سے مستعار لئے ہیں اور کرداروں کی تشکیل و ترتیب پلاٹ کے انتخاب میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ انہوں نے سماج کے ہر طبقہ سے اپنے کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔

؎ آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ۔ مرتبہ۔ قمر رئیس ص۵۱

اس میں امیر طبقے کی خوبصورت تعلیم یافتہ لڑکیاں نظر آتی ہیں اور نچلے طبقے کی بھولی بھالی بھکارن و[illegible] اس کے علاوہ اونچے طبقے کے آگر خان بہادر ہیں تو نچلے طبقے کے دھوبی رکشے والے بھی۔ اگر ایک طرف وا[illegible] سیاست داں، ادیب اور شاعر ہیں تو دوسری طرف کم پڑھے لکھے افراد بھی۔ صالحہ نے اپنے کرداروں کو [illegible] سے پر کرنے کے لئے انہیں حقیقی زندگی کا نمائندہ بنایا ہے۔ اس لئے ان میں رومانیت کی تبلیغ نہیں ہوتی، جنس کا دھماکہ نہیں ہوتا۔ بلکہ عام سی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس لئے صالحہ عابد حسین نے کہا ہے کہ ــــ

"ــــ نہ چٹپٹا عشق نہ وہ رومانیت
جو دنیا و مافیہا سے بے خبر بنا دے اور تو
اور نہ جنسیات، نہ عریانی، نہ بے باکی، بھلا
ان خوبیوں کے بغیر کوئی کہانی مقبول کیسے
ہو سکتی ہے" ؎

ایک چیز جوان کے افسانوں کو توجہ کے قابل بنا دیتی ہے۔ وہ ان کی اعلیٰ درجے کی جذبات نگاری اور نفسیاتی عکاسی ہے۔ وہ جذبات نگاری پر مکمل عبور رکھتی ہیں۔ سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ کو محسوس کرتا جذبات نگاری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو ــــ

"سچ ہے میری بہو کا سامان چوری ہو گیا۔ ا[illegible]
اسے چار دن بھی اپنی چیزیں برتنی نصیب نہ ہوئیں ــــ
"آپ لیٹ جائیے چچی اماں"
"اللہ غارت کرے ان کمبختی ماروں کو ــــ
کم از کم جہاں ڈاکوؤں نے چوری کے لئے دیکھا!

؎ دردِ جہاں ــ دیباچہ ــ صالحہ عابد حسین ــ صف

اس کی آواز شدتِ گریہ سے رک گئی ـــــ [1]

مکالمے عام طور پر کرداروں کے تعارف کے طور پر آتے ہیں یا پھر مخصوص نفسیات کی عکاسی میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ صالحہ عابد حسین کے تمام افسانوں کا تجزیہ یہ ثابت کرتا ہے کہ انہوں نے ماحول کی رنگ آمیزی سے پلاٹ میں اثر و تاثیر پیدا کی اور ایسی فضا کو پیدا کیا جو کیفیات کے رنگ کو گہرا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں وہ اپنے ذہانت کا سہارا لے کر قوتِ مشاہدہ اور باریک بینی کی وجہ سے ایسا ماحول پیش کرتی ہیں جو منظر کشی کی خوبصورت مثال ہے۔

ان کے افسانوں میں کلائمکس اور اینٹی کلائمکس جذبۂ تجسس کے سائے میں آتا ہے اور آخر میں قاری کو شدید ڈرامائی کیفیت سے دوچار کر دیتا ہے۔

صالحہ نے اپنے افسانوں میں اسلامی افکار کا حسن، مشترکہ تہذیبی اقدار، سماجی بصیرت اور ذاتی تجربوں کو پیش کیا ہے۔ ان کا اسلوب بیان سیدھا سادہ اور پر خلوص ہے اور کبھی کبھی ان کی تحریروں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ان پر پریم چند کا اثر ہے۔ صفیہ ملک کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ـــــ

"میں کسی حد تک پریم چند سے متاثر ہوں۔ انہوں نے دیہاتی زندگی کو دکھانا اپنا مقصدِ حیات بنا لیا تو میں نے عورت کی زندگی کو مقصد رکھا ہے۔ اس طرح متاثر ہوں ان سے۔ لیکن اور کوئی اثر نہیں ہے۔"

مگر ان کے اسلوبیاتی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے اسٹائل کا مخصوص مزاج رکھتی ہیں۔ ان کی طرزِ تحریر قدیم و جدید کا سنگم ہے۔ وہ خوبصورت زبان استعمال کرتی ہیں اور ایسے الفاظ پیش کرتی ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہوتے ہیں۔ صالحہ کے افسانوں کا سرمایہ مختلف رسائل اور مجموعوں میں دستیاب ہے۔ ان کے افسانوں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نقش اول، نوچنے، نراس میں آس، دردِ درماں، تین چہرے تین آوازیں۔

ختم

---

[1] نوچنے ـ افسانہ ـ شباہت ہمسایہ ـ صالحہ عابد حسین ـ صفحہ

بقیہ: سجدۂ ناچشیدہ

ہاسپٹل جانے پر رضامند کر لیا تھا۔ ہاسپٹل پہنچ کر وہ رکشے کے گیٹ پر ہی کھڑا ہو گیا۔ میں نے بڑھ کر دروازے کو دھکا دیا۔ چھوٹی کی نظریں دروازے کی طرف ہی لگی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے تیر رہے تھے۔ بچہ اس کی چھاتی سے چپکا ہوا تھا جس پر ایک بوسیدہ سا کپڑا پڑا تھا بیوی پاس ہی اسٹول پر بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھی آہٹ پر اس نے بھی چونک کر دیکھا میں نے جیسے ہی اس کا ہاتھ پکڑ کے اندر کیا۔ چھوٹی اپنے باپ کا سامنا کرتے ہی اضطراری طور پر اٹھ بیٹھی۔ اس کے کپڑے سرک گئے جس کی وجہ سے دونوں چھاتی نیم عریاں ہو گئیں اور وہ بے اختیار چیخ پڑی:

"اس پاپی کو میری نظروں سے دور لے جاؤ۔"

اس کی آواز ہاسپٹل میں بہت دیر تک گونجتی رہی ـــــ

ختم

ڈاکٹر [illegible] انصاری

اُردو کی اولین مثنوی ۔ چندائن

اُردو شاعری کی معتبر، مستند اور محکم اصناف میں "مثنوی" کی حیثیت مسلم ہے۔ اس کی صنفی اور موضوعاتی خصوصیات پر بہت سارے علما، ناقدین اور سرکردہ محققین بے شمار باریک و دقیق مسائل و مباحث پر اپنے اپنے خیالات ظاہر کر چکے ہیں۔ ان میں جلال الدین جعفری، خواجہ حالی، علامہ شبلی، امداد امام اثر وغیرہم سے لے کر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی، گیان چند جین، نجم الہدیٰ، ڈاکٹر وہاب اشرفی، علی جواد زیدی وغیرہ کے کارنامے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ بہرکیف مثنوی کے صنفی امتیازات ایک الگ بحث کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فی الوقت اسی قدر ذہن نشین رکھا جائے کہ لفظ "مثنوی" عربی مادہ مثنیٰ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں۔ "دو دو کیا گیا"۔ چوں کہ مثنوی میں ہر بیت کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اس لئے اصطلاحِ شاعری میں ابیاتِ مختلفۃ القوافی کو مثنوی کہتے ہیں۔ مثنوی گرچہ ایک عربی اصطلاح [illegible] ہے لیکن فی الاصل یہ ادبی صنف اردو کو براہِ راست فارسی ادب کی دین ہے۔ چنانچہ ادبیاتِ فارسی کے زیرِ اثر ہندوستان میں اردو شعرا نے بھی وافر تعداد میں مثنویاں لکھی ہیں۔

زیرِ نظر تحریر میں اردو مثنوی کے اولین نمونے "چندائن" کے حوالے سے بعض مفید بحثیں کی گئی ہیں۔ جہاں تک اردو میں مثنوی نگاری کی ابتدا کا سوال ہے، اس ضمن میں محققین کے درمیان اختلافِ رائے ہے۔ بعض کے نزدیک اردو کی دیگر روایتی اصنافِ سخن ۔ قصیدہ، غزل، مرثیہ کی طرح صنفِ مثنوی کی تاریخ بھی ادبِ اردو کی تاریخ جتنی ہی قدیم ہے، جس کے ابتدائی خدوخال کی تلاش کا سلسلہ دہلی سلطنت کے قیام ۔ ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء تک جا پہنچتا ہے۔ چنانچہ اس عہد کے صوفیائے کرام کے ملفوظات اور جستہ جستہ منظوم کلام میں دستیاب ہم قوافی ادبیات کو مثنوی کی اصل قرار دیا جاتا ہے۔ اس دور کے اربابِ قلم کے دستیاب شدہ نمونوں میں اب تک کی تحقیق کے مطابق قدیم ترین نمونہ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر

۱۱۱۰ء، ۵۶۹ھ تا ۱۲۶۵ء، ۶۶۴ھ) کا ہے۔ مولوی
لحق صاحب کو یہ نظم ایک قدیم بیاض سے دستیاب
تھی۔ اس کی پہلی بیت درج ذیل ہے ؎

تن دھونے سے دل جو ہوتا پاک
پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک

(اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا
کام، مولوی عبدالحق، ص ۱۳)

ازیں قبیل اس عہد کے دوسرے صوفیائے کرام شاہ
ؒ، حضرت امیر خسروؒ دہلوی، مخدوم جہاں حضرت شاہ
ف الدین احمد یحیٰ منیری ثم بہاریؒ وغیرہ کے منظوم کلام
ں ایسے مثنوی نمونے دستیاب ہیں جن کی ہیئت مثنوی
شابہ ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل رضویؔ نے بعض تاریخی
کی بنیاد پر بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے مذکورہ بالا
کلام کو اردو کی پہلی باقاعدہ مثنوی ثابت کرنے کی
شش کی ہے۔ لیکن تحقیق کے رو سے الحاقی ہونے
حتمال قرین قیاس ہے اور چونکہ یہ ابتدائی نمونہ مثنوی
کی مکمل صورت پیش کرنے سے قاصر ہے اس لئے بھی
یدؒ کے کارنامے کو صنفِ مثنوی کی باضابطہ ابتدا قرار
ناسب ہے۔ اگرچہ یہ ابتدائی نمونے ہی اردو مثنوی
نا کے ارتقا کی ٹھوس بنیادیں ہیں۔ اور بقول پروفیسر
قادر سروری ـــ "یہ آئندہ مثنوی کا ہیولیٰ ہیں۔"
س کہ اس عہد تک مثنوی کی کوئی مستقل حیثیت
میں متعین نہیں تھی، صرف ہیئت تشکیل پا رہی تھی
ا کی مخصوص ہیئت کا عروضی تصور بھی یہاں
ہے۔ عموماً ہندی اوزان اور اسالیب بیان

اردو مثنوی کا ارتقا، سید محمد عقیل رضوی، ص [illegible]

اپنے عہد کے ہیں۔ مثنوی کا کینڈا ابھی ابھی نامکمل اور غیر
متعین ہے۔ اس لئے بھی بابا فریدؒ کے کلام کو صنفِ مثنوی
کی باقاعدہ ابتدا قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔

اردو مثنوی نگاری کی باضابطہ ابتدا [illegible] کے
[illegible] فریدؒ کے کلام کی اولیت پر تامل اور سوالیہ
نشان [illegible] اولیت کا سہرا اب تک فخرالدین نظامی کی
مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کے سر بندھتا آ رہا ہے جو سلطان
احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد حکومت (۱۴۲۱ء [illegible]
[illegible]) کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی
نے بڑی کاوش سے اپنی ترتیب و تحشیہ کے ساتھ اس
کا ایک خوبصورت ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اس طرح
سرزمین دکن کو اردو کی پہلی باقاعدہ مثنوی تصنیف کرنے
کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت ملا داؤد
کی "چنداین" مصنفہ [illegible]ھ / ۱۳۷۷ء جو شمالی ہند کا
کارنامہ ہے اور دکنی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" سے قبل
کی تخلیق ہے کو اردو کی پہلی باقاعدہ مثنوی کہلانے کا حق
حاصل ہے۔

"چنداین" شمالی ہند کی قدیم ترین تصانیف میں سے
ایک ہے جسے ڈلمؤ ضلع رائے بریلی کے ملا داؤد نے
جو امیر خسرو دہلویؒ کا ہمعصر تھا نے [illegible]
۱۳۷۹ء-۸۱ء میں تصنیف کیا چونکہ اس مثنوی کی
زبان موجودہ ہندی سے قریب تر ہے اس لئے اردو والے
اسے اودھی یا برج بھاشا کی تصنیف قرار دے کر سبک
دوش ہو جاتے ہیں۔ کسی نے بھی تاریخی حقائق کی روشنی
میں اس مثنوی میں موجود داخلی شہادت نیز زبان و

چنداین [illegible]

بیان کا تجزیہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، نتیجتاً اب تک یہ مثنوی بے توجہی کا شکار رہی ہے۔ ہندی ادب میں "چنداین" کا تعارف سب سے پہلے منظر عام پر ہونے ۱۹۴۰ء میں کرایا۔ اس کے بعد ایودھیا سنگھ ہری اودھ نے اپنی تصنیف — "ہندی بھاشا اور اس کے ساہتیہ کا وکاس" (ہندی زبان اور اس کے ادب کا ارتقا) میں اس مثنوی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ انہیں دونوں بزرگوں کی کوشش سے پہلی بار ادبی دنیا ملا داؤد اور اس کی مثنوی "چنداین" سے روشناس ہوئی۔

ذیل میں وہ نکات و دلائل درج کئے جاتے ہیں جن کی بنیاد پر "چنداین" کو اردو کی تصنیف اور پہلی باقاعدہ مثنوی قرار نہ دینا اردو کی حق تلفی ہوگی۔

(۱) اس تصنیف کے مثنوی ہونے کی تاریخی شہادت ملا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر برج رتن داس نے اپنے تحقیقی مقالہ "کھڑی بولی کے ساہتیہ کا اتہاس" میں ملا عبدالقادر بدایونی کا جو بیان نقل کیا ہے اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

> سلطان فیروز تغلق کے وزیر خان جہاں
> کا انتقال ۱۳۷۰ء میں ہوا اور اس کا
> بیٹا جونا شاہ وزیر ہوا۔ ملا داؤد نے اپنی
> عشقیہ داستان چنداین کا انتساب
> اسی کے نام کیا ہے۔ یہ مثنوی لورک اور
> چندا کے عشق کی داستان ہے۔۔۔ [۵]

اس اقتباس میں جہاں اس مثنوی کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں اشارہ ملتا ہے وہاں "یہ مثنوی لورک اور چندا کے عشق کی داستان ہے" بڑے کام کے فقرے ہیں۔ ان سے بخوبی مستنبط ہوتا ہے کہ چنداین اردو ادب کی تصنیف ہے، کیونکہ ہندی ادب میں "مثنوی" نام کی کوئی شعری صنف نہ جب تھی اور نہ اب ہے — "مثنوی" سے ایک صنف تک جس منظوم داستان کا تصور شعرا اور ناقدین کے ذہنوں میں ابھرتا رہا تھا اس کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ چنداین کے داستانی موضوع کی وضاحت مثنوی کی اس بیت سے بھی ہوتی ہے ؎

لورک کتھا اہیں ہتیہ کھنڈ گاؤں
کتھا کاوی ہیں لورک سناؤں

اور سب سے اہم بات یہ کہ ایک باقاعدہ صنف کی حیثیت سے اردو میں سب سے پہلی مرتبہ "مثنوی" لا سے اردو شاعری کے قارئین کی ملاقات ہوتی ہے

(۲) اس مثنوی کے تمام مخطوطے فارسی رسم الخط میں ہیں، جس میں ہر نیا واقعہ نظم کرنے سے پہلے ایک عنوان متعین کیا گیا ہے جو فارسی میں ہے۔ اس طرح کا اہتمام ملا داؤد کے بعد کے مثنوی نگار — نظامی، غواصی، وجہی، نصرتی، مقیمی، افضل جھنجھانوی وغیرہ بیشتر شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ اس رواج کو "چنداین" کی تقلید کا نتیجہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

چنداین (ملا داؤد)؛ (۱) مدح خان جہاں در باب عدل و انصاف۔

(۲) صفت خوض و لطافت آب او گوید۔

(۳) صفت خندق بر گرد شہر گو رو گوید۔ وغیرہ

کدم راؤ پدم راؤ (نظامی)، (۱) گفتن کدم راؤ با [illegible]

قطب مشتری (ملا وجہی) ۱؎ در صفت عشق گوید۔

۲؎ در شرح شعر گوید

۳؎ کشتن محمد قلی اژدھارا۔ وغیرہ

پھول بن کہانی (افضل جھنجھانوی) ۱؎ در میان ماہ اول ساون۔ وغیرہ

اوپر کی مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ الگ الگ واقعات کے لئے فارسی میں عنوان قائم کرنا اردو مثنوی نگاری کی ایک روایت رہا ہے، جس کا اہتمام مثنوی چندراین میں پہلے پہل ملتا ہے۔

(۳) فارسی اور اردو مثنویوں کی ایک مشترک روایتی خصوصیت یہ بھی ہے کہ بالعموم ان کی ہیئت میں حمد، نعت و منقبت، مدح شاہِ وقت، سبب تصنیف و تالیف اور تعریف و توصیفِ سخن وغیرہ اجزا شامل ہوتے ہیں۔ ان کے بعد اصل واقعہ شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ "چندراین" بھی ان التزامات سے محروم نہیں۔

(۴) مثنوی "چندراین" کی ہیئت وہی ہے جو بعد میں منظوم ہونے والی علاقائی بولیوں کی منظوم داستانوں کی ہے۔ یعنی "دوہا چوپائی" کی ہیئت مثنوی کی عروضی ہیئت سے بہت مماثل ہوتی ہے۔ اردو کے صوفی شاعروں نے اپنی مثنویوں میں اکثر اسی ہیئت کو اختیار کیا ہے۔ قطبن کی "مرگاوتی"، شیخ عثمان کی مثنوی "چتراولی" اور رحمت شاہ کی مثنوی "شیریں فرہاد" کی بھی یہی ہیئت ہے۔

(۵) "چندراین" کی زبان بھی وہی ہے جو قطبن کی "مرگاوتی"، [illegible] داس) اور شاہ علی محمد جیو گام دھنی وغیرہ کی مثنویوں کی زبان ہے۔ چنانچہ ان مثنویوں کے اقتباسات ملاحظہ ہوں، جن کا تقابلی مطالعہ کرکے ان مثنویوں کی ہیئت، اوزان اور زبان و بیان کی مشترکہ خصوصیت و یکسانیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) چندراین (ملا داؤد)

ہیرن ہار گر قسی جوتی   مرگ نکھت جنو بیٹھے موتی

: : : :

بسوئی چاند سپورن تہاں   مانک جوت ترائیں جہاں

: : : :

دوہرا ــــــ

رین مانجھ جس دن کیا، ناہیں بیر برّاد
جڑمی مو سو دیکھا، جو نہ بکھہوت کاؤ ۱؎

(۲) مرگاوتی (قطبن)

شیخ بڑھن جگ ساچا پیرو   نام لیت سدھ ہوئے سریر
قطبن نام لئی پاؤ پرے   پیر پیوی دوہ جگ نہ سرے

: : : :

دوہرا ــــــ

گرو منتھ دکھائے دین سے جو چل جانے کو رے
تک ایک میں پہونچے جو ست بھاوے سو ہو رے ۲؎

(۳) چتراولی (شیخ عثمان)

جن کچھوں دس گنہ پایانا   پہلیں گا سو دلیں ملتانا
دیکھے سی سنگھی لگ سیانیں   مہرلوں سب سلو میں سمائیں
پیرسے کھنڈ نگر سوار   جین ہرن سیوین گنجانا ۳؎

۱؎ چندراین: ملا داؤد، مرتبہ — پرمیشوری لال گپت، بمبئی ۱۹۶۴، صفحہ ۲۰۲

(علی محمد جیو گام دھنی)

کبھی جو یاد سے بیٹھی کا بیا ہو کر جیتا باہر سے باہا

مکھ پر بال بکھیر سو ساگتی چھپ کر سورے رات سنگاتی
وے سنجال سو جھیر کیا دن ہو آوے سورج بیٹا[1]

مثنوی حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی (الکھ داس)

جان پہچان جگ کیسے بھاگ کنت بلیا لیو پہرے لاگ
الکھ داس آکھے سن تانہاں ہم تم کھیلنہ دی گل بانہاں[2]

اس کے ساتھ اب ذرا دکنی کی قدیم ترین مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کی زبان بھی ملاحظہ ہو۔

گسائیں تہیں ایک دُنہ جگ ادار بروبرد نہ جگ تہیں دیہار

دھنیا انگھے رچنہار توں رہنہار کچھیں رہنہار توں[3]

اقتباسات بالا کا تجزیہ کر کے ان کی ہیئت، اوزان اور لب و لہجہ، لفظیات، اسالیب وغیرہ کی یکسانیت کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام مثنویوں کی ہیئت، اوزان اور زبان و بیان پر ہندی دوہرے اور بھگتی کی ہیئت، اسطور و اسلوب، زبان اور لہجے کی چھاپ نمایاں ہے۔ صرف مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کا وزن فارسی کی عروضی میزان کے مطابق ہے جو مثنوی کے مخصوص وزن بحر متقارب مثمن مقصور یا محذوف بروزن — فعولن، فعولن، فعولن، فعل میں لکھی گئی ہے۔

مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کی بحر سے قطع نظر مذکورہ بالا تمام مثنویوں کا وزن ہندی ماترک چھند پر مبنی ہے جو اوزان کی ہیئت بھی سنسکرت "دوہرا" یا "دوہا" چوپائی کی ہیئت سے ماخوذ ہے۔

زبان اور لب و لہجے میں اگرچہ خفیف سا فرق پایا جاتا ہے جو مختلف تصانیف پر مقامی بولیوں کے اثرات اور زمانۂ تصنیف کے تفاوت کا نتیجہ کہی جائے گی۔ ورنہ بنیادی طور پر ان کے اوزان و آہنگ اور دیگر صنفی خواص ایک ہی جیسے ہیں۔ ذیل میں ان مثنویوں کی زبان کا تقابلی و تجزیہ قدرے تفصیل سے کیا جاتا ہے:

مثنوی "مرگاوتی" کی زبان میں — جگ، ساجا، سدھ، ہرے، ہرے، اوتارا، جیتر، سنگاسن، پورا، ارتھ وغیرہ خالص ہندی الاصل الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اور پیرو، سر پیرو، اوتارا، جھاجا، بیری وسے وغیرہ الفاظ کا لہجہ ہندی کی ادبی روایت سے مستعار ہے، جس کی جھلک ہمیں مثنوی "چنداین" کی زبان میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

اس طرح شیخ عثمان (مثنوی چترا ولی)، عبدالقدوس گنگوہی اور علی جیو گام دھنی کی مثنویوں میں بھی یہی زبان استعمال ہوئی ہے۔ نظامی کی کدم راؤ پدم راؤ، کا بھی یہی حال ہے۔

بلاشبہ "چنداین" کے یہ نمونے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت امیر خسروؒ، حضرت شرف الدین کی منیریؒ، کبیر داس، قطبن، شیخ عثمان، فخر دین نظامی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، حضرت شاہ علی محمد جیو گام دھنی وغیرہ کی زبان کی توثیق کے لئے استعمال کئے جا

---

[1] مثنوی اور مثنویات، مرتبہ ڈاکٹر طالب اختری، ص ۵۲

[3] مثنوی کدم راؤ پدم راؤ: فخر دین نظامی۔ مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، صفحہ ۶۵

ہیں ۔۔۔

ان توضیحات کے پیش نظر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "چینداین" "کدم راؤ پدم راؤ" "مرگاوتی" "اوپی" وغیرہ سبھی ایک ہی ادبی سلسلے کی تصنیفات ہیں، جن کی جڑیں مخلوط طور پر ہندوی کی ادبی روایات میں پیوست ہیں۔ ان میں اگر کچھ فرق ہے بھی تو اسے زبان کی صفائی اور کثافت سے عبارت کیا جا سکتا ہے، اس صفائی اور کثافت کے پیچھے بھی ہندوی اور فارسی روایت کی اثر پذیری کا رجحان کارفرما ہے۔ جو نمونہ جتنا قدیم تر ہے اس میں ہندوی روایات و اساطیر کے اثرات اتنے ہی گہرے اور ہمہ گیر ہیں اور رفتہ رفتہ فارسی روایت ہندوی روایات کی جگہ لیتی گئی ہے۔ فارسی روایات و اسالیب سے ہم آہنگی کے نتیجہ میں زبان کی ایک ایسی صورت سامنے آتی ہے جس سے ہم آج زیادہ مانوس ہیں۔ ممکن ہے کہ مثنوی نگاروں نے بھی کسی سعد اللہ خاں گلشن کے اس مشورے کو اپنا لائحہ عمل بنایا ہو جو صنف غزل اور ولی دکنی کے حوالے سے تاریخ ادب اردو میں خاصا مقبول ہے۔ بہر کیف یہی وجہ ہے کہ چینداین کے مقابلہ میں "کدم راؤ پدم راؤ" کی زبان باوجود علاقائی بولیوں کے اثرات اور لسانی اختلافات کے نسبتاً صاف ہے۔ اسی طرح کدم راؤ پدم راؤ کے مقابلہ میں "مرگاوتی" "چترادلی" "نو سرہار" اور "خوب ترنگ" کی زبان بھی نسبتاً ایک دوسرے سے زیادہ شستہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ مثنویاں اردو زبان کے قدیم انداز و آہنگ کی نمائندہ ہیں۔ جن کا ذخیرۂ الفاظ، اسالیب اور لب و لہجہ موجودہ اردو زبان سے مختلف ہے۔

بدیہی اسباب کی بنا پر "چینداین" کو اردو کا قدیم ترین ادبی نمونہ جان کر اردو ادب کے سرمائے میں شامل کر لینے میں کوئی باک نہیں ۔۔۔ شمالی ہند کے قدیم ترین ادبی کارناموں میں "چینداین" کی صنفی حیثیت متعین ہے، جو اس امر پر دال ہے کہ "چینداین" شمالی ہند کی اردو کا قدیم ترین ادبی نمونہ ہونے کے ساتھ ہی اردو مثنوی کا بھی اولین صنفی نمونہ ہے۔ اور اس طرح فخر دین نظامی کی دکنی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" پر بزم شمال کے ملا داؤد کی "چینداین" کو فوقیت و اولیت حاصل ہے۔

دشمنان

بقیہ: سچا رشتہ

انجام کے خوف سے فیاض صاحب گم سم کھڑے تھے۔ اسی وقت آمر نے فیاض صاحب کے قریب آکر کہا۔

"آپ ذرا بھی چنتا نہ کریں چاچا!"

فیاض صاحب بے اختیار ہو کر آمر سے چمٹ گئے۔ ان کی آنکھوں سے ٹپکی ہوئی آنسوؤں کی بوندیں اعتراف کر رہی تھیں کہ رشتہ ناتا، مذہب، خاندان سب دنیاوی باتیں ہیں ۔۔۔ جو وقت پر ساتھ دیتے ہیں وہ اپنے ہیں باقی سب پرائے ۔۔۔

دشمنان

براہ کرم اپنی نگارشات خوشخط اور صاف ارسال کریں۔

تحریص!

قیوم خضر
پٹنہ

طاقِ عصیاں پر ہوس کے جھلملاتے ہیں چراغ!
قہقہوں کی شوخیوں میں چلمنوں کی اوٹ سے
سرسراتے آنچلوں کی دشمنِ جاں آہٹیں
ہوش گم ہے آسماں پر جنوں کا پھر دماغ
مستیوں میں ٹھمریاں پھر گا رہی ہیں قمریاں
آج پھر ہے پارہ پارہ دامنِ عقل و خرد
پھر مذاقِ دلبری چٹکیاں لینے لگا
پھر لبوں پر جاگتی ہے نرم بوسے کی طلب
پھر مہیا ہیں جنوں کے سارے اسباب خلل
پھر خدا حافظ دلِ وحشت زدہ نے کہہ دیا

☙

نظمیں

سلیم انصاری
جبل پور

(۱) — محرومی —

میں اکثر سوچتا ہوں
گلی میں کھیلتے بچے سے پوچھوں
تم اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر کیوں نہیں چلتے
تم اپنی ماں کی چھاتی سے لپٹ کر کیوں نہیں ہوتے؟
تمہارے چہرے پر سنجیدگی اچھی نہیں لگتی
مگر میں جانتا ہوں
جب کسی زرخیز دھرتی سے
گرجتے بادلوں کے جھنڈ بن برسے گزر جائیں
تو سب کچھ ٹوٹ جاتا ہے

(۲) — خواب نظم —

اس نے کہا تھا
خواب نہ دیکھو
خواب تو ایسے پنچھی ہیں
جو تعبیروں کے جنگل میں کھو جاتے ہیں
جنگل ایسا
جس سے باہر آنے والے سارے رستے
اندیشوں کی دھند میں لپٹے رہتے ہیں
اس نے شاید ٹھیک کہا تھا
خواب نہ دیکھو
سپنا دیکھنے والی آنکھیں
بے منظر ہو جاتی ہیں

(۳) — ڈر —

چلوں!
دھوپ میں اپنی خوش فہمیوں کی
کرچیں چن کر —
اپنے لہو کے اندھیرے سے ڈر لگ رہا ہے

(۴) — ایک ادھوری نظم —

کھلونے آج میری دسترس میں ہیں
مگر —
میں آج ان کو چھو نہیں سکتا
کہ میرا بچپنا تو
دور —
ماضی کی اندھیری وسعتوں میں کھو گیا ہے

غزلیں

رام پرکاش راہی
دہلی

پھر وہی کرب گذارش، وہی منشا اپنا
کوئی اظہار کی صورت نہ تقاضا اپنا

چہرہ در چہرہ لئے اپنے کئے کے تیور
جانے کس سوچ میں گم صُم تھا مسیحا اپنا

عکس در عکس کی اک طرفہ کشاکش کا شکار
مسخ تھا آئینہ خانے میں سراپا اپنا

آنکھوں آنکھوں کے یہ زینے یہ تعلق کی بساط
دل ہی الہام ہے اور دل ہی صحیفا اپنا

خدمتِ خلق کا ایسے میں تصور بھی کیا!
لوگ سب کچھ ہیں سنبھالے ہوئے اپنا اپنا

بے تکی بات ہے، اڑ جائے گی بے پر راہی
تم نے لکھا ہے ہواؤں پہ فسانہ اپنا

سادھو رام دیوانہ
کھرڑ۔ روپڑ

شہر کی یاد کو سینے سے لگائے رکھنا
دشت میں بھی کوئی ماحول بنائے رکھنا

رات کے پچھلے پہر بھی کوئی آجاتا ہے
اپنی چوکھٹ پہ چراغوں کو جلائے رکھنا

راس آجائے ہمیں بھی کوئی موسم شاید
گھر امیدوں کا کھنڈر میں بھی سجائے رکھنا

بڑھ گئی اور بھی وحشت مری تنہائی میں
بھولنے والے کو مشکل ہے بھلائے رکھنا

زندگی جانے ہمیں کیسے نوازے آکر
سرمئی خواب کچھ آنکھوں میں سجائے رکھنا

ٹوٹتے رشتوں نے دیوار پہ لکھ دی سرخی
روح کا درد بھی اپنوں سے چھپائے رکھنا

اپنا ہمراز بنایا ہے جو دیوانے کو
چلمنیں اپنے دریچوں کی گرائے رکھنا

صابر فخرالدین

غزلیں

دل تو ہم اس کے پاس رکھیں گے
جس سے ملنے کی آس رکھیں گے

بھر گئے زخم تو بدن پہ ہم
کونسا پیرہن رکھیں گے

کالے کھیتوں میں ہم امیدوں کی
اجلی اجلی کپاس رکھیں گے

اپنے اطراف مرتے دم تک ہم
زندگی کی مٹھاس رکھیں گے

دشمنوں کے لئے بھی ہم صابر
دوستی کی اساس رکھیں گے



زندگی صد چاک مٹی
موت کا ادراک مٹی

ڈال کر کیا شادماں ہے
سب کے منہ پر خاک مٹی

میرے پیکر میں سما کر
کر گئی چالاک مٹی

خاک کا پتلا ہے انسان
اور ہے پوشاک مٹی

آسماں ٹھہرا ہوا ہے
اوڑھ کر بیباک مٹی

پی کے خونِ دل ہمارا
ہو گئی نمناک مٹی

سونا اگلے بھی تو صابر
ہے خس و خاشاک مٹی



غزلیں

م۔ا۔ اخلاق
فتح پور

ہوا جب بھی بیانِ کامرانی
زباں پر آگئی میری کہانی

ان اشکوں کا وجود اپنا ڈھلا ہے
نہ چھینو مجھ سے یہ میری نشانی

کرم ہے اس طرح مائل ہوا وہ
بڑھی کچھ اور میری بدگمانی

خوشی اک پل کی لے کر کیا کروں گا
مجھے مل جائے دردِ جاودانی

وہ کیا مانے گا ماعطایات تیری
وہی دل جس نے خود میری نہ مانی

جہاں ہر شے ہے فانی اس جہاں میں
محبت ہی رہے گی غیر فانی

ذرا سی آئی غلامی سیکڑے کی
نہ کام آئی حرم کی پاسبانی

انھیں راہوں پہ آخر ہم نے اخلاق
گنوا دی بے سبب اپنی جوانی

رہبر جونپوری
بھوپال

اہلِ تخریب کو تعمیر سے کیا نسبت ہے
ملک اور ملک کی توقیر سے کیا نسبت ہے

عزم و اخلاص سے رکھتی ہے فسادات کی آگ
امن کو نعرہ و تقریر سے کیا نسبت ہے

آپ دل کھول کے انصاف کو پامال کریں
آپ کو عدلِ جہانگیر سے کیا نسبت ہے

یہ تو افسونِ سیاست ہے سلگتے ہیں چنار
آگ کو وادیِ کشمیر سے کیا نسبت ہے

قتل و پیکار رہیں دُریودھن و راون کا شعار
گوتم و گاندھی کو شمشیر سے کیا نسبت ہے

لوگ کرتے ہیں کس ایثار کی باتیں آخر
خوابِ نادیدہ کو تعبیر سے کیا نسبت ہے

ہم جنوں والے سمجھتے ہیں سلاسل کا مقام
صاحبِ ہوش کو زنجیر سے کیا نسبت ہے

منحصر جس کا عمل پر ہے مقدر رہبر
اس کو پھر ہاتھ کی تحریر سے کیا نسبت ہے

غزلیں

عبدالسلام کوثر
راج نانڈگاؤں

نہ گرنے پائے ہرگز قوم کا معیار مولانا
امیرِ شہر سے رہنا ذرا ہشیار مولانا

ہیں جن کے دل پراگندہ نظر بیمار مولانا
وہ کیا سمجھیں کسی فنکار کا کردار مولانا

ہماری ذات سے منسوب تھیں اخلاق کی قدریں
مگر ہم آج ہیں رسوا سرِ بازار مولانا

اگر یہ سچ ہے اپنی قوم بہتر ہے زمانے میں
ہمیں سمجھاؤ ہم کیوں ہیں ذلیل و خوار مولانا

فقیروں سے یونہی ملتے رہو سب جان جاؤ گے
عبادت کی حقیقت عشق کا معیار مولانا

مورخ آج کی تاریخ لکھے گا تو سرخی میں
تمہارا نام آئے گا ہزاروں بار مولانا

سیاست کے نظارے خون کے آنسو رلائیں گے
نہ پڑھنا بھول کر بھی آج کا اخبار مولانا

زمانے کو اگر ہم بے نیازی سے ٹھکراتے
زمانہ بن گیا ہوتا گلے کا ہار مولانا

سمجھ میں کچھ نہیں آتا مدد کس کی کریں آخر
ادھر مجبور ہے کوثر ادھر بیمار مولانا

قطب الدین ثاقب
ہزاری باغ

زندگی کے فلسفے اچھے لگے
موت کے جب ضابطے اچھے لگے

منزلوں کے جب نشاں روشن ہوئے
مجھ کو سارے راستے اچھے لگے

حسرتوں کے پھول جب بھی کھل گئے
خوشبوؤں کے سلسلے اچھے لگے

شاخِ گل پر بکھرے موتی کی طرح
شبنمی سب قافلے اچھے لگے

موت آئی زندگی کو لے گئی
قرب جیسے فاصلے اچھے لگے

ہو نہ جائیں بدگماں مجھ سے کہیں
کیسے کہہ دوں وہ مجھے اچھے لگے

بے مزہ تھی زندگی ثاقب مگر
شعر و فن کے ذائقے اچھے لگے

غزلیں

ڈاکٹر سعید عارفی
بہرائچ

نقیب موسم گل ہوں خزاں نہیں ہوں میں
گلے لگاؤ کہ نامہرباں نہیں ہوں میں

یہ اور بات کہ تم پر عیاں نہیں ہوں میں
تجھے پکار کے دیکھو جہاں نہیں ہوں میں

ہوائے تند کی دستک پہ چونکنا کیسا
فصیلِ سنگ ہوں گرتا مکاں نہیں ہوں میں

جو سب کی بات ہو ایسی ہی بات کہتا ہوں
امیر شہر ترا مدح خواں نہیں ہوں میں

ہنر پہ اپنے نہیں ناز ہے ابھی مجھ کو
جو سنگ کاٹے وہ آب رواں نہیں ہوں میں

غم زمانہ مجھے کھینچ جتنی طاقت ہو
تو جس کو توڑ دے ایسی کماں نہیں ہوں میں

مجھے سنبھال کے رکھو کہ عہد نو میں سعید
نوائے روح فزا ہوں فغاں نہیں ہوں میں

محمد ظفر اعظمی
بھاگلپور

زمیں پہ آئے گا یہ کب مرے گمان میں تھا
وہ اک پرندہ ازل سے جو آسمان میں تھا

یہ کیسی چیخ فضاؤں میں رات ابھری تھی
امیر شہر بھی سہما ہوا مکان میں تھا

جلا رہی تھی مرے سر کو دھوپ کی شدت
کھڑا ہوا میں یہاں جبکہ سائبان میں تھا

زمانہ کہتا رہا اس کو بے ہنر لیکن
مرا تو اس کا ہی چرچا بہت جہان میں تھا

اسی کے ہاتھ میں خنجر دکھائی دیتا ہے
وہ ایک شخص جو کل میرے سائبان میں تھا

تمام سہمی نگاہوں میں زندگی آئی
عجب سرور ظفر صبح کی اذان میں تھا

غزلیں

ضیاء الانجم
جبلپور

اک ذرا سا خیال کر دیتا
وہ مجھے باکمال کر دیتا

دشتِ امکاں سے دشتِ حیراں تک
وہ مجھے بے مثال کر دیتا

بخشتا نور چشمِ حیراں کو
اور پھر لازوال کر دیتا

دشتِ غم سے نجات کی خاطر
کوئی پیکر نکال کر دیتا

خود کو وہ لاجواب ہونے تک
مجھ سے الٹا سوال کر دیتا

دیکھتا وہ اگر قفس میں مجھے
میرا جینا وبال کر دیتا

کرشن پرویز
کھوار (اڑیسہ)

دل میں کسی کے طنز کی نشتر چبھو گئی
دنیا کسی کی آنکھ میں موتی پرو گئی

دولت نے ہر لباس کو اجلا بنا دیا
اچھے برے کی آج تو پہچان کھو گئی

ہر شخص اپنے آپ میں محدود ہو گیا
دنیا وہ پریم پیار کی معدوم ہو گئی

کلفت ہے بے کسی ہے کہ تشویش و رنج ہے
قسمت گلے میں ہار یہ کتنے پرو گئی

کہتے رہے ہیں منہ پہ ہی سب کا کھرا کھرا
پرویز زندگی میں یہی بھول ہو گئی

شارق عدیل
علی گڑھ

غزلیں

پیکرِ ذہن کو بال و پر دے گئی
شاعری زندگی کے ہنر دے گئی
آنکھ جو کی فلک کو جو چھوتے ہوئے
اک عمارت زمیں کو کھنڈر دے گئی
جسم کو موم کرتی ہوئی دھوپ میں
یاد ان کی گھنے سے شجر دے گئی
خواہشوں کے محل سے گزرتی ہوئی
زندگی ایک لمبا سفر دے گئی
ان لبوں پر مچل کر مری داستاں
تتلیوں کو فرشتوں کے پر دے گئی
ان کو دیکھا تو عکس اپنا آیا نظر
آج دھوکا ہماری نظر دے گئی

روشنی کے تصور میں چلتے رہے
ہم اندھیروں میں ہنستے بدلتے رہے
میں صداقت کا تلخاب پیتا رہا
آئینے مستقل زہر اگلتے رہے
ان کے نقشِ کفِ پا تھے زیرِ قدم
رات ہم کہکشاں پر ٹہلتے رہے
تیرگی ہم سے بچ کر گزرتی رہی
ہم چراغوں کے مانند جلتے رہے
دل تھا شارق خطِ استوا کی طرح
ذہن کے زاویے رُخ بدلتے رہے

ڈاکٹر حسین الحق
گیا

حیص بیص میں گھرا مسافر

یہ ۱۹۷۱ء کا واقعہ ہے!

لوگوں کا تانتا تھا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا، پچھلے سات آٹھ مہینوں سے یہ سلسلہ لگاتار جاری تھا۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جہاں کوئی نہ کوئی، نہ آیا ہو۔

اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت حکومت کے عاملوں نے بھی چشم پوشی کر لی تھی ورنہ فوج کے جوان اور سی آئی ڈی کے جاسوس اب اتنے گدھے تو نہ تھے کہ مکتی باہنی R.O.W اور یوپی بہار کے عام آدمی کے درمیان فرق نہ کر پاتے۔۔ انسانی سرشت میں چھپا نیکی اور رحم دلی کا ایک اور پہلو!

مگر آنے والا ہر بنگلہ دیشی اور چھپا کر رکھنے والا ہر ہندوستانی اسے اپنا کارنامہ سمجھتا تھا۔ اور لوگوں کے سامنے فخریہ اپنے معرکے بیان کرتا تھا۔

اس لن ترانی میں سب سے آگے ذاکر چچا تھے، کہنے لگے نعیم الدین اور اس کے خاندان کو لانے میں میں نے ... پاپڑ بیلے وہ تو بس قبلہ پیر و مرشد کا ... خیال ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ہی گھر میں کھدبدی لگی کہ میرے بھیا بھابھی اور بھتیجوں بھتیجیوں کا کیا ہوگا؟ میں نے لاکھ سمجھایا کہ بی بی ہم تو اپنی ہی دال روٹی میں آج تک مست رہ ہو لیے، سر چھپاتے ہیں تو پیر کھلتا ہے، پیر چھپاتے ہیں تو سر کھلتا ہے۔ اور تو ایسی فاقہ مستی میں جو حاتم طائی کی قبر پر لات مارنا چاہتی ہے تو ننگی کیا نہائے گی اور کیا نچوڑے گی؟ مگر وہ بندی تو اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ گئی کہ آج مروں تو کل دوسرا دن جب تک ماں جائے کا منہ نہ دیکھ لوں تو دانہ پانی حرام!

اب آپ ہی بتایئے جن کا اتا پتہ نہ ٹھور ٹھکانہ ان کو آدمی کہاں سے کھوج نکالتا۔ اور وہ بھی ایسی کربلا میں کہ خلقت تراہ تراہ کر رہی ہو۔ کیسا اس کا پوشش کہ چھپی چتری سے اپنے ہوتے سوتے کو خبر کرے کہ وہ کس حال احوال میں ہے اور جان لوں [illegible] ڈھاکہ چھوڑا بھی ہے یا تو پھر پورا اور محمد پور پہنچا اور کسی بہاری کا پہنچا— آپ کا خدا الگ تھا کیا یہ جان سے ... کی بات نہ تھی؟ [illegible]

ہوتا چلا گیا

بھی ہی عقل کے ناخن لے اور اس ارادے سے باز آ۔ البتہ اگر تیرے بھائی بھوجائی بھولے بھٹکے بجھتے بجاتے یہاں تک پہنچ جائیں تو پھر وہ سر آنکھوں پر جم جم آئیں، جب تک چاہیں رہیں جیسے چاہیں رہیں، مگر اس خفقانی نے ماں جائے کے لئے اپنے ماتھے کے سیندور تک کو سات سلام کیا اور مجھے اللہ آمین کہہ کے روانہ کر ہی ڈالا۔

میں افتاں خیزاں کلکتہ پہنچا، وہاں شہر محلے اور خاندان کے کچھ عزیز رہتے تھے ان سے مشورہ کیا سب نے یک زبان ہی کہا کہ اس وقت میر پور اور محمد پور جانے کا ارادہ شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے برابر ہے کیوں کہ کوئی بنگالی کسی بہاری کو پھوٹی آنکھوں بھی دیکھنے کو تیار نہیں ہے، اور پھر اگر رات میں سورج نکال ہی لیا جائے تو اس کی کیا ضمانت کہ اپنے عزیزوں کا منہ بھی دیکھنا نصیب ہوگا تب ایسے میں تاڑ سے فلاں رگڑنا کہاں کی دانائی ہے سان عزیزوں کی بات دل کو لگی مگر پھر خیال آیا کہ وہاں جو آپ خوا دے آپ مرادے میں ہے، وہ تو آپ ہی مارے گی آپ ہی جلائے گی اس لئے مرتا کیا نہ کرتا اسی نصیبوں جلی قسمت کی ہیٹی بہن کی خاطر آگے بڑھا جو آنے کا منہ دیکھتی تھی اور جاتے تک بیٹھ ۔۔۔۔ چلا میں مرشد آباد کے آگے تک پہنچ گیا۔ کہ شاید کسی قافلے کے ساتھ وہ صبح کا بھولا شام کو واپس آجائے تو کم از کم تاڑ سے گزر کر کھجور میں تو نہ اٹکے۔

اور بھائی! اسی کو اتفاق کہتے ہیں کہ بالآخر ایک قافلے میں وہ کرم جلا، ستم رسیدہ نظر آ ہی گیا۔ پہلے تو مارے دل بلیوں اچھلنے لگا پھر عجیب کیفیت حزن کی طاری ہوئی کہ وہ نور دیدہ اور راحت چشم جس کے غلاموں میں حبشی و آرام شامل تھا اور جس کا پہر بعد، روز عید اور ہر شب شب برات

ہوتی تھی وہ ایسے پھٹے حالوں نظر آیا کہ دل خون ہو گیا۔ مگر پھر خیال آیا کہ آسمان میں تھگلی لگانے کا یہی نتیجہ تو نکلنا تھا۔ اس زمانے میں کیسا کیسا میں نے اسے سمجھایا کہ بھائی تو اپنے آپے میں رہ اور ہوا میں قلعے نہ بنا، ساری دنیا کو اگر خلجان ہو گیا تو کیا ضروری کہ تو بھی مراق میں مبتلا ہو جائے پر اس مرد خدا پر تو آسیب سوار تھا، اور سچ پوچھو تو اس زمانے میں سب کا آسن اکھڑا ہوا تھا، کون کس کی سنتا، شجاع الدین بھی اس مرگ انبوہ میں شامل ہوا اور جب آسمان سے گرا تو اس حال میں پہنچا کہ دیکھ کر دل بیٹھ گیا۔

میں تو پہلے پہچان ہی نہ سکا، مدقوق چہرہ، سر کے بال داڑھی سب بے تحاشہ بڑھے ہوئے، شاید ہفتوں سے منہ نہ دھو سکا تھا، جھکر پر منوں گرد اور میل و کثافت کے سائے، آنکھیں بے نور گڑھے میں دھنسی ہوئی، نہایت میلا جگہ جگہ سے پھٹا پینٹ شرٹ، ننگے سر ننگے پیر ۔۔۔۔"

اللہ اللہ! یہ وہ شجاع الدین تھا جو دن میں دو مرتبہ کپڑے بدلتا تھا اور روز شیو کرتا تھا۔

اور اس کی بیوی، کاش آسمان گر پڑتا، بجلی مجھے راکھ کر دیتی یا زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتا تو شاید مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا جتنا اس حور شمائل کو دیکھ کر ہوا۔ وہ خوب رو اور دل کش لڑکی جس کا جوبن پھٹا پڑتا تھا جس کے آفتاب حسن کی کرنوں کی چھوٹ جدھر بھی پڑ جاتی تھی، صحن کی صف بقعۂ نور بن جاتی تھی، جس کے نازک نرم اور تیکھے نقوش پر زاہد خشک بھی پلکیں جھپکاتا وہ بے تحاشا سلے اور مڑے تڑے پھٹے کپڑے کی طرح جگہ جگہ شکن آلود ہو چکی تھی پتہ نہیں اندر سے بھی مسک گئی تھی یا اپنا

آپ بچا سکتی تھی۔ مگر باپ سے اب اس بچاؤ بچنے کی کوئی
بات نہ تھی اور بچوں کے چہرے پکار پکار کر کہہ رہے
تھے "ہم بھوکے ہیں"... مجھے تو کرشن چندر کے ناول
"ان داتا" کا قحط زدہ خاندان یاد آگیا۔

خدا لگتی کہتا ہوں۔ میں تو پہچان بھی نہ پاتا اگر
شجاع الدین خود ہی "دولہا بھائی" کہہ کر لپٹ نہ پڑتا۔
خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں اس کی بیوی مجھے دیکھ
کر ایسا پھپھک پھپھک کر روئی کہ کلیجہ پھٹا پڑتا تھا
لیکن شجاع الدین کو تو جیسے سکتہ مار گیا تھا۔ بندۂ خدا
کی آنکھ تک نہ بھیگی۔ میں نے غزال آنکھوں کی وحشت
کی تشبیہ سنی تھی مگر مغرور آنکھوں کی ویرانی نہیں دیکھی
تھی۔ سو دیکھ لی!

میں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ وہیں پاس کے ایک
سیلون میں شجاع الدین اور اس کے بچوں کا بال بنوایا
پھر قریب کے ایک تالاب میں لے جاکر انہیں نہلوایا اور
ساتھ میں جو کپڑے لتے لے گیا تھا انہیں پہنایا اور جب
وہ سب آدمی کے جامے میں آگئے تو ایک ہوٹل میں کھانا
کھلایا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے بچے تو مریکھوں کی طرح
کھانے پر ٹوٹ پڑے اور ماں باپ بھی حتی الامکان سلیقہ
یاد رکھنے کا ثبوت دینے کی کوشش کرنے کے باوجود کھانے
پر ٹوٹ پڑ رہے تھے، پھر کھا کر وہیں یہ ایسا سوئے
جیسے قیامت سے رشتہ جوڑ لیا ہو یا اصحاب کہف سے
دوستی کر لی ہو!

میں گھبرایا کہ بلا لیا ہے پولیس کا سامنا ہے یہ
ہوٹل والا کہیں کھڑے کھڑے نکالنے پہ نہ تل جائے۔
مگر شاباش اس ہندو ہوٹل والے کو۔ جب میں اس

سے معنے تک [illegible]
لگا "دادا! چنتا مت کرو۔ [illegible] خوب [illegible]
[illegible] جب تک خود [illegible] شریف [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ماری جائے [illegible]
شام ہوئے [illegible]
اور [illegible]
[illegible]
اور [illegible] ایک [illegible]
[illegible] دوسرے دن شجاع الدین [illegible]
کا پینٹ شرٹ اور اس کی بیوی کے [illegible]
کا برقعہ خریدا اور [illegible]
سے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔

بھائی! گھر پہنچ کر جو تماشا ہے [illegible] خدا کی پناہ!
اور سب سے زیادہ غضب تو اس [illegible]
جو [illegible] ایسا [illegible]
گیا ہو مگر یہاں تو قیامت یہ ٹوٹی کہ [illegible]
میں آگیا [illegible] اور [illegible] اس امید پر بھرا
بیٹھا کہ جب [illegible] سارا بخار
نکالوں گا۔ سو صاحب [illegible] ایسا [illegible]
[illegible] آیا۔

[illegible] اب سوال یہ تھا
کہ [illegible]
[illegible]

کہ چلیے یہی جھگڑا غیر ملکی اور ہندوستانی کی سطح پر دشمن کی جان کیسے بچائی جائے۔ اسی فکر میں تو میری نیند اڑ گئی۔ بس اسی خوف سے جان سوکھی جاتی تھی کہ اگر کہیں خدانخواستہ اس کو کوئی گھر نہ ملا تو گھر میں تو زندگی دوبھر ہو گی ہی ساتھ ہی اپنے شوہر کے بوجھ سے بھی دبا رہے گا کہ ایک دکھیارا بھی پناہ بھی نہ پا سکا اور میں اسے پناہ نہ دے سکا۔

یہ سوچتے سوچتے کئی دن گزر گئے اور اسی درمیان خبر ملی کہ تھانے والے محلہ محلہ مخبری کرا رہے ہیں کہ کس نے کس جگہ بنگلہ دیشیوں کو پناہ دی ہے۔ بس اس خبر پر تو میرا خون سوکھ گیا، اپنی عزت اپنا گھر اپنے بال بچے کسے پیارے نہیں ہوتے۔ اب میں سالے کے لئے اپنی جان تو نہ دے دیتا اور اپنی عزت نیلام تو نہ کر دیتا، مگر پھر وہی سوال کہ یہ دکھیارا کہاں جائے گا؟

آخر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جگنو چمکا۔ میں نے شہر کے ایک نظامیہ مدرسہ کے صدر ملا جی کے پیر پکڑ لئے اور ان کی وساطت سے مدرسے کے مہتمم کے آگے پوری طرح کھل گیا، وہ دونوں بیچارے، اللہ ان دونوں کو اس کا اجر دے، راضی ہو گئے اور تمام دفتری کارروائی ایک دن میں مکمل ہو گئی۔ بس یہ بھی خدا کا کرم تھا کہ جب شجاع الدین بھاگا تو [illegible] میں اپنی میٹرک کی سرٹیفکیٹ بھول کر یہیں چھوڑ گیا تھا۔ اگر وہ یہاں نہ ہوتی تو پچھلے دس برسوں سے اس مدرسے میں ٹیچر کے عہدے پر بحالی بھی بے معنی ہوتی۔ بھائی علیم الدین کہنے لگے کہ اصل چیز تو وہ سرٹیفکیٹ ہے مگر میں مطمئن تھا کہ بہرحال ابھی تو وہ سرٹیفکیٹ نکلنے نہیں جا رہی ہے، اور وہی ہوا بھی، تھانے والے آن ہی دھمکے، پر میں تو کاغذ پتر سے مضبوط تھا، اڑ گیا: "ایک آدمی جو ۶۶ء میں یہیں سے میٹرک کرتا ہے اور ۷۶ء سے شہر کے مدرسے میں پڑھا رہا ہے، اس کا ایک بچہ جو پڑھنے کے قابل ہے، دو برسوں سے یہیں پڑھ رہا ہے پھر آپ کس بنیاد پر غیر ملکی بنیاد پر غیر ملکی قرار دے سکتے ہیں؟"

"مگر کیوں بیچا؟" تھانے دار نے سوال کیا

"جی چاہا اس لئے بیچا۔" میرے جواب دینے سے پہلے اندر سے گھر میں بول اٹھیں۔

"مولوی جی۔ آپ چپ رہئے۔" انسپکٹر نے ڈانٹا

انسپکٹر کا اتنا کہنا تھا کہ گھر میں کو جلال آگیا خود پولس انسپکٹر کی بیٹی، کس سے دبنے والی؟ دروازہ کھول، دھڑ سے باہر آ گئی۔ "آپ علاقہ کے داروغہ ہو گیا: میرے گھر میں آگ لگانے آئے ہو اور مجھ سے کہتے ہو چپ رہو۔ ارے تمہاری مت ماری گئی ہے کیا؟ جو ایک بے گناہ کا گھر اجاڑنے پر تل گئے ہو، سات پشت سے تو ہم یہیں رہ رہے ہیں، اور آج تم، وردی پہنی! اب صاحب جی ہمیں دھمکانے چلے ہو؟ امیر علی پولس انسپکٹر کی بیٹی پر اپنی وردی کا رعب نہ جمانا۔"

بیچارے انسپکٹر کی تھوڑی دیر کے لئے سٹی گم ہو گئی، لگتا تھا ساری اکڑ فوں نکل گئی۔ غریب عورت سے بھلا کیا تو تو میں میں کرتا۔ مگر چند ہی لمحوں بعد جیسے اس نے سنبھالا لیا۔ وہاں سے تو اٹھ گیا، باہر آ گیا مگر جاتے جاتے دھمکا گیا: "مولوی صاحب! شجاع الدین سے تو جلد ہی

ہی، آج نہیں تو کل، کبھی نہ کبھی دھر ا ہی جائے گا۔ آپ کتنے دن اسے بچائیے گا، اپنی فکر کیجئے۔ کہیں جو کے ساتھ گھن نہ پس جائے۔

"نہ میں بچانے والا ہوں نہ آپ مارنے والے۔ سب کرنے والا بھگوان ہے" میں یہ کہہ کر گھر میں چلا آیا مگر تھانے دار کی بات دل میں چبھ گئی۔ گھر میں کا معاملہ تو یہ تھا کہ آنکھ کے آگے ناک سو جھے کیا خاک۔

رات بستر پر گیا تو پھر علیم الدین بھائی کی بات یاد آئی: "اصل چیز تو دو ٹرسٹ ہے۔ یہ خیال آج ہی جیسے خوف کا ایک گھنا خار دار جنگل میرے اندر اُگ آیا۔ اس رات میں رات بھر جاگا۔ طرح طرح کی تدبیریں سامنے آئیں اور سب ایک دوسرے کو کاٹتی گئیں۔ آخر میں ایک خیال پوری شدت کے ساتھ سامنے آیا اور مجھے محسوس ہوا کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

صبح ہوتے ہی میں نے اپنے بچپن کے دوست شیو شنکر کا دروازہ کھٹکھٹایا جو اب جن سنگھ کا ضلعی صدر بن چکا تھا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔ "جاکر تم! خیریت تو ہے؟" میں نے اس کے سامنے اپنی تباہیاں کی تو وہ سُن کر خوب ہنسا، پھر ہنستے ہوئے بولا۔

"یہ تو چھوٹا سا مسئلہ ہے جس کا سامنا تم کو کرنا پڑ رہا ہے تم کو یاد ہے تم جن سنگھ کو کتنی گالیاں بک چکے ہو؟ اب اس وقت وہ باتیں کنارے رکھو جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔"

"ٹھیک ہے میں ستر ہ سے تمہارے سالے کو جن سنگھ کا ممبر بنالوں گا مگر جب آج تک اس کی ممبر شپ دکھائی ہے تو آج جو دوسرے ممبر ہیں وہ بھی تو جانیں گے کہ پچھلا آدمی پارٹی کا ممبر ہو گیا۔"

"ہاں! تو اس سے کیا ہے؟"

اس سے یہ کہ اپنے سالے سے کہو کہ وہ پارٹی کے جلسوں میں آنا شروع کر دے۔ میں سکریٹری سے کہہ کر پچھلا ریکارڈ درست کرا دوں گا۔ مگر یہ بات سب کو تو نہیں بتائی جا سکتی، سب کو تو یہی بتایا جائے گا کہ ایک مسلمان اپنی مرضی سے جن سنگھ کا سد رسیہ بنا ہے تو جب کوئی سد رسیہ بنا ہے تو اسے جلسوں میں بھی تو آنا چاہئے۔"

"یار! یہ تو بڑی عجیب بات ہو گی۔ ایک تو مسلمان، اس پر پاکستان سے لوٹا ہوا اور وہ علی الاعلان جن سنگھ کا ممبر بن جائے؟" شیو شنکر

شیو شنکر پھر قہقہہ مار کر ہنسا اور کہنے لگا "ہیں بھی تو دیکھو ارشنک ہماری کنھنائی پر سوچو کہ ہم ایک پاکستانی کو جن سنگھ کا ممبر بنا رہے ہیں۔ کیا یہ ستو ہم ایک عجیب بات نہیں ہے؟"

"شیو شنکر شاید ٹھیک کہہ رہا ہے" میں کچھ بولا نہیں مگر جی میں یہ خیال آیا۔

شجاع الدین کو جب میں نے بتایا تو وہ پہلے تو پیچھے سے اکھڑ گیا۔ کہنے لگا "آپ بھی کمال کرتے ہیں دولہا بھائی! میں مسلمانوں کی دشمن جماعت کا ممبر بن جاؤں؟ نہیں نہیں مجھے جیل جانا منظور ہے!"

مگر جب میں نے اسے سمجھایا کہ اگر جیل جانا پڑا تو صرف تم ہی نہیں جاؤ گے، تمہاری بیوی بھی جائے گی اور بیوی کے ساتھ ساتھ بہن بہنوئی کو بھی جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔"

شہاب دائروی

سچا رشتہ

فیاض صاحب اپنے ہاتھ میں بریف کیس
اٹھائے باغ سے گذر رہے تھے۔ درختوں کی ٹہنیوں
سے جھڑے ہوئے سوکھے پتے ان کے پاؤں کے دباؤ سے
چرمرا کر ٹوٹ رہے تھے اور اس کی آواز ان کے جسم
کی رگوں میں سنسناہٹ دوڑاتی ہوئی دماغ میں یہ احساس
لگا رہی تھی کہ ان کا وجود بھی ان پتوں کی طرح ٹوٹ
چکا ہے ۔۔۔ اس احساس کے اندر چھپی ہوئی سچائی
کی تلخیاں ان کے دل کو چھیدنے لگیں ۔۔۔ منزل اب بھی
دور تھی ۔۔۔ پاؤں تھکن سے چور تھے ۔ حوصلہ پست
تھا، تھوڑی دیر آرام کرنے کے خیال سے پرانے برگد کی
زمین پر پھیلی ہوئی ایک موٹی جڑ پر گردن جھکا کر بیٹھ
گئے اور ماضی کی طرف تیزی سے دوڑ پڑے ۔

دو ماہ پہلے بیٹے کے بلاوے کا تار پا کر ان کی
زندگی کے نصف سوکھے درخت میں نئی کونپلیں پھوٹی تھیں
خوشی سے سرشار ہو کر انہوں نے ساتھیوں کو تار دکھایا
تھا، بیوی کی قبر پر جا کر دعائے مغفرت کرنے کے
بعد اپنے جذبات سے بے قابو ہو کر بول اٹھے ۔

" میں تو تم سے بار بار کہا کرتا تھا کہ اپنا دل چھو
نہ کرو — ہمارے بیٹے کے جسم سے ہمارا خاندانی خو
ہرگز زائل نہ ہوگا ۔ خواہ وہ دنیا کے کسی خطہ میں کیو
نہ رہے اور وہاں کا ماحول جیسا بھی ہو ۔ لوٹ کر اعا
منصب پائے گا اور ہمارے آخری دن سکھ چین سے گذ
گے ۔ لیکن تم ہی پریشانیوں سے تنگ آکر ہمت ہار بیٹ
اور میرا ساتھ چھوڑ دیا ۔۔۔ کاش کہ آج تم زندہ ہوت

بیٹے کے بنگلے میں پہنچ کر انہوں نے کیا سوچا !
کیا پایا ۔۔۔ یہ حقیقت جب ان کے ذہن میں ابھری تو ا
کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں ۔۔۔ ایک دن ان کی بہ
اور اس کی سہیلیاں رمی کھیل رہی تھیں اور قہقہ
کے فوارے چھوٹ رہے تھے ۔ وہ مغربی تہذیب و تمد
میں پھیلی ہوئی گندگی کو مشرقی معاشرے میں داخل ہو
ہوئے دیکھ کر چپ نہ رہ سکے تھے لہذا انہوں نے ملازم ز
میاں سے بہو کو بلا کر بڑی نرمی سے کہا تھا ۔

" دلہن ! اچھے گھرانوں میں یہ سب کھیل پسند
کیا جاتا ہے ۔"

اتنا کہنا تھا کہ جیسے پیال کے ڈھیر دل میں
آگ لگ گئی ہو ۔ لہکتی ہوئی ان کی بہو نے بڑا تلخ
جواب دیا ۔

" آپ کو دو وقت کی روٹیاں چاہئیں ۔ وہ ملتی
رہیں گی ۔ لیکن آپ دخل اندازی سے گریز کیا کریں ۔
میں آپ کے بیٹے کی زر خرید باندی نہیں ہوں ۔"

فیاض صاحب ہکا بکا ہو کر رہ گئے تھے اس
واقعے کے بعد کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب وہ بہو کی طنز
بھری باتوں کا شکار نہ ہوئے ہوں ۔ اپنے بیٹے کی زندگی
سنوارنے کی خاطر انہوں نے قربانیاں دی تھیں ۔ اثاثوں
کو بیچ کر تنگ دستی خریدی تھی ۔ اپنی شریک حیات کو
کھویا تھا ، سب کچھ گنوا کر اپنے بیٹے کی زندگی میں دکھ
بھرنا کس طرح پسند کرتے ۔ ؟ چاہت کی مانگ کچھ
تھی ۔ ؟ غیرت اس مانگ کی مخالف تھی ۔ مزید ذلت
کے خوف سے وہ بریف کیس میں اپنا ضروری سامان
رکھ کر چپکے سے بنگلہ سے نکل پڑے تھے ۔ فیاض صاحب
کے ذہن میں سوچ کا مقید پرندہ ان کے دماغ کے پنجرے
سے نکل کر اڑ گیا تو اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھائی دیکھا
کہ ایک سفید پوش سن رسیدہ آدمی ان کے سامنے سے گزر
کر دو قدم آگے بڑھا ، پل بھر رکا ، پھر پلٹ کر ان کے
پاس آیا اور شک وشبہ میں پڑا دبے لہجے میں پوچھا ۔

" آپ بڑے ناظر صاحب تو نہیں ۔ ؟ "

" کبھی تھا بھائی ۔ اب نہیں ہوں ۔" وہ اپنے
دفتر کے چپراسی مرلی دھر کو پہچان گئے تھے ۔ لیکن انہوں
نے اپنے خون میں لگاؤ کا جب کوئی جذبہ نہیں پایا تھا تو
پرائے خون میں پانے کی امید کیوں کرتے ؟

" شاید آپ مجھے پہچان نہیں پائے ۔ میں مرلی دھر
پہلا آپ کا سیوک ، اپنی زندگی کی آخری ہچکی تک آپ
کی مہربانیاں بھول نہیں پاؤں گا ۔ مالکن کہاں ہیں ۔؟"
مرلی دھر نے ان کے قریب بیٹھ کر پوچھا ۔

" غموں سے تنگ آ کر انہوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا
اور مٹی کے اندر سکون سے سو گئیں ۔" دل کے درد سے فیاض
صاحب کی آواز بھاری ہو گئی ۔

" اور چھوٹے بابو ۔" مرلی دھر نے پوچھا ۔

" ان کے بارے میں کوئی سوال دوبارہ مت کرنا مرلی
ہو سکتا ہے کہ میرے دل میں لگے زخم کے تمام ٹانکے ٹوٹ
کر ٹوٹ نہ جائیں ۔ اور میں زندہ نہ رہ پاؤں ۔"
فیاض صاحب کے چہرے پر دل کی اداسیاں پھیل گئیں ۔

" ایک بھائی تو ابھی آپ کا زندہ ہے ۔" مرلی دھر کی
نگاہیں فیاض صاحب پر جمی تھیں ۔

" میرا بھائی ۔؟" فیاض صاحب کی آواز میں حیرت
تھی ۔

" ہاں ، آپ کا بھائی مرلی ۔"

یکایک دونوں کھڑے ہو گئے اور مرلی نے پوری
طاقت سے انہیں اپنی باہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا ۔

" چلئے بھائی ، میرے گھر ۔" مرلی دھر نے بریف کیس
اٹھا لیا اور فیاض صاحب مرلی دھر کے ساتھ چلتے رہے
باتیں ہوتی رہیں ۔ راستہ طے ہوتا رہا ۔ مرلی دھر نے اپنے
مکان کے سائبان میں پہنچ کر تیز آواز لگائی ۔

" ارے ماں جلدی آ ۔ دیکھ کون آئے ہیں ۔
بھگوان نے تیری اچھا پوری کر دی ۔"

مرلی کی بیوی شانتی اپنے شوہر کی ملازمت کے

وہاں اپنی مجبوریوں سے نجات پانے کی خاطر کئی بار فیاض
صاحب سے مل چکی تھی اور کبھی نامراد نہیں لوٹی تھی،
وہ ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی باہر آئی اور فیاض صاحب
کو دیکھ کر خوشی سے ان کے پیر چھو کر اپنے عقیدے کا اظہار کیا۔
شانتی اب بھیا کو اندر لے چلیں گی یا راستہ بھر کھڑے
جیب حساب کھڑی رہیں گی۔ مرلی نے کہا۔
"آج میرا گھر سورگ بن گیا ۔ شانتی نے کہا۔
فیاض صاحب اپنے اور مرلی کے درمیانی
فرق کو دیکھ کر سخت حیران تھے۔ جو اپنوں میں نہیں پایا
تھا وہ پرائے دے رہے تھے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ
جو ہمیں خلوص دے صحیح معنوں میں وہی اپنا کہے جانے
کا حقدار ہے، باقی سب پرائے ہیں ۔ رشتہ، ناتا، خون
خاندان یہ ساری باتیں بکواس لغو اور خود فریبی کے
سوا کچھ بھی نہیں ۔ ایک مکڑی کے جال کی طرح جیسا جو
مفاد کے تقاضوں کے تحت پھیلتے اور سکڑتے ہیں۔
ہمارے سماج میں اپنے اور پرائے کہے جانے کا چلن
کیوں مروج ہوا ۔؟ مرلی کی عمر نے اس کو طرح طرح
کے تجربوں کے رازوں سے واقف کیا تھا؛ فیاض
صاحب کی خاموشی دیکھ کر فوراً سمجھ گیا کہ وہ کوئی
کشمکش سے دوچار ہیں ۔ ان کے دونوں شانوں
پر اپنے ہاتھوں کا ہلکا دباؤ ڈال کر انہیں صوفے پر
بٹھاتے ہوئے کہا۔
"آپ اپنے گھر آگئے ہیں، اجازت دیں تو بہو کو
بلاؤں ؟ آپ اپنی بہو سے ملنا چاہیں گے ؟"
"امر کی دلہن ؟" فیاض صاحب کا حافظہ
قابل رشک تھا، اتنے دنوں بعد بھی امر کو بھولے
نہ تھے جو اسکول جاتے وقت ان کا کھانا لے جاتا تھا۔
اور جس کو وہ روزانہ ایک روپیہ دے کر سمجھاتے
تھے کہ دو گھنٹہ صبح شام پڑھنے کی عادت
بنا لو تو یقیناً ایک دن تم اپنے باپ کا نام روشن
کرو گے ۔
فیاض صاحب نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا
"امر کرتا کیا ہے ۔؟"
"وہ اس شہر کا ایس۔پی ہے۔"
فیاض صاحب کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا
بے اختیار ہوتے ہوئے بولے۔
"بلاؤ بہو کو ۔"
چند ساعت کے اندر گھونگھٹ میں چہرہ
چھپائے مشرقی تہذیب کی پوری طرح حفاظت
کرتی ہوئی امر کی بیوی آئی، جھک کر فیاض صاحب
کے چرن چھوئے اور اٹھ کر اپنے ہاتھوں کو
جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔
فیاض صاحب خوشی سے پھٹ پڑے۔
اپنے کرتے کی جیب سے دس روپیہ نکالا اور
انتہائی دبی ہوئی آواز میں بولے ۔
"میری خوشی کے لئے یہ حقیر رقم قبول کر لو
بہو۔"
بہت ہی اپنائیت سے بہو نے کہا۔
"بابو جی یہ دس روپے نہیں، میرے
لئے دس لاکھ ہیں، بھگوان کی مورتی کے سامنے
جس مہاپرش کی ٹنگی ہوئی تصویر ہے ۔ ان
کا درشن ہو جانا کیا یہ میری سب سے بڑی خوش

قسمتی نہیں ۔۔۔؟"

" جگ جگ جیو بیٹو ۔ اس حقیر بوڑھے کو عزت تم نے بخشی ہے، خدا تمہیں اس کا صلہ دے گا۔" فیاض صاحب کے دل میں جذبات کا سیلاب آگیا تھا۔

ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ امر کی جیپ دروازہ پر لگی، شاید اس کی بیوی نے فون سے اطلاع دی ہو۔ وہ تیزی سے لپکتا ہوا فیاض صاحب کے قریب پہنچ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ کو جوڑ کر بولا۔

" بھگوان نے آپ کا درشن کرا دیا۔"

فیاض صاحب نے امر کو اپنے قریب بٹھا کر اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

" بیٹے میری بات پر عمل کر کے اس کا پھل تم نے پا لیا ۔ ایک اہم نکتے کی باتیں پھر تم سے کہہ رہا ہوں، غریب طبقوں کے حقوق کا پوری طرح سے حفاظت کرنا اور وہ لیسے افراد جو اپنے ہاتھوں غنڈوں اور دھن کے بل سے قانون اور انصاف کو اپنے حق میں کر لینے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں بے خوف ہو کر ان کے گریبانوں پر ہاتھ ڈال دینا، ممکن ہے اس راہ کو اپنانے میں تمہیں قدم قدم پر ارچنیں پیش آئیں، پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے ۔ لیکن تم نراش ہرگز نہ ہونا۔ فتح یقیناً تمہاری ہوگی کیونکہ سچائی کو مکر و فریب کی چادر سے زیادہ دنوں تک چھپایا نہیں جا سکتا۔"

امر نے اپنا ہاتھ فیاض صاحب کے ہاتھ

رکھتے ہوئے کہا۔

" میں وچن دیتا ہوں چاچا کہ اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر آپ کی باتوں پر پوری طرح عمل کر برائیوں کے درمیان رہ کر فیاض صاحب اتنا خوش تھے جیسے کہ پوری کائنات ان کی مٹھی میں ہو ۔۔۔ امر کے خاندان کے تمام افراد ان کی عزت اور احترام کرتے تھے ۔ ایک دن آفس سے آتے ہی امر نے ان سے کہا۔

" آج چھوٹے بابو سے ملاقات ہوئی تھی۔" امر کی نگاہیں فیاض صاحب کے چہرے پر اپنی باتوں کے اثرات تلاش کرنے لگیں ۔

فیاض صاحب تالاب کے پانی کی طرح ساکت رہے ۔۔۔ نہ ان کے چہرے پر دل کا کوئی عکس ابھرا اور نہ ان کی زبان میں کوئی جنبش ہوئی۔

" چاچا ۔۔۔! کیا آپ مانتے ہیں ؟ کہ کبھی کبھی ہم حقیقت جان نہیں پاتے اور غلط فہمیوں کے شکار ہوتے ہیں۔" امر نے کہا

" ہاں ایسے حادثات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔"

فیاض صاحب نے مختصر جواب دیا۔

" بالکل ایسے ہی حادثے کے شکار آپ بھی ہوئے ہیں ۔ چھوٹے بابو کی دکھ بھری کہانی سن کر میں بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ اپنی تعلیم کے آخری سال میں طویل علالت کی وجہ سے وہ امتحان نہ دے سکے تھے، مزید ایک سال کا قیام ضروری تھا، آپ کی دی ہوئی ساری رقم علاج میں خرچ ہو چکی تھی، آپ کے پاس کچھ بچا نہ تھا اس لئے

سے وہ واقف تھے۔ آپ کو صحیح حالات سے آگاہ کرنا
مشکل ہی کے سوا کیا ہوتا، چھوٹے بابو نے انتہائی ضبط اور
دانائی سے کام لے کر چپکے سے شادی رچا لی تھی، روتے رہتے ۔
بات بات پہ ہیجان سے ہونہیں پاتے تھے۔ عارضی ملازمت پانے
کے لئے ان کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ اسی دوران
ان کی ایک ہندوستانی کلاس میٹ نے اس شرط پر
ساتھ ان کی کفالت کرنے کی پیشکش کی تھی کہ امتحان ختم
ہوتے ہی ان سے شادی کر لینی ہوگی، ان کا مستقبل اندھیرے
میں پھنسا ہوا تھا اور اجالا پانے کی خاطر وہ راضی ہو گئے
تھے۔" امر نے انکشاف کیا۔

فیاض صاحب کے دل میں باپ کی محبت نے جوش
مارا اور وہ اضطرابی کیفیت میں بولے۔

" بیٹا امر! تم مجھے اس کے پاس جلد لے چلو۔"
فیاض صاحب کے دل میں ان دیکھے جذبات نے شور مچا دیا
تھا ــــ

امر کی دلی خواہش تھی کہ باپ بیٹے کے درمیان کھڑی
دیوار ڈھ جائے۔ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

چاچا! ہم دونوں ناشتہ کر لیں، پھر چلتے ہیں۔
وہ دونوں ناشتہ سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے
کہ فون کی گھنٹی لگاتار بجنے لگی، مجبور ہو کر امر نے اٹھ کر
ریسیور اٹھایا، وہ جیسے جیسے سنتا رہا اس کے رنگ
زرد ہوتے گئے۔ ریسیور رکھ کر جلدی سے فیاض صاحب
کے قریب آکر بولا۔

" ہمیں فوراً چھوٹے بابو کے یہاں چلنا پڑے گا۔"
" خیریت تو ہے نا، جلدی کہو کیا بات ہے امر" فیاض
صاحب بوکھلا گئے۔

وہ پوری طرح ٹھیک ہیں۔ آپ ذرا گھبرائیے پریشان
نہ ہوں؟ امر نے انھیں تسلی دی۔
جب وہ چھوٹے بابو کے بنگلے کے بڑے ہال میں داخل
ہوئے تو وہاں کا منظر بڑا دل شکن تھا۔ چھوٹے بابو پولیس
کے گھیراؤ میں خاموش بیٹھے تھے، چھوٹے بابو کی بیگم کی لاش
خون سے لت پت ہال کے وسط میں پڑی تھی اور اس کے داہنے
ہاتھ کی گرفت میں ریوالور تھا، فیاض صاحب رجب کے
پاس گئے اور اس سے پوچھا۔
" یہ سب کیسے ہو گیا رجب ــ؟"
سہمے ہوئے رجب نے پہلے چاروں طرف دیکھا پھر
دھیمی آواز میں کہنے لگا۔
" وہ جو بابو ابھی آپ کے ساتھ آئے ہیں، صبح بھی آئے
تھے اس وقت بنگلہ میں نہ صاحب تھے اور نہ میم صاحبہ
انھوں نے بڑی چالاکی سے ہنستے ہنساتے مجھ سے وہ
بھید اگلوا دیا جس سے تنگ آکر آپ یہاں سے چپکے سے
نکل پڑے تھے، صاحب سے آنے کے بعد دونوں ڈرائنگ
روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ بابو وہاں سے
چل دیئے۔ میم صاحبہ جوں ہی اندر داخل ہوئی غصہ
نے بڑا اثر طمانچوں سے ان کے گالوں کو سرخ کر دیا۔
یکایک وہ غصہ سے بپھر اٹھی تھیں بڑی پھرتی سے انہوں
نے اپنے پرس سے ریوالور نکال کر دو گولیاں صاحب
پر چلائی۔ لیکن دونوں بار صاحب بڑی تیزی سے جھک
گئے تھے۔ اور گولیاں دیوار سے ٹکرائی تھیں، تیسری گولی
چلنے سے پہلے صاحب نے اچھل کر میم صاحبہ کی کلائی
پکڑ لی اور ریوالور کا رخ ان کی طرف مڑ گیا تھا۔
ریوالور کی ٹریگر کس کی انگلی سے دبی یہ خدا جانے ــ؟
(بقیہ صفحہ پر)

عادل حیات
نئی دہلی

جرعۂ ناچشیدہ

فن پچپاسوں کے مجمے میں آسانی سے پہچانا جا سکتا تھا کیونکہ دبلا پتلا ہونے کے باوجود وہ کافی دراز قد تھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا لیکن سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ عمر کچھ یہی چالیس پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ صبح ہوتے ہی روزانہ امین آباد کے چوراہے پر خوانچہ لگا دیتا اور شام تک بیٹھا صدائیں لگاتا رہتا۔

"چھولے لے لو۔۔۔"

"چٹپٹے۔۔۔ مسالے دار۔۔"

"چھولے لے لو۔"

میں جب کبھی آفس جاتے وقت اس طرف سے گزرتا تو اکثر وہ مجھے ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا اور اپنی نحیف آواز میں بولتا۔

"بابوجی! آج کے چھولے کھا کر دیکھئے، بہت مزہ آئیگا۔"

اور تھوڑے سے چھولے میری جانب بڑھا دیتا۔ میں اس کے ہاتھوں سے چھولے لے کر چکھتا جو روزانہ کی ہی طرح پھیکے اور بدمزہ ہوتے تھے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا دل رکھنے کے لئے چھولے کی تعریف کرنے لگتا، اتنی دیر میں وہ تین روپیوں کے چھولے تیار کر کے میرے ہاتھوں میں تھما دیا کرتا تھا۔

میرے فلیٹ کے قریب ہی اس کا گھر تھا، جس میں بیوی کے علاوہ اس کی تین بچیاں رہتی تھیں۔ اللہ نے اسے بیٹوں سے نہیں نوازا تھا۔ اس کی بڑی کا نام شیلی تھا، وہ کچھ پڑھی لکھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں اکثر چھوٹے موٹے رسالے رہا کرتے تھے۔ دوسری بیٹی بے بی کہلاتی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی سہیلیوں کے درمیان گھری رہتی تھی۔ گھر کے کام کاج سے اسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ تیسری بیٹی کا نام چنچل تھا۔ لیکن گھر والے اسے چھوٹی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ وہ اندازاً پندرہ سال کی رہی ہوگی، باقی دونوں بہنیں اس سے دو دو سال بڑی تھیں۔ مجھ سے چھوٹی کو کافی انسیت تھی۔ جب بھی وہ مجھے دیکھتی اس کا ہاتھ ماتھے تک اٹھ جاتا۔

ایک شام جب میں آفس سے لوٹ رہا تھا تو مجھے اس کے گھر کے نزدیک کافی بھیڑ نظر آئی۔ میں

نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ شاید اس نے آج اپنا خوانچہ نہیں لگایا تھا۔ مجھے اپنے دل میں انجانا سا خوف اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بھیڑ کی جانب چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر مجھے طرح طرح کی سرگوشیاں سننے کو ملیں لیکن مجھے ان پر یقین نہیں آیا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ میں اس پر یقین کر ہی نہیں سکتا تھا۔

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے اپنے آپ سے کہا، اتنے میں میری نظر رئیس بھائی پر پڑی۔ رئیس بھائی بااثر اور کافی رعب والے شخصیت کے مالک تھے۔ اتفاقاً ان کی نظریں بھی مجھ سے ٹکرا گئیں۔ وہ تیر کی طرح میری طرف بڑھے اور نزدیک پہنچ کر ہانپتے ہوئے بولے۔

"ارشد بھائی غضب ہو گیا... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ....."

"تو کیا یہ بات سچ ہے۔" میں نے بے بسی سے پوچھا۔

"ہاں چار مہینے گزر چکے ہیں.... اب کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"لڑکے کا پتہ چلا"

"نہیں"

"اس سے پوچھ تو لیتے۔"

"سبھی لوگ پوچھ کر تھک گئے ہیں..... وہ کچھ بولتی ہی نہیں۔"

"ہوں۔" میں نے کہا اور گھڑی پر نظر ڈالی تو ساڑھے سات بج چکے تھے۔ آٹھ بجے مجھے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ فلم دیکھنے جانا تھا۔ میں نے رئیس بھائی سے معذرت چاہی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بچے تیار بیٹھے تھے میرا بڑا لڑکا پہلے ہی ٹکٹیں لا چکا تھا۔ میں نے کپڑے تبدیل کئے اور بچوں کے ساتھ سینما ہال چلا گیا۔ فلم دیکھنے میں میرا ذرا بھی دل نہیں لگا۔ بار بار میرے دماغ میں رئیس بھائی کا یہ جملہ گونجنے لگتا۔

"ہاں ... چار مہینے گزر چکے ہیں .... اب کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

میں کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا میرے اس فعل سے بچے پریشان سے ہو گئے۔ بیوی نے مجھے ڈانٹ پلائی۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے..... دیکھتے نہیں ہیں کہ بچے پریشان ہو رہے ہیں۔"

مگر میں چپ رہا۔ تھوڑی دیر بعد انھیں وہیں چھوڑ کر میں واپس چلا آیا۔

اس دن کے بعد جب بھی میں آفس جاتے وقت اس طرف سے گزرتا تو وہ مجھے دیکھ کر نہ تو ہاتھ جوڑ کر کے سلام کرتا اور نہ ہی اس کی یہ آواز ابھرتی۔

"بابو جی! آج کے چھولے کھا کر دیکھئے، بہت مزہ آئے گا۔"

میں نے اکثر چھولے خریدنے کے بہانے اس سے بات کرنی چاہی، لیکن اس نے ہمیشہ مجھے ٹال دیا۔ خدا جانے اس حادثے سے اس میں کون سی تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔

چھوٹی کو ہاسپٹل میں بھرتی کر دیا گیا تھا کیونکہ نو مہینے پورے ہو چکے تھے۔ لیکن آج تک اس لڑکے

کا پتہ نہیں چل سکا تھا اور نہ ہی چھوٹی نے اپنی زبان
کھولی تھی۔ میں حیرت میں تھا کہ چھوٹی جس عذاب کو
نو مہینوں سے پیٹ میں پال رہی ہے اس کے محرک
کا نام کیوں نہیں بتا دیں۔

ہاسپٹل میں لوگوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ کچھ
لوگ تو ہمدردی میں اسے دیکھنے آ رہے تھے۔ اور کچھ
لوگ اس لئے آ رہے تھے کہ ممکن ہے اس ایام میں وہ
مجرم کا نام بتا دے۔ سبھی لوگ آئے مگر چھوٹی کا باپ
اسے دیکھنے ہاسپٹل نہیں آیا۔ احباب لاکھ سمجھاتے
کہ!

"چھوٹی نادان ہے، غلطی کر چکی ہے ـــ اب
غصہ کرنے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ جا کر دیکھ آؤ" لیکن
اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔

میں نے بھی کئی بار کوشش کی مگر مثبت
نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ ویسے ہی صبح خوانچہ لگاتا اور
شام تک میٹھی صدائیں لگاتا رہتا۔

"چھولے لے لو...."

"چٹپٹے.... مسالے دار"

"چھولے.... لے لو.."

چھوٹی کو ہاسپٹل میں داخل ہوئے آٹھ دن
گزر چکے تھے۔ آج صبح ہی سے وہ دردِ زہ میں مبتلا
تھی اور سہ پہر دن میں ڈھائی بجے اس نے ایک بچے کو
جنم دیا۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس بچے کا باپ
کون ہے۔ گھر اور محلے کے بیشتر لوگ آئے لیکن اس
کا باپ نہیں آیا۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ چھوٹی کو دیکھنے
ہاسپٹل پہنچا اور جب میری بیوی کو معلوم ہوا کہ چھوٹی
کا باپ آج تک اس سے ملنے نہیں آیا ہے تو وہ مجھ سے
کہنے لگی۔

"آپ جا کر چھوٹی کے باپ کو سمجھائیے۔۔ ہو سکے
تو اپنے ساتھ لے کر آئیے۔"

"میں پہلے ہی کوشش کر چکا ہوں۔ اب کوئی
فائدہ نہیں۔"

"ایک بار اور کوشش کرنے میں کیا مضائقہ ہے"

"اچھا۔ تم کہتی ہو تو ایک بار پھر کوشش
کر کے دیکھتا ہوں۔"

میں یہ کہہ کر گھر سے باہر نکل گیا۔ کئی دنوں
سے کہرہ چھایا ہوا تھا۔ اس لئے سردی کچھ زیادہ بڑھ
گئی تھی۔ میں رکشا کے ذریعہ سیدھا امین آباد پہنچا
مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی نظریں چرانی شروع کر دیں
جیسے وہ پہلے ہی سے جانتا ہو کہ میں وہاں کس لئے آیا
ہوں۔ میں نے پاس جا کر اس سے کہا۔

"آپ کی چھوٹی نے چاند سے بیٹے کو جنم دیا ہے"

یہ سنتے ہی وہ بری طرح چونک پڑا۔ اس کے
ماتھے پر پسینے کے قطرے بکھر گئے۔ مگر اس نے
جلد ہی اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا اور بولا۔

"تو میں کیا کروں؟"

"اب غصہ تھوک دیجئے اور چھوٹی کو دیکھنے
چلئے۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟" میرے اس سوال پر اس نے جھرجھری
سی لی اور پسینے میں نہا گیا۔ میں نے اسے بہلانا شروع
کر دیا۔ آخر کار میری جیت ہوئی۔ میں نے اسے کسی طرح

شہرِ خیال

★ تازہ شمارہ میں محترم مسعود منظر صاحب نے کیا خوب لکھا ہے کہ ہمارا ادب گمراہی اور انتشار سے نکل آیا ہے اور اس کا ثبوت اس شمارہ میں شائع شدہ بیشتر تخلیقات ہیں۔ غزلیں بہت اچھی ہیں۔ لمحوں کی سرگوشی پر صدیاں کیوں خاموش ہوگئیں۔ صابر فخرالدین، حنیف ترین صاحب کی نظموں میں "ہم کلامی" زیادہ پسند آیا۔

● —— سخاوت شمیم، کوٹ شیلی

★ سہیل کا شمارہ [illegible] کی وصولیابی پر رسید سے مطلع کر چکا ہوں

اداریہ "فن کار کا منصب" نہایت جامع اور پر تاثر ہے۔ مضمون اقبال کا اسلوب و آہنگ" پسند آیا۔ نالندہ ضلع کا مضمون پُر از معلومات ہے۔ غزلیں اور نظمیں جدید عصری حسیت کی آئینہ دار ہیں۔ نسیم بن آسی کا افسانہ "کہاں جانا ہے" ماحول و معاشرہ کا بہترین عکاس ہے۔ اعلیٰ درجہ کی ادبی صحافت کے لئے آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

● —— آفاق فاخری، اعظم گڑھ

★ موقع ملتا ہے تو "سہیل" ضرور پڑھتا ہوں۔ کبھی مکمل کبھی نامکمل اور کبھی صرف آپ کا اداریہ۔ پڑھ کر جو شعر و ادب اور فرد و سماج کے شعور و فکر کو نیا زاویہ عطا کرتا ہے۔ آپ کے اداریوں میں جو خاص بات اور زندگی کی دھڑکن ہوتی ہے وہ کہیں اور نہیں ملتی۔ اگر آپ اپنے تمام اداریوں کو ترتیب وار یکجا کر کے شائع کرائیں تو آپ کا یہ کام ایک سنگِ میل ثابت ہوگا۔

● —— ظفر ہاشمی، جمشید پور

★ "سہیل کا شمارہ ۱ موصول ہوا۔ پسند آیا۔ اس شمارے میں عبدالمنان صاحب کا مضمون "شیخ محمد بخش مجہور اور ان کی تصانیف" تحقیق کرنے والوں کے لئے مددگار ثابت ہوگا۔ آپ نے "عہد عکاس غزلیں" کا سلسلہ شروع کر کے شعراء کے لئے جو گوشہ محفوظ کیا ہے، یہ ایک عمدہ خیال ہے۔ افسانوں میں سید نفیس احمد سنبھلی کا افسانہ "تباہی" قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ نئی کتابوں میں "ڈھانچہ" پر جناب رؤف خیر کا تبصرہ بے لاگ اور کارآمد ہے۔

● —— شیریں اختر، گیا

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے لیبل آرٹ پریس شاہ گنج پٹنہ سے چھپوا کر دفتر سہیل ریلوے سائیڈ روڈ، گیا سے شائع کیا

سُہیل گیا

ماہنامہ

• چیف ایڈیٹر •

مسعود منظر

• ایڈیٹر •

جمیل منظر

خوش نویس :- سید عبدالاحد گیاوی

شمارہ ۷ جلد ۵۶

بدل اشتراک

فی شمارہ ——— ۵ روپے

زرسالانہ ——— ۵۰ روپے

لائف ممبری ——— ۱۰۰۰ روپے

فہرست

• خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ •

ماہنامہ سہیل

ریورسائیڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱

فون نمبر ۲۱۵۷۳

نمود

تجربہ اور تخلیق

یہ غلط فہمی کچھ عام سی ہو چلی ہے کہ لوگ تجربے کو تخلیق سمجھنے لگے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تجربہ تخلیق تک پہنچنے کی ایک کوشش محض ہے ـــــ اور موجودہ ادبی پس منظر میں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ ایسے تجربات کوشش ناکام کی منزل میں رہ جاتے ہیں تخلیق سابقہ مطالعات، فطری ذوق اور ہنرمندی پر محیط ہے اور تجربہ نئی ہیئتوں اور موضوعات کی طرف لالچ لپک کی ایک نظر ہے۔ تخلیق میں فن کار کی داخلی شخصیت کا سوز و ساز شامل ہوتا ہے تخلیق میں فن کار کے اندرون کی سچائی منعکس ہوتی ہے۔ تجربہ مشق و مزاولت کے درجے سے اکثر و بیشتر آگے نہیں بڑھتا۔ بلا شبہ تخلیق فن کے لئے بھی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ریاضت ایک صوفی اور یوگی کا انہماک ہے۔ تجربہ مولوی کی عبادت ہے، پنڈت کا جپ ہے اور تخلیق عارفوں اور خدا رسیدہ لوگوں کی رسائی ہے۔

آج ہمارے شعر و ادب میں تجربے کے نام پر پیش کی جانے والی متعدد تحریروں کو تخلیق کا درجہ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تخلیق میدان میں بہت سے CHARLATANS (نیم حکیم) ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بے سوزِ دروں جو ادبی نگارشات ایک سیلاب کی طرح سامنے آئی ہیں ان کے نتیجے میں تخلیق کا زوال پیدا ہوا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سچے اور کھوٹے ادب میں امتیاز کر سکیں۔ اگر یہ نہیں ہوا تو ہماری زبان میں تمام تحریروں کا ایک انبار لگتا جائے گا اور ہم رفتہ رفتہ پست سے پست تر ہوتے جائیں گے۔ رسائل کی بھرمار اور اکادمیوں کی اشاعتی امداد کی وجہ سے خام اور ناقص ادب کی ترویج کو بھی تقویت ملی ہے۔

ایسے نازک اور سنگین موقع پر سچے تخلیق کار کو اپنا امتیاز قائم کرنا ہوگا۔ انہیں فیشن کے طور پر تجربہ کرنے والوں اور اس کی بنیاد پر شہرت حاصل کرنے والوں سے بلاشبہ اپنا الگ راستہ نامطلب کی اس پائیدار خدمت کے لئے سستی شہرت اور قبولیت عام سے بچنا ہوگا۔ ہمارے [illegible]

مسعود منظر

پروفیسر قمر رئیس

ترقّی پسندی ۔۔۔ راستے اور منزلیں

اس حقیقت سے آپ حضرات بخوبی واقف ہیں کہ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کی ۲۵ ویں کانفرنس، ارض دکن کے شیراز، حیدرآباد میں، پوری نصف صدی کے بعد منعقد ہو رہی ہے۔ اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس بھی اسی شہر میں اکتوبر ۱۹۴۵ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس حوالے سے اِسے اردو کے ترقی پسند ادیبوں کے جشن سیمیں اور جشن زرّیں کا قرآن السعدین یا سنجوگ سمجھنا چاہیے۔

۱۹۴۵ء کی پہلی کانفرنس، آغاز تحریک کے پہلے دہے میں منعقد ہوئی تھی۔ جب اس کی روایت جڑ پکڑ رہی تھی۔ ادبی اور نظریاتی طور پر اس کی بنیادیں استوار ہو رہی تھیں اس پہلی اور پرشکوہ کانفرنس نے ترقی پسند ادبی تحریک کی شناخت کو نکھارنے اور اس کے آدرشوں کو ہمہ گیر طور پر پھیلانے میں جو کارنامہ انجام دیا وہ ہماری تاریخ کا ایک حصّہ ہے۔ اس کانفرنس کے مذاکرات میں سروجنی نائڈو، ڈاکٹر تاراچند، مولانا حسرت موہانی، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر عبدالعلیم، فراق گورکھپوری، سید احتشام حسین، سید سبط حسن، سجّاد ظہیر، کرشن چندر، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی، ابراہیم جلیس، عابد علی خاں اور کیفی اعظمی جیسے بلند قامت، روشن ضمیر، ایثار نفس اور خلوص پرور دانشوروں اور تخلیق کاروں نے حصہ لیا تھا۔ آج نصف صدی بعد، ترقی پسند تحریک کے ان بنیاد گزاروں میں (علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی کے علاوہ) کوئی بھی ہمارے درمیان موجود نہیں ہے۔ لیکن ان کی خدمات ان کے صحیفے، ان کے خواب، وہ قیمتی اور تابناک ورثہ ہے جو ہمیں ملا ہے۔ جو نصف صدی تک ہماری رہنمائی کرتا رہا ہے۔

ان بزرگ اور باکمال ادیبوں نے ہمیں بتایا کہ حب الوطنی اور آفاق گیر انسان دوستی میں کوئی مغائرت نہیں ہے۔ دونوں جذباتی سطح پر ایک دوسرے کا تکملہ کرتے ہیں۔ یہ ادیب انسان کے ضمیر ـــــ زندہ ضمیر کی علامت تھے۔ اس زمین پر کہیں بھی انسان کا لہو بہا ہو۔ اس پر ظلم و تشدد ہوا ہو، وہ تڑپ اٹھتے تھے وہ ظلم و استحصال، محکومی اور غلامی کی ہر شکل سے نفرت کرتے

تھے اور ان کا ضمیر اس سے کسی مفاہمت کے لئے آمادہ نہ
تھا۔ وہ بڑی سے بڑی طاقت سے، بڑی سے بڑی قیمت
پر بھی اپنی آزادئ فکر اور ندائے ضمیر کا سودا روا نہیں
رکھتے تھے۔ مختلف نظریوں اور عقیدوں سے وابستگی
کے باوجود وہ جس تحریک سے جڑے تھے وہ غلامی اور
جبر و بیداد کی سفاک طاقتوں کے خلاف، زیردستوں
کی عالمگیر تحریک کا ایک حصہ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ
ہی اپنے کروڑوں ہم وطنوں کو بھی، جن کی دکھوں بھری
زندگی ان کے سامنے تھی، وہ غلامی کی ذلت، افلاس
احتیاج، بھوک، قحط، جہالت اور ہلاکت خیز مہلک
وباؤں کے عذاب سے نجات دلانے کے خواب دیکھ رہے
تھے۔ ان میں سے کچھ خوابوں کی تعبیر انھوں نے دیکھی
لیکن ان کے بہت سے خواب بھی ان کی وراثت کے
ساتھ ہمیں ملے ہیں۔ جو آسیب کی طرح ہمارا پیچھا کر
رہے ہیں۔

ان بزرگوں نے ترقی پسند فکر و دانش کا جو
دیا روشن کیا تھا اس کے اجالے آج بھی ہمیں زندگی کی
المناک سچائیوں کا ادراک بخشتے ہیں اور اکثر ہمارے
وجود کو اضطراب، احتجاج اور غم و غصے کی تمازت سے
بھر دیتے ہیں۔ اس کے لئے ہم ان کے منت گزار ہیں لیکن
ہمیں دیکھنا اور سوچنا ہے کہ کیا ہم ان کی روایت کا تحفظ
کرنے یا زندگی کے بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں میں
اسے ایک نئی پہچان دینے میں کامیاب ہو سکے ہیں؟
کسی تنظیم یا انجمن کے معتمد عمومی کی رپورٹ
بالعموم انجمن کی سرگرمیوں اور کارگزاریوں پر مشتمل ہوتی
ہے۔ لیکن ہماری انجمن کا نہ کوئی باضابطہ دفتر ہے نہ
عملہ۔ نہ مالیہ نہ رجسٹر۔ اور نہ ہی اس کی کوئی باضابطہ
رکنیت ہے

ابتدا ہی سے یہ اس کا خصوصی رہا ہے۔ کرشن چندر
مارچ سنہ ۱۹۴۲ء کی دہلی کانفرنس میں انجمن کے جنرل
سکریٹری چنے گئے تھے۔ چودہ سال بعد دسمبر سنہ ۱۹۶۶ء
کی دہلی کانفرنس میں جب وہ انجمن کی سرگرمیوں کی
رپورٹ پیش کرنے کھڑے ہوئے تو، مجھے یاد ہے۔ ان
کے ہاتھ میں ایک قلم تھا۔ اپنی نہایت مختصر رپورٹ میں
انہوں نے کہا کہ جب یہ عہدہ مجھے ملا تو اس کے ساتھ یہ
قلم تفویض ہوا تھا۔ اور بس قلم کا کام لکھنا ہے۔ سو یہ
لکھتا رہا۔ میری کوشش تھی کہ دوسرے ترقی پسند
اہل قلم بھی لکھیں اور بہتر سے بہتر لکھیں۔ جس کی اپنی
ایک شناخت ہو۔ کرشن چندر نے کہا تھا۔ میرے
نزدیک، انجمن ترقی پسند مصنفین کا بنیادی کام یہی ہے
ہم سب جانتے ہیں کہ سنہ ۱۹۸۶ء کے جشن زریں
سے پہلے ملک میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا شیرازہ خاصہ
بکھرا ہوا تھا۔ دہلی میں سنہ ۷۲ء کے بعد سجاد ظہیر صاحب
کی تحریک اور خاکسار نیز ڈاکٹر اجمل اجملی مرحوم کی کوشش
سے اس کے کچھ جلسے اور مذاکرے ضرور ہوئے لیکن
یہ ایک خاص اور جارحانہ طرز کی "جدیدیت" کے فروغ
کا زمانہ تھا اور نوجوان ادیب ہمارے فورم کے قریب
آتے ہوئے تامل کر رہے تھے۔ لیکن جب ہم نے "ادب
اور عصری آگہی" کے نام سے دو روزہ سیمینار کیا اور معاصر
زندگی کی کشیدگیوں کو ادب سے ہم آہنگ بنانے پر
زور دیا تو اس کی کامیابی نے بہت سے جوان العمر اور
سلجھے ہوئے ادیبوں میں جوش اور حوصلے کے آثار نظر

آئے۔ یہ وہ ادیب تھے جو سنگ بند جدیدیت ... کے نعروں کے تنگ حصار سے باہر زندگی کو انہی کے ہزار شیوہ و رنگ میں دیکھ رہے تھے۔ اور پھر ۱۹۶۳ء کے اوائل میں جب دہلی سے خاکسار اور بشیر بدر کے زیر اہتمام ماہنامہ عصری آگہی جاری ہوا تو جدید احساس فکر رکھنے والے بہت سے ادیب اس میں آزادی سے لکھنے لگے۔ یہی کام نئے دائرے میں کتاب، لکھنؤ (مدیر عابد سہیل) اور عصری ادب دہلی (مدیر محمد حسن) بھی انجام دے رہے تھے۔ کچھ عرصہ قبل علی سردار جعفری نے بھی بمبئی سے گفتگو کا اجرا کر کے ترقی پسند اور نوجوان ادیبوں کے لئے ایک فورم مہیا کیا تھا۔ اس کے ماسوا ماہنامہ سہیل گیا بھی تحریک کا ترجمان پہلے سے

ایسے ہی منظر کے ساتھ ۱۹۸۶ء میں جب بمبئی الہ آباد، لکھنؤ، حیدرآباد، جے پور، مالیگاؤں، دہلی اور بعض دوسرے شہروں میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جشن زریں منایا گیا (خصوصاً دہلی میں جب ۲۶ تا ۲۸ دسمبر ۸۶ء جشن زریں کی سہ روزہ تقریبات ہوئیں) تو ان جلسوں اور مذاکروں میں نوجوان ادیبوں نے بھی خاص جوش و خروش سے حصہ لیا۔ اس سلسلے کا آغاز ۱۹۸۵ء میں ہوا تھا جب لندن کی انجمن ترقی پسند مصنفین نے اگست میں تین دن تک انجمن کا جشن طلائی منایا۔ ان تقریبات کا اہتمام سید عاشور کاظمی، فارغ بخاری، بخش لائلپوری، اور جاوید حکیم قریشی نے کیا تھا۔ ہندوستان سے اس سہ روزہ جشن میں ملک راج آنند، کرتار سنگھ دگل، علی سردار جعفری، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر سید عقیل رضوی، پروفیسر نامور سنگھ، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، فضل امام، پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر ش۔ اختر، پروفیسر نریش، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر شفیقہ فرحت، اور ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے شرکت کی۔ ان کے علاوہ پاکستان، امریکہ، سوویت یونین، ناروے، فرانس اور بعض دوسرے ملکوں سے بھی ممتاز ادیبوں نے اس جشن کی تقریبات میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ یہ بین الاقوامی نوعیت کا بہت بڑا اور بہت یادگار اجتماع تھا جس کی کامیابی کی گونج ہند و پاکستان کے وسیع تر ادبی حلقوں تک پہنچی اور پاکستان کراچی میں ۱۹۵۲ء کے بعد پہلی بار (پابندی کے باوجود) ترقی پسند ادیبوں کی ایک عظیم الشان کانفرنس جشن طلائی کے نام سے مارچ ۱۹۹۶ء میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے سربراہوں میں سید سبط حسن، مجنوں گورکھپوری، شوکت صدیقی اور سوبھو گیان چندانی (سندھی) جیسے اکابرین کے نام تھے۔ اور جس میں اردو، سندھی، پنجابی، سرائیکی اور بلوچی ادب کے ہر پیڑھی کے جانے مانے ادیبوں نے جوش کے ساتھ شرکت کی۔ اس کانفرنس کے شرکاء نے آزادی، اعتماد اور استدلال کے ساتھ اس حقیقت کو جتایا کہ پاکستانی ادب کا مقتدر اور غالب رجحان آج بھی ترقی پسندی کا رجحان ہے۔

اس منظرنامہ کے حوالے سے، میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کے بارے میں صرف چند باتیں مزید کہنا چاہوں گا۔

اس انجمن کی پچھلی کانفرنس ۲-۳-۴ مارچ ۱۹۹۴ء کو دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس کے تین اجلاس خاص تھے

۱۔ ادب میں کمٹمنٹ کے نئے تناظر
۲۔ ترقی پسندی کی معنویت اور عصر حاضر
۳۔ سیکولرزم کو درپیش خطرات اور ادیب

ان اجلاسوں میں پڑھے جانے والے پرچوں میں جو سوالات اٹھائے گئے تھے ان پر زوردار بحث

ئی۔ اس کی روداد ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے رپورتاژ کی
شکل میں لکھی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس اجتماع
اٹھائی گئی بحثیں صرف کانفرنس تک محدود نہیں رہیں
اس سے باہر ادبی حلقوں میں دور دور تک پہنچیں۔

اس کی ایک قرارداد کے مطابق ماہنامہ "عصری
ہی کی' سہ ماہی کی شکل میں دوبارہ اشاعت شروع
گئی اور چند شماروں کے بعد اس کا نام 'نیا سفر'
دیا گیا تھا۔

انجمن کے سکریٹری ارتضیٰ کریم نے دہلی کے نوجوانو
ں قلم ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر ابن کنول۔ ڈاکٹر جلال انجم
ڈاکٹر خالد علوی کی شرکت سے قلم زاد، کے نام سے نوعمر
یبوں کی انجمن بنائی تھی اس کے جلسے بھی وقفہ وقفہ
سے ہوتے رہے۔ اس کی آخری کارگزاری ۲۹ اکتوبر ۹۴ء
نامور ادیب کلام حیدری پر ایک روزہ سیمینار تھا۔

استقبالیہ اور کتابوں کی رونمائی کے جلسوں
علاوہ انجمن نے گزشتہ چند برسوں میں دو اہم موضوعات
سیناروں کا اہتمام کیا۔

جوش ملیح آبادی ترقی پسند تحریک کے سربراہوں
ں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ترقی پسند شعراء کی پہلی صف
باغیانہ اور احتجاجی لہجہ کے تعین میں جوش کی شعریات
اہم رول ادا کیا تھا۔ لیکن ۱۹۵۵ء میں ان کے ترک
ن کے بعد ہندو پاکستان دونوں ملکوں میں ان کے
لاف بے رخی کا ایک معاندانہ ماحول پیدا ہو گیا تھا
س کو سکہ بند 'جدیدیت' کے بعض علم برداروں نے
زندہ ہوا دی۔ اس طرح جوش کو علامت بنا کر بالواسطہ
رقی پسند شعری روایت کو ہدف ملامت بنایا گیا۔ ہم
نے اپنے مذاکروں اور جریدوں میں جہاں نامور ان
جدیدیت کے دوسرے حملوں کا مدلل جواب دیا تھا
وہاں اس کی ضرورت بھی محسوس کی کہ جوش کی تخلیقی
ذہانت اور فکری و شعری کاوشوں کا علمی اور تحقیقی نقطہ
نظر سے جائزہ لیا جائے تاکہ نئی پیڑھی ان کے جوہر کی اصل
قدر و قیمت کو سمجھ سکے۔

اس مقصد سے ہم نے ۱۷، ۱۸، ۱۹ اپریل ۱۹۹۴ء
کو دہلی میں ایک سیمینار کیا۔ اس میں پڑھے جانے والے
سارے مقالے 'نیا سفر' کے خاص نمبر کی صورت میں شائع
ہو چکے ہیں، اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں اپنے مقصد میں کچھ
کامیابی ضرور ملی ہے۔

دوسرے سیمینار کا موضوع بھی بڑی معنویت
کا حامل تھا جو ۲۸ مئی ۹۴ء کو منعقد ہوا۔ ۱۹۹۲ء
میں سوویت یونین کا انہدام اور مشرقی یورپ کی اشتراکی
ریاستوں کا خاتمہ، اس ڈوبتی صدی کے اہم ترین
واقعات میں سے ایک ہیں۔ اس کے دوررس اثرات نہ
صرف دنیا کی سیاست اور معیشت میں ہویدا ہوئے
بلکہ فکر و دانش اور فن و ادب کی سطح پر بھی محسوس
کئے گئے۔ اس کے نتیجے میں ایک قطبی نظام وجود
میں آیا اور امریکی سامراج ساری دنیا میں اپنی حاکمیت
اور بالادستی کے منصوبے بنانے لگا۔ اشتراکی ملکوں
کی کمزوریاں اپنی جگہ لیکن ان ملکوں میں اشتراکیت
کے نام پر جو معاشرے بن رہے تھے انھوں نے
انسان کو صدیوں کے استحصال، جبر و محکومی، پسماندگی
اور وحشیانہ اونچ نیچ کی زنجیروں سے آزادی کے
خواب دکھائے تھے۔ ان خوابوں کی مدھم روشنی

نے ہمارے شعور و ادب کے نئے گوشوں کو منور کیا تھا اسے انسانی دکھ درد سے کچھ قریب کر دیا تھا۔

پھر سامراجی ملکوں کی پروپیگنڈہ مشین یہ دعویٰ بھی زور شور سے کرتی رہی ہے کہ سوویت یونین کا انہدام گویا مارکسی نظریہ کی شکست ہے۔ جو عقلی اور منطقی طور پر بھی غلط ہے۔ بہرحال، اس سیمنار میں ان اہم سوالوں پر بڑی بیباکی اور آزادی سے کھل کر اظہار خیال کیا گیا اور پرچے پڑھے گئے۔ بالعموم اس نکتہ سے اتفاق رائے کیا گیا کہ مارکسزم ایک مکمل اور جامع مادی فلسفہ ہے۔ کوئی مملکت اگر اس سے اخذ و استفادہ کر کے اپنے مخصوص تاریخی اور قومی حالات کے تقاضوں کے تحت، اشتراکی معاشرہ تعمیر کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اس میں ناکام رہتی ہے۔ تو اس سے کسی بھی طرح مارکسی فلسفہ باطل نہیں ٹھہرتا۔ اس سیمنار کی بحث اور مقالے بھی 'نیا سفر' ۱۹۹۴ء کے چوتھے شمارہ کی زینت ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کے دوسرے سکریٹری ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے ممتاز پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کے تعاون سے الہ آباد میں انجمن کو خاصہ سرگرم اور فعال بنا رکھا ہے۔ انہیں ہندی کے ترقی پسند ادیبوں کا تعاون بھی حاصل رہا ہے۔ اور الہ آباد میں انہوں نے ہم خیال نوجوانوں کا ایک حلقہ بھی پیدا کر لیا ہے۔ تحریک کے مسائل پر مذاکروں کے علاوہ گزشتہ عرصہ میں انھوں نے سید احتشام حسین اور علی سردار جعفری کی خدمات پر دو بڑے سیمنار بھی کیے: ڈاکٹر محمد عقیل رضوی کی نگرانی میں 'انداز' نام کا ایک جریدہ بھی شائع ہو رہا ہے۔ جو اہم کتابوں پر بے لاگ تبصرہ کے لئے مخصوص ہے یہ انجمن کی عملی سرگرمیوں کا ایک مجمل خاکہ تھا۔ اب میں پھر تحریک کی طرف آتا ہوں

اردو ادب میں جدید تر مغربی رجحانات کی بازگشت تلاش کرنے والے کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ یہ مابعد جدیدیت POST-MODERNISM کا دور ہے — مغرب میں بیسویں صدی کا نصف اوّل یعنی دوسری جنگ عظیم تک کا عہد 'جدیدیت' کا عہد کہلاتا ہے۔ جب انسان نے سائنسی، صنعتی اور اجتماعی ترقی کے اور ایک ایسے فلاحی معاشرے کی تعمیر کے خواب دیکھے تھے جو امن آشتی کا ضامن اور انصاف پر مبنی ہو۔ تاریخی اعتبار سے مغرب میں دوسری جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ مابعد جدیدیت کا زمانہ کہلاتا ہے جب خوابوں کا یہ طلسم ٹوٹ گیا اور سائنسی نیز صنعتی ترقی نے انسان کو لاینحل مسائل کے دام میں اسیر کر لیا اس عہد میں خواب ہی نہیں عقیدے بھی چور چور ہو گئے جدید ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ صورت حال مغربی ادب میں منعکس ہوتی رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ مغرب کی یہ ذہنی اور تہذیبی صورتحال اور سائنسی و صنعتی ترقی، ہندوستانی معاشرے کے ارتقار سے کیسی اور کتنی مناسبتیں رکھتی ہے؟ ہمارا معاشرہ دوسری جنگ عظیم یا آزادی سے پہلے ایک نو آبادیاتی اور جاگیردارانہ معاشرہ تھا۔ جب ہندوستانی عوام بڑے حوصلے سے آزادی کی لڑائی لڑ رہے تھے — وہ انتہائی پسماندگی، افلاس و استحصال کا شکار تھے — یہ آزادی کے چند سال بعد کا زمانہ ہے جب ملک میں صنعتی اور سائنسی ترقی کے دروازے

کھلے۔ زمینداری نظام ختم ہوا اور ایک بہتر زندگی
کے لئے خواہشیں اور امنگیں بیدار ہوئیں۔ ایک طرف
جدوجہد اور آزادئ عمل کے نئے میدان سامنے آئے
تو دوسری جانب خوشحالی اور انسانی شرف حاصل
کرنے کی راہ میں نئے مسائل اور نئی دشواریاں بھی حائل
ہوئیں۔ صرف برصغیر ہند و پاکستان ہی نہیں سارے
ایشیائی ملک نوآبادیاتی نظامی اور اس کے اثرات کا
طوق اتار کر پھینک رہے تھے ـــ فاشزم کی شکست
کے بعد جمہوری طاقتیں اور عوامی تحریکیں سر ابھار رہی
تھیں۔ چین میں سوشلسٹ انقلاب کامیاب ہو چکا تھا
کوریا، ویٹ نام، انڈونیشیا، الجیریا اور دوسرے
افریقی ملکوں میں یہ جنگ جاری تھی۔ اس حوصلہ خیز
دور میں بعض ترقی پسند دانشور نظریاتی انتہاپسندی
کا شکار بھی ہوئے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ عہد ترقی پسند
ادب کا عہد زریں ہی کہا جائے گا۔ نہ صرف فیض بلکہ
سردار جعفری، مخدوم، مجروح، اختر الایمان، جاں
نثار اختر، کیفی، ساحر ـــ اور دوسری طرف ـــ
عصمت چغتائی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی،
منٹو اور خواجہ احمد عباس جیسے فنکاروں نے اپنی
شاہکار اور گراں مایہ تخلیقات اردو کو اسی عہد میں
دیں اور یہی وہ زمانہ ہے جب حیدرآباد اور دوسرے
شہروں سے ترقی پسند تحریک کی نئی کونپلیں پھوٹ رہی
تھیں جو اس کی روایت سے مانوس بھی تھیں اور
منحرف بھی۔ لیکن اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں
ہے۔

آج اس حقیقت کو ثابت کرنے کی ضرورت
نہیں کہ ساتویں دہے میں ایک خاص جدیدیت کے ذریعہ
جس نوع کی جدیدیت کو فروغ دینے کی منظم کوشش
کی گئی اور مغرب کے نظریوں سے اخذ و استفادہ کر کے
جس طرح کی نظریہ سازی عمل میں آئی اس کا نشانہ ترقی
پسند تحریک، اس کی اقدار اور اس کے قد آور نمائندے
تھے۔ وہ مغربی جدیدیت کی طرح ہماری بدلتی ہوئی زندگی
کے حقائق اور مسائل کی ترجمان نہیں تھی۔ اس کے
متشدد رویے نے ایک معاندانہ تحریک کی صورت
اختیار کر لی لیکن چونکہ اس کی بنیاد کمزور اور مستعار
تھی اور تنگ نظری پر استوار تھی اس لئے اس کے اثرات
دو دہوں میں ہی تحلیل ہو کر رہ گئے۔

اس کے برعکس گزشتہ دہوں میں جن خود آگاہ
فنکاروں نے ترقی پسند فکر کے بعض پہلوؤں سے
انحراف کے باوجود اپنی الگ پہچان بنائی اور اپنے
عہد کی سچائیوں سے روحانی اور ذہنی طور پر جڑے
رہے ان کے تخلیقی رویے ترقی پسندانہ یا ترقی
پسند روایت کی توسیع ہی کہے جائیں گے۔

ادب کے افق پر، آزادی کے بعد نمودار
ہونے والی دو پیڑھیوں سے ہمارا جو تعلق اور تفاعل
رہا ہے۔ ان کی جو نگارشات اور تخلیقی تجربات
ہمارے سامنے ہیں وہ اس حقیقت کا ثبوت ہیں
کہ آج کی ترقی پسندی ایک نئی شناخت کی متلاشی
ہے۔

گزشتہ دہے میں ترقی پسند ادیبوں کے
سامنے ایک اور چیلنج بھی آیا ہے۔ وہ ہے، مغرب
کے ساختیاتی اور پس ساختیاتی نظریات۔ ان کے

بارے میں یہ خیال عام ہے کہ یہ زبان و ادب کے
بعض ہی ترقی پسند نظریات کی تکذیب کرتے ہیں
[illegible] میں ترقی پسند نقاد ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے
ساختیاتی فکر خصوصاً سائیسر کے نظریۂ لسان کا اردو
میں پہلی بار تنقیدی تعارف کرایا تھا۔ اس کے بعد
ان نظریات کی تشریح و تعبیر میں کچھ اور مضامین لکھے
گئے۔ حال ہی میں عملی تنقید میں بھی ان کو برتنے کی کوشش
ہوئی ہیں۔ مغرب میں ساختیاتی اور پس ساختیاتی نظریہ
سازی میں، لوسیاں گولڈمان، ٹیری ایگلٹن، لوئی
التھوسے اور پیری ماشرے جیسے مارکسی عالموں
کا اہم حصہ رہا ہے۔ اور خود ژاک دریدہ کے بعض
تصورات بھی مارکسی اثر سے خالی نہیں۔ اس میں شک
نہیں کہ یہ مباحث خاصے دقیق اور تجریدی فکر کے حامل
ہیں۔ ان کی تفہیم کے لئے لسانیاتی، بشریاتی اور فلسفیانہ
مسائل اور مقدمات پر بھی نظر ضروری ہے۔ تاہم جہاں
تک ادب اور تنقید کے حوالے سے اس نظام فکر
کے عمومی مباحث یا حاصلات کا تعلق ہے چند
باتیں ضرور کہی جاسکتی ہیں۔

اول یہ کہ ساختیات اور پس ساختیات
کے مباحث نے متن کی معنویت اور کثیر المعنویت
پر زور دیکر، اس ہیئت پرستانہ، نئی تنقید پر خط
تنسیخ کھینچ دیا جس کی تشہیر جدیدیت کے علمبرداروں
نے زور و شور سے کی تھی۔ ان کا نشانہ متن اور
صرف متن تھا اور بھی شاعری کا۔ تخلیق کی معنویت
اس کے سماجی اور تہذیبی محرکات، تاریخی عوامل
اور فکری و نفسیاتی ماخذوں سے انہیں کوئی
سروکار نہیں تھا اور اس طرح بزعم خویش انھوں
نے مارکسی یا سماجیاتی تنقید کو رد کر دیا تھا۔ ساختیاتی
اسلوب تنقید میں متن کے معنی اور اس کے بین السطور
میں پنہاں دوسری معنوی جھلکیاں کو قابل اعتنا
سمجھا گیا۔ دوسرے یہ کہ 'نئی تنقید' یا اردو کی 'جدیدی
تنقید میں لفظی پیکروں، علامتوں اور استعاروں کے
تحلیل و تجزیہ کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ جس کا تعلق تخیل
کی کارفرمائی سے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کا تعلق
اس کے عام قاری سے اور اس کی فہم و فکر سے بڑی
حد تک منقطع ہو گیا۔ ساختیاتی تنقید، خاص طور پر
اس کے مارکسی مفسرین نے اس رشتہ کو نئے انداز
سے بحال کرنے کی کوشش کی اور متن کے مطالعہ میں
تہذیبی اور سماجیاتی سیاق کے حوالوں پر زور دیا۔
جس کے کچھ پہلو بحث طلب بھی ہیں۔

یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ ضروری
ہے کہ مغربی معاشرہ کے ارتقائی مرحلے اور اس کے
مسائل اور تضادات ہمارے سماج سے مختلف رہے
ہیں اس لئے ان کے تخلیقی اور تہذیبی دھارے بھی اپنی
رسائی، گہرائی اور اندرونی کیفیت کے لحاظ سے ایک مختلف
سطح کو پیش کرتے ہیں۔ ان کی نظریہ سازی کے عمل کا محرک
بھی اکثر اسی صورت حال کی تفہیم و تعبیر ہوتا ہے۔ اس کا
یہ مطلب نہیں کہ ہم انھیں یکسر نظر انداز کر دیں۔ زبان
اور کلچر کے تفاعل اور تشکیل کے بارے میں ان کے بعض
نظریے، سائنسی دریافتوں کی طرح آفاقی معنویت
رکھتے ہیں۔ تاہم شعر و ادب کا تعلق چونکہ کسی بھی قوم کی تہذیبی
تاریخ، جمالیات اور فکری روایت سے گہرا ہوتا ہے۔

اس لئے اس میدان میں کسی نظریہ کے رد و قبول یا
اطلاق میں بڑی احتیاط اور غور و تامل کی ضرورت ہے۔
مثلاً رولاں بارتھ نے اپنے مشہور مضمون ۔ THE
DEATH OF THE AUTHER ۔ میں اس تصور کو
قطعیت سے رد کیا ہے کہ تخلیق یا متن کے معنی کا ماخذ
مصنف ہوتا ہے۔ اس کے مطابق ضروری نہیں کہ قاری اس
تجربہ یا خیال میں شریک ہو جو مصنف نے ادا کیا ہے
یا ادا کرنے کی کوشش کی ہے اس کی اس قول کی تشریح
بھی بار بار کی گئی ہے کہ ادیب نہیں، لکھت لکھتی ہے۔
WRITING WRITES NOT AUTHER. رولاں
بارتھ اور اس کے ہم مسلک اس طرح مصنف کی نفی
کر کے متن یا تخلیق کے معنی کا تعین کرنے کا سہرا
قاری کے سر باندھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا
مصنف ایک بے شعور اور مجہول آلہ ہے؟ کیا وہ
اپنی تخلیق میں موجود نہیں ہوتا اور اس کے وسیلے سے
کسی خیال کی ترسیل کرنا نہیں چاہتا؟ کیا اب زبان
معنی و خیال کی ترسیل کا ذریعہ نہیں رہی؟ ساختیاتی
نظریات میں اس طرح کے کئی اہم مباحث ہیں جن
پر ہمیں اپنے ادب کی روایت کے تناظر میں غور کرنا
ہے۔ اس سلسلے میں یورپ کے مارکسی نقادوں کے
خیالات کو بھی خواہ مخواہ کتنے ہی ریڈیکل ہوں، آنکھیں
بند کر کے مانا نہیں جا سکتا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ انھوں
نے ادب میں نظریہ اور سیاسی عوامل کی اہمیت کو
ماننے اور منوانے کی سعی کی ہے۔

یہی وہ پہلو ہے جس نے ساختیاتی فکر کے
زیر سایہ، نو تاریخی تنقید، اور تانیثی یعنی فیمنسٹ
تنقید کی ہمہ گیری کی ہے۔ یہ دونوں رویے ادب کو
انسانی معاشرہ کی وسیع تر ساخت اور اس کے
بنیادی عوامل یعنی سیاست اور نظریاتی آویزش
سے جوڑتے ہیں۔ جو ترقی پسند ادب کی فکری اساس
کا ایک حصہ رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ترقی پسند ادیب
وسیع مطالعہ اور معروضی غور و فکر کے ذریعہ اس چیلنج کا
سامنا کر سکیں۔

آج کے نوجوان ادیب اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ
عہد حاضر میں ترقی پسندی کی ترجیحات کیا ہیں؟ کیا
کسی خاص نظریہ سے غیر مشروط طرفداری کا نام ترقی
پسندی ہے؟ یا یہ ایک روشن اور متفاوت تو ہی رویہ ہے
جو زندگی کی سچائیوں کی تلاش میں جاری و ساری رہتا ہے؟
اگر ایسا ہے تو یہ رویہ ایک فلسفی اور سائنٹسٹ کے
رویے سے کیونکر مختلف ہوگا؟ کہ وہ بھی سچائیوں کی
تلاش کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک ادیب
اور تخلیق کار کا ذہنی رویہ ان سے اپنے بنیادی حوالوں
میں مختلف ہے اور ہونا چاہیے۔ ان کی تلاش و تحقیق
کا محرک علمی ہے جب کہ ایک تخلیق کار کی فکر و تشویش
کا مرکز انسان کی ذات ہے۔ اس کی فلاح، آسودگی،
آشتی اور آزادی ہے۔ اس طرح انسان دوستی
ہی اس کا بنیادی حوالہ ٹھہرتا ہے۔ لیکن آج کی یہ
انسان دوستی عہد ماضی کی انسان دوستی سے اس
لئے مختلف ہے کہ اس کا سرچشمہ مذہب، روایتی اقوال
اور وجدان تھا، جبکہ صنعتی عہد کی انسان دوستی
کو فروغ دینے میں تمام بشری، عقلی اور سائنسی علوم
اور نظریات نے مدد بہم پہنچائی ہے۔ گویا یہ نظریہ

اور اس کا اطلاق ترقی پسندانہ ہوگا جو انسان کی آزادی، آسودگی اور فلاح کا ضامن ہو۔ جو اس کو صدیوں سال کے استحصال، ظلم، احتیاج زیردستی اور نابرابری کی اذیت سے نجات بخشنے کے امکانات رکھتا ہو، اس لئے ذاتی طور پر میں کل بھی نہیں، آج بھی اشتراکی نظریہ کو حرز جاں بنائے ہوئے ہوں کہ پچھلی صدیوں میں جو نظریئے انسان نے خلق کئے ہیں ان میں اشتراکی نظریہ سب سے بڑھ کر، انسان دوستی اور دردمندی کا حامل ہے۔ لیکن خود انسان تو اپنے خلق کئے ہوئے اس نظریہ سے بھی ارفع، اشرف اور افضل ہے۔ اس لئے اس نظریہ یا اس کے اطلاق سے وفاداری انسان سے وفاداری پر مرجح نہیں ہو سکتی۔ چند مثالیں لیجئے۔

سابق سوویت یونین میں اسٹالن کے دور اقتدار میں انسانی حقوق اور آزادیوں کو وحشیانہ ڈھنگ سے پامال کیا گیا۔ انسانوں پر نظریہ کے نام پر بہیمانہ ظلم روا رکھا گیا۔ ۱۹۴۲ء میں سرخ فوج کے طیاروں نے چیچنیا کی بے گناہ آبادی پر ہزاروں بم برسائے۔ اور پھر ۱۹۴۴ء میں چیچنیوں، بشکیریوں اور شمالی قفقاز کی خودمختار مسلم قومیتوں کے لاکھوں انسانوں کو مال بردار گاڑیوں میں حیوانوں کی طرح بھر کر دور دراز کے علاقوں میں اس لئے بھیجا گیا کہ ان پر نازی ہٹلر کی امداد کا شبہ تھا (حالانکہ ہٹلر کی فوجوں نے کبھی اس خطہ میں قدم نہیں رکھا) تو ان المناک واقعات کی جن ادیبوں نے حمایت کی یا جان کر خاموش رہے ان کا یہ رویہ ترقی پسندی کے بجائے مصلحت کوشی اور بے ضمیری کا مظہر ہی کہا جائے گا۔

اسی طرح ۱۹۷۴ء کی ایمرجنسی کے دوران جن ادیبوں نے (خواہ وہ کسی نظریہ سے وابستہ رہے ہوں) اس انسان دشمن اقدام کی حمایت کی کسی طرح ترقی پسند رویے کا نام نہیں دیا جا... اس کے برعکس جن ادیبوں نے جبر و بیداد... اس برہنہ مظاہرے کے خلاف احتجاج کیا، ... (خواہ ان کا تعلق کسی نظریہ سے رہا ہو) ان... اقدام ترقی پسندی اور انسان دوستی کا رویہ ہی... گا۔

عصر حاضر کے ادیب، بجا طور پر سمجھتے ہیں... پسندی کا رویہ مستقل بالذات نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی بندھا ٹکا فارمولہ ہے۔ وہ کسی... حمایت یا کسی خاص نظریہ سے وابستگی او... داری کبھی نہیں ہے بلکہ یہ ایک متحرک، فعا... رویہ ہے جو آج کی بدلتی ہوئی پیچیدہ زندگی... شرف انسانی کو درپیش ہر خطرے کو سمجھتا... کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ یہ رویہ اپنے... میں خود ایک مزاحمت ہے۔ ایک بغاوت... دیوار ہے ان استحصالی طاقتوں کے خلا... جو اپنے مفاد کے لئے، آج بھی، انسانوں کو... اور بدترین عذاب شکنجوں میں اسیر کرتی ہیں۔

مظہر امام
دہلی

خیالات

• آل احمد سرور

میں آل احمد سرور کو آج کے اردو ادب کا ضمیر سمجھتا ہوں۔ وہ ایک بلند پایہ نقاد، ایک بڑے مفکر اور دانشور ہیں۔ اردو ادب اور شاعری کی پرکھ اور تفہیم کے لئے جس شعور، معروضیت اور مذاق سلیم کی ضرورت ہے وہ موجودہ دور میں آل احمد سرور سے زیادہ کسی اور کو میسر نہیں۔ ان میں آج بھی جاننے، دیکھنے بھالنے اور سیکھنے سمجھنے کی خواہش مردہ نہیں ہوئی ہے۔ انسانیات (...) یعنی عمرانیات، نفسیات، فلسفہ، تاریخ، فنون لطیفہ وغیرہ کی بابت ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ وہ کسی نئی ادبی تحریک، اور رجحان سے مخاصمت نہیں برتتے۔ وہ اسے صحیح تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تخلیق کار کی حیثیت سے بھی انہوں نے اپنے ہم عصر ناقدوں کے مقابلے میں بہتر شاعری کی ہے۔

آل احمد سرور مزاج کے اعتبار سے مشرقی ہیں اور دماغ کے اعتبار سے مغربی اصولوں، نظریوں اور تجربوں سے مدد لینا مفید سمجھتے ہیں۔ مگر وہ اپنے تہذیبی سرمائے کے قابل قدر حصوں کو اتنے ہی احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ سرور صاحب بہ اک وقت دل، دماغ اور مذاق کی اعلیٰ اور پاکیزہ صفات اور صلاحیتوں کے ساتھ ایک محکم، متوازن اور توانا شخصیت کے مالک ہیں۔ شخصیت، جو اپنے اندر بڑا گداز بڑی دلآویزی اور بڑی انفرادیت رکھتی ہے!

• اعجاز صدیقی

اعجاز صدیقی سے میرے مراسم کی ابتدا ۱۹۵۲ء میں ہوئی تھی۔ جمشید پور کے ایک مشاعرے میں پہلے پہل میرا ان کا آمنا سامنا ہوا۔ اس مہینے میری ایک نظم "شاہراہ" میں چھپی تھی۔ اعجاز صاحب نے کہا۔ "آپ نے کبھی شاعر کے لئے نہیں لکھا۔ میں آپ سے نظم کے لئے مطالبہ کرتا، لیکن آپ نے تو اتنے "شاہراہ" کو دیدیا ہے۔" اس جملے میں ایک محبت آمیز شکایت تھی اور حسن طلب بھی۔

اس کے بعد سے میں "شاعر" میں باقاعدگی سے لکھنے لگا خاص طور پر اس کے خاص نمبروں میں۔ اعجاز صاحب مجھے چائے سے، بڑی محبت سے، اصرار کر کے لکھواتے تھے۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ اگر اعجاز صاحب کا پیہم اصرار شامل حال نہ ہوتا تو میں اپنی بہت سی نظمیں، غزلیں خصوصاً نثری مضامین نہ لکھ پاتا۔ کرشن چندر، پرویز شاہدی اور سلام مچھلی شہری پر مضامین میں نے ان کی فرمائش پر ہی لکھے تھے۔

اعجاز صدیقی شاعر تھے۔ ادبی جریدے کے مدیر تھے۔ اردو زبان کے مجاہد تھے۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرنے کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ بحیثیت مدیر ان کا درجہ بہت اونچا ہے۔ اس صدی میں چند مدیران کی مستقل اہمیت ہے ان میں مولانا عبدالحلیم شرر، سر عبدالقادر، مولانا صلاح الدین احمد، تاجور نجیب آبادی، نیاز فتح پوری، شاہد احمد دہلوی، اعجاز صدیقی، اور محمد طفیل جیسے نام آتے ہیں۔ میری ادبی شخصیت کی تشکیل میں جن مدیروں نے معتدبہ حصہ لیا ہے، ان میں مخمور جالندھری، فکر تونسوی، نیاز فتح پوری، محمد طفیل اور اعجاز صدیقی کے نام سب سے اہم ہیں۔ اور ان میں سے میں اعجاز صدیقی کا سب سے زیادہ احسان مند ہوں۔ اعجاز صدیقی کو خاص نمبر مرتب کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ اس میدان میں محمد طفیل (ایڈیٹر "نقوش") کے علاوہ کوئی ان کا حریف نہیں تھا۔

اردو زبان سے ان کو محبت تھی۔ اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے کا جو حوصلہ تھا۔ اس محبت کے نام میرے حرف کی عقیدت شاعری نذر کی جا سکتی ہے۔ جس دلیری کے ساتھ انہوں نے اردو کا مقدمہ لڑا۔ بڑ لڑتے لڑتے جان دیدی۔ وہ انہیں زندہ جاوید رکھنے کے لئے کافی ہے۔

عجاز صدیقی نامساعد حالات کا شکار رہے، صحت کی خرابی نے انہیں ہمیشہ پریشان رکھا۔ لیکن وہ آخر دم تک محنت سے نہیں تھکے۔ ان میں جو عزم و ہمت تھی، جینے کا جو ولولہ تھا۔ اس سے میں ہمیشہ متاثر ہوا ہوں، اور اس سے خود مجھے بڑا حوصلہ ملا۔ انسانیت، محبت اور مروت ــــ آج کے دور میں بھی زندہ ہے۔ اس کا احساس مجھے اعجاز صدیقی سے مل کر اور ان کے خطوط سے برابر ہوتا رہا۔

• باقی

باقی کی شاعری ایک بالکل نئے ذائقے سے آشنا کراتی ہے۔ نئی امیجری، نئے پیکر، نئی تازہ کار ترکیبیں، الفاظ کا تخلیقی اور جدلیاتی استعمال ــــ یہ ہے ان کی غزل کی خصوصیات۔ ان کے یہاں محض منطقی اظہار نہیں۔ وہ الفاظ کے مزاج داں ہیں۔ وہ بندھے ٹکے راستوں پر چلنا نہیں چاہتے۔ وہ روایت سے استفادہ ضرور کرتے ہیں لیکن غزل کی گھسی پٹی لفظیات سے عموماً اجتناب کرتے ہیں

راج نرائن راز نے انہیں "تکلف کا شاعر" کہا ہے۔ میرا خیال ہے وہ اس شعوری صناعی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو باقی کے اشعار میں نمایاں ہے۔

باقی اظہار کے نئے پن کے تلاش میں ہیں۔ کبھی کبھی وہ اس دھن میں معنویت کو مجروح کرنے سے بھی احتراز نہیں کرتے [illegible] کا خیال ہے [illegible] تازگی کا احساس

دلاتے رہنا چاہئے۔ اس لئے وہ مانوس بحروں کو چھوڑ کر
غیر مانوس یا کم از کم نیم مانوس بحروں کا سہارا لیتے ہیں اور
اس کو غلطی سے تازگی سمجھ لیتے ہیں۔ دراصل وہ ہمیشہ
اپنا پاؤں اگلے پانی میں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ دیکھے بغیر کر
اگلا پانی بہت گہرا بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس میں ڈوبنے
کے بھی امکانات ہیں۔

پیہم موج امکانی میں
اگلا پاؤں نئے پانی میں

ناصر کاظمی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی
اداسی کو ایک پوری تہذیب کی آواز بنا دیا ہے۔ باقی کے
یہاں نشاطیہ پہلو نمایاں ہے اور وہ اس پہلو کو ہی ہمارے
نئے معاشرے کی آواز بنانا چاہتے ہیں۔

چھو سکے گی اب نہ میرے ہاتھ طوفانی ہوا
جس دیئے کو میں جلا دوں گا وہ جلتا جائے گا

ان کے یہاں احساس زیاں بھی نشاطیہ پیکروں میں
طلوع ہوتا ہے:

باقی کے اشعار آسانی سے یاد ہو جاتے ہیں۔ کچھ
اشعار بے ساختہ حافظے سے وارد ہو گئے۔

شب وہاں تذکرۂ کم ہنراں تھا کتنا
کیا چمکتا کوئی شعلہ کہ دھواں تھا کتنا

کسی کے لوٹنے کی جب صدا سنی تو کھلا
کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی سفر میں تھا

کبھی ہوں تیری خموشی کے کٹتے ساحل پر
کبھی میں لوٹتی آواز کے بھنور میں تھا

آج رکھا ہے پہلی بار تونے ہاتھ پر
لمس اوّل کی لذت کو محفوظ کر

پھر نہ کہنا فلک خوش لقا اور نہ تھا
پھر نہ کہنا زمیں خوبصورت نہ تھی

عجیب لوگ ہیں، کچھ کہہ دو، مان لیتے ہیں
ہوا ہوں زیر بہت زود قائلوں سے میں
کہو تو ساتھ بہا لے چلوں یہ دکھ بھرے شہر
گذر رہا ہوں عجب خستہ ساحلوں سے میں

وہ ٹوٹتے ہوئے رشتوں کا حسن آخر تھا
کہ چپ سی لگ گئی دونوں کو بات کرتے ہوئے

لباس اس کا علامت کی طرح تھا
بدن روشن عبارت کی طرح تھا

کوئی بھولی ہوئی شے طاقِ ہر منظر پہ رکھی تھی
ستارے چھت پہ رکھے تھے، شکن بستر پہ رکھی تھی

● پورن سنگھ ہنر

پورن سنگھ ہنر ہمارے ان بزرگ شاعروں میں
ہیں جنہیں اپنے جذبات و محسوسات کو ہنر مندی سے پیش
کرنے کا غیر معمولی سلیقہ ہے۔ ان کا طرز اظہار نہایت سنجیدہ
پاکیزہ اور مودب ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں ایک ایسی
روانی، بے تکلفی اور بے ساختگی ہے کہ ان کے اشعار
پڑھتے یا سنتے ہی بے اختیار منہ سے واہ نکلتی ہے۔
پورن سنگھ ہنر کے محرکات شعری کے بارے میں جب
بھی میں نے سوچا ہے مجھے ہمیشہ ایسے دردمند دل کی

گداختگی کا خیال آیا ہے جو ساری کائنات کے دکھوں کو اپنے دکھوں میں سمیٹ لینے پر قادر ہو۔

پورن سنگھ ہنر کی شاعری کو جدید اصطلاحوں کی روشنی میں پرکھنا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن ان کا کلام ان تجربات سے عاری نہیں، جن کا تعلق آج کی عصری زندگی سے ہے۔ ہنر کی شاعری کلاسیکی روایت سے جڑی ہوئی ہے۔ اور اس لئے یہ لب ولہجہ مانوس لگتا ہے۔ ان کے سیدھے سادے اشعار میں بھی ایک رکھ رکھاؤ ہے جو ہماری موجودہ شاعری میں خال خال ملتا ہے۔ پورن سنگھ ہنر کی تمام شاعری ایسے ہی اشعار پر مشتمل ہے۔

وہ رنگ شب ملا، نہ وہ رنگ سحر ملا
نکلا جو گھر سے میں تو نہ پھر اپنا گھر ملا

چند روزہ حیات تھی لیکن
ہم نے کیا کیا سجائے گھر اپنے

زندگی راہ بنا لیتی ہے دریا کی طرح
ورنہ ہم وہ تھے کہ بے سمت سفر پہ نکلے

ہم نے پتھر تو پھینکے بہت اے ہنر
اک ثمر بھی نہ شاخ ثمر سے گرا

جس کے سائے میں آکر لوگ خواب بنتے تھے
آج اس شجر کو بھی اپنے سائے کا ڈر ہے

کس زمانے کی ہم بات کہتے رہے
دن کو دن، رات کو رات کہتے رہے

ہر نظر سے متاع نظر چھن گئی
ہر کسی کی کہی بات کہتے رہے

[illegible]

بقیہ: ایک خط۔ خورشید اکبر کے نام

یوں رفاقتیں ہوئیں تلخ تر کہ جب آیا موڑ جدائی کا
نہ ہماری آنکھ ہی نم ہوئی، نہ تمہاری شکل دھواں ہوئی

ہم جلاتے رہے مقتل میں شہادت کے چراغ
دست قاتل پہ گوارا ہمیں بیعت نہ ہوئی

آپ کی نسل کا ہونے کے باوجود ظفر کا ذہن زیادہ بالیدہ نظر آتا ہے کیونکہ اس کی نگاہ ان سازشوں پر بھی جو اس نسل کی موت کی سازش بھی کرتا ہے اور ان کی موت پر آنسو بھی بہاتا ہے۔ اسی بالغ نظری نے اسے ایک بے نیازی بخش دی ہے جو اسے ہر طرح کے خوف اور حرص سے بالاتر بنا دیتی ہے اور اس کی حق گوئی کسی انعام و اعزاز کو خاطر ہی میں نہیں لاتی۔ اس بالغ نظری اور بے نیازی کے بغیر احتجاج کی لے موثر اور دیرپا نہیں ہوتی کیونکہ نظام اور صورتحال کو قبول کر افراد یا اداروں کی مخالفت کی ہی نہیں جا سکتی۔

[illegible]

شرر غازیپوری
[illegible]

رباب آب

پانی کی بوند بادل کی گود سے نکل کر جب دھرتی کی اور چلتی ہے تو نہ جانے کتنے گمان ویقین کا گرداب اس کو اپنے نرغے میں لے لیتا ہے۔ انگنت وسوسوں، اندیشوں اور کشاکش سے الجھتا ہوا اس کا ذہن کیسے کیسے متضاد خیالوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ کبھی وہ سوچتا ہے اگر وہ دھول میں گرے گا یا آگ میں یا سمندر کے کنارے کسی سیپ کے کھلے منہ میں گر کر موتی بن جائے گی۔ ٹھیک اسی عالم سے میں گزرا تھا جب مجھے کلکتہ چھوڑنا پڑا۔ بحری جہاز ایم۔ وی۔ انڈمان سے میرے سفر کا آغاز ہوا۔ کلکتہ کے خضرپور جیٹی کو رات کے دس بجے جہاز نے الوداع کہا۔ خراماں خراماں شترابی چال چلتا ہوا ہگلی ندی کے سطح آب پر سر ابھارتی ہلکی ہلکی موجوں کو دلارتا چیکارتا ہوئے منزل بڑھتا رہا۔ کلکتہ جیسا عظیم شہر مجھ سے چھوٹ رہا تھا، وہاں کا ادبی ماحول چھوٹ رہا تھا۔

کلکتہ سے انڈمان جاتے وقت بائیں ہاتھ کے کنارے کی زمین سندربن کے سرسبز وشاداب جنگلوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ دور تک ہرے بھرے پیڑ پودوں کا علاقہ پھیلا ہوا ہے۔ یہاں برکھا رت جب مہربان ہوتی ہے تو اک عنائی ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ دھرتی پر جب برکھا کی بوندیں چھم چھم کرتی اترتی ہیں تو احساس ہوتا ہے اندر لوک سے کئی اپسرائیں پاؤں میں گھنگرو باندھے رقص کر رہی ہیں یہاں کی بھیگی بھیگی شامیں، بھیگی بھیگی صبحیں مینکا کا روپ دھارے رشی وشوامتر کی تپسیا بھنگ کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ یہاں کے پیڑ پودے جو انسانی زندگی کے ضامن ہیں انسانی آنکھوں کی پلکوں پر خوبصورت سپنوں کو خوبصورت تعبیروں سے سجاتے ہیں۔ خوابوں کی یہ تعبیریں حسین مستقبل کے دل آویز نغمے گاتی ہیں۔ لیکن آج لوگ آتش کدۂ ایندھن کے لئے ان پیڑ پودوں کے لہو سے اپنے خنجروں کی پیاس بجھاتے ہیں۔ ان کو کاٹ کاٹ کر انسانی زندگی اور فطرت کے بیچ شگاف ڈال رہے ہیں۔ معاشی ترقی کے ہوڑ میں شہر کاری کی طرف بڑھتے ہوئے اپنی تہذیب، اپنے تمدن کا جنازہ

نکال رہے ہیں۔

سندربن سندرتا کا درپن ہے۔ شاید اسی لئے اس کا نام سندربن پڑ گیا لگتا ہے۔ یہ فطرت کا خوبصورت آنچل ہے جس کے سائے میں انسانی جذبات موجزن ہو جاتے ہیں۔ احساسات گوناگوں رنگوں میں رنگ جاتے ہیں۔ روح کا سرشار یہاں اپنے شباب کی رعنائیوں میں قوس و قزح بن جاتی ہیں۔ انسان و کائنات کی ہم آہنگی یہیں تکمیل پاتی ہے۔ یہاں کا گنگناتا ماحول، چہچہاتے ہوئے پرندوں کی اس ڈالی سے اس ڈالی تک پرواز، جنگلی جانوروں کی چنگھاڑ، انسانی حرکت و عمل کی سرگرمیاں۔ ہنگامۂ عالم کے تمام تر عناصر اس بات کے ثبوت ہیں کہ زندگی اپنی تمام مثبت و منفی اداؤں کے ساتھ جلوہ نما ہے۔ ہر شئے میں خدا کی صناعی کی قندیلیں روشن ہیں ہر کیفیت خدا کے قادر مطلق ہونے کی گواہ ہے۔ زندگی کا ہر ماحول اس کی غفاری، ستاری اور جباری کی غمازی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ہگلی ندی جس کے دوش پر سفر جاری ہے، گنگا اور اس کی معاون ندیوں کا مشترکہ روپ ہے۔ روزانہ اس کی تہہ سے منوں مٹی نکال کر اس کی گہرائی بڑھائی جاتی ہے۔ اس کے دونوں کناروں کا درمیانی فاصلہ اتنا کشادہ رکھا گیا ہے کہ بہ یک وقت دو بحری جہاز ایک دوسرے کی بغل سے گذرتے ہوئے بغیر تصادم کے اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔ اس کنارے سے اس کنارے تک لوگوں کی آمد و رفت چھوٹے چھوٹے خوبصورت بجروں سے تکمیل پاتی رہتی ہے۔ یہ بجرے افلاس زدہ تنگ حال ملاحوں کا ذریعہ معاش ہیں۔ صرف ملاح گیری ہی ان کا روزگار ہے۔ کنارے سے لگے ان بجروں کے مناظر آنکھوں کے سامنے ماضی بعید کی ایک تاریخ پیش کرتے ہیں جب رام جی، سیتا اور لکچھمن ساتھ بن واس کے دوران سریو ندی کے کنارے پدھارتے ہیں اور کیوٹ (ملاح) کو ناؤ لانے کے لئے کہتے ہیں تو ملاح جوان کا پرم بھگت ہے بڑے پریم سے ہاتھ جوڑ کر رام جی سے بنتی کرتا ہے (مہاتما تلسی داس نے رام چرتر مانس میں رام کیوٹ سمباد کے بڑے ہی خوبصورت پیرائے میں اس کا ذکر یوں کیا ہے)

مانگی ناؤ نہ کیوٹ آنا ؛ کہئی تمہار مرم میں جانا

چرن کمل رج کہوں سب کہئی

مانس کرنی مور کچھو رہئی

چھوت سلا بھئی ناری سوہائی

پاہن تیں نہ کاٹھ کٹھنائی

ترنیو، منی گھرنی ہوئی جائی

باٹ پرہ موری ناؤ اڑائی

ایہی پرتی پال ہوں سب پریوارو

نہیں جانوؤں کچھو اور کبارو

جوں پربھو پار اوس گا چہوں

موہی پد پدم پکھارن کہہ ہو

[جب رام جی نے کیوٹ سے ناؤ مانگی تو کیوٹ نے کہا میں آپ کا مرم (بھید) جانتا ہوں آپ کے چرنوں کی دھول کے لمس سے ہی پتھر ناری روپ اختیار کر لیتا ہے۔ میری کاٹھ کی چھوٹی ناؤ کی بساط ہی کیا۔ یہ گھرنی (گوتم منی کی پتنی اہلیہ) ہو جائے گی۔ یہ چھوٹی ناؤ میرے پورے پریوار کی زندگی کا سہارا ہے۔

اور کوئی روزگار نہیں آتا۔ اے پربھو اگر آپ پار جانا ہی چاہتے ہیں تو اپنے پاؤں پکھارنے (دھونے) کی اجازت دیں (اہلیہ گوتم منی کی پتنی تھی۔ ایک رات گوتم منی کی بددعا سے پتھر بن گئی۔ اور جب رام لکھن منی وسوامتر کے ساتھ جنگل بھرمن کرتے ہوئے اس تپوبن میں پہنچے جہاں ایک ویران آشرم کے پاس بددعا زدہ پتھر تھا۔ رام جی کے چرن سے چھوتے ہی وہ پتھر دوبارہ ناری روپ میں آگیا۔]

ان تجربوں کو دیکھ کر ایک اور یاد ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔ جب گرو دیو مہاکوی رابندر ناتھ ٹھاکر نے ایک ایسے ہی بجرے میں پدما ندی کی سطح آب پر تین مہینوں تک رہ کر دیہی علاقوں کے لوگوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اور کئی معرکہ آرا نظمیں تخلیق ہوئی تھیں ابھی بھی ایک ملاح اپنے چپو کے ساز پر ٹھاکر کے گیت "وسندھرا" کی کچھ لائنیں گنگنا رہا ہے ۔

اے میری جنم بھومی
میری ماں
لے لے پھر مجھے اپنی شفقت بھری گود میں
کھینچ دے مرے سراپا پہ
اپنے پیار کا آنچل
میں بکھرنا چاہتا ہوں
تیری مٹی کے ذرے ذرے میں
رنگ و بوئے فصل گل کی طرح
بھر دوں انبساط و مسرت
دشا دشا میں
توڑ کر
اپنے آہنی جسم کی قید میں

اب جہاز ہگلی ندی کی دھاراؤں کے دوش پر خراماں خراماں اس مقام پر پہنچتا ہے جس کا نام گنگا ساگر ہے۔ یہاں گنگا اپنی معاون ندیوں کے ساتھ زمانے بھر کے گنیہ اور پاپ اپنے دامن میں بٹور کے ساگر سے ہم آغوش ہو کر رتناکر کا مقدر بن جاتی ہے گنگا کو الوداعی سلام کہنے ہر سال ہندوستان کے کونے کونے سے گنگا کے عقیدتمند یہاں آتے ہیں۔ گنگا ساگر مشہور و معروف تیرتھ استھان ہے یہاں لوگ پوتر اسنان کی غرض سے آتے ہیں۔ لوگ کشتی پر بیٹھ جاتے ہیں اور گنگا آکر انہیں اسنان کرا جاتی ہے انھیں پوتر کر جاتی ہے۔ یہاں ساگر کا نیلا پانی گنگا کے سفید پانی پر غالب نظر آتا ہے۔ دونوں پانیوں کے بیچ ایک سرحد کے تعین کا یقین ہوتا ہے۔ یہاں ایک شعر ختم ہوتا ہے اور دوسرے اور دوسرے کا آغاز ہوتا ہے۔ جہاز بحر ہند کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں سے کچھ ہی گھنٹوں کے سفر کے بعد ایک بہت ہی جاذب نظر اور دلفریب منظر آپ کا استقبال کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

جہاز کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے فلائنگ فش کا (اڑنے والی مچھلیوں) غول در غول پانی سے اچھلتا ہے اور پھر پانی میں غوطہ لگا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ گھنٹوں جاری رہتا ہے۔ یہ خوشنما منظر سوچ اور فکر کو احساس دیتا ہے کہ سیم بدن جل کامنی کچھ اس کا کچھ اس تیزی سے محو رقص ہے کہ صرف اس کی جھلک کے گردلیپی چاندی کی گردش ہی آنکھوں میں کوندتی رہتی ہے منظر کی لطف اندوزی دل و دماغ پر اس طرح غالب ہو جاتی ہے کہ ہر یاتری سفر کی تکان کو یکسر فراموش

کو سمیٹتا ہے۔ جب یہ منظر اس پرکیف عالم کی سیاہ تاریکی کو سکوت کی چادر میں اپنا سراپا ڈھانپ لیتا ہے تو فوراً اسی کی جگہ اسی نوعیت کا ایک دوسرا دلکش منظر بھرپور سطوت کے ساتھ آنکھوں سے آنکھ مچولی کا کھیل شروع کر دیتا ہے۔

اڑنے والی مچھلیوں کی طرح بہت سی مچھلیوں کا گروہ بھی اپنی حرکتوں سے مسافروں کو محظوظ کرتا ہے۔ انھیں محظوظ کہا جاتی ہے یہ سالونی سلوتی مچھلیاں چھپاک چھپاک کی آواز پیدا کرتی ہوئی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ انسان دوست ہیں۔ وقت ناگہانی پر وہ جہاز اور انسان دونوں کی مدد کر سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا اوقات یہ ڈوبتے انسان کو بحفاظت کسی نہ کسی طرح کنارے تک پہنچا دیتی ہے سننے میں آیا ہے کہ کبھی کبھی ڈوبتے ہوئے جہاز کو بھی یہ مچھلی بچا لیتی ہے۔ انھیں دیکھ کر اور ان کی خاصیت کو جان کر بہر انسانی عقل حیران ہو جاتی ہے اور زبان سے بے ساختہ ایک کلمہ نکلتا ہے۔

لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِیْھِنَّ ط وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۃ (زمین اور آسمانوں اور تمام موجودات کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ترجمہ مولانا حضرت سید ابوالاعلی مودودی)

اور جب سمندر کی گہرائی سر ابھارتی ہے اور اس کا پھیلاؤ اپنے اندر سکڑ جاتا ہے۔ سمٹ جاتا ہے تو ان مچھلیوں کا یہ خوبصورت منظر بھی بتدریج دھیرے دھیرے اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے اور اوپر نیلے آکاش پر سورج کے رتھ کا سفر۔ یہ تمام تر شواہد، گردش روز و شب، طبعی حادثات و واقعات انسانی حیات سے لازمی طور پر وابستہ نظر آتے ہیں۔ ذہن میں سورۃ الرحمٰن (قرآن) کی وہ آیتیں گونجنے لگتی ہیں جس میں اللہ نے فرمایا ہے "دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں۔ پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔ ان سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں اور یہ جہاز اسی کے ہیں سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے اٹھے ہوئے ہیں۔ بس اے جن و انس، تم اپنے رب کے کن کن احسانات کو جھٹلاؤ گے؟

تَبٰرَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ہ

(بڑی برکت والا ہے تیرے رب جلیل و کریم کا نام۔ ترجمہ مولانا مودودی)

اس طرح نیلے پانی پر تھرکتا ہوا جہاز دو دن کی مسافت طے کرتا آخر کار شمالی انڈمان کے اوّلے جزیرہ ڈگلی پور کے قریب جا پہنچتا ہے۔ دور سے ہی خشکی کا یہ حصہ ایک کالے دھبے کی طرح سطح آب پر ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ جیوں جیوں جہاز اس کے قریب آتا جاتا ہے کالاپن معدوم ہوتا جاتا ہے۔ اور اس کی جگہ ہریالی لیتی جاتی ہے۔ جب جہاز بالکل قریب پہنچ جاتا ہے تو نظر کے سامنے ایک بہت ہی پرکیف و پر بہار خطہ ارض اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر نواز ہوتا ہے۔ جسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور نے اسی خطہ ارض کے لئے ایک نظم کی تخلیق کی تھی جس کا مطلب یوں ہے

یہ دھرتی
سدا بہار دھرتی
جہاں گاتی ہیں مقدس ہوائیں
پیار بھرے نغمے
نوری زرہ بکتر پہنے لمحات
عطا کرتے ہیں لازوال خوش نصیبی
حیات کو
بوقت صبح
شفق کی گود سے
نکل کر صبح کا پوت
اپنے تمام دن کے سفر کے اختتام پر
بوقت شام
تھکا ماندہ، السایا ہوا
چھپ جاتا ہے
کسی پہاڑ کی اوٹ میں
تب
اترتی ہے دھرتی پر
رات کی سیج
قوس و قزح کی ست رنگی چنری اوڑھے
مٹھیوں میں ستارے لئے
اور چھیڑتی ہے رومانی پرسوز دھنیں
بکھیر دیتی ہے رومانی نغمگی
یہاں کی فضاؤں میں، ہواؤں میں
ناچ اٹھتا ہے حسن بے پروا
جھوم اٹھتی ہے حیات
بھر جاتا ہے فرحت و انبساط کی شراب سے
دل کا جام
بجھ جاتی ہے پیاسے ہونٹوں کی پیاس
ثبت کر دیتا ہے احساس
عارضی ارض پر
بوسۂ پیمانِ وفا

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ جزائر انڈمان و نکوبار کل 572 جزیروں پر مشتمل ہے یہ تمام چھوٹے بڑے جزیرے 8294 کیلو میٹر کا رقبہ گھیرے ہوئے ہیں ان میں سے کل 36 جزیرے آباد ہیں باقی جزیرے غیر آباد ہیں. سارے جزیرے قدرت کے انمول تحفے ہرے بھرے جنگلوں سے سرسبز و شاداب ہیں. ساحل سمندر پر ریت کے ذروں کی چمکتی سیپیاں کبھی اپنے آپ میں غیر معمولی دلکشی رکھتی ہیں یہاں جزیروں کا درجہ حرارت ہمیشہ 23 سینٹی گریڈ سے 30 سینٹی گریڈ تک رہتا ہے. مئی سے اکتوبر تک کے مہینے موسم برسات کے تحت آتے ہیں. یہاں کی سمندری ہوا نسیم سحری کی طرح نکہت و نور میں نہائی ہوئی ایک دلکش ادا کے ساتھ مصروف رقص و نغمہ رہتی ہے. اس کی وجہ سے دوپہر دھوپ کی تمازت سے منہ چھپائے پھرتی ہے.

ڈگلی پور کو چھوڑتا ہوا جہاز مڈل انڈمان سے گزر کر ساؤتھ انڈمان کے شہر پورٹ بلیر کی ہیڈ و جیٹی پر لنگر انداز ہو جاتا ہے. پورٹ بلیر انڈمان و نکوبار کا دارالسلطنت ہے.

(باقی آئندہ)

جمشید مسرور

اوسلو، ناروے

صلیب درد سے آ کر کبھی اتار مجھے
میں مر رہا ہوں مری زندگی پکار مجھے

چھیڑا ہے ساز کہیں بے صدا و بے آہنگ
بلا رہا ہے کوئی جسم و جاں کے پار مجھے

مسابقت ہے بڑی سخت دیکھئے کیا ہو
رکا جو میں تو سمندر کرے گا پار مجھے

بناؤ اور نہ خنجر مرے لئے کوئی
کہ کاٹتی ہے شب و روز دل کی دھار مجھے

کھلا پڑا ہے چمن میں زر خزاں جمشید
ستا رہا ہے اب اندیشۂ بہار مجھے

سجاد مرزا

گوجرانوالہ۔ پاکستان

جو ہاتھ میں تلوار پکڑ کر نہیں نکلا
اس جیسا بھرے شہر میں خودسر نہیں نکلا

کیا کیا نہ فصیلوں پہ رہے خوف کے پہرے
دیواریں تو نکلی ہیں، کوئی در نہیں نکلا

کب شام کی دہلیز پہ ڈوبا نہیں سورج
کب شام ڈھلے درد کا لشکر نہیں نکلا

ہیبت کے قفس میں جو مقید ہے پرندہ
اڑنے کے لئے اس کا کبھی پر نہیں نکلا

گزرا تھا ہمارا جہاں معصوم لڑکپن
اس شہر میں ڈھونڈے سے بھی وہ گھر نہیں نکلا

وہ لطف مسافت سے شناسا ہی نہیں ہے
شاید وہ کسی لمبے سفر پر نہیں نکلا

کیوں ڈوب گئیں آج ترے شہر کی گلیاں
سجاد کی آنکھوں کا سمندر نہیں نکلا

پروفیسر عنوان چشتی
نئی دہلی

من بسیا کے چاک پہ چڑھ کر اور کٹیلی ہوتی ہے
جس کایا کی سوندھی مٹی پیار سے گیلی ہوتی ہے

غربت میں ہر چیز جہاں کی کتنی نکیلی ہوتی ہے
چولہا کچا ہوتا ہے اور لکڑی گیلی ہوتی ہے

سچی بات مرے ہونٹوں پر آئی تھی مدت پہلے
دنیا لیکن مجھ پر اب تک نیلی پیلی ہوتی ہے

جامن جیسے ہونٹ ہیں اس کے آموں جیسے گال
کھٹی میٹھی بات بھی اس کی کتنی رسیلی ہوتی ہے

مہکی مہکی اس کی سانسیں بہکے بہکے اس کے قدم
حسن کی ہر سوغات جہاں میں کتنی نشیلی ہوتی ہے

اس کشاکش میں ہے اب جینا مجھے
مجھ سے کرتا ہے کوئی منہا مجھے

"دل محبت" کو سلام آخری
زندگی کرنی ہے اب تنہا مجھے

جس کے مارے گھٹا جاتا ہے دم
اے ہوائے تازہ اک جھونکا مجھے

اس کے دل کی تو میں کہہ سکتا نہیں
اس کی آنکھوں نے بہت سوچا مجھے

سانحے دل پر گزرتے ہی رہے
اس نے کس انداز سے دیکھا مجھے

"دل سمندر" تک پہنچنے کے لئے
اس کی آنکھوں میں اترنا تھا مجھے

کیا مرے منہ پر لکھا ہے اس کا نام
جس نے دیکھا غور سے دیکھا مجھے

غزلیں

شرون کمار ورما
چنڈی گڑھ

بے سبب ضد پہ اڑی ہو جیسے
ہر خوشی دور کھڑی ہو جیسے

ڈر گیا دیکھ کے آئینہ میں
سامنے لاش پڑی ہو جیسے

اس طرح آدمیت سے ڈر لگتا ہے
کوئی افتاد پڑی ہو جیسے

موت کی راہ تکا کرتا ہوں
اس سے امید بڑی ہو جیسے

دھڑکنیں تیز ہوئی جاتی ہیں
تیرے ملنے کی گھڑی ہو جیسے

پروین صدیقی
علی گڑھ

گنگناتی، جھومتی، گاتی گھٹا اچھی لگی
جو تجھے چھو آئی وہ مہکی ہوا اچھی لگی

عشق کے قصے کہانی ہمکو بھاتے ہی نہ تھے
پیار کی تو نے سنائی جو کتھا اچھی لگی

بار گذری دل کی بے چینی میں باد رنگ و بو
پر یہ سچ ہے تیرے دامن کی ہوا اچھی لگی

ان گنت مانگیں دعائیں رنگ لائیں چند ایک
عرش تک پر پہنچنے والی دعا اچھی لگی

زندگی سے پیار تو ہمکو کبھی تھا پروین بہت
دن وہ اپنوں نے دکھائے جب قضا اچھی لگی

حنیف نجمی
ہمیرپور

غزل

بے سبب تم کو جو ہر شخص سے بیزاری ہے
ایسا لگتا ہے تمہیں وہم کی بیماری سی ہے

تیری چاہت پہ بھروسہ تو میں کر لوں، لیکن
تو ہے فن کار محبت تری فن کاری سی ہے

دیکھ کر ہنستے ہیں سب سست روی کو میری
پوچھتا کوئی نہیں کب سے سفر جاری ہے

ذہن و دل پر بھی کوئی حق نہیں جیسے اپنا
کن زمینوں پہ یہاں قبضۂ سرکاری ہے

کوئی ناخوش ہو کہ اب خوش ہو بلا سے اپنی
کام اپنا تو میاں آئینہ برداری ہے

اتنا آساں نہیں کھونا انا کو اپنی
یہ وہ مجرم ہے جسے [illegible] ہے

میں ہوں خوش تن نام کا فن سے مری [illegible] سبب
تو ہے بدنام کہ شہرت تری اخباری ہے

وہی میں ہوں وہی دنیا ہے مگر جانے کیوں
تجھ سے بچھڑا ہوں تو ہر کام میں دشواری ہے

دکھ نہیں یہ کہ میں تیرے لئے برباد ہوا
غم تو یہ ہے کہ رویہ ترا بازاری ہے

مال و زر، دولت و ثروت نہیں کچھ پاس اپنے
فن ہی فن ہے مگر اپنی زمیں داری ہے

ہر طرف جس کی مہک [illegible] نجمی
باوجود اس کے مرا عشق ابھی جاری ہے

عطا عابدی
دہلی

عہد عکاس غزلیں

[عطا عابدی اپنے معاصرین میں تخلیقی اعتبار سے خاصے سرگرم اور فعال ہیں۔ تخلیق میں DELIBERATION اور تیز رفتاری کی متضاد خصوصیات نہ صرف فنکار کے ذاتی رویے کی نشاندہی کرتی ہیں بلکہ ان کے اثرات براہ راست PRODUCT کو متاثر کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تیز چلتے ہوئے اپنا توازن کھونے لگتے ہیں —— یہ بڑی ہنرمندی ہے کہ دوڑتے ہوئے بھی اپنی سلامت روی قائم رکھی جائے۔ عطا عابدی کی شاعری کا اس حیثیت سے بھی مطالعہ کرنا چاہئے۔ مشق و مزاولت کی کثرت اظہار میں جلا پیدا کرتی ہے، عطا عابدی کے یہاں یہ کثرت کیا جلوے پیدا کر رہی ہے ــ یہ بھی دیکھنا چاہئے۔ مشہور ہوتے ہوئے فنکار کا توسیعی جائزہ خود اس کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی کرتا ہے اور ہم عصر تخلیقی معیار و مزاج کی پیمائش بھی کرتا ہے۔ قارئین کے ایسے ہی جائزہ کے لئے عطا عابدی کی بیک وقت کئی غزلیں شائع کی جا رہی ہیں ———— ادارہ]

منع کیا تھا مت بیٹھو تم جذبوں کی دیوار تلے
کچل گیا نا پیارا لہجہ لفظوں کے انبار تلے

قتل مجھے ہونا ہے اک دن کب تک جان بچاؤں گا
کیوں نہ اب اپنی گردن خود ہی رکھ دوں میں تلوار تلے

دھوپ میں جن کی خاطر بادل دامن پھیلا دیتا تھا
سایہ سایہ چیخ رہے ہیں آج وہی اشجار تلے

الفت کی ترسیل کا رشتہ محتاج تشریح ہوا
پوشیدہ انکار ہیں کتنے، اک لفظِ اقرار تلے

سورج اپنی دھوپ لئے آ پہنچا سر پر اور عطا
بیٹھا ہوا ہے سائے کی خاطر بے سایہ دیوار تلے

پڑا جو وقت تو سایہ بھی ساتھ دے نہ سکا
وہ میرا اپنا ہے اب یہ بھرم بھی ٹوٹ گیا

خودی کے زعم میں اس کی شناخت بھی نہ رہی
مقابلے میں جو سورج کے اک چراغ چلا

در یقیں پہ وہ آیا تو تھا غرور کے ساتھ
مگر گمان کی حد سے وہ آگے جا نہ سکا

تھے ہم بھی غالباً اپنی انا کے مارے ہوئے
ترا مزاج بھی مائل بہ انکسار نہ تھا

بتا رہی ہے اداسی رہِ تمنا کی
عطا ادھر سے کوئی راہ رو نہیں گذرا

عطا عابدی

دہلی

آئینے سے ڈرتا ہوں
عصرِ نو کا چہرا ہوں
سب کہتے ہیں اچھا ہوں
مجھ کو کیسا لگتا ہوں؟

مستقبل میں رہتا ہوں
ماضی کا ایک حصہ ہوں
پنجرے میں کیوں رہتا ہوں
کیا میں ایک پرندہ ہوں

محفل روز سجاتا ہوں
پھر بھی کتنا تنہا ہوں
ساحل کا کھاتا ہوں فکر
بیچ سمندر تنکا ہوں

رہتا ہوں ہر دم خاموش
کس سے باتیں کرتا ہوں
یاد آتا ہوں اکثر میں
کس کا ٹوٹا رشتہ ہوں

کیوں سب کی دستارگری
کیا میں اتنا اونچا ہوں
پھر کیوں ہوں معذور بھی
دست و بازو والا ہوں

غزلیں

ماضی و حال سے بے خبر تھا مگر، خواب فردا کا آنکھوں میں بستا رہا
وقت کا پہرہ تھا سامنے پر مگر، لمحے لمحے کی رُوداد سنتا رہا

صنفِ کوہکنی کا تھا عامل مگر، کیا کہوں آپ کا یہ طلسم نظر
سر کو تربت سے ٹکرا کے گرتا رہا سنگریزوں کو پلکوں سے چنتا رہا

بزمِ رقص و سرود اور رنگ ساز طرب، بس تھا کیف تصور کا یہ تاب و تب
خلوتِ ذہن میں تھا کوئی نغمہ خواں، بے ارادہ ہی سر اپنا دھنتا رہا

مختلف رہبروں کی ہدایات میں رُک گیا تھا الجھ کر تضادات میں
آخرش راستہ اپنا خود طے کیا، خار چبھتے رہے پھول چنتا رہا

خواب کی بستیوں میں جنابِ متین، ہر دفعہ جیسی کل تھیں وہ ہیں آج بھی
اور حقیقت کی دنیا میں ارمان جل راکھ میں ضم کی ہر روز بھنتا رہا

عطا عابدی

دہلی

غزلیں

ہر چند نہ کچھ خوبیٔ کردار [illegible] مجھ میں
ہر شام و سحر سکّے کی جھنکار ہے مجھ میں

اب دل میں سماتا ہی نہیں ہے کوئی چہرہ
آئینہ نما شیشے کی دیوار ہے مجھ میں

بے نور ہوئیں [illegible] کی نگاہیں
گمنام بڑی دولتِ شہکار ہے مجھ میں

سرگوشی خود اپنی کبھی سنائی نہیں دیتی
خوابیدہ ہر اک جذبۂ [illegible] ہے مجھ میں

تجھ کو ہی نہیں، خود کو بھی [illegible]
گزری ہوئی ہر یاد گراں بار ہے مجھ میں

بچپن سے ہی [illegible]
اس جگ میں بھی ایسا [illegible]

لگتا ہے کہ اُبلا ہے رگِ گل سے لہو بھی
کہتے ہیں سبھی، [illegible] ہے مجھ میں

زخموں کی سزا دیتا ہے [illegible]
وردی میں نہاں ظلم کی تلوار ہے مجھ میں

تاریکیٔ اوہام عطاؔ [illegible]
جب خانۂ نور آج بھی مسمار ہے مجھ میں

شامِ غم، تنہائی، سوچوں کا ہجوم
روشنیٔ طبع شعروں کا ہجوم

حیرتوں کی جلوہ ریزی کا سبب
آئینہ خانے میں چہروں کا ہجوم

عہدِ رفتہ کی صدائے بازگشت
شاہراہِ دل پہ یادوں کا ہجوم

ہیں حقیقت کی فقط اب کرچیاں
[illegible] آنکھوں میں خوابوں کا ہجوم

زندگی کی [illegible] تمام
ذہن کے پردے پہ فکروں کا ہجوم

[illegible] تنہائی کا [illegible]
[illegible] ہجوم

بھول کر سن لی کبھی جو دل کی صدا
[illegible] کا ہجوم

[illegible] زندگی کو [illegible]
ایک دل اور لاکھوں حسرتوں کا ہجوم

[illegible]
[illegible] کتابوں کا ہجوم

ختم ہو جائے فاصلوں کا درد
بھول جاؤں میں راستوں کا درد

آنکھیں پلکیں جھپکنا بھول گئیں
کون سمجھے گا [illegible] کا درد

سسکیوں سے بھری ہوئی ہے فضا
آہ! بے چارے زخمیوں کا درد

توڑ لیتا ہے خواب بھی رشتہ
جب کبھی اٹھتا ہے [illegible] درد

زندگی حسرتوں کا پیکر ہے
ہائے مجروح خواہشوں کا درد

غم کے ماحول میں عجب ہے
شاعروں کو ہے [illegible] کا درد

سب کو ہوتا نہیں عطاؔ محسوس
عکس در عکس آئینوں کا درد

سید پرویز اقبال لکھنیاوی
مونگیر

غزلیں

جام و مینا بھی نہیں حسن نظارہ بھی نہیں
زندگی جینے کے لئے کوئی سہارا بھی نہیں

جذب ہے خاک وطن میں مرے اپنوں کا لہو
غم تو یہ ہے کہ کہیں ان کا اشارہ بھی نہیں

ہم کو دستور یہاں خود سے بدلنا ہوگا
ورنہ حالات ہیں ایسے کہ گزارا بھی نہیں

لٹ گیا باغِ عشق سے نشیمن اپنا
اب ہمارا بھی نہیں اور تمہارا بھی نہیں

کیسے تاثیر کا امکان ہو سرِ قریۂ جاں
دل وہ پتھر کہ جہاں کوئی شرارہ بھی نہیں

ہوتی آواز تو آواز پہ میں آجاتا
تو نے اے فصلِ جنوں ہم کو پکارا بھی نہیں

کوئی امید نہ منزل نہ اشارہ نہ خبر
آج کی رات تو گردوں پہ ستارہ بھی نہیں

گل و بلبل کی رفاقت تو عیاں آج بھی ہے
قیس و لیلیٰ کی محبت کا بیاں آج بھی ہے

گاؤں میں میرے وہ ٹوٹا سا مکاں آج بھی ہے
یعنی اجداد کی عظمت کا نشاں آج بھی ہے

لاکھ مسمار کرو تم مرے محراب و فصیل
میرے سینے پہ مرے اصل کا نشاں آج بھی ہے

یورشِ غم کو ابھی تک میں بھلا بھی نہ سکا
میری آنکھوں سے لہو دیکھ رواں آج بھی ہے

میرے حصے میں فقط پھول ہیں مرجھائے ہوئے
ورنہ گلشن میں بہاروں کا سماں آج بھی ہے

ہر جگہ اڑ کے چلا جاتا ہے بے خوف پرند
سرِ افلاک بنا تھا وہ مکاں آج بھی ہے

وقت نازک کا تقاضہ ہے کہ چپ ہوں ورنہ
دل میں پوشیدہ مرے برقِ تپاں آج بھی ہے

منظر مظفرپوری

مظفرپور

ناٹک

منی اپنی موت نہیں مری تھی بلکہ اسے مارا گیا
تھا۔ اس انداز سے کہ دنیا والوں کو یہ موت فطری لگے اور اس
مقصد میں زیب النساء پوری کامیاب رہیں۔ ایک ہفتہ ہو گیا
منی کو انتقال کئے مگر آج تلک کسی کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس
کی موت کا اصل ذمہ دار کون ہے؟ "ٹائیفائیڈ" ہو جا
گھر کے بھی سبھی افراد یہی سمجھ رہے ہیں کہ منی کی موت "ٹائیفائیڈ"
ہو جانے سے ہوئی ہے۔

منی کو ٹائیفائیڈ تھا یہ درست ہے اور یہ بھی سچ ہے
کہ اسے ڈاکٹر سے دکھا کر باقاعدگی سے دوائیاں بھی دی جاتی
تھیں مگر دی نہیں جاتی تھیں۔ بلکہ پھینک دی جاتی تھیں۔ اور
اس کام کو زیب النساء بڑی ہوشیاری سے انجام دیتی تھیں
کبھی نہیں۔ کوئی نہیں دیکھ پاتا تھا سوائے ایک منی کے۔ بس
یہی تھی وہ واحد شخص جو زیب النساء کی ساری حرکتوں کو
بستر علالت پر پڑی چپ چاپ دیکھتی رہتی تھی۔ ہاں!
[illegible] زیب النساء پر آ کے ایک خاموش سوال ضرور کھٹکا تھا۔
"اماں [illegible] ہے میں نے؟" بیٹی کے اس خاموش
سوال نے زیب النساء کو اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

ردعمل میں وہ منی کو سینے سے چمٹا کر سسکنے لگی تھی
"میری قسم اماں، مت روئیے۔ مجھے آپ سے کوئی شکا
مرا وعدہ ہے۔ آخری سانس تک خاموش رہ کر آپ
مقصد کو کامیاب کروں گی" اس نے اپنے زرد آلود چہرے
تاثرات اور ہاتھ کے اشاروں سے ان کو یقین د
تب زیب النساء کے ضبط کا بندھ ٹوٹ گیا تھا۔ ا
زار و قطار رونے لگی تھیں کہ گھر کے لوگوں کے علاوہ ا
پڑوس والوں کو بھی یہ یقین ہو گیا تھا کہ منی چل بسی
عورتوں نے منی کو مردہ جان کر زیب النساء سے الگ
تھیں۔ مگر منی چاہ کر بھی مزاحمت نہ کر پائی تھی۔ ا
تھی کہ اس کی زبان سے اتنا بھی نہ نکل سکا کہ ابھی
ہونے کی تصدیق اپنی زبان سے نہ کرتیں تو واقعی
ان سے الگ کرنے کے بعد قبلہ کی طرف رخ کر کے
اس واقعہ کے دو ہی روز بعد منی چل بسی۔ اب زیب
دہلی کو خیرباد کہہ کر واپس اپنے گاؤں جا سکتی تھیں
انہیں کوئی دشواری نہیں تھی اور نہ ہی دہلی چھوڑنے کا غم
بھی تو کیوں؟ آخر دیا ہی کیا ہے اس دہلی نے ان کو؟

کے پلاٹ کا خواب۔ جس کی تعبیر جانے کب ملے گی۔ مگر بدلے میں
اس دہلی نے کیا کچھ نہیں چھین لیا۔ ان سے۔ جوان سال بیٹا
قاسم جو کنبے کا سہارا تھا۔ ۵ برسوں سے حوالات میں بند ہے
اور شوہر رسول میاں جن کا کبھی اس دہلی میں لاکھوں کا کاروبار
ہوا کرتا تھا اب صرف ایک آدھ سو روپے کی سبزی بھاڑے
کے ریڑھی پر رکھ کر دن بھر سڑک کے کنارے کھڑے رہتے
ہیں۔ اس طرح کے اور بھی نہ جانے کیسے کیسے دن دیکھنے پڑے
زیب النساء کو۔ بڑی لڑکی ذکیہ نے محلے کے ہی ایک آوارہ
لڑکے کے ساتھ بھاگ کر ان کی ناک ہی کٹوا دی۔ جبکہ منجھلی
لڑکی منی نے ایک دم نرالی تکلیف پہنچائی ہے۔ واقعہ یہ ہے
کہ یہ ان کی سب سے اچھی بیٹی تھی۔ ہر اعتبار سے۔ رفتار گفتار
صورت، سیرت سب کچھ قابل تعریف تھی۔ دو سال قبل
اس کی شادی ہوئی تھی۔ رخصتی کے وقت زیب النساء نے اس
کے شوہر کے آگے ہاتھ جوڑ کر منت کی تھی کہ بڑے ناز و پیار
سے پالا ہے۔ اسے کوئی تکلیف مت دینا مگر چھ ماہ بعد
ہی منی پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کا شوہر اس
کے جہیز کے گہنے زیورات لے کر جانے کہاں بھاگ گیا۔ بہت
تلاش کی گئی۔ مگر آج تک اس کا کوئی اتا پتا نہ چل سکا۔
نہ جانے اس بات کی خبر گاؤں تک کیسے پہنچ گئی۔ اسی
سانحے کے ایک ماہ بعد ہی زیب النساء کی والدہ کا خط
آیا۔ لکھا تھا۔ منی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ٹھیک نہیں ہے
اور یہ خیال رہے کہ گاؤں میں منی کو اس کے شوہر کے
بغیر مت لانا۔" یہ ایک عجیب مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا ان
کے سامنے۔ ہر وقت گم صم رہ کر سوچتی رہتیں۔ کہ کس طرح
حل کیا جائے؟ واحد راستہ ایک ہی نظر آتا تھا کہ اس کی
دوسری شادی کر دی جائے۔ مگر سوال یہ تھا کہ کسی غیر
طلاق شدہ سے کون کرے گا شادی۔

اب رہی بات ان کی منجھلی بیٹی مالو کی تو اسی نے
ان کو بھی بیچ کر گاؤں واپس جانے پر آمادہ کیا ہے۔ دراصل
حرکت ہی کچھ ایسی کر گئی ہے وہ۔ اور ویسے بھی ان کے
جگر کی قوت جواب دے چکی ہے۔ مزید کچھ سہنے کی
صلاحیت نہیں رہی۔ بہت ہو گئی تباہی اور جگ ہنسائی
حالانکہ گاؤں واپس جانے کا خیال اس سے قبل بھی کئی بار
ان کے ذہن میں آ چکا تھا۔ قاسم جیل آ چکا تھا۔ اس وقت
بھی آیا تھا یہ خیال۔ قرقی منسلک ہوئی تھی۔ اس وقت بھی ذکیہ
ایک لونڈے کے ساتھ بھاگی تھی۔ اور بھی ایسے بہت سارے
حالات آئے تھے اور ہر بار کچھ نہ کچھ سوچ کر ارادہ ترک کر
دیتی تھیں۔ مگر اس بار ارادہ مستحکم ہے۔ ٹلنے کا کوئی
سوال ہی پیدا نہیں اٹھتا۔ منی کو یوں ہی ہلاک نہیں کیا
گیا ہے زیب النساء نے۔ اس کے پیچھے جو مقصد کارفرما
تھا وہ ہے گاؤں کی واپسی۔ تاکہ وہاں پہنچنے کے بعد منی کی
ذات سے وابستہ لوگوں کے تنقیدی سوالوں کا جواب
وہ صرف ایک ہی جملہ میں دے سکیں کہ نا شفا شدہ ہو
جانے سے اس کا انتقال ہو گیا۔ بہت قلق ہے انہیں منی کی
موت کا۔ حق کہ اگر مالو کے بدچلن ہونے کا علم انہیں نہ ہوتا
تو بلاشبہ فی الحال زیب النساء گاؤں واپس جانے پر
ہرگز آمادہ نہ ہوتیں اور نہ ہی منی کو نامعلوم کے بہانے موت
مارنے کا فیصلہ کرتیں۔ بلکہ اس کا اچھی طرح علاج کراتیں
اور اس کے صحت یاب ہونے کی ہر ممکن کوشش کرتیں۔ چاہے
اس کا بوجھ گاؤں اور سماج سے ان کے [illegible]
کا سبب ہی کیوں نہ بنتا۔ [illegible] مگر
مالو کی شرمناک حرکتوں سے دل پر [illegible]

وہ جب کہ وہ کسی وجہ سے مجبور ہو گئیں ورنہ ان کا مزاج بھی ایسا صاحب تھی تھیں۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتی تھیں کہ قاسم باہر نہیں ہے ورنہ وہ مالو کے ساتھ اس لڑکے کا بھی گلا ریت دیتا۔ جس کے ساتھ اس نے تنہا گھومنا کر آوارہ گردی کی۔ ذکیہ کے وقت بھی وہ جیل میں تھا۔ ورنہ ایسے بدکرداروں کو وہ کہاں معاف کرنے والا تھا جس لڑکے کا قتل کرنے کے جرم میں وہ سزا کاٹ رہا ہے وہ اول درجے کا غنڈہ تھا۔ آئے دن جھگی جھونپڑی کی لڑکیوں کو چھیڑتا رہتا۔ تھا۔ بس یہی چھیڑ خوانی اس کی موت کا سبب بنی تھی۔

حالانکہ گاؤں واپس جانے کا فیصلہ کرنے سے قبل زیب النساء نے مالو کے متعلق کافی غور وخوض کیا تھا۔ سب سے پہلے ان کے ذہن میں تو یہی آیا تھا کہ ایسی بدچلن لڑکی کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ مگر قانون کی زد میں آجانے کے تصور سے ارادے کو ترک کر دینا پڑا۔ خیال تو یہ بھی آیا تھا اس کی فوراً شادی کر دی جائے۔ مگر جہیز اور نقدی کے مسئلے نے ہمت پست کر دی۔ کاش منی کی جگہ اسے ٹائیفائیڈ ہو جاتا۔

کبھی کبھی زیب النساء کو یہ زندگی بڑی بے معنی لگتی ہے سوچتی ہیں۔ صرف جینے کے عمل کو زندگی کا نصب العین نہیں کہا جا سکتا۔ اور پھر جس زندگی کو ہر تھوڑے دنوں بعد بے موت مرنا پڑے وہ تو اور بھی بے مصرف ہے۔ ایسی زندگی کا تو فوراً انت ہو جانا چاہیے۔ مگر زیب النساء ایسا نہیں کر سکتیں۔ مجبوری ہے۔ تبسم اور گڈی جو ابھی نا سمجھ ہیں جن کی زندگی کو ان کے سہارے کی سخت ضرورت ہے۔ ان کی مجبوری ہی تو ہے۔ انہیں دونوں کی خاطر تو یہ ابتک زندہ ہیں۔ ورنہ یہ ذلت بھری زندگی تو شاید کوئی ذلیل انسان بھی نہیں جیتا۔ خود بھی مر جاتیں اور مالو کو بھی ختم کر دیتیں۔ اس سے یہ ہوتا کہ منی کی ہلاکت کے علاوہ گاؤں کی واپسی سے بھی بچ جاتیں۔

گاؤں چھوڑنے کا بے حد پچھتاوا ہے زیب النساء کو دراصل رسول میاں کے اصرار پر ہی انہیں دہلی آنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ یہ چھوڑنا کب چاہتی تھیں گاؤں۔ رسول میاں بھی کیا جانتے تھے کہ یہ دہلی ان کے کینے کو راس نہیں آئے گی۔ خوشحال تھے۔ کمائی بھی اچھی ہو رہی تھی۔ جمنا پار ۲۰ گز کے رقبے میں اپنی ایک جھگی بھی تھی۔ سچ پوچھئے تو اسی جھگی کو آباد کرنے کی غرض سے رسول میاں نے کنبے کو دہلی بلایا تھا۔ کیونکہ کاروباری مصروفیت اتنی زیادہ تھی کہ انہیں اکثر سبزی منڈی یا رین بسیرا میں راتیں گذارنی پڑتی تھیں۔ جس کی وجہ سے جھگی ویران پڑی رہتی تھی اور یہ خدشہ ہر گھڑی لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی قبضہ نہ کر لے جبکہ رسول میاں اسے کسی قیمت پر گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس جھگی کی بدولت انہیں بہت کچھ حاصل ہونے والا تھا۔ جیسے کہ راشن کارڈ دہلی کی باشندگی، اور کبھی نہ کبھی دہلی کے کسی خطے میں ۲۵ گز کا پلاٹ بھی۔ بس اسی لالچ کے تحت رسول میاں نے بیوی بچوں کو گاؤں سے بلوا لیا تھا۔ پورے پندرہ سال ہو رہے ہیں جھگی کو آباد کئے مگر ۲۵ گز کا پلاٹ تو درکنار، ابھی راشن کارڈ بھی نہیں بن سکا ہے۔ سرکار کہتی ہے جھگیاں بہت بن چکی ہیں۔ دہلی میں مزید گنجائش نہیں رہی جبکہ رسول میاں جیسے لوگوں کا رونا ہے کہ "ہم جائیں تو جائیں کہاں"

منی کو انتقال کئے ۱۵ روز ہو چکے ہیں۔ البتہ

ثواب کے لئے فاتحہ خوانی بھی کرائی جا چکی ہے۔ اب باقی
کام گاؤں میں۔ اب یہاں مزید وقت کاٹنا بس میں نہیں
ہے زیب النساء کے۔ صرف ایک روز اور کسی طرح بسر
ہو جائے۔ دراصل کل قاسم سے ملاقات کی تاریخ ہے۔
اس کو دیکھنے کے لئے ان کا دل بہت بے تاب ہے۔ پھر
جانے کب ملاقات ہو۔

دوسرے روز پو پھوٹنے کے بعد زیب النساء
رسول میاں کے ہمراہ تہاڑ جیل کے لئے روانہ ہو گئیں۔
کافی کوششوں کے بعد کوئی ۱۱ بجے قاسم کا دیدار ممکن
ہوا۔ وہ سلاخوں کے پیچھے کھڑا زیب النساء کو ٹکر ٹکر دیکھ
رہا تھا۔ آنکھیں کسی بھی جذبے یا احساس سے عاری تھیں
اس کی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ سلاخوں کے باہر جو عورت
اپنی بے چارگی اور مقدر پر آنسو بہا رہی ہے۔ اس کا
وہ بیٹا ہے۔

"کیسا ہے تو میرا لال؟"

"زندہ ہوں!" اچانک قاسم کا چہرہ تمتما گیا۔
آنکھیں انگارے برسانے لگیں۔ اور تب تک رہوں گا
زندہ جب تک مالو کا گلا نہیں کاٹ دیتا۔ اتنا بولنے کے
بعد وہ ایکدم سے چپ ہو گیا۔ اور زیب النساء کو سلاخوں
کے اور نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے اشارے پر
زیب النساء عمل کرتی سلاخوں کے بالکل قریب آگئیں
تب قاسم اپنا منہ ان کے کان کے نزدیک لے جا کر ایک
دم دھیرے سے بولا۔ "اماں کیا منی واقعی ٹائیفائیڈ سے
مری ہے؟" پھر کیا تھا! قاسم کے اس سوال پر زیب النساء
ایک دم سے تھرا گئیں۔ حیرت و استعجاب کا سراپا بنی ٹکر
ٹکر پھٹی پھٹی آنکھوں سے قاسم کو تکے جا رہی تھیں۔ چہرے
کے تاثرات سے صاف عیاں تھا کہ وہ قاسم سے بہت
کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔۔ مگر زبان کے مفلوج ہونے کے
جرم نے ان کو گونگا بنا دیا تھا۔

"نہیں نا؟ میرا دل پہلے سے کہہ رہا تھا کہ منی۔۔۔؟"
اس کے آگے کا جملہ قاسم کے اندر کہیں گم ہو گیا تھا۔ صرف
روئے چلا جا رہا تھا۔ مگر کس پر؟ یہ کہنا مشکل ہے۔
کیونکہ اس کے دل کے اندر جو سیلاب موجزن تھا اس
میں صرف ایک منی کی لاش یا خود اس کی کشتی حیات
ہی نہیں تیر رہی تھی بلکہ والدین اور بہنوں کے ہمراہ مہذب
اور خوشحال زندگی جینے کی مردہ تمنائیں بھی ڈبکیاں لے
رہی تھیں۔ "اور آپ کس دنیا میں کھوئے رہتے ہیں ابا؟"
اب قاسم رسول میاں سے متوجہ تھا۔ آپ کی بھی اپنی
ایک دنیا تھی جس کی زمین میں اب صرف مردہ خواب دفن
ہیں۔ ہے کہ نہیں، اس کا احساس ہے آپ کو؟" شاید
بولنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا رسول میاں کے پاس یا بولنا
ہی نہیں چاہتے تھے۔ آپ دونوں آدمی یہاں سے چلے جائیے۔
خدا حافظ!" اتنا بولنے کے بعد قاسم نے زیب النساء
اور رسول میاں کی طرف سے رُخ موڑ لیا اور قیدیوں کے
کے درمیان جانے کہاں گم ہو گیا۔ دونوں میاں بیوی گھنٹوں
سلاخوں کے باہر قاسم کے انتظار میں کھڑے رہے مگر
قاسم نہیں آیا۔ تب مایوس ہو کر رسول میاں زیب النساء
کو سہارا دیتے ہوئے جیل کے احاطے سے باہر نکل گئے۔

"مت روؤ قاسم کی اماں!" زیب النساء کا غم سے برا حال
دیکھ کر رسول میاں انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔
"مجھے دیکھو، سب کچھ محسوس کرتے ہوئے بھی اس طرح جی رہا
ہوں جیسے احساس سے میرا دور کا بھی رشتہ نہ ہو نہیں

عبدالقیوم ابدالی

ایک خط۔ خورشید اکبر کے نام

سب ادب

ایک عرصہ قبل آپ کی غزلوں کا مجموعہ "سمندر خلاف رہتا ہے" ملا تھا۔ پڑھ تو گیا تھا لیکن روزگار زمانہ نے اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ آپ کو اپنی رائے بھیج پاتا۔ اب جب کہ بہار اردو اکیڈمی کی طرف سے اس کتاب کے لئے دیئے جانے والے انعامی رقم کے چیک واپس کرکے آپ نے ایک نئی بحث کے دروازے کھول دیئے ہیں میں اپنی رائے سے آپ کو واقف کروانا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ کی یہ کتاب اس نسل کے نام معنون ہے جو بہ قول آپ کے ترقی پسندی اور جدیدیت سے انحراف کرنے والی تھی یا ہے! ظاہر ہے کہ آپ اپنے کو بھی اسی نسل کا نمائندہ سمجھتے ہوں گے۔ آپ کی نسل کے لوگ ہی شاید اپنے آپ کو "جدید تر" نسل کا ادیب یا فن کار کہلانا پسند کرتے ہوں۔

مجھے نہیں معلوم کہ آپ ترقی پسندی سے کیا مراد لیتے ہیں۔ ترقی پسندی آپ کے نزدیک نظریہ ہے، رجحان ہے یا پھر کوئی تحریک۔ یہ سمجھ پانا اس لئے بھی مشکل ہے کیونکہ اس پر کوئی تفصیلی گفتگو آپ سے اب تک نہ ہو سکی ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت سے انحراف کے دعوے کے باوجود آپ بنیادی طور پر اشتراکی آدمی موجودہ سیاسی نظام، عدم مساوات اور ناانصافیوں خلاف آپ کے یہاں جو غصہ ہے اس کی لَے ان روا ترقی پسندوں سے ملتی ہے جو تاریخی اور جدلیاتی مادیت کے نظریئے سے پوری طرح واقف نہیں تھے اور اد کی سماجیات کا مطلب نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی ان کے یہاں بھی حملے یکطرفہ ہوتے تھے اور دونوں سے ان کی خودسری اسی طرح خلاف رہتی تھی جیسے ہیں۔ شعر

عجب طرح کی طبیعت ملی ہے خودسر کو
کہ دو جہان سے اکبرؔ خلاف رہتا ہے

یہ خودسری دراصل ایک ایسا رومانی رجحان جو دنیا کی ہر چیز کو ناقص اور ہیچ سمجھتا ہے۔ اس میں گرفتار اکثر نوجوان سماجی حالات کا تجزیہ ہی نہ کر پاتے اس لئے ان کا غصہ انفرادی ذہنوں میں

بتا رہ جاتا ہے اور وہ دوست اور دشمن کی شناخت کرنے میں غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ دراصل انسان اپنے حالات کا زائیدہ ہوتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی تو یہی ہے کہ وہ دنیا کو اپنے رہنے کے قابل بنا سکے لیکن صاحبان اقتدار حالات میں تبدیلی نہیں چاہتے اس لئے ان کی مسلسل اور مستقل کوشش ہوتی ہے کہ وہ عام آدمی کی اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیں۔ اس کے لئے وہ کبھی ظلم اور جبر کرتے ہیں تو کبھی انعامات واکرام سے نواز کر زباں بندی کرتے رہتے ہیں۔ کبھی مذہب، ذات، زبان، علاقے اور فرقوں کے نام پر عام لوگوں کو بانٹتے رہتے ہیں اور کبھی عہدوں اور اعزازات سے نواز کر اسے مشین نما نظام کا پرزہ بناتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ تمام لوگ جو اس نظام کو قوت بخشتے ہیں لازمی طور پر ان لوگوں میں شامل نہیں ہوتے جو اس نظام کو بدلنے نہیں دینا چاہتے بلکہ اس پورے نظام سے برگشتہ خاطر ہونے کے باوجود اس مشین کے ساتھ چلتے رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ آپ نے سچ ہی کہا ہے ؎

تھکے ہارے ارادے دھوپ کے ماتے ہوئے شکلے
تھپکی گنگناتی خوش خیالی برگدی سی کی

لیکن یہ تھپکی گنگناتی برگدی خوش خیالی ہمارے دھوپ کے ماتے تھکے ہارے ارادوں کو سلا دینے میں اس لئے کامیاب ہو جاتی ہے کیونکہ ہم نے "سیہ کاریوں" کے سبب کی تلاش سے روگردانی کی ہے اور محض حالی نسب لوگوں کو گالیاں دینے پر اکتفا کر لیا ہے۔ شہنشاہ، امیر شہر، جدید وقت، سلگتی پیاس کی مورچہ بندی، سفید کبوتر، پتھر، خود سر، یہ محض الفاظ یا علامتیں نہیں رہ گئی ہیں بلکہ تلمیحات کا درجہ اختیار کر لیا ہے کیونکہ روحانی ترقی پسندوں سے آپ کی نسل تک پہنچتے پہنچتے خود ان الفاظ نے اپنے ساتھ کئی حکائی پس منظر جوڑ لئے ہیں۔

لیکن جو بات آپ کی نسل کو ان روحانی ترقی پسندوں سے الگ کرتی ہے وہ یہ کہ ان کے حصہ میں چند خواب تھے۔ اور آپ کی نسل کے حصہ میں صرف شکست خواب کی کرب ناکیاں، وہاں امید کی ایک کرن باقی تھی اور یہاں صرف بے آب وگیاہ صحرا ہے۔ وہاں خود سری میں سر پر دیوار پر بندشں کو توڑ دینے کا حوصلہ تھا اور یہاں ضمیر کا دم گھٹا گھٹا قدم قدم پر آنکھیں چراتا ہے۔ وہاں نظام کو بدلنے کی خواہش تھی اور یہاں نظام کا حصہ نہ بنا پانے کا گلہ ہے۔ آپ کے ہی چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

بدن میں سانس لیتا ہے سمندر
مری کشتی ہوا پر چل رہی ہے

روز مہنگے ہوئے جاتے ہیں کنوارے سپنے
بیٹیاں جائیں گی کس طرح بیاہی سوچوں

گناہوں میں دھنسے قدموں کے نیچے
کوئی غیبی خزانہ ہو تو دیکھوں

میں تنہا مصلحت کردار موسم کا مخالف ہوں
نہیں تو سہل ہے کیا شہر بھر کو بدگماں رکھنا

میں سر جھکائے ہوئے مصلحت سے لڑتا ہوں
یہ سر اٹھا تو ترا اختیار ٹوٹے گا

ہر ایک اینٹ سے مجبوریاں [illegible]
نہ جانے کب یہ سسکتا دیار ٹوٹے گا

کہ جس کی آنچ سے جبر یلؑ کی جلیں

انا میں اتنی تمازت ابھی نہ رکھی جائے

ہواؤں کے [illegible] کشتیوں کو چھوڑ دینے کے

بعد منہ زور لہروں سے ٹکرانے اور ان کی مخالف سمت میں چلنے کا اگر چارہ ہم میں رہ ہی نہیں جاتا تو ہمارے پاس اس کے سوا راستہ ہی کہاں رہ جاتا ہے کہ ہم بھی اپنے آپ کو اس نظام کا حصہ بنا لیں اور یہ تبھی ممکن ہے جب ہم موجودہ سماجی اقدار کے مطابق "شریف" کہلا سکیں۔ اس لئے اب ہمیں بھی غیبی خزانوں کی تلاش رہنے لگی ہے۔ مصلحتیں ہمارا مقدر ہو گئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود طبیعت کی خودسری اور انا کی تمازت اگر دامن پکڑنے لگتی ہے تو شاعری جلے پھپھولوں کو پھوڑنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

میں بن کے آئینہ بیٹھا ہوں بیچ رستے میں

کہ اس طرف سے سکندر نکلنے والا ہے

مزاجوں میں وہی درباداری

ٹپکتی رال میں جاگیر گم صم

ان دونوں اشعار میں تصویر کے صرف دو رخوں کا فرق ہے ورنہ سکہ تو ایک ہی ہے۔ اگر سکندروں کے سامنے اپنی آئینہ ساما‌نی قیمت مانگتی ہے تو ہم میں اور درباروں میں رال ٹپکاتی نسل میں فرق کیا رہ جاتا ہے۔ ہم نے اپنی موتیوں کو اس قدر ارزاں کر دیا ہے کہ صاحبانِ اقتدار اسے کتوں کے آگے پھینک دینا چاہتے ہیں۔ پھر اگر موتیوں کی بے قدری ہوتی ہے تو اس میں کتوں کا کیا دوش ؟

دلوں کی مسجد ویراں میں اکبرؔ اذاں خاموش ہے تکبیر گم صم

اس لئے میرے بھائی ؎

مجھ پہ ہر حال میں ہے، فرض غلامی اس کی

وہ فقط رنگتِ زنجیر بدل سکتا ہے

لیکن غلامی صرف جسمانی نہیں ہوتی۔ ذہن و دل بھی غلام ہو سکتے ہیں۔ روحانی بغاوت کو صرف منفی تصویروں میں پناہ ملتی ہے اس لئے آپ کی شاعری بھی ایک ایسے بے بس اور لاچار باغی کی شاعری ہے جو حالات اور صورتحال کا شاکی ہونے کے باوجود اسے قبول کر لیتا ہے۔ ان حالات یا اس صورتحال کو بدلنے کا کوئی حوصلہ آپ کی شاعری سے نہیں مل پاتا۔ دراصل آپ کی نسل کا المیہ یہ ہے کہ اس نسل کے نوجوانوں کو ہر لمحہ یہ فکر رہتی ہے کہ وہ کس طرح ان سیڑھیوں کو حاصل کر لیں جس پر چڑھ کر اس کا قد بھی ان لوگوں کے برابر ہو جائے جنہیں ہمارا سماج "شرفاء" میں شمار کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان نام نہاد شرفا کے مقابلہ میں ایک عجیب سی احساس کمتری آپ کا مقدر بن جاتی ہے ؎

تجھ سے مل کر میں چھوٹا ہو جاتا ہوں

یار! مجھے تو کتنا اونچا لگتا ہے

سردار نے کوئی اٹھارہ سال قبل یہ شعر کہا تھا ؎

آسماں پہ اڑنے کا حوصلہ نہیں جن کو

نامراد رہتا ہے ذوقِ بال و پراں کا

انھیں کا ایک شعر ہے۔

یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے ہم نفسو

ستارہ بن کے جلے، بجھ گئے شرر کی طرح

یہ شعر بھی اسی زمانے کا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر سردار ہی کے یہ دونوں اشعار قلمبند کئے ہیں کیونکہ اکثر جدیدیوں

اور جدید تر ادیبوں نے جب بھی ترقی پسندی سے انحراف کا نعرہ بلند کیا ہے ان لوگوں نے سردار کو ہی نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی وہ نسل جس نے زندگی کے کڑے کوس سفر سے فرار حاصل کر رومانی اور خوابیدہ مرغزاروں میں پناہ لینے کی سعی کی تھی ان کے لئے تو یہ انحراف سمجھ میں آنے کی بات بھی تھی۔ لیکن وہ لوگ جو سماج کو بدلنے کی بات کرتے ہیں اس نظام سیاست کے ہی شاکی ہیں۔ ان اشعار میں بیان "جذبے" اور "عزم" سے انحراف کی صورت میں ان کے ہاتھ جو کچھ آسکتا تھا وہ آپ کے یہاں بھی ہے سے

جس طرح بعض ترقی پسند ناقدین نے اپنی ادعائیت کی سبب تمام تر مابعد ترقی پسند ادبی سرمائے کو کوڑے کرکٹ کا ڈھیر کہنے کی غلطی کی تھی اسی طرح بعض جدید ناقدین نے بھی ترقی پسندوں کے ذریعہ تخلیق کئے جانے والے ادب کو رد کر دینے کی بھول کی ان میں سے نے تو فیض اور مخدوم کی شاعری کو بھی اعتبار کے قابل نہیں سمجھا۔ لیکن نہ تو اردو شاعری کا کوئی سنجیدہ قاری فیض، مخدوم، جاں نثار، کیفی، سردار، مجروح، کو فراموش کر سکتا ہے اور نہ ہی ابن انشا، ن م راشد، میراجی، خلیل الرحمٰن اعظمی، بانی، علوی، شہریار، ندا فاضلی، جاوید اختر کو کر سکتا ہے اور لوگوں کو جانے دیجئے خود میں اپنے شہر کے چند شاعروں کے یہ اشعار پیش کر رہا ہوں ذرا بتائیں انھیں ہم کس خانے میں رکھیں۔

کہا جائے کس بات پہ دشمن ہوا موسم
سرسبز کسی شاخ کو ہونے نہیں دیتا

تاریک پربتوں میں سورج نے جان دیدی
ٹھنڈا اداس گہرا بستی پہ ڈولتا ہے

کفر کی ہوا آکاش ہمارا بہت کہیں تو آنگن بھر
اتنے میں ہم اڑتے کیسے سبے تو رستے جیون بھر

میری تھکن کو نئے دشت پھر بلا لیں گے
کسی ندی میں وہ جھک کر جو پاؤں دھوئیں گے

اندر باہر ایک خموشی ایک جلن بے چینی سی
کس سے ملئے کس سے کہئے یہ سب کیسا لگتا ہے

جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں شہروں کے فقیہہ
کیا درختوں سے بھی چھن جائے گا عالم وجد کا

دن بھر کی دوڑ دھوپ کے حاصل پہ آنخ تھو
قطرہ بنے عذاب تو ساحل پہ آنخ تھو

سونی سونی آنکھوں میں بھر دے سوچے سوچے دکھ
کر کے پھر پچھتاؤں کوئی نادانی آمین

وہی ہے شہر وہی سفلے او چھے جھوٹے لوگ
نکل چلو کہ نہ راس آئے گی فضا آؤ

درخت چپ ہے مگر سانس لیتے پتوں میں
یہ سرسراتا ہوا خوف سا چھپا کیا ہے

مسیح وقت اب آئے تو بس خدا آئے
پیمبروں کی زمیں اور عذاب چاروں طرف

منصفت ہے تو یہ عذر سیہ کاری بھی لے جا
سورج کو کسی دن پس دیوار بھی لے جا

تمہاری مرجیہ سیاست یقیں کا چہرہ جھلس چکا ہے
ہمارے سہمے ہوئے مکانوں پہ امتیازی نشان مت کھو

اچھلے نہ یاد آئے کہ میرا بھی خدا تھا
ہونٹوں پہ بہت تلخ بیاں سا تھا ہے میر

میرے چہرے سے غم آنکھوں سے حیرانی نہ جائے گی
یہی صورت رہے گی اور پہچانی نہ جا سکے گی۔

[illegible] شعرا کے ہیں جن
[illegible] نسل نے میدانِ ادب میں قدم رکھا ہے
ہر آنے والی نسل [illegible] نسل کو رد کر دینا چاہتی ہے
کیونکہ [illegible] کے بغیر خود اس کی شناخت مشکل ہوتی ہے۔
اس [illegible] کوشش کے باوجود اس کے لاشعور پر موجود
[illegible] نسل کے اثرات خود اس کے احساس اور جذبے
کا حصہ بن جاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر لہجہ اور آہنگ میں
شعوری تبدیلی کے باوجود جذبے اور احساس کی کارفرمائی
اس کی ادبی کائنات کو اپنا اسیر بنائے رہتی ہے۔ جدیدیت
سے انحراف کی آپ کی تمام تر کوشش اسی لئے بھی بیکار
ہو جاتی ہے کیونکہ آپ اسی "وقت اور حالات" میں جی
رہے ہیں جو آپ کی پیش رو نسل نے ورثے میں آپ کو دی
ہے۔ مندرجہ بالا اشعار کے انتخاب میں نہ تو میں نے کوئی پیمانہ
سامنے رکھا ہے اور نہ ہی کوئی نقطۂ نظر لیکن کیا آپ ان
اشعار میں موجود جذبے یا احساس سے انحراف کا دعویٰ
کر سکتے ہیں؟

بھائی! میں شاعری کا آدمی نہیں ہوں۔ اس لئے
میں اپنے ان محقق دوست کی طرح جنہوں نے مولانا آزاد کو
غلافِ کعبہ کی طرح اوڑھ لیا ہے یہ کہہ نہیں سکتا کہ آپ کی
شاعری میں وہ قوت ہی نہیں ہے جو احساس اور جذبے کی
کسی سطح کو منعکس کر سکے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ شاعری
کے تمام تر اسرار و رموز سے عدم واقفیت کے باوجود آپ
کے زیادہ تر اشعار میں جس احساس یا جذبے کو اسیر کرنے
کی کوشش کی گئی ہے وہ میرے بعض مجروح جذبات و
احساسات کو بھی سکون پہنچانے کا باعث ہوتے ہیں اور
اسی لئے آپ سے تقریباً ایک دہائی قبل پیدا ہونے کے
باوجود میں آپ کو اپنے ہی فرقے کا ادیب و شاعر سمجھتا
اس رشتہ کے بغیر میں کسی ادیب یا شاعر کی تخلیق کو
نہیں سمجھ پاتا۔ میں نے آپ کی کتاب پر تبصرہ لکھنے کا
اس لئے کیا تھا کیونکہ آپ کے یہاں اس نسل کے جذبے
یا احساس کی ترجمانی کی کوشش مجھے نظر آئی تھی۔
حال سے ناراض اور اپنے مستقبل سے مایوس ہو
ہے۔ ناراضگی کے رجحان سے اس بغاوت کی امید
جا سکتی ہے جو اس نظام کو بدلنے کے لئے سعی کرے۔
میری تلخ نوائی اس جذبے اور رشتے کی زائیدہ ہے
مجھے اگر آپ کو اس سے تکلیف پہنچی ہے تو میں شرمندہ
ہوں کہ میں اب تک اپنے آپ کو یہ باور نہیں کرا سکا
کہ اچھا ادب کسی گروہ، حلقے یا انجمن کی پشت پناہی
وجہ سے اچھا ہو جاتا ہے یا ان کی مخالفت کی بنیاد
اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ نہ ہی میں سمجھتا
کہ محض اخبار بازی کی بنیادوں پر کسی کو احتجاج
کے فرقے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اچھا ادیب
اس کا احتجاج اگر اس کی تخلیقات کی بنیاد
نہیں جاتا تو اس کی عمر اس قدر چھوٹی ہوتی ہے
بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کی نسل کے ایک
اظفر جمیل کے یہ اشعار دیکھیں ؎

کب غرض ہے ہمیں درپیش ہنر گوئی سے
مسئلہ صرف کسی کرب کے اظہار کا ہے

پھر کربلا کے دشت کا منظر ہے سامنے
راہِ سفر نہ ڈھونڈ تو عزمِ امام رکھ

ہماری موت کوئی حادثہ نہ تھی اظفر
یہ اک رچی ہوئی سازش تھی مدتوں کی

(بقیہ ص ۱۸۱ پر)

شہر خیال

"سہیل" کا تازہ شمارہ ۴-۵ جلد ۱۹۹۶ء موصول ہوا۔ خوشی ہوئی۔ مظہر امام پر ڈھنگ سے اپنے مضمون کی اشاعت کے لئے شکر گزار ہوں۔

پورا پرچہ پڑھنے کا موقع ملے یا نہ ملے لیکن کچھ اداریے ضرور پڑھتا ہوں جن میں آپ کا اداریہ بھی شامل ہے آپ ہمیشہ ایسے موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں کہ غضب کا ہوتا ہے چند جملے یا زیادہ سے زیادہ ایک صفحہ پر آپ کا نمونۂ نمودِ آفاق بن جاتا ہے۔ یعنی روایت اور جدت کا موضوع کوئی نیا نہیں ہے لیکن اس ہمہ گیر موضوع کو آپ نے اس طرح سمیٹا ہے کہ ایک فکر انگیز شعر بن گیا ہے۔ آپ کی ترتیب بھی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ مثال کے طور پر تین مختلف شخصیتوں کا اس بار انتخاب اس طرح کیا گیا ہے کہ اندرون سے لے کر بیرون تک ان کا مکمل سراپا سامنے آجاتا ہے۔

ظفر ہاشمی، جمشید پور

ماہنامہ سہیل برابر موصول ہو رہا ہے۔ گذشتہ دو چار شمارے کافی معیاری رہا ہے

نیا سہیل پڑھ کر جی چاہا کہ آپ کی محنت کی داد دوں۔ لہٰذا مخاطب ہوں۔ ایمان کی بات ہے اداریے نہایت متوازن اور معیاری ہوتے ہیں۔ مضامین کے موضوعات بھی منفرد ہیں۔

آپ کی زبان و ادب کی خدمت قابل تحسین ہے۔ جملہ احباب کو واجبات۔

رفعت اختر، ٹونک

ادھر کئی شماروں میں بنود کے تحت جو کچھ بھی آپ تحریر کر رہے ہیں قارئین کو اس کے مطالعہ سے حوصلہ مل رہا ہے۔

اور سب سے خوشی کی بات تو یہ ہے کہ "سہیل" اپنے معیار کی طرف لوٹ رہا ہے۔

یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ آپ کہانی پر توجہ دے رہے ہیں۔

شعری حصہ غنیمت کی منزل سے آگے سفر کر سکتا تھا۔ اگر آپ نگاہ انتخاب کو تھوڑا سا روک کر رکھتے مگر" رؤف خیر، جگن ناتھ آزاد" کی شعری تخلیقات شعری حصے کی آبرو بچائے گئی۔

شارق عدیل، علی گڑھ

سہیل کا تازہ جلد ۴-۵ سے نواز ہوا۔
سرورق بیکاسو کی فنکاری کی یاد تازہ کر رہا ہے
اس بار نمود کے تحت "روایت اور جدت"
معتدل اور فکر انگیز اداریہ ہے۔ آپ کے اداریوں کا
کوئی جواب نہیں، کوزہ کو دریا سمونا اسے کہتے ہیں۔
محترم علی جواد زیدی کا مضمون یاد نگاری۔
ان کے مخصوص انداز نگارش کا حامل ہے۔ مظہر امام سے
متعلق ظفر ہاشمی کی تحریر قابل مطالعہ ہے۔ احمد وکیل علیمی
نے پروین شاکر کی شاعری اور ان کے فکر و فن کے بارے
میں جو تاثرات پیش کئے ہیں، اس سے ان کی شاعری کے
معنوی اور فکری جہت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ موصوف
نے پورے خلوص سے پروین کی شاعرانہ اہمیت کا جائزہ
لیا ہے۔ جس سے مضمون نگار کے عمیق مطالعہ اور سخن
فہمی کا پتہ چلتا ہے۔
شعری حصہ میں محترم جگن ناتھ آزاد کی غزلیں
حاصل شمارہ ہیں۔ اس کے علاوہ عبدالمتین نیاز کی عہد
نامکاسی غزلیں بھی خوب ہیں۔ میں آپ کے نظر انتخاب
کا قائل ہوں۔ سخاوت شمیم، اور سید احمد سحر کی بھی غزلیں
پسند آئیں۔

رسالہ ہر لحاظ سے معیاری اور ہم عصر ادب کا
ترجمان ہے۔

——— نسیم بن آسی، مغلسرائے

"سہیل" جلد ۴-۵ موصول ہوا، شکریہ۔ یوں
تو اس شمارے کے سبھی مضامین، افسانے اور غزلیں

کے تحت جناب عبدالمتین نیاز کی جو غزلیں شائع ہوئی
ہیں ان میں سے چند غزلیں کافی اچھی ہیں اور فکر و فن کا
خوبصورت نمونہ ہیں۔

——— شیریں اختر، گیا

— بقیہ:۔ ناٹک —

قاسم کی اماں، میں بے حس نہیں ہوں، ہاں بے حس ہونے
کا ناٹک ضرور کرتا ہوں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ رسول میاں
تم چلو بھر پانی میں کیوں نہیں ڈوب مرتے۔ یا خود میں ہی
اپنے آپ سے یہ سوال نہ کر بیٹھوں کہ تم کس نصب العین
کے تحت جیتے رہے ہو رسول میاں؟ یہ ناٹک آج سے اور
اس وقت سے تم بھی شروع کر دو قاسم کی اماں۔ تم نے
دہلی میں کون کون سے کارنامے انجام دیئے؟ قاسم کب
جیل سے باہر آئے گا؟ ذکیہ اور مالو نے کیا کیا گل کھلائے
۲۵ گز کا پلاٹ دہلی کے کس خطے میں ملا؟ منی کو ناحق کیوں
مار ڈالا؟ (رسول میاں کے اس آخری جملے پر زیب النساء
پھر ایک بار کانپ ہیں) ہاں قاسم کی اماں۔ کوئی بات
چھپتی تھوڑی ہی ہے۔

دہلی

پرنٹر، پبلشر، اڈیٹر: منظر نے لیبل آرٹ پریس
شاہ گنج پٹنہ ۶ سے چھپوا کر دفتر سہیل ریلوے سائیڈ
روڈ گیا سے شائع کیا

براہ کرم اپنے مضامین اور خطوط صاف اور
خوشخط ارسال کریں۔

ماہنامہ سہیل گیا

▲ چیف ایڈیٹر ▲

مسعود منظر

★

▲ ایڈیٹر ▲

جمیل منظر

●

خوشنویس :۔ سید عبدالاحد گیاوی

فہرست

شمارہ ۳ جلد ۵۶

بدلِ اشتراک

فی شمارہ	۵ روپے
زرِ سالانہ	۵۰ روپے
الف ممبری	۱۰۰۰ روپے

▲ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سہیل

ریلوے سائیڈ روڈ ، گیا۔

فون نمبر :۔ ۲۱۵۴۳

درخت لگائیں۔ ماحولیات کو بہتر بنائیں

(۱) انسان اس سرزمین کی سب سے بڑی جاندار ہے۔ اس کی حفاظت کرنا فرض ہے۔

(۲) یہ اس کا فرض ہے کہ اس کے مہیا وسائل کا استعمال پورے ویدک سے کریں۔

(۳) اس کے وسائل کا استعمال غلط طریقے سے نہیں کرتے ہوئے اس کی حفاظت آنے والی نسل کیلئے کریں۔

(۴) خود اعتمادی زندگی کا بہتر لائحۂ عمل ہے اس سے فرار نقصان دہ ہوگی۔

(۵) بلاشبہ حفاظت کے خطرات بڑھ جائیں گے۔ ماحولیات اتنا پراگندہ ہوجائیگا کہ کائنات کی بربادی کی وجہ بن جائیگا۔

(۶) سرزمین کا وجود صرف انسانوں کیلئے ہی نہیں ہے اس پر جنگلات اور جنگلی جانوروں کا بھی حق ہے۔

(۷) یہ کبھی نہ بھولیں کہ پودوں اور حیوانوں کی زندگی اس سرزمین پر پہلے ہوتی تھی انہوں نے ہی بہتر حالات پیدا کئے جس سے انسان کا اسی سرزمین پر افزائش ہوئی۔ آج بھی انکی اہمیت برقرار ہے۔

(۸) **درخت لگائیں** ۔ جنگل اور جنگلی جانوروں کی حفاظت کریں اور اس سرزمین کی ماحولیات کو بہتر بنائیں۔

جاری کردہ: **محکمہ جنگلات و ماحولیات، بہار**

P.R-NO-51D (Inf-16) 96-97

نمود

تاریخ ادب کے دو سیاہ حاشیے

سال رواں کے تاریخ ادب میں مزید دو سیاہ حاشیے جڑ گئے ہیں اور یہ سیاہ حاشیے ظفر اوگانوی اور شین مظفر پوری کی یاد میں آنسو بہاتے نظر آرہے ہیں۔ ملک کے ادبی نقشہ پر بہار کا نام جلی حروف میں اجاگر کرنے والے یہ دو اہم نام دھندلے ہو گئے۔ یہ حادثہ ہو گیا۔ لیکن بہار میں اردو داں ادیبوں اور دانشوروں کے درمیان کوئی ہلچل نہیں مچی۔ کچھ تعزیتی جلسے ہوئے اور بس! لیکن یہ گلہ ہی بے سود ہے کیوں کہ بہار کے ادیبوں کے متعلق ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ کسی کو بھی اپنا ہی قد ناپنے سے فرصت نہیں جو دوسروں کی فکر کرے۔ ظفر اوگانوی کو مجموعی ادبی خدمات کے لئے عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ سے نوازا گیا اور شین مظفر پوری کو بھی راشٹر بھاشا پریشد اور اردو اکادمی نے ادبی خدمات کے سلسلے میں ایوارڈ دیئے لیکن چراغ زندگی کے بجھتے ہی سبھی پروانوں نے ان دونوں کی خدمات کو یکسر فراموش کر دیا۔ یہ رویہ بہار کی تاریخ میں ہمیشہ ایک سیاہ دھبہ کی شکل میں قائم رہے گا۔ بہار کا یہ المیہ ہے۔

ظفر اوگانوی نہ صرف اپنے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں بلکہ ان کا شمار بہار کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ ان کی طرف سے بے اعتنائی کی وجہ، ممکن ہے، یہ بھی رہی ہو کہ ظفر اوگانوی اپنے لئے اردو کے صرف اسی ناقد کو اہم جانتے تھے "جو بین الاقوامی، ادبی، سائنسی اور سماجی نظریات و اقدار کی خامیوں سے آگاہ ہیں اور جنہوں نے خلوص دل کے ساتھ اس منظر میں نئی کہانی کے آرٹ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔"

شین مظفر پوری کے ساتھ کوئی علامت توقیر (STATUS SYMBOL) نہیں تھی ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ کم و بیش تین سو افسانوں، متعدد ناولوں اور ناولٹ اور کم از کم دس ہزار صفحات اخباری ایڈیٹوریل کے باوجود وہ اردو اکادمی کے ماہنامہ کے دفتر کے ایک گوشۂ گمنامی میں پڑے رہتے۔ انہوں نے اپنی زندگی ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دی لیکن انہیں کیا ملا؟ معاشی بدحالی جس کے زخموں سے وہ ہمیشہ تڑپتے رہے اور سینکڑوں کرچیوں کی چبھن لئے وہ اپنے قلم کی نوک سماجی بگاڑ کا آپریشن کرتے رہے۔

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

اقبال کی تصنیف
"فارس میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا" تجزیاتی مطالعہ

اس حقیقت کے پیش نظر کہ شاعر اقبال کے نام و شعری مرتبہ کا مضمرات ذہنی نیز حصولِ زر و شہرت کے تحت بیجا استحصال کیا جا رہا ہے راقم الحروف نے اپنی تصنیف۔ IQBAL IN FINAL CUNTDOWN۔ (یعنی تجزیاتی معکوس شماری میں؛ اقبال) جملہ تصانیف و تخلیقات کا بے لاگ جائزہ سپردِ قلم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں ایک پورا باب۔ THE DEVELOPMENT OF META-PHYSICS IN PERSIA۔ اسی موضوع پر مرتکز ہے۔

پہلے اس تصنیف کے پس منظر سے واقفیت ضروری ہے۔ اقبال نے اپنے مقالہ بعنوان۔ THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA۔ کو ۱۹۰۷ء ۷ مئی CERTIFICATE OF RESEARCH۔ حاصل کیا۔ ملحوظ رہے یہ سند حاصل کرنا ضروری ہو گیا تھا کیونکہ اس کو لکھ کر وہ B.A ہو سکے۔ کیونکہ اقبال پنجاب یونیورسٹی سے ایک دفعہ ناکامیاب ہو جانے کے باوجود تھرڈ ڈویژن ہی میں ایم۔اے (فلسفہ) پاس کر سکے۔ بی۔ اے میں بھی تھرڈ ڈویژن تھی لہٰذا بار۔ایٹ۔لا ڈگری امتحان میں شمولیت کے لئے ان کے سامنے صرف ۲ ترجیحات تھیں، انگلینڈ میں انٹرنس پاس کرنا یا مقالہ لکھ کر اپنی تعلیمی استعداد (QUALIFICATION) کو B.A کی ڈگری حاصل کرنا۔ ان کا فیصلہ درست تھا۔ کہنے والے لاکھ کہتے رہیں کہ ان دنوں کیمبرج میں Ph.D کا اہتمام نہ تھا۔ مزید برآں بی۔اے ڈگری جس کو نمائشوں کی زینت بنایا جا رہا ہے۔ محض جعلی ہے کیونکہ بی۔اے ڈگری میں ان کا نام SHEIKH MOHAMMAD IQBAL B.A۔ ہی جھوٹ کو سامنے لے آتا ہے کسی ڈگری میں B.A کیونکر لکھا جا سکتا ہے۔ اقبال نے میکٹگرت (MC TAGGART) کی نگرانی اور ایچ سڈوک (H.SIDWICK) کی شاگردی میں سارٹیفیکٹ کے لئے اپنا مقالہ تیار کیا تھا، اور یہ مقالہ بادی النظر ہی میں

ھ۔ ھ کے معیار و ملتزمات پر پورا اترتا نہیں معلوم ہوتا۔ بزم اقبال لاہور نے اس کا پہلا ایڈیشن شائع کیا جس کا پیش لفظ ایم۔ ایم۔ اشرف نے قلمبند کیا ہے۔ موصوف نے پیش لفظ میں اعتراف کیا ہے کہ ..... مقالہ Marks of Immaturity یعنی عدم بلوغیت کے نشانات سے بری نہیں ہے ... " یہ اعتراف خاصا اہم ہے۔ مزید براں، اقبال جرمنی میں ۲۰ جون سے لے کر ۵ نومبر ۱۹۰۷ء میں یعنی صرف ۴ ماہ ۱۱ دن ہی رہے۔ اس قلیل مدت میں کوئی شخص کسی غیر ملکی زبان پر عبور حاصل نہیں کر سکتا۔ قیاس یہی ہوتا ہے کہ جناب ایملی اما ویگینٹ (Emilie Emma wegnast) جن کی نگرانی میں اقبال جرمن زبان سیکھنے کے لئے کوشاں رہے انہوں نے مقالہ ہذا کو جرمن زبان میں منتقل کرایا ہوگا مزید برآں اقبال کو زبانی امتحان اقبال کو زبانی امتحان (VIVA VOCE) کے لئے سوالات و جوابات حفظ کرا دیئے ہونگے۔ ملحوظ رہے جرمنی ویارک اور سنسکرت زبانوں، ادبیات اور مذہبیات کا یوروپی مرکز ہے اور اسلامیات کے لئے پیرس یعنی فرانس کے دارالخلافہ میں شہرت یافتہ رکز رہا ہے۔ غالباً اسی خیال کے تحت اقبال نے میونخ (MUNICH) یونیورسٹی سے رجوع کیا ہوگا۔

مقالے کے دیباچے میں اقبال نے لکھا ہے

" ..... اس تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ فارسی مابعد الطبعیات کی تاریخ پر آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک اساسی وزینہ (GROUND WORK) فراہم کراؤں۔ نظر ڈالتے وقت اس کام کے اور تکمیل ہونے کی توقع تو نہیں کی جا سکتی۔ بہرحال میرا مقصد

پوری طرح تاریخی سطح ہی ہے .... دو نکات پر توجہ کا طالب ہوں۔

(ا) فارسی فکر و نظر کا ارتقائی پہلو پیش کرنا ... (اور) اس کی موجودہ فلسفے کی زبان میں تشریح کرنا۔

(ب) تصوف پر میں نے زیادہ مربوط انداز۔ (scientific) میں پیش کرتے ہوئے میری کاوش یہی رہی ہے کہ وہ محرکات و اسباب جن سے یہ منظرہ (PHENOMENON) پیش آیا ان پر منطقی انداز میں زیر بحث لانا۔ کرنے کو دعوے تو کر دیئے مگر کیا اقبال کی ایرانی فکر و نظر پر گرفت مطلبوط تھی۔ پہلے باب بعنوان۔ PERSIAN DUALISM ZOROASTER یعنی تصور ثانیت: زرتشت ہی سے اس سوال کا جواب منفی نظر آتا ہے۔ یہ باب بدرجہ سطحی و ناقص ہے۔ قیاس یہی گذرتا ہے کہ اقبال نے زرتشت کے اوستا کا مطالعہ ہی نہیں کیا تھا۔ ہر ایک سنجیدہ اسکالر بمبئی میں قائم رہنمائے مزدیان سبھا سے ضرور رجوع کرتا پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک انجمن اور وجود میں آئی ہے۔ جو آج تک فعال ہے۔ نام ہے۔ PAND - NAMAH - ...AR BAD MARSPAND انجمن پارسیان بھی سرگرم کار اور بڑی فعال تنظیم ہے۔ غالب امکان یہی ہے کہ اقبال نے گاتھا (GATHA) کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ Dr. L. H. Mills (ڈاکٹر ایل۔ ایچ۔ ملز) کے خیال سے گاتھا کی زبان ویداں کی زبان سے مماثلت تو رکھتی ہے مگر ہے اس کے بعد کی۔ رگ وید ...ہ ق میں مرتب ہوا جب کہ

گاتھا کو قریب ... ۱۵ ق م میں مرتب ہوتا دکھائی دیتا
ہے۔ اوستا اس کی تفسیر ہے جو ویدک رچاؤں کی
تفاسیر سے مماثلت رکھتی ہے۔ اقبال کو یہ بھی معلوم
نہ تھا کہ اوستا کا AZATA (ازاتا) بالکل ویدک
YAGNA (یجن) جیسا ہی ہے۔ کاش وہ فردوسی کے
شاہنامہ کو بھی مطالعہ میں لائے ہوتے۔ پارسیوں
کو آتش پرست سمجھنا غلط فہمی پر مبنی خیال ہے۔ فردوسی
نے کہا ہے ؎

نہ گوئی کہ آتش پرستاں بودند
پرستندۂ پاک یزداں بودند

اقبال کی غلط فہمی یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے MITH
RAISM (متھرا ازم) کو بھی زرتشتی خیالات کا
ایک رخ بتا ڈالا۔ متھرا زرتشتی تصور میں صداقت اور
روشنی کو کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ ZOROASTRIAN
RELIGION & CUSTOM (TARAPORE-
-WALA -SON & CO. BOMBAY
جو E.S.D. BHARUCHA نے سپرد قلم کی ہے۔ مزید
برآں اقبال نے موبد کی تصنیف دبستان مذاہب
کو بھی صرف نظر کر دیا ممکن ہے کہ انہیں اس کا علم
ہی نہ ہو۔ اقبال کے شعری مجموعہ "جاوید نامہ" میں صرف
"زروان" کا ذکر ملتا ہے، جسے انہوں نے برگساں کے
SPACE-TIME CONTINUUM یعنی زماں و مکاں
کے مفہوم میں ایک کردار دیا ہے۔ اوستا کے چاروں
حصوں یعنی "یسنہ" "دسپارد" "وندیداد" اور
"خردہ اوستا" میں زراوان (ZRAVAN) ملتا
ہے جو سنسکرت کے لفظ کال (KALA) کے
مترادف ہے جس کے معنی "زمان و مکان" ہی ہوتے
ہیں۔ زروان کو زرتشتی "زمان ابدی، زمان مسلسل نیز
مکان پر محیط سمجھتے ہیں۔ غالباً اقبال کو یہ بھی معلوم نہ
تھا کہ "ایران" جمع ہے "ایرا" کی جو "آریہ" کا ہم معنی ہے
ایران کے معنی ہوئے "آریوں کا مسکن"

باب ۲ میں منی (MANI) اور مزدک MAZ-
(DAK) کو ۲۱۶/۲۱۵ عیسوی کی ترویج بتایا گیا ہے
جو صحیح نہیں ہے۔ دراصل (MAAN) منی (MUNI) کی
مسخ شکل ہے۔ گوتم بدھ کو بھوٹان، تبت، لیہہ، سکم
وغیرہ میں منی ہی کہا جاتا ہے۔ مزدک کی تعلیمات کا زمانہ
اقبال کے نزدیک 578-۵۳۱ تھا مگر انہوں نے
کوئی سند پیش نہیں کی ہے۔ سبط حسن نے اپنی کلاسیکی
تصنیف "موسیٰ سے مارکس تک" میں مزدک تعلیمات کو با
حوالجات منی کی تعلیمات سے عبارت بتایا ہے۔ "موسیٰ
سے مارکس تک" میں پورے ۲۰ (بیس) صفحات میں اسی
موضوع پر وافر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب ۲ کا عنوان ہے

THE NEW PLATONIC ARISTONTELI
-ANS OF PERSIA یعنی ایران کے نو افلاطو
ارسطوی۔ یہ عنوان ہی غیر واضح ہے۔ کیونکہ ضروری
تھا کہ نو افلاطونی و ارسطوی خیالات و تصورات
کی باوضاحت تشریح کی جاتی اور بتایا جاتا کہ ایران پر
وہ سب کیونکر در آئے۔ اقبال یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ
عرب فتوحات ایران کی تعقلی و ثقافتی پہلو پر اثر انداز
نہیں ہو سکیں مگر عدم وضاحت نیز عدم حوالجات نے
پورے باب کو حکائی کر ڈالا ہے۔ ڈاکٹر نشر لیعقی نے ا

معروف و مشہور تصنیف SHIISM IN PERSIA میں شیعی عقائد کو ایرانی RESPONSE (جواب) بتایا ہے۔ مزید براں، اقبال نے شیعہ فرقوں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، زیدی، اسمٰعیلی، بوہرہ، خواجہ، روشنیہ وغیرہ باب ۳ اور بھی حوصلہ شکن ہے۔ باب تین حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے میں جو ۲۸ صفحات کو محیط ہے بتایا گیا ہے کہ بصرہ شہر کاروباری مرکز بھی رہا اور فلسفہ کے مختلف دبستانوں کی محفل بھی بنا۔ یونانی فلسفہ، عیسائی مابعد الطبیعیاتی تصورات، بودھ خیالات مانی خیالات اور مشرکانہ میلانات و رجحانات وغیرہ کے اثرات بھی بصرہ پر مرتب ہوئے۔ فاضل مقالہ نگار نے یہ بتانے کی ضرورت و اہمیت کو نظر انداز کیا کہ مابعد الطبیعیات، عقلیات، مادیت وغیرہ کے مفاہیم میں کیا ؛ حصہ دوم میں مشرکانہ رجحانات، تصوف اسمٰعیلی خیالات کا فروغ۔ وغیرہ پر زور صرف کیا ہے جو اقبال کی ناواقفیت نیز کمزوری کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ریسرچ نہیں ہے، اِدھر اُدھر سے اکٹھا کئے نوٹس (NOTES) بھری ہیں۔ ۱۹ویں صدی کے فارسی اور فرانسس میں کئے گئے کام کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا ہوگا۔

چوتھے باب میں اقبال نے تصوف کے تصورات کے مفاہیم و مطالب پر پچھلے باب میں کوشش ہی نہیں کی اور اس باب میں IDEALISM & REALISM (عینیت اور واقعیت / حقیقت کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ ریسرچ کی روح کی صحیح پہچان رکھنے والا اس بحث کو پچھلے باب ہی میں ضم کر دیتا۔ بہر کیف، اقبال نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ سب کا سب REHASH (سڑی گلی اشیا) ہے، اگر شامل نہ بھی ہوتا تو موضوع پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

پانچواں باب، تصوف کے متعلق ہے جو اقبال نے صوفی سے عبارت اصطلاح بتایا ہے۔ میری دریافت اس کے مختلف ہے۔ اپنی تصنیف ISLAMIC MYSTICIM: SUFISM (STERLING) - میں میں نے اس کو یہودی اصطلاح تصوف EN SOF (ان صوف) سے عبارت سمجھنے پر دلائل پیش کئے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ تصوف آغاز اسلام سے پہلے موجود تھا "ان صوف" کے تصورات اسلامی تصورات میں ایران میں باختہ ہو گئے جس کے لئے وہاں آریائی تصورات تبوسط زرتشتی و منی خیالات پہلے ہی سے موجود تھے۔ تصوف کو آج کل کے محاورہ میں MUSLIM LIB-ERATION THEOLOGY - یعنی آزاد مسلم الٰہیات کہا جا سکتا ہے جو محبت و صلح کا بے مضمرات مذہب ہے۔ اقبال مواخذ کی نشاندہی ہی نہیں کرتے۔ صرف داستانی انداز میں تحریر ہی کئے جاتے ہیں لہٰذا یہ پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے کشف المحبوب" اور سکنات الیا" جیسے جریدوں کو بھی سامنے رکھا یا نہیں۔ غالباً وہ ناواقف محض رہے۔ صوفی اصطلاح "فنا" کو نشانہ بنانے میں بری طرح ٹھوکر کھائی ہے۔ دراصل "فنا فی اللہ" اور "باقی باللہ" میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ سب کچھ PSYCHOLOGICAL COND-ITIONING - یعنی نفسیاتی کیفیت کی تنظیم بھری ہے بقا اور فنا لہٰذا دونوں اصلاحات ایک ہی آہنگ معنی رکھتی ہیں۔ اقبال MAYA (مایا) کو بھی نہیں سمجھ سکے

"ستیہ چت آنند" (Satya Chitta Anand) میں ستیہ کا مطلب Reality یعنی صداقت ہی سے ہوتا ہے۔ سنسار دنیاوی مظاہر سب صداقت ہی ہیں مگر یہ سب کے سب گزراں بھی ہیں۔ اقبال نے Aham Brahmasmi کا ترجمہ I am God کیا ہے جو غلط ہے۔ یہ صحیح ہوگا۔ — I am what is Brahma — یعنی "انا الحق" (میں "حق" ہوں) اس میں لفظ "حق" کے معنی کا پھیلاؤ خاصا وسیع ہے۔

اقبال نے کئی جگہ یہ لکھا ہے کہ Arabic mind is pragmatic یعنی عربی دماغ عملی ہے مگر کہیں "عملی" کی وضاحت نہیں کی گئی ہے جس کا معیار مقتضی رہتا ہے۔

اقبال نے صرف ۲ صفحوں ہی میں "بہائی" مذہب کا ذکر کیا ہے اور کچھ "بابی" خیالات کا ذکر بھی کیا ہے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے "ایرانی دماغ" (؟) کو دو طرف سے ثانیت (Dualism) کا شکار کہہ ڈالا ہے، پہلے ایرانی دماغ قبل اسلام مجوسی ثانیت نیز بعد اسلام "یونانی" ثانیت۔ اقبال نے بابی خیالات کے اثرات کا اعتراف بھی کیا ہے اور یہ بھی برسبیل تذکرہ کہہ ڈالا ہے کہ آغا محمد خاں قاذار کے دور میں بہائی خیالات سے متاثر ہو کر قازار دور میں اصلاحیں بھی کی گئیں۔ قازاری دور ۱۹۲۵ء۔۱۷۹۴ء تک رہا۔ یعنی جب اقبال نے اپنا نام نہاد تحقیقی مقالہ لکھا تب بھی قازاری شہنشاہیت تھی۔ اقبال نے تاریخی پس منظر کو نظر انداز ہی کر دیا ہے۔ یہ حقیقت در خود اعتنا ہے کہ مذہبی تصورات کو تاریخی پس منظر میں ضرور دیکھا جانا چاہیے۔ اقبال کو اس کا علم نہ تھا کہ بہائی مذہب ہر مذہب کو درست گردانتا ہے، وہ ایک دنیا، ایک سرکار، عالمگیر تعلیم اور مکمل صلح جوئی کا تصور پروان چڑھاتا ہے۔

اس مقالے میں پہلے انسان کا متعلق پر نظر الحلی کا تصور شامل نہ تھا، یعنی کیمبرج کی بی اے ڈگری حاصل کرنے کے لئے لکھے گئے مقالے میں شامل نہ تھا۔ یہ باب بھی دوسرے ابواب کی مانند تشنہ ہے مزید برآں شروع سے آخر تک، ابواب میں باہم رشتگی کا فقدان ہے یعنی ایک باب کا دوسرے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ تمام ابواب کو علاحدہ علاحدہ تحریریں سمجھا جا سکتا ہے۔ ریسرچ میں ارتباط و باہم رشتگی ضرور ہونا چاہئے۔

شاعر بمبئی کے مدیر افتخار امام صدیقی نے خصوصی اقبال نمبر ۱۹۸۸ء میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ "ایک سوال یہ بھی بنتا ہے کہ بی۔اے کا مقالہ معمولی ترمیم و اضافہ کے بعد پی ایچ کا تھیسس کیسے بن گیا"؟ (ص ۴۰۳ اقبال خصوصی نمبر شاعر ۱۹۸۸ء) اور فی الواقع اس سوال کا جواب ہو ہی نہیں سکتا۔ "نابلوغیت" سے بھرپور باہم رشتگی وارتقا سے محروم متعدد تحریروں کو من حیث المجموع ریسرچ تھیسس نہیں سمجھا جا سکتا۔

پیش نظر تحریر سے ابھرنے والے منتجات درج ذیل ہیں۔

۱۔ اقبال کی یہ تصنیف تحقیقی مقالہ نگاری کا ثبوت فراہم نہیں کرتی، صرف اس کو درسی مضمون نگاری ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

۲۔ شروع سے آخر تک کہیں حوالے نہیں ملتے۔ حکایتی انداز بیان ہے اور بس۔

۳۔ کتابیات کے تحت ابتدائی ماخذ اور ثانوی ماخذ ہر تحقیقی مقالے میں ہوتے ہیں مگر اقبال کی تصنیف بالکل عاری ہے

(بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

مظہر امام

خیالات

(قسط ۳)

• جدید اردو شاعری

ہر ادب اپنے وقت میں جدید ہونے کا دعویٰ
ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد جو ادیب اور شاعر سامنے آئے
وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہوں یا ادب برائے
ے، وہ اپنے آپ کو جدید یا نیا کہتے تھے اور ان
ب نئے ادب کے زمرے میں شامل تھا۔ سنہ ۵۴-۱۹۵۳ء
آتے ان کا ادب پرانا ہو گیا اور ایک نئی نسل ابھری
نسل کی رہنمائی اور ہم سفری کی سعادت اس نسل کو
ل ہوئی جو سنہ ۵۵-۱۹۵۴ء کے آس پاس اپنے وجود کو
چکی تھی۔

سنہ ۵۲-۱۹۵۱ء تک اردو شعرا، بلند آواز میں گفتگو
تے تھے۔ شاید انہیں اپنی بات سامعین تک پہنچانے کے
س کی ضرورت بھی تھی۔ پھر جب انہیں احساس ہوا
ری اور سامع دونوں ان سے مخاطب ہیں۔ ان سے
ہیں، تو پھر اونچی آواز میں باتیں کرنا ضروری نہ رہا۔
روں اور مدھم لہجے میں ہی نہیں۔ سرگوشیوں میں
بھی باتیں ہونے لگیں۔ سنہ ۵۵-۱۹۵۴ء کے بعد کی شاعری
میں لہجے کا یہ فرق واضح ہے۔

جدید شاعری میں کئی رنگ ہیں — چکا چوند
پیدا کرنے والے، شوخ، نرم، ہلکے۔ ان سب کا اپنا
حُسن ہے۔ اس دوران پیکر تراشی اور علامت نگاری
کا رجحان ابھرا ہے۔ دو ٹوک، واشگاف، براہ راست
طرز اظہار سے اجتناب برتا جا رہا ہے، کیوں کہ یہ اسلوب
مطبوع نہیں رہا۔ اب اکہری حقیقت نگاری، ڈکشن
کی مرصع کاری، اضافتوں سے پُر فارسی آمیز ترکیبوں کا
دور نہیں رہا۔ البتہ ہیئتی تجربات کی طرف زیادہ توجہ ہوئی
بحروں میں تصرف یا نئی بحریں ایجاد کرنے کا رجحان بڑھا
پرانے علائم کی جگہ نئے علائم نے لے لی۔ ترقی پسند دور
کے مخصوص علائم سحر، خورشید، شمع، طوفان، مے، مقتل
دار وغیرہ کلیشے (CLICHE) بن گئے۔ بے چہرگی اور
تنہائی خصوصی موضوعات قرار پائے۔ وہ بھی اب کلیشے
بن گئے ہیں۔

ہر چند جدید ترین نسل ترقی پسندی اور جدیدیت

دونوں سے انحراف کا اظہار کرتی ہوئی اپنے لئے نئی راہ نکالنے کی سعی میں مصروف ہے، پھر بھی اگر اس وقت کوئی شاعری قابل اعتنا ہے تو وہ وہی ہے جسے جدید شاعری کہاجاتا ہے۔ اور جس کی ابتدا ۱۹۵۵ء کے آس پاس ہوئی تھی۔ اور جو ۱۹۶۰ء کے بعد محترم اور معتبر بن گئی۔ اس کے نمائندہ شاعروں میں (ہندوستان کی حد تک، خلیل الرحمٰن اعظمی، قاضی سلیم، بلراج کومل، کرشن موہن، شاذ تمکنت، وحید اختر، باقر مہدی، حسن نعیم، عمیق حنفی، عزیز قیسی، محمد علوی، شہریار، زبیر رضوی، مخمور سعیدی، بشر نواز، حامدی کاشمیری، بانی، بشیر بدر، کمار پاشی، سبل کرشن اشک، ندا فاضلی وغیرہ کے نام لئے جاتے ہیں۔

○ تصوف اور صوفیت

شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا نے تصوف کی مختصر تعریف یہ کی ہے کہ تصوف نام ہے احسان اور اخلاص نیت کا۔ احسان کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر لمحہ اپنے آپ کو خدا سے قریب محسوس کرے، گویا خدا اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اخلاص نیت سے مراد یہ ہے کہ انسان خیال انجام سے بے نیاز ہو کر ہر کام خدا کی خوشنودی کے لئے سرانجام دے۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے نزدیک تصوف ایک ایسی عمارت ہے جس کی ابتدا علم سے ہوتی ہے۔ جس کی درمیانی منزل عمل ہے اور آخری عشق۔ حضرات چشتیہ کی تعلیم سلوک میں سب سے اہم مقام "عشق" کو حاصل ہے۔ گویا عشق کا مرتبہ علم اور عقل سے افضل ہے۔ مولانا آزاد نے "حیات سرمدؒ" کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ جس میں انہوں نے سرمد کا دفاع کرتے ہوئے اس کی بے لباسی اور عریانی کے لئے کئی جو[ا]ز پیش کیا ہے اور عشق مجازی کو عشق حقیقی تک پہنچنے [کا] وسیلہ بتایا ہے۔

ہر چند رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں تصوف کے [نقوش] نمایاں ہیں۔ لیکن اسلام کے ابتدائی دنوں میں یہ اِ[صطلاح] وضع نہیں ہوئی تھی، پہلے شخص جنہیں "صوفی" [کہا] گیا، وہ ابو ہاشم کوفی تھے جن کی وفات آٹھویں [صدی] عیسوی کے وسط کے آس پاس ہوئی۔ اسلام کے ا[بتدائی] صوفیوں میں ابراہیم ادھم، داؤد طائی، رابعہ بصری، [فضیل] بن ایاز، بایزید بسطامی، جنید بغدادی اور ابو بکر [شبلی] کے نام آتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد یہا[ں] بھگتی تحریک پر صوفی مسلک کے اثرات نمایاں ہوئے [اور] صوفیوں نے بھی بھگتی تحریک سے استفادہ کیا۔ ہند[وستان] میں اسلام کی اشاعت میں مسلمان بادشاہوں کی عظ[مت و] جبروت سے زیادہ صوفیائے کرام کی دی ہوئی اخ[لاقی] اور روحانی تعلیم کا حصہ ہے۔ صوفیوں کے یہاں محبت، رواداری اور خدمت کا جو جذبہ تھا، اس نے ا[نسان] دوستی کے تصور کو فروغ دیا۔ عوام سے قربت اور ا[ن کے] رنج و غم میں ان کی رفاقت کے باعث ان کی ہر دلع[زیزی] بڑھتی گئی اور دلوں پر صوفیائے کرام کی حکمرانی آج بھی [قائم] ہے۔

اقبال کو صوفیوں سے شروع سے عقیدت [تھی] بلکہ ان کی ابتدائی شاعری میں وحدت الوجود کے ا[ثرات] ملتے ہیں، لیکن عجمی تصوف کے مسلک، صوفیت کے [زوال] کے زوال، رہبانی طرز فکر وغیرہ پر انہوں نے "ا[سرار]

خودی" اور "رموز بیخودی" میں تنقیدیں کیں ۔ "اسرار خودی" کے دیباچے میں تصوف اور صوفیت سے متعلق اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا اور حافظ کے تعلق سے جو اشعار کہے، وہ خاصے ہنگامہ خیز ثابت ہوئے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ تصوف نے اسلامی اقوام کو ذوق عمل سے محروم کر دیا ہے اور رہبانیت کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ دراصل اقبال تصوف سے نہیں، بلکہ صوفیا کے اس گروہ سے نالاں اور بیزار تھے، جو ان کے قول کے مطابق:

" ..... شریعت اسلامیہ کو علم حاضر کے حقارت آمیز خطاب سے یاد کیا جاتا ہے اور تصوف سے وہ باطنی دستور العمل مراد لیتا ہے جس کی پابندی سے سالک کو فوق الادراک حقائق کا عرفان یا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔"

حق تو یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ اور مسلک تصوف میں بنیادی طور پر کوئی تضاد نہیں، کیونکہ دونوں خدا تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔ صوفیا نے تصوف کو عین اسلام قرار دیا ہے اور غوث علی شاہ قلندر جیسے صوفی تو عالم باعمل تھے اور شرعی فرائض کے سختی سے پابند تھے۔ پنج وقتی نماز ہی نہیں، تہجد اور اشراق کو بھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔ دراصل صوفیوں کی علامتی زبان کی تشریح و تعبیر نے تصوف کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کیں اور بعض صوفیا کو بھی اسی بنا پر جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ تصوف کے کئی خانوادے، ادارے اور سلسلے اپنے اپنے طور پر اپنے مسلک کی تشہیر کرتے رہتے ہیں۔ تصوف عجز و انکسار اور فقر و فاقہ سے عبارت تھا، اب دنیا پرستی، نخوت اور جاہ طلبی کی شناخت بن گیا ہے۔ صوفیائے کرام نے خدمت خلق کی جو مثال قائم کی تھی اگر وہ جذبہ پھر سے خلوص و صداقت کے ساتھ پیدا ہو جائے تو تصوف کی کرشمہ سازی آج بھی عوام کے دلوں کو مسخر کر سکتی ہے!

● فردوس بر روئے زمیں

ہمیں معلوم نہیں کہ جنت کا رقبہ کیا ہے اور اس کی حدود اربعہ کیا ہیں، لیکن ہم ایک ایسی جنت بر روئے زمیں سے واقف ہیں جو اپنے رقبے اور حدود اربعہ سے نہیں، بلکہ جو اپنے غیر معمولی حسن و دلکشی، زیبائی اور رعنائی کے باعث پہچانی جاتی ہے۔ یہاں دودھ کی نہریں نہیں ہیں، لیکن یہاں کے جھرنوں کا شفاف پانی دودھ سے زیادہ تازگی بخش اور شہد و انگبین سے زیادہ شیریں ہے۔ باغ رضواں سے ہمارا رشتہ صرف تصور کے ذریعہ قائم ہوتا ہے، لیکن اس فردوس ارضی کے باغات اپنے نرگس و نسترن اور اپنے گل و لالہ کی رنگا رنگی کے نادر نمونوں سے چشم و نگاہ کو طراوت بخشتے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں اقبال نے خدا کو "بے حجاب" دیکھا تھا۔

لیکن وادیٔ کشمیر کی تصویر کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ آج بھی یہ خطۂ افلاس اور استحصال کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہوا۔ اور اقبال نے کم و بیش پینسٹھ سال پہلے جو یہ کہا تھا:

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا، امیروں کو دوشالہ

اس کے نظارے آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ آج بھی ایسی نا کتخدا خواتین اپنے ہاتھوں میں مہدی لگنے کا انتظار کر رہی ہیں جن کی عمریں چالیس سال سے تجاوز کر چکی ہیں

کیوں کہ ان کے والدین لاکھوں کا جہیز دینے سے قاصر ہیں۔ چشمۂ شاہی کا وہ پانی جسے پینے کے لئے ہزاروں میل کی مسافت کرکے دور دراز سے سیاح آیا کرتے تھے، آج اس کا اصل ابال معدوم ہو رہا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے وہ انجام کے تصور سے لرز کر آنسو بہا رہا ہو۔ بلند و بالا سایہ دار اشجار کاٹے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ کئی منزلہ عمارتیں اور عالی شان ہوٹل معرضِ وجود میں آ رہے ہیں۔ اور کشمیر کی مشہور جھیل ڈل میں یہاں کی ساری غلاظت جمع ہو رہی ہے۔ اندیشہ ہے کہ آئندہ چالیس سال میں یہ جھیل خشک ہو کر ایک چٹیل میدان میں تبدیل ہو جائے گی۔ یہ غلاظت کشمیر کی روح کو، اس کے تصور کو اور اس کے مزاج کو آلودہ کر رہی ہے۔

پس نوشت :-

یہ تحریر ۱۹۸۹ء کی ہے۔ گذشتہ سات آٹھ سال کے دوران وادیٔ کشمیر میں ظلم و جبر اور قتل و غارت گری کی جو گرم بازاری رہی ہے۔ اس نے اہلِ کشمیر میں دل شکستگی اور مستقبل بیزاری پیدا کر دی ہے۔ یہ خونچکاں داستان چند سطروں میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اس کی روداد پھر کبھی :-

(بقیہ فصلِ آگہی)

صرف یہ عرض کر سکتا ہے کہ سلیم انصاری کی نظمیں قابل توجہ ہیں۔ اور بعض کمزوریوں کے باوجود کئی معنوں میں توجہ انگیزی کی بہترین خوبیوں کی حامل ہیں۔ یہ نظمیں اپنے فکری اسلوب کے اعتبار سے قارئین پر صحت مند بصیرت اور خوشگوار حیرت کا انکشاف کرنا چاہتی ہیں۔ اتنی خوشگوار حیرت —— کہ جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ آگے چل کر سلیم انصاری کے لئے شاعروں کے جمِ غفیر میں اپنی خوشبو کو محسوس کرا لینا ممکن المحال نہ ہوگا

مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ سلیم انصاری بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ اور کچھ ضروری نہیں کہ منہ کا مزہ بدلنے کے لئے غزل بھی کہیں۔ غزل کا دائرہ ویسے بھی بہت تنگ ہے۔ نظم میں نسبتاً زیادہ امکانات ہیں۔ نظم کی ضرورت بھی آج زیادہ ہے۔ اور اگر سلیم انصاری کے سامنے کوئی بڑا امبیشن ہو، اگر وہ اپنی شاعری کے ذریعے کوئی بڑا کارنامہ انجام دینا چاہتے ہوں تو انہیں اپنی تمام تر تخلیقی قوتوں کا استعمال صرف اور صرف نظموں کے لئے کرنا چاہئے۔

فصلِ آگہی پڑھ کر کی نظمیں پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ ان کا مطالعہ سود مند ہے۔ لاحاصل نہیں۔

پرنٹر و پبلشر
این منظر نے نبیل
آرٹ پریس شاہ گنج پٹنہ سے چھپوا کر
دفتر سہیل ریلوے حاصل روڈ، گیا سے شائع کیا

شررغازیپوری
پورٹ بلیر

رباب آب

(قسط دوئم)

میتھولوجی کے نقطہ نگاہ سے انڈمان لفظ ہنومان سے ماخوذ ہے ملایا میں اسے ہنڈمان کہا جاتا تھا اغلب ہے گردشِ ایام کے ہاتھوں یہ لفظ اپنی شکل وصورت بدلتے بدلتے آج انڈمان ہوگیا ہے۔ ہندوستان میں فرنگی دورِ حکومت کے آغاز میں یہ خطہ ارض جنگلی قبائیلیوں کا آشیانہ تھا۔ جزائر انڈمان کے قبائلی لوگوں میں شامل ہیں گریٹ انڈمانیز، اونگیز، جاراواز اور سینٹلیز یہ تمام قبائلی نیگرو نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ برٹش دورِ حکومت میں (تقریباً 1789ء میں) یہاں نوآبادیات کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس کے تحت کیرل اور ملابار کے علاقوں سے موپلا بحیثیت قیدی یہاں لائے گئے اور بسائے گئے۔ بعدہٗ اترپردیش، مدھیہ پردیش سے کسی نہ کسی جرم کے بہتان کے زیرِ اثر فرنگیوں نے ہندوستانیوں کو یہاں لاکر ڈال دیا۔ پہلی جنگ آزادی کے بعد ایک بڑی تعداد میں سیاسی قیدیوں کو یہاں لایا گیا۔ پھر بعد آزادی یہاں کے نوآبادیات میں بنگلہ دیش (مشرقی پاکستان) اور سری لنکا کے مہاجرین سے اضافہ ہوا۔

اس طرح لازماً ان جزیروں میں ہر عقیدہ، ہر منصب اور ہر تہذیب کی جھلکی یہ اتم نمایاں ہے۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی قوم کے لوگ یہاں کے باشندے ہیں۔ نتیجتہً تمام بھارتیہ زبانیں ہندی، اردو، بنگالی، ملیالم تلگو، تامل، پنجابی، کنڑ، اڑیا، مراٹھی، گجراتی، راجستھانی وغیرہ وغیرہ اپنی وجودیت کو قائم رکھی ہوئی ہیں۔ ان کے مابین نہ کوئی ٹکراؤ ہے نہ کوئی لسانی تصادم بلکہ ایک قابلِ احترام اتحاد ہے۔ مذہبی تنازعوں سے پاک یہ سرزمین اپنے آپ میں مہاتما گاندھی کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ ایک خوبصورت منی ہندوستان ہے۔ یہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ شمالی انڈمان مڈل انڈمان اور ساؤتھ انڈمان (جس کا ذکر پہلے باب میں آچکا ہے) یہاں کے جنگلات یہاں کے لئے سبز سونا ہیں جو ۸۰ فیصد زمین کو اپنے آغوش میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

شمالی انڈمان میں دگلی پور کے جزائر شامل ہیں یہاں کی اکثریت بنگالی ہے۔ جہاں بنگالی زبان اپنا اہم کردار نبھا رہی ہے زمین ہموار ہے۔ یہاں ہر موسم کا لطف اٹھایا جاسکتا ہے یہاں کی دھرتی کی کوکھ

ہر فصل کے لئے ایجاد ثابت ہوئی ہے۔ سیڈل پیک یہاں کی واحد پہاڑی ہے جو تقریباً ۷۳۲ میٹر اونچی ہے۔ اسی پہاڑی سے انڈمان نیکوبار کی اکلوتی ندی کلپانگ نکل کر اس دھرتی کو سیراب کرتی ہے۔ موسم برسات میں کبھی کبھی یہ بھیانک روپ اختیار کرکے تباہی کی باعث بھی بن جاتی ہے۔ "برساتی ندی ہو۔ چلی اترائی" لیکن یہ پولیس ہائیڈرو الیکٹرک پروجکٹ کی ماں بھی ہے۔ پورٹ بلیر سے یہاں تک کی آمدورفت کا سلسلہ فیری بوٹوں سے قائم ہے۔

مڈل انڈمان میں خاص طور پر دو جزیرے قابل ذکر ہیں۔ رنگت اور مایا بندر۔ یہ دونوں جزیرے پورٹ بلیر سے ایک سو ستر کیلومیٹر اور دو سو چالیس کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہیں۔ یہ جزیرے بھی اپنے قدرتی مناظر اور ساحل سمندر کی دلفریبی کے باعث ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ برما کے مہاجرین یہاں کے خوشگوار ماحول میں زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ بنگالیوں کی اکثریت یہاں بھی اپنے پاؤں پھیلائے ہوئے ہے۔ یہاں کا معاشرہ وہی ہے جو دکھی پور میں ہے۔ ہری سبزیوں اور سنتروں کی کاشت اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ایک خوبصورت تمدن ایک خوبصورت تہذیب رنگا رنگ مظہریت کا حامل ہے چاروں طرف شادابی اور وجدان کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ یہاں کا گنگناتا ہوا ماحول دل میں سرور اور روح میں نغمگی بھر دیتا ہے۔ یہاں کے مناظر دشت و دمن ذہن پر جو تاثر چھوڑتے ہیں اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ جل کے نیلے سنگھاسن پر بیٹھی جل کامنی دونوں ہاتھوں [illegible] لنگوا اکوامرت نثار کرتے۔ منوہر تن یہ جہاں

ہریرہ پوشاک نگاہوں کو خلد کی جھلکی دکھا رہی ہے جل کامنی کے کانوں میں تاملین جھمکا، نازک کلائیوں میں ملیالی کنگن، زلفوں میں شام اودھ قید، آنکھوں میں بنگالی جادو، ماتھے پر کشمیری بندیا، ہونٹوں پہ ڈوگری تبسم، مدھماتے نینوں میں آسامی کاجل پاؤں میں منی پوری پائل، پائل میں اروناچلی جھنکار، ہاتھوں میں ہماچلی حنا بندی۔ چندا سی پیشانی پر کنٹری جھومر، چہرے پر پنجابی پانی۔ اداؤں میں ہریانوی نمکینی، انداز میں کلنگ کا حسن، جوڑے میں راجستھانی گجرا، مراٹھی لہنگا، بہاری کرتا، تلنگانی دوپٹہ زیب کئے ہوئے بیٹھی ہے کاجل کامنی مدھر منوہر اچھپ لئے ہوئے۔

ساؤتھ انڈمان میں دو تحصیلیں ہیں۔ پورٹ بلیر اور فرار گنج، دونوں تحصیلیں قدرتی حسن سے دھن وان ہیں قدرت نے جی کھول کر ان کی آرائش و زیبائش کی ہے نادر اور قیمتی درختوں سے بھرے جنگلات کی گود میں ناہموار زمین پر بسنے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے مکانات کی بے ترتیبی میں دلآویز ترتیب بکھراؤ میں دلنشیں رچاؤ ایسا لگتا ہے جیسے جنگل کی دیوی اپنے گلے میں رنگ برنگ موتیوں کی مالا ڈالے ہوئے شان بے نیازی سے لبوں پر من بھاون مسکراہٹ سجائے پر تمکنت نگاہوں سے دعوت نظارہ دے رہی ہے۔

یہاں کی ہر بستی دیو مندر سیتار یکتی کی کہانیوں کی طرح بے نیاز تسلسل، منظم، انتشار، بکھراؤ بکف اکائی کو درشاتی ہے۔ ہر چار قدم پہ بدلتی ہوئی زبانیں اور بولیاں، سڑکوں، پارکوں اور بازاروں میں ایک اکائی میں بندھ کر ہندوستانی زبان کا روپ دھارن کرلیتی ہیں۔ زبان نحوی اغلاط سے پامال ہوتے ہوئے بھی

نفیم کے حسن سے سنوری اور نکھری ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں بولی جانے والی زبان میں تقسیم کے المیہ کا دور دور پتہ نہیں۔ یہاں ابھی خدا قتل نہیں ہوا ہے۔ اس گناہ سے یہاں والے ابھی بری الذمہ ہیں۔ دھرتی کے خوبصورت جسم سے لوگوں کی وابستگی قابل رشک ہے۔ کردار و گفتار میں مبہم سا تضاد ناقابل برداشت نہیں۔ حواس کی دھار پر زندگی جیتے ہوئے لوگ مفر کی موت سے کوسوں دور ہیں۔ یہاں در و دیوار پر کبھی سبزے لگتے ہیں۔ ویرانی کا نام و نشان نہیں۔ دشت کو دیکھ کر گھر کی یاد نہیں آتی۔ بارود گدام کے ہوتے ہوئے کبھی بارودی ماحول نہیں۔ ہوائیں ہر کثافت سے پاک و صاف ہیں۔ یہاں رسی رسی ہے ناگ ناگ ہے۔ کوئی کسی کی جگہ نہیں لیتا۔ مجاز و حقیقت غالب و مغلوب نہیں۔ تہذیب و تمدن میں تنوع ہوتے ہوئے بھی اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ کا رواج نہیں۔ ڈیڑھ اینٹوں کی نہ تو مسجد ہے اور نہ ہی کوئی مندر۔ مناسب وقت پر مندروں سے جرس کی صدائیں ہواؤں میں بکھرتی ہیں اور مناسب وقت پر ہی مسجدوں کی اذانیں اطراف میں گونجتی ہیں۔ کوئی ٹکراؤ، کوئی تصادم جنم نہیں لے پاتا۔ ہر شئے میں ایک دلنشیں رکھ رکھاؤ اور رچاؤ ہے۔

یہاں والوں کی نگاہیں بے شک صرف ایک ہی موسم سے مانوس ہیں لیکن یہاں کے لوگ سمندر پار کے سبھی موسموں کا جشن مناتے ہیں۔ جیسا کہ میں جیسا کبھی تہوار کے موقع پر بھاگڑہ رقص کا مظاہرہ بڑی آن بان سے ہوتا ہے۔ ہر طرف ایک نغمہ گونجتا ہوا کانوں تک پہونچتا ہے۔

یہ دیش ہے ویر جوانوں کا
البیلوں کا مستانوں کا
اس دیش کا یارو کیا کہنا
یہ دیش ہے دنیا کا گہنا

پھاگن کے مہینے میں ہولی کی چھب پورے شباب پر ہوتی ہے۔ رنگوں کا تہوار، چھبیل چھبیلا، رنگ رنگیلا جشن جن کے دل پر ایک مستانہ عالم کا نقش مرتسم کرتا جاتا ہے جب جھال مجیرے اور ڈف کے ساز سے پھوٹتے ہیں گیت کے بول ــ

جمنا تٹ شیام کھیلیں ہولی۔ جمنا تٹ
اودھ میں ہولی کھیلیں رگھوبیرا اودھ میں
کس کے ہاتھ کنک پچکاری
کس کے ہاتھ ربیرا
اودھ میں ہولی کھیلیں رگھوبیرا
رنگ برسے بھیگے چنروالی، رنگ برسے
پنگھٹ نا جاؤں پنگھٹ نا جاؤں۔ چھیلا ابیرا
سے مارے لا۔

گانوے کا چھیلا بڑا اتپاتی، کہواں چھپاؤں بلم کی تھاتی۔ گھونگھٹا اٹھائی مکھ دیکھے لا۔

یہاں بھی گانوں کے چھیلے کم شرارتی نہیں ہوتے ہولی کے دن ہر چھیلا کنہیا بن رادھاؤں کو تھگنی کا ناچ نچا دیتا ہے۔ برجوری اور رضامندی دونوں کیفیتیں ہولی کا لطف دوگنا کر دیتی ہیں۔ بسنتی ہوا تالی پہ تالی دے دے گانے لگتی ہے۔ ناچے رادھا دیوانی چھم چھم۔ بلم کی تھاتی یہاں بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ہاں گھونگھٹ اس لئے نہیں اٹھتا کہ یہاں گھونگھٹ صرف لفظ تک محیط ہے

کوئی ہیئت کوئی مظہریت نہیں رکھتا. کوئی گوری گھونگھٹ میں نہیں چلتی. پتہ نہیں سہاگ رات میں رونمائی کی رسم دولہا میاں کیسے مناتے ہوں گے.

پونگل تاملین تہوار ہے. ماہ جنوری میں جب دھان کی فصل کٹتی ہے اور گھروں میں نئے چاول کی آمد ہوتی ہے تو ساری بستی فرصت کے اوقات کا جشن مناتی ہے. پوری بستی خوشحالی کے جھولے جھولنے لگتی ہے. یہ تہوار دھرتی سے لگن کی غمازی کرتا ہوا نظر آتا ہے گھروں کے اندر باہر صفائی کی مہم چل پڑتی ہے. دہلیزوں پر رنگولیوں کے خوشنما بیل بوٹے کنواری دوشیزاؤں کے ہاتھوں تشکیل پانے لگتے ہیں. آخری دن جانوروں کو نہلا دھلا کر ان کی سینگوں کو رنگا جاتا ہے. کسی گائے یا بچھڑے کے گلے میں تولیہ ڈالا جاتا ہے جس میں روپئے بندھے ہوتے ہیں. سارا گاؤں تماشائی بن جمع رہتا ہے جانور کو ہنکال دیا جاتا ہے. گاؤں کے نوجوان اس جانور کے پیچھے بھاگتے ہیں. جانور بھی بھاگتا ہے جو جوان جانور کو پکڑ لیتا ہے. جانور کے گلے میں بندھی رقم اس کا انعام ہو جاتی ہے. گھروں میں پونگل (کھیر) بنا کر دیوتا کی پوجا ہوتی ہے عورتیں سبھ کامنا لیئے ہوئے پونگل گیت گاتی ہیں ؎

پونگل پونگل پال پونئی پونگل
نو اوم پونیم دیٔ ولنگیا
نو اوم پونیم تیرو اوڑے بوہیا
دیی والنگیا واتیہ کنو وڑکا

(میرے دیوتا، تجھے دودھ کا پونگل ارپن کر رہی ہوں. ہمارے لوگوں کو ہر بلا سے محفوظ رکھنا، ہر بیماری سے بچانا. کوئی پریشانی انہیں لاحق نہ ہو. ہم سے ہر دکھ ہر غم الگ اپنے راستے چلا جائے ہماری خوشی کے دنوں کو برے دن کی نظر نہ لگے.

اونم اور مکر سکرانتی ایک تہوار کے دو نام ہیں. اس تہوار کو ملیالی اونم کے نام سے مناتے ہیں اور شمالی ہندوستان کے ہندو بھائی مکر سکرانتی کے نام سے مناتے ہیں اونم سے ایک روایتی کہانی منسوب ہے. صدیوں پہلے کیرل میں ایک راجہ بلی تھے. راجہ ہریشچندر کی طرح دانی، ستیہ وادی. ان کی پوجا اور ارادھنا نے راجہ اندر کو تشویش میں ڈال دیا. اندر کے آگرہ (التجا) پر وشنو بھگوان بونے کا روپ دھارن کر راجہ بلی کی پرکشا لینے راجہ کے دربار میں جا پہونچا. برہمن بن کر بھکشا دان مانگی. بھکشا میں تین پگ زمین کی مانگ کی. راجہ بلی نے خوشی خوشی اس کی اجازت دیدی وشنو نے ایک پگ میں آکاش لوک. دوسرے پگ میں مرتیو اور تیسرے پگ میں پاتال لوک ناپ لی. راجہ بلی کے لئے کوئی ٹھور ٹھکانہ جب نہیں رہا تو وشنو نے انہیں پاتال لوک جانے کا حکم سنایا. راجہ بلی نے التجا کی کہ انہیں سال میں ایک بار اپنی پرجا سے ملنے آنے کا حکم دیا جائے. ان کی یہ درخواست منظور ہوئی. اور تب سے راجہ بلی کے عقیدت مند کہتے ہیں کہ راجہ بلی سال میں اونم کے دن پرجا سے ملنے آتے ہیں. ان کے سواگت میں ہی یہ تہوار منایا جاتا ہے. اس تہوار کے جشن کی تیاری دس دن قبل شروع ہو جاتی ہے. دسویں دن طرح طرح کے پھولوں سے آنگن میں بنے پوجا بیدی کو سجایا جاتا ہے. اور پوجا کی رسم ادا کی جاتی ہے. پوجا منڈپ میں ملیالی عورتیں کچھ اس قسم کا بھجن گاتی ہیں ؎

تاویری باڑ دو کا گرم کالم
مشیر جارم دلو بولے
آموا اوڑے والی کم کالم
الجلم ملا بول [illegible]

(راجہ مہابلی کے دور حکومت میں سبھی لوگ برابر
تھے۔ کوئی چھوٹا بڑا نہیں تھا۔ انسانی زندگی غم واندوہ
سے پاک خوش وخرم تھی چوری چماری تل کے برابر نہیں تھی۔
گندی ذہنیت کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا)

بسنت پنچمی کے دن گھر گھر میں عورتیں پیلی ساڑیوں
میں ملبوس ایسی لگتی ہیں گویا سرسوں کھیتوں کے بجائے گھروں
میں چوپالیوں میں گلیوں میں پھولا ہوا ہے۔ اور ہر طرف اپنی
مہک لٹا رہا ہے۔ نسوانی ہاتھوں کی حنا بندی کسی فائن
آرٹ کی غمازی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جو دل و
دماغ پر پرکیف تاثر چھوڑتی ہے۔

جنم اشٹمی کرشن کا جنم دن آنند سے بھرا
ہوا جوش وخروش میں ڈوبا ہوا ہے۔ امنگوں سے لبریز
گاتا ہوا ناچتا ہوا، مہکتی رات کے آنچل تلے خوشیوں
سے اٹکھیلیاں کرتا ہوا، ہر فرد، ماہ وانجم و کہکشاں
سے نظریں ملاتا ہوا ہر لمحہ ساز دل پہ تھرکتی ہوئی احساس
کی انگلی۔ فضاؤں میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی روح کی
نغمگی مست لیے چھ دن کیا عالم گذرتا ہے۔ آدھی رات
کو ٹھیک بارہ بجے کرشن کنہیا جنم لیتے ہیں۔ گھر گھر سے
[illegible]
پہنچتا ہے ۔

[illegible] دوارے

کوئی لتاوے ان دھن سولڑا
کوئی لتاوے دھن گیتا
بدھیا باجے
جھومتا دوارے
بدھیا باجے

دیوالی بھی بڑے جوش وخروش کے ساتھ اپنا
دکھلاتی ہے۔ [illegible] اس کی شروعات ہوتی ہے۔ ۱۰
رات بھی گھروں میں چراغاں کا اہتمام رہتا ہے۔ دوسری رات
دیوالی کی خاص رات ہوتی ہے۔ گھروں میں، دہلیزوں میں
چوپالیوں میں ہر جگہ جشن چراغاں کسی نوخیز چنچل حوا کی
طرح بل کھاتا اٹھلاتا نظر آتا ہے۔ جگہ جگہ جوئے کے اڈے
جم جاتے ہیں۔ پانسے پھینکے جاتے ہیں۔ پانسے پلٹتے ہیں۔ ہار
جیت کے دور پہ دور چلتے ہیں۔ لیکن داؤ پر دروپدی نہیں
لگتی۔ کبھی دوشاسن کے ہاتھ کسی دروپدی کا چیر نہیں
کھینچتے۔ اس لئے ہم اندرجالی کرشن مراری کی وہ [illegible]
نہیں دیکھ پاتے جسے دیکھ کر لوگ کہہ گئے تھے۔ [illegible]
کی ناری ہے، کہ ناری ہی کی ساری ہے۔ [illegible]
ہا ہے کیونکہ ابھی چیر ہرن کے [illegible]
اللہ بچائے ان بھیڑیوں سے۔ جان بچی لاکھوں پائے

درگا پوجا کا تہوار یہاں کا ایک اہم تہوار ہے
درگا پوجا اور دسہرہ ایک ہی تہوار کے دو نام ہیں [illegible]
دن تک ایک خوشگوار ماحول رہتا ہے۔ جس میں [illegible]
میں رام لیلا کا اہتمام رہتا ہے اور [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

بہت سے بازاروں و دکانوں کی رونق بھی عروج پر ہوتی ہیں۔ خرید و فروخت کی ہما ہمی، گہما گہمی پیدا ہوتی ہے۔ بڑا خرچیلا تہوار ہے۔ اس تہوار کے آخری دو دن بڑے مشغول ہوتے ہیں۔ سڑکوں پر لوگوں کا سیلاب امڈ آتا ہے۔ شانہ سے شانہ چھلتے ہیں۔ زرق برق پوشاکوں میں لوگ دل کو بھاتے ہیں۔ ہر عارض پہ کھلتا ہوا گلاب ہر ہونٹ پر ریشمی تبسم کا رقص، ہر آنکھ سے وصل و ملاقات کی جھلکتی ہوئی شراب، دیار یار کی طرف بڑھتا ہوا ہر قدم، ہر دل میں مطلوبہ دیوی کی دید کا ذوق۔ یہ تمام تر عالم بھلا، من بھاون اور منوہر لگتا ہے۔

محرم کا تہوار بھی یہاں کسی نہ کسی پیمانے پر منایا جاتا ہے۔ پورے مہینے کسی نہ کسی گھر میں مجلس کا اہتمام ہوتا ہے۔ عاشورہ کے دن علم کے ساتھ نوحے پڑھتے ہوئے۔ ماتم کرتے ہوئے شیعی بھائی جلوس کی شکل میں والی پور سے ابرڈین جیٹی تک جاتے ہیں۔ موڑ موڑ پر شربت پینے پلانے کا اہتمام رہتا ہے۔ اس ماتمی جلوس کو دیکھ کر یقین اور محکم ہو جاتا ہے کہ ؎

"قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے"

عید اور بقر عید کے تہوار بھی اپنی روایتی اور تمدنی طریقے سے منائے جاتے ہیں۔ ان دونوں عیدین کے بعد عیدگاہ سے باہر ہندو مسلمان سکھ عیسائی کا ایک دوسرے سے گلے ملنا ایک عجیب سماں باندھ دیتا ہے۔ ان دونوں پرووں میں صرف ہندوستان دھڑکتا رہتا ہے۔ ہر زمین میں یہ شعر گونجتا رہتا ہے ؎

عید کا دن ہے گلے آج تو مل لے ظالم
رسم دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے

یہ ہے انڈمان۔ باپو کے خوابوں کا ہندوستان۔ جہاں سبھی مذاہب کے تئیں رواداری اور احترام کا بول بالا ہے جہاں انیکتا میں ایکتا ہے۔ جہاں اخوت اور بھائی چارے کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں لوگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ جہاں شیشوں کے گھروں سے اڑان بھرتے ہوئے پرندوں کا شکار نہیں ہوتا۔ جہاں انسان کو سر بچانے کی چنتا نہیں ستاتی کیونکہ دور دور تک کسی پتھر کا اتا پتا نہیں۔ اس لئے سرزمین انڈمان کے متعلق یہ کہنا مبالغہ آرائی نہیں کہ ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

(جاری)

— بقیہ اداریہ —

لیکن یہ بے اعتنائی دونوں کے درخشندہ فن کو چھپا نہیں سکتی اور جب بھی اردو افسانہ نگاری کا تذکرہ ہوگا، ظفر اوگانوی اور شین مظفر پوری کا نام نمایاں رہے گا۔

مسعود منظر

دُنیا

ناوک حمزہ پوری
شیرگھاٹی، گیا

بدنام حوالے کی طرح ہے دنیا — چارے کے گھٹالے کی طرح ہے دنیا
مفلس کو ہے بس ایک لنگوٹی کی طرح — منعم کو دوشالے کی طرح ہے دنیا

(۲)

آلام کے دفتر کی طرح ہے دنیا — آفات کے لشکر کی طرح ہے دنیا
داخل جو ہوا اس میں نہ زندہ نکلا — آسیب زدہ گھر کی طرح ہے دنیا

(۳)

زردار، گھمنڈی کی طرح ہے دنیا — بازار ہے، منڈی کی طرح ہے دنیا
دیتی ہے جو خطرے کا ہمیشہ سگنل — اس سُرخ سی جھنڈی کی طرح ہے دنیا

(۴)

شمشیر ہے، بھالے کی طرح ہے دنیا — مجروح کے نالے کی طرح ہے دنیا
زہر اس کا عدوئے جاں ہے ناوک صاحب — افعی سی ہے، کالے کی طرح ہے دنیا

۵

ہم کہتے تھے خوشبو کی طرح ہے دنیا — جنّت سی ہے، مینو کی طرح ہے دنیا
اک بچہ جو غالباً تھا عارف باللہ — بول اُٹھا کہ کھٹّو کی طرح ہے دنیا

فضا ابن فیضی

مئوناتھ بھنجن

غــــزلیں

میں گھر میں ہوں، تو کھنڈر سے پکارتا ہے مجھے
مرا عدم، یہ کدھر سے پکارتا ہے مجھے

اسی سزا کے لئے، آجتک میں زندہ ہوں
کوئی صلیب ہنر سے پکارتا ہے مجھے

میں کس حوالے سے، اپنی تلاش میں نکلوں
وہ اک انوکھی ڈگر سے پکارتا ہے مجھے

ازل سے میں اسی گنبد میں قید ہوں، لوگو!
وہ جس کھلے ہوئے در سے پکارتا ہے مجھے

میں ناشنیدہ صداؤں کے کس حصار میں ہوں؟
وہ بار بار نظر سے پکارتا ہے مجھے

وہ جانتا ہے، کہ یہ شخص میرا قاتل ہے
بریدہ گردن و سر سے پکارتا ہے مجھے

ہنوز تخم زمیں ہوں، مگر مرا موسم
فراز شاخ و شجر سے پکارتا ہے مجھے

نئے شعور کی لے ہے، غرض نہیں اس کو
وہ اپنے عہد کے ڈر سے پکارتا ہے مجھے

چمکتی دھند میں تحلیل ہو رہا ہوں فضا
وہ کس مقام حشر سے پکارتا ہے مجھے

اپنے اس کے درمیاں، اک رابطہ بن جاؤنگا
رفتہ رفتہ، میں کوئی دست دعا بن جاؤنگا

خواب ہوں، شب بھر تو پلکوں پر سجائے رکھ مجھے
صبح تک، میں بھولا بسرا ماجرا بن جاؤں گا

کیا خبر تھی، دوستوں کی مہربانی کے طفیل
اس طرح جینا پڑے گا، حادثہ بن جاؤں گا

دیکھنے میں ہوں، بہت بد وضع، پتھر کی طرح
میں، سلیقے سے تراشو! آئنا بن جاؤں گا

سانحہ ایسا نہیں کچھ، یہ شکست التماس
بس یہی ہوگا، کہ آشوب انا بن جاؤں گا

وقت کے اس بے اماں موسم میں، مجھ کو ساتھ رکھ
دھوپ پھیلے گی، تو سائے کی قبا بن جاؤں گا

تہمتوں کی بے لباسی، دیکھتی رہ جائے گی
میں ترے شانوں پہ، مریم کی ردا بن جاؤں گا

کیا تمہارا میرا رشتہ؟ لفظ کے صورت گرو!
نقش میں تو ڈھل نہ پاؤں گا، صدا بن جاؤں گا

ایک شاعر کا قلم ہوں آج، لیکن اے فضا؟
وقت آنے پر، پیمبر کا عصا بن جاؤں گا

مظہر امام
دہلی

غزل

نئی بارش کی رم جھم میں لباسِ غم تو بدلے گا
وہی رسم چمن ہوگی، مگر موسم تو بدلے گا

وہ زہر بادِ صرصر ہو کہ سورج کی تمازت ہو
کسی صورت مزاجِ نازکِ شبنم تو بدلے گا

مسیحاؤں نے کچھ تازہ دوائیں لا کے رکھی ہیں
نئے زخم آئیں گے اب بھی مگر مرہم تو بدلے گا

کفن ریشم کے مقتولوں کو اب پہنائے جائیں گے
عزاداروں کا طرزِ گریہ و ماتم تو بدلے گا

نئی ساقی گری کا جشنِ فیاضی مبارک ہو
وہی ہوں گے ایاغ و جام لیکن سم تو بدلے گا

نئی ناوک زنی ہوگی، مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ جس عالم میں ہم رہتے ہیں وہ عالم تو بدلے گا

کرشن موہن

غزلیں

بوڑھے ہو کر شریف ہو بیٹھے
قافیہ تھے، ردیف ہو بیٹھے

دیکھ کر میرا انکسار و عجز
معتقد بھی حلیف ہو بیٹھے

جن کو غرّہ تھا زور بازو پر
وہ بھی آخر ضعیف ہو بیٹھے

کام کہرام نے ہمیں مارا
کتنے زار و نحیف ہو بیٹھے

شاعری اور افسری بھی کی
خود ہی اپنے حریف ہو بیٹھے

ان کو فصل ربیع کیا بھائی
جو قتیل خریف ہو بیٹھے

سمجھیں کیا عشق کی لطافت کو
جو ہوس سے کثیف ہو بیٹھے

ایک ہی دھن ہو گئی سر پر سوار
جب سے چاہت کا نشہ چھانے لگا

بام و در کو، سارے گھر کو، تیرا پیار
اپنی سرمستی سے مہکانے لگا

دفعتاً بدلا مرے ساجن کا موڈ
ہنستے ہنستے اشک برسانے لگا

مان جانے کی تڑپ پھیلی رہی
روٹھ جانے میں مزا آنے لگا

مضطرب رہنے لگا شام و سحر
دل محبت کا مزا پانے لگا

کرشن موہن دل سے دل کو رات دن
اک پیام آنے لگا، جانے لگا

ڈاکٹر ظفر حمیدی
مظفرپوری

ایک نظم اگلی صدی کے نام

دھوپ کو کچھ نکھارنے کا خیال
چاندنی کو سنوارنے کا سوال
حسن کو ناپنے کا پیمانہ
عشق کو جانچنے کا اک آلہ
اور خوشبو کے تول مول کی بات
یا دھنک کی کمان کی قیمت
اوس کی بوند کی خرید و فروخت
بادلوں کو پھنسانے کی باتیں
بجلیوں کی چمک کو قید کریں
موت کے دیوتا کو رشوت دیں
پھر اچانک ہی ہو گیا خاموش
اتنا کہنے کے بعد اک انسان
دو ہزار ایک عیسوی میں ہوں

غزل

ابھی ہیں تعلق کے تیور نرالے
میں اس کو سنبھالوں وہ مجھ کو سنبھالے
جسے جو پسند آئے بڑھ کر اٹھا لے
ہیں امرت کے بھی، زہر کے بھی ہیں پیالے
مرے دل میں انگڑائیاں لے رہے ہیں
ابھی آنے والی صدی کے اجالے
مرے اندر اک آنچ لہکی ہوئی ہے
جو چاہے چراغِ بصیرت جلا لے
یہ دکھ درد کے پھول بکھرے ہوئے ہیں
تو سر تا قدم اپنا ان سے سجا لے
وہ سورج سمیٹے ہوئے آ رہا ہے
تو فی الحال اپنے دیا کو بجھا لے
کسی نے بھی اک بات سچی کہاں ہے
مرے پاس بھی ہیں بہت سے رسالے
ہر اک داغ شاید نہیں دھل سکے گا
ظفر جتنا جی چاہے آنسو بہا لے

ظفر ہاشمی

جمشید پور

ایک ہی بحر اور قافیے میں چند دوہے

(۱)

کیسی یہ سرکار ہے کیسا اس کا رام
کون ہے مجرم کیا پتہ کس کو دوں الزام

(۲)

رشوت کی ہر دوڑ میں آگے اس کا نام
پیچھے تو جنتا رہے لے کر خالی جام

(۳)

رشوت کا ہے آپ پر آخر کیوں الزام
کوئی کسی کو یوں نہیں کرتا ہے بدنام

(۴)

چوسے جاؤ خون بھی، بھرتے جاؤ جام
مر جاؤں میں بھوک سے، تم کھاؤ بادام

(۵)

خوف کا ماحول بھی، وحشت بھی ہر گام
کیسے رہیں گے شیخ اب کیسے رہیں گے رام

دوہا میں ردیف کا پہلا تجربہ

(۱)

جیون بھر دیتا رہا کاوش کا ہر رنگ
راہوں میں کھلتا رہا سازش کا ہر رنگ

(۲)

رکھتی ہے جب قید میں زلفوں کی زنجیر
کاٹ نہ پاتی ہے کبھی باہوں کی زنجیر

(۳)

میرے لئے تم چھوڑ دو کانٹوں کی ہر سیج
مجھ سے لے لو تم مگر پھولوں کی ہر سیج

(۴)

زخموں کے ہر رنگ کے موسم کا ہے دیش
بھائی چارہ، پیار کے، گوتم کا ہے دیش

(۵)

شیشے کا ہے یا کوئی پتھر کا ہے جسم
چوس لے زہر وقت جو شنکر کا ہے جسم

(۶)

برسے تیرے باغ میں پھولوں کی برسات
میرے پودوں کے لئے زخموں کی برسات

غزلیں

ملک زادہ جاوید
نوئیڈا

شہروں میں لڑکے زیادہ ہیں لڑکیاں کم ہیں
کھلے ہیں پھول درختوں پہ پتیاں کم ہیں
ایکویریم سے نکالو انھیں کرو آزاد
سمندروں میں یہ سنتے ہیں مچھلیاں کم ہیں
کسی کے کاندھوں پہ میں ہوں کھڑا کوئی مجھ پہ
بلندیوں پہ پہنچنا ہے سیڑھیاں کم ہیں
ہوا چراغ کی لو تک نہیں پہنچ سکتی
مرے گھرانے پہ موسم کی سختیاں کم ہیں
تم اس کے گھر کا بھی نمبر ضرور رکھ لینا
وہاں پہ لوگوں کے ناموں کی تختیاں کم ہیں

٥

وہ دشمن ہے مگر ہے یار میرا
بڑا دلچسپ ہے کردار میرا
لگا کر قہقہے مدھم سروں میں
لطیفوں سے ہے دل بیزار میرا
لہو میں ڈوب کر پھر چاند نکلا
محترم بن گیا تیوہار میرا
مجھے آئی نہیں ہیں راس خوشیاں
سلگتی دھوپ ہے معیار میرا
بھروسہ تھا مجھے جمہوریت پر
لٹا ہے اس لئے گھربار میرا
نظر سے چاٹ کر جادو یہ شرقی
وہ واپس کر گیا اخبار میرا

٥

کوئی بھی رت ہو یہ موسم کہاں بدلتا ہے
ہمارے خون سے گھر کا [illegible]
اندھیری رات [illegible]
کوئی زمیں پہ نہیں دل پھر بھی [illegible]
یہ پوچھنا بجھے چراغوں سے جلتے دیئے [illegible]
یہاں پہ غیب کے سورج کہاں نکلتا ہے
خوشی زوال پہ ہے [illegible]
میرے عزیزوں سے کردار تیرا [illegible]
مری زبان سے [illegible]
وہ صرف اپنے [illegible]
یہ کیسی دھوپ ہے [illegible]
وہ برف ہو کے [illegible]

٥

شرون کمار ورما
امرتسر

(طنزیہ)

کب آؤ گے

جناب ڈیڑھ گز بھر گوپال جی
آپ کو بھرا اس طرح مخاطب کرنا شاید ناگوار گزرے۔ اس نام سے تو میرا ہی آپ کو پکارتی ہیں لیکن انہیں تو زہر پینا پڑا تھا۔ یہ کیسا اصول ہے آپ کی سرشتی کا۔ سچے کو جھوٹا اور نیک کو بدنام کیا جاتا ہے اگر آپ ارجن کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور نہ کرتے تو شاید پانڈو، کوروؤں کے ہاتھوں مارے گئے ہوتے دھرت راشٹر ہو کہ کنس آپ کے ہوتے ہوئے اپنی ظالمانہ کارروائیوں سے باز نہیں آئے۔ میں آپ کا پرم بھگت ہوں، اس لئے اس طرح مخاطب کرنے کی آزادی لے رہا ہوں۔ آزاد ملک کا شہری ہوں نا، یہ بات دوسری ہے کہ میری یہ آزادی نیتاؤں کی خوشنودی کی غلام ہے۔

میں آپ سے ذاتی طور پر ملنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں متھرا اور ورندابن اور گوکل بھی گیا لیکن پنڈوں اور پجاریوں نے میری وہ درد شا کی الٹے پاؤں بھاگ آیا۔ میں نے بڑے پجاری جی سے منتی کی کہ اس دھرتی کی تھوڑی سی مٹی لینا چاہتا ہوں۔ جہاں آپ گھٹنوں چلے اور کھیلے تھے۔ پجاری نے پلاسٹک کے ایک چھوٹے سے لفافے میں چمچہ بھر مٹی "اس کچی" جگہ سے لے کر ڈال دی جو اس کے قریب ہی فرش میں چھوڑ دی گئی تھی۔ لفافے مجھے تھمانے سے پہلے اس نے کہا کہ میں اس کے لئے ایک سو ایک روپیہ خزانچی کے پاس جمع کرا کر رسید لے آؤں میں نے عرض کیا۔ حضور میں غریب آدمی، اتنی رقم نہیں دے سکتا۔ پجاری نے مجھے گھور کر دیکھا اور مٹی اس خالی جگہ پر الٹ دی۔ میں مایوس سا مندر سے نکل آیا۔ مندر کے باہر بیٹھی ایک بزرگ عورت نے کہا۔ بیٹا، بھگوان کرشن کہاں نہیں کھیلے کہاں ان کے قدم نہیں پڑے، کہیں سے بھی تھوڑی سی مٹی اٹھالو۔ پجاری کا بیٹا جو پاس ہی جنیو پہنے کھڑا تھا۔ بڑھیا پر برس پڑا۔ بھاگ یہاں سے، اب آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ صاحب، مندر سے ہی مٹی لو یہ بڑھیا تو پاگل ہے۔ میں نے اس نوجوان کو سر سے پاؤں تک دیکھا لمبے بال، آنکھوں پر Ray - Ban کا قیمتی چشمہ، خوبصورت

ٹ اور نئی جینز جس پر کسی غیر ملکی کمپنی کا لیبل لگا تھا
پ چاپ آگیا۔ ملنے کی خواہش دل میں دبائے ۔
کسی منتری یا بڑے افسر سے ملنا ہو تو کوئی نہ
راستہ نکل آتا ہے ۔ سفارش یا رشوت سے کام
باتا ہے" رشوت" غلط لفظ ہے ۔ اسے ہم لوگ پارٹی
نیر فنڈ کہتے ہیں اور یہی مناسب بھی ہے ۔ آپ کے
نے میں شاید پارٹی فنڈ نہ ہوتا ہو ۔ ڈیموکریسی ہوتی
ہی ہوتا ۔ خیر، اپنی ناقص عقل سے سمجھانے کی کوشش
ہوں ۔ فرض کیجئے ایک شام جمنا تٹ پر آپ کی
ھین کر رادھا جی منہ پھلا کر کہتی ہیں ۔
"ہٹو جاؤ ۔ ہم تم سے نہیں بولتے شیام"
"کیوں رادھے ؟" آپ پریشان ہو کر پوچھتے

" دودھ اور مکھن کا ایک پلانٹ ہمارے بیٹا
م الاٹ کرا دیں ۔
آپ فوراً فرمان جاری کرتے ہیں کہ گوکل
ورنداین کی ترقی کے لئے امن اور خوشحالی کے
لیسا کرنا ضروری ہے ۔ سرکاری طور پر دودھ مکھن
رخ بھی بڑھا دیتے ہیں ۔ دوسری مثال لیجئے ۔
کے بچپن کا دوست ، غریب سداما آپ سے ملنے
ہے ۔ آپ کا پی ۔ ایس (P.S) اسے آپ سے ملنے
یتا کبھی آپ دریودھن سے میٹنگ میں مصروف
ہے جاتے ہیں ۔ کبھی مہاتما ودر کے ساتھ ۔
اپنی پوٹلی سے ستو اور چاول نکال کر اس کی
میں ڈال دیتا ہے ۔ وہ سداما جی کو فوراً آپ

الیس کی تعریف کرتے ہیں بلکہ گوردھن پربت پر اس
کے نام ایک پلاٹ الاٹ کر دیتے ہیں اور سداما سے
پارٹی فنڈ دینے کے لئے کہتے ہیں ۔
میں آپ سے ملاقات کی بات کر رہا تھا ۔ ناقوس
اور گھنٹیاں بجا بجا کر آپ سے رابطہ قائم کرنے والے
یاد آئے ۔ میں ایک ہزار آٹھ سوامی نرالانند جی
کے چرنوں میں حاضر ہوا ۔ آپ کے بارے میں پوچھا
تو گدگد ہو کر بولے ۔ مورکھ پرانی ، بھگوان تو کن کن
میں موجود ہیں ، ہر پرانی میں رہتے ہیں ۔ گھاس میں وہ ہیں
پیپل میں وہ ہیں ۔ تبھی ایک بھکاری بچے نے اس کا
دامن کھینچ کر کہا ۔ بڑی بھوک لگی ہے ۔ پجاری جی
جلال میں آگئے ۔ بھرشٹ کر دیا کم بخت ، دوبارہ
اس سردی میں نہانا پڑے گا ۔ تو مندر میں گھسا کیسے
تب انہوں نے سیوا داروں کو بلا کر اس نحیف و
ناتواں بچے کو دھکے دے کر مندر سے باہر پھینکوا دیا
سڑک پر گر کر وہ رونے لگا ۔ میں نے جا کر اسے اٹھایا
ڈھابے پر لے جا کر کھانا کھلایا اور بتایا کہ اس کے
اندر بھی بھگوان ہے ۔ مندر میں جانے کی بجائے اپنی انتر
آتما میں اسے تلاش کرے ۔ لڑکے کی آنکھوں میں
شعلے تھے ۔ لہجے میں نفرت تھی ۔ میں اس سوامی کے بچے
کو چھوڑوں گا نہیں ، دوسرے بچوں کو ساتھ ملا کر
اس سے بدلہ لوں گا ، آج نہیں تو کل ۔ میں ڈر گیا ۔ اگر
اس بچے نے اسے ۔۔۔۔۔ اٹھائی تو گھال بال ۔ ۔۔۔
کر کے ظالم کو سزا دیا کرتے تھے ۔
کل میرا چھوٹا بچہ دودھ کے لئے ضد کرنے لگا

ہے۔ بھارت میں یہاں بھی دودھ کی ندیاں بہتی
تھیں۔ سونے کی چڑیاں یہاں ڈال ڈال پر بسیرا کرتی
تھیں۔ یہ رشی منیوں کی پاون دھرتی ہے۔ اب غیر ملکی
تجارتی کمپنیوں کے آجانے سے ہر طرف سکھ شانتی
ہو جائے گی۔ آلو کے چپس سے لے کر کینٹکی چکن تک
سستا ملا کرے گا۔ جہانگیر بادشاہ نے ایک
ایسٹ انڈیا کمپنی کو اجازت دی تھی۔ ہم نے سب
کو کھلی چھٹی دے دی ہے۔ گوروؤں نے ایک دو دو پڑی
سر دیا رنگی کی تھی اب یہ تجارتی کمپنیاں کسی کے تن
پر کپڑا نہیں رہنے دیں گی۔ دودھ کی نہریں یا ندیاں
کیا ہوتی ہیں، آپ جانیں۔ البتہ پانی کی نہروں اور ندیوں
کا برا حال ہے۔ ان کی مرمت کے لئے جو سیمنٹ وغیرہ
آتا ہے۔ ٹھیکیداروں اور منتریوں اور افسروں کے
بنگلوں میں کھپا دیا جاتا ہے۔ پانی کنارے کاٹ کر
کھیتوں میں جا گھستا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلیٰ۔

میرا ایک قریبی دوست مجھے شہر کے بڑے مندر
میں لے گیا تھا کہ آپ کے درشن کر سکوں۔ واہ۔ کیا
ٹھاٹھ ہیں آپ کے۔ آپ کی [illegible] پر بجلی کا پنکھا چل
رہا تھا۔ اے سی لگانے کی بات چل رہی تھی۔ سونے
چاندی کے زیورات، پھول مالائیں، گوٹے کناری پارچات
پھل، مٹھائیاں، چڑھاوے کی موٹی رقم، سنگ مرمر
کا فرش، قیمتی قالین، چاندی کے دروازے، سونے کی
چھتیں اور کلس، جواہرات جڑے ستون، دیسی گھی کے
چراغ، صندل اور لوبان کی خوشبو، غرض یہ کہ بھگوان
کتنا [illegible] لیکن
[illegible]

اور باوردی مندر کی پولیس۔ یہ لوگ جنتا جنا
کو آپ سے دور رکھنے کے لیے ہر وقت وہاں موجو
ہیں۔۔۔ اچھا، یہ تو بتایئے کہ یہ سونا، چاندی، چڑھاوا
پھل، مٹھائیاں آپ تک کیسے پہنچتے ہیں۔ پہنچتے بھی
کہ نہیں اور آپ اس بے انتہا دولت کا کیا کرتے ہیں
کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بے پناہ دولت پھر کسی غز
کو حملے کرنے پر اکسائے۔ میں نے پجاری سے
ترش خفگی سے بولا۔

"تم دھرمی ہو، ناستک ہو۔ پاپی ہو۔"
"کچھ پھل، مٹھائیاں، میرے بچوں کے
دیدو۔"

اٹھ ہزار، خطرناک ارادے سے آگے
آئے۔ میں نے آپ کی طرف دیکھا۔ آپ مسکر
سے لگائے۔ پھولوں سے ڈھکے مسکرائے جار
ہیرے جڑی آنکھیں چمک رہی تھیں۔
آپ کو بھوگ لگانے کا سمے ہو گیا تھا۔ سب
نکال دیا گیا۔ بھوجن، بھجن، اور ناری۔ تینوں کے
کے ادھیکاری۔ دروازے بند ہو گئے۔ میں ا
بچوں کا درد لئے سڑک پر آ گیا۔ ایک بھکا
گندہ سا بچہ بھوک سے روئے جا رہا تھا۔
من میں آیا کہ اس بچے کو آپ کے سنگھاسن پر
دوں لیکن یہ تو "ادھرم" ہوتا اور ایسا کرتے
میری جان بھی جا سکتی ہے۔ میں نے یہ تجویز
کے سامنے رکھی تو انہوں نے اپنے کان سے
بڑھا دیئے۔ آپ نے تو خود کو درگنیشر کے مد
[illegible]

ایک سادھو مہاراج نے بتایا کہ بھگوان
کے درشن گھور تپسیا کے بعد ہی ممکن ہے۔ تپسیا
تو صبح سے شام تک کرتا ہوں، کرنی پڑتی ہے، صبح سے
ہی بوتھ سے دودھ لینے کے لئے قطار میں کھڑے
ہونا پڑتا ہے۔ کبھی اِس ٹانگ پر کبھی اُس ٹانگ پر۔ کبھی
دودھ دیر سے آتا ہے کبھی دودھ بیچنے والی لڑکی۔
میری سمجھ میں یہ نہیں آسکا کہ بھارت مہان میں ہر کام دیر
سے کیوں ہوتا ہے۔ اس کے بعد دفتر کے لئے بس کی
قطار میں وہی تپسیا کرنی پڑتی ہے۔ دن بھر دفتر میں
بڑے چھوٹے صاحبوں کے نخرے برداشت کر۔
ہوئے آتا ہوں شام کو پھر وہی قطار، وہی دھکے،
وہی تکان۔ گھر آتا ہوں تو بچوں سے بات تک کرنے
کی سکت نہیں رہ جاتی۔ دن کے ہنگامے جسم سے
جان نچوڑ لیتے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اور گھور
تپسیا کیا ہوگی اور کیسے کروں۔ مجھے یہ نوکری رشوت
اور سفارش سے ملی ہے۔ زندگی کی عام ضروریات اس
قدر مہنگی ہو گئی کہ تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ اوپر کی
آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اس لئے پارٹ ٹائم جاب
کرنا پڑتا ہے۔ گھر آکر چائے کی پیالی پیتا ہوں اور
ایک دکان پر بہی کھاتہ لکھنے چلا جاتا ہوں۔ میرے
علاوہ آٹھ دس اور بھی درخواست دینے والے تھے۔ میں
نے سب سے کم اجرت پر کام کرنا منظور کر لیا۔ آپ جانتے
ہو۔ یہ پارٹ ٹائم جاب، کیا بلا ہوتی ہے۔ دراصل
آپ کا تعلق شاہی خاندانوں سے رہا ہے۔ آج کل
بھی یہی خاندان کسی نہ کسی شکل میں حکومت کر رہے ہیں۔
راس لیلا اور پارٹ ٹائم میں زمین آسمان کا فرق
ہے۔ پہلے کام میں زمین و آسمان ایک ہو جاتا ہے۔ دوسرے
میں ایک کرنے پڑتے ہیں۔ آپ جانی جان ہوتے ہوئے
بھی اس لعنت کو نہیں سمجھ سکتے۔ میری بیوی کا تیرتھ
کی گرتی ہوئی صحت اور بچوں کو دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے
میں اس کا مرجھایا چہرہ دیکھ کر کام پر چلا جاتا ہوں۔
دل بہلانے کے لئے سنگل بینڈ کا دیسی
ساخت کا گھڑ گھڑاتا ٹرانسسٹر آن کرتا ہوں تو
نصیحت کی جاتی ہے۔ اچھی صحت کے لئے فلاں دوائی
کھاؤ۔ فلاں صابن سے نہاؤ۔ فلاں ٹوتھ پیسٹ
استعمال کرو۔ یہی سب کر رہا ہوں لیکن صحت دن بدن
خراب ہوتی جارہی ہے۔ اور وہ نیتا جو دبلے پتلے تھے
جن سے ڈھنگ سے بولا بھی نہیں جاتا تھا۔ موٹے تازے
ہوئے جارہے ہیں۔ یہ ہے ڈیموکریسی کا کمال۔ آپ نے
تو خواہ مخواہ کنس اور نرکش کو مارا۔ کورو کشیتر کے میدان
میں پانڈوؤں کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا۔ ڈیموکریسی اور
سیکولرازم کا ڈھنڈورا پٹوا دیتے۔ بغیر ہتھیار کے تمام
مخالف ملیامیٹ ہو جاتے۔ سوچتا ہوں ایک ٹانگ پر
ٹھنڈے پانی میں کھڑا رہ کر تپسیا کروں یا کسی برگد
کے نیچے بیٹھ کر بدن سکھا لوں۔ بیوی سے مشورہ کیا
تو وہ تانڈو نرتیہ پر اتر آئی (ہندوستان میں اب یہ رقص بیویوں
کے دم سے ہی زندہ ہے) حالانکہ یہ مردوں کے لئے مخصوص
ہے اب آپ سے کیا پردہ بیوی کو ناراض کرنے سے
بہتر ہے کہ بھگوان کو خفا کر لیا جائے۔ میں نے سوچا کہ
ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر تصویر کھنچوا لی جائے۔
بیوی نے کہا کہ سراسر گناہ ہوگا۔ بھگوان کو دھوکا دو گے
یہ خیال بھی ترک کر دیا۔

اچھا، ایک بات بتائیے۔ گیتا میں کیا ہوا اپنا وعدہ آپ کب پورا کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے دھرتی پر منشیہ کے روپ میں کب آ رہے ہیں۔ کیا ابھی دھرتی پر پاپ کا گھڑا بھرا نہیں۔ کیا گھٹالے، حوالے آپ کی نظر میں پاپ نہیں، کیا جنتا کو بے وقوف بنانا، جھوٹ بولنا، دھوکا دینا، عوام کی کمائی پر عیش کرنا آپ کی نظر میں عیب نہیں۔ متھرا، گوکل، ورندابن سب موجود ہیں۔ کنس اور پوتنا کنس سیاسی نیتاؤں کے روپ میں وہی سب کر رہے ہیں جو تقریباً پانچ ہزار سال پہلے کیا کرتے تھے۔ کیا آپ بھی کھدر پوشی سے دھوکا کھا گئے۔ ہاں، کوروکشیتر کا وہ میدان نہیں رہا۔ خیر ہم کوئی اور جگہ ڈھونڈ لیں گے۔ ابھی تک تو دیش میں گائیں بھی ہیں اور سبزیاں بھی۔ لیکن جلدی ہی "ذبح خانے" جدید مشین اور کلارنٹ بنانے والی تجارتی کمپنیاں انہیں ختم کر دیں گی۔ آپ نے آنے میں زیادہ دیر کی تو گائیں بھی باہر سے درآمد کرنا پڑیں گی۔ گوبر تو ہم منگا ہی رہے ہیں کہ غیر ملکی مالی تعاون اور قرض کے لئے یہ بھی ایک خرچا ہے۔

میں آپ کا سچا بھگت ہوں۔ سدا ماہی سمجھ لیجئے آج اس دیش پر پانچ دروپدی کو ستو سے کہیں زیادہ کورو ننگا کرنے پر تلے ہیں۔ پورا ملک لاکھ کا محل بن گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جنتا کا وشواس آپ پر سے اٹھ جائے۔ لیس آجائیے۔

آپ کا شیدہ جینتک اور بھگت

(ایک اور سدآما)

[signature]

بقیہ:- اقبال کی تصنیف ۔

اس تصنیف سے اقبال بحیثیت فلسفی ابھرتے نہیں معلوم ہوتے۔ بس، دل کو سمجھانے کو، پروفیسر شریف نے جونا بلوغیت کا ذکر کیا ہے اور اس کو اقبال کی پہلی کاوش بتایا ہے یہی تسلیم کر لیجئے۔

[signature]

● براہ کرم اپنی تخلیقات خوشخط ارسال کریں

مشرف عالم ذوقی
دہلی

مکمل آزادی کی طرف

(اصل واقعہ کی زیراکس کاپی)

سچی بات یہ ہے کہ وہ مجھ سے شرط ہار گیا تھا
ر معاملے کی پیچیدگی شرط ہارنے کے بعد ہی شروع ہوئی تھی
جیسے میں نے کہا۔ تیار ہو جاؤ۔ اب میں تم سے کچھ
نگنے والا ہوں۔

اسے میری شرط منظور تھی کیونکہ ہم دونوں کے بیچ
طے ہوا تھا۔

'منظور' میں ٹھٹھا کر ہنسا۔ ایک بار پھر سوچ لو۔
زرا ہوا خوری کے لئے جا رہا ہوں۔ مگر اکیلے نہیں جانا
ہتا ہے۔ کچھ دیر کے لئے مجھے تمہارا ضمیر چاہئے۔ بس کچھ دیر
لئے۔

وہ بے حیائی سے ہنسا، جیسے عام طور پر اس کے
قلاش لوگ کرتے ہیں، جن کے پاس پیسے نہیں ہوتے اور
ہوا جواری جن سے اچانک پیسے طلب کر بیٹھتا ہے۔
وہ مطمئن تھا۔ "لے جاؤ۔۔۔۔ جو چیز ہے ہی نہیں،
ٹھیک، تم اسے لے جا سکتے ہو۔"

"نہیں، ہے تمہارے پاس ہے۔" میں وثوق کے
مسکرایا۔ اور سنو، میں آج کی شام ہی واپس کر دوں
گا۔ بس آج ہی کی شام۔

میں نے دیکھا، وہ سگریٹ کا کش کھینچ رہا تھا۔
ساتھ ہی مسکرا بھی رہا تھا۔ تاہم مجھے اطمینان تھا۔
موسم خوشگوار تھا اور اس موسم میں، میں اس کے ضمیر کے
ساتھ کچھ لمحے گزارنا چاہتا تھا۔

سمندری ہوا میں ٹھنڈک تھی۔ یہ ٹھنڈک جسم میں
تازگی بھر رہی تھی۔ میں نے ایک خاموش جگہ پسند کی اور
اس کے ضمیر کو خوانچے والے کے پاس بیٹھا کر ادھر ادھر
دیکھنے لگا تھا۔ اس اثنا میں، میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے
دوست کے ضمیر کے ساتھ کیا باتیں کرنی ہیں۔ میں جیسے ہی بیٹھا،
ایک خوبصورت بدن والی لڑکی قریب سے خوشبو بکھیرتی چلی
گئی۔

میں نے گفتگو شروع کی ـــ
"تم نے اس کے پستانوں کو دیکھا؟"
"آہ، بے حد معمولی۔ معمولی اور گھناؤنی سوچ۔ تم
اس سے زیادہ سوچ بھی نہیں سکتے۔"
"مگر ایسا دیکھنا تو قدرتی بھی ہے۔۔۔"

۔ بہا دیہی گیا

خرید کر لایا تھا۔

قدرتی عمل ہے ضمیر مسکرایا۔ وہاں، تمہارے گھر
بھی تو ایک عورت بیٹھی ہے ۔۔۔ وہ ۔ کیا وہ تم مردوں کے
کے اعضاء پر فخر کر سکتی ہے۔ نہیں معذرت بتاؤ۔ اس سے
تمہارا چہرہ بگڑ جاتا ہے

" مگر اس کے پستان اچھے تھے۔ بھلے بھلے، گورے
بھی ہوں گے اور ۔۔۔ دودھ سے لبریز؟"

میں مسکرایا۔ کیوں؟ آدمی بوڑھا بیشک ہو جائے
مگر تصور کو عمر کے ہر دور میں جوان ہونا چاہیے۔

ضمیر مسکرا رہا تھا۔

" اچھا سنو، اس دن " میں نے اس کا دھیان
دوست کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔" اس دن اس کا باس
آیا تھا، نا، گھر پہ ؟"

" ہاں ۔ آیا تھا"

اس نے چکن کی دعوت کی تھی ؟

" ہاں کی تھی ؟"

" وہاں اس کی بیوی بھی تھی، نا ؟" میں مسکرایا۔
نوجوان، البڑ اور خوبصورت ، میں دوبارا مسکرایا۔
عورت کے پستان اور چکن کا ذائقہ۔ ٹھنڈی ہوا کے لئے
ضروری ہے کہ ۔۔۔ انسان اپنے دماغ کو کھلا چھوڑ
دے اور ۔۔۔"

ضمیر کے چہرے پر کوفت کے آثار تھے ۔۔ اف،
تم بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر وقت ضائع کر رہے ہو۔
زندہ رہنے کے لئے ۔۔۔۔

آہ ، تم بالکل ٹھیک سمجھے ۔ زندہ رہنے کے لئے
[illegible] سب کا تعلق زندہ رہنے سے ہی ہے۔

اور سچی بات یہ ہے کہ سارا تماشہ زندہ رہنے کا ہے۔
حقیقت یہی ہے کہ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔
بے تکی اور فضول، یہ حقیقت سب پر آشکارا
ضمیر کے چہرے پر طنزیہ ہنسی تھی۔ اس سمندری ماحول سے
نکلو۔ شاید تم کچھ کام کی بات کر سکو۔

چلو ۔

میں اسے لے کر باہر سڑک پر آگیا۔

اچانک کچھ نعروں جیسی آواز میرے کانوں
سے ٹکرائی ۔۔۔ اُف ، اس آواز سے کتنے دنوں بعد میرا واسطہ
پڑا ہے۔ کتنے دنوں بعد۔ تاہم مجھے یقین تھا، کہ ایک دن
بھلی بھلی صدائیں اس زمین سے ضرور اٹھیں گی۔ اس
سے ۔۔۔۔ سامنے کے آدمیوں کا ایک ہجوم تھا۔ لوگ
لگا رہے تھے ۔۔۔ اور ان کے قدم ایسے بڑھ رہے تھے
ابھی آگے بڑھ کر وہ فلک بوس عمارتوں کے چھکے چھڑا
دیں گے ۔۔۔۔

آہ ، تم یہ انقلاب ہے ، مجھے خوشی تھی۔ ۔
ہوئے وقت کو بس اسی کی ضرورت رہ گئی تھی۔ انقلاب
کی۔ شاید یہ انقلاب مجھے بھی پکار رہا ہے۔ مجھے
انقلاب میں شامل ہونا چاہیے۔ میں نے ضمیر کو
والے انداز میں دیکھا۔

" تم یہ سب دیکھ رہے ہو ؟"

" کیا ؟

" انسان عظیم ہے " اور کسی خوشگوار
کے لئے یہ اس کی پہلی چوٹ ہے ، پہلی دستک

" میں سمجھتا نہیں ، تم کیا کہہ رہے ہو۔"

" تم سمجھو گے بھی نہیں۔ انسان عظیم ہے

ان لوگوں کو دیکھو۔ ان کی آوازیں سنو؟

"پاگل ہو۔ یہ کہاں اشارہ کر رہے ہو۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔"

"کیا سچ مچ تمہیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔ سرخ انقلاب، پرچم اور زندگی۔۔۔"

"تمہیں پتہ ہے۔ تم کہاں ہو۔ ضمیر نے اس بار ناگواری سے کہا۔ زندگی اور انقلاب سے دور، وہاں'

اس نے اشارہ کیا۔ جہاں اشارہ کیا، وہاں ہائی وے پر ٹریفک کا منہ کھلا ہوا تھا۔ گاڑیاں، بسیں اور آدمی ـــ

اس بھیڑ میں خود کو پہچان سکتے ہو تم؟ وہ ہنسا۔ حقیقت یہی ہے۔ تم وہیں گھر گئے ہو۔ افسوس، اس نے پلٹ کر حملہ کیا۔ تم نے چھوٹی چھوٹی باتوں میں سارا دن ضائع کر دیا۔ یاد ہے۔ تم دونوں کے بیچ کیا طے پایا تھا۔ شام ہوتے ہی شرط ٹوٹ جائے گی اور تم مجھے واپس کرنے چلے جاؤ گے؟

"ہاں، یہ تو ہے۔"

"پھر جو میں چاہتا ہوں، وہ کرو، ضمیر نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"کیا؟"

پہلے اپنے گھر چلو۔ اور ہاں، اپنے ضمیر کو بھی میرے ساتھ کر دو۔ بہتر ہوگا، اپنے دوست کو بھی ملا لو اس لئے جو کچھ بھی ہم کریں گے، وہ یقینی طور پر تم دونوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

اور ہمارے نہ چاہنے کے باوجود وہ کھیل شروع ہو گیا۔ جس کے لئے ہمیں مدعو کیا گیا تھا۔ ہم دونوں ہی غبارے سے نکلی ہوئی ہوا کی طرح، تماشائی بنے بیٹھے تھے

"دیکھو۔۔۔۔ دیکھو، یہ کیا کر رہے ہیں۔۔۔" دوست کے چہرے پر تعجب کے آثار تھے۔

"کچھ نہیں۔ شاید یہ وہی کچھ کر رہے ہیں جو۔۔۔"

میں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ کبھی جانے انجانے، تمہیں پتہ ہے یہ دل کیسے کیسے کرنے لگتا ہے۔۔۔"

"ہاں" دوست نے گردن ہلائی۔

"کبھی شام میں گھر جاتے ہیں اور لگتا ہے، گھر نہیں ہے۔ گھر کی جگہ ایک بڑی سی گھڑی کھڑی کر دی گئی ہے ـــــ وقت ـــــ وقت بتانے والی سوئیوں کی جگہ سیڑھیاں لگی ہوں۔۔۔ ہم سیڑھیاں چڑھتے ہیں اور گھر میں آجاتے ہیں۔ خاندان کے سارے لوگ چھوٹی چھوٹی گھڑیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔۔ ٹھمکا۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔ ایسے میں اچانک خواہش ہوتی ہے۔ ٹھمکا، ٹھمکا لگایا جائے۔۔ دیوانہ وار رقص کیا جائے۔۔۔۔ کیوں۔۔۔

ہاں۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔

سامنے، دونوں ضمیر اس وقت یہی کر رہے تھے۔۔۔ ان کے پاؤں میں گھنگھرو نہیں تھے۔ نہ ہی ناچ کا سلیقہ انہیں معلوم تھا۔ جس طرح دونوں اپنے پاؤں کو جنبش دے رہے تھے، اس سے وہ اناڑی ہی معلوم دے رہے تھے۔

۔۔۔ تاہم۔۔۔۔۔

"دیکھو تو" دوست مسکرایا۔ "وہ بالکل ویسے ہی ناچ رہا تھا جیسے۔۔۔"

میں ناراض ہوا۔ "بہر حال یہ طے ہے کہ ہمیں ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی ہے۔۔۔"

پاؤں اچانک اپنے مقام پر ٹھہر گئے۔ ضمیر ہماری

طرف مڑے۔

"دیکھو... اب ہم..."

میرے دوست کا ضمیر مسکرایا۔ ممکن ہے تمہیں شرم محسوس ہو۔ اپنی آنکھیں بند کر لینا۔"

"کیوں ؟"

"کیونکہ اب ہم اپنے کپڑے اتار رہے ہیں۔"

اور ہمارے منع کرنے کے باوجود دونوں ہی مادرزاد ننگے ہو گئے۔

"کبھی کبھی ایسا کرنا اچھا لگتا ہے نا۔" دوست میری طرف مڑا۔

انتہائی کریہہ اور گھناؤنا۔" میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔

"لیکن اچھا لگتا ہے، نا...؟"

میں اس کی طرف مڑا۔ دھیرے سے حامی بھر لی۔

شاید قصور ہماری خواہشوں کا ہے، جو اندر قید رہتی ہیں۔

"شاید!"

دوست مسکرایا۔ شرمیلے ہونے کے باوجود اُسے مزہ مل رہا تھا۔ وہ میرا ضمیر ہے نا۔ میرے بارے میں سب جانتا ہے... بس، چھوٹے سے گھر میں یہ حسرت ہی رہ گئی کہ...، وہ چلے جا رہا تھا۔ مکمل آزادی شاید جانوروں کو ہی حاصل ہے...، وہ دھیرے سے چیخا اس کی چیخ میں عجیب طرح کی لذت پوشیدہ تھی... دیکھو... دیکھو تو وہ کیا کر رہے ہیں... وہ پاؤڈر لگا رہے ہیں... اب دیکھو... انہوں نے لپسٹک کھول لی ہے... وہ بلاؤز اور ساری پہن رہے ہیں... آہ..."

وہ چیخا رہے لے رہا تھا۔ جیسے عجیب سی سنسنی بدن میں دوڑ گئی ہو۔

"یہ پاگل پن ہے، میں اپنے ضمیر پر چیخا۔ اس میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ کیونکہ اب یہ کچھ ہمارے یہاں بھی عام ہو چکا ہے۔

"عام ہو چکا ہے ؟" اس بار ضمیر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"ہاں"

"اچھا بتاؤ اس کے بعد ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"بہت کچھ۔ مثلاً ایک دوسرے کے کپڑے نوچ سکتے ہو..."

"اور ؟"

"ایک دوسرے کو اذیت دینے کے نئے نئے طریقوں پر غور کر سکتے ہو ؟"

"اور ؟"

"مثلاً ایک دوسرے کو ہلاک کر دینے کی حد تک لڑ سکتے ہو یا ایک دوسرے کو ہلاک کر سکتے ہو؟" میں نے منہ بنایا اور یقینی طور پر یہ بھی ایک طرح کی فناسی ہوگی۔ یعنی تم اس میں بھی کوئی نہ کوئی لذت تلاش کر لوگے۔

"اور ؟"

مگر اس بار کوئی سوال نہیں پوچھا گیا۔ ہم نے آنکھ اٹھائیں تو وہ دونوں اپنی جگہ سے غائب تھے۔ ہم دونوں اکیلے کمرے میں بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کو گھور رہے تھے

"چلو" کوئی بات نہیں۔ ایسا تو ہونا ہی تھا، میں مسکرایا۔

دوست نے گردن گھمائی۔ چلو، اچھا ہوا اس سے نجات تو مل گئی۔ اب اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ختم

ویریندر پٹواری

دہلی

حقیقت

خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح
ل تو گئی تھی لیکن کسی کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ
ہندؤں کا شکار منور علی کون ہے اور کٹر مسلمانوں
شکار پرکاش پنڈت کون ہے۔ لیکن جونہی اس
ں کے بارے میں اطلاعات ملتی رہیں گاؤں میں
لوگ جمع ہو گئے کہ گاؤں والے سمجھ بیٹھے پھر سے
شن کی تیاری ہو رہی ہیں! پھر جب ہر آدمی گاؤں
ں سے منور علی اور پرکاش پنڈت کے بارے
پوچھ تاچھ کرنے لگا تو اتنی قیاس آرائیاں ہونے
جتنی سمندر کی آتی جاتی لہریں۔ مگر حقیقت کیا ہے
اننے کے لئے بیرونی ممالک کے صحافی بھی اپنے
بڑے بڑے کیمرے ساتھ لے کر آئے تھے۔ مجھے
اپنے اخبار کے لئے سٹوری راتوں رات بھیجنے
ابت تھی اس لئے میں بھی زیادہ سے زیادہ جانکاری
حاصل کرنے کی بھی توڑ کوشش کرتا رہا مگر فقط اتنا
پایا تھا کہ منور علی عمر ۲۰ برس اور پرکاش پنڈت
برس دونوں کو اپنے اپنے گھر سے اٹھا کر اغوا کر لیا

ہے۔ اور پھر قتل کر کے لاشوں کو غائب کر دیا گیا ہے
تاکہ سازش بے نقاب نہ ہو سکے۔ حیرت کی بات یہ
تھی کہ دونوں مقتول اشخاص نے خود ہی اپنے سیاسی
سرپرستوں کو ایک دوسرے کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا
تھا۔ لیکن دونوں ہی اپنی جان کھو بیٹھے تھے۔ گاؤں
والے ایسی خبریں سن کر کبھی پریشان ہو جاتے تھے۔ اور
کبھی حیران ہو کر چونک پڑتے تھے۔ یہ جانے بغیر کہ تردید
کی جائے یا تصدیق کی جائے۔ وہ کچھ نہ کچھ یوں بولتے
جا رہے تھے جیسے قصہ حاتم سنتے سنتے کہانی گو کی ہاں
میں ہاں ملا کر اس گھڑی کا انتظار کر رہے تھے کہ کب یہ
شہر سے آئے ہوئے مہرباں گاؤں والوں سے بڑھتی ہوئی
مہنگائی کے بارے میں یا بجلی یا پانی کے بارے میں پوچھ
تاچھ کریں گے۔ لیکن وہ ہوا نہیں جو وہ چاہتے تھے۔ پھر
جب اچانک بارش ہو گئی تو گاؤں والے پانی کے بلبلوں
کی طرح غائب ہو گئے۔ گاؤں میں سناٹا چھا گیا ہوتا اگر
شہر سے ایک کے بعد ایک کار، جیپ بس اور ٹرک شہر
آتے نہ ہوتے۔ ان کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کورو کشیتر

کالنگا یا پانی پت کے میدان میں ہو رہی گھمسان لڑائی
کی پلاننگ ہو رہی تھی۔ اور گاؤں والے ادھ کھلی کھڑکیوں
سے ان اجنبی لوگوں کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے ان
کو اپنی اپنی بستیاں گاڑنے کے لئے ایک نیا جزیرہ مل
گیا ہو۔ اور یہ عجیب بات تھی کہ گاؤں میں رہنے والے
ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک جیسی کیفیت تھی مگر پوچھ
تاچھ کرتے کرتے وہ مصلحتاً بات ادھوری چھوڑ کر
کھڑکیاں بند کر دیتے تھے۔ پھر بات شاید ٹھنڈی پڑ
جاتی مگر جونہی شہر سے آئے ہوئے ایک شخص نے تھانے
دار کو وارننگ دے کر یہ کہہ دیا کہ اگر مقتول پنڈت
نہیں بلکہ ایک دلت ہوتا تو ہم نے اب تک یا تو لاش
برآمد کر کے جلوس نکالا ہوتا یا پھر تھانے کو پھونک ڈالا
ہوتا — یہ سن کر تھانے دار کے ارد گرد جمع لوگ
بھڑک کر تھانے کی کھڑکیاں دروازے اور فرنیچر
توڑنے لگے۔ تھانے دار زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ اور پھر
بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے جیپ
کاریں اور بسیں جلائی گئیں تب گاؤں والوں نے دروازے
کھڑکیاں بلکہ دریچے بھی بند کئے۔ اور دُبک کر اندر
بیٹھ گئے۔ میرا ماتھا لہولہان تھا مگر پھر بھی مجھے یقین
تھا کہ اگر گاؤں کا کوئی ہندو یا مسلمان مجھے دیکھ
لیتا تو مجھے دہشت کے انگاروں سے بچا لیتا۔ وجہ یہ
کہ یہ گاؤں کبھی میرے نانا مرحوم کی جاگیر ہوا کرتی تھی۔
اور لوگ ان کو حاتم طائی کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے
دو سال پہلے جب وہ فوت ہو گئے تھے تب گاؤں کے
ہر ہندو اور مسلمان نے ۱۳ دن تک سوگ منایا تھا۔ لوگ
ان کو سخی داتا کہتے تھے۔ لوگوں کا اب بھی یہ وشواس

تھا کہ ان کا نام لو تو مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ ا
مجھے باقر علی نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے کمرے میں کھینچ
اندر لیا تو میں نے بھی محسوس کیا کہ اچھے لوگوں کو
کرنے سے مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔ جبھی تو لوگ
منیوں یا پیر فقیروں کے آستانوں پر سجدہ کر کے
مرادیں پوری ہوتی ہوئی دیکھ لیتے ہیں! باقر علی نے
گلے لگا کر جب میرا ماتھا چوم لیا تب میں نے ان کو
لیا۔ جبکہ اس نے مجھے دور سے ہی پہچان لیا تھا
علی کہنے کو نانا مرحوم کے چلم بھرنے والے ملازم تھے
گھر میں ان کی عزت اتنی ہی ہوا کرتی تھی جتنی مرحوم
کی عزت ہوا کرتی تھی۔ میری ماں ان کو چاچا کہہ کر
کیا کرتی تھی۔ نانا ان کی بات کبھی نہیں ٹالا کرتے تھے
باقر علی نے کہہ دیا فاطمہ کی بیٹی کی شادی ہے تو
صرف لگان معاف کیا کرتے تھے بلکہ شادی کا خرچ
برداشت کیا کرتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ نانا او
بھیس بدل کر اپنے گاؤں والوں کی خیر و خبر رکھتے
دیکھا کہ کسی غریب عورت کا نوزائیدہ بچہ سردی سے
رہا ہے تو اپنے پشمینے کا شال کا ایک ٹکڑا کاٹ
اس کو دے دیتے تھے بھنگی نے پرانا کوٹ مانگا
نے اپنا نیا کوٹ ہی نہیں بنیان بھی یہ کہہ کر دی کہ
ہو۔ یہ بنیان پہن لو گے تو کوٹ فٹ ہو گا ورنہ لوز
آؤ گے جیسے خیمے میں چھپا ہوا آدمی۔ نانا مرحوم کو کبھی
نہیں آتا تھا لیکن بقول باقر علی وہ اس روز غصے
ہو گئے جب ملک کا بٹوارہ ہوا اور ان کے بچپن
کا سارا خاندان پاکستان چلا گیا۔ اس روز
آزادی کا جشن منا رہا تھا تب وہ چلا رہے تھے۔

بٹوارہ کرنے والو! تم انسان کو انسان سے جدا کر چکے
ہو۔ دیکھنا تمہارے ناپاک چہرے ایک دن سب
کو دکھائی دیں گے معصوم لوگوں کو جب تمہارے بٹوارے
کی تلوار کاٹے گی اسی روز طوفان آئے گا پھر ایک
تباہ کن سیلاب سرسبز کھیتوں کو ریت کے نیچے دفن کر
دے گا۔ چنار اور برگد جیسے سر بفلک درخت
اکھڑ جائیں گے اور فقط کھنڈر رہ جائیں گے۔ اسی
روز تم پہچانے جاؤ گے کیونکہ تمہارے چہروں پر فرقہ
پرستی کا خون لگا ہوگا۔ پھر لوگ تمہیں کاٹ کر گدھوں
کو تمہارا گوشت کھلائیں گے۔" باقر علی رات بھر مجھے
نانا مرحوم کی باتیں یاد دلاتا رہا لیکن وہ منور علی اور
پرکاش پنڈت کے بارے میں شہر سے آئے لوگوں کی
باتیں سن کر حیران تھا کہ کیا انسان اس حد تک گر
سکتا ہے؟ اس احساس سے اس کا چہرہ کبھی غصے
سے سرخ ہوتا رہا کبھی گھبراہٹ سے پیلا پڑ جاتا تھا۔
ان لوگوں کی بات چلی تو باقر علی نے اس بات کی تصدیق
کر لی کہ منور علی اور پرکاش پنڈت روز کسی نہ کسی بات
پر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور ایک دوسرے کی
بات نہ ماننے کی وجہ سے سڑک پر بھی ہنگامے کیا کرتے
تھے۔ ایک دن تو ہاتھا پائی تک کی نوبت آئی تھی۔
مگر لڑنے جھگڑنے کی وجہ وہ نہ تو کسی کو بتایا کرتے
تھے اور نہ ہی کوئی ان سے روز روز کے ہنگامے کرنے
کی وجہ پوچھتا تھا۔ وہ اس لئے کہ لوگ یہ سمجھ گئے
تھے کہ وہ رسیدہ عمر کی وجہ سے سٹھیا گئے ہیں۔ اور
اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیوں کہ
جب وہ اسکول میں داخل ہوئے تھے تب نہ جانے
بچوں سے کیا کیا کرتے تھے کہ وہ دیکھتے دیکھتے ان کو
تنہا چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ پھر جب وہ اسکول
میں ٹھیکیدار کے کام پر جاتے تھے تو ٹھیکیدار ان کو
ڈانٹ ڈپٹ کر بھگایا کرتا تھا۔ اس عمر میں کیا کام
کر سکو گے۔ چارپائیں اٹھا نہیں سکتے۔ زمین کیسے کھود
سکو گے، پھر جب میں نے باقر علی سے اس متنازعہ
زمین کے بارے میں پوچھا جس کو ہڑپ کر دونوں
اپنے اپنے فریقین نے پہلے ہی قتل کر دیئے گئے تو
وہ سحر کے وقت مجھے اس مکان میں لے گیا جہاں
منور علی اور پرکاش پنڈت رہتے تھے۔ وہ مکان
کم اور کھنڈر زیادہ دکھائی دے رہے تھے۔
گاؤں سے بہت دور نانا مرحوم کے ایک کھیت
میں دو چھوٹے چھوٹے مکان جن کی دیواریں ایک
دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں اور کمزور دیواریں
اس لئے کھڑی تھیں کیونکہ برگد کے پیڑ کی شاخیں
اور سوکھی ہوئی جڑوں، دیواروں سے یوں لپٹی ہوئی
تھیں جیسے بچے کے ننگے بدن سے لپٹا ہوا ماں کا پھٹا
پرانا میلا کچیلا آنچل۔ ایک دیوار پر ہندی میں کچھ
لکھا تھا اور دوسری دیوار پر اردو میں کچھ لکھا تھا
مگر کیا لکھا تھا پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ بوسیدہ کمروں
میں خالی ڈبے خالی برتن اور ٹھنڈی راکھ تھی۔ پرکاش
پنڈت کے کمرے میں سنسکرت کی کتابوں کا انبار لگا
تھا جبکہ منور علی کے کمرے میں عربی کی بے شمار
کتابیں تھیں۔ کتابوں کی حالت دیکھ کر یقین سے
کہا جا سکتا تھا کہ دونوں کو مطالعہ کرتے ہوئے دبوچ
لیا گیا ہے یا عبادت کرتے ہوئے اغوا کر لیا گیا ہے

جب ہم واپس لوٹ رہے تھے تو کسی نے باقر
بتایا کہ شہر میں کرفیو لگ گیا ہے اور کتوں کی مدد
لاشوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے
سے پہلے کہ میں بھی اپنی کہانی اپنے اخبار کے ایڈیٹر
پاس دیتا میں نے ایک پیڑ کے نیچے دو بے حرکت جسم
باقر علی نے منور علی اور پرکاش پنڈت کو پہچان
دونوں کے جسم ٹھنڈے تھے۔ کپڑے گیلے تھے۔
نبض چل رہی تھی۔

بے چارہ تھانے دار ہمیں دور سے دیکھ کر
پہلے گھبرا گیا لیکن میرا اشارہ سمجھ کر وہ نہایت پھرتی
چالاکی سے جیپ لے کر آ گیا اور ہم نہایت ہوشیاری
سے دونوں کو جیپ میں بٹھا کر ہسپتال لانے میں کامیاب
ہوئے۔ خبر ہم سے پہلے شہر پہنچ گئی تھی اور عام طور پر
ورسٹ بوٹ ٹائی پہننے والے لیڈروں نے اپنے
لباس بدل دیئے تھے۔ ایک لیڈر شیروانی پہن کر اور
دوسرے دھوتی کرتا پہن کر ہسپتال کے باہر مظاہرے
کر رہے تھے۔ اور یہ دونوں یہ مانگ کر رہے تھے کہ پوسٹ
مارٹم کے بعد لاشیں انکو دی جائیں تا کہ ان کو جلوس
کی شکل میں آخری رسومات کے لئے لیا جا سکے۔

میرے ایڈیٹر نے جب مجھے آئی سی یو کے باہر
دیکھا تو وہ بہت خوش ہوا۔ وہ اس لئے کہ پہلی خبر
میری ہوگی اس لئے اخبار کا نام روشن ہوگا۔ مگر میں
اپنے آپ کو زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ سمجھ رہا تھا۔
ہسپتال کے باہر اتنے لوگ جمع ہو گئے تھے کہ علاقے
کو ملٹری نے گھیر لیا تھا۔ یوں تو میری خبر کو پہلی خبر سمجھ
کر سب میرا انتظار کر رہے تھے کہ میں کب منہ کھولوں

اور دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو۔ لیکن جب میں
نے زبان کھولی تو یوں لگا جیسے سب سننے والوں کو
سانپ سونگھ گیا۔

حقیقت یہ تھی کہ منور علی اور پرکاش پنڈت دونوں
کو اپنے گھر سے بھگانے، اغوا کرانے یا قتل کروانے کے
منصوبوں کی خبر پھیلانے والوں کے دماغ میں کیا
تھا۔ پتہ نہ منور کو معلوم تھا نہ پرکاش کو۔ دونوں
فاقہ کشی کا شکار ہو کر تب بے ہوش ہو گئے تھے جب چار
دن سے بھوکے یہ ۸۰ سال کے بوڑھے پتے کھا کر سو گئے
تھے۔ دراصل نانا جی نے ۱۹۴۷ء میں دونوں کو
دینی تعلیم دینے کے لئے ایک مکتب کھولا تھا اور
ہندوؤں کو دھارمک شکشا دینے کے لئے پاٹھ شالا
کھولا تھا اور یہ کھنڈر ہی اب تک مکتب اور پاٹھ شالا تھا۔
زمین بھی نانا ہی کی تھی اور مکان بھی ان کا تھا۔ نانا جی
جب تک زندہ تھے وہ منور علی اور پرکاش پنڈت کو ہر
ماہ تنخواہ بھی دیتے رہے۔ حالانکہ پچھلے ۳۰ سال سے
نہ وہاں کے ہندو نے اپنے بچے کو پاٹھ شالا بھیجا اور نہ
کسی مسلمان کا بچہ منور علی کے پاس آیا۔ نہ پرکاش کو
ہندوؤں نے مدد کی اور نہ منور کو مسلمانوں نے مدد کی۔
حالانکہ وہ گھر گھر جا کر بلکہ ہر اسکول میں جا کر یہ فریاد
کرتے رہے کہ مذہب کے نام پر لڑنے والو ہم سے مذہبی
تعلیم لو۔ عربی پڑھ لو، سنسکرت پڑھ لو! ورنہ ہمیں
روٹی کمانے کا کوئی ذریعہ بتا دو۔ جب بھی انہوں نے خود
کشی کی بات کی تب کبھی پرکاش نے روکا اور کبھی منور نے
پھر وہ لڑتے رہے مگر کسی نے ان سے نہیں پوچھا کہ کیوں
لڑ رہے ہو۔؟ اس لئے وہ جیتے جی روز مرتے رہے مگر کسی

نے ان سے یہ نہیں پوچھا۔ ہندو ــــ میرے گھر آؤ ــــ مسلمان میرے گھر آؤ ــــ اور وہ بھوکے رامائن اور قرآن شریف پڑھ کر سوجایا کرتے تھے۔ اور ہوش میں آتے ہی دونوں بڑبڑاتے رہے ــــ "ہم تم سے پوچھ رہے ہیں لوگو ــــ مندر اور مسجد کی بجائے مکتب اور پاٹھ شالا کیوں نہیں لڑتے؟ ہم ہیں نا ــــ تعلیم دینے کے لئے ــــ؟ ہمیں بچاؤ نا ــــ روٹی دو نا" میں نے لفظ بلفظ وہی سنایا جو منور علی اور پرکاشی پنڈت نے مجھے رک رک کر اپنے ڈوبتے سانسوں پر قابو کر کے کہا تھا۔ لیکن میری رپورٹ سے پہلے ہی شہر میں کرفیو لگ چکا تھا اور پڑوسی ملک بھی شہید اعظم منور علی کو قتل کرنے کی مذمت کر چکا تھا۔ بلکہ اس ظلم وستم کی داستان کو دنیا کی توجہ کا مرکز بنانے کا ارادہ بھی کھلے عام ظاہر کر چکا تھا ــــ اور اب میں اپنے ایڈیٹر کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ جاننے کے لئے میں نے حقیقت بیان کر کے اپنے ان داتا کو فائدہ پہنچایا ہے یا نقصان! کہیں ہجوم مجھے حقیقت بیان کرنے کے لئے اپنے پاؤں سے کچل نہ ڈالے!

ختم

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے)

کتاب کا نام :۔ فصلِ آگہی
شاعر :۔ سلیم انصاری
صفحات :۔ ۱۳۶ ۔ قیمت :۔ ۵۰ روپے
ناشر :۔ سلیم انصاری
۵۵ موتی نالہ، جبل پور (ایم۔ پی)

فصلِ آگہی ایک حمد، ایک نعت، قریب ۱۵ نظموں اور ۴۵ غزلوں کا ایک ایسا تازہ شعری مجموعہ ہے جس کی صرف تعریفیں کی گئی ہیں۔ ۱۳۱ صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعہ پر ڈاکٹر خالد محمود، جناب عشرت ظفر، جناب عبدالحئی انجم اور ڈاکٹر محمود شیخ نے اپنی رائیں لکھی ہیں۔ آخر میں میری بات عنوان سے شاعر نے اپنے تاثرات بھی پیش کئے ہیں۔ ڈاکٹر خالد محمود کی رائے میں سلیم انصاری کی شاعری نئے ادبی منظر نامے سے منسلک ہونے کے باوجود اپنی قدرے الگ پہچان بھی بنائی ہے۔"

جناب عشرت ظفر فرماتے ہیں: "میں سلیم انصاری کو ایسا ہی شاعر پاتا ہوں جس کے یہاں تخلیقی تجربات مختلف بالمنوع اشکال و آثار میں نمودار ہوتے ہیں۔"
سلیم انصاری کی نظموں کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے: "ہر نظم ایک ایسا آئینہ ہے جو عصری انقلاب کی بدلتی ہوئی فضا کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔"

وہ اور آگے لکھتے ہیں سلیم انصاری کی آواز ایوان شعر میں بہت منفرد ہے۔ ان کے یہاں لفظیات کی معنوی جہتیں نئی ہیں اور شعری رویہ بھی جدید آہنگ سے مملو ہے۔

عبدالحئی انجم صاحب نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "فصل آگہی" کا ایک ایک لفظ اپنے عہد و حالات کے تناظر میں ایٹم کی طرح بے پناہ تخلیقی و تخریبی قوتوں کی امانت دار ہے۔" یہ الگ بات ہے کہ "فصل آگہی سلیم انصاری کے فکر و فن اور شعور و آگہی کی پہلی نمود ہے۔"

ڈاکٹر محمود شیخ نے بھی اس مجموعہ کی کم تعریف نہیں کی ہے۔ فرماتے ہیں: سلیم نے مروجہ شاعری کے مزاج سے ہٹ کر ایک بالکل نیا لب و لہجہ اختیار کیا ہے اور غزل کے بدلتے ہوئے رنگ و آہنگ کو اپنا کر شعری تقاضوں کو پورا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

الغرض! مذکورہ تائیدی و تعریفی حوالوں کے بعد مزید کچھ لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ پھر بھی جہاں تک مبصر کی حیثیت سے ناچیز کی رائے کا تعلق ہے۔ ناچیز

ماہنامہ سہیل گیا

ایک شمارہ شمس کنول کے نام

• چیف ایڈیٹر •

مسعود منظر

★

• ایڈیٹر •

جمیل منظر

★

فہرست

شمارہ ۹ جلد [illegible]

بدل اشتراک

فی شمارہ ——— ۵ روپے

زر سالانہ ——— ۵۰ روپے

[illegible] ——— [illegible] روپے

• خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ •

ماہنامہ سہیل

ریلوے سائیڈ روڈ، گیا ۔ ۸۲۳۰۰۱

فون نمبر :- ۲۱۵۷۳

سیلاب سے متاثر علاقوں میں صحت کی احتیاط

سیلاب میں آلودہ پانی / پینے کا پانی، غذا اور عام آلودگی کی وجہ کراتی سار / قے دست، کھانسی سردی اور جیرم کی بیماری پھیل سکتی ہے۔ مندرجہ ذیل احتیاطی تدابیر سے آپ درج بالا بیماریوں سے بچ سکتے ہیں۔

صاف کھانا ـــــ کھلے میں رکھی کوئی چیز نہ کھائیں۔ گھر میں کھانے پینے کا سامان ڈھک کر رکھیں۔ جس سے مکھیاں اس تک نہ پہنچیں۔ کھلے میں بکنے والے چاٹ، پکوڑا، برف، مٹھائی، نمکین سے پرہیز کریں۔

- باسی، پرانی، سڑی گلی، سبزی یا پھل وغیرہ کبھی نہ کھائیں • کچی سبزیوں اور پھل وغیرہ کو استعمال کرنے کے پہلے اچھی طرح دھولیں • کھانا ہمیشہ اچھی طرح پکا کر کھائیں • ایک بار میں جتنا کھانا ہو اتنا ہی کھانا پکائیں جن سے باسی کھانا نہ بچے • کھانا پکانے اور پروسنے کے قبل ہاتھ اچھی طرح سے دھولیں۔ • سیلاب کے وقت چوڑا، ستو، پھولا چنا اور گڑ کا استعمال کریں

صاف پانی ـــــ پینے اور کھانا پکانے کے لئے پانی ہمیشہ نل یا گہرے پمپ سے لیں۔
• کم گہرے کنویں، کم بور والے ہینڈ پمپ یا کسی دوسری جگہ سے پانی بھرنا پڑے تو کلورین ٹیبلٹ کی ٹکیہ ڈال کر یا اچھی طرح ابال کر ٹھنڈا کر کے پانی کام میں لائیں۔ • پانی بھرنے کے قبل برتن اور ہاتھ ہمیشہ الگ اچھی طرح سے دھولیں • پینے اور کھانا پکانے کا پانی ہمیشہ الگ ڈھک کر رکھیں • صاف برتن سے کھانے پینے کا پانی نکالیں۔

صفائی ـــــ

• گھر کے اندر باہر صاف رکھیں • گھر کا کوڑا کرکٹ جگہ خاص میں ڈالیں • پانی پینے کی جگہ اجابت نہ کریں • کھلے میں اجابت کے لئے بیٹھیں اور اجابت کے بعد اسے مٹی سے ڈھک دیں۔

ـــ جاری کردہ ـــ

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار

P.R.No 85 D(INF.34)96-97

نمود

یہ شمارہ شمس کنول کے لئے

• شمس کنول اپنی آخری سانس تک علم و ادب اور ملک و ملت کی خدمت کرتے رہے ایک طویل عرصے تک متعدد شعبہ ہائے حیات میں ان کی سرگرمی ان کے مطالعات و مشاہدات اور ان کے تفکر و تدبر نے ان کی شخصیت میں ایک ایسی عبقریت پیدا کردی تھی جس کی وجہ سے ہمارے ادبی معاشرے کے بہت سے افراد انہیں ایک فاصلے پر رکھ کر دیکھنے لگے تھے۔ بالعموم ہمارا پڑھا لکھا طبقہ ان کے تصورات سے متاثر تو تھا لیکن کھل کر ان کی تائید کرنے میں جھجک محسوس کرتا تھا۔ فلمی صنعت، نقد و ادب، صحافت اور سیاست پر ان کی بے لاگ اور بے ریا باتوں سے کچھ لوگ کڑواہٹ بھی محسوس کرتے تھے۔ پہلے یہ کہ اب تک ہمارے یہاں سچائی کی تلخی برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ شمس کنول چونکہ لاگ لپیٹ، مصلحت اور موقع پرستی سے ہٹ کر بے کم و کاست اپنے موقف کا اظہار کردیتے تھے اس لئے وہ انعامات و اعزازات اور دنیاوی آسائشوں سے دور رہے۔ ایک مضبوط نظریہ اور کردار رکھنے والے انسان کو جو قیمت چکانی پڑتی ہے وہ شمس کنول نے بھی ادا کی۔

لیکن مصلحین اور مفکرین کا سب سے قیمتی سرمایہ وہ خیالات ہوتے ہیں جو ان کے بعد بھی دنیا کو صحیح راستہ دکھاتے رہتے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ شمس کنول کی تمام تحریروں کو موضوعات و عنوانات کے تحت مرتب کیا جائے اور اس قیمتی تحفے کو اہل وطن اور اہل ملت تک صحیح انداز سے پہنچایا جائے۔

اس نابغۂ روزگار کو یاد رکھنے کے لئے ہم نے فی الحال ماہنامہ سہیل کے اس عام شمارے کو شمس کنول کے لئے مخصوص کیا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ محض ایک تمہید ہے — اور اردو والوں کو مہمیز کرنے کا ادنیٰ سا وسیلہ ہے۔ شمس کنول کی خدمات کے بھرپور اعتراف کی ضرورت ہی نہیں ہمیں ان کے نظریات و خیالات سے روشنی بھی حاصل کرنی ہے۔ ادارہ سہیل اس جری، بے باک اور فعال مجتہد فکر و نظر کو عقیدت کا سلام پیش کرتا ہے۔

——— مسعود منظر

ڈاکٹر کلیم اللہ حالی
گیا

شمس کنول — ایک عبقری شخصیت

شمس کنول (شمس الاسلام صدیقی) کی ہمہ جہت اور وسیع و عریض شخصیت کو کسی محدود خانے میں رکھ کر دیکھا نہیں جا سکتا۔ ان کی شخصیت کا پھیلاؤ اکثر و بیشتر ہماری دسترس سے باہر ہونے لگتا ہے۔ اور ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا ذکر ہم کس ضمن میں کریں۔ وہ مشتاق اہل قلم بھی تھے۔ شعر و سخن اور نقد و نظر پر بھی انہیں دسترس حاصل تھی، وہ مفکر بھی تھے اور مصلح قوم و وطن بھی، ان کی سیاسی سوجھ بوجھ دوسروں کو راستہ دکھاتی تھی۔ وہ غیر معمولی صحافی بھی تھے، قوم و ملت کے لئے ان کا جذبۂ ایثار مثالی تھا۔ زندگی بھر وہ معاشرے کو تعصب، جہالت، کم نظری، ظلم و استحصال اور دوسرے مصائب سے پاک کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کی تحریر ایک سنجیدہ مقصد کے لئے وقف تھی۔

بجنور کی سرزمین سے اٹھنے والا یہ ذرہ ہندوستان کے متعدد علاقوں میں چمکتا رہا۔ بمبئی، دلی، بجنور، علی گڈھ جہاں بھی شمس کنول کا قیام رہا وہاں اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت کے لئے انہوں نے کوئی وسیلہ تلاش کر لیا۔ حسن اتفاق سے انہیں رفیقہ حیات بھی ایسی میسر ہوئیں جنہوں نے ہر منزل پر ان کا ساتھ دیا۔ ان کے ہر مہم پر شانہ بشانہ شریک رہیں۔ شہناز کنول خود بھی ادب کی خدمت کرتی رہیں اور اپنے رفیق حیات کا بھی ہاتھ بٹاتی رہیں۔ انہوں نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی اس میدان میں شہناز کنول نے ایک معتبر مقام حاصل کر لیا۔ شمس کنول نے بمبئی کے اخبار انقلاب میں کام کیا، وہاں بھی انہوں نے اپنے قلم کا جوہر دکھلایا۔ پھر اپنا فلمی میگزین فن کار شائع کیا۔ ۲۵ سال ممبئی کے قیام میں انہوں نے ہر روز علم و ادب، زبان و صحافت اور ملک و معاشرہ کی خدمت کی۔ اپنا رسالہ گگن نکالا۔ جس نے ان کے نظریات و تصورات کی تشہیر میں اہم رول ادا کیا۔ پھر علی گڈھ سے "افق تا افق" شائع کیا اور اگرچہ اس کے صرف پانچ شمارے شائع ہو سکے لیکن مختصر مدت میں ہی اس نے اپنی پہچان کرا دی۔ دراصل رسالہ گگن میں شمس کنول "افق تا افق" کے عنوان سے مستقل کالم لکھتے تھے۔ اس عنوان پر انہوں نے

رسالے کا نام رکھا۔

شمس کنول کی ہر تحریر گفتگو کا موضوع بنی رہی۔ آج کل کے جذباتی نمبر میں ان کا انٹرویو نما مضمون خاصا مقبول ہوا۔ چونکہ ان کی نظر زندگی کے تمام شعبوں پر تھی معاشرے کے جملہ گوشوں میں وہ عرق ریزی کی صلاحیت رکھتے تھے اس لئے فلم سازی کی صنعت بھی ان کے لئے دلچسپی کا موضوع بنی رہی۔ چنانچہ ان کے وہ مضامین بھی خاصے مشہور ہوئے جو انہوں نے فلمی دنیا کے متعلق لکھے ہیں۔ دلیو یکا رانی پر ان کے مضمون کی صدائے بازگشت دیر تک سنائی دیتی رہی۔ فلم آرٹ کے مالک و مدیر ادوم پرکاش نامی ان کی تحریروں کے دلدادہ تھے اور بڑے اشتیاق سے اپنے رسالے میں ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ شمس کنول اخبار ریاست کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہے۔ صحافت، سیاست اور ادب تینوں شعبوں پر بیک وقت اتنی اچھی مہارت اردو کے کسی اہل قلم کو نصیب نہ تھی جب انہوں نے گگن کا بنگلہ دیش نمبر نکالا گیا تو اپنے مشتملات کی نیرنگی اور خیالات کے وزن کی وجہ سے اس نے قارئین کو خاصا متاثر کیا۔

شمس کنول کے رسالے گگن کے مذاہب عالم نمبر نے تو برصغیر ہند و پاک میں اپنی ضخامت اور علمی وقعت کی وجہ سے تہلکہ مچا رکھا تھا۔ تمام مقتدر اہل علم و قلم نے اس نمبر کی تعریف کی ہے اور بلاشبہ اتنا وقیع نمبر ہنوز اردو زبان میں شائع نہیں ہوا ہے۔ شمس کنول کی عبقری شخصیت نے کبھی کسی سے متاثر اور مرعوب ہونا نہیں سیکھا تھا۔ وہ اپنے تصورات پر پہاڑ کی طرح اٹل تھے۔ وہ سیکولرزم کو امن و آشتی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اردو زبان کے املا میں تبدیلی پر اصرار کرتے تھے اور عملاً زندگی بھر روش عام سے ہٹ کر اپنے مخصوص املا کا استعمال کرتے رہے۔ ان اصلاحات میں سے آج ہم کچھ قبول کر رہے ہیں اور ممکن ہے مستقبل میں ان کے اجتہادات کے مزید فیض یاب ہوں۔

شمس کنول باہمت، جری اور ثابت قدم اہل قلم تھے۔ کسی زبان کو صدیوں کی ریاضت کے بعد ایسا بیدار مغز انسان ہاتھ لگتا ہے

شمس کنول اگر ایک طرف فلمی دنیا کے تمام نشیب و فراز سے واقف تھے اور انہیں بے کم و کاست AUTHORATATIVE انداز میں بیان کر دیتے تھے تو دوسری طرف وہ شعر و ادب اور صحافت کے سلسلے میں بھی جچی تلی رائیں دیتے تھے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کے اظہار میں بڑے سے بڑے ارباب قلم سے اختلاف کرتے ہوئے بھی نہیں کتراتے تھے۔ فلمی دنیا سے اتنی وابستگی کے بعد بھی وہ بڑی جرأت سے یہ بتاتے ہیں کہ

"فلمی بازار میں اپنی دکان لگانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنا اشتہار آپ بن جائے اور اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر جو کچھ اپنی ہی تعریف میں کہے اور دوسرے کو کوڑا کرکٹ سمجھے"[1]

یہی نہیں شعروادب اور ادبی رسائل وجرائد پر شمس کنول کے بے باک تبصرہ بھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ معاشرت وتہذیب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر ان کی رائیں وزن نہ رکھتی ہوں۔ وہ افق تا افق کے ہر شمارے میں متعدد موضوعات کا احاطہ کرتے تھے۔ ادب وتہذیب کے تمام پہلوؤں پر اپنے خیالات رقم کرتے تھے حدیہ ہے کہ ادبی رسائل کے اداریے شذرات اور جملہ مشمولات بھی زیر بحث آتے تھے۔

حیرت ہوتی ہے کہ شمس کنول ہمہ وقت کس طرح متفرق تحریروں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان پر بے لاگ رائیں دیتے تھے۔ رائیں بھی ایسی جن سے اختلاف کی گنجائش ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ اردو اکا ڈمیوں سے شائع ہونے رسائل کے عدم معیار پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔

> واقعہ یہ ہے کہ پنجاب، راجستھان، ہریانہ، بہار اور مغربی بنگال وغیرہ کی سرکاریں اپنے پاسبان، نخلستان تعمیر ہریانہ، جنات، زبان وادب اور روح ادب وغیرہ جیسے جریدوں پر قومی سرمایہ ضائع کررہی ہیں۔ یہ جریدے نہ اپنی اپنی سرکاروں کی اچھی پبلسٹی انجام دے پاتے ہیں اور نہ اردو عوام ہی کے لئے مفید مواد فراہم کرتے ہیں۔"[۲]

شمس کنول کی تمام تحریروں کو موضوعات کے تحت مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ساری تحریریں ہمارے سیاسی قائدین، فلمی صنعت کاروں، صحافیوں، تخلیق کاروں، ناقدوں اور مفکروں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ یہ کام اگرچہ دشوار ہے مگر ضروری بھی ہے۔ ہم اسی طرح اس یگانہ روزگار دانشور سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

حوالہ

۲۔ افق تا افق ۔ دسمبر ۱۹۹۰ء

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے نبیل آرٹ پریس شاہ گنج پٹنہ ۶ سے چھپواکر دفتر سہیل ریور سائیڈ روڈ، گیا سے شائع کیا۔

بھیجی لیا

. ندیم (علیگ)

جانے والے کی یاد آتی ہے

سال ۱۹۹۵ء میں اردو کی مشہور ہستیاں ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئیں ان میں شمس کنول
س الاسلام صدیقی) بھی تھے چند سال قبل بمبئی اور بھنور کو خیرباد کہہ کر دیار سر سید. علی گڑھ میں ایک مکان
رسٹی کے قریب ہی تعمیر کرلیا تھا. جہاں سے 'افق تا افق' نکالنے لگے تھے. مسلسل بیماری نے ان کو بہت
ر کردیا تھا. مگر ان کی ہمت کو توڑ نہ سکی تھی . یہ زندگی کا کیسا المیہ ہے کہ جب فنکار کا فن اپنے عروج
رتا ہے تو اس کا جسم جان کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے.

آہ! شمس بھائی کے کیا کیا حوصلے اور منصوبے تھے . ان کے اندر تجربوں کا ایک سمندر موجزن تھا.
. ندگی کچھ اور مہلت دیتی تو وہ بمبئی میں گذاری ہوئی زندگی کے حالات تحریر کرتے جو ان کی ایک منفرد
ستان حیات بھی ہوتی .

بھنور کی خاک نے ان کو پکارا . ۵ر اکتوبر کو وہ جب وہ علی گڑھ کو خیرباد کہہ رہے تھے تو ہمیں معلوم
تھا کہ شمس بھائی کی صورت کبھی نہ دیکھ سکیں گے . ۸ر اکتوبر ۱۹۹۵ء کو انہوں نے اپنے آبائی وطن
ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں .

شمس کنول کی وفات پر ملک اور بیرون ملک اخباروں اور رسائل نے تعزیتی اداریے لکھے. احباب
تعزیتی خطوط بھیجے.

چند اخبارات اور رسائل کی تعزیتی تحریروں کے اقتباسات پیش خدمت ہیں جن سے بھائی شمس
کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے!

فہیم انہونوی (ایڈیٹر حریم ڈائجسٹ)

"شمس صاحب ایک بہت ہی بلند کردار آدمی تھے اور آدرش وادی تھے اور انہوں نے ہمیشہ اعلیٰ
خیالات کے ساتھ ایک سادہ زندگی گزاری. ان کے دل میں قوم و ملت کے لئے بھی ہمدردی تھی
اب اسے کیا کہئے کہ اس قوم نے کبھی اپنے سچے اور مخلص بہی خواہوں کی ذرا بھی قدر نہیں کی. مجھے
معلوم ہے کہ شمس بھائی کو کیسی پریشانیاں اٹھانی پڑیں. شمس صاحب صف اول کے صحافی

ادراداب تھے۔ انداز نگارش نہایت سادہ اور خوب ہی نہیں بلکہ خوب تر تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کا معیار کتنا بلند تھا۔ پہلے وہ گلش نکالتے تھے جو حالات کا شکار ہوگیا پھر علی گڑھ سے "افق تا افق" جاری کیا لیکن چند شماروں کے بعد ہی ان پر یہ حقیقت دوبارہ واضح ہوگئی کہ ایسے سنجیدہ رسالوں کا پوچھنے والا ہمارے یہاں کوئی نہیں ہے۔ اب تو خیر سارے ہی شکوے دور ہوگئے۔ ان کے جیسے لوگ اب بہت مشکل سے ملتے ہیں اور آیندہ ملیں گے بھی نہیں اور شاید اچھا بھی یہی ہے۔

شمس صاحب میں ایک اور خوبی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ بے لاگ بات کہتے تھے۔ وہ کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے لیکن جو صحیح سمجھتے اسے کہنے سے گریز بھی نہیں کرتے تھے۔ خود انھوں نے ایک بار لکھا تھا کہ "ہر عبقری انسان انتہا پسند ہوتا ہے۔ یہ بات ان پر صادق آتی ہے لیکن چونکہ وہ اپنی قوم کی بھلائی اور بہتری کے خواہاں تھے اس وجہ سے ان کی انتہا پسندی بھی اسی باعث تھی۔

ایک ایسا انسان جس کے دل میں دوسروں کا درد تھا۔ ایک وضعدار اور شفیق ہستی ہم سے جدا ہوگئی۔
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

محبوب الرحمٰن فاروقی (ایڈیٹر آجکل)

عارف نقشبندی کا غم تازہ ہی تھا کہ اطلاع ملی کہ ہمیں داغ مفارقت دینے والوں میں شمس کنول بھی شامل ہوگئے۔ وہ شخص جو زندگی سے ہمیشہ جد وجہد کرتا رہا۔ جس کے اندر طوفانوں سے ٹکرانے کی ہمت ہمیشہ موجزن رہی، جو کبھی نامساعد حالات میں گھبرایا نہیں، جو زندگی کی امٹ اقدار کا جویا رہا۔ جو اپنے خیالات و روایات کے اظہار میں ہمیشہ بے باک اور جری رہا جس نے کبھی کسی سے کسی معاملہ پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ جو سچائی کا پرستار تھا اور اس کے اندر افق تا افق اس سچائی کا بے باکانہ ڈھنڈورا پیٹنے کی ہمت تھی۔ جس نے سچائی کے برمحل اظہار میں کبھی جھجک محسوس نہیں کی وہ شخص ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو اچانک دنیا سے منہ موڑ کر منوں مٹی تلے خاموشی کی نیند سو گیا۔ یقین کرنے کو تو جی نہیں چاہتا مگر کیا کیا جائے ہر ذی روح کو موت آتی ہے اور موت ہی برحق ہے تو کیا سمجھا جائے کہ اس زندگی کا مآل صرف موت ہی ہے نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ شمس کنول ابھی زندہ ہے جسمانی طور پر وہ ہم سے پوشیدہ ضرور ہوگیا ہے لیکن اپنے کردار، افعال، عمل اور نظریات کی صورت میں وہ "گگن" "افق تا افق" اور مضامین کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جب بھی اردو دنیا میں حسرت موہانی جیسے سرپھرے انسانوں میں شمس کنول کا نام بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اپنے ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ "میں بھی جرت

مو ہانی جیسا اس پیرا انسان ہوں طویل عرصے تک بمبئی میں رہنے کے باوجود وہ تجربے دولت کمانے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکا ۔ ۔ ۔ ۔"

ندیم صدیقی (انقلاب بمبئی)

شمس الاسلام صدیقی جنہیں ہم اردو والے شمس کنول کے نام سے جانتے ہیں ان کا شمار قلمکاروں کے اس قبیل میں ہوگا جنہیں گننے وقت ہاتھوں کی انگلیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ بجنور کی خاک سے اٹھنے والا اردو کا یہ صحافی اپنے خاص مزاج کے رنگ کو بمبئی کی رنگینی پر فوقیت دینے والا غیور اور صاحب طرز ادیب تھا۔ اب جبکہ ہماری زبان میں اکثر لکھنے والے "خوب اور خوبصورت" جیسے لفظوں کے بہت معمولی معنوی بعد سے بھی نا واقف ہیں مگر پھر بھی عظیم ہونے کے نعرے لگواتے ہیں' ایسے ماحول میں شمس کنول جیسے فرد ایک چراغ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ میں "لائٹ ہاؤس" کی حیثیت کے حامل تھے ۔ ۔ ۔

شمس کنول نے بظاہر بڑی کشمکش میں عمر گزاری مگر "زندگی" نے اپنے دروازے ان پر وا کر دیے ہیں کہ یہ عمل ان کے اپنے جذبے اور ایمان کے تئیں خلوص کا نتیجہ ہے جو لکھنے والوں کے لئے ایک ترغیب بھی ہے اور حیرت کی تصویر بھی ۔"

شاہد رشید (ایڈیٹر اردو ٹائمز)

"شمس کنول نے اپنی زندگی میں اپنی کج کلاہی کی وجہ سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا بعض اوقات وہ از خود غلط ہوتے تھے۔ لیکن جس بات کو وہ صحیح مان لیتے تھے اس پر سختی سے کاربند رہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ جب اپنے قلم کی قوت سے ارباب اقتدار میں اپنا اثر و رسوخ قائم کر کے زندگی کی ضروریات ہی نہیں آسائشیں حاصل کر سکتے تھے تب وہ اپنی خودداری اور فاقہ مستی کے نشے میں چور رہے۔ ان حالات کا اثر ان کی تحریر پر بھی پڑا لیکن حامد الانصاری غازی کی دختر شہناز کنول کی ازدواجی رفاقت نے ان کی زندگی کی ان تلخیوں کو کچھ کم کر دیا تھا۔"

"شمس کنول جیسا خوددار اور صاحب طرز صحافی اردو میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ان کی شخصیت گوشت پوست کے جسم کے ساتھ منوں مٹی کے نیچے ختم ہو جائے گی لیکن ان کا اسلوب نگارش ان کی تخلیقات ان کے رسائل کا مواد ادب اور صحافت کے سنجیدہ قارئین کے ذہنوں میں زندہ رکھے گا۔"

شاہدہ فرحت

نذرانۂ عقیدت

(برادرم شمس کنول کی یاد میں)

افق سے تا افق پھیلی ہوئی ہے روشنی اس کی
بجھائے گی اجل کیسے وہ شمع زندگی اس کی
وہ اسم باسمٰی شمس جس کا نام نامی تھا
صحافت اور ادب میں اب بھی ہے تابندگی اس کی
شرافت اور دیانت کا وہ پیکر مخلص و صادق
مبرّا ہر تصنع سے تھی دلکش سادگی اس کی
مولف تھا وہ پر عظمت کتاب "عالمی مذہب"
عبادت بھی یہی اس کی یہی تھی بندگی اس کی
رفیق زندگی شہناز جیسی اس نے پائی تھی
کرے گی نام روشن وہ رفیق زندگی اس کی
وہ اہل دل کا اور اہل ادب کا قدرداں فرحت
شکستہ دل کو دیتی تقویت تھی دوستی اس کی

شہناز ہاشمی

شمس بھائی

زندگی نے کس موڑ پر کون اچانک آجائے اور پھر یسے ہی اچانک چلا بھی جائے یہ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اگر لے سے سب کچھ معلوم ہو جائے تو ہستی کے راز بھلا نہ کیسے رہیں۔

ایک اداس شام تھی جیسے کہ ہر شام ہوتی ہے پھر رے عزیز از جان بھائی جان حمید احمد الہاشمی کو جدا ہوئے چند روز ہی گزرے تھے۔ ایک شخص سارے شہر کو ویران یا تھا۔ شام دھندلی ہوتی جا رہی تھی کہ دیکھا اشتیاق خاں چلے آ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے ساتھ آنے ں کا تعارف کروایا۔ شمس کنول صاحب اور ان کی شہناز کنول۔ شمس کنول اور ان کی تحریروں سے فیت تھی۔ "ہمکن" کے ذریعے شہناز کنول کے افسانے ناول پڑھتے رہتے تھے خاص کر میری بہن خالدہ عابد تابوں کی الماری میں شہناز کنول کا ناول رکھا رہتا ہے۔

خالی خالی ذہن سے آنے والوں کا استقبال کیا ا کچھ بات ٹھیک سے نہ ہو سکی۔ آنسو تھے کہ کسی طرح تھم ہے تھے کہ یہی وقت روز شام کو بھائی جان کے آنے کا ہوتا شہناز میری ہم نام نے تسلی کے الفاظ کہے۔ دیر تک ساتھ رہیں۔ شمس کنول صاحب نے رموز کائنات اور ہمہ وقت دنیا کے جاری و ساری کاروبار کے بارے میں اس طرح سے گفتگو کی کہ میری آنکھوں کا سیلاب تھم سا گیا۔ اور اس دن سے شمس کنول صاحب شمس بھائی بن گئے۔

اس کے بعد ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ پتہ چلا کہ شہناز ہمارے پرانے ساتھی عابد اللہ غازی کی بہن ہیں جن کی بیوی تسنیمہ ہماری اولین شاگرد ہیں۔ اور بھی قربت کا سامان ہوا۔ پھر طارق غازی آئے جو جدہ میں سعودی گزٹ کے منیجنگ ایڈیٹر ہیں ہمارے داماد شاہین نظر (فوزیہ کے شوہر) سب ایڈیٹر تھے۔ یہ بھی ایک رشتہ ہوا۔ طارق غازی کی بیگم نور جہاں سے دوستی ہو گئی۔ ان کی روشن شخصیت کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حیدرآباد میں مقیم ہمارے عزیزوں خالدہ عالم علی اور طارق سلطان اور سلمہ سے ان کی راہ و رسم تھی۔ پھر ارشد آئے اور ہماری بہن کے گھر میں بیٹھ کر اپنے اشعار سنائے۔ دونوں خاندانوں کا رشتہ استوار ہوتا رہا۔

سب سے بڑھ کر بیگم ماجدہ نازلی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہم ان کے افسانے اور ناولیں پڑھتے رہے ہیں اور ان کے ذہن جدید اور شگفتہ اسلوب بیان سے

متاثر ہیں۔ ہم نے اپنے لیڈیز کلب میگزین کے پہلے شمارے
کا اجرا بیگم ماجدہ نازلی سے کروایا۔ ان تمام سرگرمیوں میں
شمس بھائی پس منظر میں یا بہ نفسِ نفیس شریک رہے۔
کبھی ہم ان کے گھر بیٹھے چائے پی رہے ہیں اور افق تا افق
کی باتیں ہو رہی ہیں اور کبھی وہ ہمارے غریب خانے کی
رونق بڑھا رہے ہیں۔ ہماری تر ویمن سوسائٹی کی ایک
میٹنگ میں بھی شریک ہوئے۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ
مجھے ایک ایسا مشفق بھائی مل گیا جس کی شفقت کا سایہ
ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔

زمانہ اپنے راستہ پر چلتا رہا۔

ایک دن شمس بھائی نے خلافِ معمول مایوس
سے ہو کر کہا "میری طبیعت خراب ہے۔ تھک گیا ہوں۔
اب رسالے کے لیے بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا۔ سب کے
چندے واپس کروا دو۔ رسالہ اب نہیں نکلے گا!" میں
نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ رسالہ نکلے گا اور آپ ہی
نکالیں گے۔ چندہ واپس نہیں ہوگا۔ چندہ واپس کرنے
کا ارادہ وہ بھی اردو رسالے کے ایڈیٹر کی طرف سے۔
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔
واقعی شمس بھائی وضع داری اور شرافت کا نمونہ تھے، روشن
خیال، روشن دماغ انسان۔ ان کو دیکھ کر، ان کی باتیں سن
کر، ان کے حوصلے دیکھ کر جی چاہتا تھا کاش دنیا میں علم
ایک نہ ہو سکے تو بہت سے لوگ ان جیسے ضرور ہوں۔
قلی قطب شاہ کی وہ دعا یاد آتی تھی جو انہوں نے حیدرآباد
کے لیے مانگی تھی:

"میرا شہر لوگاں سے معمور کر"

ایک دن شہناز آئیں اور کہا کہ شمس بیمار ہیں
آپ کو یاد کر رہے ہیں بلایا ہے۔ میں دوسرے دن ملنے گئی۔
بہت تیز بخار میں غافل تھے۔ کوئی بات نہ ہو سکی۔ کہاں تو
بے تکان بولتے تھے۔ اور کہاں بالکل خاموش لیٹے تھے۔
کئی دن بعد میں پھر عیادت کے لیے گئی۔ پھر وہی غفلت
کی کیفیت۔ شہناز بہت پریشان تھیں۔ جو بھی ٹوٹے
پھوٹے الفاظ میں زبان سے نکل سکا اطمینان دلایا کہ
آج کل بخار کا موسم ہے۔ اپنے وقت سے ٹھیک
ہو جائے گا۔

اکتوبر میں ایک سمینار میں حیدرآباد جانا ہوا
ایک مہینے بعد واپس ہوئی۔ علی گڑھ آتے ہی پہلی خبر جمیلہ
ماجد اور پھر آصف اظہار علی نے سنائی کہ شمس کنول
رخصت ہو گئے۔ ایسے نہیں۔ یقین نہیں آتا۔ اتنی
جلدی؟ کیا معمولی بخار بھی جان لیوا ہوتا ہے؟ لیکن
بخار معمولی کہاں تھا؟ دو ڈھائی مہینے کی بخار [illegible]
کی شب بیداری۔ آخر میں وہی ہوا کہ قضا نے چلی چال
میرے غم میں شہناز اور شمس بھائی خلوصِ دل سے
شریک ہوئے تھے۔ شہناز کی شریکِ غم تو میں بھی ہوں
لیکن وہ غم غلط کرنے والے الفاظ کہاں سے لاؤں
میں خود ہی تہی دامن ہوں۔ حال ہی میں شہناز نے
بتایا کہ میرے والد کی کتابیں پڑھنے کے بعد انہیں
ہوا کہ میرے والد اور ان کے والد کے حالات زندگی
بہت ملتے جلتے ہیں۔ اچھا ہی شہناز جیو اپنے خاندان
کی اس علمی، ادبی اور تہذیبی وراثت اور یکسانیت
بھروسے اور حوصلہ مندی کے سہارے زندگی کے

شمس کنول

شمسِ نور بار تھا

متین امروہوی

(۱)

لُٹ گیا علم کا انمول خزانہ افسوس
ہو گیا ختم محبت کا فسانہ افسوس
زندگی ایسی تھی پانی میں کنول ہو جیسے
موت ایسی ہوئی کرتا ہے زمانہ افسوس

(۲)

گلشنِ اردو میں کھل کے وہ کنول مرجھا گیا
فصلِ گل رخصت ہوئی موسم خزاں کا آگیا
عندلیبانِ چمن ہیں اس کے غم میں سوگوار
شمس کی گویا تمازت سے کنول کملا گیا

(۳)

اس کے ہاتھوں میں ہمیشہ رقص کرتا تھا قلم
گوہرِ الفاظ وہ کاغذ پہ کرتا تھا رقم
علم اس کا اوڑھنا اس کا بچھونا تھا ادب
فکر کی راہوں میں روشن ہے اس کے نقشِ قدم

* سیّدہ ضیاء احتشام

صحافتوں کے آسماں پہ شمس نور بار تھا
وہ بدنما کثافتوں میں جوں کنول شعار تھا
نگاہِ فن شناس میں عظیم و محترم تھا وہ
کہ فکر و فن کی بزم میں جلیل و باوقار تھا
وہ کارزارِ زندگی میں [illegible] کوہکن لیے
وہ نرم خو تھا نرم رو وہ مثلِ جوئبار تھا
وہ شہسوار علم و فن تھا عمر بھر رواں رہا
گگن پہ جلوہ گر رہا افق سے آشکار تھا
وہ دوستوں کی بزم میں رہا تھا میکشِ وفا
عدو کی محفلوں میں بھی حلیم و بردبار تھا
وفا کا ذکر جب چھڑیگا یاد اس کی آئیگی
کہ پردۂ خیال پر کرن سی جھلملائیگی

شمس کنول نہیں رہے

ان کا اسلوب باقی رہے گا

٭ ساجد رشید
(ایڈیٹر اردو ٹائمز، بمبئی)

اردو کے صاحب طرز صحافی شمس کنول نے سات[1] اکتوبر کو ستر سال کی عمر میں زندگی کی جہد مسلسل کو تمام کیا اور اپنے آبائی وطن بجنور میں خاک نشین ہوئے!

بجنور کے ایک زمیندار گھر کے چشم و چراغ شمس الاسلام صدیقی نے جب بمبئی میں بود و باش اختیار کیا فلمی تبصروں سے انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کی ابتدا کی تھی لیک فلمی رسالہ تقریباً دس سال تک نکالتے رہے۔ جو اپنے مواد کے اعتبار سے تمام فلمی رسالوں سے یکسر مختلف اور موضوعات کے لحاظ سے مختلف تھا۔ فلمی صحافت کو جب شمس صاحب نے وقت، سرمائے اور ذہانت کا زیاں تصور کیا تو ماہنامہ "گگن" جاری کیا۔ گگن نے بہت ہی کم مدت میں سنجیدہ قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی تھی۔ بلاشبہ یہ اردو کا سب سے منفرد کیمرل میگزین تھا جس میں سیاست، سماجیات شعر و ادب کے علاوہ فلم پر فکر انگیز مضامین ہوتے تھے۔ پرچے کا نوے فیصد مواد شمس کنول ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہوتا تھا۔ اگرچہ تجارتی نقطۂ نظر سے یہ پرچہ منفعت بخش تو نہ تھا لیکن اس کے دو ڈھائی ہزار جو خریدار تھے ان کے پاس گگن کے تمام شمارے آج محفوظ ہیں۔ اسی سے "گگن" کی وقعت کا اندازہ جا سکتا ہے۔ گگن "کا" مذاہب عالم نمبر" ایک شمارہ تھا جس نے ہندو پاک کے سنجیدہ مطالعہ شوقین قارئین میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

شمس کنول نے اپنی زندگی میں اپنی بےکلا کی وجہ سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا بعض اوقات و خود غلط ہوتے تھے لیکن جس بات کو وہ صحیح ما لیتے تھے اس پر سختی سے کاربند رہتے تھے۔ یہی سب تھا کہ وہ جب اپنے قلم کی قوت سے ارباب اقتدا اپنا اثر و رسوخ قائم کر کے زندگی کی ضروریات ہی نہ آسائشیں حاصل کر سکتے تھے تب وہ اپنی خودداری فاقہ مستی کے نشے میں چور رہے۔ ان حالات کا ان کی تحریر پر بھی پڑا لیکن حامد الانصاری غازی دختر شہناز کنول کی ازدواجی رفاقت نے ان کی کی ان تلخیوں کو کچھ کم کر دیا تھا۔

شہناز کنول عالمہاپ کی افسانہ نگا بمبئی میں ہیں۔ انھوں نے شمس کنول کی زندگی میں نغ

[1] سے آٹھ اکتوبر تاریخ وفات ہے۔

بہتر کا رول اتنی کامیابی سے ادا کیا کہ شناسا لوگ رشک کرتے تھے۔ شمس صاحب کی زندگی کو اعتدال دینے میں شہناز کنول کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔

۱۹۹۷ء کے اواخر میں انھوں نے گگن کا احیا "افق تا افق" کے نام سے کیا۔ جسے شمارے باقاعدگی سے نکالے لیکن عمر اور صحت دونوں میں اب ان کا عفہ ضد اور دنیاوی مشقت اٹھانے کی سکت نہ تھی سو وہ

سخت علیل ہوئے۔ بجنور سے عزیزوں نے آکر صنکا اور آبائی مکان پر لے گئے جہاں پہنچ کر انھوں نے اپنی مٹی میں سکون حاصل کیا۔

شمس کنول جیسا خود دار اور صاحب طرز صحافی اردو میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ان کی شخصیت گوشت پوست کے جسم کے ساتھ منوں مٹی کے نیچے ختم ہو جائے گی۔ لیکن ان کا اسلوب نگارش، ان کی تخلیقات، ان کے رسائل کا مواد ادب اور صحافت کے سنجیدہ قارئین کے ذہنوں میں عرصہ دراز تک زندہ رہے گا۔

برائے کرم ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریں

حق گوئی اور نصب العین

عام طور پر دنیا میں دو قسم کے انسان بستے ہیں۔ ایک تو وہ جو حقیقت پسند ہیں اور حق گو ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کسی نصب العین کے پرستار ہیں یعنی مثالیت پسند ہیں۔ اور یہی دونوں مل کر کسی معاشرے کو ترقی دیتے ہیں۔ انسانیت کی عمارت میں نصب العین کی وہی حیثیت ہے جو مٹی کی مورت بنانے میں پانی کی ہوتی ہے۔ پانی کی بدولت مٹی میں نرمی اور لچک پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ پانی کی مقدار کا تناسب صحیح ہو۔ پانی کم ہوا تو مورت ٹوٹ جائے گی اور زیادہ ہوا تو کیچڑ بن جائے گی۔ حقیقت پسند اس تناسب کو برقرار رکھنے کا کام کرتے ہیں یعنی کسی بھی قوم میں مثالیت پسندی اور نصب العین دونوں متناسب مقدار میں ہوں۔ حقیقت پسند یہ دیکھتا ہے کہ نصب العین اپنی قومی خصوصیات کے تحت ہے یا نہیں جو معاشرہ اس متناسب کو برقرار نہ رکھ سکا اس کی مٹی کیچڑ بن گئی۔

شمس کنول کی یاد میں

ڈاکٹر انجمن آرا انجم

رسالہ اُفق تا اُفق کا مدیر
ادب کے فلک کا تھا مہر منیر
وہ شمس اب زمانے سے رخصت ہوا
بنا ہے عدم کا وہ اب راہ گیر

پروین صدیقی

راہِ عمل میں علم کا لیکر علم چلا
قرطاس پر دلیری سے اس کا قلم چلا
ہر گام پر دکھائیں گے جو راستے ہمیں
راہوں میں ایسے چھوڑ کے نقشِ قدم چلا

پروین صدیقی

کھو گیا علم و ادب کا تاجدار
گلشن اردو میں تھی جس سے بہار
ظاہر و باطن میں یکساں نیک خو
قول سچا سادگی اس کا شعار
کوئی دشمن تھا نہ اس کا سب تھے دوست
سب سے تھا اس کا تعلق پائیدار
دے گیا داغ جدائی وہ ہمیں
مغفرت اس کی کرے پروردگار

ادم پرکاش نامی
(ایڈیٹر تیج دیکلی)

شمس کنول - میرا ہمدم میرا دوست

[illegible] میں مالکان روزنامہ 'تیج' نے فلم آرٹ کے نام سے ایک ہفت روزہ نکالا جو ہندوستان اور پاکستان کا پہلا اردو آفسیٹ پر چھپنے والا فلمی ہفت روزہ تھا۔ چند مہینوں میں اس کی اشاعت اٹھارہ ہزار ہوگئی۔ میں اس ہفت روزے کا ایڈیٹر تھا۔

جناب شمس کنول نے فلم آرٹ میں چھپنے کے لیے ایک فلمی مضمون بھیجا جو اپنے موضوع اور اسلوب بیان کے اعتبار سے اچھوتا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت پر لاتعداد خطوط موصول ہوئے۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر اور دوسرے صف اول کے ادیبوں کو جو حق المحنت ادا کیا جاتا تھا اتنی ہی رقم کا منی آرڈر شمس صاحب کو بھجوانے کے ساتھ ساتھ میں نے انھیں لکھا کہ وہ مہینہ میں کم از کم ایک مضمون ضرور بھجوایا کریں۔ اس طرح شمس صاحب سے میرا غائبانہ تعارف ہوا۔ کئی ماہ تک وہ مضامین بھجواتے رہے۔ اور میں اہتمام کے ساتھ شائع کرتا رہا۔

چند ماہ بعد شمس کنول صاحب بجنور سے دلّی تشریف لائے۔ شام کا وقت تھا۔ میرے پاس مشہور فلم ڈائرکٹر بی۔ آر چوپڑہ بیٹھے ہوئے تھے۔ چوپڑہ صاحب تقسیم ملک سے پہلے لاہور سے ایک فلمی ماہنامہ شائع کرتے تھے۔ میرے اُن سے لاہور ہی سے تعلقات تھے اور ان تعلقات کو قائم رکھتے ہوئے ہندوستان میں بھی وہ اکثر مجھ سے ملنے آتے تھے۔ چوپڑہ صاحب اردو نہیں جانتے تھے اس لئے شمس صاحب کے نام واقف نہ تھے اور ان کی فلمی معلومات کے بارے میں بھی انھیں علم نہ تھا۔ میں نے تعارف کرایا تو چوپڑہ صاحب نے کہا "بھائی فلم جرنلزم کرنا ہے تو بمبئی کا چکر لگاؤ۔ اسٹوڈیوز میں فلمیں بنتی ہیں وہ دیکھو فلم اسٹارز سے ملو ان سے انٹرویو لو ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں کے خیالات معلوم کرو اور بمبئی آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا۔"

چند دن دہلی رہنے کے بعد شمس کنول بجنور چلے گئے۔ مگر اپنی گہری چھاپ چھوڑ گئے۔ ان دنوں وہ سگریٹ پیا کرتے تھے۔ مگر گھٹیا سگریٹ کبھی ان کے ہاتھ میں نہیں دیکھا۔ لباس کے معاملہ میں بھی بے حد نفاست پسند تھے۔ دوبارہ جب وہ دلّی آئے تو پھر ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

ایک دن شام کو میں دفتر سے اٹھ کر ان کے بتائے ہوئے ایڈریس پر گیا قاسم جان کی ایک بلڈنگ

کی دوسری منزل پر پہنچا تو طاہر صدیقی (جو آج کل سپریم کورٹ کے وکیل ہیں) اور بسنت کمار چٹرجی (جو اُن دنوں "نئی دنیا" میں کام کرتے تھے) اور شمس کنول صاحب اپنی اپنی چارپائیوں پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ بسنت کمار چٹرجی نے کہا "میں ان سے کہہ رہا ہوں کہ بجنور چھوڑ کر دلّی آجاؤ ملازمت کا کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائے گا۔ اچھا لکھتے ہو تمہارے لئے ملازمت تلاش کرنا مشکل نہیں ہوگا۔

بات کو بڑھاتے ہوئے چٹرجی نے کہا کہ "اس وقت "ریاست" سے اچھا کوئی اخبار نہیں ہے وہاں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی جگہ خالی ہے"۔

دو تین دن غور کرنے کے بعد شمس صاحب مجھ سے ملے تو کہا "چلو کسی دن "ریاست" کے دفتر چلو" میں نے چٹرجی کی تجویز پر غور کیا ہے، مجھے دلّی آجانا چاہئے، کسی دن کیا آج ہی چلتے ہیں۔ چند منٹ ٹھہرو میں یہاں سے فارغ ہو کر آپ کو سردار دیوان سنگھ مفتوں کے پاس لے چلتا ہوں۔ مجھ سے ان کے اچھے تعلقات ہیں۔ دفتر کے کام سے فارغ ہو کر میں شمس صاحب کو "ریاست" اخبار کے دفتر لے گیا۔ حضرت جوش ملیح آبادی بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے مفتوں صاحب سے شمس کنول صاحب کا تعارف کرایا۔ میری بات سن کر جوش صاحب نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں اچھا لکھتے ہیں، میں نے دو تین مضمون ان کے پڑھے ہیں۔"

میرے تعارف اور جوش صاحب کی تعریف
[illegible]

ہو گئے۔ اس زمانے میں شام کو میرا اڈہ "...ہ" کے دفتر میں ہوا کرتا تھا۔ جس کا دفتر دریبہ نکڑ پر الوری پیلس کے ساتھ والی بلڈنگ میں تھا۔ شام کو دت بھارتی "افسر آذری" عشرت اظہار راثر، زبیر رضوی، سب خوش فکرے تھے۔ کبھی کبھی نجم صدیقی (مالک و ایڈیٹر "نجم") اور مخمور عثمانی بھی آجاتے تھے۔ "نگارستان" کے ایڈیٹر گوبند سہائے اپنے زمانے کی دلچسپ سنا کر محفل کو زعفران زار بناتے رہتے۔ ساتھ شمس کنول بھی کبھی کبھار خوش فکروں کی محفل میں شامل ہوتے تھے۔ ایک دن صاحب نے بتایا کہ 1937 یا 193؟ میں و... کے ایڈیٹر بودھ راج ادبرائے کے ساتھ ... نصف درجن پردہ ڈیلو سروں اور ہدایت کاروں ان کو اپنا مہمان بنانے کے لئے دا... پر موجود نہیں۔ "نگارستان" خالص فلمی ہ... تھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ زمانہ کجن او... کے عروج کا زمانہ تھا۔ مجھے ایک دن ج... کجن کا سہ رنگا بلاک اور تین سو روپے ... کے ساتھ کہ "نگارستان" کے اگلے شمارے ... رنگا بلاک چھاپا جائے۔ دوسرے دن مخت... سے بھی سہ رنگا بلاک اور تین سو روپے آگیا کہ مختار بیگم کا بلاک پہلے صفحہ پر چھاپا جائے۔ یہ سلسلہ کئی ہفتے تک جاری رہا۔ آج کل
[illegible]

فلمی ہفت روزوں اور ماہناموں کی قدر و قیمت کم ہو گئی ہے۔ اب تو ڈسٹری بیوٹر فلم ایڈیٹروں کو فلم کا پاس دینا بھی پسند نہیں کرتے۔ شمس صاحب یہ باتیں توجہ سے سنتے رہتے۔ کچھ بولتے نہیں لیکن ان کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ فلموں پر لکھنا بند کر دیں گے۔

سردار دیوان سنگھ مفتون شمس کنول صاحب کے کام سے بہت خوش تھے۔ ایک دن میں ان سے ملنے گیا تو کہنے لگے کہ تم نے جو نوجوان کام کرنے کے لئے بھجوایا ہے وہ کافی ذہین ہے اور اس کا مطالعہ بھی گہرا ہے۔ میں ایک بار بات بتاتا ہوں تو وہ اس کے مطابق مضمون لکھ دیتا ہے پھر ایک دن سردار دیوان سنگھ کا فون آیا کہ شمس صاحب دفتر نہیں آرہے ہیں کیا بات ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے بھی نہیں ملے ہیں معلوم کر کے بتاؤں گا۔

اچانک ایک دن ان کا خط بمبئی سے آیا کہ وہ بڑی مشکل سے 'ریاست' میں حاصل کی گئی ملازمت اچانک چھوڑ کر بمبئی آ گئے ہیں۔ میں نے بی۔ آر چوپڑہ اور راماننذ ساگر کے نام تعارفی خط انھیں بھجوائے کہ اگر آپ فلموں ہی میں کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو میرے ان دیرینہ دوستوں سے ملئے شاید کچھ کام بن سکے۔ چوپڑہ صاحب "چاندنی چوک" اور "افسانہ" نام سے فلمیں بنا کر اپنے پاؤں صنعت فلم سازی میں جما چکے تھے۔ ساگر صاحب فلموں کے مکالمے اور کہانیاں لکھ کر کافی نام پیدا کر چکے تھے

حسب توقع چوپڑہ صاحب نے تو ان کی کوئی مدد نہ کی البتہ راماننذ ساگر انھیں لے کر روزنامہ انقلاب کے دفتر گئے اور انھیں فلم ایڈیٹر کی ملازمت مل گئی۔ انقلاب بمبئی میں ہفتہ میں صرف ایک صفحہ فلموں سے متعلق ہوتا تھا جس پر کچھ خبریں اور نئی فلم پر ریویو چھپتا تھا۔ شمس صاحب کے لئے یہ کام مرضی کے مطابق تو تھا مگر اس سے گزر بسر مشکل تھی۔ بہرکیف ایک سال تک وہ "انقلاب" میں رہے۔ پھر ایک ہفت روزے میں چند ماہ کام کیا۔

کچھ عرصہ بیروزگار رہنے کے بعد 'گگن' نام کا میگزین بمبئی سے نکالا۔ افق تا افق' اس کا مستقل عنوان تھا۔ 'گگن' میں انھوں نے اپنے جوہر خوب دکھائے۔ ان کے مداحوں کا حلقہ بھی وسیع ہوا مگر مالی پریشانیاں کم نہیں ہوئیں۔ جو کچھ ادھر ادھر کام کر کے کماتے تھے سب 'گگن' میں لگا دیتے تھے۔ اس عرصہ میں بنگلہ دیش آزاد ہوا تو 'گگن' نے بنگلہ دیش نمبر نکالا۔ جو سیاسی اور ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا۔ کسی کام کے سلسلے میں انھیں بجنور جانا تھا راستے میں چند دن دلی قیام کیا۔ میں نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں سیّد انیس الرحمٰن (ایڈیٹر پرچم ہند) مولانا مسلم (ایڈیٹر دعوت) گوپال متل (ایڈیٹر تحریک) سرور تونسوی (ایڈیٹر شان ہند) نقش جھوانی (ایڈیٹر پرتاپ) فکر تونسوی (ملاپ) کے علاوہ دت بھارتی، اصغر آذری

دعیز ملکی صحافی وادیب شامل ہوئے۔ مسلم صاحب نے اس تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں شمس کنول صاحب کے انداز تحریر کا مداح ہوں "گگن" میں دعوت اور جماعت اسلامی پر شدید تنقید کرتے ہیں مگر انھوں نے کبھی امیر جماعت مولانا مودودی پر یا جماعت پر ذاتی حملہ نہیں کیا۔ اصولوں کی لڑائی کو اصولوں کی حدود ہی میں رکھا ہے۔ گوپال متل نے کہا "گگن کا خاص نمبر پڑھا ہے اور اس دعوت میں شمس صاحب سے پہلی بار ملاقات ہوئی ہے۔ گگن پڑھ کر نگار کی یاد تازہ ہوگئی نیاز فتح پوری کا انداز اپنانا کوئی آسان بات نہیں۔

بنگلہ دیش نمبر کے بعد گگن نے مذاہب عالم نمبر شائع کیا جو ۱۶۵۰ صفحات پر مشتمل اور کئی کلو وزنی تھا۔ دنیا کے ہر بڑے اور چھوٹے مذہب کے بارے میں اس کے ماننے والوں کے سیر حاصل مضامین شائع کئے گئے۔ میرے خیال میں شمس صاحب نے مذاہب عالم نمبر نکال کر اخباری دنیا میں ایک مثال قائم کی۔ نہ اتنا ضخیم اور معلوماتی نمبر کسی اخبار نے نکالا اور نہ شاید آئندہ بھی نکل سکے گا۔ اس نمبر کی اشاعت پر ان کی تعریف

تو بےحد ہوئی مگر ان کی کمر یہ بوجھ نہ اٹھا سکی۔ کچھ عرصہ بعد وہ بمبئی سے مایوس ہوکر بجنور لوٹے:

بہت دیکھی ہیں دیکھی ہیں
دلی اور لاہور کی گلیاں
یہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی
مگر بجنور کی گلیاں

بجنور پہنچ کر انھوں نے مجھے کئی خط لکھے کہ میں ان سے ملنے کے لئے بجنور آؤں۔ اور آخر ایک دن میں بجنور پہنچ گیا۔ خوب باتیں ہوئیں۔ وہ ملک کے سیاسی حالات سے بہت دکھی تھے خصوصاً حکمرانوں سے جو امیدیں دوسرے لوگ کی طرح انھوں نے رکھی تھیں وہ پوری نہ ہونے سے ان کا دل پریشان تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود انھوں نے علیگڑھ سے "افق تا افق" کے نام سے میگزین نکالا جس پر کافی خسارہ اٹھانا پڑا۔ گگن کی طرح افق بھی سنجیدہ لوگوں کے پڑھنے کا میگزین ہے۔

ایسا کچھ کر کے چلو

۳۱ جنوری ۱۹۵۸ء کو بابائے اردو مولوی عبدالحق نے پاکستان میں ادیبوں کی ... اپنے خطبہ صدارت میں کہا تھا "ادب ایک شریف پیشہ ہے اس کی شرافت پر آنچ نہ آنے دینا آپ کا شعار ہونا چاہئے۔ آپ ادب کے ذریعہ قوم کے اخلاق و کردار بنانے، روشن خیالی پیدا کرنے، فرسودہ خیالات اور جہالت کی تاریکی مٹانے میں بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

محبوب الرحمٰن فاروقی
ایڈیٹر آجکل

آہ! شمس کنول

عارف نقشبندی کا غم تازہ ہی تھا کہ اطلاع ملی کہ ہمیں داغِ مفارقت دینے والوں میں شمس کنول بھی شامل ہو گئے۔ وہ شخص جو زندگی سے ہمیشہ جد و جہد کرتا رہا، جس کے اندر طوفانوں سے ٹکرانے کی ہمت ہمیشہ موجزن رہی، جو کبھی نامساعد حالات میں گھبرایا نہیں، جو زندگی کی اعلیٰ اقدار کا جویا رہا۔ جو اپنے خیالات و روایات کے اظہار میں ہمیشہ بے باک اور جری رہا، جس نے کبھی کسی سے کسی معاملہ پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ جو سچائی کا پرستار تھا اور جس کے اندر افق تا افق اس سچائی کا بے باکانہ ڈھنڈورا پیٹنے کی ہمت تھی، جس نے سچائی کے برمحل اظہار میں کبھی جھجک محسوس نہیں کی، وہ شخص ۱۰ اکتوبر ۹۵ء کو اچانک دنیا سے منہ موڑ کر منوں مٹی تلے خاموشی [illegible] ابدی نیند سو گیا۔ یقین کرنے کو تو جی نہیں چاہتا۔ مگر کیا کیا جائے ہر ذی روح کو موت آنی ہے اور موت ہی برحق ہے۔ تو کیا سمجھا جائے کہ اس زندگی کا مآل صرف موت ہی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ شمس کنول ابھی زندہ ہے۔ جسمانی طور پر وہ ہم سے پوشیدہ ضرور ہو گیا ہے لیکن اپنے کردار، افعال، عمل اور نظریات کی صورت میں وہ گگن، افق تا افق، اور مضامین کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جب بھی [illegible] دنیا میں حسرت موہانی جیسے سر پھرے انسانوں کا تذکرہ کیا جائے گا جن کے قدم آزمائشوں میں ڈگمگائے نہیں جنھوں نے کبھی کسی بھی حالت میں کسی بھی طور پر سمجھوتہ کرنا یا ہمت ہارنا نہیں سیکھا ایسے سر پھرے انسانوں میں شمس کنول کا نام بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اپنے ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ "میں بھی حسرت موہانی جیسا سرپھرا انسان ہوں طویل عرصے تک بمبئی میں رہنے کے باوجود دو نمبر سے دولت کمانے کے لئے اپنے وجود کو آمادہ نہیں کر سکا۔"

وہ بجنور میں پیدا ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور اپنی زندگی کا آغاز بمبئی سے کیا۔ انھوں نے ہفت روزہ "انقلاب" میں کام کیا اس کے بعد "فنکار" نام سے فلمی میگزین نکالی۔ لیکن وہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکی۔ بعد میں انھوں نے "گگن" کے نام سے ادبی میگزین شروع کی کے عالمی مذاہب نمبر اور ہندوستانی مسلمان دونوں خصوصی شمارے کافی مقبول ہوئے۔ ۳۵ سال تک بمبئی میں مقیم رہنے کے بعد وہ اپنی اہلیہ شہناز کے ساتھ بجنور آ گئے اس کے بعد وہ علی گڑھ چلے گئے اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔ علی گڑھ سے پچھلے سال ہی انھوں نے افق تا افق کا اجرا کیا جس کے پانچ شمارے منظر عام پر آ چکے ہیں افق تا افق۔

ہجر کے سلسلے میں انھیں بہت دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ہمارے دفتر بھی تشریف لائے۔ وہ بہت پریشان تھے۔ میں ان کی معصومیت پر انھیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ یہ کہتے ہوئے اُٹھے کہ وہ زندگی میں کوئی غلط کام نہیں کریں گے چاہے انھیں رسالہ کے نام ملنے کے لئے دس سال انتظار کرنا پڑے۔ میں حیرت سے ان کی معصومیت بھرے چہرے کو دیکھتا رہا کہ اس شخص کو دنیا میں زندگی گذارنا کس قدر مشکل ہوگا جو دنیا کے دستور سے بھی ناواقف ہو۔

وہ اردو زبان اور اردو کلچر کے رسیا تھے ہندوستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب پر ان کا ایمان تھا۔ جو آخر دم تک اسی طرح بنا رہا گرچہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے حادثے کے بعد وہ حکومت سے دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ وہ نوجوان نسل کی اردو سے بڑھتی ہوئی بے گانگی سے بھی بہت افسردہ خاطر رہا کرتے تھے۔ اس کے دامن کو وہ وسیع سے وسیع تر دیکھنا چاہتے تھے اور اسے مالا مال کرنے کی حتی المقدور کوشش بھی کرتے تھے۔ انھوں نے اردو زبان کو سہل بنانے کے لئے اس کے املا پر خصوصی توجہ دی اور اکثر و بیشتر الفاظ کے مروجہ املا سے ہٹ کر آسان املا لکھتے رہے۔ اردو املا کو آسان بنانے کے بارے میں لوگوں نے باتیں بہت کی ہیں عملاً بہت کم کرکے دکھایا ہے۔ لیکن اب وہ وقت آگیا ہے کہ زبان کو زندہ رکھنے کے لئے مشکل الفاظ کا سہلا

املا تلاش کیا جائے اگر ایسا ہو سکے تو اردو دنیا کی طرف سے شمس کنول کو بہترین خراج عقیدت ہوگا۔ ان کے مضامین کی نوعیت بھی سب سے منفرد ہوتی تھی۔ آج کل کے جذبی نمبر کے لئے جذبی صاحب سے لیا گیا ان کا انٹرویو تھا مضمون جس طرح مقبول عام ہوا اسی طرح مشہور فلمی اداکارہ دیویکا رانی پر ان کا مضمون بھی کافی مشہور ہوا۔ ایسے قلم کار دھنی شخص کا اٹھ جانا یقیناً ایک ناقابل تلافی نقصان ہے جس کا جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

ادارہ دعا کرتا ہے کہ خدا انھیں غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

ایک خط شمس کنول کے نام

خورشید جہاں
انگلش لیکچرر گورنمنٹ انٹر کالج بجنور

یہ خط ایک ایسی خاتون کا ہے جو شمس کنول کے قلم اور ان کی صحافتی دیانت داری سے بے حد متاثر تھیں مگر اردو کی کسمپرسی اور نامساعد حالات سے دلگیر بھی تھیں۔ انھوں نے اگست ۹۰ء میں یہ خط شمس کنول کو لکھا تھا جس وقت وہ ایسے بخار سے لڑ رہے تھے جس نے دو ماہ بعد ان کو اپنے چاہنے والوں سے جدا کر دیا۔ (مدیران)

شمس بھائی! آپ کا خط ملا۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ امید ہے کہ اب کی صحت نسبتاً بہتر ہوگی کیونکہ اب دم توڑ چکی ہے ویسے علی گڑھ ہمارے بہتر کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہی گرم ہے اور آپ کی بمبئی کے موسم کے عادی ہو گئے ہیں۔

خط سے بیشتر "افق تا افق" بھی موصول ہو گیا تھا۔ اس کے موصول ہونے سے بھی پہلے میں نے پروین بہن کو ایک بیرنگ خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ وہ ان کو مل گیا ہوگا۔

"افق تا افق" کے اجرا کی تاخیر پہلے ہی جس کی نشاندہی کر رہی تھی وہ اب اس کے صفحات پر نظر آ گئی اور آپ یہ چھاپنے کے لیے مجبور ہو گئے کہ یہ جاں بلب ہے۔ اس نازندگی کے لیے دعا و دوا دونوں ہی درکار ہیں تو بھائی صاحب ہم "اپنے" اللہ سے اس کی زندگی کے لیے دلی دعا کر رہے ہیں۔ "اپنے" اس لیے کہ آپ تو اس سے قطع تعلق کا اعلان گگن کے مذاہب عالم نمبر میں کر چکے ہیں۔ شہناز بہن کی دعاؤں اور کوششوں سے اگر یہ پھر سے استوار ہو گئے ہوں تو یہ کم از کم ہمارے (میرے اور میری بہن قمر) کے لیے بے پایاں خوشی کا باعث ہوگا۔

آپ نے لکھا ہے کہ شمالی ہند والوں کا تعلق اردو سے ختم ہو چکا ہے۔ بجا ہے لیکن جہاں مخلوق اپنے خالق سے رشتہ توڑ رہی ہو وہاں ایک زبان کا کیا ہے۔ حفیظ صاحب پہلے ہی کہہ گئے ہیں "حفیظ اپنی بولی محبت کی بولی۔ نہ اردو نہ ہندی نہ ہندوستانی" اردو جس تہذیب اور جس کلچر کی ترجمان تھی اور ہے جب وہی ختم ہو رہا ہے یا ایک منظم سازش کے تحت ختم کیا جا رہا ہے تو پھر اس کا کیا ہے۔ خیر اگر بات سے بات یونہی نکلتی رہی

تو اسے پڑھ کر آپ کی تو تضیع اوقات ہوگی۔

۱۰۰ روپے آپ بالکل واپس نہ کریں۔ یہ میرا اپنی
مادری زبان کو ایک حقیر سا نذرانہ سمجھیں اور اگر "افق تا افق"
کو فضل ربی سے حیات نو مل جائے تو مجھے بھی یاد رکھیں۔
اس سلسلے میں مجھ سے اور بھی جو کچھ ہو سکے گا کروں گی
انشاء اللہ۔ اب رہی گگن کے مذاہب عالم نمبر کی بات تو
جب کوئی علی گڑھ جائے گا میں اس کی قیمت آپ کو
بھجوا دوں گی اور تب آپ کسی آنے والے کے ذریعہ
ایک کاپی مجھے بھجوا دیں۔ کیونکہ میری بہن قمر کو اپنی
شاگرد رومانہ کے ذریعہ ان کے والد (وقار صاحب) کی
کاپی ہاتھ آگئی تھی۔ یہ گزشتہ تین چار سال پہلے کی بات
ہے۔ وہ کتابوں کے معاملہ میں "بڑی بدنیت" ہے۔ اگر
اسے کوئی کتاب پسند آجائے تو وہ اسے اس وقت تک
نہیں واپس کرتی جب تک اسے پورا نہ پڑھ لے یا پھر
اپنی کاپی نہ خرید لے۔ اسی لیے وہ آج تک واپس نہ
جا سکی وہ بے چارے مانگ مانگ کر تھک گئے اور
اب تو مایوس ہو کر انہوں نے مانگنا ہی چھوڑ دیا ہے۔
اب جب آپ مجھے وہ کاپی بھیجیں گے تو قمر معذرت کے
ساتھ وہی انہیں بھجوا دیں گی۔

میں کئی دنوں سے علیل تھی۔ اس لیے جواب
میں تاخیر ہو گئی شرمندہ ہوں۔ چلتے چلتے ایک گذارش
اور کر دوں کہ "افق تا افق" کو اگر آپ ماہنامہ کے
بجائے اسی قیمت پر دوماہی یا سہ ماہی کر دیں تو اسے
بند کرنے سے بہتر رہے گا۔ اس صورت میں اس کی
اشاعت میں تاخیر سے جو آپ کو ذہنی کوفت ہوتی ہوگی
اس میں بھی کمی آجائے گی۔ مضامین کے انتخاب کا
وقت مل جائے گا۔ مضامین میں ذرا تنوع پیدا ہوگا۔
نئے لکھنے والے تو حشرات الارض کی طرح ہیں مگر اس
گودڑ میں دانۂ گندم تلاش کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ یوں
چھپنے کو تو نقال چور، اچکے اپنے اپنے وسائل کو بروئے
کار لا کر چھپ بھی رہے ہیں اور لولڑے بھی جا رہے ہیں۔
آپ کی شہناز کی اور پروین بہن کی کوششیں رائیگاں
نہیں جا سکتیں۔ بہرحال یہ تو میں دور بیٹھ کر اندازہ لگا
رہی ہوں حالات واقعی سے تو آپ دونوں ہی واقف
ہوں گے۔ لکھنے کو بہت ہے مگر خوف طوالت مانع ہے۔

سوال ایک زبان اردو کا ہی نہیں ہمیں
تو کوئی زبان بھی نہیں آتی تعلیم سے ہمیں
الرجی ہے کہ نوکری نہیں ملتی تو پڑھنے سے
فائدہ معیار زندگی پیسوں سے بلند ہوتا
ہے چاہے وہ جیسے بھی حاصل کیا جائے

[illegible] محنت رائیگاں تو نہیں
جائیگی۔ دراصل آپ کی بلند پایہ تحریر ہمارے عوام
(جو خوبصورت "آنچلوں" کی چھاؤں میں زندگی
گزار رہے ہیں) کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ بے باک قلم جو
ہمارے دانشوروں کو آئینہ دکھا رہا ہے اسے برداشت
کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ حقیقت کا سامنا کرنا بڑا دشوار
ہے "خودداری" خوددار کے راستہ کی سب سے بڑی
رکاوٹ ہے۔ میں نے ایک بار کہیں پڑھا تھا کہ خواجہ
حسن نظامی صاحب مرحوم نے گھٹنے کے درد کے لیے
ایک تیل بنایا تھا جس کی تعریف کا حق علامہ اقبال

مرحوم ادا نہ کر سکے تھے تو اس کی پاداش میں وہ شاعر مشرق کے خطاب سے محروم ہوتے ہوتے رہ گئے کیونکہ انہیں اپنی غلطی کا بروقت احساس گیا تھا جس کی تلافی کر دی گئی لیکن مایوسی بہرحال کفر ہے۔ میری بہن قمر کا یقین ہے کہ اردو بھی "اور یا نگلی بیتا رہا" کے ہیرو کی طرح ایک دن یہی کہہ کر اٹھ کھڑی ہوگی "بھاڑ میں جائیں میں تو زندہ رہوں گا" ملائم سنگھ کی ذراسی نظر کرم سے یوں لگا تھا جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔

سوال ایک زبان اردو کا ہی نہیں ہمیں تو کوئی زبان بھی نہیں آتی نہ اردو نہ ہندی نہ انگلش نہ عربی۔ تعلیم سے ہمیں الرجی ہے کہ نوکری نہیں ملتی تو پڑھنے سے فائدہ۔ معیار زندگی پیسوں سے بلند ہوتا ہے چاہے وہ جیسے بھی حاصل کیا جائے۔ ایسے معاشرہ میں خود دو لوگوں کا جینا بڑا جوکھم کا کام ہے۔ مگر یہ کام کرنا تو بہرحال ہے ہی۔

ہمارے ہمراب [illegible] مشورہ دیا ہے اس پر غور ضرور فرمائیں اور رسالے تو اس قیمت پر سہ ماہی بنا دیں مگر بند نہ کریں ویسے دعاؤں کے علاوہ ہمارے پاس اور ہے کیا۔ امی صاحبہ کو میرا سلام پہنچا دیں۔ پروین بہن کے [illegible] ہوں۔ ان کی معرفت میں نے ایک گذارش [illegible] سے کرائی تھی۔ شمیم صاحب (مرحوم) کے کلام کو چھپوانے کی۔ اگر حالات اور صحت اجازت دیں تو۔۔ اس کے [illegible] کا ہی انتظار ہے کیونکہ ان کی اہلیہ [illegible] کو بڑی خواہش ہے اور جلدی بھی۔

کہا جاتا ہے کہ مالک رام کی صاحب زادی بشریٰ جب اسکول میں پڑھتی تھی تو شاہ سعود ہندوستان آئے۔ دلی کے اس اسکول میں شاہ کو ایک مہمان کی حیثیت سے آنا تھا۔ اسکول کی طرف سے غالباً قصداً شاہی مہمان کو خوش آمدید کہنے اور ہار پہنانے کے لیے بشریٰ کو مقرر کیا۔ بشریٰ نے جب بہت ہی اچھی اور بامحاورہ عربی میں اور عرب کے لب و لہجے میں شاہ کو خوش آمدید کہا تو شاہ سعود حیران رہ گئے اور اس حقیقت پر تو انھیں مزید تعجب ہوا کہ بچی مسلمان نہیں ہندو ہے!

-×-×-×-

شمس کنول

سر سید احمد خاںؒ کی خدمات

"سر سید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کر دینے پر صرف کر دینی چاہیں یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔"

پنڈت نہرو

میری کہانی حصہ دوم صفحہ ۳۱۵

"انسان کو لازم ہے کہ وہ تمام جہاں کے انسانوں کی بھلائی چاہے اگر ہم ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھیں تو جان لیں گے کہ ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک باپ کی اولاد ہیں مگر آفتاب کی تیزی نے کسی جگہ ہم میں سے کسی کا رنگ اور کسی ملک میں دھوپ کی کمی سے کسی کا رنگ گورا کر دیا ہے۔ مگر ہم سب ایک درخت کی شاخیں ہیں۔ پس ہم کو بلا تعصب تمام انسانوں کی بھلائی چاہنی چاہیئے۔!"

سر سید احمد خاں

"وہ لوگ جو پیر بن کر شہر بہ شہر اپنے مریدوں سے ٹیکس وصول کرتے پھرتے ہیں یا پھر منبر پر بیٹھ کر جھوٹے سچے قصے سنا کر اور واعظ بن کر لوگوں سے روپے جمع کرتے ہیں اور بہت سے وہ لوگ جو اپنے تئیں کسی پیر یا فقیر کے خاندان کا بیان کر کے یا کسی درگاہ کا خادم کہہ کر مکہ معظمہ کا طواف اور مدینہ منورہ کا زیارت کرنے والا بتا کر روپیہ مانگتے ہیں یہ جو مسلمان ایسے لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں وہ در اصل اپنی قوم کے یعنی مسلمانوں کے دشمن ہیں اور نامہذب خیرات نہایت بری چیز ہے۔ اس سے قوم میں مفلسی ناشائستگی بے حیائی اور بے غیرتی پھیلتی ہے۔"

سر سید احمد خاں

"اب ہندوستان ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں، مقدس گنگا اور جمنا"

پیتے ہیں۔ ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم کھاتے
،مرتے جیتے میں ہم دونوں کا ساتھ ہے ہندوستان میں
ہتے ہیں دونوں کا خون بدل گیا ہے۔ دونوں کی رنگتیں
سی ہو چکی ہیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے
مشابہ ہو گئی ہیں، مسلمانوں نے ہندوؤں کی [illegible] مسلمانوں
میں اختیار کرلی ہیں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی سیکڑوں
دتیں لے لی ہیں۔ یہاں تک کہ ہم دونوں آپس میں ملے
ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کرلی جو نہ ہماری
ان تھی اور نہ ان کی۔ پس اگر ہم اس حصے کو قطع نظر کریں تو
حقیقت ہندوستان میں ہم دونوں کے اعتبار اہل
ن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے اتفاق اور
ہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں
ترقی اور بہبودی ممکن ہے۔ اور آپس کے اتفاق کو بھی
ابت ایک دوسرے کی بدخواہی سے ہم دونوں کو ہونے والے
افسوس ہے ان لوگوں پر جو اس کو نہیں "سمجھتے" اور
پس میں ان دونوں قوموں میں تفرقہ ڈالنے کے خیالات پیدا
تے ہیں اور یہ نہیں [illegible] سکتے کہ اس مضرت و نقصان
خود بھی شامل ہیں اور آپ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتے
یں!"

دھرم پر زوال آتا ہے اور حق پر باطل یا نیکی پر
ی غالب آنے میں سچائی کا روپ دھارن کرلیتا
وں، نیکی کی حفاظت، اچھائی کو رد کرنے اور بھلائی کو دوبارہ
پھیلانے کے لیے میں ہر وقت ضرورت پیدا [illegible] کرشن
بھگوان، بھگوت گیتا باب ۴ سطر سات اور آٹھ۔
کرشن جی کی کہی ہوئی اس بات پر مذہب کی رو سے

نہیں بلکہ سائنسی غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نیچر کا یہ اصول ہے
کہ گرمی جب شدید صورت اختیار کرلیتی ہے تو ٹھنڈک میں بدل
جاتی ہے، درختوں کے پتے جب ساکت دکھائی دیتے
ہیں ہے اور سمندر جب قطعی طور پر خاموش ہوجاتا ہے
تو طوفان آتا ہے اس کے بعد تبدیلی یا انقلاب لازمی ہے
اور جو چیز جتنی دبتی ہے اتنی ہی قوت ابھرتی ہے۔ آج کا
ہندوستانی مسلمان بھی بحرانی دور سے گزر رہا ہے اور
یہ دباؤ اس [illegible] ناقابل برداشت ہوچکا ہے۔ چناں چہ
نیچر اس اصول کے کو بھی ابھرنے کی قوت دے گی اور
وہ قوت ایک قائد کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ قدرت کرے
کہ آنے والا قائد اپنے وقت کا سرسید احمد خاں ہو۔

سن اٹھارہ سو ستاون کے انقلاب کے مابعد
اثرات ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں زیادہ مضر
ثابت ہوئے، انگریز آقاؤں کی نظر میں وہ مجرم اور باغی
تھے چوں کہ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت کے ہاتھ
سے چھینی تھی اس لیے انگریز فاتح تھے اور مسلمان مفتوح۔
انگریزوں نے ہندوؤں کو اپنا دوست سمجھا۔ ہندوؤں
نے بھی انگریز کو اپنا دوست بنالیا اور بدلتے ہوئے حالات
کا ساتھ دیتے ہوئے انھوں نے ترقی کی راہ اپنائی۔ مسلمانوں
نے ہندوؤں کی بہ نسبت بہت زیادہ کھویا تھا اور جو باقی تھا
وہ عیش پرستی کی نذر کررہے تھے۔ مسلمانوں کو انگریزوں
سے نفرت ہوچکی تھی۔ وہ انگریز سے کٹ کر تباہ ہونے کے
لیے تیار تھے لیکن انگریزی تہذیب اور انگریزی تعلیم حاصل
کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ نتیجے میں مسلمان سرکاری ملازمت
پانے، سماج میں جائز مقام حاصل کرنے اور انگریزی عدالت

سے صحیح انصاف کے سلسلے میں محرومی کا سامنا کر رہے تھے اپنے ہی ہندو بھائیوں کے سامنے جب مسلمان رسوائی، بے غیرتی اور حق تلفی کا شکار ہوئے تو ان میں؟ بے حسی، آرام طلبی کم ہمتی، خود غرضی، کم تری، بدحالی، پریشانی، بے غیرتی یاسیت دل شکنی، اوہام پرستی اور باہمی تعصب کے عناصر پیدا ہو گئے۔ گو مسلمانوں کا زوال ہو چکا تھا لیکن ان کو اپنے زوال کا احساس نہیں تھا۔ انھیں اپنے ماضی پر فخر تھا مگر وہ اپنے حال و مستقبل سے بے خبر تھے۔ اس ہی انتشار اور ان ہی حالات نے سرسید احمد خاں کو جنم دیا اور وہ مسلمانوں کے لیے فرشتۂ رحمت بن کر نمودار ہوئے۔

اس وقت مسلمانوں کے سنبھلنے کی تین صورتیں تھیں، پہلی یہ کہ بغاوت کریں، دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو اپنے حال پر چھوڑ دیں مگر اس کا نتیجہ اور بھی برا تھا۔ تیسری صورت یہ تھی کہ وہ اپنے اچھے یا برے ماضی کو بھلا کر اور اپنی شکست کے غم کو مٹا کر زمانے سے صلح کر لیں سرسید نے مسلمانوں کو ان کی پستی اور بدحالی کا احساس دلا کر مشورہ دیا کہ وہ حکومت وقت سے صلح کر لیں اور زمانے کا شکوہ کرنے کے بجائے حکومت کو اپنا دوست بنا کر اس سے اپنا حق حاصل کریں۔ مصلحت زمانا سرسید کا یہ نیک ترین اور بہترین مشورہ تھا۔ مسٹر محمد علی جناح کی یک طرفا پالیسی، مولانا ابو الکلام آزاد کے غلط سیاسی اندازے اور ہندوستان کے فرقہ پرست عناصر [illegible] تھا کے نتیجے میں آج کا مسلمان ابھی وہیں کھڑا ہے جہاں سن اٹھارہ سو ستاون کا مسلمان کھڑا تھا۔ آج کا مسلمان اقتصادی طور پر بدحال ہے، وہ جدید تعلیم سے محروم ہے، اکثریتی فرقہ اس کو غیر وفادار سمجھتا ہے مسلمان کی مذہبی، تہذیبی تمدنی اور سماجی قدریں دم توڑ رہی ہیں۔ اس کے برادران وطن طاقت اور نئی آزادی کے زعم میں اس سے ناکردہ گناہ کا انتقام لے رہے ہیں اور آج کا مسلمان اٹھارہ سو ستاون کے مسلمان کی طرح زیادہ درماندہ ہے اگر اس کا سہارا ہے تو سیکولر دستور کا جو غیر جانبدار ضرور ہے معصوم اور بے زبان بھی ہے!

دراصل سرسید کی ضرورت اس لیے ہے کہ آج کی مسلم سیاست چند ایسے با اقتدار اور بااختیار مگر نام نہاد مسلم راہ نماؤں کے ہات میں ہے جو محض ذاتی مفاد کے لئے ہندوستان کے بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو اور زیادہ گمراہ کر رہے ہیں۔ یہ خود ساختہ راہ نما کٹھ پتلی ہیں اور ان کے دھاگے کسی اور کے ہات میں ہیں۔ یہ ملت کے ترجمان نہیں بلکہ یہ اداکار ہیں۔ یہ مسلمان کی لاش پر اس وقت تک نہیں روتے جب تک ان کا ہدایت کار آنسو بہانے کے لیے ان کو گلیسرین مہیا نہیں کرتا۔ افراد کی ذاتی رائے قوم کی آواز بنتی ہے، مگر آج کے مسلم راہ نماؤں نے اپنی ذاتی آواز پر قوم کو چلانے کا کام اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

مسلمانوں نے جہاں اور بہت سی ہندوستانی بدعتیں اپنائی ہیں وہاں ہیرو شپ یا شخصیت پرستی کو بھی اپنا لیا ہے۔ حالانکہ اسلام شخصیت پرستی سے انکار کرتا ہے۔ دنیا کی دوسری زندہ اور باہوش قومیں بھی اپنے ہیرو کو پوجنے کی قائل نہیں۔ انگریز قوم کے لیے مسٹر چرچل نے بہت کچھ کیا دوسری جنگ عظیم کے دو

میں وہ آئے دن دشمن کی توپوں کے اوپر سے [illegible]
بہ نفس نفیس صورت حال کا جائزہ لینے کے عادی تھے
ان کی بوڑھی قوم کی خاطر ان کو ایسا کرنے سے نہیں
روکتی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اگر آج دنیا کے نقشے میں برطانیہ
جیسا ملک موجود ہے تو وہ صرف مسٹر چرچل کی
ہے۔ مگر جنگ کے بادل چھٹتے ہی انگریز قوم نے چرچل
کی ضرورت محسوس نہیں کی اس نے چرچل کو محض ہنگامی
حالات ہی کے لیے ایک موزوں وزیر اعظم سمجھا انگریز
قوم کی یہ احسان فراموشی نہیں تھی بلکہ یہ بیدار مغزی او
وقت شناسی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ ان مسلم
رہنماؤں کو جو اپنے روشن ماضی کا کرتے ہیں اور
حصول آزادی کے سلسلے میں اپنے آپ کو مسلمانوں کا
محسن ہیں اور اپنی رائے مسلمانوں پر ٹھونسے ہوئے ہیں،
بھلا دیں۔ یہ ستون شکستہ اور خستہ ہیں۔ یہ خود دوسروں کے
سہارے کھڑے ہوئے ہیں یہ مسلمانوں کے لئے سہارا نہیں
بن سکتے۔ نیا میک اپ کرنے سے پہلے آج کے چہرہ
کو بدل دینا ضروری [illegible] ہے۔

آج کے مسلمانوں کے لئے یہ جاننا ضروری
ہے کہ سر سید احمد خاںؒ ان کے بزرگوں کی فلاح کے
لیے کیا کیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی لوٹ کھسوٹ کے
نتیجے میں سن اٹھارہ سو ستاون کا انقلاب رونما ہوا
تھا۔ چونکہ وہ ناکام رہا اس لیے انگریزی حکومت
نے اسے بغاوت کا نام دیا۔ بہرصورت تبدیلی کے
سب سے زیادہ مسلمانوں ہی کی صورت مسخ کی تھی سر
سید نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا

[illegible] سے ہو کر گزرے تھے قوم کا ہی غم
تھا جس نے ان کو قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔ ابتدا
میں ایک عام کی طرح انھوں نے بھی فرار اختیار کرنا
چاہی اور اپنی فرار کو ہجرت کا نام دینا چاہا مگر کوئی غیبی قوت
تھی کہ جس نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان کو اپنا
وطن سمجھیں اور حالات کا جواں مردی اور نیک نیتی سے
مقابلہ کریں [illegible] کافی غور و خوض کے بعد مسلمانوں کی
جہالت کو ساری برائیوں کی جڑ سمجھا انھوں نے مسلمانوں
کو جدید علوم سے آراستہ کرنے پر توجہ دی۔ کیونکہ تحریک
کے کامیاب ہونے کے بعد ہر تحریک کے کامیاب ہونے
کا امکان ہے۔ وہ تحریک سیاسی ہو یا معاشرتی، اقتصادی
ہو یا مذہبی آج کا ہندوستان صرف تین فی صدی تعلیم
یافتہ ہے اور تعلیم کے سلسلے میں [illegible] حالت اور زیادہ درد
ناک ہے چنانچہ آج بھی سر سید جیسی ہستی کی ضرورت ہے
جو مسلمانوں کو آج کی رائج زبان سیکھنے کی
ترغیب دے تاکہ کاروبار اور ملازمت میں مسلمان اپنے
ہم وطنوں سے پیچھے نہ رہیں، مادری زبان اردو سے بھی
غافل نہ ہونے دے تاکہ اپنی تہذیبی، مذہبی اور معاشرتی
قدریں برقرار رکھ سکیں اور ٹیکنیکل تعلیم حاصل کرنے
[illegible] مسلمانوں نے اپنی اقتصادی
حالت سدھار رہے!

[illegible] سر سید نے دوسرے فرقوں اور قوموں
[illegible] زبانی حملے کا جواب دیا جو مسلمانوں
پر کیا جا رہا تھا۔
انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب "دی لائف

آف محمد" جس میں ان کے پیغام پر چند اعتراضات کئے گئے
تھے) کا مدلل جواب دینے کی کامیاب کوشش کی۔ عیسائی مبلغوں
کے پروپیگنڈے کے جواب میں مقدس انجیل کا ترجمہ پیش
کر کے ان کو خاموش کر دیا۔ انگریز حکومت چونکہ اٹھارہ سو
ستاون کے غدر کا ذمہ دار صرف مسلمانوں ہی کو سمجھتی تھی اور
اس کے نتیجے میں ان نے اپنے انتقام کا نشانہ مسلمانوں
کو محروم کر رکھا تھا اس لئے سرسید نے "اسباب بغاوت ہند
کے نام سے ایک کتاب لکھ کر مسلمانوں کی زبردست وکالت
کی۔ جب ڈاکٹر ہنٹر نے ایک کتاب میں اسلام کی توہین کی تھی،
سرسید نے اس کا مدلل جواب دے کر سارے تاریخی دعوے
جھوٹے ثابت کر دیئے۔ جب بھی ہندوستان کے کسی فرقہ
پرست نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کی اور ملک کی
فضا خراب کرنا چاہی، ہمیشہ آپس کی غلط فہمیوں کو دور کر کے
اپنے ہم وطنوں کو امن وامان کا پیغام دیا جا سکتا ہے لیکن
"تہذیب الاخلاق" کو تو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جو
عرصے تک مسلمانوں کے نقطہ نظر کو پیش کرتا رہا اور مسلمان
کے کردار میں وسعت پیدا کرتا رہا۔

آج کے حالات بھی بدلے ہوئے نہیں ہیں۔ آج
بھی اکثر غیر ملکی کتابیں اور ملک کے فرقہ پرست اخبارات اکثر مسلمانوں
پر بہتان رکھتے ہیں اور [illegible] لگاتے ہیں جن کا جواب ان کی
مسلسل لغویات کا معقول جواب دینے کے لیے ایک سرسید
کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی ایک سرسید کی ضرورت ہے جو فخر سے
سینہ تان کر برملا کہہ سکے کہ دوسرے فرقوں کی بہ نسبت مسلم فرقہ زیادہ
ہندوستان کے سیکولر آئین کا وفادار ہے۔ اکثریتی فرقہ پرستوں کو
[illegible] سے مسعود دار غیر ممالک کے جاسوس ثابت کر بہانے بتاتی

کو کہ برات جاری ہے، مسلمانوں نے نہیں، اور مسلم ماں
بریگیڈیئر عثمان جیسے سپاہی پیدا کر رہی ہے جو کشمیر کی حفاظت
میں شہید ہو سکتے ہیں اور کسی مسلم ماں نے سن سینتالیس
سے لے کر آج تک ایک بھی گوڈسے پیدا نہیں کیا!

مفلسی ایمان کو کمزور کرتی ہے، کردار کو مسخ اور افعال
کو بدنما بناتی ہے۔ چنانچہ اٹھارہ سو ستاون کے بعد مسلمان
اقتصادی بدحالی میں مبتلا ہوا تو وہ روز بروز تنگ نظر،
متعصب، بدعملی، اوہام پرست اور بہت سے کم رو
عقیدوں کے سہارے زندگی گزارنے کا عادی انسان بنتا
گیا۔ یہ دیکھ کر سرسید نے اسلام کو ایک اعلا اور فطری
مذہب قرار دیا اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ مذہب ایک فلسفہ
زندگی ہے اور جو شعائر عقل، فلسفہ اور سائنس پر پورے
نہیں اترتے ان کو ترک کر دو۔ سرسید نے ان تمام بنیادی
اداروں اور مدرسوں کی بھی مذمت کی جو خانقاہی روٹیوں اور
نیاز نذر کی مٹھائیوں کے بل بوتے پر چل رہے تھے اور
جہاں سے علم حاصل کرنے کے بعد ایک مسلم نوجوان اپنی
زندگی میں صرف مسجد کا موذن یا کسی مکتب کا ملا ہی بن سکتا
تھا۔ سرسید نے مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی بھی کوشش کی کہ
جدید فلسفے اور سائنس کی واقفیت سے اسلام کی حقانیت
پر کوئی حرف نہیں آتا؛ اور مغربی تعلیم اور خصوصی طور پر
علم سائنس سے نوجوان کے عقائد متزلزل نہیں ہوتے
یہی سبب تھا کہ سرسید کو اپنے نظریے کے تحت قرآن
کی تفسیر کرنا پڑی اور اسی سلسلے میں بے شمار مذہبی مصائب
[illegible] کہ انھوں نے مسلمانوں کو بسم اللہ کے گنبد سے باہر
نکالنے کی کوشش کی۔ قدرت کہیے کہ سرسید کے

میں کوئی ایسا قائد آئے جو شیعہ سنی جھگڑے، دیوبندی بریلوی
اختلافات، مزار پرستی، پیر نوازی، اوہام پرستی اور دوسری
بدعتیں دور کر دے، اور مسلمانوں کو یہ سمجھا دے کہ ان
حماقتوں کا تعلق تمہارے سیدھے سادے مذہب سے
بالکل نہیں ہے اور تمہارا ضعیف اعتقاد ہونا تم کو گمراہ
تو کر سکتا ہے منزل مقصود پر نہیں لے جا سکتا اور جوڈ کی
زبان میں یہ کہہ دے کہ: "وہ تمام فیصلے جو ہم نے مذہب،
اخلاق اور خدا کی ہستی کے بارے میں کئے تھے۔ ان پر اب
از سر نو غور کرنا چاہیئے!"

غرض کہ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا
جس پر سر سید نے اپنی تنقیدی اور اصلاحی نظر نہ ڈالی ہو،
کھرے کھوٹے کو نہ پرکھا ہو اور پھر بلا خوف اخلاقی جرأت
اور دلیری کے ساتھ بیان نہ کر دیا ہو۔ انھوں نے مسلمانوں
کو ان کے لباس پر توجہ دلائی، ان کے رسم و رواج کی اصلاح
کی، طرز گفتگو کے نفسیاتی انداز بتائے، نشست و برخاست
کے آداب سکھائے اور حد تو یہ ہے کہ دستر خوان کے آداب
بھی مقرر کئے۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے لئے ان کو
بہت کچھ کرنا پڑا۔ ہر تحریک اور تنظیم کو کامیاب بنانے
کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چناں چہ سر سید
نے روپے کی فراہمی کے لئے کتابوں کی دکان کھولی،
لاٹری نکالی، ڈرامے اسٹیج کرائے، چرامی اور امام ضامن
کے روپے لئے، اور لیلو نامی طوائف سے بھی چندہ وصول
کیا۔ اسی ہی سلسلے میں سر سید کی یہ لگن اور قربانی تو قابل
داد ہے کہ جب وہ سر ولیم کی کتاب کا جواب لکھنے کے لئے
لندن روانہ ہوئے تو سفر خرچ اور کتاب کی اشاعت کے
لئے اپنا گھر مع سامان اور ذاتی لائبریری فروخت کر دی۔
اور اپنا مکان بھی رہن رکھ دیا۔

چناں چہ آج کے مسلمانوں کو ایسے راہ نما کی ضرورت
نہیں جو قائد بن کر اپنے جھونپڑے سے محل میں آ جائے
اور دکان دار سے مل مالک بن جائے بلکہ ایک ایسے ہی
سر سید کی ضرورت ہے جو ہزاروں کے نذرانے اوقاف
کے سرمائے ورائٹی پروگراموں، مشاعروں، قوالیوں اور
مجمعوں کی دولت سے ملت کا محل تعمیر کرے اور اس کے
چونے اور گارے کو اپنے خون سے تر کرے۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ آج سر سید جیسے
انسان کی ضرورت محسوس کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ
مسلم فرقے کو کسی فرقہ پرست قائد کی ضرورت ہے
سر سید فرقہ پرست نہ تھے انھوں نے اپنے تحریک کے
سلسلے میں ہر فرقہ کی فلاح کو اپنے پیش نظر رکھا تھا۔
ستائیس جنوری سن اٹھارہ سو بیاسی کو انھوں نے
گرداس پور میں جو تقریر کی تھی اس کا حصہ ذیل میں درج ہے:

"کیا اس زمین پر تم دونوں نہیں بستے، کیا اسی
زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا کیا اسی زمین کے گھاٹ
پر تم جلائے نہیں جاتے۔ تم اسی پر جیتے اسی پر مرتے
ہو تو یاد رکھو کہ ہندو و مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے
ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو اس ہی ملک میں رہتے
ہیں سب ایک ہی قوم ہیں جب یہ سب گروہ ایک
قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فوائد میں
جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہئے۔"

فرقہ پرست نہ ہونے کے باوجود سر سید نے

فرقہ کی طرف زیادہ توجہ دی سب واضح تھا ہندوؤں کی تعلیمی تحریک اٹھارہ سو سولہ ہی میں شروع ہو چکی تھی اور جب سرسید کھڑے ہوئے تو ہندوؤں کی تحریک کو ستر برس گزر چکے تھے تعلیمی اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے ستر برس پیچھے تھے۔ سرسید کا مسلمانوں کو ان کو ہم دوش بنانے کے ساتھ لاکر کھڑا کر دینے کی خواہش قطعی طور پر جائز تھی بلکل اسی ہی طرح جیسے مہاتما گاندھی نے ہندوستان کے دوسرے کسی فرقے پر بہت کم اچھوتوں کے سدھار پر زیادہ توجہ دی، اس لئے کہ اچھوت دوسروں سے بہت پیچھے تھے۔ سرسید کے فیصلوں اور ارادوں کی پنڈت جواہر لعل نہرو نے بھی تائید کی ہے!

یہ صحیح ہے کہ سرسید نے مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے سے باز رکھا دراصل مسلمان اپنی جہالت کی بنا پر سیاسی اور آئینی جدوجہد سے ناآشنا تھے اور اٹھارہ سو ستاون کی بغاوت کے انتقام میں انگریزی حکومت مسلمانوں کے سلسلے میں جفا کے لئے ڈھونڈ ڈھونڈ کر قصوروار پیدا کر رہی تھی، اس لئے ایسے وقت میں مسلمانوں کو سیاست میں شریک کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ سرسید کا مسلمانوں کو ملکی سیاست سے ڈرانا ایسا ہی تھا جیسے کہ گاندھی جی کا انیس سو تیئس میں کانگریسیوں کو اصول نافرمانی کا اہل نہ پاکر اپنی تحریک کو روک لینا۔

اس طویل بات کا آخر یہ ہے کہ آج کا ہندوستانی مسلمان اپنی تباہی کے پاتال میں پہنچ چکا ہے۔ جہاں گھپ اندھیرے کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے اب وہ اپنے دلوں کی جوت جگائے تو بات بنے، ورنہ سے

یہاں سو گیا جو گھڑی پل کی خاطر
وہ کوسوں پرے رہ گیا کاروں سے

دل بدست آور

مرادآباد والے راجا جے کشن داس اپنے وقت کے ایک نامور ہندو تھے۔ سرسید کے گہرے دوستوں میں تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے دنوں میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ انگریزی سرکار نے وفاداری کے صلے میں سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب اور بہت سی جائداد عطا کی تھی۔ سرکار سے جو مکان عطا ہوا تھا اس کے اندر ایک کونے میں ایک مسجد واقع تھی۔ راجا جے کشن داس نے نہ صرف مسجد کو برقرار رکھا بلکہ اپنی زندگی بھر مسجد کے جملہ اخراجات برداشت کرتے رہے ان کے بعد ان کے بیٹے اور پھر اُن کے پوتے کنور جگدیش پرشاد نے بھی اپنے دادا اور باپ کی طرح مسجد کا تمام خرچ خود اٹھایا اور مسجد کو آباد رکھا۔

شمس کنول

افق تا افق (گگن کی فائل سے)

حکیم کے درسِ خودی کو کیا کہیئے!

انحرافِ حق کا ہو یا گناہ کا، بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اس کا تقاضا کیا جائے تو کڑاکے جاڑوں میں بھی بڑے بڑوں کو پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ کانگریسی نیتاؤں کی بہادری میں شک نہیں انہوں نے انگریز جیسی جابر اور غالب قوم سے ہندوستان کو دوبارہ حاصل کیا۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ ان نیتاؤں میں اخلاقی جرات اس حد تک مفقود ہو چکی ہے کہ یہ نشہ بندی کی ناکام تحریک کو ناکام کہنے کے لئے تیار نہیں۔ قانونی سہارے کے باوجود نشہ بندی نے فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچایا ہے۔ محکمۂ پولیس کی روایتی بدعنوانیوں انگریزی راج کی دین ہیں لیکن قانونِ شراب بندی نے اس میں اور اضافہ کیا ہے۔ اگر ہمارے نیتا قانون کے مزاج کو سمجھنے کی ذراسی بھی صلاحیت رکھتے تو ان کو "تھیوری آف لیجسلیشن" کے مصنف جرمی بینتھم کی یہ بات ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ "ایسے قانون جیسے قانونِ نشا بندی، عام طور پر قانون شکنی کے لئے انسان کو سدا بیدار رکھتے ہیں!" سمجھنے والے کے لئے بات زیادہ پیچیدہ نہیں ہے کہ بدی کو دور کرنے کے لئے بدی کا سبب پہلے معلوم کیا جاتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بات اخلاقیات سے ہٹ کر جب بھی اقتصادیات پر آتی ہے تو اخلاقیات کو ہار ہوتی ہے۔ خالی پیٹ کتنا اپدیش متاثر کرتا ہے اور نہ قرآن کا درس۔ بھوک نے قانون اور دھرم سے ہمیشہ ٹکر لی ہے، بدھ بھی چالیس دن کی فاقہ کشی کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ بنا بھوجن ریاضت درست نہیں۔ چنانچہ جس دن ہمارے اجلے اجلے تن والے نیتا پینتالیس کروڑ ہندوستانیوں کے پیٹ کو روٹی، تن کو کپڑا رہنے کو مکان اور ذہن کو تعلیم دینے میں کامیاب ہو گئے قانون نشا بندی بھی کامیاب ہو جائے گا۔ جہاں آٹھ کروڑ انسان مسلسل فاقے کرتے ہوں وہاں اخلاقی درس اچھا نہیں معلوم ہوتا ——

جہاں فقیر کو نانِ جویں نہیں ملتی
وہاں حکیم کے درسِ خودی کو کیا کہیئے

انا الحق کہیں (اور پھانسی نہ پائیں)

ہو نٹ پر مسلمانوں کے پیغمبر نے ایک اونچے مقام پر کھڑے ہو کر اپنی قوم سے کہا "اگر میں یہ کہوں کہ اس ٹیلے کی دوسری طرف سے ایک لشکر جرار تم پر حملہ کرنے کے لئے آ رہا ہے تو کیا تم میرا یقین کرو گے؟" سب نے ایک زبان ہو کر جواب دیا "اے رسول اللہ ہم ضرور یقین کریں گے۔ اس لئے کہ آپ امین ہیں اور آپ نے جھوٹ کبھی

گزر گیا! محمد جیسی برتر اور اعلیٰ ہستی کو اپنا ماضی اپنا
کردار اور اپنی ذات کو عوام کی کسوٹی پر رکھ دینا پڑا۔ اس لئے کہ
انسان اپنے ماضی و حال، افکار و اعمال ہی سے پہچانا جاتا ہے،
اور اس کی حالیہ کارگزاریوں کو پرکھنے اور اس کی ذات کو سمجھنے
کے لئے اس کے ماضی کا جائزہ لینا ہی پڑتا ہے۔ مہاتما
گاندھی نے بھی یہی کہا تھا کہ "انسان کی زندگی ناقابل
تقسیم مجموعہ ہے۔ جو انسان پبلک کے سامنے آچکا ہے
اس کے داخلی اور خارجی پہلو الگ نہیں ہوتے!"
دراصل ذاتی زندگی ہی عوامی زندگی پر سب سے زیادہ
اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لئے کسی پبلک انسان کی
ذات کو درمیان میں لائے بغیر ہم اس کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ
دوسروں کو سمجھا سکتے ہیں اس کی اپنی ذات واضح کی جا سکتی
ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جو ذاتی تنقید و تبصرے پر ناک
بھوں چڑھاتے ہیں وہ [illegible] بے وقوفوں کی جنت
میں رہتے ہیں اور کبوتر خانے کی مخلوق سے تعلق رکھتے
ہیں اور یہ وہ ہیں کہ جن کے دل میں چور ہوتا ہے جن کے
ضمیر گندے ہوتے ہیں اور جو اپنے میل آلود تن کو
اوپر سے دھلے ہوئے لباس سے چھپائے ہوئے ہیں۔
جہاں تک الفاظ کی شدت اور [illegible] کا تعلق ہے
اس پر بھی کوئی ذی فہم اعتراض نہیں کر سکتا۔ ورنہ قرآن
بھی اس اعتراض کی زد میں آجائے گا۔ کلام پاک میں بلا کی
شدت اور [illegible] ہے۔ وہ مشرک کو [illegible] اور [illegible]
کو [illegible] کہتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ [illegible]
گوئی اور [illegible] کے اظہار کے لئے [illegible]
[illegible] ذریعہ ہونا پڑتا ہے۔ اسی لئے [illegible]

نے بھی یہ تسلیم کیا تھا کہ صاف گوئی سے بہتر کوئی چیز نہیں،
گو صاف گوئی اکثر تکلیف دہ چیز ہوا کرتی ہے مگر علم [illegible]
پر اچھی اور مفید ہوتی ہے۔" پیغمبر اسلام نے بھی یہ ہدایت
کی تھی کہ "تم میں سے جس کو منکر (خلاف مرضی الٰہی) بات
نظر آئے وہ اسے اپنے ہاتھ سے ٹھیک کر دے اور اگر
اس کی قدرت نہ ہو تو زبان سے کام لے اور اس کا بھی
یارا نہ ہو تو دل سے ہی سہی مگر یہ ایمان کا سب سے کمزور
پہلو ہے!" رسول اللہ کی یہ ہدایت اس لئے تھی کہ قرآن
پہلے ہی سچے انسان کی یہ پہچان بتا چکا ہے کہ "وہ حق کے
اعلان میں کسی سے نہیں ڈرتا!"

لیکن اس میں شک نہیں

کہ آج کرسیوں کے محافظ، ہوا خواہ، خود غرض، مصلحت
پسند، لالچی، بے ضمیر، خوشامدی، بد طینت، بدکردار، ابن الوقت،
گندم نما جو فروش، حاشیہ نشین، چڑھتے سورج کی پوجا
کرنے والے اور مرغان باد نما، تنقید اور سچی بات کہنے
کو پسند نہیں کرتے، یہ صرف ایسی باتیں سننے کے عادی
ہوتے ہیں جو ان کو پسند آتی ہیں اور جو دوسروں کے غم کو
اپنا غم سمجھتا ہے اس کو یہ اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں۔ ان
ارباب وقت کی [illegible] کرنے والوں کو یہ بتا دینا
چاہئے کہ ہمیشہ سے انسانیت کے لئے [illegible] ایک ہی
راہ [illegible] یعنی جو حسین کے مددگار نہیں ہیں
وہ یزید و شمر سے تعلق رکھتے ہیں!

ماہنامہ [illegible] زندہ رہنے کے لئے!
ایک اخباری خبر کے مطابق [illegible]
[illegible]

پچھلے پانچ سال میں بلیا کے گورنمنٹ ہسپتال کے
بلڈ بینک کو اپنا سو پونڈ خون فروخت کیا۔ جبکہ اس
نوجوان کا اپنا وزن بھی صرف ایک سو چھتیس پونڈ تھا۔ مہنگائی
نے بھوک کو اتنا شدید کر دیا ہے کہ مدراس کے فضیر ایا
ایم۔ بھگت وتسلیم نے انکشاف کیا کہ صوبہ مدراس میں
ایک سال میں ساڑھے پانچ ہزار سے زائد اشخاص نے
خودکشی کر لی۔ ان میں زیادہ تر بھوک کے مرض میں مبتلا
تھے مرنے کے بعد قسمت ان کانگریسیوں کی تھی جو
اپنے نعرے بھرتے اس لئے کہ پہلے گھر کی مرغی دال برابر
ہوتی تھی اور اب کانگریسیوں کی دی ہوئی مہنگائی کی برکت
ہے کہ دال بھی مرغی کے بھاؤ پڑتی ہے۔ پہلے چائے قومی مشروب تھا
اور تمباکو نوشی غم دوراں اور غم جاناں سے نجات پانے
کا ذریعہ تھی، اب یہ دونوں عادتیں عیاشی بن چکی ہیں
رقیب کے ہاتھ میں قینچی دیکھ کر کبوتر جیسے بزدل پرندے
جب سے نامہ بری چھوڑ چکی تھی، عاشقوں کے لئے سرکاری
چٹھی رساں کا سہارا تھا، اب تو پوسٹ مین کو دیکھ کر جان
جاتی ہے کہ کہیں ٹیکس ناشناس محبوب کا کوئی بیرنگ خط
اپنے نام نہ ہو۔ زہر کا بھاؤ معلوم نہیں، اگر برا وقت
آیا تو وہ بھی مہنگا نکلے گا، قبل از وقت شکر ہے کہ وہ برا
وقت خود بخود ٹل جائے گا۔ شکر پر شکر یاد آگئی۔ ہائے اب
وہ لب جیسے لب شیریں کہاں۔ اسی نے الہ آباد یونی
ورسٹی کے شعبہ معاشیات کے صدر پروفیسر جے۔ کے
سنہا کو کہنا پڑا کہ غریبوں کے لئے جینا تو دشوار رہتا
ہی تھا مرنا دشوار ہو گیا ہے۔ "مشکل تو یہ ہے کہ جب سے
جب زیادتی سے پیش آتے ہیں تو نیچے کے غلط

کاروں کو اور شر ملتی ہے وہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے
پر ہی قناعت نہیں کرتے بلکہ اس میں غوطہ لگاتے ہیں
اور چھلانگیں مارتے ہیں۔ اثر انداز جتنا ہو۔ اس دیس
کی جنتا جہاں گنگا بہتی ہے۔

تو کیا اب بھی

یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ہم نے "گگن" کی قیمت میں دس
نئے پیسے کا اضافہ کیوں کر دیا؛ لیکن یقین کیجئے آپ اب
بھی نقصان میں نہیں ہیں، نقصان تو ہمارا مقدر ہے
"گگن" کی سالانہ قیمت پانچ ہی روپے ہے۔ اور پھر
زیادہ اشتہارات چھاپنے کا ہمیں شوق نہیں۔ (جیسا
کہ کسی بھی اخبار کے مالک کو نہیں ہوتا) — اس لئے آپ کو
"گگن" میں افق تا افق پڑھنے ہی کا سامان ملے گا۔ اور ہم
ہر صورت "گگن" کو اپنے خون سے رنگین بنائے رکھیں گے!

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی!

کہا جاتا ہے کہ دیوی سرس وتی اور لکشمی میں ازلی بیر ہے۔
سرس وتی کی پوجا لکشمی کی ناراضی کے مترادف ہے۔ لکشمی
تو ناراض ہو کر من بھی جاتی ہے لیکن سرس وتی کا دامن
اگر ایک بار ہاتھ سے چھوٹ گیا تو پھر زندگی بھر سرس وتی کے
وردان سے محروم رہنا پڑتا ہے۔

آج کا یہ خیال عام ہے کہ گو بہت کچھ لکھا جا رہا ہے،
تعلیقات کے انبار لگے ہو گئے ہیں، مگر کام کی چیزیں وہ چند
ہی نکلتی ہیں۔ ایک صاحب کا کہنا ہے کہ آج کی اردو زبان
میں وہ چاشنی اور شگفتگی نہیں جو بیس پچیس سال پہلے کی
اردو میں پائی جاتی تھی۔ ان کے خیال میں عربی فارسی الفاظ
کا کم اور ہندی الفاظ کا زیادہ استعمال اس کا بڑا سبب ہے

ممکن ہے ایسا ہو لیکن وجہ صرف یہی نہیں دراصل آج کے
لکھنے والے لکھتے زیادہ ہیں اور پڑھتے کم ہیں اور جو
کچھ پڑھتے ہیں وہ بھی ہلکی پھلکی چیزیں ہوتی ہیں۔ نتیجے میں وہ
معلوماتِ عامہ اور حالاتِ حاضرہ اور واقعاتِ عالم سے زیادہ
واقف ہو جاتے ہیں لیکن کلاسکس سے بالکل نہیں۔ جب کہ
کلاسکس کا مطالعہ فطری ذوق کو وزن، وقار اور زندگی کو
آب و تاب پیدا اور خوبصورتی دیتا ہے۔ کسی چیز کو حاصل
کرنے یا کسی فن میں مہارت پیدا کرنے کی جو لگن اور دھن
ہمارے بزرگوں میں پائی جاتی تھی وہ آج کی نسل کے
قلم کار میں نہیں پائی جاتی۔ پہلے پیروں میں لوہے کی نہیں
اشٹ دھات کی بیڑیاں پڑی رہتی تھیں اور لوگ
پہاڑ پر چڑھنے کی ہمت رکھتے تھے۔ اسی سلسلے
میں پریم چند نے بڑی اچھی بات کہی تھی کہ "لکھتے تو وہ ہیں
جن کے دل میں کچھ درد ہے، پریم ہے، لگن ہے اور
گیان ہے!"

پہلے ہر ادیب، ہر صحافی اور ہر نثر نگار کا اپنا ایک
ازم ہوتا تھا، بنا سیاسی نظریے یا ادبی عقیدے کا قلم کار
پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ چناں چہ وہ اپنے ہی نظریے یا
عقیدے کے تحت لکھتا تھا اسی ادارے کی ملازمت
قبول کرتا تھا جو اس کے خیالات سے میل کھاتا تھا۔
ابوالکلام آزاد، حسن نظامی، سالک، مولانا ظفر علی خاں، چراغ
حسن حسرت، نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریاآبادی،
خارخلیش، حیات اللہ انصاری، سر سید احمد خاں، گاندھی
اور مولانا محمد علی نے اپنے مسلک کی خاطر تکلیفیں
اٹھائیں مگر وہی لکھا جو بہتر سمجھا یہی وجہ ہے کہ ان کی
تحریروں میں زور ہے، چاشنی ہے، شگفتگی ہے
ہے اور قائل کر دینے والا عنصر ہے اور اسی
یہ لوگ صاحبِ طرز کہلائے۔ برخلاف اس کے
ہر قلم کار یا تو سرے سے کوئی سیاسی یا ادبی نظریہ
ہی نہیں اور اگر فیشن کے طور پر کوئی ازم اپناتا ہے
تو اس کا اس کے قلم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔
لیگی ہو کر کمیونزم کے حق میں اداریئے لکھ سکتا۔
یا کمیونسٹ ہوتے ہوئے گاندھی ازم کی حمایت
قلم توڑ سکتا ہے اور یہی نہیں بڑھتی ہوئی تنخواہ
میں چھ ماہ میں چھ کرسیاں بھی بدل سکتا ہے۔
بات یہ ہے کہ جو بات دل سے نکلے گی وہ دل میں
اترے گی اور جو بات خیالات اور حالات کے
نتیجہ ہو گی وہ کھوکھلی ہو گی۔ اسی سلسلے میں ایک
بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جو قلم کار عملی طور پر جتنی
بسر کرتا ہے اتنا ہی اونچا وہ لکھ سکتا ہے۔
وادیٔ زندگی کے بغیر حسین، ٹھوس اور دائمی
جنم ممکن نہیں۔ دراصل آج کے قلم کار کو ضمیر
صاحبِ طرز بننے نہیں دیتی۔

گلوں کے سائے میں کانٹوں کا

شاہ جہاں کے زمانے میں ملّا جیون نام کے ایک
گزرے ہیں، ملّا جیون کے علم و فضل کا اندازہ
طرح کیجیے کہ شاہ جہاں نے ان سے درخواست
وہ اورنگ زیب کے استاد بن جائیں،
بڑی بے نیازی سے جواب دیا کہ پڑھا دیں
مگر معاوضہ بھرپور لوں گا۔ شاہ جہاں نے پھر

"جو فرمایا ہے پیش کیا جائے گا" ملاجی نے پیر جھٹکا اور
جواب دیا "اچھا سوچ کر کل بتاؤں گا!"

ملاجی نے بیوی سے پوچھا "گھر کا خرچ کتنا ہے؟"
جواب ملا "بیس روپے"۔ بیوی کا جواب سن کر ملاجی
شاہ جہاں کی طرف چل دیئے۔ راہ میں ایک حلوائی کی دکان
دکھائی دی، سوچنے لگے کہ شاہزادے کو پڑھانا ہے،
دماغ خرچ ہوگا، دو پیسے روز کا حلوہ ضرور کھانا چاہئے۔
یہاں پہ بغیر کسی تمہید کے شاہ جہاں سے فرمایا "اکیس روپے
سے کم نہیں لوں گا"۔ شاہ جہاں نے مذاق سمجھا عرض کیا
"قبلہ! ذرا حالات کا خیال کیجئے، سلطنت پر پہلے ہی سے
اخراجات کا بے حد بار ہے، اس معاوضے میں تھوڑی
کمی کر دیجئے۔" "نہیں کمی کی کوئی گنجائش نہیں، لونڈے کو
پڑھوانا ہے تو پڑھواؤ، ورنہ میں چلا!"

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ مغل شہنشاہ جو اپنے
وقت کا سب سے بڑا دولت مند انسان تھا اپنی سرکار
آمدنی اور خرچ پر کتنی کڑی نظر رکھتا تھا اور اپنے ولی عہد
کے سلسلے میں بھی ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے کے
لئے تیار نہیں تھا۔ جب ہم اپنے دور پر نظر ڈالتے ہیں تو
پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ۳۰۸ حاکموں نے اپنی حسین بیویوں
کے ساتھ "ڈیلی گیشن" کے عنوان سے جو غیر ملکی دورے
کئے ان پر ۸۰ لاکھ ایک ہزار ۷۹ روپے ۸۵ پیسے خرچ ہوئے
یہی نہیں بلکہ مرکزی حکومت کے ایک عزت مآب وزیر
پچھلے تین برس میں چودہ بار غیر ممالک کے دورے پر
تشریف لے گئے، نتیجے میں انہوں نے ایک لاکھ ۸۹ ہزار
۵۵۱ روپے اور ۹۰ پیسے کا مجموعی بل بنایا اور سرکار کو گزار دیا۔

ہے کہ پہلے سے ۳۰ جولائی ۱۹۷۲ء تک ۱۴۳ ملین ڈالر
سے زیادہ زرِ مبادلہ گھٹ چکا ہے۔ واضح رہے یہ
"ہنی مون" اس قوم کی دولت سے منائے جا رہے
ہیں جس قوم کے رمضانی اور فقیر چند راشن کی قطار میں
کھڑے کھڑے تھک جاتے ہیں، بے ہوش ہو جاتے
ہیں اور گر پڑتے ہیں۔ رام اور گاندھی کے دیس کا یہ
انقلاب بھی قابلِ غور ہے کہ پھولوں کے خون سے کانٹے
سرخ رو بنے پھرتے ہیں!

جدھر بھی آنکھ اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے!

خلیفہ بننے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک بلیغ
اور مثالی بیان جاری کیا:۔

"لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں۔ حالاں کہ
میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو میری
مدد کرو اگر بُرا کام انجام دوں تو مجھ کو درست کرو... جب
تک میں حق اور سچائی کا فرماں بردار رہوں تم میرے فرماں
بردار رہو، ورنہ تم پر میری اطاعت لازم نہیں!"

آج رام اور گاندھی کے دیس میں (جس کو بھارت
کہتے ہیں) میں بسنے والی مسلم اقلیت کے سامنے دو
اہم مسائل ہیں ـــ

جان و مال اور مذہبی آزادی کا تحفظ

مادری زبان اردو کی بقا

مسلمان کی عزت و آبرو، اس کی جان اور
اس کے مال کو مسلمانوں کے نبی اکرم صلعم نے بیت اللہ
کے برابر قرار دیا ہے، حرمت والے مہینے کے برابر مقدس
مانا ہے اور پاک شہر مکہ کے برابر بلند مرتبہ تسلیم کیا ہے

جب کہ اس ہی مسلمان کا لہو اپنے وطن عزیز میں پانی سے زیادہ
ارزاں ہو چکا ہے پچھلے بیس برسوں میں ہندوستان کے ہر
اہم علاقے کے فرقہ وارانہ فسادات اور گورکھپور، رانچی، مرہ
گڑھ، شولاپور، احمد نگر، اکولہ، مالے گاؤں، جمشید پور، بھیونڈی، پونا
نیوا اور ہرسند کے یک طرفہ بلوؤں نے یہ واضح کر دیا ہے
کہ سیکولر بھارت کی سیکولر مزاج پولس جب خود خطرے
میں گھرتی ہے تو انھیں نہیں گولیاں چلاتی ہے مگر جب
اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والے انسان اور ان انسانوں
کے گھر نذر آتش کئے جاتے ہیں تو وہ پولس لاٹھی تو کیا
زبان بھی نہیں ہلاتی، بلکہ دور کھڑی تماشہ دیکھتی ہے۔ جیسے
کسی کا گھر نہیں بلکہ سیول جھڑی جل رہی ہو!

حدیث ہے کہ مومن ایک [illegible] سے دو بار نہیں
ڈسا جاتا، مگر نہ جانے ہندوستان کا مسلمان کیسا مومن
ہے کہ پچھلے بیس برس میں حکمران پارٹی کے اشارے پر
اکثریتی فرقے نے اس کو ایک ہزار بار ڈسا ہے اور وہ
خاموش ہے، ہندی مومن کو یہ جان لینا چاہئے کہ ظلم
سہتے رہنا گناہ عظیم ہے اس سے ظالم کے حوصلے بڑھتے ہیں۔

اردو زبان کی بات بھی عجیب ہے۔ کچھ پیشہ
وران اردو اور احساس کمتری میں مبتلا تھوڑے سے اردو
داں عوام اردو کو قومی مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ ورنہ
پنڈت نہرو کی آتما سے جے پرکاش نرائن تک اور مدھوک
سے گرو گول والکر تک اردو زبان اور ہر فساد کو مسلمانوں
کا مسئلہ سمجھتے ہیں

اب ہلم اور گاندھی کے اس دیش (جس کو بھارت
کہتے ہیں) کی مسلم اقلیت کے ان دونوں مسائل کے حل

قتلِ عام پر واضح کیا۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان برملا یہ
کہیں کہ ہاں ہاں "اردو ہماری زبان ہے بس۔ اور ہم چونکہ
ہیں اور ہم اپنے محترم آئین کے آرٹیکل [illegible] کے تحت
اپنے داخلی اور خارجی امور اپنا کاروبار اور اپنی [illegible]
اردو ہی زبان ہی کے ذریعے انجام دینا چاہتے ہیں۔ —
رہے کہ ہندوستان کے متفقہ دستور میں مذہب
کی بنیاد پر ہر فرد اور ہر فرقے کو زندہ رہنے کا حق دیا گیا
نماز پڑھنے والے مومن کو یہ بھی یاد رکھنا
کہ وہ ہر چوبیس گھنٹے میں ایک بار نہیں بلکہ متعدد بار
(اللہ سب سے بڑا ہے) کا نعرہ لگاتا ہے۔ آج
میں جہاں چپے چپے پر مالکیت اور آمریت اور بڑائی
مدعی بستے ہیں، وہاں ایک مومن "اللہ اکبر" جیسا بڑا
نعرہ لگانے سے نہیں ڈرتا تو پھر یہ شیر خدا
آپ کو مسلمان اور اردو کو اپنی زبان کہتے ہوئے کیوں
جھجکتا ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ فرقہ پرستی ہے تو اس
کہنا ہے کہ "اگر یہ فرقہ پرستی ہے تو مہاتما گاندھی بھی
بڑے فرقہ پرست تھے جو فرقہ در فرقہ ہندوؤں میں
کی تھیوری کو مان کر زندگی بھر اچھوتوں کی فلاح کا کام
دیتے رہے۔ اور جب مہاتما گاندھی فرقہ پرست ہو
تو ہندوستانی مسلمان کے فرقہ پرست ہونے میں
برائی نہیں۔

جان و مال کے تحفظ کا مسئلہ ہو یا اردو
کی زندگی کا سوال اس کا تو مسلم عوام ہی حل کر سکتے

جو بچاؤ ... ہوئے اس ... اردو
توسط ... مسلمان ... شریفوں ہونے ... پرام
شنوں اور اسمبلی میں گئے ہوئے ان تمام نہاد مسلمان۔
... پر مسلم عوام اپنے خلیفہ ابوبکرؓ کے پہلے بیان کو یاد کرتے
ے واضح کردیں کہ آپ ہماری اردو کی حفاظت کریں
اپنے عہدوں اور اعزازات سے سبکدوش ہو کر واپس
ہم ہی جیسے بن جائیں۔
- مسلم عوام کو چاہئے کہ وہ چیخ چیخ کر ان جعفروں اور
صادقوں سے ... ہارڈی فاسٹ کے الفاظ میں یہ کہہ کر
... خیرہ اور ... ثابت کی ہے کہ اپنے خادم ہمارے

... بھارت ... سے ... برطرف
کردیئے ہیں!
بھارت دنیا میں ایک سیکولر ملک کہا جاتا ہے
اور بھارت والے اپنے طرز نظام کو ایشیا میں سب سے
بڑی جمہوریت کہتے ہیں اس لئے بھارت کے مسلمان یہ
یقین رکھیں کہ اگر وہ اکثریتی فرقے اور حکومت کے مقابلے
کے لئے نہیں بلکہ اپنے جعفروں اور صادقوں کے سامنے
کھڑے ہو گئے تو جان و مال اور مذہب کا تحفظ اور اردو
زبان کی حیات یقینی ہے!

علم اور جہالت

کہتے ہیں برطانیہ صرف دو حریفوں سے لرزا۔ اس طرف پرشا یعنی جرمنی،
ادھر حیدر علی اور ٹیپو سلطان۔ ان ... کی دلاوری اور تدبر سے مرعوب،
معترف اور خائف۔ ٹیپو ان کا "باغی" نہیں تھا بے پناہ ذہین، عالم، طاقتور اور
جری، ہمسر دشمن تھا۔ چنانچہ لارڈ ولزلی نے کمسن شہزادوں کو یرغمال بنایا مگر ان
کے ساتھ بہت محبت اور پدری شفقت سے پیش آیا۔
اٹھاون برس بعد دلّی اور لکھنؤ کے پشتینی پنشن یافتہ کمزور فرضی حکمرانوں
کے لئے ان کا رویہ بدل گیا۔ مغل شہزادوں کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کیا
اور قتل کروادیا۔ جو زندہ بچے ان کو ذلیل و خوار کیا۔ دراصل جاہل اور نااہلوں کا
یہی حشر ہوتا ہے ——— "چاندنی بیگم" قرۃ العین حیدر۔

شہرِ خیال

سہیل کا شمارہ نمبر ۱-۶ اپنے دوست رام پرکاش راہی کے توسط سے ملا۔ مضمون کی اشاعت کے لئے شکریہ۔

سہیل میں آخری مضمون غالباً جمیل مظہری نمبر کے لئے لکھا تھا۔ اب جو رسالہ دیکھا تو اس زمانے کی یاد تازہ ہو گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ رسالہ اب بھی نکل رہا ہے۔ اس دور میں رسالے کو زندہ رکھنا کمال ہے۔ آپ کی ہمت اور ادب دوستی کی داد دیتا ہوں۔

——— علی جواد زیدی

• سہیل کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ "نمود" میں آپ نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ بلاشبہ کہ شاعری مر رہی ہے اور نہ ادب کا زوال ہو رہا ہے۔ یہ بات بھی لوگ کر رہے ہیں جو نئی نسل کو قبول نہیں کر رہا ہے۔ خدا کرے آپ کا زورِ قلم اور زیادہ!

——— مشتاق احمد، مدھوبنی

• "سہیل" کا تازہ شمارہ نمبر ۲ جلد ۲۶ بھیجنے کے لئے شکریہ قبول فرمائیں۔

سرورق جدید آرٹ کا نمونہ ہے۔ مقالات و تخلیقات کے انتخاب کو دیکھ کر حُسنِ انتخاب کی تحسین نہ کرنا ادبی بددیانتی ہوگی۔ موجودہ ادبی حالات و رجحانات کے تعلق سے "نمود" واقعی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدا کرے "سہیل" زندہ رہے۔۔۔۔ اس کا مستقبل درخشندہ رہے۔ آپ کا قلم تیز تر چلتا رہے۔ "نمود" قارئین تک پہنچتا رہے!

علاوہ ازیں ——— ڈاکٹر محمد امیر الدین انصاری "ادبی اولین مثنوی" تحقیقی معیار کو قائم رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ صالحہ عابد حسین کے افسانوں پر ڈاکٹر نکہت آرا کی آرا سے اتفاق نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ڈاکٹر حسن الحق، شہاب دائروی اور عادل حیات کے افسانے ایسی سچائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں جو سماج میں نت دن دیکھنے سننے کو ملتی ہیں۔

پیشِ نظر شمارے کا منظوم حصہ بھی لائقِ تحسین ہے۔ امید ہے مظہر امام صاحب کے زرّیں خیالات کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوگا۔ ایک استدعا ہے کہ آپ پروفیسر علیم اللہ حالی صاحب کے مقالات و تخلیقات سے بھی مستفید ہونے کا موقع فراہم کیجئے۔ غالباً آپ کلام حیدری مرحوم کی شخصیت اور افسانہ نگاری پر مشتمل خصوصی شمارہ شائع کر رہے ہیں۔ آپ واقعی لائقِ مبارکباد ہیں۔

——— نسیم اختر، وارانسی

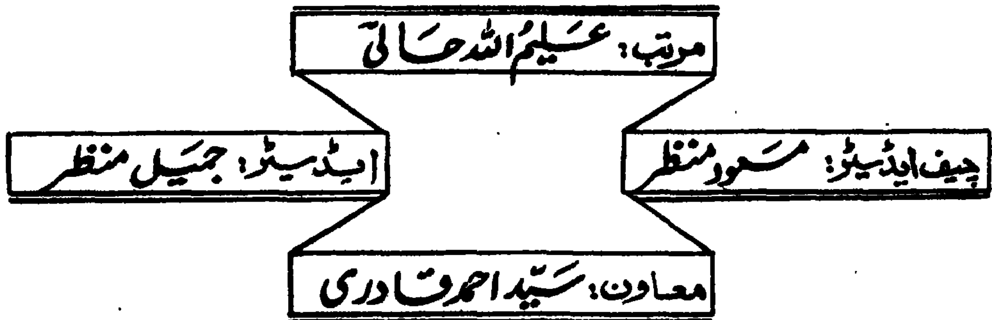
بانی:- حافظ محمد عبدالرحمن بسمل سنہاروی

بیادگار: زین الدین احمد وادریس سنہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

جلد ۵۶ — شمارہ ۱۰

حیدری نمبر



عام شمارہ:- پانچ روپے

زر سالانہ:- پچاس روپے

اس شمارے کی قیمت
سو روپے

پتہ

ماہنامہ سہیل ریور سائیڈ روڈ گیا ۸۲۳۰۰۱

فون نمبر: ۲۱۵۷۳

انتساب

ماہنامہ سہیل کے کلام حیدری نمبر کو
ہم اپنے والد ماجد
ادریس شہنساروی مرحوم
کی یادوں سے منسوب کرتے ہیں
ـــــ اور یوں محسوس کرتے ہیں
گویا ہم نے ان کی ایک وصیت پوری کی ہے

سورج کو سائبان میں لا کر کھڑا کیا
ہم نے ترے رفیق کا بھی حق ادا کیا

- مسعود منظر
- جمیل منظر

ماہنامہ سہیل گیا

کلام حیدری نمبر

ترتیب

شخصیت

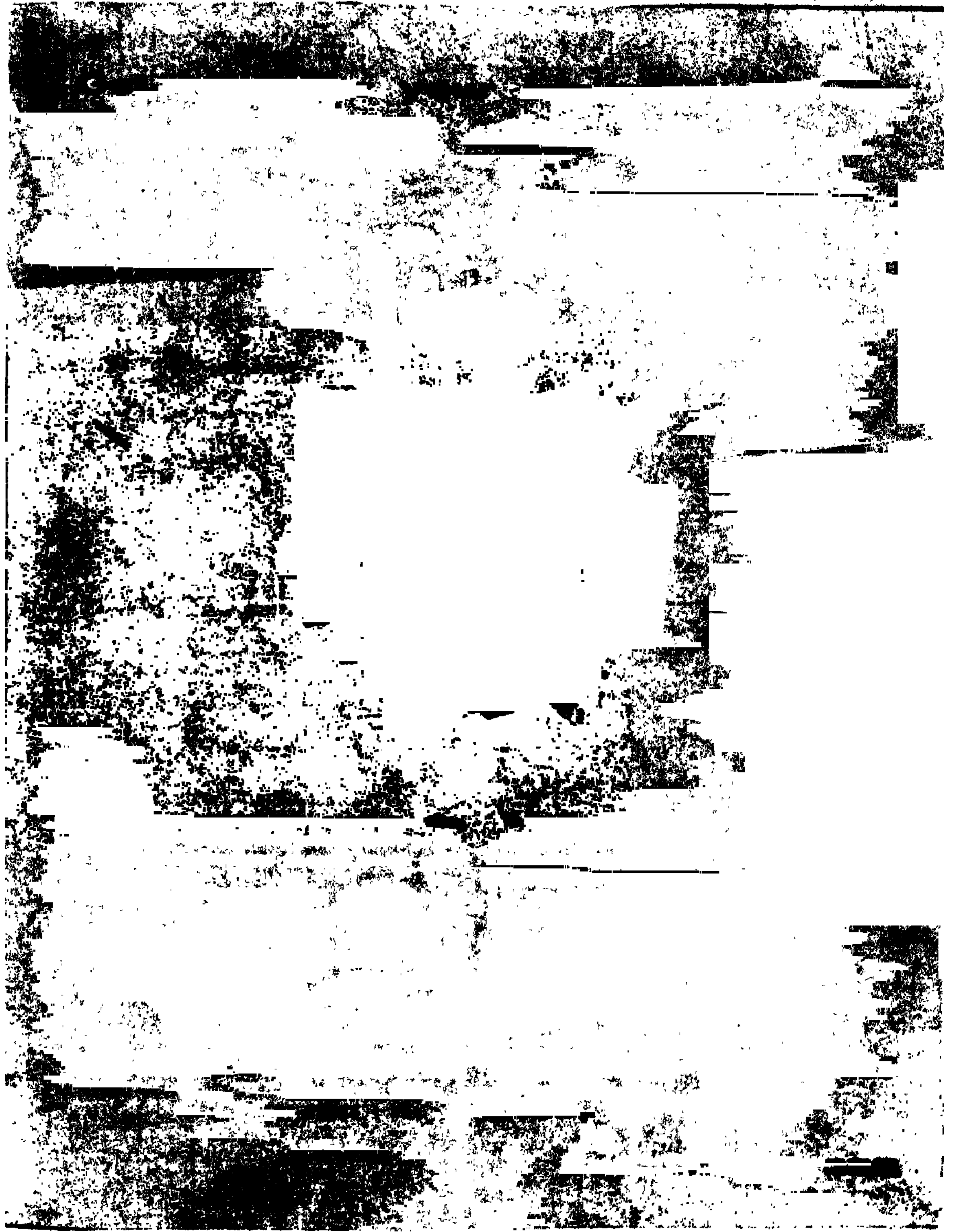
شعروفن ۱۷۵ ـــــ تا ۲۵۲

تعزیتی ۲۵۵ ـــــ تا ۲۸۵

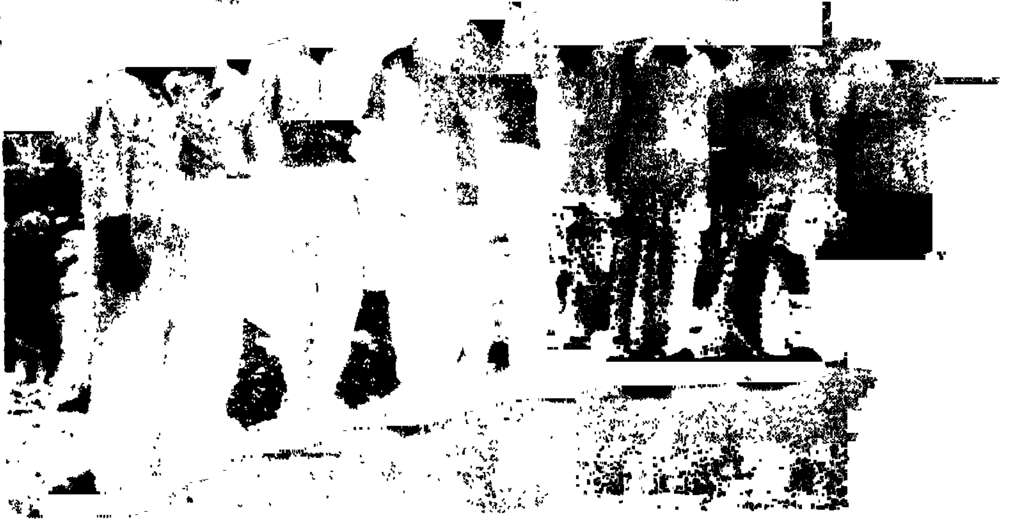
نالۂ وداع ۲۸۷ ـــــ تا ۲۹۲

الفراق ۲۹۵ ـــــ تا ۳۰۴

فن ۳۰۷ ـــــ تا ۳۱۲



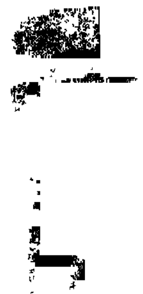
سہیل گیا۔ کلام حیدری نمبر



ما ہجوم دوستاں میں ۔ (تصویر میں ادریس سنہاروی، غیاث احمد گدی، کرشن چندر اور رام لعل وغیرہ دیکھے جا سکتے ہیں ۔





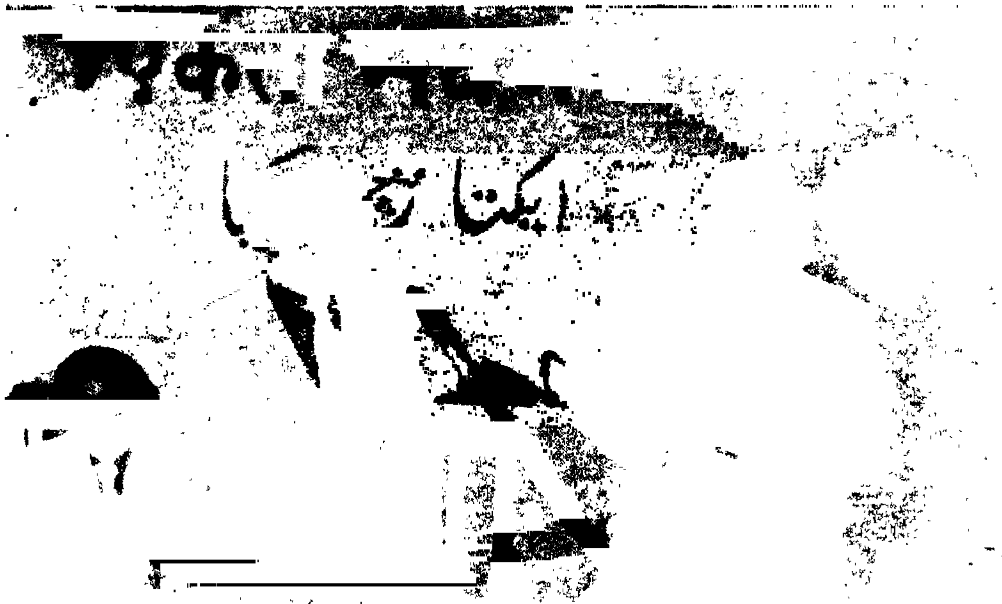


علیم اللہ حالی   وفا ملک پوری   کلام حیدری



ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

کلام حیدری اپنی بیگم شاہدہ حیدری اور بیٹی نگارینہ حیدری کے ساتھ۔



ایکتا منچ کے جلسے میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ "سہیل" (گیا) کے غلام حیدری نمبر کا رسم اجرا کرتے ہوئے
تصویر میں سہیل کے چیف ایڈیٹر مسعود منظر، غلام حیدری، فیاض حالی۔

سہیل گیا، کلام حیدری بمبئی



کلام حیدری، رام لعل، شمس الرحمٰن فاروقی، لطف الرحمٰن اور جوگندر پال وغیرہ کے ساتھ



(۱) قاضی عبدالستار (۲) کلام حیدری (۳) قمر رئیس



طالب علم کلام حیدری (بائیں جانب کھڑے ہوئے) اپنے اساتذہ (بائیں سے) علامہ جمیل مظہری، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر صدرالدین فضا اور پروفیسر مطیع الرحمٰن کے ساتھ۔

یہ خصوصی شمارہ : ـــــــــــ

کلام حیدری نمبر ہے۔ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ہم اسے بہت تاخیر سے شائع کر رہے ہیں لیکن وہ لوگ جو آج کی ادبی صحافت کی الجھنوں سے واقف ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس سلسلے میں ارادے کو عمل کی منزل تک گزارنے میں کیا کیا دشواریاں پیش آتی ہیں وسائل کی کمی، تعاون کا فقدان، اہل قلم کی بے توجہی، کتابت و طباعت کی دشواری، اشتہارات کی نایابی، معیاری تحریروں کی کمی ـــــــــــ غرض رکاوٹوں اور مزاحمتوں کے بیچ سے گزرتے ہوئے آج کوئی ادبی رسالہ اگر اپنے کسی بڑے منصوبے کی تکمیل کر لیتا ہے تو اسے ادبی دنیا کا مشکور ہونا چاہئے۔

مگر ہم اس خصوصی شمارے کو پیش کرتے ہوئے داد و ستائش کی متمنی و منتظر بھی نہیں۔ یہ کام تو ہم نے ایک فریضے کی تکمیل کے طور پر کیا ہے۔ کلام حیدری کی بے وقت موت نے ہم سبھوں کو ایک زبردست کمی کا احساس دلایا ہے۔ علم و ادب اور صحافت سے وابستہ ہند و پاک کے تمام حلقوں میں کلام حیدری کا سوگ منایا گیا ہے۔ ہم صرف ماتم گساری کے قائل نہیں بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی فن کار ہمارے پاس سے رخصت ہوتا ہے تو اپنی اتھاہ یادوں کے ساتھ شعر و ادب کے وہ خزانے بھی ہمارے سپرد کر جاتا ہے جس سے نہ صرف اس کی یاد تازہ رہتی ہے بلکہ اس خزانے سے ادب و فن کی ایک ناقابل فراموش دستاویز تیار ہوتی ہے وہ ہماری روایتوں کو آگے بڑھانے اور زبان و ادب کے استحکام کی ایک قیمتی کڑی بن جاتا ہے۔

کلام حیدری اب نہیں رہے تو ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم ان کی تخلیقات و نگارشات کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں ـــــ یہ معلوم کریں کہ ادب میں ان کا کیا مقام ہے اور موجودہ اور آنے والی ادبی نسلیں ان سے کیا کچھ حاصل کر سکتی ہیں۔

ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم اپنی مجبوریوں کی وجہ سے نہ اپنے منصوبے کی صحیح تکمیل کر سکے ہیں اور نہ کلام حیدری کو ان کی حیثیت کے مطابق خراج عقیدت پیش کر سکے ہیں لیکن یہ حقیر پیش کش اس نسبت اور لگاؤ کی ایک علامت ضرور ہے جو ہم کلام حیدری مرحوم کے سلسلے میں محسوس کرتے رہے ہیں۔

یہ خصوصی شمارہ پروفیسر علیم اللہ حالی کی کوششوں کا مرہون ہے۔ پتہ نہیں وہ اس محنت و جانفشانی کے لئے ادارۂ سہیل کا شکریہ بھی قبول کریں گے یا نہیں ــــــــ اس لئے کہ کلام حیدری کی محبت و موانست اور شعر و ادب سے وابستگی کا جو جنون ہمارے سر میں ہے وہی سودا انہیں بھی ہے ــــــــ اور جو کام والہانہ اور لگاؤ کے تحت کیا جاتا ہے، اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی پھر ہم بطور ہدیہ انہیں نذرانۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔

اس خصوصی شمارے کا انتساب ہم اپنے والد مرحوم جناب ادریس سنہاروی کے نام اس لئے کر رہے ہیں کہ کلام حیدری اور ادریس سنہاروی دو ایسے دوست رہے ہیں جو ہر دور میں ذہنی اور تحریکی اعتبار سے قریب رہے ہیں ــــــــ اتنے قریب کہ انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ نمبر شائع کر کے ہم اپنے والد ماجد کی روح کو بھی مطمئن و مسرور کر رہے ہیں ــــــــ ہمیں اس کا یقین ہے۔

مسعود منظر

"کلام حیدری نے خوبصورت اور متاثر افسانہ سنایا اور باتیں کہیں اور کہا کہ میں اپنی تلوار میان سے باہر رکھتا ہوں تاکہ یہ زنگ آلود نہ ہو اور بے سروسامانی کو پسند کرتا ہوں۔ بے سروسامان لوگوں نے روم و ایران کی زبردست اور ظالم حکومتوں کو مٹا دیا اور سامان جمع کرنے والے برباد ہوتے چلے گئے۔"

کلام حیدری کے اعزاز میں ایک جلسے کی رپورٹ۔ مطبوعہ حریت کراچی

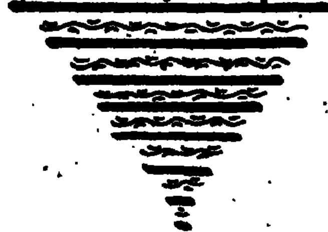
قرض کی پہلی قسط

کلام حیدری
کا بڑا قرض ہے۔ ذاتی
طور سے مجھ پر بھی اور ادبی دنیا پر
بھی۔ میرا ان کا معاملہ تو قیامت میں طے ہوگا
اس وقت جب لین دین کا حساب ہوگا ۔۔۔۔ جب جمع
تفریق ہوگا، وہ تو جب ہوگا تب ہوگا مگر اس دنیا میں آخری
سانس تک میں ان کا پلہ گراں محسوس کرتا رہوں گا۔

ادبی دنیا پر ان کا جو قرض ہے، اسے ادا ہونا چاہئے جس قدر بھی ادا ہو سکے۔ مگر
مجھے بے دلی پھر یہاں سے ڈر لگتا ہے، بہت سی شخصیتیں جنھوں نے علم و ادب، شعر و سخن اور
زبان و اسلوب کو سنوارا اور نکھارا ہے اب ہماری ادبی تاریخ کا گم گشتہ باب ہو کر رہ گئی ہیں۔ جو قوم
اور جو نسل اپنے سابقین کے کارناموں کو یاد نہیں رکھتی، یقین جانئے وہ خود بھی بھلا دی جاتی ہے۔ فراموش
کردگی کی یہ روش نہ صرف صاحبان علم و فن کی دشمن ہے بلکہ ہماری زبان اور اس کے سرمایۂ ادب کو بھی طاق نسیاں بنا دیتی ہے۔
ایسے میں ہمیں ادارۂ سہیل کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ اس نے کلام حیدری کی شخصیت اور ان کے فکر و فن سے
متعلق ایک خصوصی شمارے کی اشاعت کا تہیہ کیا اور اپنے سخت نامساعد مالی حالات اور گوناگوں مزاحمتوں کے
بعد بھی اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔

جہاں تک اس یادگار مجلے کی اشاعت و ترتیب میں میری محنت و جانفشانی کا مسئلہ ہے تو میں صرف
یہ عرض کروں گا، میں اسے ایک ایسا قرض تصور کرتا ہوں جو اردو زبان و ادب سے تعلق
رکھنے والے تمام افراد پر عائد ہوتا ہے ۔۔۔۔ میں اس کام کو فرض کفایہ
سمجھ کر انجام دے رہا ہوں۔ اس قرض کی پہلی قسط ادا کر کے میں علم و ادب
کے تمام شیدائیوں کو پکار رہا ہوں۔

علیم اللہ حالی



کلام حیدری

سوانحی خاکہ اور علمی و ادبی سرگرمیاں

نام ـــــــ محمد کلام الحق حیدری عرف کلام حیدری

والد کا نام ـــــــ محمد انعام الحق

والد کا پیشہ ـــــــ پولیس آفیسر

والدہ کا نام ـــــــ نور العین

جائے پیدائش ـــــــ موضع رانکڑ ضلع مونگیر (بہار)

نانیہال ـــــــ موضع رانکڑ ضلع مونگیر (بہار)

دادھیال ـــــــ موضع پچنہ، ضلع مونگیر (بہار)

تاریخ پیدائش ـــــــ ۲ر اپریل ۱۹۳۰ء

تاریخ رحلت ـــــــ ۳ر فروری ۱۹۹۴ء

ابتدائی تعلیم ـــــــ قصبہ جلیسر ضلع ایٹہ (یوپی) زیر نگرانی ڈاکٹر علی حسن مرحوم (نانا)

استاذ ـــــــ جناب اللہ بخش، قصبہ جلیسر ضلع ایٹہ (یوپی)

انگریزی کے استاذ ـــــــ جناب عبد الحنّان، (بہار)

میٹرک ـــــــ ۱۹۴۵ء ۔ پٹنہ مسلم ہائی اسکول

آئی کام ـــــــ رپن کالج کلکتہ ۔ ۱۹۴۷ء

بی۔اے آنرز ـــــــ رانچی کالج، رانچی ۔ ۱۹۵۰ء

ایم۔اے اردو ـــــــ پٹنہ یونیورسٹی ۔ 19

لکچرر ـــــــ پورنیہ ڈگری کالج ۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۸ء تک

ملازمت سے استعفےٰ دیکر گیا میں کنکریٹ انڈسٹری قائم کی۔ ۱۹۵۸ء سے تا دم حیات یہی مشغلہ رہا

شادی ـــــــ ۱۹۵۶ء میں شاہدہ خیر (بنت ڈاکٹر ابا لخیر مرحوم) سے ہوئی

اولاد ـــــــ صرف ایک لڑکی ۱۹۵۸ء میں ـــــــ نگار ینہ حیدری

داماد ــــــــ انیس احمد ــــــــ انجینیر
نواسیاں ــــــــ آفرین احمد اور سارہ احمد

سماجی اور علمی مصروفیات

(i) گیا میں اردو کالجوں کے قیام میں سرگرم عمل رہے۔
(ii) اردو گرلس مڈل اور ہائی اسکول گیا کا قیام
(iii) تقریباً اٹھارہ سال تک مگدھ یونیورسٹی (بودھ گیا) کے سینیٹ ۔ دیگر کمیٹیوں اور کاسنل کے ممبر رہے۔
(iv) متعدد تعلیمی اداروں کے سکریٹری اور دیگر اعلیٰ رکن کی حیثیت سے فعال رہے۔
(v) کلچرل اکادمی قائم کی ــــ اس کے ذریعہ ادیبوں، فنکاروں کو اعزاز و اعتراف کا سلسلہ قائم کیا۔
(vi) انجمن ترقی اردو بہار کے جنرل سکریٹری رہے۔
(vii) انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن رہے۔

ادب و صحافت

(الف) افسانوی مجموعے: ــــــــ

(۱) بے نام گلیاں: اشاعت ۱۹۵۵ء
کہانیاں: کھلیان اور سلاخیں، راہی نے بچے پہچانا، قیامت، روپ بہروپ، دعا، بے نام مثلث، مامتا، مستقبل اور ایٹم بم، مسکراہٹ کے پیچھے، میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ بھوا محبت بھی ایک حقیقت، دو آنکھیں ایک کھڑکی، مجرم۔ (کہانیوں کی مجموعی تعداد ۱۴)

(۲) صفر: اشاعت ۱۹۶۴ء
کہانیاں: عنابی کانچ کا ٹکڑا، سپنی، زندانی، درد، واپسی، ادھار، حادثہ، بابو، روشنی، بھیک، اسیر، تلاش، اپنی آوازیں، کس کی کہانی، صفر۔ (کہانیوں کی مجموعی تعداد ۱۶)

(۳) الف لام میم: اشاعت ۱۹۶۹ء
کہانیاں: الف لام میم، قاتل، کچھ مت بولو، باز وکیوں کٹے، جا شیائی آدمی، کون جانے، کہانی نامرد، شادی، خواب، تاریخ اور جگہ، خودکشی، اب۔ (کہانیوں کی مجموعی تعداد ۱۴)

(۴) گولڈن جبلی: اشاعت ۱۹۸۳ء
کہانیاں: گولڈن جبلی، رات کتنی باقی ہے، ایک سال اور سامنے سے ہٹا، روشنی کی ضمانت، وہ ایک ہزار آٹھ سو پچانوے، ٹرنک سے ایکھ ہوں، ستر اور بے ستری، نوح کا بیٹا، کون ہو

بابا کہاں ہو، جزیرے، اور درویش کی صدا، قہقہے، چیخیں (کہانیوں کی مجموعی تعداد ۱۴)
(کتاب کے اخیر میں مختصر خود نوشت سوانح بعنوان۔ اپنی زندگی کے کچھ سچ۔ بھی شریک اشاعت ہے)

۷) تنقیدی مجموعہ: **تفہیمات** : اشاعت ۱۹۸۳ء
مقالوں کے عنوان: جوش کی انقلابی شاعری، ولی کی غزلوں کی ایک خصوصیت، جب کھیت جاگے، منٹو، تخلیقی عمل۔ ایک جائزہ، تصورات عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں، حسرت اور صحافت، پریم چند کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے۔ (مقالات کی تعداد ۔ ۸)

۸) منتخب اداریے (ہفتہ وار مورچہ سے) عنوان دار اشاعت ۱۹۷۹ء
موضوعات: زبان، ادب اور تعلیم / فرقہ وارانہ فسادات / کمیونسٹوں کے بارے میں / لسپتیاں / کچھ کانگریس کے بارے میں / آر ایس ایس، جماعت اسلامی، جن سنگھ / ناقابل فراموش ایام (تعداد ۷)

ادبی تبصروں کا مجموعہ: **مبصلا** اشاعت ۱۹۸۰ء
مندرجہ ذیل مطبوعات پر تبصرے:
تخلیقی عمل ـ وزیر آغا / سہ ماہی سطور (جون اگست ۸۰ء) کمار پاشی / شعور ـ مارچ ۷۸ء میں راز / تصورات عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں / وزیر آغا ـ معیار دوسرا شمارہ ۱۹۷۷ء شاہد ماہلی / ۷۷، ۱۹ء کا شعری ادب ـ ساحل احمد / دو غنڈے (افسانے) مظفر حنفی / پہلی آواز (افسانے) رتن سنگھ / معنی کی تلاش (تنقید) وہاب اشرفی / غزل ـ پس منظر، پیش منظر، ساحل احمد / ادبی تحقیق ـ رشید حسن خاں / وجدان، عصمت جاوید / شاخ لہو ـ شفیع مشہدی / دائرے سے باہر شفیع مشہدی / بیانات ـ جوگندر پال / کائنات غم، فرحت قادری / سفر جلتے دنوں کا / علیم اللہ حالی / صحرا میں اذان، گوپال متل / دبستان آتش، شاہ عبدالسلام / نغموں کا سفر جیلانی بانو / تبسم ـ رام لعل نابھوی / لوح بدن، پریم کمار نظر / شعلوں کا شجر، چندر بھان خیال / شجر صدا، عتیق حنفی / تنکے کا سہارا، شکیلہ اختر / راستے اور کھڑکیاں، انور خاں / نشاد سنگ، بلراج کومل / بشارت، اظہار اثر / جلوہ ہائے حرمت الاکرام / مراٹھی کا مطالعہ ـ یونس اگاسکر۔

ادبی تنقید کی جھلکیاں: **مضامین** اشاعت ۱۹۷۹ء
(۱۹۷۰ سے ۱۹۷۸ء تک کی مدت میں لکھے گئے تنقیدی شذرات کا انتخاب ـ مرتبہ: نوشابہ حق)

تنقیدی کتاب: **ادب اور تصوف** اشاعت ۱۹۸۴ء جلد اول ـــ شاعری

ارتقا سیریز (۱۹۷۶ سے ۱۹۸۰ء تک کے اردو کے اہم افسانوں کا انتخاب)
شمولہ فن کار (پاکستان) غلام الثقلین نقوی / انتظار حسین / علی حیدر ملک / احمد داؤد / خالدہ حسین / مسعود اشعر (ہندوستان) احمد یوسف / غیاث احمد گدی / جوگندر پال / کلام حیدری / شفق / شوکت حیات / سید

محمد اشرف/حسین الحق/عبدالصمد/م ق خاں/نثار احمد صدیقی

(ح) ترجمہ: تذکرہ شعرائے گجرات ـــــ (فارسی سے اردو ترجمہ)

اعترافات: متعدد مشاہیر اہل قلم کے مقالات کے علاوہ ڈاکٹر اسلام عشرت کی ایک کتاب ـــ "کلام حیدری بحیثیت افسانہ نگار" (اشاعت ۱۹۸۵ء)

(ط) تالیفات:

(۱) جمیل مظہری نمبر، ماہنامہ سہیل گیا/ دو جلدوں میں
(۲) بھاگلپور کا ادبی ماحول نمبر، ماہنامہ سہیل گیا
(۳) احتشام حسین نمبر، ماہنامہ آہنگ گیا
(۴) فکشن نمبر، ماہنامہ آہنگ گیا

(ی) صحافت:

(۱) ماہنامہ نغمہ و نور، کلکتہ ۱۹۴۷ء
(۲) ہفتہ وار مورچہ، گیا ۱۹۶۳ء
(۳) ماہنامہ آہنگ، گیا ۱۹۶۶ء

(ک) کالم نگاری:

(ہفتہ وار بودھ دھرتی گیا میں کئی سال تک "نف نوٹس" کے عنوان سے کالم نگاری کی۔

"ہم لوگوں پر سے ایک سال کے اندر دس بارہ سال گذر گئے۔
ہم گیا سے بول رہے ہیں؟ نہیں۔ ہم زمین کے اندر سے بول رہے ہیں۔ آواز ملتی ہے آپ کو؟
میرے یار ـــــ دنیا میری سمجھ میں نہیں آئی
تیری سمجھ میں آئی کیا؟ ـــــ حقیقت تلاش کرتا رہا۔
خدا کو ڈھونڈتا رہا ـــــ اس کی رحمتیں ملیں، وہ نہ ملا۔
زندہ ہوں یار ـــــ مگر اب بھی کیوں زندہ ہوں؟"

(اقتباس: جوگندر پال کے نام ایک خط ۱۱ر جنوری ۱۹۹۴ء)

میں اور میرے افسانے

کلام حیدری

یہ عنوان پڑھنے والوں اور ریڈیو سننے والوں کے لئے نیا نہیں ہے۔ اور ریڈیو والوں کے لئے بھی نیا نہیں ہے۔ اس عنوان کے تحت لکھنے کی دعوت دینا ایک طرح کی دھمکی ہے کہ صاحب! آپ افسانہ نگار ہیں، شاعر ہیں یا کچھ اور ہیں ـــــ اور کسی بات ہیں نہیں مانتے تو چلئے خود ہی "میں" کی تعریف بھی کیجیے۔ اور خود ہی یہ بھی بتائیے کہ آپ کے افسانے کیا ہیں؟ اور کیسے ہیں! آپ نہ ہوتے تو کیا ہوتا، آپ کے افسانے نہ ہوتے تو آپ کی زبان کا کیا بگڑتا؛ پھر بھلا آپ اور آپ کے افسانے ـــــ یہ دونوں کے دونوں "کیوں" ہیں" چلئے آپ ہوتے تو ہوتے یہ افسانے کیوں

بھائی بات یہ ہے کہ غالب خستہ کے بغیر یعنی میرے بغیر کوئی کام بند نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اس "میں" کا ہونا کوئی خاص بات نہیں۔

لیکن میرے افسانے نہ ہوتے تو ـــــ

قصہ یہ ہے کہ غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا۔
یعنی تخلیق پر اگر اختیار نہیں ہے تو یہ بات پکی ہے کہ میں نہ ہوتا تو بھی افسانے ہوتے اور آپ چاہے مانیں یا نہ مانیں کوئی نہ کوئی وہی سب لکھتا یعنی ویسے ہی افسانے لکھتا جیسے میں نے لکھے ہیں۔ اور آگے لکھنے والا ہوں۔ یہ "میں" جب نام سے شناخت کیا جاتا ہے تب ہی دقت ہوتی ہے اور افسانوں کو اس نام والے "میں" کے گرد ہالہ بناتے ہوئے آپ دیکھتے ہیں۔ تب ہی آپ کو اس نام والے "میں" سے دلچسپی ہوتی ہے ـــــ

ورنہ "میں" کیا، میں تو اس دنیا میں سزا بھگتنے کے لئے آیا ہوں۔ بلکہ آیا نہیں ہے، لایا گیا ہے۔ اور جب جو کوئی "میں" اس دنیا میں مبتلا ہے کہ "میں"، نہیں کوئی ہے تو اس کے لئے ابتلا کے سوا کیا ہے۔ ہر "میں" کو یہ عجیب خواہش ہوتی ہے کہ اس کا "میں" جلی جلی لکھا ہو ـــــ یعنی بس چلے تو دو چار ہزار میل لمبی اور چوڑی دیوار پہ وہ نہ صرف "میں" لکھ دے اور یہی نہیں وہ تو کنگا کر بھی اس شکل میں بھلا دے کہ جس شکل میں ـــــ "میں" ہے۔

غرض کہ مدعا تھا کہ "میں" بہت خراب چیز ہے یہ اپنی حد سے پاؤں باہر نکال دیتا ہے۔ تو ابلیس بن جاتا ہے۔
"میں" تو صرف ایک ہے، ذات باری، رب العالمین، رحمٰن، رحیم ـــــ اور اس کے علاوہ جتنے "میں" ہیں وہ بس

یوں ہی سے، میں، میں۔

میں جس کا نام کلام حیدری ہے بوعلی شاہ قلندر کے اس قطعہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

حیدری ام، قلندرم، مستم
بندہ مرتضیٰ علی ہستم
پیشوائے تمام رندانم
من سگِ کوئے شیر یزدانم

مالک اور سالک کے صحیح متعلقین کو پہچانتا ہوں۔ جانتا ہوں، مانتا ہوں اور باقی تو آتے جاتے رہتے ہی ہیں ان سے حیدری کی نہ نسبت ہے اور نہ مطلب۔ اور دنیاوی عروج و شہرت سے مالک ہی کو مطلب نہیں رہا۔ تو بندے کو کیا ہوگا؟

۱۹۸۰ء اپریل میں عمر کی نصف صدی یعنی ۵۰ سال گذر چکا۔ تجربوں کے تنوع کی بابت لکھنے لگوں گا تو ریڈیو والے قسطوار براڈ کاسٹ کرنے لگیں گے اور مجھے قسطوں سے ہمیشہ کی چڑ رہی ہے۔

میرے زمانے میں ایم اے کے امتحانات بھی دو قسطوں میں ہوا کرتے تھے۔ یعنی ۵۰، ۵۱، ۵۲ وغیرہ میں ـــ پارٹ one پارٹ Two ـــ تو میں نے امتحان قسطوں میں نہیں دیا۔ یعنی ایک ہی بار دونوں پارٹ سے نجات حاصل کی۔ پھر ایک موقع آیا جب B.L کا امتحان دینا ـــ دو پارٹ ـــ میں نے ایک بار میں دیدیا ـــ نتیجہ؟ نتیجے سے غرض نہیں اور بے غرض ہو کر کچھ کیجئے تو جانے کیوں نتیجہ بھی بہت اچھا ہو جاتا ہے۔

اب آپ تصور کیجئے اس کا جس کے مولوی صاحب نے کان کھینچ کھینچ کر بڑے کر دیئے۔ اور گرو جی نے ڈیوڑھا سوایا، اٹھیا وغیرہ کے پہاڑے یوں صف بنا کر رٹوائے ہوں کہ جیسے یہ بھی میدان جنگ میں جانے کی ڈرل ہو۔ پر دادا شاعروں کے استاد رہے، وکالت کے نامی آدمی ہوئے، دادا کو بھی وکالت ہی بھائی ـــ والد صاحب کو شہسواری کے شوق نے پولیس آفیسر بنا دیا۔ ماں کو بہادر، عبادت گذار اور خدا کے آگے ہاتھ پھیلانے والی میری ماں نے مجھے وہ سب کچھ دیا۔ جو ماں دیتی ہے۔ اور ایک چیز بڑی قیمتی دی ـــ خوف خدا ـــ اور یہ سبق کہ خدا کے سوا کسی سے کچھ نہ مانگنا ـــ اور خدا نے کچھ مانگنے پر اور کچھ کیا بہت کچھ بلا مانگے دیا۔ اس بہت کچھ کی تفصیل بیان کرنے کی اس قلم میں قوت نہیں۔

اپنی تاریخ پڑھی تو ـــ

اب تاریخ کیا لکھوں کہ میں تاریخ داں نہیں۔

اللہ کے بہت کچھ دینے پر مجھے دوست نما لوگوں سے دشمنی، حسد، جلن بھی ملا۔ مجھ کو ہاتھ پکڑ کر اوپر اٹھا اس نے مجھے نیچے ہی گھسیٹنے کی کوشش کی اور یہ نہ سوچا کہ ان بازوؤں میں بندۂ علی کی قوت بھی تو ہوگی۔

نانا ڈاکٹر ـــ انہوں نے مجھے قناعت پسندی اور انکسار بخشا۔ ماموں ڈاکٹر ـــ انہوں نے غلط باز کو سیدھے غلط کہنے کی عادت ڈال دی۔

اور سوچنے کی ایسی عادت خود بخود پڑ گئی کہ دنیا سوتی ہو تو میں گھنٹوں آنکھیں بند کئے بستر پر تکیہ لگائے سوچا کرتا ہوں۔ ہر بات کی اپنی توجیہ، ہر بات کی اپنی تشریح، ہر بات کی اپنی توضیح۔

دوست نما لوگ پریشان، نہ حسد سے ڈرتا ہے نہ دشمنی سے ڈرتا ہے۔ نہ دشمن سے خوف کھاتا ہے اور نہ کو صحیح فراز داز، پہ کہہ دیتا ہے۔ اپنے سر اسیمہ، روپیے کما ہے اور سیلاب لئے خرچ کرتا ہے۔ اور کبھی اس کا کوئی کام رکتا ہے۔

رکھتا۔ پہاڑ سے سب جانتا ہے مگر جوڑ گٹھ نہیں کرتا ہی
جیسے جانتا ہے۔ سستے کیا ہوٹل، سے لے کر فائیو اسٹار ہوٹل
تک روشندار رہتا ہے۔ کھادی، ہینڈلوم کے کُرتے پاجامے
میں کلام حیدری لگتا ہے۔ قیمتی سے قیمتی سوٹ میں بھی کلام
حیدری ہی ہوتا ہے۔ کپڑے پہنتا ہے قیمتی سے قیمتی کپڑوں
نے بھی کلام حیدری کو نہیں پہنا ہے۔ اسکول کالج کے
ساتھی سے بڑھ کر کسی کو دوست مانتا ہے تو بس اپنی
برادری کے ہی لوگوں کو ـــ یعنی ادیب، شاعر، اور وہ
جو پڑھے لکھے ہیں۔ کوئی پوچھے کیوں؟ اسکول، کالج کے
ساتھی بچوں کی معصومیت کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔
پڑھنے لکھنے والوں سے سیکھنے اور جاننے کے لئے
ملتا ہے۔

یہاں تک آپ کو کوئی "میں" ملا۔ نہیں ملا
ہوا یہ کہ یہاں تک کلام حیدری کا ذکر تھا۔ اور یہ ذکر اب
ختم ہوتا ہے۔ کیونکہ اب ذرا ـــ اس کے افسانوی یعنی "اب
میں" کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ لیکن ٹھہریئے۔ افسانوں میں
"میں" کو تلاش کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ یہاں تک کہ میں
اسے ناممکن سمجھتا ہوں ۔ ہوتا ہے یہ کہ ایک ہی افسانے
میں "میں" بہت سے روپ میں آتا ہے اور آپ
کسی ایک پر انگلی رکھ کر نہیں کہہ سکتے کہ ـــ یہ رہا "میں"
قلم پکڑ کر گھسیٹنا تو کلام حیدری نے ۱۹۴۵ء ۱۹۴۶ء
میں شروع کر دیا تھا مگر اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ مطلب یہ
کہ جلی تو جلی خفی میں بھی نہیں تھا۔ بلکہ مخفی تھا۔ ۱۹۴۶ء
میں صرف ایک کہانی ایسی جدید اردو کلکتہ میں آئی جس
میں لکھنے والے کا نام تھا۔ لیجئے کلام حیدری آگیا۔
میں مستی و قلندری میں سرشار رہا ہوں۔
میٹرک ـــ پٹنہ
آئی کام ـــ کلکتہ
بی۔ اے۔ آنرز ـــ رانچی
ایم۔ اے ـــ پٹنہ
بی ایل ـــ گیا
ان شہروں شہروں میں جا کر ڈگریاں لینے کا
شوق نہیں تھا۔ یہ میری قلندری تھی۔ جو یہاں اور وہاں
لے جایا کرتی تھی۔

ایک دوست کلکتے میں تھا جس کے ساتھ وہ معتوب
و مستحدی دنیا دیکھی کہ جسے حسین کہتے ہیں۔ اور وہ بازاری
دو چار نہیں، شاید ایک سال کا کم ہی دن ایسا ہوگا جب
میں بارہ بجے رات سے چار بجے صبح تک اس اندھیری
اجالی دنیا کے جلوے دیکھنے نہ جاتا ہوں گا۔ اور میرا یہ
دوست ـــ کہاں ادھار میں آگیا ہے۔ اصل آپ
میں، وہ بڑا آدمی تھا، جس نے ایک محبوبہ کے لئے بڑے
شہر میں پوری بلڈنگ خرید کر دے دی جس نے کسی
آبرو کے اشارے پر لاکھ لاکھ کی دوکان اسے دے دی
میں اس پوری شخصیت کا احاطہ اکیلے ایک کہانی
"ادھار" میں کیسے کر سکتا تھا۔ میں اس کا مقروض
اب بھی ہوں۔

"سچی" کہانی کئی انتخابات میں شامل ہے اور اس
کہانی میں ایک آدمی کے اندر اچھا اور برا دونوں کے
موجود رہنے کا ذکر ہے۔ صرف SITUATIONS ہی ہیں
جو کبھی اچھے کو ابھارتے ہیں، کبھی برے کو۔
کس کی کہانی صرف المیہ نہیں ہے۔ صرف ماضی
پرستی نہیں ہے، احساس کے جاگنے کا وہ لمحہ ہے جب
آدمی کو اچانک اپنی سترپوشی کا خیال آتا ہے۔ اس سے پہلے
اس سے پہلے تو آدم اور حوا جنت میں سیر سپاٹا کر

رہے تھے۔ افرا آگہی "کے پیڑ سے دور تھے ـــــ اور
پھر وہ سسک کر رو رہا ہے کیوں کہ اس آگہی کی
ابتدا تھی۔ اور زمین پہچاننے کا عمل تھا ـــــ
INFANCY کی جنت بہتر ہے یا آگہی کا دشت؟
دکس کی کہانی، کا قاری اس سوال کا جواب دے گا؛
نامرد۔ کیا وہ ہے جس نے پولیس آفیسر کو اپنی بیوی کو
اٹھا کر لے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر لوٹتے دیکھا اور مطمئن
ہو کر اس نے کہا کہ سو جا ـــ یا وہ شریف آدمی جو یہ سب
دیکھ رہا تھا مگر اس سماجی ناانصافی کے خلاف آگے نہیں
آیا ـ چھپ گیا۔ ایسے میں تو مجرم بہادر بن جاتا ہے
کیا سماج میں مجرموں کو بہادر سمجھنا نامردی سے کچھ
کم ہے۔

روشنی میں کردار کو EXPLAIN کرنے کے لیے
جس EDIT کا استعمال کیا نہ جانے کیوں میرا ہر نقاد
MISS کرتا ہے۔ اور مجھے کہنا پڑا ہے کہ میں نقاد کی آنکھوں
میں روشنی اور اس کے SKULL میں دماغ ڈال
دوں۔

حاشیائی آدمی؛ میں "جسٹی"، ـــ کلید ہے اور
اسے گنگا کے پوتر پانی نے اپنے ـــ کیوں کہ اس جسٹی کا
اس سے باہر کھولنے والا کوئی نہیں تھا۔ گنگا کے سوا اور
کون ہے! اب میں گنگا کے بارے میں بھی اس کہانی میں
بس عام کہانی لکھنے والوں کی طرح لکھتا تو پھر میں، کلام
کلام حیدری کیوں پڑتا؟

کون جانے ـــ اب میں سب کہانیوں کی KEYS
مہیا کر دوں تو اپنا نام کلام حیدری کیوں رکھوں ـــ PROFFESSOR
AN EXPERIENCED کیوں نہ رکھ دوں؟
ایک طالب علم قسم کے نقاد جن میں جوہر ہے نے
لکھا ہے کہ کلام حیدری کی شخصیت دیو قامت ہے کیونکہ
وہ کئی قسم کے کام کرتے ہیں، مختلف شعبہ ہائے زندگی میں
ACTIVE رہتے ہیں۔ اسی سے اتنے بڑے افسانہ نگار
نہیں ہو سکے جتنے جیسے ہو سکتے تھے۔

یعنی میرے تجربات کے تنوع، میری کہانیوں میں طرح
طرح کے موضوعات اور کئی طرح تکنیک اور کئی طرح کی
تکنیک کو ملا کر ایک افسانے میں تخلیقی طور پر برتنا ـــ یہ
مجھے دیو قامت بناتے ہیں ـــ بڑا افسانہ نگار نہیں بناتے
بھائی بڑا افسانہ نگار اردو میں کون ہے؟
اگر کلام حیدری کو آپ افسانہ نگار ہی مان لیتے ہیں
تو یہ بڑا انعام ہے۔

افسانوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے ـــ
الف لام میم کا ذکر نہ کروں ـ میرے قارئین اور سامعین
یعنی پڑھنے والے اور مجھے سننے والے مطمئن نہیں ہوں گے
ہندوستان پاکستان کی سرحدوں کو پار کر جانے والا
یہ افسانہ درجنوں تبصروں سے سجایا گیا ہے۔
اس کے ان ٹکڑوں کو سیاق و سباق سے الگ
کر کے QUOTE کر دیا جاتا ـ کہ لکھا ہے افسانہ نگار تقریر
کر رہا ہے ـــ حالانکہ وہاں پر یہ دکھایا گیا ہے کہ
ایک آدمی مختلف کام کر رہا ہے۔ جلسہ کر رہا ہے، جھنڈا پھہرا رہا
ہے۔ تقریر کر رہا ہے۔ یہ مناظر میں یہ رننگ کمنٹری بن
گئے ہیں۔ ان کو EDIT کرنے کا کام افسانہ نگار نے نہیں کیا
ہے، وہ قاری کو کرنا ہے اور مجھے نقاد سے تقاضا کہ ان کو EDIT
کر کے فاجرا، بناؤ ـــ

فاجرا بنانے کا کام تخلیق نہیں ہے یہ ان کا کام ہے جو ٹیلر
کے سارے بٹن ٹھیک بند رکھتے ہیں۔ اور یہاں ـــ اپنا
گریباں بھی چاک ہے ـــ اور دامن یزداں بھی چاک۔
ہائے میرے افسانے۔

اپنی زندگی کے کچھ سچ

کلام حیدری

مجھے اپنی تاریخ پیدائش یاد نہیں ہے لیکن مجھے
ی ماں نے بتایا کہ میں جولائی سنہ ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوا ۔
سے پہلے میری ایک بہن پیدا ہوئی تھی ، یعنی میری آپا
ڈھائی تین سال کی عمر میں ، اپنے بھائی کی آمد کا انتظار
بغیر دنیا سے چلی گئی ۔ اس کا نام قرۃ العین تھا ۔ میں اپنی
ائش سے لے کر آج تک آپا قرۃ العین کو تلاش کرتا ہوں .
وہ مجھے آج تک خوابوں کے سوا اور کہیں نہیں ملی ۔ میری
العین آپا ! جن کی میں کوئی تصویر نہیں بنا سکتا ، ہر چند
را تصور ہمیشہ کچھ آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا ہے ۔
ن میری آپا قرۃ العین کا کوئی مجسمہ نہیں بن سکا ۔ چار پانچ
ل کی عمر سے لے کر آج تک ـــــــ میرا تصور
آپا کو ڈھونڈتا رہا ہے ۔ شاید اس اذیت نے مجھے مرنے
ید پتا ملے گی ۔

میں نے اپنے نانا کے ساتھ رہ کر پانچ برس کی عمر سے
بارہ برس کی عمر تک تعلیم پائی ۔ قصبہ جلبیر کے محلہ نوشیان
ہر مکان کی ایک ایک اینٹ مجھے آج تک یاد ہے ، اس
منہدم اور کھنڈر قلعہ بھی مجھے یاد ہے ۔ اختر منزل کی بڑی
ت بھی یاد ہے جو بذات خود ایک محلے کی حیثیت رکھتی

رکھتی تھی ۔ وہ کسی بہت بڑے جاگیردار کی ملکیت تھی ۔
جس کے احاطوں میں مونگ پھلیاں لگی تھیں جلیبر گھنگھروؤں
کا شہر ہے ۔ اور ان گھنگھروؤں کی موسیقی آج بھی میرے
کانوں میں گونجتی رہتی ہے ۔

میں اپنی گوالن میا کی خوشبو کو بھی نہیں بھول سکتا
شیر خوارگی کے زمانے میں میری وہ گوالن میا جس کا بیٹا
کلدیپ مجھ سے شاید چند دن چھوٹا یا بڑا ہوگا ۔ بھی مجھ
سے نہیں بھلایا جا سکتا ۔

اسکول کے تین چار برسوں میں ماں باپ سے الگ
رہ کر گمراہ ہونے اور بھٹکنے کے سارے راستے کھلے رہتے
ہیں ۔ لیکن نہ جانے ایسا کیوں ہوا کہ میں بھٹکا تو گورنمنٹ
اردو لائبریری پٹنہ کی بلڈنگ میں پہنچ گیا ۔ جہاں افسانوں
ناولوں ، داستانوں کی کتابیں اور رسالوں کے فائل
سے چن چن کر صرف افسانے پڑھتا رہا ۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شام
کو لائبریری اس وقت کھلتی جب میں اس کے برآمدے میں اس
کے کھلنے کا دس دس منٹ ، پندرہ ، پندرہ منٹ تک
انتظار کرتا رہتا ، اور جب لائبریری کا آخری دروازہ بند ہو
جاتا تو باہر چلا آتا ۔ اسکول کے ان چار برسوں میں آٹھواں

کلاس ٹپنہ مسلم ہائی اسکول سے پاس کیا لیکن نویں جماعت میں رام موہن رائے سیمنری میں داخلہ لیا یہ ۱۹۴۳ء تھا۔
ابا مرحوم کی پوسٹنگ اس سے پہلے داناپور میں تھی۔ جہاں ملٹری کنٹونمنٹ تھا۔ اور چھوٹی چھوٹی چھٹیوں میں بھی وہاں جاتا تو ٹامیوں کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں اس وقت کچھ ذہن میں کبھی اپنی غلامی کا شدید احساس ہوتا۔ داناپور اسٹیشن پر آنے جانے والی گاڑی کے ڈبوں پر ONLY FOR EUROPIANS لکھا ہوا دیکھتا تو مایوس کن سی اضمحلال کیفیت طاری ہو جاتی کھگول ریلوے انگریزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ اس سنیما ہال میں بھی انگریزوں کے لئے ایک الگ مخصوص کلاس تھا جس میں بیٹھنے کی مجھے خواہ مخواہ خواہش ہوتی۔ میں نے نشے میں چور ٹامیوں کو علم تم سے لڑھک کر گرتے دیکھا۔
داناپور دکھگول کی ریلوے کالونی کالان اور اس کی چمن آرائی اس وقت دیکھنے کے لائق ہوا کرتی تھی۔ وہاں میرا ایک دوست منظور عالم، جس کے یہاں رسالوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ کیوں کہ اس کے چچا "خیام" وغیرہ میں افسانے لکھا کرتے تھے۔ رحمت علی صابر نوحلوی لاہور سے نکلنے والے مقبول ماہناموں اور ہفتہ واروں میں کثرت سے چھپتے تھے۔ منظور عالم اور میں۔ ریلوے کالونی کے لان اس کے فواروں اور اس کی چمن آرائیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے شام کو وہاں ضرور جاتے۔ اور ڈی ایس داناپور آفس کے ارد گرد لان میں بیٹھی اینگلو انڈین عورتوں اور لڑکیوں کو اس طرح دیکھتے کہ جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔ یا کسی FAIRY LAND سے ابھی ابھی اتر کر آئی ہوں اپنی غلامی کا شدید گہرا احساس اس ماحول میں جانے کدھر سے جڑ پکڑتا جا رہا۔

یہاں تک کہ اچانک ۱۹۴۲ء میں ، جمعہ کا دن تھا الفسٹن سنیما پٹنہ میں فضلی برادران کی فلم "چورنگی" کا شو ہو رہا تھا۔ کہ انقلابیوں کا وہ جلوس سنیما ہاؤس پر ٹوٹ پڑا۔ جس جلوس پر پٹنہ سکریٹریٹ کے پاس فائرنگ ہوئی تھی۔ اور کئی نوجوان شہید ہوئے تھے۔ فلم بند ہو گئی۔ الفسٹن سنیما ہاؤس کے سب دروازے کھل گئے تھے لو ہاتھوں میں تین رنگے جھنڈے لئے ہوئے لوگ ہال میں داخل ہو گئے۔ پتہ نہیں کیسے ایک جھنڈا میرے ہاتھ لگ گیا اور اسے لئے جب میں ہال کے باہر انقلاب زندہ باد کے نعروں کے درمیان نکلا تو اس وقت تک پورے پٹنہ پر ٹامیوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ بی این کالج کے پاس انہوں نے ایک بیریر بنا دیا تھا۔ ایسے بیریر شاید شہر کے مختلف حصوں میں بنائے گئے تھے۔ مجھے پوربی پٹنے کی طرف جانا تھا اس لئے میں نے اس بیریر کو پار کرنا چاہا تو ایک ٹامی نے مجھ سے پوچھا گاندھی والا یا جناح والا، مجھے گاندھی اور جناح کا فرق معلوم نہیں تھا۔ میں نے کہا، جناح والا اس نے مجھے پار جانے دیا اور گاندھی والوں کو نہ صرف یہ پکڑ لیا بلکہ بے تحاشہ ان کو مارنا شروع کیا۔ جب تک اپنے گھر میں نہیں پہنچا اس وقت تک راستہ بھر یہ سوچتا رہا تھا کہ گاندھی اور جناح میں کیا فرق تھا کہ گاندھی والے نے ـــــ جناح والے کو چھوڑ دیا اور گاندھی والے کو پکڑ لیا گھر میں پہنچ کر مجھے اس فرق کا پتہ چل گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ میں جناح والا نہیں ہوں، گاندھی والا ہوں۔
دوسرے دن رام موہن رائے سیمنری کے دونوں گیٹوں پر طلبا کا بڑا جلوس تھا۔ اور گیٹ بند تھے تو میں نے گیٹ کے ایک تالے کو ایک روڑے سے پتھر سے مار مار کر توڑ دیا۔ گیٹ کھلتے ہی آگے میں تھا اور میرے پیچھے ہزاروں

غلامی سے نجات پانے کے لئے بے قرار لوگ تھے۔

چند دنوں کے ہل چل کے بعد بے شمار لوگ جیلوں میں تھے، اور پٹنہ کے ہر کالج کے میدانوں میں ٹامیوں کی فوج شین گنوں اور رائفلوں سے مسلح پڑاؤ ڈالے ہوئی تھی نہ سے ہر جگہ جانے کے راستے مسدود تھے۔ کئی دنوں بعد سٹیشن سے ایک بس ملی تو اس سے بہار شریف پہنچا بہار شریف سے ایک ٹم ٹم پر بہ بگھا کے لئے روانہ ہوا تو ایک ہی میل پر ٹم ٹم کا ایک چکا نکل گیا۔ ٹم ٹم کی سواریاں سڑک پر لڑھک گئیں۔ ان میں میں اور میرے ایک خالہ زاد بھائی تھے۔ وہاں سے آٹھ میل پیدل چل کر ہم دونوں ایک چک پہنچے۔ جہاں میری خالہ کا گھر تھا۔

میری یہ خالہ اردو، اور فارسی کے علاوہ تاریخ پر اتنا عبور رکھتی تھیں کہ وہ آئی اے، اور بی اے تک کے گھر کے طالب علم کو فارسی پڑھاتی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم کی پوری تاریخ ان کو اس طرح یاد تھی کہ جیسے وہ ہر محاذ پر لڑ رہی ہوں۔ دوسری جنگ عظیم میں انگریزوں سے انتہائی نفرت کی بنا پر ہٹلر سے انہیں اتنی محبت اور عقیدت تھی کہ وہ ہر لمحہ ہٹلر کی اقبال مندی کی دعائیں مانگا کرتی تھیں اور چھوٹے بڑے تمام محاذوں کی جو اطلاعات ان تک اخباروں سے پہنچتی تھیں، وہ انہیں اس طرح یاد تھیں جیسے وہ ہر چھوٹے بڑے محاذ کی ہر جنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہوں۔

یہ میری وہ خالہ تھیں جن کے علم کا دبدبہ میرے اوپر بہت زیادہ تھا۔ اور جن کے یہاں میں نے اس آپا کا بدل تلاش کر لیا تھا۔ جو میرے پیدا ہونے سے پہلے دنیا سے جا چکی تھیں۔ شاہدہ باجی کی محبت کا یہ عالم تھا انہوں نے مجھے اپنے بھائیوں کے زمرے سے ایک لمحہ کے لئے خالی نہیں سمجھا۔ دیکھنے میں مضبوط، تنومند اور بیحد خوبصورت، میری شاہدہ باجی نے میری قرۃ العین آپا کی جگہ لے لی تھی۔ میری آمد کی مسرت سے وہ ایسی کھل اٹھتیں کہ جیسے انہیں بڑی نعمت مل گئی ہو، اور باورچی خانے میں بے انتہا مصروف ہو جاتیں۔ انہیں معلوم تھا کہ میں کون کون سی چیزیں پسند کرتا ہوں، انہیں معلوم تھا کہ میں کن کن باتوں سے دکھی ہوتا ہوں۔

شاہدہ باجی کی جب شادی ہوئی تو مجھے یاد ہے، کسی لمحے رویا نہیں، اور اس سے زیادہ خوشی مجھے اپنی چھوٹی بہن عنیفہ کی شادی میں کبھی نہیں ہوئی۔ ان کے شوہر عبدالقیوم ملک اپنے وقت کے بہار کے نامی گرامی فٹبال پلیئر رہے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد ان کو پاکستان جانا پڑا میری شادی کے موقع پر جب شاہدہ باجی ۱۹۵۵ء میں بڑے دھوم دھام سے خاص طور پر پاکستان سے آئیں تو میں رو پڑا۔ سابق مشرقی پاکستان اور موجودہ بنگلہ دیش کی تمام المناکیوں کو میری بہن وہاں جھیلتی رہی اور میں یہاں تڑپتا رہا اور جب اپنی پیاری بچیوں اور لڑکوں سمیت کراچی پہنچ گئیں۔ تو مجھے لگا میں نے دوسری زندگی پائی۔ میری قرۃ العین آپا کو خدا نے مجھ سے چھین لیا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ کیونکہ خدا سب سے بڑا ہے اور اس کی مصلحتیں انسانی عقل سے بالا ہیں۔ لیکن میری شاہدہ باجی کو ملک کی تقسیم نے چھین لیا۔ آہ کا مجھے اتنا دکھ ہے کہ جس کا پتہ تو میری کئی کہانیوں میں اس طرح آیا ہے کوئی دل والا روئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اگست ۱۹۴۲ء کے بعد جب نومبر ۱۹۴۲ء میں حالات نارمل ہوئے اور میں پٹنہ واپس گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ رام موہن رائے سیمنری سے مجھے نکال دیا گیا ہے میں پرائیویٹ

طور پر مسلم ہائی اسکول سے نویں درجے کا امتحان پاس کیا اور میں دسویں درجے میں نام لکھایا۔

دسویں اور گیارہویں کے بہترین دوستوں میں یوں تو بہت سے نام ذہن میں آتے ہیں لیکن، حافظ علی رضا جیسا مخلص ساتھی اور دوست مجھے کوئی نہیں ملا حافظ علی رضا لندن میں عرصۂ دراز سے اپنی جرمن بیوی اور بچوں کے ساتھ خوش و خرم ہے۔ چند سال پیشتر جب حافظ علی رضا گیا آیا تو یہ سو فیصدی وہی حافظ علی رضا تھا، جو اسکول میں میرا ساتھی تھا۔ ہمدرد اور دوست رہا تھا۔ لندن میں اُس کے کئی مکانات ہیں۔ خود کا دُسٹ اکاؤنٹنٹ ہے اور لندن میں بھی اپنی مہمان نوازی اور دوستی کے سلسلے کو اسی طرح برقرار رکھے ہوئے ہے جس طرح پٹنہ کے رمنہ روڈ کی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رکھتا تھا۔ حالانکہ حافظ علی رضا ایک غریب طالب علم تھا۔ اور آج وہ ایک بے حد خوش حال لندن کا باشی ہونے کے باوجود، مزاجاً، عادتاً اور طبیعتاً وہی ۴۴-۱۹۴۳ء اور ۴۵ء کا حافظ علی رضا ہے

میٹرک پاس کر لینے کے بعد میں نے کلکتے کا رخ کیا اور وہاں ایک نائٹ کالج میں کامرس پڑھنے لگا۔ یہ ۱۹۴۵ء کا اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا۔ کلکتہ میں میرا کوئی نہیں تھا سوائے ایک دوست کے جس کا نام ریاض تھا۔ اور جو سول سپلائز کے محکمے میں ملازم تھا۔ اس نے مجھے خط پر خط لکھ کر کلکتے بلایا اور میں دو سال تک اس کے ساتھ اسطرح رہا کہ حساب دوستاں دل سے باہر کبھی نہیں ہوا

۱۹۴۶ء میں کلکتے میں مسلم لیگ کے ڈائریکٹ ایکشن کے نتیجے میں جو بھیانک فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اسے میں اتنے قریب سے دیکھا ہے کہ فرقہ وارانہ فساد کی المناکی کے تمام پہلوؤں کو لئے ہوئے ایک ایسا دکھی انسان ہوں جس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا۔ کہ مذہبی جنون آدمی کو درندہ کیسے بنا دیتا ہے۔ اس فرقہ وارانہ فساد کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا مجھے اس لئے ملا کہ میں نے ریڈ کراس میں اپنا نام لکھایا تھا۔ اور رائفل پولیس کے ساتھ سڑکوں پر، پورے کلکتے کے چھوٹے بڑے محلوں، گلیوں، بازاروں، تنگ مکانوں میں زندگی سے بیزار بچے کھچے لوگوں کو رفیوجی کیمپ میں لانے کا کام کرتا تھا۔ میں مشکل سے دو ہفتے رہا کے ان کاموں میں رہا۔ لیکن ان پندرہ دنوں کا ایک لمحہ داستان بن سکتا ہے۔ پہلے دن جب ہم ٹرک لے نکلے تھے، تو سڑکوں پر سے لاشوں کو کھینچ کھینچ کر سڑک کنارے کر کے ٹرک کے گزرنے کا راستہ بنانا پڑتا تھا۔

بہار کے فرقہ وارانہ فساد کے بعد مسلم لیگ کے زیرا... جو رفیوجی کیمپ بنے تھے۔ ان کا احوال یہ تھا کہ رفیوجیوں میں کھچڑیاں بٹتی تھیں۔ اور مسلم لیگی لیڈروں کے تا... اسی بلڈنگ کی اوپری منزل پر پلاؤ اور قورمے تناول فرما تھے۔ بے کس اور بے سہارا جوان لڑکیوں کو سہارا دینے کا لالچ دے کر کتنے ہی بوالہوسوں نے اپنی ہوس پوری کی۔ کبھی موقع ملا تو ان المیوں کو لکھ کر اپنے دل اور ذہن کا بوجھ ہلکا کر دوں گا۔

۱۹۴۷ء میں کلکتے سے آئی کام پاس کرنے کے بعد میں نے سینٹ زیویرس کالج کے تھرڈ ایر کامرس میں داخلہ لیا اور ان ہی دنوں میں نے ایک ماہنامہ "نغمہ" کے نام سے نکالا اور نکالتا رہا۔ پر ایک دن میرا دوست جس کے ساتھ میں یہ رسالہ نکالتا تھا۔ میرے کچھ حساب کئے

۱؎ حافظ علی رضا کا انتقال حال میں ہوا۔ اور میں بڑی المناکی سے گذر رہا ہوں۔

بھنے پر یہ کہہ گیا کہ ڈکلریشن اس کے نام سے ہے
لئے قانونی طور پر وہ رسالہ اسی کا ہے۔ میں نے
ھنے کے بعد ایک رکشے پر اپنا سامان رکھا اور کلکتے
مولا باڑی میں جا کر رہنے لگا۔ رسالہ بند ہو گیا اور
نہ دوست کراچی چلا گیا۔ سنا ہے وہاں کوئی تیسرے
جے کا رسالہ نکالتا ہے اور کبھی کبھی فلموں کے گانے
تا ہے۔ خدا اسے خوش رکھے۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب مشرقی پاکستان جانے
لئے کسی اجازت نامے اور پرمٹ کی ضرورت نہیں
اور میں سمجھتا کہ دونوں ممالک برابر اسی طرح
ہ گے، میں اکیلے رنگ پور چلا گیا۔ اور اسٹیشن کے ٹھیک
منے مشرقی بنگال کے قاعدے سے بانس کی دیواروں
ر پھوس کی چھاونی کے ساتھ ایک ریسٹوران کھولا۔
دن ایسا ہوا کہ رنگ پور اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر
ے ریسٹوران میں آئے اور مجھ سے پوچھا کہ آپ
یزی پڑھے ہوئے ہیں؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں
کام پاس ہوں۔ پھر یہ پوچھا کہ یہ پوچھنے کی آپ
ضرورت کیا پڑی؟ کہنے لگے "میں روز آپ کو
ھتا ہوں کہ آپ بک اسٹال سے انگریزی اخبار
لیتے ہیں۔ اور اپنے ریسٹوران میں بیٹھے پڑھتے رہتے
۔ تو مجھے تعجب ہوا کہ آپ کے اغل بغل اور آگے پیچھے
کائیں ہوٹل اور ریسٹوران دیگر زبوجیوں کے کھول
ے ہیں۔ ان میں اور آپ میں فرق ہے۔

میں نے رنگ پور کالج میں داخلہ لینا چاہا تو معلوم
۔ کالج بالکل بند ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ
نانوے فیصد پروفیسر ہندو تھے۔ جو سب کے سب
نے گئے یا بھگا دیئے گئے۔ ریسٹوران کی آمدنی
اچھی خاصی تھی۔ مگر باورچیوں کے نخروں اور ملازموں
کی شرارتوں نے مجھے عاجز کر دیا تھا۔ وہاں ایک پشاوری
خان تھے۔ جن کا سینما ہاؤس تھا۔ وہاں ایک میرے
رشتے کے بھائی چیف آپریٹر تھے۔ میں نے اس سینما
میں آپریٹری سیکھنا شروع کر دیا۔ پشاوری خان صاحب
نے کو پتہ نہیں میری سنجیدہ خدمت گذاریوں نے کیسے
متاثر کر دیا کہ انہوں نے مجھے سینما کا منیجر بنا دیا اور مجھے
ایسا لگا کہ شاید میرا مستقبل رنگ پور ہی سے منسلک
ہو گیا۔ خاں صاحب کی مہربانیاں اور ان کی عزت
افزائی برابر یاد آتی ہے۔

لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ میں نے اخباروں میں
پڑھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں آنے جانے کے
کے لئے پرمٹ سسٹم جاری کیا جا رہا ہے۔ میرے اندر
کے خالص ہندوستانی اپنی شہریت کو بدلنے پر رضامند
نہیں ہوا، اور میں نے اچانک رنگ پور چھوڑ دیا۔ میں چلا
اپنے ابا مرحوم کے پاس جن کی پوسٹنگ ان دنوں رانچی
تھی، پہنچ گیا۔ رانچی میں میں نے تھرڈ ایر آرٹس میں داخلہ
لیا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کو قریب سے دیکھنے
کے بعد جبکہ میرا ذہن سیاسی طور پر کوئی راستہ ڈھونڈ رہا
تھا، میری ملاقات اختر پیامی سے ہو گئی جس کی نظمیں
ان دنوں "نیا زمانہ" میں چھپا کرتی تھیں۔ یہ ۱۹۴۸ء تھا
لکھنے لکھانے کا سلسلہ کلکتے سے شروع ہو چکا تھا
مگر میں نے بغیر فرمائش کے اپنے افسانے کبھی ایڈیٹروں کے
پاس دوڑنے اور خوشامد کرنے کو اپنے مزاج کے خلاف
پایا۔ فضل حق قریشی کے زمانے کے غیر منقسم ہندوستان
کے "آج کل" میں میرے افسانے نقلی ناموں سے شائع
ہوئے۔ "جدید ادب" کلکتہ میں پہلی بار میرا افسانہ

"بھائی" شریک اشاعت ہوا۔ رانچی کالج کے ماحول
نے مجھے بڑی تیزی کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین
، اسٹوڈنٹ فیڈریشن اور یہاں تک کہ کمیونسٹ پارٹی
سے قریب کر دیا۔ رانچی میں بعض کم جاننے والے لوگ اختر
پیامی کو کلام حیدری اور کلام حیدری کو اختر پیامی سمجھتے
اور کہتے تھے۔

میرے والد کا انسپکٹر کا کوارٹر، کمیونسٹ پارٹی
کے انڈر گراؤنڈ کامریڈس کے چھپنے کی محفوظ جگہ بھی جاتی
تھی رانچی کالج کے دو سال میں ہم نے اتنے کام کئے
کہ لگتا ہے جیسے ہم نے وہاں دس سال کام کیا۔

بی اے ٹسٹ کا امتحان چھوڑ کر میں اسٹوڈنٹ
فیڈریشن کے ایک جلسے میں رانچی ڈیلیگیٹس کے لیڈر
کی حیثیت سے پٹنے میں ہونے والی کانفرنس میں شریک
ہوا جلوس نکلا، جلوس پر لاٹھیاں چلیں، میرے دوست
گھائل ہوئے، قید ہوئے، دوسرے دن ہم نے پٹنہ
جیل پر نہایت قلیل تعداد میں دھاوا بولا
وہاں فائرنگ ہوئی، وہاں سے رانچی لوٹا تو اپنے پچھلے
امتحانات کے ریکارڈس کی بنا پر بی اے کا یونیورسٹی
امتحان دینے کی اجازت ملی۔ جس دن یونیورسٹی کا فام
بھرا وہ تاریخ ۲۴ جنوری ۱۹۵۰ء تھی۔ ۲۴ اور ۲۵
جنوری ۱۹۵۰ء کی درمیانی رات میں تین بجے باہری
دروازے پر دستک ہوئی کہ میں نے دروازہ کھولا۔
تو اپنے آپ کو پولیس حراست میں پایا۔ رانچی جیل میں مجھے
اور میرے ساتھیوں کو جو اس رات گرفتار ہوئے
تھے، سیاسی قیدی بنا کر نہیں رکھا گیا۔ بلکہ سیل
میں بند کر کے رکھا گیا۔

۲۶ جنوری جبکہ ہندوستان میں جمہوریت
کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ تو مجھ جیسے محب وطن جیل
کی سیل میں بند تھے۔ ہم نے ہندوستان میں جمہوریت
کے پہلے دن کے اس سورج کو نکلتے ہوئے نہیں دیکھا
جس کے لئے ۱۹۴۲ء میں ایک نویں کلاس کے لڑکے
نے اسکول کا گیٹ توڑا۔ جس کے لیے ۱۹۴۶ء
میں جہازیوں نے بغاوت کی۔ جس کے لئے پٹنہ
سکریٹریٹ کے پاس نوجوان نامیوں کی سنگینوں کے
آگے اپنے سینے سپر کر دیئے تھے۔ درمیان میں ایک
بات رہی جاتی ہے۔ کہ ۱۹۴۹ء کی انجمن ترقی پسند
مصنفین کی آل انڈیا کانفرنس بھیمڑی میں، رانچی
دو منڈوبین نے شرکت کی۔ ایک میں اور ایک دوسرا
وحید الحسن جو اس وقت فرسٹ ایر کا طالب علم تھا او
ان دنوں مشہور اینتھروپولوجسٹ ہے۔

جیل سے چھوٹا تو بی اے کے امتحان کو شاید دس
بارہ روز رہ گئے تھے۔ امتحان دیا اور خدا جانے کیسے
اردو میں فرسٹ کلاس آنرز کے ساتھ یونیورسٹی میں دوسری
دوسری پوزیشن لا کر پاس ہو گیا۔ ان دنوں بہار میں صرف
ایک یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی تھی۔

ستمبر ۱۹۵۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں اردو
ایم اے میں داخلہ لیا۔ جہاں میری ہی طرح آزاد
ہندوستان کی جیل میں رہ کر آئے ہوئے منظر شہاب
بھی تھے۔ منظر شہاب میرے ان چند دوستوں میں سے
ہے۔ جس نے دوست ہونے کا نام کبھی نہیں لیا۔
زندگی کے ہر قدم پر دوست رہا۔ انور عظیم بھی دوستوں
میں رہے مگر ان کی دوستی کا مزاج اور معیار الگ تھا
وہ بھی مجھے عزیز ہے، وہ میرا ساتھی ہے۔ ایم اے میں
ہم تینوں نے ایک ساتھ امتحان دیا۔ میرے لیے لڑکی کا

...ٹ ہونا کسی کا سکنڈ ہونا، کسی کا تھرڈ ہونا کوئی اہمیت
...یں رکھتا تھا۔ مگر شاید انور عظیم کے ذہن میں یہ بات
...تہ تھی۔ کہ ایم اے میں وہ ٹاپ کریں گے۔ ہم ایم اے
امتحان دے کر الگ ہو گئے اور جب ایم اے کا رزلٹ
... تو میں فرسٹ کلاس فرسٹ تھا۔ انور عظیم فرسٹ کلاس
...سکنڈ اور منظر شہاب فرسٹ کلاس تھرڈ۔ حالانکہ شاید
...دونوں سے زیادہ مستحق فرسٹ کلاس فرسٹ کا منظر
...شہاب تھا مگر وہ شاعر اور فلسفی، امتحان گاہ میں اپنی شاعری
...فلسفے میں اُلجھ کر رہ جاتا تھا۔ اس لئے کوئی جواب
...ل اور کوئی جواب مختصر، اور کسی سوال کا جواب ہی ندارد
...ا منظر شہاب جو جمشید پور کے ایک بڑے کالج کا آج
...نسپل ہے۔

میں نے اکتوبر ۱۹۵۲ء میں، تیج نرائن کالج میں اردو
...لکچرر کی حیثیت سے جوائن کیا اور ۱۹۵۸ء تک وہاں
...رہا۔ اسی درمیان میری شادی ہو گئی۔ گمان یہ نہیں
...ا کہ درس و تدریس کی دنیا سے نکل کر میں کاروبار اور
...محنت کی دنیا میں آ جاؤں گا۔ پر ایسا ہوا۔ کلکتے کے ماحول
...دوران کے تجربے سینما کی منیجری، ان سب نے مل کر میرے
...ن پر کچھ ایسا اثر ضرور ڈالا تھا کہ میں کاروبار کی جانب
...ذب ہو سکتا تھا۔ شادی ہونا ایک اہم بات تھی۔ کیونکہ
...ں سے زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ مگر یہ نیا
...ب میری کتاب زندگی میں جس طرح شروع ہوا اسے
...ن کہنے کا ابھی موقع نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ سناتا چلوں کہ ایک بار
...صاحب جو ادیبوں کا انٹرویو لیتے پھر رہے تھے، میرے
...ں تشریف لائے اور انہوں نے مجھ سے پہلا سوال کیا "کیا
...پ نے اپنی شادی میں ایک لاکھ روپے لئے تھے۔

میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "آپ کو غلط
اطلاع ملی ہے، میں نے اپنی شادی میں ایک لاکھ نہیں
سات لاکھ روپے لئے تھے۔"

خیریت ہوئی کہ انہوں نے اس کی تفصیل
نہیں پوچھی ورنہ بتاتا کہ ایک لاکھ کی میری بیوی ہے
ایک لاکھ کی میری تین عدد سالیاں ہیں۔ ایک لاکھ
کے میرے ڈاکٹر ابا ہیں۔ (سسر) ایک لاکھ کی میری امی
(ساس) اور ایک لاکھ کے میرے بڑے سالے ڈاکٹر خالد خیر
ہیں۔ اور یہ ساتوں لاکھ میرے لئے ہر سال ضرب ہوتے
چلے جاتے ہیں۔ اور مجھے لگتا ہے کہ شادی کے بعد سے اب
تک ارب اور کھرب پتی ہو گیا ہوں۔

ڈاکٹر ابوالخیر مرحوم کلارکیٹ ولیبویہ تھا کہ وہ
گیا ضلع کے مشہور ترین ڈاکٹر تھے۔ جو اگر چاہتے تو اپنی
شہرت کے ذریعہ جانے کتنا کماتے ان کی قناعت پسندی
نے ان سے اتنی مفت دوائیں بٹوائیں اتنے گھرانوں کو
فائدے پہنچائے کہ ان پر سے کروڑوں روپے نچھاور کئے
جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ابوالخیر نے اپنے رشتہ داروں گاؤں
والوں، دوستوں، یاروں کو اتنا کچھ دیا کہ گیا شہر کا
کوئی آدمی آج تک نہ انہیں فراموش کر سکا اور شاید
فراموش کر بھی نہیں سکتا۔

عجیب بات ہے کہ نانا آبا مرحوم کے بعد اگر مجھے
ان جیسی شخصیت کوئی ملی تو وہ ڈاکٹر ابا ہی کی شخصیت
تھی۔ وہی پاک بازی، وہی پاک طینی، وہی فراخ دلی
وہی فیاضی، وہی قناعت پسندی، وہی محنت سے
محبت، وہی روشن دماغی وہی دلیری، وہی بردباری
اور ان سب سے کسی طرح کم انکساری نہیں! یہ ان
کی جرأت مندی تھی کہ انہوں نے مجھے نسبتاً اچھی ملازمت

سے استعفیٰ دینے کی حوصلہ مندی بخشی اور میں بے خطر ایک صنعت کار بن گیا۔ ان کی دوررسی، مردم شناسی نے پتہ نہیں مجھ میں کیا پایا کہ میرا انتخاب صنعت کار کے لئے کیا اور میں نے کالج سے دو سال کی چھٹی لے کر ۱۹۵۵ء میں کنکریٹ پائپ بنانے کا کارخانہ اس وقت کھولا جب بہار میں صرف تین کارخانے تھے۔ ڈاکٹر ابا کے انتقال کے بعد مجھے ایسا لگا کہ جیسے تیز دوپہر میں اچانک رات ہوگئی ہے۔ کہ میرے اندر جرأت مندی ختم ہوگئی۔

۱۹۵۸ء میں میں نے کالج سے استعفیٰ دیدیا جب تک میرا کارخانہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکا تھا میں ۱۹۵۸ء سے کر ۱۹۶۳ء تک اپنی صنعتی مصروفیات میں مشغول رہا۔ اور ادبی طور پر سوائے پڑھنے کے تقریباً کوئی ادبی کام نہیں کیا۔ میری سالی نزہت منصور نے امریکہ سے EDUCATIONAL PSYCHOLOGY میں ایم اے کیا۔ نزہت نوری کے نام سے افسانے لکھتی ہے۔ اس کی زبان۔ اس کے اپنے حسن کے مطابق ہے۔ میری دوسری سالی قیصر احمد بی اے آنرز ہے جسے نے کبھی کوئی ادبی مقالہ لکھا تو تعریفوں کے ڈھیر لگ گئے۔ میری تیسری سالی نوشابہ حق ڈبل ایم اے ہے اور تاریخ میں فرسٹ کلاس فرسٹ ہے۔ اس کے ساتھ میرا پیار ویسا ہی ہے۔ جیسے گود میں کھلائے ہوئے بچے کے ساتھ۔ اور شاید اس کا پیار ویسا ہی ہے جیسے وہ اپنے حیدر بھائی کے بغیر اپنے آپ کو نامکمل سمجھتی ہے میری امی کا یہ حال ہے کہ جیسے ان کا ایک بیٹا نہیں ہے۔ بلکہ دو بیٹے ہیں۔ اور مجھے یہ شرمساری ہے کہ میں ان کی محبت کے آگے ہوائے سرنگوں رہنے کے اور کوئی خراج پیش نہیں کر سکتا۔

اپنی بیوی کے بارے میں لکھتے ہوئے مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اپنی تعریف خود کرنے لگ جاؤں۔ زمین شعلوں سے لہلہاتی رہا ہوں پر چلنے کی صلاحیت مجھ میں اس لئے آج تک ہے کہ اس کے پھول سے ہاتھ میرے شانوں پر ہیں۔

۱۹۶۳ء سے میں نے ہفتہ وار "مورچہ" کا آغاز کیا۔ اور ادبی اور تہذیبی دنیا میں اسے جو حاصل ہے اسے بتانے کی میری ضرورت نہیں۔ اس کے دو تین سال بعد میں نے ادبی ماہنامہ "آہنگ" جاری کیا۔ اس کی بابت بھی میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ اس کی بابت سب کچھ کہنے کا حق مجھ سے زیادہ اس کے قارئین کو ہے۔

کلچرل اکیڈیمی کا قیام بھی "مورچہ" کے ساتھ ساتھ وجود میں آیا جس کے نقوش بعد میں ابھرتے چلے گئے۔ اور جس ادارے نے کلیم الدین احمد اور خلیل الرحمن اعظمی جیسے ادیبوں کی کتابیں شائع کرنے کا فخر حاصل کیا۔

۱۹۷۱ء میری زندگی کا وہ موڑ ہے جب میرے کیریر میں بحران آیا۔ ایک زلزلہ — ایک قیامت — اور اگر اس کا الزام کسی کے سر دوں تو میری جان نکلتی ہے۔ مگر ۱۹۷۱ء میں کے بعد سے وہ صنعت کار کلام حیدری نیم جان ہوگیا۔ جو ۱۹۷۱ء سے پہلے کم انکم گیا کے پیمانے پر اپنی ایک مخصوص جگہ رکھتا تھا۔

شاید خدا نے مجھے یہ سبق دیا ہو کہ ادب میرا منتظر ہے۔ اور اگر میں اپنی بقیہ زندگی میں ادب کو کچھ نہیں دے سکا تو زندگی کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس لئے میں اپنے آپ کو سمیٹنا چاہتا ہوں اور ادب میں ڈوب جانا چاہتا ہوں

(باقی صفحہ پر)

کلام حیدری — اپنے گھر میں

مشاہد حیدری

میں سوچتی ہوں جن باتوں کی بازگشت میرے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے جن یادوں کی شادابی اب میرے لئے ایک NIGHT MARE سے کم نہیں کیا میں ان پچھلی باتوں کو دہرا سکوں گی ۔۔۔۔۔۔ ؟ شاید یہ کام اب مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ آج یہ سب باتیں میرے لئے ایک STILL تصویر بن چکی ہیں۔ ایسی تصویر جس نے مجھے بھی پتھر کا بنا دیا ہے ۔۔۔۔۔۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی ۔۔۔۔۔۔

گھر ہو یا باہر، جو آدمی ہر رابطے کے لئے اپنے نفعے اور نقصان کو بالائے طاق رکھتا ہو تو خود اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔

ہمارا خاندان مختصر ترین خاندان مانا جاتا رہا۔ کیونکہ ہماری صرف ایک بیٹی ہے۔ نگار رینہ ۔ جسے ہم رینا کہہ کر پکارتے ہیں لیکن اس پر بھی ہمارے گھر میں کبھی سناٹا نہیں رہا۔

کلام صاحب سے ملنے جلنے والوں، رشتہ داروں اور مہمانوں کے آتے جانے کا سلسلہ برابر بنا رہا۔ کچھ افراد خاندان تو ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ یعنی کلام صاحب کے تینوں بھائی اور ان کے والدین ۔ اور جب تک سب بھائیوں نے اپنا اپنا دھندا اور روزگار نہیں سنبھال لیا ، اور اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو گئے اس وقت تک ان کا لگاؤ ہر طرح سے کلام صاحب کے ساتھ قائم رہا۔ گھر کے لوگوں کے علاوہ دوست و احباب کی آمد سے رونق رہتی تھی۔ رینا جب بھی اپنا بچپن یاد کرتی ہے تو اسے کوئی بھی ہفتہ شاید ہی ایسا نظر آتا ہے جب ملنے جلنے والوں اور مہمانوں کی رونق سے ہمارا گھر خالی رہا ہو ۔۔۔۔۔۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب رینا کی شادی ہو گئی اور کلام صاحب بیٹی اور داماد اور پھر اپنی نواسیوں میں ایسے کھوئے رہے جیسے اپنے آپ کو بھول گئے ہوں۔

۔۔۔۔۔۔ داماد کو دیکھ کر انہوں نے نئے حوصلوں اور نئی تمناؤں کی ایک دنیا اپنے دل میں بسا لی۔ جیسے انہیں بیٹا مل گیا ہو ۔۔۔۔۔۔

رینا کے لئے وہ ہمیشہ سے کچھ زیادہ ہی SENTI MENTAL رہے تھے۔ اس کی ذرا سی بھی جدائی ان کے دل کو لگ جاتی تھی۔ میں ماں ہو کر بھی شاید ان کی طرح سے محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی بیٹی ہی ان کی جان ہے ان کی ہر بات سے اس کا اظہار ہوتا تھا ان کی ایک کہانی میں بھی اس SENTIMENT کا واضح اشارہ ہے۔

" ابھی ابھی اسکول کا بستہ پھینک کر کون دوڑتا ہوا اس سے لپٹ گیا ہے، یہ معصوم

بدن کی خوشبو کسی کی ہے، اس خوشبو میں
گھلتا ہے وہ حل ہو گیا ہے ....
اور اسے لگ رہا ہے، جیسے وہ اس کے جسم کے
زہر کو آہستہ آہستہ چوس رہا ہے، جبھی تو
اتنا آرام اتنی فردوسی راحت مل رہی ہے ''

اپنی نواسیوں کو پاکر شاید انہیں وہ راحت مل گئی تھی۔
اپنی تمام مصروفیات کے باوجود ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ ان بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت نکال سکیں۔ ان کی تمنا رہتی کہ ان بچوں کے ساتھ نواسیوں کے ساتھ انگلی پکڑ کر مکان کے سامنے والی سڑک پر چہل قدمی کرتے رہیں۔ سامنے والی دوکان سے ان کے لئے کھلونے یا کچھ نہ کچھ تحفے خریدتے رہے۔ پاس والی نرسری سے ان کی پسند کے پودے لا لا کر گھر میں لگاتے رہیں۔ گھر سے باہر نکلیں یا سیر کو جائیں تو یہ بچے ان کے ساتھ رہیں۔ بس یہ تمنا کچھ زیادہ ہی ان کے من کو بھا گئی تھی۔ ____ نواسیوں کو گود میں بھر کر وہ بے حد خوش دکھائی دیتے تھے۔ جیسے ساری دنیا انہیں مل گئی ہو ____ مگر قسمت نے بس تھوڑے ہی دنوں میں کے لئے یہ کھیل انہیں کھیلنے دیا ____ بھری پری زندگی جینے کی تمنا لئے ہوئے وہ اچانک ہم سے الگ ہو گئے اور اس اچانک کے دھوکے نے ہمیں سکتہ میں ڈال دیا۔

بچوں کے ساتھ جو وقت انہوں نے گذارا اسے بچے بھی نہیں بھول پاتے۔ خصوصاً بڑی نواسی آفرین تو بہت حساس ہے اپنے نانا کے لئے مجھے تسلی دیتی ہے۔ بڑی دلجوئی کرتی ہے۔ مگر مجھ سے منہ پھیر کر اپنے آنسوؤں کو روک لینا خوب جانتی ہے۔ اس کے احساس کی یہ MATURITY اس کی فطرت کا ایک نمایاں حصہ ہے۔

ایک بات جس کا ذکر کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا اور جس کا تھوڑا سا اظہار انہوں نے ۔ اپنی زندگی کے کچھ سچ ۔ میں بھی کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اپنی سسرال کے بہت پیارے تھے وہ ابا مرحوم کے چہیتے رہے۔ کلام صاحب کو بھی ابا سے اتنی عقیدت اور محبت تھی جتنی انہیں اپنے عزیز ترین بزرگ اپنے نانا جان مرحوم سے تھی وہ خود اس بات کا اظہار بار بار کرتے تھے اور کہتے تھے ____ "ڈاکٹر ابا کو جب بھی دیکھتا ہوں تو مجھے نانا جان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے "۔

اماں کو وہ ہمیشہ ممی کہتے رہے۔ کلام صاحب کے لئے ان کی ممی یعنی ان کی ساس نے اپنی ممتا کا اتنا بڑا خزانہ نہ جانے کہاں چھپا رکھا تھا کہ جب جب اس کا اظہار ہوتا۔ لوگوں کو رشک آنے لگتا تھا ____ کہہ نہیں سکتی کہ وہ اپنے دامادوں میں انہیں سب سے زیادہ چاہتی تھیں یا اپنے بچوں سے بھی زیادہ انہیں پیار کرتی تھیں۔ مگر ایک بات کلام صاحب کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ انہوں نے اماں کو اپنی ماں سے کم نہیں سمجھا۔

اپنی سالیوں کے لئے وہ دلارے حیدری بھائی تھے میری بہن نزہت کی طبیعت میں ادبی جھکاؤ دیکھتے ہوئے وہ انہیں ہمیشہ لکھنے کے لئے بڑھاوا دیتے رہے۔ اپنے اکلوتے سالے یعنی بھیا کے لئے وہ ایک حوصلہ مند عزیز بھائی تھے۔ یہ دونوں سالے بہنوئی سگے بھائیوں کی طرح جھگڑتے بھی تھے اور سگے بھائیوں کی طرح گلے مل کر رو بھی لیتے تھے۔

بھیا کا بڑا بیٹا تابش خیر انہیں بہت پیارا رہا کرتا تھا۔ اسے لٹریچر کی طرف دیوانگی کی حد تک مائل دیکھ کر وہ کہا کرتے تھے اس لڑکے کو تو میرے یہاں ہونا چاہئے تھا۔ شاید فرشتوں سے غلطی ہو گئی اور انہوں نے اس کی WRONG DELIVERY کر دی۔ اسے ادب کی طرف بڑھاوا دینے میں انہیں لذت ملتی تھی۔

ایک بے حد اہم ہستی جسے ان کی زندگی کے لئے روشنی کا مینار کہنا چاہئے۔ ان کی ماں کی ہستی تھی۔

ماں بیٹے میں، زبردست UNDERSTANDING تھی اپنے والد سے بھی وہ متاثر ضرور تھے مگر ان کی UNDERSTANDING جیسی اپنی ماں سے تھی، کسی سے نہیں تھی۔ ان کا ذکر بار بار کرتے نہیں تھکتے تھے۔ ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی کھانے کی چیزوں کا ذکر کرتے تو یہ محسوس کرتے کہ ان کے مقابلے دنیا بھر کے سارے پکوان بے مزہ ہیں۔ اماں نے انہیں اپنے ہاتھوں سے دودھ میں روٹی ملا کر بچپن میں کس طرح کھلائی تھی کہ ہمیشہ اس دودھ روٹی کی مزیداری کو یاد کرکے کہتے "جب بھی دودھ روٹی کھاتا ہوں ویسا کیوں نہیں لگتا جیسا اماں بنا کر کھلاتی تھیں۔"

ویسے کھانے کی چیزوں کے لئے CHOOSY تھے کوئی پسند کی چیز ہوتی تو کھایا ورنہ چکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے، گھر کی بنی ہوئی باقرخوانی، بریانی اور حلوے شوق سے کھاتے تھے۔ سادہ کھانے میں بیسن کی روٹی بہت مرغوب تھی انہیں۔

سگریٹ نوشی کے زندگی بھر عادی رہے بلکہ وہ CHAIN SMOKER رہے۔ سگریٹ کے علاوہ اور کوئی لت انہیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ اپنے گھر کے لئے ان کا ایک رکھ رکھاؤ تھا جسے دنیا جانتی ہے اور جو انہیں ہر قیمت پر عزیز رہا۔ اس رکھ رکھاؤ کی خاطر کبھی ایسا بھی ہوا کہ کسی پیارے دوست کی دوستی سے بھی کنارہ کشی اختیار کرنی پڑی۔

اپنی ماں کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ بے حد سادگی پسند طبیعت والی یہ اماں تقویٰ و پرہیزگاری میں اپنی مثال آپ تھیں۔ وہ ہستی جس نے کلام صاحب کو بے باکی اور حق گوئی کے راستے پر لگایا اور زندگی کے ہر کڑے موڑ پر حوصلہ اور ہمت دے کر آگے چلنے کی طاقت بخشی ـــــ اماں کے کردار کا یہ پہلو نہ ہمیشہ یاد کرتے تھے اور کہتے تھے میں آج کچھ بھی نہیں ہوتا اگر فلاں فلاں وقت پر اماں نے سنبھال نہ لیا ہوتا۔

وہ ایک ذہین ماں کے ذہین بیٹے تھے۔

اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ چھوٹے بھائی عمر میں ان سے زیادہ چھوٹے تو نہیں مگر ان کا ذکر وہ ایسے کرتے جیسے کوئی اپنے بیٹوں کا ذکر کرتا ہے۔ جب یہ پورنیہ میں پروفیسر تھے اس وقت بھی بھائیوں کو ساتھ رکھتے تھے اور ان کی پڑھائی پر پوری توجہ ڈالتے تھے۔ اپنے گھر "رینا ہاؤس" میں رہتے ہوئے بھی میں نے یہی دیکھا کہ بھائیوں کی ذمہ داری کو وہ اپنی خاص ذمہ داری سمجھتے رہے۔ انہیں پڑھانے لکھانے کا کام، انہیں روزگار سے لگانا، ان کی شادیاں کرانی، یہ سارے فرائض بڑے چاؤ اور خوشی سے انجام دیتے رہے۔ سگی بہن صرف ایک تھیں۔ بہن، بہنوئی اور بھانجے انہیں ہمیشہ بہت پیارے لگے۔

گھر والوں کے لئے وہ SELF LESS SERVICE کے قائل تھے کہہ نہیں سکتی کہ اپنی اس محبت کے بدلے میں انہیں کسی سے کوئی توقع بھی تھی یا نہیں۔ ہاں یہ کہہ سکتی ہوں کہ توقع کے برعکس انہیں بہت کچھ ملا۔ کس نے ان کی توقعات کو کہاں تک پورا کیا اور کہاں تک ٹھکرایا میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی۔

گھر سے باہر جب کبھی اپنے کام کے سلسلے میں جاتے یا کسی لمبے سفر کے بعد گھر واپس آتے تو ان کا یہ معمول تھا کہ ہم گھر والوں کے لئے کچھ نہ کچھ پسند کی چیز لاتے۔ کپڑے ہوں یا آرائش کی چیزیں۔ مگر ان تحفوں کے ساتھ ساتھ ان کے بکس میں بہت ساری نئی کتابیں ضرور ہوتیں۔ اردو کی، انگریزی کی۔ ادب سے تعلق رکھنے والی کتابیں، وہ کتابیں خریدتے رہتے تھے۔ جہاں کہیں اپنی من چاہی مطلوبہ کتاب پر نظر پڑ جاتی وہ اسے خریدے بغیر نہیں رہتے تھے۔ چلتے چلتے کتابوں اور رسالوں کی دکانوں پر رک جانا اور رک کر گھنٹوں کھوئے رہنا کہ آگے راستہ چلنا بھی یاد نہیں رہے یہ ان کی عادت سی تھی۔ اس شوق کی وجہ سے ہمارے گھر میں اچھا خاصا ذخیرہ کتابوں کا جمع ہو گیا ان میں سے بہت ساری تو خدا بخش لائبریری (پٹنہ) کو انہوں نے

خود اپنی زندگی میں دے دی تھیں یہ سوچ کر کہ وہاں زیادہ محفوظ رہ سکیں گی۔ باقی ابھی بھی بہت ساری ایسی کتابیں ہیں جن کا ملنا فی الحال شاید مشکل ہو۔

مجلسی آدمی تھے۔ احباب کا حلقہ وسیع تھا۔ اردو ادب سے تعلق رکھنے والی ہستیاں ہمارے گھر میں اکثر آیا کرتیں ان کے اعزاز میں، جلسے سیمنار، مشاعرے اور ادبی شاموں کا اہتمام کلام صاحب اپنے گھر کے ہال میں کیا کرتے تھے، کلچرل اکیڈمی جو انہوں نے قائم کی تھی اس کی طرف سے بھی نشستیں ہوتی رہتی تھی۔ خصوصاً نئے سال کا پہلا دن یعنی پہلی جنوری کا دن تو کلچرل اکیڈمی کی اس ادبی میٹنگ کے لئے مخصوص تھا۔ اس دن ادبا شعرا ہمارے یہاں جمع ہوتے اور اپنی تخلیقات و علمی معلومات سے اس میٹنگ کو کامیاب بناتے۔ ایسی محفلوں کی رونق اور چہل پہل سے ہمارا گھر ہمیشہ آباد اور سرشار رہتا تھا۔

کچھ ادبی شخصیتیں ایسی بھی تھیں جن کا آنا جانا اور قیام بیشتر ہمارے یہاں ہوا کرتا تھا۔ حسن نعیم بھائی، غیاث احمد گدی بھائی، احمد یوسف بھائی اور بھی کئی نام ہیں۔ اور بزرگوں میں خاص طور پر، سہیل عظیم آبادی صاحب۔ یہ لوگ آتے اور ان کے قیام کے دوران کلام صاحب کو جو خوشی اور طمانیت ملتی تھی وہ ان کی ہر بات، ان کے چہرے کی ہر مسکراہٹ سے ظاہر ہوتی تھی۔

غیاث بھائی کا آنا اور ٹھہرنا ہمارے یہاں زیادہ ہوا کرتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ادب کے علاوہ کلام صاحب کے ساتھ ان کا کچھ کاروباری سروکار بھی تھا، اور وہ اس طرح کہ کلام صاحب کی فیکٹری میں لوہے کے تاروں کی کھپت تھی اور غیاث بھائی جھریا سے ان تاروں کی سپلائی کا کام کرتے تھے اکثر تو ایسا ہوتا کہ مال سے بھرے ہوئے ٹرک میں بیٹھ کر غیاث بھائی خود بھی ساتھ چلے آتے۔ اور سیدھے فیکٹری پہونچکر مجھے فون کر دیتے۔

بھابی، میں آگیا ہوں۔ اور میں ان کے ٹھہرنے کے لئے کمرہ وغیرہ ٹھیک کروا دیتی۔

ایک بار بیچارے اتنی جلدی میں جھریا سے چلے کہ اپنا دو جوڑا کپڑا بھی ساتھ نہ لا سکے۔ گرد میں بالکل اٹے ہوئے تھے۔ کلام صاحب نے جو ان کی حالت یہ دیکھی تو اپنا کپڑا کرتا پائجامہ لے جا کر دیا تو نہا دھو کر تیار ہو سکے۔ ایک دو بار اور بھی ایسا اتفاق ہوا پھر تو غیاث بھائی اور کلام صاحب دونوں کے لئے یہ جیسے ایک لطیفہ بن گیا۔ غیاث بھائی کہتے یار مجھے کیا پڑی ہے کہ اپنے کپڑے لاؤں۔ یہاں سرکاری تو مل ہی جاتا ہے پہننے کو، اور کلام صاحب ہنستے ہنستے سے کہتے۔ لو بھئی! اب جلدی سے ان کے لئے سرکاری کپڑا لا بھی۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ غیاث بھائی اچانک جھریا سے آئے اور نوکر سے میرے نام یہ پرزہ بھجوا دیا۔

"بھابی آپ کا بندہ اور پھر وہی گندہ"۔ میں سمجھ گئی کی حالت اور جلدی سے ان کے لئے کپڑا بھجوایا۔ تو یہ سب ہوتا رہتا اور کلام صاحب اور غیاث بھائی کو اس میں بچوں کے کھیل جیسا مزہ آتا تھا۔ اس بات کے اندر ایک بے تکلف ایک محبت اور ایک جذبے کی ایسی معصومیت تھی کہ جس کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا ایک ہم پیالہ و ہم نوالہ والی بات ہو جیسے۔ مگر دیکھنے والے اس چھوٹی سی، پیاری سی، بے ضرر سی بات کو بھی اپنی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کوئی دوربین لگا کر دیکھتا ہے، کوئی خوردبین لگا کر دیکھتا ہے۔ اصل آنکھ سے دیکھنے والے کو ہی صحیح دکھائی دے سکتی ہے۔

اتنی بات ہے کہ وہ صاف دل اور بڑا دل رکھتے ایسے لوگوں کی ہر بات کو ترازو پر رکھ کر نہیں تولا جا سکتا کسی میزان پر نہیں چڑھایا جا سکتا۔ نفع و نقصان کے پلڑے

میں نہیں ڈالا جا سکتا۔

طبیعتاً زندہ دل اور خوش مزاج تھے۔ شاید اس کی وجہ سے حاضر جوابی اور برمحل فقرہ چست کرنے کا آرٹ انہیں اچھی طرح آتا تھا ان کی تحریر اور تقریر دونوں میں یہ بات ایک اپنی جگہ رکھتی ہے۔

میں نے لکھتے لکھاتے ہوئے بھی کبھی انہیں کوئی اہتمام کرتے نہیں دیکھا یعنی کوئی افسانہ لکھ رہے ہوں، یا مضمون، یا اداریہ۔ کچھ بھی لکھتے وقت وہ قلم برداشتہ لکھ ڈالتے تھے۔ کوئی بھی جگہ ہو چاہے آفس کا ٹیبل، جس پر کاروبار کے کاغذات پھیلے ہوئے ہوں، یا گھر کا کوئی کونہ، کوئی کمرہ جہاں گھر کے لوگ اور بچے موجود ہوں۔ چاہے ڈائننگ ٹیبل ہی کیوں نہ ہو جس پر کھانے کا اہتمام ہو رہا ہو۔ یہ لکھنے پر آتے تو مقررہ وقت کے اندر ہی اپنی من پسند چیز لکھ ہی کے بس کرتے۔ اور میں نے انہیں کبھی اپنی لکھی ہوئی چیز کو دوبارہ صاف کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہاں کاربن رکھ کر لکھتے ضرور تھے تاکہ کاپی رہ سکے۔ حروف صاف اور سجل ہوتے تھے۔ اس لئے شاید اس کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ دوبارہ لکھ کر صاف کیا جائے۔

اس کے علاوہ بھی اگر کسی جلسہ یا میٹنگ میں شریک ہونا ہوتا اور کسی مخصوص موضوع پر تقریر کرنی ہوتی تو کلام صاحب کبھی کچھ لکھ کر نہیں لے جاتے یعنی کوئی تیاری جیسے کم از کم پوائنٹ ہی یکجا کرلیں۔ ایسا کرتے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا کہ تقریر اور جلسے میں شریک ہونا انہیں کچھ زیادہ ہی ATEASE بنا دیا کرتا تھا۔ کم از کم مجھے انہیں دیکھ کر ایسا ہی محسوس ہوتا تھا۔

زندگی کے آخری دن ایسے گذرے کہ وہ جیسے بالکل بدلے ہوئے سے ہو گئے تھے۔ جب سے انہیں ہارٹ کا اٹیک ہوا تھا۔ بہت DEMORALISED ہو گئے تھے۔ اور آپریشن کے بعد تو بے حد مایوس کن باتیں کرنے لگے تھے۔ زندگی سے ناامیدی کی باتیں، ایسی باتیں جنھیں یاد کرکے میں کسی پل بھی چین نہیں لے پاتی ہوں۔ نہ جانے کیوں اور کیسے انہیں اپنے آخری وقت کا ایسا الوٹ یقین ہو گیا تھا میں اسے ان کا وہم سمجھتی تھی اور دل جوئی کرتی رہتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی اس وہم پر ان سے خفا بھی ہو جاتی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ کسی طرح سے وہ دل سے اس وہم کو نکال دیں۔ مگر میں غلطی پر تھی۔ وہ صحیح کہتے تھے وہی جیت گئے اور مجھے ایکدم SURPRISE دے دیا۔

جس زندگی کو اتنے عرصے تک ہنسی خوشی لمحہ لمحہ جیا ہو آج اس کی یاد میرے لئے لمحہ لمحہ مرنے کے برابر ہے آج یہ ساری اگلی پچھلی باتیں جیسے میرا منہ چڑا رہی ہوں، میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔ اس خالی پن کے احساس تلے سب کچھ بے معنی ہو گیا ہے۔ اپنا وجود بھی بے معنی ہو گیا ہے۔



بقیہ: کلام حیدری بحیثیت صحافی

میں اچھی کی تحریر ہوں۔ بلاشبہ یہ کلام حیدری جی کا معیار و عظمت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

کلام حیدری کی صحافت اپنی نوعیت کے لحاظ سے بیحد متنوع، دلچسپ، منفرد اور قابل ذکر و قابل قدر ہے۔ میرے نزدیک ایک کامیاب صحافی اور مدیر شدہ ہے جو دو ماند یش، نڈر، غیر جانبدار اور حق گو کے علاوہ گہرے مطالعہ عمیق مشاہدہ بھی رکھتا ہو۔ اور میں بہانگ دہل کہتا ہوں کہ کلام حیدری کے یہاں یہ تمام خصوصیات موجود ہیں۔ لہٰذا میری نگاہ میں بلاشبہ کلام حیدری ایک اہم کامیاب اور عظیم صحافی تھے۔

کلام حیدری سے آخری مصاحبہ

علیم اللہ حالی

یہ کلام حیدری سے آخری ادبی گفتگو ہے۔ ان کے انتقال سے چند دن قبل اس انٹرویو کا آغاز کیا گیا تھا اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ یہ گفتگو ٹھیک اسی شام مکمل ہوئی جس کے چند گھنٹوں کے بعد رات کو ان کا انتقال ہوا۔ شعر و ادب اور علم و فن کے بارے میں ایسے اگر ان کا
کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مصاحبے کی تفصیل پہلی بار ماہنامہ سہیل کے ذریعہ قارئین تک پہنچا رہا ہوں۔

علیم اللہ حالی

۴۷۔ کیا ترقی پسند تحریک کے اثرات آج بھی زندہ ہیں ؛ آج کے بدلتے ہوئے معاشرتی نیز تہذیبی وادبی ماحول و فضا میں ترقی پسندی کی معنویت کیا بنتی ہے ؟

کلیم: آپ کا یہ سوال اس بات کی چغلی کھا رہا ہے کہ مجھے کوئی کٹر اور پیدائشی ترقی پسند سمجھتے ہیں میں ترقی پسندی کی ترکیب کو اس معنی میں استعمال کر رہا ہوں جس معنی میں استعمال کر کے ترقی پسندی کو معتوب بنایا گیا ہے۔ جب بھی کوئی فلسفہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے ماننے والے اور منکر یا اس کی تردید کرنے والے دونوں ہی ہوا کرتے ہیں۔ فلسفہ ایک ہی وقت میں مختلف جغرافیائی حدود میں مختلف بھی ہوا کرتا ہے۔ مثلاً جب مارکس کا فلسفۂ جدلیات سامنے آیا تو ایسا نہیں کہ سارے فلسفے ختم ہو چکے تھے۔ یا کچھ اور نئے فلسفیانہ خیالات کا ابھرنا بند ہو چکا تھا۔ میرا فلسفے کا مطالعہ بالاستیعاب نہیں ہے۔ اور فلسفے کی جو ہمہ گیری ہوتی ہے اتنا ہمہ گیر میرا مطالعہ بھی نہیں

ہے فلسفوں کے متعلق اردو میں جب فلسفوں کے حقیق جاننے والے باتیں کرتے ہیں۔ تو وہ باتیں ان کو زیب نہیں دیتی ہیں۔ میرا فلسفہ پر باتیں کرنا محاورۃً محض فلسفہ بگھارنا ہوگا۔ مارکس کے فلسفے نے زندگی کے بہت سے شعبوں کو متاثر کیا۔ اور جب زندگی کے بہت سے شعبے متاثر ہوں تو یہ شاید ممکن نہیں ہے کہ فنون لطیفہ اثر قبول نہ کریں۔ ادیب و شاعر کے نظریات اس معنی میں تو نہیں بدلتے کہ بات سفید سے سیاہ اور سیاہ سے سفید ہو جائے لیکن بنیادی رنگ سے ہٹ کر ایک نیا شیڈ ضرور بن جاتی ہے۔ اور کچھ عرصے کے لئے ایسا لگتا ہے کہ وہی SHADE حکمرانی کرتے ہیں۔

انقلاب روس کے بعد، ۱۹۱۷ء مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ

ہر طرح کی ترقی کی ذمہ دار ٹھہرائی گئی،، زار کی بادشاہی گئی۔ مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ کے نام سے روس میں شخصی دبدبے اور حکومت کا دور شروع ہوا، لینن اور اسٹالن سیاست، زراعت، ادب شاعری تہذیب ہر شعبے کے رہبر رہنما اور مربی بن گئے۔ ان دونوں کے ذہن اب دانشور ہوتے ہیں کسی کو شبہ ہو تو کم از کم مجھے تو شبہ نہیں۔ تاریخ گواہ ہیں کہ گورکی کی لینن سے بنی نہ اسٹالن سے ہی بنی۔ مایکوفسکی جیسا شاعر خودکشی کرنے پر مجبور نہ ہوا۔ یونین بننے لگی تو مزدور کی یونین تو بنی ہی دانشوروں اور ادیبوں کی بھی یونین بننے لگی اور روس میں سند بن تقسیم ہونے لگیں کہ کون ادیب ہے کون شاعر ہے۔ کون کس درجے کا ہے اور کس عہدے پر فائز کیا جانا چاہیئے۔ اسٹالن کے زیر اثر ادیبوں کی تنظیمیں یہ سب کچھ طے کرنے لگیں۔ آج کے اردو ادب کے دور

میں تقریباً یہی کچھ ہو رہا ہے۔ سرکاری ادبی انجمنیں کے نام پر وہی تماشا دکھلا رہی ہیں جو روس کے دکھلایا کرتے تھے۔ ترقی پسندی کا مفہوم اگر یہ لیا کہ ادب و شاعری کا معیار اونچا بھی ہو۔ اور اس پھیلاؤ بھی بڑھتا جائے تو ترقی پسندی آج سے انکشافات کے زمانے میں زیادہ معنویت رکھتی اس زمانے کے جب انکشافات کی یہ نوعیت آئندہ جیسے جیسے ذرائع ابلاغ میں ترقی ہوگی و ویسے ترقی پسندی کی معنویت بڑھتی جائے ترقی پسندی جدلیات کی محتاج نہیں۔

اردو کا تعلق ہندوستان سے ہے ادب پسندی کی پیدائش کا زمانہ لوگ بتاتے ہیں کہ ہے۔ یہ پورا سچ تو کیا ادھورا سچ بھی نہیں ہے جبریت کا یہ تقاضا تھا۔ کہ انگریزوں کی غلامی کرنے کے ساتھ ساتھ زوال آیا وہ معاشرے ہونے والا ادب بھی ہمارے غصے کا شکار ہو۔ ترقی پسندی کے نام پر جہاں اچھا ادب پیدا غیض و غضب کے عالم میں ادب و شاعری کے جہاں تہاں بہت ہی پست کر دیا۔ اس لئے ترقی مصنفین کے سرمایۂ ادب کو چھاننے پھٹکنے بے حد ضروری ہو گیا ہے۔ اگر ہندوستان زبان زندہ رہی تو یہ کام جو شروع ہو چکا ہے رہے گا۔ ویسے اردو کے لئے گوشۂ عافیت پاکستان کی شکل میں تو موجود ہے ـــ اس جواب کے لئے سیکڑوں صفحات کی ضرورت سوال کرنے والے میں حوصلہ اور توانائی ہو تو دینے میں اگر حوصلہ ہو بھی تو توانائی نداد۔

ع ج:۔ افسانے کی زبان شاعری کی زبان سے کس
حد تک مختلف ہے؟

ک ج:۔ افسانے کی زبان شاعری کے زبان سے مختلف
ہوتی ہے۔ یہ علیحدہ بحث ہے کہ افسانے کی زبان
کو شاعری کی زبان سے مختلف ہونا چاہیئے یا نہیں
ہونا چاہیئے۔ میں "چاہیئے" لفظ کے استعمال
سے اس لئے پرہیز کرنے کو کہتا ہوں کہ یہ لفظ
تنقیدی مباحث میں بیکار سا لفظ ہے مثلاً
اگر میں یہ کہوں کہ بہار میں یا بھوپال میں ایک غالب
پیدا ہونا چاہیئے۔ دیکھئے کہ یہاں لفظ "چاہیئے"
کس قدر بھونڈا اور بے معنی لگتا ہے۔ شعر اور
افسانے کی زبان میں الفاظ کی حد تک تو ایسا کچھ
بھی نہیں ہوتا کہ جو مختلف ہوں۔ مثلاً افسانے
میں محبت، عشق، دغا، وفا سارے الفاظ
استعمال ہوتے ہیں۔ اور شاعری میں بھی ہوتے ہیں
لیکن ان کو جب افسانے میں استعمال کیا جاتا ہے
تو یہ جو لذت دیتے ہیں اس سے کہیں بڑھ چڑھ
کر شاعری میں یہی الفاظ مزہ دیتے ہیں۔ افسانے
میں زبان، واقعہ، سانحہ یا حادثہ کے تابع ہو جاتا
ہے۔ اور شاعری میں زبان موسیقی بن جاتی ہے۔
کبھی کبھی کسی افسانے کی زبان کی تعریف کرتے
ہوئے بعض نقادوں نے یہ لکھ دیا ہے کہ اس
افسانے کی زبان شاعری کی زبان ہو گئی ہے۔
یا شاعری سے قریب ہو گئی ہے۔ اور یہ سنتے ہی
افسانہ نگار بہت خوش ہو جاتا ہے کہ اس کا افسانہ
افسانہ تو ہے ہی زبان کے لحاظ سے شاعری بھی
ہو گیا۔ حالانکہ اسے اس بات پر افسوس ہی کرنا
چاہیئے کہ اس کے افسانے کی زبان نثر نہ
ہو کر شاعری ہو گئی۔ یا شاعری کے قریب ہو گئی ہے
کیونکہ افسانے میں استعمال کی گئی زبان افسانے
کی کے کام آتی ہے۔ اگر بھونڈے پن سے الفاظ
استعمال کئے جائیں گے تو افسانہ کامیاب ہو ہی
نہیں سکتا۔ بھونڈے پن کو آرٹ بنانا انشائیہ لکھنے
والوں کا کام ہے۔ اس لئے میں انشائیہ کو بھی
تخلیق کا مرتبہ دیتا ہوں۔ کرشن چندر کے کامیاب
افسانوں میں الفاظ کا بے دریغ خرچ ملتا ہے
لیکن اس کے یہاں اس کے افسانے "آدھے گھنٹے
کا خدا" میں الفاظ کو بے دریغ خرچ نہیں کئے
اس کا ناول شکست، الفاظ کے بے دریغ
خرچ کی وجہ سے بھی ناکامیاب ہو گیا۔ قرۃ العین
حیدر کے یہاں الفاظ کے استعمال کا جو سلیقہ
ملتا ہے وہ انہیں بڑا فکشن رائٹر بننے میں
مدد کرتا ہے۔ عصمت چغتائی کے یہاں زبان
کی چٹک مٹک اور چٹخارے ہیں لیکن جس طرح
چٹنی اور اچار سے پیٹ نہیں بھرا جا سکتا
اسی طرح چٹخاروں سے سیر نہیں ہوا جا سکتا
میں اتنے بڑے بڑے لوگوں کے نام لیتے ہوئے
کسی کی ناکامیابی کا اگر ذکر کر رہا ہوں تو اس
سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ میں انہیں حقیر کر رہا
ہوں میں انہیں بہادری کی ایک مخصوص سطح پر
رکھنے کے بعد ہی اس کے متعلق کچھ عرض کر
رہا ہوں۔ نام مجھے یاد نہیں پڑ رہا ہے کسی فرانسیسی
نقاد نے شعر کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ شیل
ٹاک ہے۔ کوئی کمزوری نہیں کی نثر کی اصل

تعریف کو حرفِ آخر کہا جائے یا سب کچھ سمجھ لیا جائے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ منٹو کے افسانے کی نثر فیملی ٹاک جیسی لگتی ہے۔ نثر کی بھی اپنی موسیقی ہوتی ہے اس میں جھنکار نہیں ہوتی۔ تان اور الاپ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن گھنگھروؤں کی ہلکی ہلکی چاپ اچھی نثر میں ہوتی ہے۔ فکشن کی زبان کرداروں، کرداروں کے مزاج کرداروں کی عادتوں ـــــ سب سے متاثر ہوتی ہے اور جو فکشن رائٹر ان گھاٹیوں اور اتار چڑھاؤ سے سلامت گذر جاتا ہے وہی داد پاتا ہے۔ اور اپنے قاری کا بڑا حلقہ بھی پیدا کر لیتا ہے اور عصری ہونے کے علاوہ ماورائے عصر بھی ہو جاتا ہے۔

فکشن کی زبان میں ایک سہک اور چہل پہل ہونی چاہیئے۔ چہل پہل سے میری مراد یہ نہیں کہ اس کی اس کی زبان سے سوز نمائش ہو جائے بلکہ میرا مفہوم یہ ہے کہ فکشن کی زبان اونگھتی ہوئی نہ لگے۔ بیدار اور بولتی ہوئی لگے۔ فکشن کی زبان کے سلسلے میں میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ بہت لمبے لمبے جملے نہ ہوں تو جملوں کی اثر انگیزی بڑھتی ہے۔ فکشن کی زبان میں استعمال کیا گیا لفظ افسانے کو وہی کچھ دے جو اس مخصوص افسانے کی ضرورت ہو

ع ح :۔ افسانے کی صنعتی حیثیت کے بارے میں آپ کا کیا تصور ہے ؟

ک ح :۔ مجروح سلطان پوری کا ایک شعر ہے

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا۔

افسانے کی صنعتی حیثیت کے سلسلے میں مختصر افسانے کو تخلیق کے دائرے سے خارج جانتے ہیں وہ دراصل ناول کے مقابلے میں نثر کے چھوٹے ہونے کو اس کی اہمیت کی کسو ہیں جس طرح کسی ناول یا ڈرامے کے بارے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کتنے الفاظ پر مشتمل طرح مختصر افسانے کے بارے میں یہ بھی نہ جا سکتا کہ اسے کتنے الفاظ پر مشتمل ہونا چاہ مختصر افسانہ طویل مختصر افسانہ منی افسانہ۔ سب ذہنی آزادی تخلیقی پابندیوں سے کی پیداوار ہیں بات دراصل یہ ہے کہ کسی صنف لئے اصول پہلے نہیں بنائے جاتے۔ اور نہ ہیں۔ کہ جن کو سامنے رکھ کر مختصر افسانہ یا کسی پارے کو خلق کیا جا سکے۔ پہلے کوئی صنف ہے کچھ عرصے تک اس کے مختلف نمونے سا ہیں۔ پھر عالم نما منل لوگ ان فن پاروں اجزا کو تلاش کرتے ہیں۔ ان کا نام رکھتے ہیں کے استعمال کے طریقے کرتے ہیں۔ کیا جانے لگتا ہے کہ مختصر افسانے کے اجز یہ ہیں اور وہ نہیں ہیں جو نقاد کسی صنف کے پر اصرار کرتے ہیں۔ جو دراصل بلاواسطہ تخلیق کا منہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حا اس میں کامیاب نہیں ہو پاتے تخلیقی ابال کو قبول نہیں کرتا۔ اور ہر رکاوٹ کو دور نمودار ہو جاتا ہے۔

اچھا ادب اور بڑا فن شاید کوئی کبھی نہیں ادب بڑا فن کا اسے ہوتا ہے کہ وہ جس صنعت کو ہاتھ

سے وہی صنف اہم اور عظیم بن جاتی ہے۔ مثالوں کی کمی نہیں ہے اور نثری کی پوری ادبی حیثیت مختصر افسانے پر کھڑی ہے۔ کوئی یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ مختصر افسانے پر کھڑی ہوئی یہ بڑی شخصیت ناول نگار سے چھوٹی ہے یا ڈرامہ نگار سے کم تر ہے۔

اگر مختصر افسانے کی صنف اہم نہ ہوتی تو ہر سال دنیا کی ہر زبان میں اتنے زیادہ مختصر افسانے نہ لکھے جاتے اور مختصر افسانوں کے انتخابات بھی نہ شائع ہوا کرتے۔ اگر ایک ایکٹ کا ڈرامہ اہم ہے تو مختصر افسانہ اہم صنف ادب کیوں نہیں … بڑی ادبی شخصیتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اور ایسا اس کے مختصر افسانوں کی وجہ سے بھی ہو سکا۔ میرا ساں اگر اہم ہیں تو مختصر افسانے کی صنف بھی اس کی طرح اہم ہے۔

کبھی یہ بات نئی رہی ہوگی مگر اب یہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے کہ مشینی دور میں آدمی کی زندگی بہت مصروف ہو گئی۔ اسے کم وقت ملنے لگا۔ اسی لئے مختصر افسانے کی ایجاد ہوئی۔ یہ بات جب نئی تھی تو اس وقت بھی غلط تھی۔ اور آج جب پرانی ہو چکی ہے تب بھی غلط ہے۔ ورنہ مشینی دور میں بڑے بڑے ناول نگار کیوں اور کیسے پیدا ہو گئے۔

شولوخوف، ایلیا ایلین برگ، … نے خود اپنی زبان اردو میں "لہو کے پھول" جیسا ضخیم ناول کیوں کر لکھا گیا۔ پچھلے دس بارہ سال میں اردو ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں اچھے ناول لکھے لکھے گئے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ مختصر افسانے بھی معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے آگے بڑھے ہیں۔ پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی ناولوں کے ساتھ ساتھ مختصر افسانے نے اپنی اپنی آبرو برقرار ہی نہیں رکھی ہے بلکہ بڑھائی بھی ہے۔ نام لینا ہو تو بہت سے نام گنائے جا سکتے ہیں لیکن ڈر یہ لگتا ہے کہ سارے نام کی فہرست شاید بنانا ممکن نہیں۔ اردو میں منٹو نے کوئی ناول نہیں لکھا لیکن اردو کا کوئی ناول نگار منٹو کی بڑائی سے انکار نہیں کر سکتا اور ایسا کرنے کی جرأت کوئی نقاد بھی نہیں کر سکتا۔

مختصر افسانے کی صنف بہر حال مقبول مشہور، معتبر اور مستند ہے۔

ع ح:۔ آپ کی تخلیقی شخصیت کے محرکات کیا ہیں؟

ک م:۔ ینگ پہلے فرائیڈ کا ہم نوا تھا۔ بعد میں اس کا فلسفہ فرائیڈ سے ہٹ کر زمانے کے سامنے آیا اس کے آرکی ٹائیپ دباؤ کے فلسفے میں بڑی حد تک سچائی ہے۔ وہ خوابوں کے تجزیے اور تحت الشعور وغیرہ پر زیادہ بھروسہ نہیں کرتا بلکہ وہ کئی پشتوں قبل کے اثرات کا ظہور موجودہ کسی فرد میں دیکھتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص بہت اچھا شاعر ہو گیا۔ اور اس کے شاعر ہونے کے محرک کی تلاش تحقیق کرنے والوں نے شروع کی تو پتہ چلا کہ نہ باپ کو اس کا ذوق و شوق یا صلاحیت تھی نہ دادا کو تھی نہ نانا کو تھی … جس کے درمیان اس نے پرورش پائی ان میں ادب و شاعری کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ شاعر اور اچھا شاعر کیسے پیدا ہو گیا۔ ہلکی پھلکی معمولی درجے کی یا کسی حد تک اچھی شاعری تک تو اس کی اپنی کوشش سے پہنچ ہو سکتی ہے لیکن اعلیٰ درجے کی شاعری وہ کیوں کر کر سکا۔ ینگ کے

مطابق ایسا اس لئے بھی ہو سکتا ہے کہ اس فرد کے خاندان میں کوئی ایسا شخص ہوا تھا۔ جو اعلیٰ شاعری کا ذوق رکھتا تھا۔ ادب کی تاریخ میں اس کا نام بھی لیا جاتا ہو۔ لیکن یہ پتہ نہ ہو کہ وہ بڑا شاعر اس کے پرکھوں میں سے ایک تھا۔ ینگ کے فلسفہ کی بنیاد پر اردو تنقید میں کچھ کام ہوئے ہیں۔ میں اپنے ارد گرد دیکھتا ہوں تو میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ میرا ماحول خاصا غیر ادبی رہا۔ میرا ددیہال وکالت کے پیشے سے منسلک رہا۔ والد صاحب پولیس میں داروغہ رہے۔ نانیہال ڈاکٹری کے پیشے میں رہا۔ یہ مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ میرے پردادا امیر حیدر صاحب شاعر ہاتف بہاری کے استاد تھے ہاتف بہاری پر تحقیقی مقالہ بیگم پروفیسر احمد سجاد نے لکھا ہے۔ ان کے مقالے میں اس بات کا ذکر ہے۔

پانچ برس کی عمر سے لے کر دس برس تک میں اپنے نانا ڈاکٹر علی حسن صاحب کے ساتھ قصبہ جلیسر ضلع ایٹہ (یوپی) کے محلہ نوشیان میں رہا۔ اور ابتدائی تعلیم جو صرف حساب اور اردو تک محدود تھی۔ وہیں حاصل کی۔ میرے نانا مذہبی آدمی تھے نیکی اور شرافت کے لئے ان کی شہرت علی گڑھ اور آگرہ تک تھی۔ بحیثیت ڈاکٹر بھی وہ بہت کامیاب تھے مذہبیات کا مطالعہ ان کا خاص شغل تھا اس کے علاوہ وہ تاریخ کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔ روزانہ رات میں وہ تذکرۃ الانبیاء سے نبیوں کے حالات ان کے معجزات وغیرہ مجھے سنایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبروں کی حکایت میں بہر حال قصہ کردار اور مکالمے بھی ہوا کرتے تھے۔ میں انبیائے کرام کے تذکروں میں قصے کی دلچسپی محسوس کرتا تھا۔ اور اگر نانا مرحوم بھول بھی جاتے تھے تو میں ان سے فرمائش کر کے انبیائے کرام کے تذکرے سنتا تھا پھر انہوں نے الف لیلہ کے قصے بھی سنائے فردوسی کے شاہنامہ بھی شام کے وقت پڑھ کر سناتے۔ رستم سہراب، کیکاؤس، کیخسرو، افراسیاب، مازندران، سیاوش، منوچہر، نرآنمر، بیژن، گیو، گودرز، یہ تمام کردار مجھے آج تک یاد ہیں رستم کا ہفت خواں طے کر کے اپنے بادشاہ کیکاؤس کو مازندران کی جناتی حکومت سے واپس لانے کا قصہ یہ سب نانا ابا مرحوم نے سنایا اور پھر اردو میں شاہنامہ منگوا بھی دیا۔ جسے میں بڑی دلچسپی سے پڑھتا رہا۔ ایک بار نانا ابا مرحوم سے میں نے ڈانٹ بھی سنی۔ کہ جب میں حدیث کا مطالعہ کر رہا تھا اور اس میں جو یہ لکھا رہتا ہے کہ ایک شخص آیا اور اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا اور انہوں نے یہ فرمایا ـــــ اس کو بھی میں نے اپنے بچپن میں قصہ کہانی سمجھا اور پڑھ ڈالا ہو سکتا ہے کہ میری افسانہ نگاری انہیں باتوں کی پیداوار ہو۔ ہماری بادشاہی، نام کی کوئی تاریخ کتاب تھی جسے میں نے پڑھا۔

روزنامہ ملت، اور ہفتے میں دو بار چھپنے والا مدینہ اور ندوہ سے شائع ہونے والا صدق ظاہر ہے کہ یہ سب اخبارات اور رسائل میں پڑھتا ضرور تھا۔ مگر سمجھتا بہت کم۔ خصوصاً صدق کے مضامین کو سمجھنا تو مشکل تھا ہی بریلوی جو چھپے پڑے تھے ان کا نام مولوی اللہ بخش تھا اور نانا ابا کے

ایک ملازم جو منگلیہا تھا پاؤں کے تھے ان کا نام
پیر بخش تھا۔ شفیع الدین نیرؔ کی بچوں کی نظمیں
اس زمانے میں چل پڑی تھیں۔ یہ بات میں ۳۷/۱۹۳۶ء
کی کر رہا ہوں۔ مسدس حالی کے کئی حصے مولوی اللہ
بخش نے مجھے رٹوا دیئے تھے۔ تختی لکھتے لکھتے میرا
برا حال تھا۔ جبکہ ورقی کی کتاب علم الحساب اردو
میں یعنی ارتھمیٹکس شروع سے آخر تک مجھے پیٹ
پیٹ کر پڑھا دیا تھا۔ وہاں سے جب والد صاحب
کے پاس واپس آیا تو ایک دو سال تک گھر پہ
انگریزی پڑھنے کے بعد آٹھویں کلاس میں پٹنہ
مسلم ہائی اسکول میں نام لکھوایا۔ آٹھویں پاس
کرنے کے بعد نویں درجے میں رام موہن رائے
سیمنری میں داخلہ لیا۔ یہ ۱۹۴۲ء تھا۔ ۹ اگست
۱۹۴۲ء میں اپنے اسکول کا گیٹ توڑ کر دوسرے
لڑکوں کے ساتھ اندولن میں شریک ہو گیا جس کی
سزا کے طور پر مجھے اسکول سے RESTRICATE کر دیا
گیا۔ اور میں پٹنہ سے بھاگ کر بڑہیا کے پاس مونگیر
ضلع کے ایک گاؤں ملک چک میں روپوش ہو گیا
کئی مہینے ملک چک اور ننیہال رانکر میں رو
پوش رہ کر دسمبر ۴۲ء میں پٹنہ آیا اور پھر پٹنہ مسلم
اسکول میں پرائیوٹ طور پر نویں درجے کا امتحان
دیا کیونکہ جعفری صاحب ہیڈ ماسٹر مجھے بہت
چاہتے تھے۔ اس لئے میں نے اپنا نام بدل کر
امتحان دیا۔ یعنی بجائے سید شاہ محمد کلام الحق کے ایم کے
ایچ حیدری تحریر ہو گیا۔ جعفری صاحب یہ جانتے
تھے کہ میں RESTRICATE ہو گیا ہوں انہوں
نے اس کو پوشیدہ طور پر راز میں رکھا۔ جعفری

صاحب پٹنہ سیٹی کے رہنے والے تھے تقسیم
کے بعد کراچی چلے گئے۔ میں نے پٹنہ مسلم ہائی
اسکول سے ۱۹۴۵ء میں میٹرک پاس کیا۔ اس
وقت میٹرک کا امتحان بھی پٹنہ یونیورسٹی کے تحت
ہی ہوا کرتا تھا۔

اس اسکول کے زمانے کی قابل ذکر دیگر
باتوں کے ساتھ ایک اہم بات یہ ہے کہ میں
گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ میں صبح اور شام
دونوں وقت لائبریری کھلنے اور بند ہونے
تک افسانے اور ناول پڑھتا تھا۔ رسالے کے
فائل سے چن چن کر صرف کہانیاں پڑھا کرتا تھا
تیرتھ رام فیروزپوری کے تمام جاسوسی ناولوں
کو بھی پڑھ لیا تھا۔ اور ل احمد اکبرآبادی کا
ترجمہ لالہ رخ، شہاب کی سرگزشت، (نیاز
فتحپوری) جمیل مظہری کی شکست و فتح اور
جمالستان، نگارستان، ناول شمیم الغرض
گورنمنٹ اردو لائبریری میں ایسی کون سی کہانی
تھی اور ایسا کون سا ناول تھا جو میں نہیں پڑھا
ہو۔ والد صاحب کی پوسٹنگ دانا پور ریلوے
اسٹیشن کے ریلوے تھانے میں تھی۔ کھگول میں
ریلوے کے DEV.SUPTT کا آفس تھا۔
اور ریلوے کے بے شمار کوارٹر تھے۔ یہیں ریلوے
کے ملازم رحمت علی صاحب رزمی رضوی بھی تھے۔ جو
پنجابی تھے۔ ان کے ساتھ ایک بھتیجا تھا جن کا
نام منظور عالم تھا کھگول میں ہی کسی اسکول میں
پڑھتا تھا۔ جن میں میری خوب ملاقاتیں ہوتی
ہوتی تھیں۔ رحمت علی صاحب رزمی رضوی افسانہ نگار

تھے۔ زود نویس بھی تھے۔ لاہور سے نکلنے والے رسالے خیام، مست قلندر، اور اپنے بہت سارے رسالوں میں ان کی کہانیاں چھپا کرتی تھیں جو عموماً انگریزی ناولوں کی کہانیوں سے ماخوذ ہوا کرتی تھیں کیونکہ مکمل ریلوے سنیما میں انگریزی فلمیں ہی دکھائی جاتی تھیں اور وقت مسل صابر نوشہروی اس سنیما کے گیٹ کیپر بھی کرتے تھے۔ گیٹ کیپر سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ چپراسی وغیرہ تھے۔ وہ ٹکٹ کلکٹر تھے ان کو جو کوارٹر ملا ہوا تھا اس میں منظور عالم اور ان کے سوا کوئی تیسرا آدمی نہیں رہتا تھا۔ چنانچہ لاہور کے جتنے رسالے ان کے یہاں آتے تھے ان سب کو میں پڑھا کرتا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں ان میں چھپی ہوئی کہانیاں پڑھا کرتا تھا۔ منظور عالم گوشت روٹی پکایا کرتا تھا۔ اور پرانے پرانے پرچوں کے بنڈل کباڑی سے علاوہ بیتا تا تھا۔ اس نے بھی ۱۹۴۵ میں میٹرک پاس کیا۔ میری اس کی آخری ملاقات ۱۹۴۸ میں راکچی میں ہوئی۔ جہاں سے وہ ۴۸ میں بی۔ اے۔ پاس کرنے کے بعد لاہور چلا گیا

اردو والے پچھلے ہر سال میں جتنے بھی ناول لکھے پائے ہیں ان میں قرۃ العین حیدر کو چھوڑ کر زیادہ تر ناولوں کو پڑھیے تو لگتا ہے کوئی فلسفہ یا کوئی المیہ پہلے سے ذہن میں موجود رہتا ہے اور وہ اس مخصوص فلسفہ یا فلسفہ، المیہ کے لئے ناول کی تخلیق کر رہے ہیں۔ کوئی ہے کہ ادھر کچھ تاریخ علم کو بغیر کسی تاریخی تسلسل

اور فلسفہ کے قصہ گڑھنے کی بچکانہ کوشش کئے چلا جا رہا ہے اور اسی دھاچو کڑی میں کوئی کردار کھڑا ہوتا ہے گرتا ہے۔ کسی کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے کسی کا ہاتھ ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور اس عالم میں کسی طور ناول ختم ہو جاتا ہے تو ہندوستان میں کوئی اکادمی اس کو شائع کرا دیتی ہے۔ اور تب کوئی اکادمی اس کو کوشش پیروی کے تحت کوئی ایوارڈ دے دیتی ہے۔ ہندوستان میں لکھے جانے والے اردو ناولوں کا ذکر بہت طویل ہو سکتا ہے لیکن اس میں وقت اور محنت دونوں کی بربادی ہے۔ سارتر، کافکا اور اس طرح کے بلند قامت فکشن تخلیق کرنے والے لوگوں کے نام اردو کے تعلیم یافتہ، نیم تعلیم یافتہ، غیر تعلیم یافتہ نام نہاد لکھنے والوں کی زبان پر جگہ بے جگہ سنے جاتے ہیں۔ کافکا کے یہاں وہ وہ چیزیں تلاش کر لی جاتی ہیں جن کا ہونا کوئی ہنر نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو وہ کافکا کے یہاں نہیں ہے۔ لیکن جیسن شاہراہ پر ٹرانک جام ہو وہاں ٹرانک سپاہی کے ہسلن سے کر قسم قسم کے اسلئے کے سوا اور کیا شائی پڑ سکتا ہے۔

میرے ذہن میں کبھی مہاجر وسں کے بارے میں بہت سے لوگوں کی کہی ہوئی باتیں ہیں اور لکھی ہوئی باتیں ہیں ان میں کچھ ایسی بھی باتیں ہیں جن پر میں نے رک کر توجہ کی اور ان باتوں سے کچھ سیکھا بھی لیکن زیادہ تر باتیں ایسی تھیں

کہ ان باتوں نے مجھے حیران اور ششدر ضرور کیا
مگر اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑا۔ اگر اسے OVER
SIMPLIFICATION نہیں کہا جائے تو عرض
کردوں کہ METAMORPHOSIS کا بیمہ ایجنٹ کردار
آدمی کے DESTINY اور اس کے آخری نتیجے
کو ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ یعنی MEANS
ہے جیسے کہ وہ ایجنٹ کامیاب شخص ہے جو اپنے
پیشے میں ماہر ہے اور اسے قدرت حاصل ہے
کہ وہ جب چاہے اور جس سے چاہے ملاقات
کرے اپنی بات اس سے منوا لے اور اس کے نتیجے
میں اس کا گھرانا خوش حال اور فراغت کی
زندگی گذارے۔ اچانک یہ ایجنٹ محسوس کرتا
ہے کہ وہ آدمی نہیں ہے بلکہ ایک کئی ہاتھوں اور
ٹانگوں والا کیڑا بن گیا ہے۔ اور بستر پر بے انتہا
معذور اور مجبور کیڑے کی طرح پڑا ہوا ہے وہ
دیکھتا سب کچھ ہے اور کمرے سے باہر کی آواز
بھی سن سکتا ہے دیکھ سکتا ہے لیکن چل پھر نہیں
سکتا۔

اس کے گھر والے اس کو دیکھتے ہیں تو
خوش نہیں ہوتے بلکہ انہیں اس کو کیڑے کی شکل
میں دیکھ کر شرمندگی اور ندامت محسوس ہوتی
ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے اور رشتہ دار
یا ملنے جلنے والے یا محلے کے لوگ یہ جانیں کہ
ان کے گھرانے کا سربراہ اس شرمناک حالت
میں معذور پڑا ہے۔ انسانی زندگی کا یہ المیہ
تو دیکھئے۔ استخوان تک کو چٹخا دینے والا ہے
کہ جو شخص جس گھرانے کے لئے باعث عزت
اور باعث وقار اور سامان فخر تھا وہ اس
حالت میں پہنچ گیا کہ اس کے گھر کے ہی لوگ
اب اسے ننگ وجود تصور کرنے لگے ہیں۔
اور اس کے ساتھ سلوک بھی ویسا ہی کرنے لگے
ہیں۔ کہ جیسے وہ ننگ وجود ہو گیا ہو اس کے
BED ROOM کی کھڑکیوں کے
پردے کھینچ دیئے گئے ہیں۔ کہ کسی کی اس
پر نظر نہ پڑے۔ مشہور کر دیا گیا ہے کہ اس مرض
میں ڈاکٹر نے اسے دیکھنے کی ممانعت کی ہے۔
حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ وہ اس کو کسی کو
دکھلا کر شرمناکی کا شکار نہیں ہونا چاہتے تھے
بجائے اس کے کہ وہ اس سے محبت کرتے اس
کی دیکھ ریکھ کرتے اس کی خدمت کرتے وہ اسے
ننگ وجود سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد
اسے ماسٹر بیڈ روم سے ہٹا کر گھر کے کسی ایسے
چھوٹے سے کمرے میں رکھ دیتے ہیں۔ جہاں کسی
کا گذر نہ ہو۔ روز بروز اس کی صورت کو اس
شکل میں دیکھنا اسے جیسے تیسے کھلا پلا دینا اور
کہیں لوگ اسے نہ دیکھ لیں اس کی شرمساری
کے خوف سے گھر بھر اسی کشمکش میں مبتلا رہتا تھا
لفظوں کے سہارے حالات اور گھر کے اندر
کی کیفیات سادے ڈھنگ سے بغیر کسی شعبدہ
بازی کے کاغذ پر پھیلائی ہیں۔ اور آنچ کہیں
دھیمی اور کہیں تیز رکھی ہے۔ مگر آنچ کو وہ شعلہ
کہیں نہیں بننے دیتا۔ جیسا کہ ادھر کے ناول
نگاروں کے یہاں ہو گیا ہے کہ شعلوں کی لپکتی زبانیں
فکشن کی خوبیوں کو کھا جاتی ہیں۔

ناول ختم کرنے کے بعد آدمی کو ایسا محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے وہ عجیب و غریب دنیا کا پورا سرکل بنا کر
بذات خود ایک دنیا بن گیا ہے ۔ وہ فرد جو کیڑا
بن گیا تھا جس دن مرتا ہے اسے تابوت میں ڈال
کر جب اسے آخری منزل پر پہنچا دیتے ہیں ۔ تو
آدمی کے DESTINY کا اور اس کی
SUFFERING کا مرنے سے پہلے جو بیان
ہوتی ہے وہ انسانی زندگی میں بے معنی پن
کو اتنے فن کارانہ طور پر پیش کر رہی ہے کہ پڑھنے
والا کچھ دیر کے لئے محسوس کرتا ہے جیسے وہ خود
کیڑا بن گیا اور جیسے اس پر ساری چیزیں بیت
رہی ہیں ۔ جو کافکا کے ناول کے کردار پر بیتیں ۔
میں نے کہیں OVER SIMPHITI CATION
لفظ استعمال کیا ہے ۔ مگر میں نے یہ بتایا نہیں
کہ وہ کہہ کر کیا کہنا چاہتا ہوں ۔ آپ عام طور پہ
دیکھئے تو یہ تقریباً ہر گھر کی کہانی ہے ۔ آدمی اپنا
کیریر شروع کرتا ہے ۔ جد و جہد اہل و عیال کے
لئے تنگ و دو ، خوش حال ہوتا اور بناتا ہے پھر
عمر طبعی کو پہنچ کر بیمار پڑتا ہے ایک کمرے سے
دوسرے کمرے ۔ دوسرے کمرے سے برآمدہ
اور ہر شخص اس سے کترا تا گذرتا ہے ۔ اور جب
وہ شمشان گھاٹ یا قبرستان پہنچا دیا جاتا
ہے ۔ تو گھر والوں کے سامنے خوشی کا دن ہوتا ہے
کہ ایک عذاب تھا جو ٹل گیا ۔ اور اس طرح کافکا
کے اس ناول کے ہیرو کے قبرستان میں لیجانے
کے بعد اس کے گھر والے گھومنے کے لئے گھر سے
باہر نکل جاتے ہیں ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح
وہ کیڑے بن جانے والے کے ساتھ پکنک منانے
باہر جاتے تھے ۔ اور وہ دن تھا اسکے دن کی عید
مناتے تھے ۔ سوال یہ ہے کہ یہ اسے عام کہانی سمجھ
ہوں تو کیا میرا مفہوم یہ ہے کہ میں کافکا کو وہ
مرتبہ نہیں دینا چاہتا ہوں جس کا وہ حقدار ہے
ایسا نہیں مدعا صرف یہ ہے کہ بڑی باتوں کو بیان
کر کے بڑا بننا شاید آسان ہو تو ہو لیکن عام بات
کو سائنس کی بات کو فکشن کا روپ دینا کر ا
اچھے پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان صدیوں
گفتگو کا موضوع بنا ہے ۔ کوئی معمولی بات
ہرگز نہیں ۔ اس میٹا مورفوسس کا موازنہ
مقصود نہیں مگر مجھے لگتا ہے کہ ہمینگ وے
کے ناول OLD NAMAMD THE SEA
زندہ رہنے کی جس جد و جہد کی کہانی ہے وہ
اپنی جگہ پر بڑی عمدہ کہانی ہے اور آدمی
اندر جیوٹ پیدا کرتی ہے ۔ لیکن کافکا
میٹا مورفوسس جیوٹ کے بجائے آدمی
کو ہراساں کرتا ہے ۔ اسے ہزیمت پسند
ہے مقدر ایک سچائی ہے کیوں کہ
NAMAMD THE SEA میں بھی ہزار جد و
جہد کے باوجود وہ مچھلی شکار رہنے سے
نہیں پاتی کیوں کہ یہی اس کی تقدیر تھی ۔ بڑے
لوگ بڑا ذہن رکھنے والے ناول نگار یا شاعر
ہماری آپ کی طرح کے معمولی لوگ نہیں ہوتے
وہ زندگی کو یوں پڑھتے ہیں کہ ان پر زندگی کے
رموز کھلی کتاب بن جاتے ہیں اور ہمارے لئے
بہت سے عقدوں کو حل کر دیتے ہیں لیکن زندگی

شخصیت

—— ٠:٠ ——

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

محمد حسن دہلی

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"محمد حسن بھائی، میں کلام بول رہا ہوں، پرسوں میں اسکوٹش اسپتال میں دل کا آپریشن کے لیے داخل ہو رہا ہوں وہاں ملنے پر پابندی ہے واپسی پر ملاقات ہوگی، خدا حافظ"

کیسا جیتا جاگتا لہجہ تھا، کیسا جیتا جاگتا آدمی تھا۔

زندگی میں بہت سے لوگوں سے سابقہ پڑا ہے۔ ایسے جیالے، چلبلے اور ذہین لوگ کم ملے ہیں جو اس قدر خوش وقت اور منہ پھٹ بھی ہوں۔ اور یہ یادیں، یہ باتیں کم و بیش ۴۰ سال پر پھیلی ہوئی ہیں۔

واسطہ وہی ترقی پسند مصنفین کا تھا جس کے چار یاروں میں مظہر امام، انور عظیم، شکیل الرحمٰن اور کلام حیدری تھے۔ سبھی اختر اورینوی صاحب کے شاگرد تھے اور سبھی ان سے خفا کم و بیش، کیونکہ اختر صاحب نے انہیں پڑھایا تو ضرور، مگر ان کو اپنے شعبے میں کھپایا نہیں۔ اس قسم کے شکوے شکایتیں اکثر رہتے تھے۔

کلام ان سب میں زیادہ طرحدار تھے، مدتوں بعد ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ کسی مالدار گھرانے میں شادی کر لی ہے۔ بڑی مہذب بیوی ملی ہے۔ کاروبار میں بھی بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ گیا شہر میں ایک چھوڑ دو رسالے اور اخبار نکالتے ہیں۔ ایک مورچہ، دوسرا آہنگ۔ شہر بھر سے نہیں ادب بھر سے جیو تکھی لڑتے ہیں کسی پر حملہ چیکا، کسی پر مضمون لکھا بھلا ایسی چونچال اور شریر آدمی پر کس کا دل نہ آجائے گا۔

پھر اس سب پر مستزاد یہ کہ حسین و جمیل شخص تھے اور ہر چیز میں نفاست کو مدنظر رکھتے تھے۔ حد یہ ہے کہ باتیں کرتے وقت منہ کا زاویہ کیسا بنے گا، یہ بھی ملحوظ رہتا تھا۔ ادب ہو یا سیاست۔ سبھی معاملات میں ان کا خاص نقطہ نظر تھا۔

لیکن بنیادی طور پر وہ تھے ڈھیٹ کے آدمی۔ کلام کے لئے سب سے بڑے صدمے اور تعجب کی بات یہی ہو سکتی کہ سب لوگ ان سے اتفاق کرلیں۔ ایسے موقعوں پر وہ بڑی الجھن میں پڑ جاتے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ حزب مخالف کے لئے ہی پیدا ہوئے تھے۔ اور اپنے اس منصب کو انہوں نے بڑی طرحداری سے نباہا۔

اس چھیڑ چھاڑ میں انہیں بڑا مزا آتا تھا۔ پٹنہ میں ایک مذاکرہ تھا، مذاکرے میں ایک صاحب نے خاصی لمبی تقریر کی۔ مذاکرے کے موضوع تھے غالباً شاد عظیم آبادی۔ مقرر کی تقریر تھی حسرت موہانی پر۔ تقریر کے آخر میں مقرر

نے اعلان کیا کہ جہاں جہاں انہوں نے غلطی سے حسرت
کا نام لیا ہے اس کی جگہ سننے والے شاد عظیم آبادی سمجھیں ۔
کوئی کچھ سمجھا ، کوئی کچھ ۔ مگر ہنس کر سب چپ ہو رہے ۔
مجمع سے کلام حیدری اٹھے اور مقرر صاحب کا نام بدل کر
بلکہ مضحکہ خیز بنا کر دس منٹ تک بولتے رہے کہ جہاں انہوں
نے مسخ شدہ نام لیا ہے اس جگہ سننے والے محترم مقرر نام کا
اضافہ کرلیں ۔

کلام حیدری بڑے بے دریغ اور بے جھجک آدمی
تھے ، اختلاف میں سب سے آگے ، اور ادبی معاملات میں
بے لاگ ۔ ان کی شخصیت کے جوہر اختلاف ہی میں کھلتے
تھے ۔ مگر اختلاف کی اس اوپری سطح کے نیچے کتنی محبتیں ،
کتنی قربتیں ، اور کتنی لگاوٹیں چھپی ہوتی تھیں اس کا اندازہ
لگانا بھی دشوار تھا ۔ کیسا الکھڑ ادب دوست تھا یہ شخص
جو دور دراز گیا کے علاقے میں بیٹھا ایک جوڑ دو جریدہ نکالتا
تھا اور رسالہ میں ادب دوستوں کی محفلیں سجاتا تھا ۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

کہانیاں تھیں کہ ایک کے بعد ایک چھپتی رہتی تھیں پھر ادب کا
مزاج بدلا ، ترقی پسندی کا رواج کم ہوا ۔ اور جدیدیت کی ہوا
چلنے لگی تو کلام نے قلم نیام نہیں کیا ان کے افسانوں کا رنگ
ڈھنگ بھی بدلنے لگا ۔ ان کا رخ بھی مذہبی اور نیم مذہبی ،
اساطیر اور حوالوں کی طرف ہونے لگا ، الف لام میم ،
اور "لا" وغیرہ کے الفاظ سے نت نئی رمزیت برآمد کرنے میں
لگ گئے ۔ اس کے بعد ان کے ایک افسانے کے علاوہ جس
کا عنوان مجھے یاد نہیں رہا ان سے پھر ان کی کسی اور تخلیق
کے بارے میں بات نہیں ہوئی ۔

میں تو دراصل ان کی شخصیت کی تخلیق پر غور کرتا
تھا کبھی نچلا نہ بیٹھنے والا شخص جو ایک لمحے کے لئے بھی
کی طرح نچلا بیٹھنے کو تیار نہ تھا ۔ اینٹ کے روڑے کا جواب
بھی پتھر سے نہیں فولاد سے دینے میں لذت لیتا تھا جس
کے لئے زندگی ایک سفر تھی سہانا ، ہنستے کھیلتے گذرتی ہے
ایک دلخوش کن خواب کی طرح ۔ ایسے لوگ کہاں جو زندگی
کو دلفریب سفر کی طرح طے کرتے ہوں اور اس دلفریبی میں
دوستوں اور دشمنوں سب کو شامل کرتے ہوں ۔ نشاط
زیست کے ایسے مسافر کہاں ملتے ہیں ۔

یادوں کے یہ قافلے زندگی بھر مختلف موڑ سے
گذرتے رہے مجھے البتہ عجیب سا دھچکا لگا ۔ ایک بار دہلی
میں ایک مذاکرہ تھا محفل صدارت میں میرے ساتھ کلام
حیدری بھی تھے ۔ جب صدارتی تقریر کا موقع آیا تو کلام
حیدری نے بالکل دوسرے سرے سے بات شروع کی ۔ توقع یہ
تھی کہ ارکان مجلس صدارت کے بارے میں کچھ طنز و تعریض
ہو گی ، کچھ جلے مذاکرے پر ہونگے ۔ مگر کلام نے اچانک
شروعات کردی میری تعریف و توصیف کی کہ انہوں نے
میری بعض کتابیں پڑھ کر ایم اے کا امتحان پاس کیا ہے ۔
اور آج بھی ان کتابوں کا اثر ان پر طاری ہے ۔ جیسے
اچانک کوئی تیغ بدست سورما تلوار پھینک کر آپ کے گلے
لگ جائے ۔

اب ایسا سورما کہاں پیدا ہوگا ۔ اس کی یاد کو
گلے لگاتا ہوں ، وہی کیٹیلی مسکراہٹ وہی چشمے سے جھانکتی
ہوئی شریر آنکھیں ، وہی سادہ سا کرتا جس کی بائیں
طرف کے کنارے پر بٹن لگے ہوئے ہیں ۔ وہی ٹھہر ٹھہر کر
باتیں کرنے کا انداز وہی ٹھہرا ٹھہرا انداز گفتگو ۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

پھر کلام جیسی وابستگیاں ، بیوی سے ان کی محبت اور
شادی کی نشانی اکلوتی لڑکی سے ایسا لگاؤ کہ لڑکی کی
شادی دہلی میں کرنی پڑی تو خود بھی گیا چھوڑ کر دہلی آ بسنے کا ارا

ایک تجریدی سرگذشت

جوگندر پال، دہلی

کلام حیدری کو جہاں بھی جانا ہوتا، وہاں پہونچنے
ن اسے اتنی عجلت ہوتی کہ ساتھیوں کے ساتھ ساتھ چلنے
ڑے وہ اکثر بے چینی سے اپنے آگے آگے ہو لیتا، مگر
ہت آگے جا کے بھی وہ جب خود کو ویسے ہی اپنے
مراہیوں کی صحبت میں بدستور آہستہ رو پاتا تو سٹپٹا کر،
ہیں وہیں چھوڑ کر تیز روی سے اپنی راہ ہو لیتا۔ وہ
بھی منھ دیکھتے رہ جاتے۔

اسے کہاں جانا ہوتا تھا؟

کیا پتہ، کہاں! اکثر اوقات تو سب کے ساتھ
ظاہر ہنستے کھیلتے، گپیں ہانکتے بباطن وہ نہ جانے کہاں
ہو نکلا ہوتا ـــ شاید کسی محبوب مصنف کے یہاں،
س سے وہ ایک بار بھی مل پایا تھا، یا شاید
در اپنے ذہن کی اور، جہاں اسے اپنی کوئی نئی
ری کہانی آگے بڑھانا ہوگی، یا جارحانہ کوئی اداریہ
ھنا ہوتا، شاید کچھ بھی نہ کرنا ہوتا، یا سگریٹ پہ
سگریٹ پھونکتے ہوئے وہاں اکیلے میں کچھ سوچتا
رہتا ـــ کیا! ـــ کیا پتہ کیا؟

یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی گاڑھی محبتیں، نفرتیں یا معاملات
دل کے دل سے جو بھی ـــ اپنے جی ہی جی میں
انجام دے لیتا تھا ـــ کاروبار؟ ـــ نہیں،
بھائی، انکم ٹیکس یا سیلز ٹیکس کے فارم تو وقتاً
بھرنے پڑتے ہیں، مگر یہ روز تھوڑا ہی بھرنا ہوتا
ہے ـــ ہاں، یہی تو ہے۔ فنانس کو تو قاعدے
کلیئے سے جانٹے بغیر نہیں بنتی ـــ ہاں، اسی
جن دنوں وہ اپنی کاروبار کی لپیٹ میں آجاتا، وہ
کوئی اور ہی معلوم ہوتا۔ تب وہ اپنی کڑی پہرے
داری میں صرف کاروبار سے ہی نمٹا کرتا اور
نمٹ پانے سے پہلے کاروباری ڈیسک سے
اٹھنے کا نام نہ لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے
گمان میں اتنے عمدہ ناول رقم کیے کہ سننے والا
عش عش کر اٹھتا اور سچ مچ وہ اپنے اکاؤنٹس کی طرح
ریٹرن سے ہی عہدہ برآ ہو پایا۔

کیا میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ کلام حیدری نے
جو کچھ لکھا، صرف گمان میں؟ ـــ نہیں،

وگرنہ اس کے اس قدر بندھے بندھے تیکھے مضامین
اور اداریئے اور شعور کی رو میں آزاد بہتی خیال افروز
کہانیاں کیونکر معرض وجود میں آتیں! میں دراصل
اس کی ان ڈھیروں تصانیف کے بارے میں
سوچ رہا ہوں جو اس نے نہ صرف اپنے گمان
کے منجدھار میں پوری کیں اور جن سے صرف وہی
واقف ہیں جنہیں اس کی باتیں سننے کا موقع میسر
آتا رہتا تھا۔

وہ مجھ سے اکثر کچھ اس طرح بیان کرتا
تھا: میں نے تم سے ذکر کیا تھا نا، کہ میں نے ایک
ناول شروع کر رکھا ہے۔ تمہیں خوشی ہوگی وہ پورا
ہو لیا ہے —— میں نے خوش ہو کر کہا، تو پھر کسی
دن بیٹھ جاؤ —— نہیں، وہ ہنسنے لگا، ابھی
اُسے ذہن میں پورا کیا ہے۔ بس ابھی دنوں اُسے
ذہن سے کاغذ پہ اتار لوں گا —— اپنے
ذہن سے ہی پڑھ کر سنا دو یار —— نہیں،
وہاں میں نے اتنی کاٹ چھانٹ کر رکھی ہے کہ آسانی
سے پڑھا نہیں جائے گا۔ پہلے مجھے پڑھ صاف کر لینے
دو——

کلام حیدری نے واقعی اپنے کئی فن پارے
حرف بحرف اپنے دماغ میں لکھ رکھے تھے۔ اس نے
بالآخر اسی لیئے اپنے آپ کو اپنے کاروباری جھنجھٹ
سے کلیتاً آزاد کر لیا تھا کہ اب بھی اپنا کام
فراغت سے انجام نہ دیا تو پھر کب دوں گا۔ اسے
کیا خبر تھی کہ اپنی تحریریں پوری کر لینے کے باوجود
انہیں ایک بس کاغذ پر نہیں اتار پائے گا۔ اُسے
بعض اور بھی کام پورے کرنے کی بڑی تمنا تھی،
جن میں سب سے نمایاں یہ تھا کہ جو ارمان اس
کی بیٹی رینا کی تربیت میں بر آنے سے رہ گئے
ہیں، انہیں وہ تمام تر جزئیات کی پابندی کا سے
اپنی دوستی کے تعلق سے پورا کر کے اپنی تکمیل کا
سامان کر لے۔ وہ اسے اپنی کسی طویل کہانی
کی طرح سوچ سوچ کر، لکھ لکھ کر اونچا کرنا چاہتا
تھا۔ اسی لیئے وہ گیا سے دلی چلا آیا تھا اور یہ
اپنی گڑیا کہانی کے لیئے اتنا بڑا گھر بھی بنا لیا تھا
کچھ ایسی گنجائش روا رکھ کے، کہ جوں جوں کہانی
بڑی ہوتی جائے گھر بھی ویسے ہی کشادہ تر ہوتا
رہے۔ مگر خدا کے دل کا کسے علم تھا؟ جو بات
وہ یہ، کہ جو پیدا ہوتا ہے اسے از خود اپنی پوری
اونچائی تک پہونچنا ہوتا ہے۔ ہماری کہانیاں بھی
اسی مانند خود آپ ہی اپنے آپکو لکھ کر لیتی ہوتی
بھی جائیں تو ہوں۔ میں تو کون، جو تصنیف و تخلیق
کی دعوے داری کریں؟

کیوں کی تصنیف میں جابجا کاٹ چھانٹ
کر لی جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ "وہ بولے
ہوئے الفاظ" پر مشتمل ہے۔ مگر کلام حیدری
کے بولے ہوئے الفاظ بھی اتنے کینڈے
بندھے ہوتے گویا وہ کتاب بولے جا رہا ہے
بہ الفاظ دیگر وہ لکھے ہوئے الفاظ بولا کرتا
ایسے لوگ عام طور پر بڑے کم گو ہوتے ہیں

مگر جو فراواں نہ ہو آپ اسے کلام حیدری کیونکر کہیں گے!
کلام حیدری تو اپنی تصویر میں بھی چپ چاپ کھڑا گویا!
اپنا دھن میں بولے جا رہا ہوتا ہے۔
مگر باتوں کے رسیا نے اب تو سدا کی چپ سادھ لی ہے۔
مگر سچ مانیئے، مجھے وہ اپنی اس گھور خاموشی میں بھی بدستور سنائی دے رہا ہے اور اتنی عمدگی سے اپنے کسی نکتے کی وضاحت کر رہا ہے کہ اس سے اختلاف ہونے پر بھی اس پر ویسے ہی ایمان لے آنے کو جی چاہتا ہے۔
کلام حیدری کے "مورچہ" کے سیاسی اور "آہنگ" کے ادبی اداریئے اتنے زندہ ہوا کرتے تھے، مانو تمہارے سامنے سر ہلاتے، ہاتھ گھماتے ہوئے ہم سے راست مخاطب ہو۔ کئی لوگ اپنی باتوں سے خود آپ ترجیحاً غائب ہوتے ہیں۔ مگر کلام (کتنا حسب حال نام ہے!) اپنے کہے کی گواہی دے اور پوری ذمہ داری قبول کرنے کے لیئے اپنی زبان سے برآمد ہو ہو کر ہر ایک سے الگ الگ ہمکلام ہو کر اپنی بات منوا رہا ہوتا۔ کوئی تحریر اس وقت تک اتنے مانوس تیور اختیار نہیں کر پاتی جب تک لکھنے والے نے اپنی سوچوں میں ڈوب کر نہ لکھا ہے۔ کلام حیدری کی مشکل یہ تھی کہ اسے لڑنے جھگڑنے کی عادت نہ تھی، اپنے آپ سے۔ بے پایاں تخلیقی صلاحیت کے مالک کا اتنا صلح جو ہونا عین فطری ہے اسی باعث جب اپنی متنوع کارگزاری کے عمل میں اس کا تخلیقی انہماک ٹوٹنے میں آجاتا تو اسے اپنی ڈانٹ ڈپٹ کا خیال بھی نہ گزرتا۔
ادھر ایک طویل مدت سے اس کی کوئی تحریر میری نظر سے نہ گزری۔ کسی ملاقات پر میں نے اس سے پوچھا، کیا لکھنے وکھنے سے چھٹی لے لی ہے؟ ـــــ نہیں ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ معاملہ یہ ہے کہ، لکھے ہوئے لفظ کی مہم جوئی میں اتنی دور جا نکلتا ہوں کہ آس پاس کو اوجھل پا کر وحشت ہونے لگتی ہے ـــــ پہلے نہیں ہوتی تھی؟ ـــــ وہ بولا، یہ بات نہیں۔ میری خواہش ہے کہ پہلے آس پاس کو اتنا ہموار کر دوں کہ وہ پلے گراؤنڈ سا لگے۔ پھر میں لکھنے پڑھنے کی خاطر ہمیشہ کے لیئے غائب ہو جاؤں گا۔
یہی تو اس نے کیا! ـــــ وہ بستر پر پڑا ہے اور یہیں اس کے بستر پر پہلو میں شاہدہ بھابی آنکھیں میٹے سجدے میں گری اس کی صحت کیلئے دعائیں مانگ رہی ہے اور کھٹکا پیدا کرنے کے خوف سے وہ اپنا جسم بھی یہیں چھوڑ کر یہ جا وہ جا!۔ وہ سب کے سامنے اس طرح لیٹا رہا جیسے بس خواب بھر کہیں گیا ہو۔ پر خواب در خواب جانے کہاں جا غائب ہوا۔ بعض لوگوں کو اپنی کہانیوں کی غیر مرئی کیفیت تک پہونچنے کا نا اہل سمجھ کر وہ بھلا

(باقی صفحہ پر)

کچھ کلام حیدری کے بارے میں

شاہ مقبول احمد کلکتہ

طویل قیام نے دنیائے ادب و صحافت میں کلام حیدری اور شہر گیا کو مترادفات کا درجہ دے دیا ہے آج گیا کا تصور کلام حیدری کے نام کے بغیر شاید تشنۂ تکمیل معلوم ہوتا ہے۔ گویا اب کلام حیدری کی ذات نہیں بلکہ شہر گیا کی پوری کائنات ہے۔ مگر اتنی معلوم معروف شخصیت کی زندگی کی یہی حقیقت تعارف کی ایک نئی تقریب کی محتاج تو نہیں، متقاضی ہو گئی ہے۔ ممکن ہے آپ اسے پردہ کشائی کا نام دیں، مگر میں تو کہوں گا کہ یہ معروضات اس کے سوا کچھ نہیں کہ "پیر کنعاں"، "چشم زلیخا" سے اپنے "نور دیدہ" کے لئے دبی زبان میں معذرت خواہ ہے۔

کلام حیدری کی اصل اس خاک سے ہے جس نے کبھی علم و ادب کے چمن میں نوع بہ نوع پھول کھلائے تھے جن کی خوشبو آج بھی مشام جاں کو معطر کئے دیتی ہے۔

نواح شیخ پورہ مونگیر (اب شیخ پورہ خود ضلع بن گیا ہے) میں بچینہ شرفا کی ایک قدیم بستی ہے۔ عہد جہانگیری میں اس کی خاک سے مخدوم سید منعم پاکباز اٹھے، جن کے دم قدم سے دل روشن ہوئے اور تصوف کی دنیا آبادی ہوئی۔ ان کے رسالے (۱) مکاشفات منعمی سنہ ۱۱۱۹ھ (۲) الہامات منعمی سنہ ۱۱۲۵ھ (۳) مشاہدات منعمی سنہ ۱۱۳۲ھ آج چشم عقیدت کے زیر مطالعہ ہیں۔[۱] حکیم شاہ عبدالحق سائل متوفی سنہ ۱۸۹۴ء تلمیذ خواجہ وزیر لکھنوی مصنف دعوت کشمیر از علاج الابدان، تجربات عبدالحق، حکیم سید عبدالحی ہاتف متوفی سنہ ۱۹۳۱ء تلمیذ مرزا داغ دہلوی، مصنف پیغام جنوں صاحب دیوان،[۲] ابوظفر محمد یحیٰی واقف متوفی سنہ ۱۹۲۰ء تلمیذ علامہ رضا علی وحشت، مصنف درد دل، شاہ ہادی حسن، سید عالی قدر مصنف ترکیب درست، سنہ ۱۸۱۳ء جیسے ارباب ادب و اصحاب فن نے اپنے اپنے عہد میں اس بستی میں علم و ادب، طب و شاعری، تصوف و موسیقی کی شمعیں روشن کی تھیں۔[۳]

ان ہی صاحبان فن میں ایک مبارک نام امیر حیدر وکیل مرحوم کا ہے جن کی نفیس و شائستہ زندگی اور قانون دانی کے چرچے اس نواح میں زبان زد خلائق ہیں۔ اسی نامور خاندان کے باقی مولوی امیر حیدر وکیل کے صاحبزادے مولوی

۱ے بہارستان الواصلاتی فیضان از حسین الدین منعمی ۲ے تذکرہ سراپا سخن از محسن لکھنوی و مسلم شعرائے بہار حصہ پنجم سید احمد اللہ ندوی

۳ے مسلم شعرائے بہار حصہ پنجم از حکیم سید احمد اللہ ندوی۔

کریم وکیل مرحوم کے پوتے ہیں جن کو دنیائے ادب کلام حیدری کے نام سے جانتی ہے۔ اور پٹنہ کے بجائے شہر گیا کا بتاتی ہے۔

اسی علاقہ میں قصبہ چوار کے نزدیک کلام حیدری کی ننہال موضع رانکڑ واقع ہے۔ وہیں ان کی پیدائش ہوئی۔ سن تمیز کو پہونچنے کے بعد ابتدائی تعلیم قصبہ جلیسر ضلع ایٹہ اتر پردیش میں ہوئی۔ وہاں موصوف کے نانا ڈاکٹر علی حسن پریکٹس کے سلسلے میں مقیم تھے۔ عمر عزیز کے گیارہ سال وہیں بسر ہوئے۔ دو سال انگریزی پڑھ کر اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک سے فراغت حاصل کی۔ پھر مشرق کا رخ کیا۔ ۱۹۴۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے آئی کام پاس کیا۔ سینٹ زیویرس کالج کلکتہ میں بی کام میں نام لکھوایا۔ تیسرا سال مکمل کر کے تعلیم ترک کر دی۔ اور وہ علم حساب تک نظری تھا اس کو تجارت کے کامیاب تجربے سے عملی بنا دیا۔ اب تک ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کلام حیدری اشہب عمر پر سوار ہیں اور باگ بھی ہاتھ میں ہے اور پاؤں بھی رکاب میں ہیں سمتیں مقرر ہو رہی ہیں اور رخش عمر تابع فرمان رواں دواں ہے، مگر اب دیکھیے دیکھتے صورت حال بدلتی ہے اور کلام حیدری خود زندگی کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ یعنی پھر تعلیم و تعلم کی زندگی کے مطالبہ شدید کے سامنے سپرانداز ہونا پڑتا ہے اور چاروناچار رانچی کالج میں بی۔ اے میں شریک ہوتے ہیں مگر بے چارگی کی داد دیجیے کہ خواہی نخواہی ۱۹۵۱ء میں اردو ایم۔ اے کا امتحان دیا اور بہ امتیاز پاس کیا فرسٹ کلاس فرسٹ ہوئے۔ اور تمغہ طلائی سے سرفراز بھی ہوئے۔

سطور بالا شاہد ہیں کہ تعلیمی زندگی میں کلام حیدری کامیاب و کامراں رہے۔ اب ملازمت کے سلسلے میں داخل ہوتے نومبر ۱۹۵۲ء میں پورنیہ کالج میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ مگر جلد ہی دل گھبرانے لگا اور قدرت کے مخفی اشارے سمجھ میں آنے لگے۔ ۱۹۵۶ء میں دو سال کی چھٹی لی۔ اور پھر چہ بادا باد کہہ کے تجارت اور کاروبار کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ ۱۹۵۸ء میں کالج سے بھی مستعفی ہو گئے۔ اور وہ جو ذرا سا تسمہ سا لگا ہوا تھا اس سے بھی فراغت حاصل کی۔ حالانکہ کاروبار کی دنیا نے ہاتھوں ہاتھ لیا مگر خود کلام حیدری نے اقلیم ادب کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ صنعت و تجارت کی رزم گاہ کو بزم کے آداب و انداز سکھا دیے۔ "ماہنامہ آہنگ" اور ہفتہ وار "مورچہ" اس کے شاہد ہیں۔

(۲)

تاریخ ادب اردو کے صفحات شاہد ہیں کہ بہار میں افسانوی ادب کی روایات قدیم ہیں۔ داستان نگاری کے عہد میں عالم علی عظیم آبادی کے قلم معجز رقم نے زبدۃ الخیال ۱۲۵۷ء اور سید منصور علی نے بحر عشق ۱۸۰۳ء جیسی نادرہ روزگار کتابیں پیش کیں۔ کم و بیش اسی عہد میں شاہ فرزند علی صوفی منیری کی کتاب راحت روح کا رمزیہ نگاری کے باب میں ایک گرانقدر اضافہ ہوا۔

مغربی ادبیات کے زیر اثر ناول نگاری کا جب آغاز ہوا تو اس مرکز ادب نے اصلاح النسا مصنفہ رشید النسا (۱۸۸۱ء) نقش طاؤس مصنفہ حسن علی و منشی اعظم (۱۸۸۱ء) فسانہ خورشیدی مصنفہ سید فضل الدین (۱۸۸۰ء) صورت الخیال مصنفہ شاد عظیم آبادی (۱۸۸۶ء) محل خانہ (۱۹۰۲ء)، نئی نویلی (۱۹۰۳ء) مصنفہ سید

لہ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا از اختر اورینوی و بہار میں اردو نثر کا ارتقا از ڈاکٹر مظفر اقبال

ٰ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب از ڈاکٹر جاوید نہال

علی سجاد جیسے گرانقدر ناول پیش کئے۔ آگے چل کر اختر
اورینوی کے ناول "حسرت تعمیر" اور سہیل عظیم آبادی کے
ناول "بے جڑ کے پودے" نے اس تسلسل کو برقرار رکھا۔
اب دور حاضر میں ڈاکٹر عبدالصمد کے "دو گز زمین" اور
"خوابوں کا سویرا" جیسے معرکتہ الآرا ناول ہمارے سامنے ہیں
جو اس صنف ادب میں اہم اضافہ کا حکم رکھتے ہیں۔ ان کا
فن بہت سی امیدیں اور روشن امکانات اپنے دامن
میں لئے ہوئے ہے۔ تقسیم ملک کی ماری بہار کی مظلوم آبادی
کی تباہی و بربادی، خوں ریزی و غارت گری، آلام و مصائب،
انتشار و دربدری سے پیدا شدہ مسائل کو پہلی بار اس
نامور دردمند مصنف نے بہ شدت محسوس کیا۔ اور اپنے
مذکورہ بالا ناولوں میں سمیٹ کر داستان عبرت بنا دیا۔
حالانکہ اب بھی صدہا تباہ و ویران بستیاں زبان خاموش
سے کسی مرثیہ خواں کی منتظر اور کسی داستان سرا کو آواز دے
رہی ہیں۔ دیکھیں ہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

ابھی تاریخ ادب اردو کا یہ دلکش باب ختم بھی نہ ہوا
تھا کہ زمانے نے تلون مزاجی اور تنوع پسندی کے نیک
بہانے سے ورق پلٹ دیا۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں
اور نقشہ پلٹ گیا۔ اب محفل ادب میں افسانہ طرازی کا
آغاز ہوا۔ افسانہ نگاری کے دور میں بھی یہ گوشۂ ادب
خوب پھلا پھولا۔ شبیہیں ختم ہو رہی تھیں مگر افسانہ اپنے
اختتام کو نہیں پہونچ رہا تھا۔ سالار قافلہ تو محمود کوی
اور وزارت حسین اورینوی تھے۔ مگر صفیں آراستہ
کئے ہوئے مسلم عظیم آبادی، انجم مانپوری، محسن عظیم آبادی
اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، الیاس اسلام پوری،
شکیلہ اختر، غیاث احمد گدی، شمس مظفر پوری، وہاب
اشرفی، احمد یوسف، نشاط الایمان، ظفر اوگانوی،
جاوید نہال، ذکی انور، انیس رفیع، انور عظیم اور معین
شاہد ——— جس گرد و نواح میں یہ محاذ آرائی ہو رہی
تھی اسی کے قریب ایک اور مورچہ پر اپنے افسانوں کے
موقر مجموعہ "بے نام گلیاں" ہاتھ میں لئے کلام حیدری بھی
موجود نظر آتے ہیں۔

بہار میں جو ذخیرہ ادب افسانوں کے نام سے جمع
ہوا ہے اس کا ایک خاصہ حصہ ایسا ہے کہ عام اردو افسانوں
کی طرح اس کی جڑیں نہیں ملتیں۔ اس کا جغرافیہ نہیں معلوم
ہوتا۔ اس کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ کون لوگ ہیں جن کی یہ
کہانیاں ہیں، کون سا معاشرہ ہے جس کی یہ عکاسی ہے۔
اگر شمالی بہار ہے تو سیلاب بداماں ندیاں غائب، آموں
کی مہک، لیچیوں کی خوشبو ندارد، حالانکہ باغات کی سرزمیں
ہے مگر خاک اڑ رہی ہے۔ اگر جنوبی بہار ہے تو اس کی خشک
سالی کے ہولناک مناظر نہیں۔ اس کی فضائے بسیط تاڑوں
کھجوروں کی خوبصورت قطاروں سے خالی۔ اندھڑ نہیں،
جھکڑ نہیں۔ باد سموم کے تھپیڑے نہیں، آراستہ و شائستہ
شہری مجلسوں اور سادہ و بے تکلف سے بری قصباتی
جھگھٹوں کا نام و نشان نہیں۔ اس کی شہرۂ آفاق
درگاہیں اور خانقاہیں کہاں ہیں؟ صدہا کہانیاں
بنانے والے عرس، واقعات کو جنم دینے والے نہان
اشنان، میلے ٹھیلے ناپید، کوچہ و بازار مفقود، اشیاء
و اجزا جو زندگی میں دخیل ہیں اور کاروباری زندگی کے
حق میں عناصر ترکیبی کا حکم رکھتے ہیں وہ اتنے ممیز اور ممتاز
اور واضح و متعین نہیں ہیں کہ عمومی اور غیر واضح خد و خال
کے بجائے خصوصی آب و رنگ کے حامل ہوں۔ فن کار

[1] مقالات از ڈاکٹر شاہد اقبال و فخرالدین عارفی

اپنے شہروں کے اطراف واکناف میں لے تو جاتے ہیں مگر پٹنہ، گیا، آرہ، بہار شریف، بیشخ پورہ، مونگیر بھاگل پور، مظفر پور، دربھنگہ، چھپرہ، سیوان کی سیر نہیں کراتے۔ وجہ یہ ہے کہ شہر اور مقامات خیالی ہیں جہاں قاری اور مصنف دونوں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ملک کی سچائی تو یہ ہے کہ کہیں ریگ زار ہے۔ کہیں ندیاں اور پہاڑ ہیں، کہیں وادیاں اور آبشار ہیں، کہیں ساحل سے سمندر کی موجیں مسلسل ٹکرا رہی ہیں۔ اور یہ عین مشاہدہ ہے کہ یہ اجزا و عوامل انسانی زندگی کو الگ الگ چہرے عطا کر رہے ہیں۔ مگر اسی کے متوازی اردو افسانے اسی طرح الگ الگ اور متفرق و مختلف دکھائی نہیں دیتے، ایک سپاٹ اور بے کیف یکسانیت اور بے روح یک رنگی ہے۔ جو جاری و ساری ہے۔ باستثنائے چند کہا جا سکتا ہے کہ فنکاروں کی ایسی قابل لحاظ تعداد کے باوجود متعلقہ حصہ ملک اور اس کا معاشرہ اپنے جزو کل کے ساتھ اردو ادب میں نمائندگی سے محروم ہے۔ بیشتر سرمایۂ ادب غزل کے مضامین کی طرح داخلی ہو کر رہ گیا ہے موضوعات (Theme) کی ندرت اور اچھوتا پن مصنف پر اتنا حاوی رہتا ہے کہ گرد و پیش کی بوقلمونی اور حقیقتیں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

اس اعتبار سے کلام حیدری کا فن تمام تر نہیں اکثر مواقع پر مشاہدات کی صداقت پیش کرتا ہے، ان کے مطالعہ نے جن تفصیلات کو پیش کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کس گرد و نواح میں ہیں۔ ترقی پسند ادب نے ان کے فن کو جنم دیا تھا۔ اس وجہ سے غیر متعین فضا کے بجائے ایک مخصوص ماحول و معاشرہ سے ہم دوچار ہوتے ہیں میں نے جب افسانہ "کھلیان اور سلاخیں" پڑھا تو مگدھ کے دیہات میں جا پہونچ گیا۔ مگہی زبان میں مکالمے سنے، کھڑی، اودھی اور مگہی سے ترکیب پائی ہوئی زبان جو بہار کی رائج اردو ہے کانوں کو خاصی آشنا معلوم ہوتی تھوڑی دیر کے لئے مگدھ کی شام و سحر میں سانسیں لینے لگا۔

"بے نام گلیاں" جب مطالعہ میں آیا تو ان میں رہنے والے افراد و اشخاص ان میں رونما ہونے والے واقعات و حالات، رومان و معاشقہ نے یقین دلا دیا کہ ان گلیوں کے اپنے خد و خال اتنے واضح و مخصوص ہیں کہ بلاشبہ یہ پٹنہ ہی کی گلیاں ہیں کیونکہ کلکتہ کی کسی گلی سے اپنے تفصیلات میں یہ مماثل معلوم نہیں ہوتیں۔ ورنہ عام صورت حال یہ ہے کہ اردو افسانوں کی کوئی گلی اپنے عمومی خد و خال کی وجہ سے ملک کی کسی شہر کی کسی گلی ہو سکتی ہے۔ خاتمۂ تحریر ہے کہ حیات عثمی کی آفاقیت کی تکذیب مقصود نہیں۔ بلکہ گرد و پیش سے گہری واقفیت کی تلقین ہے۔

کلام حیدری کی خصوصیت بحیثیت مبصر یہ رہی ہے کہ وہ اپنی بات بڑے اعتماد کے ساتھ نہایت پرجوش لہجے میں کہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان کی رائے سے اختلاف بھی ہو تب بھی ان کی دیانتداری اور خلوص نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس حد میں تبصرے تو کجا، ہماری تنقید بھی مصلحت کوشی نظریاتی جا بندلوں، اور گروہ بندیوں کا شکار ہے، کلام حیدری کی تحریریں حق گوئی اور بے باکی کا ایک بلند معیار قائم کرتی ہیں۔ ان تبصروں میں کلام حیدری نے بڑے سے بڑے ادبی بت پر وار کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی، ان حالات میں بھی نہیں جب متعلقہ شخصیت سے ان کے دوستانہ مراسم رہے ہوں۔

(ڈاکٹر مظفر حنفی۔ کتاب نما نومبر ۸۱ء)

اُٹھ گیا اس چمن سے کون، سارا چمن اُداس ہے

وفا ملک پوری، پورنیہ

مشیت الٰہی کی تہہ تک پہنچنا عقل انسانی کی دسترس سے باہر کی بات ہے۔ خدا کے بندوں میں وہی لوگ خوش نصیب ہیں جن کو اس نے دل مبتلا اور جوہر صبر و رضا سے نوازا ہے۔ اور میں اپنے کو انہیں خوش نصیبوں میں شمار کرتا ہوں کہ میری زندگی دل مبتلا کے ہاتھوں ہجوم آلام و افکار میں گھری رہی ہے۔ عہد شباب میں قوت دافعہ جوان تھی۔ تو مصیبت میں ہنس دینا آسان تھا مگر اب آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ اگرچہ کشاکش دوراں اور غم رفتگاں کے پیہم حملوں نے میرے تاب و تواں کو شکست دیدی ہے تاہم حوصلہ صبر اب بھی باقی ہے۔

سال رواں میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے علاوہ آسمان علم و ادب کے ایسے ایسے مہر و مہ و نجوم روپوش ہوئے جن کی لحد پر ہماری آنکھیں موتی نثار کرتی رہیں گی۔ سب سے بڑا المیہ میرے لئے کلام حیدری جیسے عہد آفریں ادیب، نقاد، صحافی، افسانہ نگار، رفیق و فا طریق اور ہمدم دیرینہ کی مرگ ناگہاں کی صورت میں ظاہر ہوا جس نے میرے پیر ہو ٹوٹے ۔ کا کام کیا۔ اس حادثہ کو مہینوں گذر گئے تاہم اب تک یہ یقین کرنے پر دل آمادہ نہیں ہوتا کہ کلام حیدری ہمارے درمیان نہیں رہے۔

کلام حیدری کی سادہ و پرکار شخصیت پر مضمون لکھنا ان کی محبت کا قرض ہے جس کا ادا کرنا میری وفا کا فرض ہے۔ اس قرض کو ادا کرنے کے لئے جب قلم اٹھاتا ہوں تو دل بیٹھنے لگتا ہے آج جب اپنے دل غم زدہ پر جبر کرکے اظہار جذبہ حسرت و یاس کے لئے قلم لیکر بیٹھا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ حکایت غم دوست کہاں سے شروع کروں ؟۔

مجھے کلام حیدری کے جوہر خداداد، ان کے اشہب قلم کی رفتار، ان کی تصنیف و تالیف اور ان کے پیرایۂ اظہار و ابلاغ کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہنا ہے۔ ملک کے دانشوروں اور قلم کاروں کو ان کے ادبی کرشموں کا خوب علم ہے اپنے طور پر بہت کچھ لکھ رہے ہیں اور لکھتے رہیں گے۔ میرے اس مختصر تاثراتی مضمون کا محور فی الوقت زیادہ تر وہ پہلو ہے جو پیشہ کمائی، صبح لو، وفا اور مرحوم کی حیدری ادبی سرگرمیوں سے متعلق ہے۔ جس سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اور ایک مثالی منفرد اور متوازن کردار ابھر کر سامنے آتا ہے۔

کلام حیدری صاحب سے میری ملاقات بے قصدہ

ارادہ اچانک میرے ایک کرم گستر، قدرشناس اور بے
حد وبنہایت مداح عبدالمنان اسمٰعیلی (ایڈوکیٹ) کے
یہاں ہوئی۔ جو پورنیہ کے مشہور ومقبول وکیلوں میں تھے۔
اور کلام حیدری صاحب کے چچا تھے، خود کلام حیدری نے
ایک تعزیتی مضمون میں بڑے لطیف پیرائے میں جس کا ذکر
یوں کیا ہے (زیر سطروں سے اس وقت کے پورنیہ کا نقشہ
ہی سامنے آجاتا ہے)

یہ ۱۹۵۲ء کا نومبر ہے، میں پورنیہ
اسٹیشن سے ایک چھوٹی سی لوہے
کی اٹیچی اور ایک عدد ہال ڈال رکشہ پر
رکھے ہوئے شہر کی طرف جارہا ہوں۔
اجاڑ سا اسٹیشن، اجاڑ اور ویران سے
چہرے ہیں، عجیب کیفیت، ناہموار
گڈھوں سے بھری ہوئی سڑک، میرا
رکشہ ہچکولے کھاتا ہوا چل رہا ہے، میں
رکشہ سے کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف
آجاتا ہوں۔ یہ ویران سی جگہ، یہ سسکتی
ہوئی سرزمین؟ یہاں کالج ہے؟ اور
مجھے اب ہی کالج جوائن کرنا ہے، رانچی سے
پورنیہ ......
میرا رکشہ عبدالمنان اسمٰعیلی ایڈوکیٹ
کے ایک بڑے کمپاؤنڈ سے گذر کر برآمدے
کی سیڑھیوں کے پاس رک گیا.....
میں ناشتہ کرکے چچا جان سے باتیں کررہا
ہوں۔ چچا جان کی باتوں میں تجربے سے
آنے والی سنجیدگی ہے۔ ایک مخصوص قسم
کا وقار ہے ایک سادگی لئے تمکنت ہے
...... اور وفا صاحب آجاتے ہیں،
صبح نو کی بشارت دے کر، اس ویران
اجاڑ اور گرد اڑاتے ہوئے شہر میں صبح
نو؟ وفا، محبت، خلوص؟ میں نے طے
کر لیا کہ اگر اس ویران اور گرد اڑاتے
ہوئے شہر میں وفا ہے محبت ہے خلوص
ہے، تو روشنی ضرور ہوگی صبح نو کی بشارت
بجا ہے۔

(میری شام اپنی آخر صبح نو دسمبر ۶۶ء)

یہ تھی کلام حیدری سے ہماری پہلی ملاقات، اور
کی زبانی، پہلی نظر والی محبت کا آغاز، اور غو
ہے کہ آغاز سے انجام تک ہماری محبت، وفا اور
کے درمیان کسی دیوار کا کیا ذکر کوئی تنکا بھی حائل
کلام صاحب جب تک پورنیہ کالج سے وابستہ ر
سے رشتہ محبت قوی تر ہوتا گیا۔ ہمارے ساتھ ہم
بھی صبح نو کو خوب سے خوب تر بنانے اور سنوارنے
ہو گئے۔ صبح نو کی شعاعیں پھیلتی رہیں۔ پورنیہ کے
ذوق کے گھروں تک اس کی کرنیں پہونچتی رہیں، ش
نہیں بلکہ دور دراز کے علاقے اردو جاننے والو
صبح نو کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ کالج کے
اردو میں تو جیسے زبان وادب کی بہار آگئی۔ شعبۂ
کے لڑکے معیاری رسالے پڑھنے لگے، کہانیاں ک
کچھ مشق سخن کی طرف بھی مائل ہوتے۔ بلاشبہ
کلام حیدری کی تدریسی صلاحیت اور ذہنی تربیت
نتیجہ تھا۔ وہی پورنیہ جس کو وہ پہلے دن ویران
اور سسکتی ہوئی زمین کہہ چکے تھے اب ایک ذرا
میں نئی توانائی اور اس نے زرخیزی کے جوہر دکھا
تو جہاں کلام حیدری کو تعجب ہوا وہاں ان کا سر
سے تن گیا۔ انہوں نے کہا:

"یہ میرے شاگرد ہیں کون کہتا ہے۔ ان کو
ذوق نہیں ہے کون کہتا ہے یہ رسائل
نہیں پڑھتے ہیں یہ۔ "ہمارا ادب" پڑھتے
ہیں، "سہیل" پڑھتے ہیں، "صبح نو" پڑھتے
ہیں، "تہذیب"، "شاہراہ" اور "سویرا" پڑھتے ہیں۔"
(ناواقف محمود سحر، صبح نو مئی ۱۹۵۳ء)

ان دنوں الہ آباد سے ترقی پسندوں کا ایک
معیاری رسالہ نکہت نکلتا تھا۔ اور ترقی پسند
نوجوانوں نے اسی الہ آباد میں نکہت کلب بھی قائم کیا
تھا۔ حیدری صاحب نے پورنیہ کالج میں نکہت کلب الہ آباد
کی شاخ قائم کی جس کا صدر اپنے کالج کے بزرگ پروفیسر
جناب فضل امام صاحب کو بنایا۔ اور پھر اسی نکہت
کلب کی طرف سے اپنے ہونہار اور محنتی طلبا کی سعی
و کوشش سے ایک یادگار کل ہند مشاعرہ کی بنا
ڈالی۔ جس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر کالج کے اس
وقت کے پرنسپل شری مدنیشور مصرا تھے۔ اور جس
مشاعرہ کی صدارت اس وقت کے ڈسٹرکٹ جج
جناب نسیم الدین احمد مرحوم نے فرمائی اور پورنیہ ٹیچرس
ایسوسی ایشن کی کے وسیع میدان میں منعقد ہوا۔ اور
جس میں پورنیہ اور کشن گنج کے اہم مقامی شعراء کے
علاوہ راہی معصوم رضا، حسن نعیم، قاسم شبیر نقوی، اذر
عظیم آبادی، وغیرہ شریک ہوئے تھے عرصہ دراز تک پورنیہ
کے باذوق حلقہ میں اس کا ذکر ہوتا رہا۔ اور حیدری مرحوم
نے اس کی روداد اپنے سحر نگار قلم سے بعنوان "ناواقف
نمود سحر فیض یاب ہو" لکھ کر اور پورنیہ کے صبح نو مئی
۱۹۵۳ء میں شائع کر کے اس یادگار کو ہر دور کے لئے
محفوظ کر دیا۔

جب تک پورنیہ میں ان کا قیام رہا (تقریباً ہر سنیچر
کو سہ پہر کو پورنیہ سیٹی آنا، کاشانہ وفا میں قیام کرنا،
اور پھر سوموار کی صبح کو دھوبی کے لئے روانہ ہونا ان
کے معمولات میں تھا۔ دھوبی سے پورنیہ سیٹی تک
کا کم و بیش پانچ کلومیٹر کا یہ فاصلہ مرحوم سائیکل سے
طے کرتے تھے۔ اس دوری اور اس سواری کا ذکر ایک
رپورتاژ میں بڑے کرب سے یوں کرتے ہیں:

"یہ دھوبی اور پورنیہ سیٹی اتنے دور،
دور پر کیوں ہیں؟ ——— یہ فاصلہ؟
——— پھر وہ کون سی شئی ہے جو
اسے اتنی دور لئے جا رہی ہے؟ "وہ بے
وفا ہے"، کسی نے جواب دیا۔ مگر سڑک
پر کوئی نہیں تھا۔ صرف سڑک تھی اور
سڑک کے آگے گڑھے تھے، بڑے بڑے
بکھرے ہوئے روڑے تھے اور سائیکل
تھی جس کا ایک پیڈل لکڑی کا بنا ہوا ہے
اور میڈگاڈ کا اسکرو ڈھیلا ہے جس
سے ایک ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جو
پروفیسر، ٹیچر اور کلرک کی سائیکل سے
نکل سکتی ہے۔ ہائے وہ دن کب آئیگا
جب وہ کم از کم ایک ریلے ہی خرید لیگا
——— اور اسے یک بیک
وفا کی سائیکل یاد آگئی جس کے پہیے
میں جب ہوا دی گئی تو ٹائر کے اندر ٹیوب
نکل کر اپنی مظلومی کی دہائی دینے لگا۔
ہائے یہ سائیکل تھی جس پر صبح نو کا ایڈیٹر
سوار ہوتا ہے۔ شاعر سوار ہوتا ہے۔
یہ سائیکل کب بدل سکے گی؟ اور یکایک
اس کی سائیکل لڑکھڑائی اور اس نے

زور سے پیڈل کو تھام کر توازن درست
کیا۔

(لطائف نمود سحر انو صبح نو مئی ۱۹۵۳ء)

ایسا نہیں ہے کہ دھوبی سے پورنیہ سیٹی برابر کلام حیدری
آتے رہے۔ وہ ہفتہ میں ایک بار ادھر آتے تو ہفتہ میں
دو بار ادھر نکل پڑتا۔ ان کے آنے کا وقت سہ پہر ہوا کرتا،
اور میں فرائض صبح ادا کرتے تھا

علی الصباح چوں مردم بکار و بار روند
بلاکشان محبت بکوئے یار روند

پر عمل کرتے ہوئے دھوبی پہنچ جاتا جبکہ کبھی کبھی کلام حیدری
خواب ناز میں ہوتے، ہمارے اس طرح صبح دم نکلنے میں
کوئے یار کی کشش کے ساتھ کاروبار کا شوق بھی شامل
تھا:

میں دھوبی میں مسجد کے زیر سایہ
ایک دو کمرے کے مکان میں ابھی سو
رہا ہوں ______ "ارے بھائی
اب اٹھئے بھی۔ میں چار میل سے آگیا،
اور آپ سوئے ہیں" میں آنکھیں ملتا
اٹھ بیٹھتا ہوں شیروانی پہنے ہوئے
یہ نحیف سا کون آدمی ہے؟ کون ہے،
"رضا" اور مجھے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر
تیار ہو جانا پڑتا ہے۔ اور کاغذ کے پلندے
کھلنے لگتے ہیں۔ یہ غزل ہے، یہ نظم ہے۔
یہ خط ہے، یہ قاسم شبیر کا خط ہے۔ اور
راہی معصوم رضا کا خط ہے یہ حسن انجم کا
...... صبح نو کے مضامین کا انتخاب
ہو رہا ہے۔ اور تلے ہوئے پاپڑ نکالے
جا رہے ہیں۔ اور پاپڑ بیلے بھی جا رہے
ہیں"

صبح نو دسمبر (میر بھی شام)

یہ تھا صبح نو کی ترتیب و تدوین سے انکے انہماک کا عالم
پورنیہ کے دوران قیام ہی ان کی سب سے پہلی
کتاب کہانیوں کا مجموعہ "بے نام گلیاں" شائع ہو کر منظر
شہود میں آئی۔ اس کی کتابت مسلم انصاری مرحوم نے کی جو
صبح نو کی کتابت کرتے رہے۔ اور یہ مجموعہ بھی حمیدیہ برقی
پریس لہریا سرائے میں چھپا جہاں پہلے دور کا صبح نو
چھپ رہا تھا۔

دو ڈھائی سال کے بعد جب پورنیہ سے نکلنے
صبح نو میرا امتحان لے چکا اور اس نے مجھے مجبور اور بے
سمجھ کر میرا پیچھا وقتی طور پر چھوڑ دیا۔ تو ایک سال یا شاید
دوسرے سال کے اوائل میں اچانک کلام حیدری بھی
جو کالج کی کسی بڑی تعطیل میں گئے تھے، سنا کہ تعطیل
گذار کر آئے اور کالج سے حساب کتاب کر کے اچانک
غائب ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ ایک طویل رخصت پر موصوف
گئے ہیں۔ کچھ دنوں بعد یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی شادی
گیا کے مشہور و معروف ڈاکٹر عبدالخیر صاحب کی
صاحبزادی شاہدہ خیر سے ہو گئی جو خود بھی ایم اے ہیں
اور یہ شادی اس طرح اچانک انجام پذیر ہوئی کہ ہم
جیسے خانماں میخانہ بھی ولیمہ کے "ماحضر" سے محروم رہے
اور پھر شادی کے بعد ہی کلام حیدری بے سان وگمان
اور بغیر اشارہ و کنایہ درس و تدریس کی دنیا سے نکل کر
کاروبار جہاں اور صنعت و حرفت کی دنیا میں چلے
آئے ______ مگر ایسا نہیں ہے کہ کلام حیدری
اردو دنیا سے الگ ہو گئے ہوں۔ بس سال دو سال
کے وقفہ کے بعد محسوس ہوا کہ ٹھہرے ہوئے طوفان میں
جوار بھاٹا جیسے آگیا ہو۔

میں ۱۹۵۵ء کے آواخر میں صبح نو کی اشاعت
ثانیہ کا عزم لئے ہوئے پٹنہ پہونچ گیا۔ کلام حیدری کا صبح نو
سے پیار ناواشتہ تھا۔ اس کا مرکز طلوع جب پونیہ سے
پٹنہ ہو گیا تو بہت خوش ہوئے۔ مجھ سے ملنے کے لئے گیا
سے پٹنہ پہونچے، مجھے گیا بلالیا۔ پھر ہمارا ان کا پٹنہ
سے گیا، اور گیا سے پٹنہ آنے جانے، ملنے ملانے اور
صبح نو کے سلسلہ میں مشوروں اور منصوبوں کا ایک سلسلہ
شروع ہو گیا۔

جگ جیون روڈ پر سرکٹ ہاؤس جو وزرا، امراء
اور سرکاری عہدہ داروں کا رین بسیرا یا محل سرا ہے بالکل
اس کے مقابل ایک بڑی سی دو منزلہ بلڈنگ ہے جس کا
نام ریناہاؤس ہے ـــــ اور ریناہاؤس
ادبا، شعرا، اہل علم اور ارباب قلم کا شبستاں بن گیا
گیا کے باہر سے آنے والے زبان وادب کے ماہرین، اردو کے
بلند پایہ ادیب و نقاد پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم،
پروفیسر آل احمد سرور، خلیل الرحمن اعظمی، اور ان کے
امثال کے لئے ریناہاؤس مخصوص تھا۔ ہر ایک کی ضیافت
طبع اور لذت کام و دہن کا اہتمام حسب رتبہ و منصب
ہوا کرتا۔ وقفہ وقفہ سے کسی نہ کسی اہم شخصیت کی آمد پر
اعزازی اور استقبالیہ نشست کے لیے ریناہاؤس
کا کشادہ ہال وقف تھا۔ یہ پروگرام کلچرل اکادمی کی طرف
سے ہوتا۔ یہ سب صرف ایک ایسے آدمی کا کارنامہ تھا۔
جسے خدا نے دولت کے ساتھ علم وادب سے بھی نوازا تھا۔
اور جو دولت کا صحیح مصرف بھی جانتا تھا۔

ادھر شہر سے ذرا دور، گیا جنکشن سے پورب
بیراگی میں جنتا سیمنٹ پائپ فیکٹری، کھلی ہوئی ہے۔
اسی احاطہ میں اردو کا "مورچہ" بھی اپنی کمان سنبھالے
ہوئے ہے۔ ہفتہ وار مورچہ کے ماسوا ماہوار "آہنگ"
بھی ان کی مالی معاونت اور قلمی کاوشوں سے پابندی
کے ساتھ بڑے کروفر سے نکلتا رہا۔ اردو ادب، و
صحافت اور تہذیب و ثقافت پر کلام حیدری کا بہت
بڑا احسان ہے کہ کلام حیدری برسوں اس کی بےلاگ
و بےباک اور صحت مند خدمت انجام دیتے رہے۔
قلمی بھی اور مالی بھی۔

مشیت الٰہی نے کلام حیدری کے ساتھ بڑی
فیاضی سے کام لیا۔ ان کو دولت علم و فن سے بھی نوازا اور
دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑا صنعت کار بھی بنا دیا۔ البتہ
قدرت نے اپنی کتاب تخلیق میں ان کے لئے صرف ایک
لڑکی لکھی تھی۔ شاید اس میں بھی حیدری صاحب کی
خواہش کو دخل ہو جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے:

"شاہدہ حیدری جب میرے بچے کو جنم
دینے والی تھی تو میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے
پروردگار سے یہ دعا کی تھی کہ " تو مجھے بیٹی
دینا"، اور میری دعا اس طرح قبول ہوئی
کہ میری ایک ہی بیٹی ہے جو میری طمانیت
کے لیے کافی ہے۔ اس نے میری زندگی میں
جو گل بوٹے کھلائے ہیں ان سے میرے
گھر کے در و دیوار اور گھر کا کونا کونا معطر
ہے"

اور جب ان کی اکلوتی بیٹی نے اپنے شوہر کا گھر بسایا۔
اور وہ دلی میں رہنے لگی تو شاہدہ حیدری کو اپنے گھر کا
کونا کونا سونا لگنے لگا۔ اور مرحوم اپنی اہلیہ شاہدہ حیدری
کے ساتھ زیادہ تر دلی میں رہنے لگے۔

بعض راویوں نے بتایا کہ انہوں نے ڈوتنا ہیں
میں کوئی گھر بھی بنا لیا ہے۔ "ریناہاؤس" کی رونقیں
گویا اسی وقت ختم ہو چکی تھیں۔ ظاہر ہے۔ ہوتی ہے

ہر مکان کی زینت بکس سے ، تاہم آخرالامر ان کی خاک
ان کو وہیں لے آئی - جہاں کا خمیر تھا۔

دلی سے ایک طویل عرصے کے بعد جبکہ میں ، غم عہد
محبت کو سہلا بیٹھا تھا۔ ۶ جولائی ۹۳ء کو مجھے حیدری
صاحب کا خط ملا۔ خط پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ " دل کا ہر
زخم ہے تازہ مجھے معلوم نہ تھا" اس خط کو پڑھ کر دل کا جو
حال ہوا میں اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ خط حسب ذیل ہے:

" ۴ر جولائی ۹۳ء

بھائی وفا صاحب ! تسلیم

بہت عرصہ سے خط نہ کتابت، نہ ملنا نہ
جلنا، حالات بڑے جابر ہوتے ہیں میں
اکتوبر ۹۲ء میں دہلی آیا۔ ۹ نومبر کو گیا
واپس ہونے کے لئے ریزرویشن کرایا۔
مگر ۲ر نومبر ۹۲ء کو رات گیارہ بجے قلب
کا سخت دورہ پڑا۔ اسپتال لے جایا گیا
بچ گیا، مگر یوں کہ ہارٹ کا آپریشن نہ کروایا
جائے تو کسی وقت بھی ہارٹ فیل ہو سکتا
ہے۔ چنانچہ ۸ر کو اسکارٹ ہارٹ اسپتال
میں داخل ہوا (۸ر فروری ۹۲ء ۱۴ اور ۲۴ر
فروری کو سینہ چاک کر کے آپریشن کیا
گیا اور ۱۵ر مارچ کو وہاں سے گھر جانے
کی اجازت ملی ——— ابھی تک
بے حد سست رفتاری سے ٹھیک ہو رہا
ہوں، ہفتہ عشرہ میں گیا جاؤں گا۔
اس بیماری کا سنکر زیادہ تر لوگوں
نے رو پیٹ لیا۔ مگر خدا نے پتہ نہیں کس
مصرف کے لئے مجھے دنیا میں زندہ رکھا
ہے۔ آپ سلامت رہیں۔ آپکا کلام حیدری۔"

اب میں اپنے اس دیرینہ رفیق و ہمنوا کی گیا
آمد کا بے چینی سے انتظار کرتا رہا کہ ۱۷ر اگست ۹۳ء
کو ایک پوسٹ کارڈ جو ۷ر اگست کو گیا سے روانہ ہوا تھا
مجھے ملا۔ جس میں انہوں نے اپنی آمد کی اطلاع دیتے
ہوئے لکھا تھا:

" میں گیا آگیا ہوں۔ اور بھری دنیا میں
انتہائی " اکیلا" محسوس کرتا ہوں ———
جانے کیوں اب جینے کی خواہش نہیں رہی
مگر زندہ رہوں۔ خدا کرے آپ بخیریت
ہوں۔ آپ کا کلام حیدری

میں نے اسی دن جواب خط میں اپنے شوق ملاقات
اور ان کی محبتوں اور ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے
ایک خط ڈال دیا۔ جس کا جواب ایک خلد آشیاں نے
بواپسی ڈاک دیا۔

" گیا ۲ر اگست ۱۹۹۳ء

بھائی وفا صاحب ! محبتیں

آپ کا کارڈ ملا۔ آپ نے میرے سلسلہ
میں جن خوبصورت الفاظ کا استعمال
کیا ہے ان کا میں حقدار نہیں ہوں۔ لیکن
ان کے ذریعہ آپ کی محبت اور خلوص
کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ دنیا
میں ۶۳ سال رہنے کے بعد یہ تجربہ ہوا کہ
آدمی واقعی کمینہ ہوتا ہے، اس سے
مستثنیٰ وہ لوگ جو سچے، اشرف،
تھے، ہیں اور ہوتے رہیں گے۔
علیؑ اور حسینؑ کے صدقے، جن سے میرے
حوصلے بڑھے ——— سوچئے کہ
فخر دو جہاں کو ظالم کی تلوار نے سہید کر دیا

پھر رہ کیا گیا؟ مجھے تو ہر دریا فرات لگتا
ہے اور یزید دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔
آپ گواہ رہئے گا کہ کلام حیدری خدا کا
قائل، تمام پیغمبروں کا ماننے والا، اور
حضرت علیؓ اور حسنؓ و حسینؓ پر قربان
ہوجانے کی تمنا رکھنے والا تھا۔ میرے
طبیعت اب دنیا میں نہیں لگتی ہے بہت
جیا، اب جینا کیا؟" احقر کلام حیدری
اس طرح مراسلات کے سلسلے سے نصف ملاقات
ہوتی رہی۔ ایک خط میں اخلاص و وفا اور محبت و قربت
کی پرانی یاد کو کریدتے ہوئے لکھتے ہیں:
" محترم اور پیارے بھائی
خدا کرے آپ اعتبار سے مطمئن اور مسرور
ہوں ــــــ آپ کا خط آج ۸ ر
ستمبر کو ملا۔ بس ابھی ابھی۔ دو بجے دن میں
یہ کارڈ لکھ رہا ہوں۔ اور ۱۹۵۲ء اور
۱۹۵۳ء کا زمانہ میری آنکھوں کے سامنے
یوں آ رہا ہے جیسے یہ بس کل کی باتیں ہوں۔
جیسے میں مدھوبنی سے پورنیہ سیٹی جا رہا
ہوں۔ جہاں آپ کے نفیس کھانے، اور
گرم گرم خلوص سے لطف اندوز ہو رہا ہو
جو گذر گیا ہے وہ واپس نہیں آسکتا۔
جو نہیں کر سکا اس کی حسرت کا کانٹا
لئے ہوئے بارگاہ الٰہی میں حاضر ہونا ہے
پھر بھی آدمی اتنا دنیاوی اور حریص ہوتا
ہے کہ دنیا چھوڑنے کے نام سے ڈرتا ہے
لعنت ہے اس دنیا پر ــــــ
ہاں یہ صحیح ہے کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں

جب دنیا میں شریف اور رذیل نہیں
رہے ہوں۔ اور پھر مجھے کیا حق پہنچتا
ہے کہ خود کو شریف کہوں، یہ تو خدا ہے
جو مجھے میرے اعمال کے متعلق بتائے گا
۔ سرور کائنات کی امت میں ہوں۔
اس لئے رحمت خداوندی کا حق دار ہوں۔
آپ کو خط لکھنے بیٹھا ہوں تو یہ کارڈ بھرنا
مشکل ہو رہا ہے۔ حالانکہ یادیں! اتنی
ہیں کہ پانچ سو صفحات بھی ناکافی ہیں مگر
خدا آپ کو خوش رکھے۔ کلام حیدری۔
پھر ایک خط اور (گویا آخری خط مرحوم کا) ۳۰ ر ستمبر ۹۳ء
کا لکھا ہوا مجھے ۱۶ ر اکتوبر کو ملا۔
"محترم بھائی وفا صاحب!
آج "قومی تنظیم" میں پڑھا کہ آپ "بہار
اردو اکادمی" کی "مجلس عاملہ" میں نامزد
ہو گئے ہیں۔ یہ آپ کے لئے سرمایہ افتخار
نہیں ہے اردو اکادمی کے لئے فخر کی بات
ہے کہ آپ بھی موجود ہیں مگر کیا؟ وفا۔
جو ڈاکٹر ذاکر حسین سے آنکھیں ملاتا تھا۔
وہ اب کس سے کہیگا اور کیا کہے گا؟
خدا آپ کو صحت کے ساتھ لمبی عمر دے۔"
میں نے حسب معمول فوراً جواب لکھ کر روانہ کیا جب
کوئی جواب نہیں آیا تو ۳ر۲ر۹۴ء کو اور پھر ۲۵ر۳ر۹۴ء
کو خطوط لکھتا رہا۔ مجھے انتہائی الجھن اور پریشانی تھی۔
ماہ صیام کی وجہ سے میں گیا کا رخ نہیں کر سکا۔ تاہم میں
نے طئے کر لیا تھا کہ رمضان المبارک کے ختم ہوتے ہی
میں گیا روانہ ہو جاؤں گا ــــــ اور عین
عید کے دن میرے ایک عزیز ترین شاگرد شہاب ہمدانی خبر

جو مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں مجھ سے ملنے آئے ۔ یہ وفا اور حیدری کے درمیان رابطہ خلوص و وفا سے واقف تھے، تو اس غم آگیں لہجہ میں جیسے کہ پاتعزیت پیش کی ۔ اور میں اس جانخراش خبر کو سنکر حیران رہ گیا ——— اس وقت اور بھی شدت سے پورنیہ کے دور افتادہ ہونے کا احساس ہوا ۔ افسوس کہ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو خود، آپ اپنی خبر نہیں آتی ۔
إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۔

کلام حیدری اچانک اس گلشن ہستی سے اٹھ گئے ۔ اور اپنے تمام چاہنے والوں کو انہوں نے چونکا دیا ۔ بقول مشتاق احمد نوری:

"وہ ہمیشہ چونکا دینے کے عادی تھے"۔

میں جو ان سے کسی حد تک قریب رہ چکا ہوں جب ان کے حالات و واردات کو دیکھتا ہوں کہ زندگی کے ہر موڑ پر ان کے فیصلے اچانک ہوتے رہے ۔ اور اس کے انجام نے بھی ان کو کبھی شرمندہ یا افسردہ ہونے کا موقع نہیں دیا ۔ اس سے ان کی قوت فیصلہ کے حتم و یقین کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ذہن کتنا بالیدہ اور ان کی فکر کس قدر تابندہ تھی ۔

اپنی طالبعلمی کے دوران میں اساتذہ کو چونکاتے رہتے تھے ۔ اپنے ساتھیوں کو حیرتی بناتے رہے ۔ اسکول کی تعلیم کے زمانہ میں انگریزوں کے خلاف ملک کی آزادی کے لئے جد و جہد کے جرم میں رام موہن رائے سمنری سے نکالا جانا اور آزادی کے بعد اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے جلسے اور جلوس میں اپنے مطالبات کے لئے آواز بلند کرنے کی سزا میں عین جمہوریت کے قیام کے موقع پر یعنی ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کی درمیانی رات میں پولس کی حراست میں رانچی جیل کی سیل میں بند کیا جانا یہ معمولی اتفاقات نہیں ہیں ۔ خود بڑے کرب سے اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"۲۶ جنوری جبکہ ہندوستان میں
جمہوریت کے قیام کا اعلان کیا جارہا تھا
تو مجھ جیسے محب وطن جیل کی سلاخ میں
بند تھے ۔ ہم نے ہندوستان میں جمہوریت
کے پہلے دن کے اس سورج کو نکلتے نہیں
دیکھا جس کے لئے ۱۹۴۲ء میں نویں کلاس
کے لڑکے نے اسکول کا گیٹ توڑا"۔

ایم اے کر کے راجدھانی سے نکلے تو ایک دم کالا پانی پہنچ گئے پورنیہ کالج سے وابستہ جب تک پورنیہ میں رہے اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں سے اردو حلقے کو چونکاتے رہے اس کا کسی قدر تفصیلی ذکر آ دیکا چکا ہے ۔

بہرحال: زندگی کے آخری سفر پر بھی وہ اسی طرح اچانک روانہ ہو گئے ۔ جو ان کی عادت سی بن چکی تھی افسوس یہ ہے کہ ان کے بہت سے یاران وفادار اور محبان غمگسار کو الوداع کہنے کا موقع بھی نہ مل سکا ۔ خود راقم الحروف کو یہ حسرت رہ گئی کہ میں ایسا بدنصیب ہوں کہ ایک مشتی خاک لے کر بھی وقت دفن نہیں پہنچ سکا ۔ افسوس کہ اب میرے پاس اشکوں کے چند قطروں کے سوا کچھ نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ۔ ع

"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے"۔

کلام حیدری۔ چند یادیں چند باتیں

شہزاد منظر، کراچی (پاکستان)

کلام حیدری افسانہ نگار بھی تھے اور ناقد بھی۔ ادبی ماہنامہ "آہنگ" کے مدیر بھی تھے اور سیاسی ہفت روزہ "مورچہ" کے سیاسی تجزیہ نگار بھی۔ وہ صنعت کار بھی تھے، اور میدان سیاست کے شہسوار بھی۔ اس طرح وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ٹھہرے، لیکن وہ دراصل کیا تھے؟ ان کی اصل حیثیت کیا تھی؟ میرا خیال ہے کہ ان کی اصل حیثیت افسانہ نگار کی تھی۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ اس لئے ہمیں سب سے پہلے ان سے افسانہ نگار کی حیثیت سے بحث کرنی چاہیئے۔ بطور افسانہ نگار ان کے افسانوں کی فنی قدر و قیمت متعین کرنی چاہئے۔ اور اس کے بعد ان کی دوسری حیثیتوں کے بارے میں گفتگو۔ میرا مقصد ان کے بارے میں چند ذاتی تاثرات کا اظہار کرنا اور ان کی تنقید نگاری کے بارے میں چند باتیں کہنی ہیں۔

کلام حیدری سے میری ملاقات کلکتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی اس نشست میں ہوئی جو ان کے اعزاز میں شہر کے دور شیب پور میں واقع تاریخی بوٹانیکل گارڈن میں منعقد ہوئی تھی۔ اس وقت ترقی پسند مصنفین شاخ کلکتہ کے سکریٹری مظہر امام تھے۔ اور اس کی نشستیں کسی ایک جگہ ہونے کے بجائے مختلف مقامات میں ہوا کرتی تھیں۔ کلام حیدری کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اور وہ شاہدہ حیدری بھابی کے ساتھ کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ مظہر امام اور ہم چند دوستوں نے ان کے اعزاز میں ایک نشست منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور طے پایا کہ کیوں نہیں اتوار کے روز شام کے وقت بوٹانیکل گارڈن میں جمع ہوا جائے اور وہیں انجمن کی نشست بھی ہو۔ چنانچہ ہم چند دوست جن میں نشاط مظفر پوری (نشاط الایمان)، اصغر راہی، قیصر شمیم، اور دوسرے احباب جمع ہو گئے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس نشست میں "ژاں پال ساونت" پر ایک مختصر سا مضمون پڑھا تھا۔ جو بعد میں ماہنامہ "سہیل" (گیا) میں شائع ہوا یہ وہ زمانہ تھا۔ جب اگرچہ میرا ادبی کیریر شروع ہو چکا تھا۔ لیکن میری ادبی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ کلام حیدری کا شمار نئے افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ اور وہ نہایت تیزی کے ساتھ ابھر رہے تھے۔ ان کا شمار بہار میں انور عظیم اور اختر پیامی کے فوراً بعد منظر عام پر آنے والے ادیبوں میں ہوتا تھا جن میں مظہر امام اور منظر شہاب اور غیاث احمد گدی وغیرہ شامل تھے۔ میں نے افسانے اور ادبی مضامین لکھنے شروع کر دیئے

تھے۔ اس اعتبار سے کلام حیدری کو مجھ سے سینئر کہا جا سکتا ہے۔ اس نشست میں میرے مضمون پر کیا بحث ہوئی یہ تو مجھے یاد نہیں۔ البتہ اس کے بعد ان سے باقاعدہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس زمانے میں میرے بارے میں ان کی رائے اچھی نہیں تھی چنانچہ انہوں نے ایک بار مظہر امام کو لکھا کہ شہزاد منظر سے کہئے کہ وہ ادب کے میدان میں گھوڑے دوڑانا چھوڑ دے، ادب ان کے بس کا روگ نہیں۔ مظہر امام نے مجھے ان کا خط دکھایا تو میں ہنس کر رہ گیا۔ کلام حیدری عموماً اسی انداز کی گفتگو کرتے تھے۔ جو جی میں آتا تھا بے دھڑک کہہ دیتے تھے، خواہ کسی کو اچھا لگے یا برا۔ انہوں نے عمر بھر اسی طرز گفتگو اور اسی طرز تحریر کو جاری رکھا۔ اور دوست اور دشمن بناتے رہے۔

انہوں نے شادی کے بعد جب گیا سے "آہنگ" جاری کیا۔ تو اس کے چند برس کے بعد میں مشرقی پاکستان منتقل ہو چکا تھا۔ اس لئے میں ہندوستان کے رسائل و جرائد سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا۔ البتہ عظیم حیاروی کا ہے کا ہے مجھے بہار سے شائع ہونے والے رسائل مثلاً صنم، صبح نو، اقدار، اشارہ اور آہنگ وغیرہ بھیجتے رہتے تھے۔ اس طرح "آہنگ" کے شمارے بے قاعدگی سے پڑھنے کے لئے ملتے رہتے تھے۔ میں جب تک مشرقی پاکستان میں رہا ان سے میرا رابطہ منقطع رہا البتہ مغربی پاکستان آنے کے بعد جب میرے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "جدید اردو افسانہ" شائع ہوا تو ان سے "آہنگ" کے ذریعہ پھر خط و کتابت شروع ہوئی۔ اس اعتبار سے نہ انہیں میں اپنا دوست کہہ سکتا ہوں اور نہ اپنا ہم عصر۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتے اور میرا احترام کرتے رہے۔ اور آہنگ میں میرے مضامین اہتمام کے ساتھ شائع کئے۔

وہ جب کراچی آئے تو ان سے پھر تفصیلی ملاقات ہوئی۔ لیکن یہ ملاقات بڑی تشنہ رہی۔ کیوں کہ ان دنوں شہر میں مہاجر پٹھان فسادات ہو رہے تھے۔ اور شہر کے بیشتر حصے میں کرفیو نافذ تھا۔ اس لئے ان سے جم کر گفتگو نہ ہو سکی۔ اور پھر وہ اچانک ہندوستان چلے گئے۔ اس وقت تک میرے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ "رد عمل" شائع ہو چکا تھا۔ انہوں نے اس پر تبصرہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن وعدہ پورا نہ ہو سکا۔ پھر اطلاع ملی کہ وہ گیا سے دہلی منتقل ہو چکے ہیں۔ اور اب وہ مستقل طور پر دہلی میں ہی رہیں گے۔ بات یہ تھی کہ ان کے داماد ٹیکسٹائل ٹیکنولوجسٹ تھے اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں (جہاں ٹیکسٹائل صنعتیں واقع تھیں) ان کی تعیناتی ہوتی رہتی تھی۔ اور وہ بھی اپنی اکلوتی بیٹی رینہ کے قریب رہنے کے لئے مختلف جگہ میں منتقل ہوتے رہتے تھے۔ ان کے ایک خط سے معلوم ہوا وہ دہلی سے اپنا ماہنامہ "آہنگ" اور ہفت روزہ "مورچہ" دوبارہ شائع [illegible] تیاری کر رہے ہیں۔ پھر ماہنامہ "کتاب نما" [illegible] ذریعہ معلوم ہوا کہ وہ دل کے عارضہ میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ [illegible] ان کا بائی پاس آپریشن ہوا ہے اس اطلاع [illegible] بے چین ہو گیا اور میں ان کی خیریت معلوم کرنے کی غرض سے انہیں دہلی خط لکھا۔ اس دوران ان کا آپریشن ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھے جواب دیا۔ اور میری نئی کتاب "علامتی افسانے کا ابلاغ" کا مطالعہ پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے وہ کتاب انہیں بھیج دی۔ کتاب پڑھ کر انہوں نے فوراً جواب دیا اور بعض سلسلے میں میری کڑی سرزنش کی۔ جو دراصل غلط فہمی پر مبنی تھی۔ میری کتاب آئی، بی، ایم "ٹائپ" میں شائع ہوئی تھی جس میں چار کا ہندسہ دو کا ہندسہ نظر آتا تھا۔ میں نے خدیجہ مستور کے بارے میں لکھا تھا کہ انہوں نے ۱۹۴۴ء سے لکھنا شروع کیا ہے جسے انہوں نے ۱۹۲۴ء پڑھا۔ اور میری تاریخی غلطی

پر کڑی نکتہ چینی کی۔ میں نے جوابی خط میں ان کی غلط فہمی دور کر دی۔ انہوں نے اپنے آخری خط میں لکھا کہ وہ میری کتاب کے بارے میں لکھنا چاہتے ہیں لیکن انہیں اندیشہ ہے کہ میں ان سے ناراض ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد اطلاع ملی کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ کلام حیدری ان چند لوگوں میں سے تھے جو ہمیشہ ضمیر کے سامنے صادق رہے اور جسے انہوں نے درست بھی سمجھا۔ اس کے اظہار سے کبھی گریز نہیں کیا۔ خواہ اس سے کوئی ناراض ہو یا خوش، اس عادت نے انہیں دنیائے ادب میں ممتاز بنا دیا۔

(۲)

کلام حیدری کے افسانے اور تنقیدی مضامین میں مختلف رسائل میں پڑھتا رہتا تھا لیکن ان کے مجموعی کام اور ادبی خدمات کے بارے میں کوئی میری رائے مرتب نہ ہو پائی تھی۔ جب تک کسی مصنف کی تمام تحریروں کا بالاستعاب مطالعہ نہ کیا جائے۔ اس کے بارے میں مجموعی رائے قائم کرنا نہ ممکن ہے نہ آسان۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے سارے افسانوں اور تنقیدی مقالات کا مطالعہ نہیں کیا۔ اس لئے کہ مجھے ان کی تمام تصانیف حاصل نہیں ہوئیں۔ (انہوں نے زندگی میں اپنی مجھے صرف ایک کتاب "تفہیمات" بھیجی تھی) اس کے باوجود میں ان کے ادبی کام اور معرکآرائیوں اور سیاسی سرگرمیوں سے باخبر تھا۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ کلام حیدری کے پاس بیک وقت دو آرگن تھے: ایک ادبی (ماہنامہ "آہنگ") اور دوسرا سیاسی (ہفت روزہ "مورچہ") جس کی وجہ سے انہیں ایوان ادب اور ساتھ ہی ایوان سیاست تک اپنی باتیں پہونچانے کی آسانیاں تھیں۔ ان کا اپنا پریس بھی تھا جس کے باعث انہیں نشر و اشاعت کی سہولت بھی حاصل تھی۔ انہوں نے اپنے اشاعتی ادارے "بہار کلچرل اکیڈمی" سے کئی اہم مصنفین کی اچھی اور معیاری کتابیں شائع کیں۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے انہیں ادبی اور سیاسی میدان میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ وہ ایک عرصہ تک بہار کی سیاست اور ادب پر چھائے رہے اور صرف بہار ہی نہیں ہندوستان کے ادبی حلقوں میں ان کی آواز سنجیدگی سے سنی گئی۔ انہوں نے ماہنامہ آہنگ بڑی باقاعدگی سے جاری رکھا۔ اور ہندوستان اور پاکستان کے تمام اہم مصنفوں کو اپنے حلقہ میں شامل کر کے اپنے رسالہ کو ایک موقر اور ادبی جریدہ بنا دیا۔ ادب ہو یا سیاست ان دونوں میدانوں میں انہیں آگے بڑھانے میں ان دونوں جریدوں کے کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کلام حیدری ابتدا سے ترقی پسند تھے۔ اور ان کی ذہنی اور فکری تربیت اور تشکیل اسی تحریک کے زیر اثر ہوئی تھی۔ اس لئے ان کی سیاست بھی ہمیشہ سے ترقی پسند اور بائیں بازو کی رہی۔ ترقی پسند تحریک میں جو اتار چڑھاؤ اور نظریاتی انتشار اور اختلاف پیدا ہوا۔ اس سے وہ بھی متاثر ہوئے۔ لیکن اس کے بنیادی اصولوں اور نظریے سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ ان میں بڑی جرات مندی اور بے باکی تھی۔ وہ بے دھڑک گفتگو کرتے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ ان میں فطری طور پر قائدانہ صلاحیت موجود تھی۔ اس لئے وہ سیاسی میدان میں تو نہیں، البتہ ادبی میدان میں رہنما کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اور انہوں نے آہنگ کے ارد گرد سینئر لکھنے والوں کے ساتھ نئے اور باصلاحیت جونیئر لکھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ قائم کر لیا۔ اور وہ ان کے بلا شرکت غیرے رہنما بن گئے۔ انہوں نے آہنگ کے ذریعے کئی نئے اور ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں اور شاعروں کو متعارف کرایا۔ ان کے افسانے اور نظمیں شائع کیں۔ ان پر مضامین لکھے۔

اور اس طرح وہ نئے اور نوجوان ادیبوں کے محبوب رہنما تسلیم کر لئے گئے۔ ان کے رسالے کو مشاہیر ادبا و شعراء کا قلمی تعاون حاصل ہونے کے باعث غیر سرکاری رسالوں میں آہنگ کو منفرد مقام حاصل ہو گیا۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ کوئی کل ہند ادبی کانفرنس یا سیمینار کلام حیدری کی شمولیت کے بغیر غیر مکمل تصور کیا جاتا تھا۔ انہوں نے آہنگ کے کئی اہم منفرد اور یادگار شمارے شائع کئے۔ جن میں "احتشام حسین نمبر" اور "اردو فکشن نمبر" قابل ذکر ہیں۔

(۴)

کلام حیدری بھی زندگی میں بہت کچھ لکھنا اور کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی سیمابی طبیعت، نجی کاروباری اور دیگر غیر ادبی اور سیاسی سرگرمیوں نے انہیں جم کر لکھنے کا موقع نہیں دیا۔ کون جانتا تھا کہ ادب گہرا لگن چاہتا ہے۔ ٹھوس ادبی کام تپّا مارے بغیر ممکن نہیں جو ان کے بس میں نہیں تھا۔ ان کے ادبی کام کرنے کی خواہش کا اندازہ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تفہیمات" کے دیباچے سے ہوتا ہے وہ ۱۵ مارچ ۱۹۸۳ء کو لکھے جانے والے اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"اپنی عدیم الفرصتی کو روتا ہوں کہ اب تک ایک موضوعی تنقیدی کتاب اردو کو نہیں دے سکا۔ حالانکہ موضوعات نے روح اور ذہن کو بے چین کر رکھا ہے۔ زندگی رہی تو مختصر افسانہ نگاری کی انتھولوجی مع بسیط مقدمہ اہل نظر کے لئے پیش کروں گا۔ اس کے علاوہ بھی بعض ایسے موضوعات ہیں جن پر کتاب لکھنے کے لئے طبیعت مچل مچل جاتی ہے، لیکن ہائے رے غم روزگار"

یہ درست ہے کہ وہ "غم روزگار" کے باعث اپنی خواہش پوری نہ کر سکے۔ لیکن وہ معاشی اعتبار سے اتنے کمزور نہ تھے کہ اگر کچھ نہ کرتے تو اہل خانہ فاقہ کرتے۔ وہ نہ صرف خوشحال تھے بلکہ متمول بھی۔ لیکن اپنی ہنگامہ پسند طبیعت کے باعث وہ خود کو خالص ادبی کام کے لئے وقف نہ کر سکے۔ کون نہیں جانتا ہے کہ وہ علالت سے قبل صوبائی سیاست میں گہرے طور پر ملوث ہو گئے تھے۔ اور صوبائی انتخابات میں پس پردہ رہ کر بادشاہ گر کا کردار ادا کرنے لگے تھے۔ کاش! انہوں نے اپنا تمام وقت ادب کو دیا ہوتا۔ یہ بھی درست ہے کہ ہر شخص دنیا کے جھمیلوں سے الگ تھلگ رہ کر کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالودود نہیں بن سکتا۔ کلام حیدری نے زندگی میں خود کو بہت سے معاملات اور شعبوں میں الجھا رکھا تھا جس کے باعث وہ ادب کو اپنا تمام تر وقت نہ دے سکے۔ اس کے باوجود انہوں نے زندگی میں جو کچھ لکھا وہ تعداد کے اعتبار سے کم نہیں اور معیار کے اعتبار سے کم تر۔ ان کے افسانوں کے چار مجموعے "الف لام میم"، "صفر"، "بے نام گلیاں" اور "گوجوبلی"، تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تفہیمات"، اداریوں کا مجموعہ "مزامیر" اور تبصروں کا مجموعہ "برملا" ہیں۔ اس طرح ان کتابوں کے مطالعہ سے ان کے مجموعی کام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تنقید میں اوریجنل فکر بہت بڑی اور مشکل بات ہوتی ہے۔ ہم عام طور پر کسی فن پارے کو پہلے سے مروج نظریے یا قدیم روایت کی بنیاد پر پرکھتے ہیں یا پھر دوسروں کے مستعار خیالات کی بنیاد پر۔ سوچی ذاتی غور و فکر بہت کم ناقدین میں ملتا ہے۔ کلام حیدری بھی کسی اوریجنل فکر کے حامل مصنف یا ناقد نہیں۔ لیکن انہوں نے کلیم الدین احمد کے اس مقولے کو گرہ

باندھ لیا تھا کہ:

"اپنی عقل، صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرو۔ مشہور اور بزرگ ہستیوں کے قول سے مرعوب نہ ہو۔ ہر چیز کی خود جانچ کرو کسی فیصلے میں دوسرے کی رائے کا سہارا مت ڈھونڈو۔ اچھے برے کی تمیز آپ کرو جب قرآن اور حدیث کو خود کھنگالنا واجب ٹھہرا تو پھر شعر و ادب، تاریخ و فلسفہ، اخلاق و سائنس کا کیا حال ہے۔ عقل کی آنکھیں کھولو، سنو، پڑھو اور جو عقل بتائے وہی کرو"

(خود نوشت، اپنی تلاش میں، ۱۳۴)

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ کلام حیدری ایک ترقی پسند ادیب تھے۔ اور ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل۔ اس کے باوجود انہوں نے کلیم الدین احمد کے اس قول پر عمل کیا۔ اور ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی فن پاروں کی تفہیم اور تحسین میں ترقی پسند ناقدین سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی صوابدید کے مطابق نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی۔

کلام حیدری کو روایتی مفہوم میں ناقد کہنا درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے تنقید کو اپنا واحد ذریعہ اظہار نہیں بنایا۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے اور گاہے گاہے تنقید اس لئے لکھتے تھے کہ وہ شعر و ادب کے بارے میں بعض خیالات و تاثرات کے اظہار کے لئے مجبور تھے۔ ہر پڑھا لکھا اور بالغ نظر شخص، خصوصاً مصنف ادب کے بارے میں کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور رکھتا ہے۔ اور جب کوئی نظم، غزل افسانہ، ناول یا تنقید پڑھتا ہے تو اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے بھی قائم کرتا ہے۔ اپنی اس رائے کو منطق اور دلائل و براہین کی بنیاد پر ضبط تحریر میں لانا تنقید کی ابتدائی صورت ہے۔ تنقید اس کے بعد علم یا سائنس بنتی ہے۔

اس اعتبار سے کوئی بھی صاحب علم شخص شعر و ادب کے بارے میں تنقید لکھ سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس میں گہرا تنقیدی شعور یا بصیرت ہو یا نہ ہو۔ کلام حیدری اپنے تنقید نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"تنقید میرا میدان نہیں، مگر تنقیدوں کو پڑھ کر متاثر ہونا یا نہ ہونا میرا حق ضرور ہے تاثرات کو کبھی کبھار لکھ دینا میری مجبوری ہے، کیونکہ تاثرات شدید ہوتے ہیں اور میری خواہش ہوتی ہے کہ میرے تاثرات دوسروں تک پہنچیں۔ تنقید سے مجھے ادب کے دامن میں آگ لگنے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے تو میں بے قرار ہو کر ادب تخلیق کرنے والوں کو پکار کر کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس آگ سے ادب کا دامن بچاؤ، ورنہ تخلیق مر جائے گی۔ ظاہر ہے اس بات میں ایک خطرہ بھی ہے کہ میرے تاثرات کسی کو پسند نہ آئیں۔ خصوصاً ادب کی تخلیق کو فلیتہ لگانے والے نقادوں کو جو جملہ بازی کو تنقید کا بدل سمجھ کر میرے تاثرات پر پھبتیاں کر کے دل ہی دل میں خوش ہو لیتے ہیں۔ مگر ادبی دنیا میں ان کو داد نہیں ملتی"

کلام حیدری ایسے نقادوں کو پسند نہیں کرتے جو تخلیقی ادب کے پیچھے اصول کی لاٹھی لے کر پھرتے ہیں۔ وہ اس ضمن میں کہتے ہیں:

"ویسے بھی میرے تاثرات تنقید لکھنے والوں کو پسند نہیں آسکتے۔ کیونکہ میں تنقید کو ادب کے پیچھے لاٹھی لے کر پھرنے والا سمجھتا ہوں"

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اصول نقد کے مقابلے میں تخلیقات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور ایسا تصور کرنا درست بھی ہے۔ ادب میں اصل اہمیت تخلیق کی ہے، نہ کہ اصول نقد کی۔ اصول نقد تخلیقات کی بنیاد پر وضع کئے جاتے ہیں۔ اس لئے فوقیت تخلیق کو حاصل ہوئی۔ بعض ناقد اصول نقد کو ہی سب کچھ تصور کرتے ہیں۔ اور اسے تخلیقی ادب پر سختی کے ساتھ منطبق کرنا چاہتے ہیں۔ کلام حیدری کو ایسے نقاد پسند نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ اصول نقد بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس میں انحراف اور اجتہاد کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تخلیقی فنکار اصول نقد کی پیروی بھی کرتا ہے اور اس سے انحراف بھی۔ تخلیقی مصنف بندھے ٹکے اصول یا مقررہ ادبی روایت پر عمل نہیں کرتا۔ وہ تخلیق کے دوران اظہار و بیان کے نئے پیرائے اور اسالیب اختیار کرتا ہے مقررہ اور متعینہ تخلیقی ڈھانچے کو توڑتا اور اس کی از سر نو تعمیر کرتا ہے۔ اسی لئے تنقیدی اصول اور نظریے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ہر دور کا عصری ادب اپنے تنقیدی اصول عصری تخلیقات سے وضع کرتا ہے اسی لئے ادب میں روایت اور بغاوت ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ جو ناقد اس حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں وہ تصور ادب کے سلسلے میں اکثر اور غیر لچکدار رویہ اختیار نہیں کرتے۔ کلام حیدری اس بارے میں لکھتے ہیں:

> تخلیقات سے اصول وضع کرنے والے
> جب تخلیقات پر ان اصولوں کو مسلط
> کرنے کی ضد کرنے لگتے ہیں، تو مجھے ایسا
> لگتا ہے کہ وہ اصولوں کو اصل سمجھ لیتے ہیں
> حالانکہ اصول تخلیقات کے لئے نہیں،
> تخلیقات کو سمجھنے کے لئے درس و تدریس
> کے کام آنے والی شئے ہے۔ تخلیق کو اس
> سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ قاری کو فائدہ
> پہونچتا ہے۔ اور کبھی کبھی (اگر وہ ذہین
> قاری نہیں ہے) اسے سخت نقصان بھی
> پہونچتا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے کلام حیدری نظریاتی طور پر ترقی پسند تھے لیکن ایسے ترقی پسند نہیں۔ جیسے دوسرے بکٹر نظریہ پرست ترقی پسند ہوتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے وزیر آغا جیسے غیر ترقی پسند ناقد کی تصانیف "تخلیقی عمل" اور "تصورات عشق و خرد" (اقبال کی نظر میں) سے بحث کرتے ہوئے انصاف کیا۔ وہ ایک نظریہ پرست اور راسخ العقیدہ ترقی پسند کی حیثیت سے کلام حیدری کو ان کی تصانیف سے کیڑے نکالنے چاہتے تھے، یا پھر اقبال کے بارے میں ان کے غیر ترقی پسند دیتے کی دھجیاں بکھیر دینی چاہئے تھیں۔ لیکن کلام حیدری نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ بلکہ اقبال کی شاعری کے جمالیاتی پہلو کو اجاگر کرنے پر ڈاکٹر وزیر آغا کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نظریاتی ہوتے ہوئے بھی ادب کے سلسلے میں مخلص اور سچے ادیب تھے۔ اور نظریہ کے مقابلے میں تخلیقی ادب کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ وہ وزیر آغا کی تصنیف "تصورات عشق و خرد" (اقبال کی شاعری میں) سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "...... میری خواہش تھی کہ ایک ایسے
> نقاد کی اہم تنقیدی کتاب پر اپنے تاثرات
> لکھوں، جو تخلیق کی دنیا میں میرے ساتھ
> دکھ جھیلتا ہے۔ میرے ساتھ تخلیق کے
> کرب میں مبتلا ہوتا ہے۔ ماں، ماں کے
> احساسات کو سمجھ سکتی ہے۔ بانجھ نقاد،

تخلیقی نقاد کو کیا سمجھے گا"

وزیر آغا خالص ادبی مباحث کو نہایت
سائنٹفک طریقے اور تخلیقی الزمینٹ کے
ساتھ پیش کرتا ہے اور اپنی تنقید کے
ساتھ ادب کے قاری کو ویسے بہالے جاتا
ہے جیسے خالق۔ اردو کے نقادوں میں وزیر
آغا کی یہ انفرادیت بے مثال ہے، کم از کم
اب تک بے مثال ضرور ہے"

اقبال پر پاکستان اور پاکستان کے باہر جتنی بڑی تعداد میں
کتابیں لکھی گئی ہیں (اور آج بھی لکھی جارہی ہیں) اس کی
مجموعی تعداد کا اندازہ لگانا۔ تقریباً ہر ہفتے اور ہر ماہ
اقبال پر کوئی نہ کوئی کتاب منظر عام پر ضرور آتی ہے۔
لیکن کتنی ایسی کتابیں ہیں جن میں کوئی نئی بات کہی گئی یا
جن میں اقبال کی شاعری کے نئے پہلو اور نئی جہت کا
سراغ لگایا گیا ہو؟ شاید ایک یا دو۔ زیادہ تر کتابوں
کو رطب یابس میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں
اقبال کے ساتھ ایک ظلم یہ ہو رہا ہے کہ انہیں شاعر اسلام
اور تصور پاکستان کا خالق ثابت کرنے کے جوش میں ان
کی شاعرانہ عظمت اور مرتبے کو یا تو قطعی فراموش کر دیا
گیا ہے یا پھر اسے کم اہمیت دی جارہی ہے۔ اقبال پر
اردو میں جو چند اچھی اور قابل ذکر کتابیں لکھی گئی ہیں۔
ان میں عزیز احمد کی کتاب " اقبال۔ نئی تشکیل" اور
وزیر آغا کی "تصورات عشق و خرد" قابل ذکر ہیں۔ کلام حیدری
آخر الذکر تصنیف سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اقبال صدی سے قبل بھی اقبال پر کم نہیں
لکھا گیا ہے۔ مگر صدی کے طفیل میں
مضامین اور کتابوں کی بھیڑ بھاڑ ہے۔
اس میں وزیر آغا کی کتاب " تصورات عشق
و خرد۔ اقبال کی نظر میں" واحد کتاب ہے
جو مجھے متاثر کر سکی ہے۔ میرا متاثر ہونا
کوئی سند نہیں ہے۔ مگر میرے لئے
مسرت کی بات ضرور ہے کہ عزیز احمد کی
کتاب " اقبال۔ نئی تشکیل" کے بعد
اس کتاب نے مجھے متاثر کیا ہے۔ کتاب
پڑھ کر یہ محسوس ہوا کہ میں کتاب پڑھنے
سے قبل جو تھا۔ وہ کتاب پڑھنے کے بعد
نہیں ہوں۔ مجھ پر کچھ انکشافات ہوئے
ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اہم ہے
ورنہ پھر وہ کتاب کیوں ہے؟ عزیز احمد
کی کتاب سے میرا متفق ہونا ضروری نہیں،
میں اس کتاب کی حدود کا احساس رکھتا
ہوں، مجھے یہ بھی شعور ہے کہ وہ کتاب
اقبال کو ایک مخصوص تحویل میں ڈالنے
کی کوشش ہے۔ مگر میں اس تاثر کو
کیا کروں جو اس کتاب کو پڑھنے کے بعد
پیدا ہوا؟ اقبال کو مذہبی علما کی مجلس سے
اٹھا کر عام لوگوں میں بٹھانے کی کوشش
کی داد نہ دینا، نہیں، نہیں میں یہ گناہ
اپنے سر نہیں لے سکتا۔ عزیز احمد کی کتاب
کو وسعت دینے کی ضرورت تھی۔ مگر
اقبال کی شاعری کو خانہ کعبہ کا غلاف
اڑھانے والے اتنی زیادہ تعداد میں ہیں
کہ غلاف کی زیارت کے سوا کچھ حاصل
ہی نہیں ہو سکا۔ اقبال پر خدا اور
قرآن دونوں اپنا سایہ کئے رہیں، یہ
میری دعا ہے۔ مگر اقبال کی شاعری

فلسفہ اور تہذیب کے شعور پر قرآن کا سایہ کئے رہنے والے نقادوں نے اقبال کو شاعروں کی فہرست ہی سے خارج کر دینے کی مہم جاری رکھی، اور کلاس روم سے لے کر سمینار اور سمپوزیم تک اقبال سرسید سے زیادہ بڑی داڑھی لگائے نظر آئے۔ اگر اقبال کی شاعری محض قرآن کی تفسیر یا تشریح ہے تو پھر مودودی شاعر کیوں نہیں؟"

کلام حیدری نجی زندگی میں جس طرح کاٹ دار گفتگو کرتے تھے، ان کی تحریر میں بھی اسی طرح کاٹ ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ قارئین کو محولہ بالا اقتباس سے ہو گیا ہوگا۔ ان کا یہ جملہ کہ " اگر اقبال کی شاعری محض قرآن کی تفسیر یا تشریح ہے تو پھر مودودی شاعر کیوں نہیں؟ " اور " اقبال سرسید سے زیادہ بڑی داڑھی لگائے نظر آتے اقبال کے بارے میں کلام حیدری کا یہ قول بڑا دلچسپ ہے کہ:

"ہر بڑا شاعر اپنے نقادوں کو گمراہ کرنے میں بڑا ماہر ہوتا ہے۔ اور اقبال شاید اپنے نقادوں کو گمراہ کرنے میں کسی سے کم نہ تھے۔"

وہ اقبال کے مولوی قسم کے نقادوں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تخلیقی اور جمالیاتی میلان تک مولوی قسم کے صراط المستقیم..... والے لوگوں کی پہونچ ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اور تخلیقی اور جمالیاتی میلان کے پیش نظر شاعر کی شاعری کی قدر و قیمت متعین کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کلیم الدین احمد تک کے بس کی بات بھی نہیں معلوم ہوتی۔ جو سارے انگریزی کے شاعروں سے اقبال کا موازنہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور مغربی نقادوں کی سند کے بغیر اقبال کو عالمی ادب میں کوئی مقام دینے کو تیار نہیں"

میرا خیال ہے کہ کتابوں پر کئے جانے والے تبصرے بھی تنقید کے زمرے میں شامل ہوتے ہیں۔ جس میں تبصرہ نگار کسی کتاب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی تنقیدی آرا کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح اگر تبصرہ نگاری کو تنقید نگاری کی ایک شاخ یا ایک قسم کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ بعض دفعہ کتابوں پر تبصرے بھی تنقید نگاری کی بہترین مثال ہوتے ہیں۔ انگریزی میں تبصرے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک عام کتابوں کا تعارفی تبصرہ اور دوسرا کتاب پر مفصل اور سیر حاصل تبصرہ۔ جسے ریویو آرٹیکل کہا جاتا ہے۔ اردو میں اس کے لئے کیا اصطلاح یا متبادل لفظ ہے اس کا مجھے علم نہیں۔ بہرحال اس قسم کے تبصرے سے مبصر کی تنقیدی آرا اور بصیرت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ کلام حیدری نے اپنے رسالہ "آہنگ" میں جو تبصرے شائع کئے اور جو بعد میں "برملا" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے اس کے مطالعہ سے بھی ان کی تنقیدی سوجھ بوجھ اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

میں کلام حیدری کے تبصرے اور تنقید نگاری کے بارے میں بتا دوں کہ انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین اور تبصرے میں جو کچھ اور جس طرح بے باکی اور جرأت کے ساتھ لکھا وہ اس لئے ممکن ہوا کہ وہ خود اپنے ماہنامہ

ے مالک اور مدیر تھے اور انہیں لکھنے کی آزادی تھی۔ انہیں نہ مدیر کے مصلحت کوشی کا خیال تھا اور نہ مصنفین کی ناراضگی کی پرواہ۔ وہ مختار کل تھے اس لئے جو جی میں آیا نہایت بے باکی سے لکھا اور شائع کیا۔ اس لئے ان کی "بے باکانہ" اور "جرأت مندانہ صاف گوئی" کی تعریف کرتے ہوئے اس امر کو بھی ذہن نشیں رکھنا چاہئے کہ وہ کسی دوسرے رسالہ کے لئے نہیں لکھ رہے تھے۔ ورنہ انہیں اظہار کی اتنی آزادی نہ حاصل ہوتی۔ یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے اپنے تبصروں میں جن آرا کا اظہار کیا۔ ان کی ادبی قدر و قیمت کم نہیں۔ ان کے تمام تبصروں اور تنقیدی مضامین سے تو خیر بحث ممکن نہیں۔ البتہ چند تبصروں کے بارے میں گفتگو کی جا سکتی ہے۔

ان کا ایک دلچسپ تبصرہ وہاب اشرفی کی کتاب "معنی کی تلاش" پر ہے۔ واضح رہے کہ کلام حیدری اور وہاب اشرفی میں جونیرٹی اور سینیرٹی کے باوجود گہرے مراسم تھے۔ لیکن کلام حیدری نے تبصرہ کرتے ہوئے انہیں بھی نہیں بخشا۔ اور بعض ایسی باتیں بھی لکھ دیں جن سے یقیناً دیرینہ تعلقات متاثر ہوتے ہوں گے۔ اس کا مرحوم کو بھی احساس تھا۔ وہ عموماً کہا کرتے تھے کہ میری بے باکانہ رائے سے احباب ناراض ہو جاتے ہیں لیکن انہیں "سچ" کہنے کا "مرض" تھا۔ وہ سچ کہنے سے کبھی جھجکتے نہیں تھے۔ جس کی وجہ سے وہ زندگی میں ہمیشہ متنازعہ فیہ بنے رہے۔ انہوں نے اس بات کی کبھی پرواہ نہیں کی کہ ان کی تحریروں کا دوسروں پر کیا ردعمل ہوگا۔ ان کی اس عادت کے باعث ادبی حلقوں کے مرکز توجہ بنے رہے اور ہندوستان کے ادبی مراکز کے زعما جو بہار کو قابل اعتنا تصور نہیں کرتے تھے ان کی جانب اور ان کے صوبے کی جانب توجہ دینے اور ان کی آرا کو اہمیت دینے پر مجبور ہو گئے۔

وہ اپنی تبصرہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے یا کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے پتہ نہیں کیوں میرے ذہن میں ساری باتیں غائب ہو جاتی ہیں۔ اور قلم اگرچہ میرے ہاتھ میں ہوتا ہے مگر اسے "سچ" اپنے قبضے میں لے کر چلاتا ہے اور اس تبصرے کو لکھتے ہوئے بھی ایسا ہی ہے۔"

مطلب یہ کہ تبصرہ یا تنقید لکھتے وقت وہ تمام ذاتی اور سماجی رسم و راہ اور تعلقات، دوستی اور مروت کو ایک جانب رکھ دیتے تھے۔ اور وہی لکھتے تھے جسے وہ درست سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے وہاب اشرفی کی کتاب پر لکھتے ہوئے ایسا ہی کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"مجھے اس کتاب کے مطالعے کے بعد محسوس ہوا کہ ان مضامین میں سے بعض میں "علم" ہے مگر غور و فکر تو ایک مضمون میں بھی نہیں ہے۔ غور و فکر ایک خلاقانہ صفت ہے اور وہ نقاد کو اس "قطعیت" سے بچا طور پر روکتی ہے۔ جو قطعیت وہاب اشرفی کے ان مضامین میں ہے ..... ان مضامین کے مطالعے سے وہاب اشرفی کے وسیع مطالعے کا کہیں پتہ نہیں۔ ادب کا مطالعہ اور اصناف ادب کی بجائے ان پر نقادوں کی تنقید پڑھنے سے عالمانہ تنقید تو لکھی جا سکتی ہے جو کسی حد تک

وہاب اشرفی کے یہاں ہے۔ مگر اضافی
ادب کے ذاتی مطالعے اور بحران پر
غور و فکر کے بغیر نقاد کوئی نیا نکتہ نہیں
نکال سکتا۔ کوئی نیا زاویۂ نگاہ تخلیق کو
دیکھنے کا نہیں دے سکتا۔ وہاب اشرفی
کے مضامین غور و فکر سے عاری ہیں۔
مگر خزانۂ علوم کی کھتونی ان میں ضرور ہے"۔

تنقید میں سچائی بے باکی اور جرأت مندانہ اظہار بہت بڑا وصف ہے۔ جس کا ہمارے زیادہ تر ناقدین میں فقدان ہے۔ ان دنوں تنقید لکھنا تعلقات کو استوار کرنا اور تحسین باہمی کا نام ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے تنقید میں جھوٹ اور منافقت عام ہے۔ اور شاید یہی طرزِ زندگی بن چکا ہے۔ کلام حیدری کی اس عادت سے لوگ ناراض تو ضرور ہو جاتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ان کا احترام بھی کرتے تھے اور یہ اس لئے کہ وہ جو کچھ بھی کہتے یا لکھتے تھے۔ اپنے تئیں سچ اور درست سمجھ کر لکھتے تھے۔ اس لئے ان کے خلوص اور نیک نیتی پر کسی کو شبہ ہوتا تھا۔ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اس میں بدنیتی کا شائبہ تلاش کرنا ممکن نہیں۔ ان کی تنقید خواہ کچھ بھی ہو۔ معاندانہ ہرگز نہ تھی اور نہ منافقانہ۔

بقیہ: اپنی زندگی کے کچھ سچ

شاہدہ حیدری نے جب میرے بچے کو جنم دینے والی تھی تو میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے پروردگار سے یہ دعا کی تھی کہ تو مجھے بیٹی دینا۔ اور میری دعا اس طرح قبول ہوئی کہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ مگر جو میری طمانیت کے لئے کافی ہے۔ اس سے میری زندگی میں وہ گل بوٹے کھلائے رہیں۔ ان سے میرے گھر کے در و دیوار اور میرے گھر کا ہر کونا معطر ہو گیا ہے۔

بقیہ: ایک تجریدی سرگزشت

سا جاتا تھا۔ کس نے سوچا تھا کہ وہ اپنی موت کے تانے بانے میں بھی اتنی گہری تجریدیت کی بُنت کر جائے گا کہ اسے بخوبی سمجھنے والے بھی سوجھ بوجھ کھو بیٹھیں گے۔ میرا خیال ہے کہ موت بھی سوجھ بوجھ کھو کر ہی اس اقدام کا ارتکاب کر بیٹھی۔ سوچیے تو وہ کیسے لے گئی ـــــ اُسے؟ ـــ
وہ تو میرے تیرے دل میں ویسے ہی طمطراق سے اپنی کوئی نئی تجریدی کہانی لکھ رہا ہے۔ اس کا کہنا تھا مجھے اوپر اوپر سے پڑھ کر مجھ سے بے انصافی مت برتو۔ میں اپنا خارج نہیں ہوں۔ میرا اوریجنل میرے اندر ہے۔ یا شاید تمہارے اندر ـــ میں نے اسے ہمیشہ اسی مانند پڑھا ہے۔ اتنا پیارا، کہ خفا خفا سا آدمی صرف اپنے ہی اندر کیسے بسا رہ سکتا ہے! جو کوئی بھی اس کی طرح واقعتاً ہوتا وہ اپنے وجود میں ہونے کی بجائے اولاً اپنے چاہنے والوں کے دل و دماغ میں ہوتا ہے۔ ہے نا؟

ان میں سے ایک۔ کلام حیدری

ش۔ اختر

ناسٹلجیا ایک بری بیماری ہے۔ آدمی ماضی کے کھنڈروں میں بے چین روح کی طرح بھٹکتا پھرتا ہے البتہ یہ بے چینی اگر تخلیق کے اظہار کی شکل اختیار کرلیتی ہے تو اسے یک گونہ سکون مل جاتا ہے جب کبھی کسی نے اس شہر کی ادبی اور تہذیبی صحبتوں کا کوئی تحریری جائزہ لیا تو میری آنکھوں کے سامنے کئی بے حد پیاری، دلنواز اور اہم شخصیتیں ابھر جاتی ہیں۔ ان میں ادبی سیاسی تمام شخصیتیں شامل ہیں۔ ان میں وہ دیوانے بھی شامل ہیں جو سرخ انقلاب کا خواب اپنی آنکھوں میں بسائے تھک کر رہ گئے، وہ باغی نوجوان بھی ہیں جن کی زبان شعلے اگلا کرتی تھی۔ وہ نحیف و لاغر انقلابی بھی دکھائی دیتے ہیں جو رات کی تاریکیوں میں اس چھوٹے سے دیہات نما سیمی شہر کی گلیوں میں چھپ کر چھپ کر دیواروں پر پوسٹر چسپاں کرتے تھے۔ کل کی غلیظ، گندی، چھوٹی اور بے حد تنگ و تاریک کوٹھری میں چلائے گئے چسکیوں میں جب ہندوستانی عوام کی تقدیر بدلنے کی ضرورت اور حکمت عملی یاد آتی ہے تو عجیب سا احساس جنم لیتا ہے۔ لگتا ہے خلوص و محبت ایمان و ایثار کی یہ دولت ہاتھوں سے چھن گئی۔

رفاقت کی یہ کیسی لہر تھی۔ دوستی اور محبت کا یہ اٹوٹ جذبہ اپنے اندر دیوانگی کی کونسی دنیا چھپائے تھا۔ وہ کیسا رشتہ تھا جو زبان، قوم، نسل، مذہب کے حصاروں کو توڑ کر دل میں آبسا تھا۔ کوئی ہندی نہیں سمجھتا، کوئی اردو نہیں بول سکتا۔ کوئی انگریزی اصطلاحوں سے ناآشنا تھا۔ لیکن مفہوم سبھوں کی سمجھ میں ایک ہی تھا۔ زندگی کو تمام استحصال سے نجات دلانے کا ایک ایسا عزم تھا جو آج دور، دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ کیسے لوگ تھے، کتنے دیوانے تھے جن کے بغیر آج کچھ عجیب سناٹا، بے کیفی اور ویرانی دکھائی دیتی ہے۔ یہ دیوانے انقلاب کے خوابوں کو اپنی پلکوں میں چھپائے آج کدھر بکھر گئے، کہاں رہ گئے؟

نئی نسل پرانی نسل سے آگے بڑھ گئی ہے سائنس نے اندھیروں کو دور کیا۔ علم و ہنر کی شعاعیں دور، دور تک پھیلتی جا رہی ہیں۔ لیکن درد کا رشتہ، محبت کی وہ ڈوری کہاں رہ گئی، الجھے الجھے خشک بالوں میں پیار کی مخروطی انگلیاں آج سنورتی ہوئی نرم و نازک زلفوں سے پھسلتی ہوئی دور کہیں ہٹ رہی ہیں؟ انقلاب کا گیت گاتے ہوئے شاعر مزدوروں اور کسانوں کے درمیان کام کرتے ہوئے فاقہ زدہ چہرے غربت کی کہانیاں جنم دینے والے افسانہ نگار کہاں روپوش ہو گئے؟ ابھی تو وہ دن بھی نہیں آیا جس کا انہیں انتظار تھا۔ یہ سب ایک تانے کے ٹوٹ جانے سے کہاں بکھر کر اوجھل ہو گئے؟

کہیں تشکیک اور لایقینیت کے گھیروں نے تو انہیں نہیں
چھپا لیا ـــــ آج میں ایسے کتنے چہروں کو یاد کر رہا ہوں
جن کی معصومیت میں انسانیت کی پکار چھپی تھی۔

آج نہ جانے کیوں ان میں ایک پر میری نگاہ رک گئی
ہے؟ ان آنکھوں کو تلاش کرنے لگی ہے۔ جن کی چمک اب بھی
دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جس کے گھونگھرالے بالوں
میں ہر وقت مصروف رہنے والی تنظیم کے کسی نئے مسئلے کا حل
تلاش کر رہی ہیں۔ کلام حیدری مدت ہوئی رانچی سے دور ہو گئے
لیکن بے نام گلیاں اب بھی انہیں یاد کرتی ہیں۔

یہ دبلا پتلا نوجوان اپنی جگہ ایک انجمن تھا۔ اس کے
دم سے کالج کی ادبی، تہذیبی اور سیاسی زندگی میں رونق گہما
گہمی اور چہل پہل تھی۔ اس وقت کا رانچی کالج کمیونسٹ طالبعلموں
کا ایک بڑا عظیم الشان گہوارہ تھا۔ بہار میں ترقی پسند تحریک
کا یہ سب سے بڑا مرکز تھا۔ کلام میں تمام لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کا
حوصلہ تھا، صلاحیت تھی، ان کی آواز اور لہجے کے سبھی قائل تھے
ان کی جرات مندی پر سبھی نازاں تھے۔ ان کی تقریروں سے
سبھی متاثر ہوا کرتے تھے۔ ان کی غصے سے لال آنکھوں کو نظر انداز
کرنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ اسی لئے میں نے کہا کہ کلام حیدری
ایک انجمن تھے، صرف ادیب اور ناقد ہی نہیں۔

طالب علمی کی زندگی بڑی عجیب و غریب ہوتی ہے۔
بسا اوقات آدمی کے قدموں میں لغزش ہو جاتی ہے، مگر کلام
نے اپنی صلاحیتوں سے کبھی کوئی غلط کام نہیں لیا۔ لڑکیاں ان
سے متاثر تھیں ان کے ساتھ کام کرتی تھیں، مگر کوئی چہرہ کبھی
اداس نہیں ہوا کسی پیشانی پر کوئی شکن نہیں آئی کسی نے
دست رفاقت کو کبھی شبہ کی نظر سے نہیں دیکھا، دل کا کوئی
تار بے وجہ نہیں جھنجھلایا۔ کلام حیدری دوستوں میں دوست،
یاروں میں یار اور بزرگوں میں بقراط۔

کلام حیدری نے اس وقت بھی اچھے افسانے لکھے،
جب تحریک زوروں پر تھی۔ ادبی مذاکروں، مباحثوں
اور جمود اور تعطل کے موضوعات پر ان کے مقالے اور
ایک روشن دماغ اور بے باک قلم کے ترجمان ہیں۔ کلام نے
مصلحت پسندی کو اپنی ادبی زندگی کے لئے کبھی نشان
نہیں بنایا۔ حق گوئی اور بے باکی ان کا شعار تھا۔ ان میں
ایک امنگ تھی، حوصلہ تھا، جانے کیسے لوگ تھے ان سب
میں انور عظیم، اختر پیامی، امر ہندی، رباب دانش، پرگیہ
فکری، ستیشور رائے، مرنال رائے، وحید الحسن، یہ سب
سب محبت بھرے دل کے ساتھ تحریک کے مضبوط ستون
تھے، کلام ان تمام لوگوں میں سب سے زیادہ نڈر تھے۔ قلم کی
انکی آواز بھی بے باک تھی ایک شریر مسکراہٹ، کبھی کبھی چہرے پر خوانی...
ابھرتی ایک ایسی مسکراہٹ، اب بھی کشش کا باعث، ایک
لہجہ جواب بھی اپنے پن کا راز چھپائے رکھتا ہے۔

کلام حیدری جب اس شہر سے رخصت ہو
تو یہاں کی ادبی، علمی اور تہذیبی فضا میں عرصہ تک
سناٹا چھایا رہا۔ مگر وہ خاموش رہنے والے آدمی تو
نہیں تھے، گیا میں بھی انہوں نے وہ کام کیا جو اب تک کسی نے
نہیں کیا۔ اس پچھڑے ہوئے صوبہ میں اگر کسی نے خاموشی
کے ساتھ بغیر کسی نام و نمود کے ٹھوس کام کیا تو وہ کلام
ہیں۔ پرچہ نکالنا ایک فیشن بھی ہے اور اظہار خیال کا
موثر حربہ بھی۔ تجارت بھی ہے اور ذہنوں کو بدلنے کا
بھی، تہذیبی قیمتوں سے آشنائی کا ایک وسیلہ بھی
تہذیبی ورثہ کی حفاظت کا ایک ذریعہ بھی۔ مورچہ اور
جس مستقل مزاجی سے عظیم ادبی خدمات انجام دیے
ہیں وہ مستقبل کی تاریخ ہی بتائے گی ان میں کبھی کبھی
چنگاری روشن چنگاری دکھائی دیتی ہے جو کلام حیدری
بیدار ذہن کا سراغ دیتی ہے۔

ان کی ادبی اور تہذیبی خدمات چند کتابوں

(باقی صفحہ پر)

کلام حیدری صاحب۔ چند یادیں

عبدالمغنی، پٹنہ

۱۹۷۷ء میں جب کلام حیدری صاحب انجمن ترقی اردو بہار کے جنرل سکریٹری کے عہدے کے لیے امیدوار ہوئے، جبکہ میں صدر کے عہدہ کے لیے امیدوار تھا، تو میرے وہ تعلقات ان کے ساتھ بہت بڑھ گئے جو پہلے سے چلے آرہے تھے اور ہم دونوں نے مل کر پوری ریاست کا دورہ کیا، تقریباً ہر بڑے شہر میں ساتھ ساتھ تقریریں کیں اور وہ فضا بنائی جس میں انجمن کا انتخاب پہلی بار ایک ریاست گیر عوامی واقعہ ان لوگوں کو بھی نظر آنے لگا جو انجمن سے بہت قریب نہیں رہے تھے۔ میں انجمن کا صدر ۱۹۷۵ء سے ہی تھا اور تنظیم کی تمام شاخیں میری حمایت کر رہی تھیں چنانچہ اس وقت جو ڈیڑھ لاکھ ووٹر یا ممبر تھے ان میں تقریباً سوا لاکھ میرے حامی تھے، جبکہ کلام حیدری صاحب انجمن کے اندر گویا تازہ وارد تھے اور ان کا مقابلہ انجمن کے ایک قدیم رہنما سے تھا۔ جن کی پشت پر بعض دوسرے قدیم اور مشہور رہنما بھی تھے۔ اس فضا میں جب انتخاب ہوا تو میں انتخابی اجلاس کے انعقاد سے پہلے ہی بلا مقابلہ منتخب قرار دیا گیا، اس لیے کہ میرے مقابلے پر جس اہم سیاسی شخصیت کو امیدوار بنایا گیا تھا اس نے اپنا نام واپس لے لیا۔ میرے انتخاب کا اعلان عبدالغفور صاحب (سابق وزیر اعلیٰ بہار) نے کیا جو انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے انتخاب کے نگران بنائے گئے تھے۔ لیکن جب انتخابی اجلاس کے انعقاد کا اعلان ہوا، تاکہ جنرل سکریٹری اور مجلس عاملہ کا انتخاب عمل میں آئے، تو فریق مخالف کی طرف سے عدالتی پابندی لگوا دی گئی، جو کچھ دنوں بعد ہٹا لی گئی اور پھر بحیثیت جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار کلام حیدری صاحب کا باضابطہ انتخاب عمل میں آیا۔

اس کے بعد تین سال (۱۹۸۰ء) تک ہم لوگ مل کر کام کرتے رہے۔ اسی دور میں ۱۹۷۸ء میں انجمن ترقی اردو بہار کے زیر اہتمام پٹنہ میں آل انڈیا اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اردو کو دیگر ریاستوں کے ساتھ بہار میں دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا گیا اور وہ بالآخر انجمن کی عوامی تحریک کے نتیجے میں ۱۹۸۰ء میں پورا بھی ہو گیا، جو آزاد ہندوستان کی اردو آبادی کے لیے ایک تاریخ ساز واقعہ ثابت ہوا اور اس کے وسیع اثرات کم از کم پورے شمالی ہند پر پڑے، چنانچہ اس کے تقریباً دس سال بعد ۱۹۸۹ء میں اردو کی سرکاری حیثیت کا قانون بہار ہی کے نمونے پر اتر پردیش میں بھی منظور ہوا، گرچہ وہاں ابھی تک اس کے نفاذ کی نوبت نہیں آئی ہے۔ اسی زمانے میں ایک اہم چھوٹا ناگپور اردو کانفرنس

رانچی میں وہاں کی شاخ انجمن کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ جس میں میرے ساتھ ساتھ کلام حیدری صاحب بھی شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کی خاص بات یہ تھی کہ انجمن نے ایک تجویز میں بہار کی دوسری علاقائی زبانوں کے مطالبات کی تائید کی۔ اس کا بہت ہی اچھا اثر بالخصوص جھارکھنڈ کی تحریک سے تعلق رکھنے والوں پر پڑا اور ان کے بعض نمایاں ترین لیڈروں نے اسٹیج پر آکر اردو کے لیے انجمن کے مطالبات کی حمایت کی۔

سن ۸۱ء میں جب انجمن ترقی اردو بہار کے نئے انتخابات ہوئے تو کلام حیدری صاحب کسی عہدے کے امیدوار بن کر نہیں کھڑے ہوئے۔ اس وقت انجمن کی ممبر سازی تین لاکھ تک پہنچ گئی تھی اور مختلف عہدوں کے لیے بہت سے امیدوار سامنے آگئے تھے جن کے حمایتی کچھ سیاسی لوگ بھی بن گئے تھے۔ ایک زبردست محاذ آرائی ریاست گیر سطح پر ہوئی۔ اس سلسلے میں کلام حیدری صاحب میرے ساتھ نظر نہیں آئے۔ چنانچہ انجمن میں میرے ساتھ ان کی رفاقت ختم ہوگئی۔ لیکن جو ذاتی تعلقات اور علمی و ادبی رشتے میرے اور ان کے درمیان بہت پہلے سے چلے آرہے تھے وہ بالکل منقطع نہیں ہوئے۔ انجمن سے پہلے ہم دونوں نے مل کر بہار اردو اکادمی کی مجلس عاملہ میں بھی تین سال تک کام کیا تھا۔ اس کے علاوہ گیا میں کلام حیدری صاحب کی جو سرگرمیاں بہت قبل سے چلی آرہی تھیں ان میں بھی بعض اوقات میری شرکت ہوئی تھی۔ خاص کر مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک کل ہند سیمینار کے موقعے پر جس میں ڈاکٹر عبدالعلیم اور احتشام حسین صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔

سن [illegible] سے سن [illegible] تک تین سال میں جب کلام حیدری صاحب انجمن کے جنرل سکریٹری تھے اکثر ایسا ہوا کہ میں انجمن کے کسی کام سے گیا آیا تو اس شہر میں اپنے قریبی رشتہ داروں کے بجائے کلام صاحب ہی کے ساتھ ٹھہرا اور ان کے گھر کے لوگوں نے میری میزبانی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس سلسلے میں وہ خاص کر اپنی بیگم صاحبہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ میرے اپنے یہاں مہمان بننے پر ان کو خوشی ہوتی تھی۔ ہم دونوں کی قریبی رفاقت کا یہ دور مختصر لیکن نتیجہ خیز رہا۔ انجمن ترقی اردو بہار اور اردو تحریک کے کئی قابل ذکر کام اس زمانے میں ہوئے۔ اس دور میں بعض وقت کلام صاحب نے کچھ پُرلطف باتیں بھی کیں مثال کے طور پر جب گیا میں انجمن کی ممبر سازی کے کوٹے کی رقم کا چیک میں نے انہیں دیا تو اسے کیش کرانے کے بجائے انہوں نے فریم کرا کر اپنی نشست گاہ کی میز پر سجا دیا۔ جب میں نے اس کا مطلب پوچھا تو وہ بولے کہ یہ ایک نمونہ ہے اس حقیقت کا کہ جو انجمن پہلے لوگوں سے چندے لیا کرتی تھی اب انہیں پیسے دیتی ہے۔ یہ بات وہ اپنے طور پر ہر ملاقاتی سے کہا کرتے تھے اور اسے فریم کیا ہوا انجمن کا چیک دکھاتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ وہ کیش نہیں کرائیں گے، ایک یادگار کے طور پر محفوظ رکھیں گے۔

اپنی وفات سے چند ہفتے قبل ایک مدت کے بعد کلام حیدری صاحب نے مجھے دو خطوط لکھے۔ ایک دلی سے، دوسرا گیا سے، جن میں انہوں نے مجھے بتایا کہ میں انہیں اکثر یاد آتا ہوں اور وہ جلد ہی مجھے مزید خطوط لکھیں گے۔ قدرت نے انہیں اس کی مہلت نہیں دی۔ ان کا آخری خط گیا سے آیا کہ وہ دلی جا رہے ہیں اور وہاں سے مجھے خط لکھیں گے۔ ان خطوط میں انہوں نے قدرے تفصیل سے اپنی بیماری کی شدت اور اس کے علاج کا ذکر کیا تھا۔ ●

کلام حیدری کی یاد میں

شمس الرحمٰن فاروقی، الٰہ آباد

یہ مئی ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ لکھنؤ میں میرا چھوٹا
گھر چند دنوں کے لئے رشک شیراز و بغداد بن گیا تھا۔
ج کومل اور عمیق حنفی کی کتابوں کا جلسہ ہونا تھا۔ میں
موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جدید افسانے پر بھی
گفتگو کا انتظام کرلیا۔ دونوں جلسے "شب خون"
طرف سے ہوئے تھے۔ اور سب شرکا میرے مہمان تھے
شرکا کی فہرست آج ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے۔
پنے خرچ پر صرف ادب کی محبت میں اتنے لوگ یکجا
جائیں۔ لکھنؤ کی گرمی اور میرا چھوٹا سا گھر، آج تصور
بھی نہیں آتا کہ سب لوگ کس طرح اس قدر ہنسی خوشی
ہے۔ اور کس طرح جمیلہ اور ہماری بیٹی مہر افشاں نے
کی میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔ سچی بات
ہے کہ جدید ادب کے لئے ہم لوگوں کے دل میں جو لگن
، نئی بات کہنے اور سننے کا جو شوق تھا وہ وظیفہ
ات کی طرح ہماری زندگیوں میں، ہماری روح میں جاری
، جدید ادب سے رسمی محبت نہ تھی، سوتے جاگتے کا ذکر
ن وجلی تھا۔ شرکا نے جلسے کی فہرست نئے ادب کا
نں اعزاز معلوم ہوتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی بلراج
کومل، شہریار، زبیر رضوی، محمود ہاشمی، کلام حیدری
شاہد احمد شعیب، ابرار اعظمی اور محبوب الرحمٰن فاروقی
مقامی لوگوں میں رام لعل، اور نیر مسعود، بعد میں کسی اور
قرینے سے شہر میں وارد ہونے والوں اور شریک گفتگو
ہونے والوں میں جگن ناتھ آزاد، زیب غوری اور بشیر بدر
تھے۔ پھر رسم اجرا کے ساتھ ہی ساتھ کرشن چندر پر
جلسہ ہوا جس میں متذکرہ بالا دوستوں کے علاوہ عابد
سہیل، منظر سلیم، امرت لال ناگر، حسن نعیم شریک تھے۔
شام کو صدیق احمد صدیقی کے زیر اہتمام پریس کلب میں
نشست تھی جس میں فراق صاحب اور آنند نرائن ملا
بھی شریک تھے۔ پھر میرے گھر پر مہمانوں کی فہرست میں
زیب غوری اور حسن نعیم کا اضافہ ہوگیا۔ نیر مسعود بھی روک
لئے گئے کیوں کہ ان دنوں ان کے محلے میں فضا سازگار
نہ تھی۔

بھلا کیا زمانہ تھا اور کیا رشتے تھے، جن میں اختلاف
بھی لذیذ و شیریں معلوم ہوتا تھا۔ کلام حیدری سے میری مراسلت
تو پرانی تھی۔ اور ان سے کبھی کبھی نوک جھونک بھی ہوتی رہتی
تھی۔ لیکن ملاقات یہ پہلی تھی۔ نرم چہرہ جس پر بھولا پن بھی،

اور ذرا سی شوخی بھی۔ کبھی آواز اپنے کو لئے دیئے
ہوئے۔ خوش پوش اور خوش گفتار، ایک موقعے پر
بولے "فاروقی سے میرے اختلافات تھے اور ہیں
لیکن یہ پہلی ملاقات ہے لہٰذا اختلافات کا ذکر نہ ہوگا"
اور سچی بات یہ ہے کہ انہیں مجھ سے کوئی ایسا اختلاف
نہ تھا، تھوڑی سی انانیت ان میں بھی تھی اور مجھ میں بھی،
اس کا اظہار کبھی کبھی وہ "مورچہ" میں (بعد میں "آہنگ"
میں) میرے تعلق سے کرتے۔ اور کبھی خط میں اور کبھی
کبھی براہ راست اپنی انانیت کا اظہار کر دیتا تھا۔ ورنہ
براہ راست میری مخالفت میں کوئی بات انھوں نے
کبھی نہ لکھی اور میں نے بھی ان کی دوستی کا احترام کیا۔ ان
پر ترقی پسند خیالات کا تھوڑا بہت اثر دیر تک رہا۔
لیکن افسانوں کے معاملے میں وہ ہمیشہ ہم لوگوں کے
ہم نوا رہے۔ لکھنؤ میں جس جلسے (بلکہ جلسوں) کا ذکر میں
کر رہا ہوں ان کی بہت خوبصورت روداد محمود ہاشمی
نے لکھی تھی (شب خون ۴۳ بابت ستمبر ۱۹۶۹ء) اور
افسانے پر گفتگو میرے گھر پر ہوئی تھی اس کو میں نے
ٹیپ کر لیا تھا۔ اس کی نقل بھی اسی "شب خون" میں شائع
ہوئی ہے۔ کلام حیدری نے اپنی بات کا آغاز ہی یہاں سے
کیا کہ ہم افسانہ نگار کے لئے کسی مینی فیسٹو (MANI-
FESTO) کے خلاف ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا
اعتراض صرف وہاں تک ہے جہاں افسانہ نگار کو زبردستی
کوئی (Manifesto) دے دیا جائے کہ
وہ اس کی پابندی کرے، ورنہ ظاہر ہے کہ افسانہ اپنے
طور پر با مقصد ہوتا ہی ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ کلام حیدری کے زبان سے
مجھے یہ بات سن کر ذرا تعجب ہوا تھا مسرت آمیز تعجب،
لیکن تعجب بہر حال ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ افسانے
میں "مقصدیت" اور "افادیت" کی پرزور وکالت
کریں گے لیکن اس دن ان کی گفتگو سے یہ بات بہر حال
بالکل واضح تھی کہ وہ افسانہ نگار (یا فنکار) کی آزادی
کو بنیادی اور مرکزی اہمیت دیتے ہیں۔ آگے چل کر
انہوں نے یہ بھی کہا کہ افسانہ نگار کو آپ یہ آزادی تو
دیں گے ہی کہ وہ کردار کی نفسیات کو واضح کرنے کے
لئے جو ہتھیار استعمال کرے۔ کلام حیدری گول
مول گفتگو کے قائل نہ تھے نہ اپنے اداریوں میں اور
مباحثوں میں۔ چنانچہ اسی گفتگو میں رام لعل نے افسا[نے]
کی تعریف میں ذرا عمومی سی بات کہی تو کلام حیدری
نے فوراً کہا کہ یہ تعریف تو ایسی (...artmention
تعریف ہے جو آپ کسی صنف پر بھی چپکا سکتے ہیں۔

لکھنؤ کے ان جلسوں اور گفتگوؤں کی تصویریں
اور یادیں میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ یادیں محمود ہا[شمی]
کی خوب صورت روداد (جسے انھوں نے اوڈی تاثر کا [نام]
دیا تھا یعنی اوڈیسی + رپورتاژ) میں محفوظ ہیں۔ او[ر]
تصویریں کلام حیدری کے بہت عمدہ کیمرے سے کھینچی
میرے البم میں ہیں۔ ان دنوں میرے کیمرے میں فلیش
نہیں کر رہا تھا۔ لیکن کلام حیدری کا کیمرہ اس قدر اع[لیٰ]
درجے کا تھا کہ اس سے عام روشنی میں بغیر فلیش کے
تصویریں لینا ممکن تھا۔ کلام حیدری نے از راہ لطف
تصویروں کی ایک ایک نقل مجھے دے دی۔ آج اس محف[ل]
کے بہت سے شرکار ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ خو[د]
کلام حیدری کو بھی موت نے قبل از وقت اٹھا دیا۔
خلیل الرحمٰن اعظمی، زیب غوری، حسن نعیم یہ دوست
بھی وقت کے پہلے ہی چلے گئے۔

ہزار شمع بجھتند و انجمن باقیست

کیا واقعی ایسا ہے؟ مجھے تو یہ دنیا ان لوگوں کے بغ[یر]

بہت سونی اور جدید ادب کی انجمن ان کے نہ ہونے سے بہت ادھوری معلوم ہوتی ہے۔

کلام حیدری بڑے افسانہ نگار نہ تھے، لیکن انہیں افسانے میں شدت INTCNSITY اور فوری پن URGENCY کا تاثر پیدا کرنے کا فن آتا تھا۔ "الف لام میم" بہت بکھر بکھرا افسانہ ہے۔ لیکن اس کا ہر صفحہ فلم کے منظر کی طرح متحرک ہے اور زندہ وجود کا تاثر دیتا ہے پورے افسانے میں حرکت اور رفتار کے بیکہ قاری پر باؤ ڈالتے ہیں۔ اور وہ افسانے کو پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ "کون جانے" میں دو منزلہ سی عمارت کا احساس پیدا ہوتا ہے، ایک منزل پر جو ہو رہا ہے وہ اہم ہے اور دوسری منزل پر جو ہو رہا ہے وہ غیر اہم ہے۔ اصل بات حالانکہ یہ ہے کہ دونوں منزلوں (یعنی دونوں مریضوں) کی صورت حال ایک سی ہے اگر ایک اہم ہے تو دوسری مریض بھی اہم ہے۔ ڈاکٹر بھی انسانی موضوعیت کا شکار ہو سکتا ہے۔

کلام حیدری بڑے افسانہ نگار نہ رہے ہوں لیکن وہ بڑے ایڈیٹر ضرور تھے۔ وہ اچھے لکھنے والوں کو جمع کرنے کا ڈھنگ جانتے تھے۔ ہفتہ وار "مورچہ" ہو یا ماہنامہ "آہنگ" وہ اپنے رسالے کو متحرک، تازہ مسائل سے دست وگریباں اور خیال انگیز بنائے رکھتے تھے۔ افسوس کہ بیماری نے انہیں بہت جلد بوڑھا کر دیا۔ اور زندگی کے آخری برس انہوں نے تعطل میں گذارے۔ ورنہ جب تک کلام حیدری فعال تھے ان سے ہمیشہ کسی نہ کسی کارنامے کی توقع رہتی تھی۔ ان کی جوئے حیات میں پانی اب نہ رہا، لیکن ان کے کارناموں سے گوہر شب چراغ کی طرح باقی ہیں۔ ؎

دریا بکنارہ دگر افتاد و گہر ماند

بقیہ : سرگذشت

ہونٹ جو اپنے کمنٹس اور جوشیلی تقریروں کے لئے مشہور تھے، مرجھا چکے تھے۔

یہ وہ عمر تھی جب میرے اندر ایک آگ روشن تھی۔

یہ آگ بھبکتی تھی، دہکتی تھی، جلاتی تھی۔

ایک بار ڈاکٹر محمد حسن نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا۔ اپنے اندر کی چنگاری کو سرد مت ہونے دیجئے۔

ممکن ہے کلام صاحب کی زندگی میں، اس چنگاری کا کوئی شعلہ ان کی طرف بھی لپکا ہو تو یہ اس عمر کا کارنامہ تھا۔ وقت کی گذری ہوئی کہانی میں ان کے سدا بہار چہرے کی جھلک میری یادوں میں اب بھی محفوظ ہے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک بے باک قلم تھا۔ اور وہ اس قلم سے دھوم مچا سکتے تھے، افسوس اس بات پر رہا کہ اپنے چند حواریوں کے بہکاوے میں آکر وہ اسے مسلسل تیز نشتر کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ کاش کہ وہ اپنی سنتے اور اپنی لکھتے تو آج ادب میں ان کی حیثیت ہی دوسری ہوتی ●

"کلام حیدری کے افسانے اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں کہ وہ ایک حساس فنکار ہیں۔ وہ زندگی کو سطحی انداز سے نہیں دیکھتے بلکہ ان کا ذہن روزمرہ ہونے والے واقعات کے احساس کے عذاب سے گذر کر کہانیاں تخلیق کرتا ہے۔ ان کا رویہ زندگی کی کوکھ میں رقصاں سماجی برائیوں سے بغاوت کا ہے۔ وہ ان سے کسی طور پر مفاہمت نہیں کر سکتے"

(ممتاز احمد خان۔ افکار)

کلام حیدری۔ کچھ یادیں کچھ باتیں

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی

کلام حیدری کا انتقال ہوگیا۔ یقین نہیں آیا، لیکن
ـنے والا اتنا معتبر تھا کہ یقین کئے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں
ـ کالج جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا لیکن وہاں جانے کا
ـہ ملتوی کرکے رینبو ہاؤس (کلام صاحب کے دولت کدے
ـم) کی جانب چل پڑا۔ وہاں پہونچا تو بہت سارے دوستوں
ـعزیزوں کو موجود پایا۔ ابھی دو دن پہلے اسی احاطے میں
ـیبا پانچ گھنٹے تک دنیا جہان کی باتیں کرکے آیا تھا۔ ما
ـالطبیعیاتی مسائل پر اور روحانی موضوعات پر خاصی
ـگو ہوئی تھی۔ لہجہ اور انداز میں وہ تیور اور طنطنہ نہیں تھا
ـجو کلام کی شخصیت کی پہچان بن کر ابھرتا تھا۔ لیکن یہ
ـنیت تو ان کے یہاں میں ان ہی دنوں سے محسوس
ـنے لگا تھا جب وہ اپنے دل کے کامیاب آپریشن کے
ـخاصا وقت دلی میں گذار کر گیا لوٹے تھے، ایسا لگا کہ

خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا

ـما انتیس برس کی دوستی میں ان کے ساتھ گذرے
ـے لمحات جگنوؤں کی طرح اڑنے لگے۔ ان کی ادبی زندگی،
ـن کی کاروباری مصروفیات، ان کی صحافتی مشغولیات،
ـن کی سیاسی اور تہذیبی سرگرمیاں، آنکھوں کے سامنے
ـب ایک کرکے بکھرنے لگیں، اتنا سرگرم اور فعال شخص
اتنی جلد ہم سے رخصت ہوگیا۔ لگا جیسے سب کچھ بدل
گیا، دل مسوس کر رہ گیا۔

کلام حیدری ترقی پسند تحریک، "صبح نو" اور پورنیہ
یہ سب میرے ذہن میں ایک ساتھ ابھرتے ہیں۔ ان کا
نام سب سے پہلے میں نے اس وقت سنا تھا جب وہ بہار
کی ترقی پسند تحریک کے ایک نمایاں علم بردار کی حیثیت سے
معروف ہو چکے تھے۔ پورنیہ سے شائع ہونے والے
"صبح نو" میں ان کے زوردار اداریے، مضامین اور
افسانے چھپتے تھے۔ اور قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتے
تھے بعض دوسرے ادبی پرچوں میں ان کی کہانیاں شائع
ہوئی تھیں۔ جن پر ترقی پسندی کا رنگ پوری طرح چھایا
نظر آتا تھا۔ پورنیہ کالج کی ملازمت چھوڑنے کے بعد جہاں
وہ شعبۂ اردو کی صدر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔
انہوں نے اپنے مستقل قیام کے لئے گیا کا انتخاب کیا۔
یہاں انہوں نے سمنٹ پائپ کا کارخانہ قائم کیا اور
بڑے انہاک کے ساتھ اس کو فروغ دینے میں لگ گئے
لیکن اس عالم میں بھی ان کو علم و ادب کی دنیا اپنی طرف
برابر کھینچتی رہی چنانچہ ہفتہ وار "مورچہ" کا قیام عمل میں آیا۔
جون ۱۹۶۵ء کی وہ گرم اور جلتی ہوئی دوپہر مجھے

اچھی طرح یاد ہے جب پہلی بار گیا کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ ایسی چلچلاتی دھوپ تھی کہ اللہ کی پناہ۔ اسٹیشن سے باہر آنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ تمازت میں ذرا کمی آئی تو مگدھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر (زوار حسین جب تھا مرحوم ان دنوں وائس چانسلر تھے) صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے ایک رکشہ میں ان کے بنگلہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں جگجیون روڈ پر ایک ایسے مکان پر نظر پڑی جس کی دلکشی اور البیلے پن نے میری توجہ اپنی طرف فوراً کھینچ لی۔ کلام حیدری کے نام کی تختی دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ کئی نام ایک ایک کر کے ذہن میں گھومنے لگے۔ انور عظیم، اختر پیامی، مظہر امام، شکیل الرحمن وغیرہ۔ رکشہ رکنے کے دھچکے کے ساتھ ساتھ خیالات کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سامنے وائس چانسلر کا بنگلہ تھا۔ ایک ریسرچ فیلوشپ کے سلسلے میں ان سے ملنا تھا۔ واپس ہوتے وقت جب میں ان سے دوبارہ ملنے گیا تو لان میں بہت سے ملنے والے موجود تھے، ایک خوبصورت جوان سال شخص کو جو کرتے پاجامہ میں ملبوس تھا جیپ سے اتر کر ان کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ مجھے پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس ذہین چہرے کو رسائل کے صفحات پر دیکھ چکا تھا۔ مجھے گاڑی پکڑنے کی جلدی تھی اور موقع بھی کچھ ایسا تھا کہ سبقت کر کے ملنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ سوچا کہ گیا تو اب تحقیقی کام کے لئے آنا ہی ہے تب مفصل ملاقات کا موقع ملے گا ہی اور فیلوشپ مجھے مل ہی گئی۔

شروع شروع وائس چانسلر صاحب کے مکان ہی میں پناہ لینی پڑی کیونکہ فوری طور کسی دوسرے مکان کا انتظام نہیں ہو پایا تھا۔ میرے تحقیقی مقالہ کا موضوع تھا "پنڈت جواہر لعل نہرو کی سائنٹیفک انسان دوستی" synopsis تیار کرنے کے لئے پنڈت نہرو کی کچھ لکھی ہوئی کتابیں درکار تھیں۔ یونیورسٹی کی لائبریری سے ابھی میری کوئی واقفیت نہیں تھی۔ خیال آیا کہ کیوں نہ کلام حیدری صاحب کو زحمت دوں۔ چنانچہ تکلف کو برطرف کر کے میں نے ایک مختصر سے خط کے ذریعہ اپنی ضرورت اور پریشانی لکھ بھیجی۔ کلام صاحب نے مطلوبہ کتابیں بھجوا دیں۔ مطالعہ کے دوران میں نے کئی سطروں کے نیچے خط کھینچے ہوئے دیکھے۔ اور بعض جگہ حاشیوں پر ان کے تاثرات بھی نظر آئے۔ جس سے اندازہ ہوا کہ ادب کے علاوہ دوسرے موضوعات سے بھی ان کو دلچسپی ہے۔

ان سے کچھ دنوں بعد وائس چانسلر صاحب کے مکان پر ہی پہلی ملاقات ہوئی۔ شام کا وقت تھا۔ زوار صاحب تھوڑی دیر کے لئے کہیں باہر گئے ہوئے تھے میں انہیں اپنے ہی کمرے میں لے آیا۔ جی بھر کے باتیں ہوئیں ترقی پسند تحریک کے عہد شباب کی یادوں سے لے کر سیاست حاضرہ تک کی باتوں کا ذکر رہا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ کاروباری مصروفیتوں کے باوجود شعر و ادب اور دوسری ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں سے ان کی دلچسپی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس دن کی بات چیت کا نقش ابھی تک ماند نہیں پڑا۔ اپنی باتوں سے انہوں نے میرے بجھے بجھے سے دل میں امیدوں اور حوصلوں کی جوت جگا دی تھی۔ کلام صاحب بار بار اس حقیقت پر زور دیتے رہے کہ پچھلی ناکامیوں اور محرومیوں کی یاد آگے کی یاد کھو ڈی کر دیتی ہے۔ ماضی پر ہمارا بس نہیں لیکن مستقبل تو ہم اپنی ہمت کے سہارے اور اپنے مقدور بھر سنوار سکتے ہیں۔ ان کی باتیں نہ تو نئی تھیں نہ انوکھی لیکن ان کے انداز میں جو اپنائیت تھی اور لہجے میں جو خلوص تھا اس سے میں بے حد متاثر ہوا۔

کلام صاحب کا مکان زینہ ہاؤس ہمیشہ ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ مجھے اس وقت ان دنوں کی یاد آرہی ہے جب یہ گیا کبھی اپنے شباب پر تھی۔ باقاعدگی اور آن بان کے ساتھ شعری اور ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ یہاں آنے والوں میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، احتشام حسین، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی، معین احسن جذبی، خلیل الرحمن اعظمی، عقیل رضوی، جوگندر پال، راہی معصوم رضا جیسے لوگ شامل ہیں۔ یہیں میری پہلی ملاقات غیاث احمد گدی اور مظہر امام سے ہوئی تھی۔ ناانصافی ہوگی اگر میں یہاں اس حقیقت کا اظہار نہ کروں کہ ان محفلوں اور جلسوں سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ ان جلسوں کی روداد، مورچہ، میں تفصیل کے ساتھ شائع ہوتی تھی۔ کئی بار یہ ذمہ داری کلام صاحب نے مجھ پر سونپی تھی اور اس طرح میرے اندر ادبی کاموں کے لئے تحریک پیدا کرنے اور اس میں تیزی لانے کا ذریعہ بنے۔ بزرگوں میں احتشام صاحب مرحوم اپنے حوصلہ افزا ادیب کے لئے اور دوستوں میں خلیل الرحمن اعظمی مرحوم دوسروں میں ادبی لگن پیدا کرنے کے لئے خاص طور پر جانے جاتے تھے۔ ان کے بعد یہ بات میں نے کلام صاحب میں پائی تو عجیب طرح کی مسرت ہوئی۔ یہاں ایک دلچسپ بات اور یاد آئی۔ میرے اور کلام صاحب کے درمیان مراسم اور روابط کو مضبوط اور استوار کرنے میں چند تین شخصیتوں نے غیر شعوری طور پر حصہ لیا، ان میں زوار حسین صاحب مرحوم کے ساتھ احتشام حسین صاحب مرحوم اور خلیل الرحمن اعظمی مرحوم بھی شامل ہیں۔ ایک عالی دماغ سیاست داں اور اعلیٰ ظرف انسان کی حیثیت سے زوار صاحب کا احترام جتنا میرے دل میں تھا، اتنا ہی میں نے کلام صاحب کے اندر بھی پایا۔ احتشام صاحب کے علم و فضل اور بلندی کردار کا ان پر اتنا گہرا اثر تھا کہ ان کا شمار احتشام صاحب کے پرستاروں میں کیا جاتا تھا۔ اس معاملہ میں اپنا حال بھی ان جیسا ہی ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی ان کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ اس کا دعویٰ مجھے بھی تھا۔

کاہل سے کاہل ادیب سے لکھوا لینے کا گر بھی انہیں خوب آتا تھا۔ باقر مہدی پر خاکہ مجھ سے انہوں نے جس طرح لکھوایا تھا وہ اپنے آپ میں ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ایک دن رات کو میں کافی تاخیر سے گھر پہونچا۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی میز پر پڑے ہوئے ایک کاغذ پر نظر پڑی یہ قیوم اثر صاحب کا حکم نامہ تھا۔ جس میں مجھے کالکا میل سے دہلی جانے کی تاکید کی گئی تھی۔

گاڑی آنے میں مشکل سے دو گھنٹے باقی تھے۔ فوراً تیار ہو کر اسٹیشن پہونچا۔ معلوم ہوا کہ قیوم اثر صاحب "انسانی برادری کانفرنس" میں شرکت کی غرض سے دہلی جا رہے تھے۔ شاہ شکیل صاحب مرحوم کو بھی جانا تھا۔ انہوں نے اپنی جگہ مجھے جانے کو کہا۔ ان کا خیال تھا کہ فخرالدین علی احمد مرحوم سے جو ان دنوں وزیر زراعت تھے، غالب کالج کی مالی اعانت کی درخواست کی جائے تو شاید کالج کی ترقی کی بہتر شکل پیدا ہو جائے۔ میرا انتخاب وہاں جانے کے لئے اس لئے کیا گیا کہ میرے ایک پرانے دوست اور ساتھی ابوحاکم صاحب اس وقت وزیر موصوف کے سکریٹری تھے ان کی مدد سے بات چیت کرنے میں کافی مدد مل سکتی تھی۔

دہلی میں انسانی برادری کانفرنس میں پروفیسر متین الزماں سے بات ہوئی۔ تو انہوں نے باقر مہدی کے بارے میں کافی دیر تک باتیں کیں۔ بہت دنوں سے ان کی ملاقات باقر مہدی سے نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے وہ ان

کے بارے میں تازہ ترین اطلاعات چاہتے تھے۔ دہلی سے
لوٹتے وقت باقر مہدی کا ایک شخصی خاکہ خود بخود میرے ذہن میں
مرتب ہوگیا۔ میں نے کلام صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے
فوراً آہنگ" میں اسے شائع کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ مضمون
میں لکھنے میں تساہلی کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے مجھے
الٹی میٹم دیدیا کہ وعدہ خلافی کی صورت میں آہنگ کے اگلے
شمارہ کے چند صفحات خالی رہیں گے۔ اور میرے اس مضمون
کے نام معنون کر دیئے جائیں گے۔ جو وعدہ کرنے کے باوجود
نہیں لکھا گیا۔ میں بہت گھبرایا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ محض دھمکی
نہیں ہے۔ ایک بار پروفیسر آل احمد سرور نے "سہیل"
کے جمیل مظہری نمبر کے لئے وعدہ کرنے کے باوجود آخر
آخر تک مضمون نہیں بھیجا تو کلام صاحب نے مرتب کی حیثیت
سے ان کے ساتھ ایسا ہی رویہ اپنایا تھا۔ جب سرور صاحب
اس سلوک سے محفوظ نہ رہ سکے تو خاکسار کس شمار قطار
میں تھا۔ چنانچہ میں نے تقریباً ایک نشست میں مضمون
مکمل کرکے ان کے حوالہ کیا۔ اور مجھے یہاں اس حقیقت
کے اعتراف میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ اس ادبی خاکہ کے
اشاعت سے میری ادبی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔
کئی خاکے اور کچھ تنقیدی مضامین تھوڑے تھوڑے وقفہ
سے شائع ہوئے میرے اوپر جو ادبی جمود کافی عرصہ سے
طاری تھا وہ بالآخر ٹوٹ ہی گیا۔ ہاسٹریخ لوئل، آڈن،
اور Absurd ادب پر جو مضامین شائع ہوئے
اس میں بھی ان ہی کی توجہ اور دلکشی کو دخل ہے۔

اس سلسلہ میں ایک خصوصیت کا ذکر اور کرنا
چاہتا ہوں نوجوان ادیبوں کی ادبی کاوش میں وہ خاص
طور پہ دلچسپی لیتے تھے چنانچہ آہنگ میں انہوں نے کچھ
دنوں تک اردو کے ابھرتے ہوئے نئے افسانہ نگاروں
کے خصوصی مطالعہ کا ایک سلسلہ جاری رکھا تھا عبدالصمد
حسین الحق، شوکت حیات، انور خاں اور علی امام کے
افسانے یوں تو ملک کے معتبر اور مشہور ادبی جرائد میں
شائع ہوکر نقادوں اور عام قارئین کی توجہ اپنی جانب
کھینچنے لگے تھے لیکن کلام صاحب ان کے منتخب افسانوں
کو ایک ساتھ آہنگ میں شائع کرکے "میں کا تعارف"
کے ساتھ ان کا خصوصی مطالعہ پیش کرتے تھے۔ بعد میں یہ
سبھی افسانہ نگار اردو ادب میں نمایاں حیثیت کے حامل
ہوئے۔ اس سے ان کی باریک بینی اور قدر شناسی کا پتہ
چلتا ہے۔

تخلیقی فنکار اور نظم و ضبط یہ دونوں چیزیں عام طور
پر ایک دوسرے کی ضد سمجھی جاتی ہیں لیکن کلام صاحب کے
یہاں معاملہ برعکس تھا۔ ان کے یہاں زندگی میں نظم و ضبط
ترتیب اور خوش سلیقگی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اور
انہوں نے اپنی سرگرمیوں کو باقاعدہ خانوں میں تقسیم کر
رکھا تھا۔ وہ بیک وقت صحافی، ادیب، صنعت کار، سیاسی
اور سماجی کارکن تھے۔ ان کی الگ الگ دنیائیں تھیں جن
کے ساتھ وہ پورا پورا انصاف کرنا چاہتے تھے۔ ان کی
کوشش یہی رہتی تھی کہ ایک کے لئے دوسرے کا خون
نہ ہونے پائے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ہم لوگ ان کے یہاں
پہونچے اور کوئی جماعت ان کے یہاں کاروبار کے
سلسلہ میں پہلے سے موجود ہے۔ ایسے مواقع پر وہ نہایت
یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ اپنے کاروباری فرائض
انجام دینے کے بعد ہی کسی اور طرف متوجہ ہوتے تھے۔
جن لوگوں کو اس بات پر حیرت ہے کہ وہ مورچہ اور آہنگ
کو اتنے عرصے سے پابندیٔ وقت کے ساتھ لگاتار کس طرح
چلاتے رہے تھے۔ اگر وہ ان کی زندگی کے اس رخ کی جھلک
دیکھ لیتے تو شاید ان کی حیرت دور ہو جاتی۔ جب وہ مورچہ
اور آہنگ" کا اداریہ لکھنے میں مصروف ہوتے تھے۔

تو کاروباری مسائل کو اس وقت تک اپنے دھیان
ہی رکھتے تھے جب تک وہ تکمیل تک نہ پہونچ جائیں۔
مجھے ہمیشہ ان کی باقاعدگی، خوش سلیقگی اور نظم وضبط
میں ڈھلی زندگی پر رشک آیا ہے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ
وقت کی قدر وقیمت کے اتنے شدید احساس کے
باوجود ان کا رویہ میکانکی نہیں تھا۔ موقع محل کے اعتبار
سے ان کے یہاں ترمیم وتنسیخ کی گنجائش ہمیشہ رہتی تھی۔

وہ اتنی ساری سرگرمیاں کیسے ایک ساتھ
جاری رکھتے تھے اس پر بہت سے لوگوں کو حیرت کرتے
ہوئے دیکھا ہے۔ ایک بار ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب
مرحوم نے مجھے الہ آباد میں تفصیل کے ساتھ ان کے متعلق
گفتگو کی اور یہ جان کر حیران رہ گئے کہ ایک شخص تن تنہا
اتنی ساری چیزوں کا روح رواں ہے۔ احتشام صاحب
مرحوم اور عقیل صاحب سے وہ ان کا کافی ذکر سن چکے تھے۔
انہوں نے گیا آکر کلام صاحب کو قریب سے دیکھنے کا اشتیاق
ظاہر کیا میں نے اعجاز صاحب کو بتایا کہ وہ اپنے خیالات
اور نظریات کے معاملے میں بڑے استوار اور مضبوط
واقع ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کے مداحین کا اچھا خاصہ
حلقہ ہے، وہیں ان کے کٹر مخالفوں کا گروہ بھی خاصہ بڑا
ہے۔ وہ ہر شخص کو خوش رکھنے کا گر شاید نہیں جانتے۔
اعجاز صاحب یہ سن کر بڑے خوش نظر آئے کہنے لگے تب
تو میں ان سے ضرور ملوں گا۔ بات آئی گئی ہو گئی میں نے
اعجاز صاحب جو دل کے عارضہ میں مبتلا ہو چکے تھے کیونکر
گیا آسکیں گے۔ لیکن ایک دن کلام صاحب کا فون آیا
کہ اعجاز صاحب پٹنہ میں ہیں اور فلاں گاڑی سے گیا
آرہے ہیں۔ میں جب ان کو لینے اسٹیشن پہونچا تو گاڑی
آنے میں دیر تھی۔ ٹورسٹ آفس میں گپ کرنے لگا اتنی
دیر میں اچانک پل پر کافی بھیڑ اکٹھا ہوتی نظر آئی معلوم
ہوا کہ گاڑی آگئی۔ جب تک میں پلیٹ فارم پار کر کے
پل پر پہنچوں، اعجاز صاحب پل پر اپنے چھوٹے بیٹے کے
ہمراہ نظر آئے۔ کلام صاحب کی گاڑی راستے میں خراب
ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ اس وقت پہونچے جب ہم لوگ
پلیٹ فارم سے باہر نکل رہے تھے۔ انہوں نے تاخیر کے لئے
معذرت چاہی تو اعجاز صاحب نے بڑے دلچسپ لطیفے سنائے
کہ کس طرح ان کو اسٹیشن پر RECEIVE کرنیوالے
کسی نہ کسی وجہ سے ہمیشہ تاخیر سے پہونچتے ہیں کبھی کبھی تو
ایسا بھی ہوتا ہے کہ نہ پہچان سکنے کی وجہ سے ہمیشہ واپس
بھی چلے جاتے ہیں۔ غرض کہ خوب ہنستے ہنساتے رہے۔
اتنے میں گاڑی ارینہ ہاؤس پہونچ گئی۔

اعجاز صاحب کا قیام دو دن تک رہا۔ اور اس
درمیان انہیں کلام صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع
ملا۔ وہ ان کی شاگردانہ محبت، خلوص اور سعادت مندی
سے بے حد متاثر تھے۔ (ویسے کلام صاحب رسمی معنوں
میں اعجاز صاحب کے شاگرد کبھی نہ رہے) ان کے اعزاز
میں کلام صاحب نے اپنے گھر پر ایک بڑا جلسہ کیا جس میں
اردو ہندی کے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ یونیورسٹی
کے کئی اساتذہ بھی شریک ہوئے۔ اپنی استقبالیہ تقریر
میں انہوں نے کہا کہ وہ ہمیشہ اس بات کی کمی محسوس کرتے
ہیں کہ ان کو اعجاز صاحب کا شاگرد ہونے کا فخر حاصل
نہیں رہا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادب کے اچھے اور لائق
اساتذہ کے لئے ان کے دل میں کتنا احترام تھا۔

کاروباری دنیا سے گہرے طور پر وابستہ ہونے
کے باوجود ان کے دل و دماغ میں علم و ادب کی شمع
پہلے ہی کی طرح روشن اور تابندہ رہی۔ ان کو ہمیشہ اس
بات کا احساس رہا تھا کہ ان کی اصل جگہ فن اور ادب

کی دنیا ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت وہ اپنی ادبی اور علمی سرگرمیوں اور تخلیقی کاوشوں سے فراہم کرتے رہتے تھے۔
وہ ادیبوں اور شاعروں کے ناز اٹھانے پر ہمیشہ آمادہ نظر آتے تھے۔ جہاں بھی انہیں علم و فضل کا پرتو نظر آتا تھا وہ اس کی قدر کرنے پر تیار رہتے تھے۔ جہاں ان کو ادبی اور فنی جوہر دکھائی دے جاتا تھا وہ اس کا اعتراف کھلے دل سے کرتے تھے میں نے جب اعجاز صاحب سے ان کا ردعمل جاننا چاہا تو انہوں نے بڑے اطمینان کا اظہار کیا۔ انہوں نے اپنے ذہن میں ان کی جو تصویر بنا رکھی تھی وہ اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں نکلے تھے۔ انہیں کلام صاحب سے بس ایک شکایت تھی وہ یہ کہ وہ خطوں کا جواب اتنی پابندی کے ساتھ نہیں دیتے جتنی پابندی کے ساتھ "موڑ چہ" اور "آہنگ" نکالتے تھے۔ پتہ نہیں اس معاملہ میں کلام صاحب کتنے ذمہ دار تھے اور محکمہ ڈاک کتنا قصوروار۔

جن دنوں بہار میں جے پی تحریک کا بڑا زور تھا۔ اور نظریاتی اختلاف کے باوجود بہتوں کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اس کے خلاف آواز اٹھا سکیں۔ کلام صاحب اس طرح کا ایک بڑا جلسہ اپنے گھر پر منعقد کرنے کے لئے رضامند ہو گئے۔ حالات اتنے تلخ اور نازک تھے کہ اس تحریک سے ایمان داری کے ساتھ ذرا سا بھی اختلاف کرنا خطرہ سے خالی نہیں سمجھا جاتا تھا چہ جائیکہ اپنا گھر اس کام کے لئے حاضر کر دینا۔ میرا خیال تھا کم ہی لوگ اس میں شریک ہونے کی ہمت کر سکیں گے لیکن کامریڈ حبیب الرحمٰن صاحب کے اشتراک سے وہ ایک اچھی خاصی تعداد جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آدمی کی پرکھ ایسے ہی بحران میں ہوتی ہے ان کو اس تحریک سے نظریاتی اختلاف تھا۔ اور بڑے سے بڑی مخالفت اور خطرہ کی پرواہ کئے بغیر انہوں نے کسی طرح کا سمجھوتہ نہیں کیا۔ موڑ چہ میں ان کے اس دور کے اداریئے جس حقیقت کے شاہد ہیں مجھے معلوم نہیں کہ ان کے اس سلسلے میں کتنے نقصانات برداشت کرنے پڑے کیونکہ میں تھوڑے ہی دنوں بعد آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو کر بھوپال چلا گیا۔ بھوپال جانے کا ذکر آ ہی گیا ہے تو یہ بتا دینے کا جی چاہتا ہے کہ ان دنوں گیا سے کافی دنوں کے لئے باہر تھا۔ جیسے ہی میرا تقرر نامہ دہلی سے قیوم اثر صاحب کو موصول ہوا وہ اس فکر میں لگ گئے کہ کس طرح جلد از جلد مجھے مطلع کر سکیں، رضوان میاں (میرا منجھلا بیٹا) پکڑے گئے، کیونکہ وہ اس وقت گیا کالج کے طالب علم تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ کس طرح کلام صاحب نے آنے جانے کے اخراجات خود برداشت کئے، تاکہ رضوان کو انتظام کر کے روانہ ہونے میں دیر نہ ہو جائے اس رویہ کو ان کی محبت اور انسان دوستی کے علاوہ اور کون سا نام دوں۔

کہتے ہیں جو نظر سے دور وہ دل سے دور، مگر یہاں معاملہ پھر برعکس نکلا۔ میں سرکاری کام سے کچھ دنوں کے لئے دہلی میں تھا۔ ایک دن کسی کلچرل کے دوران ایک پرزہ ملا۔ کلام صاحب کامریڈ حبیب الرحمٰن صاحب اور پرنسپل شکیل صاحب کے ساتھ استقبالیہ میں میرے منتظر تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ شریف پر حاضری دینے اور زیارت کرنے جا رہے تھے، مجھے بھی ساتھ لے گئے اور ثواب میں شریک ہونے کی توفیق عطا کی۔ ان کو ہوٹل تک چھوڑ کر واپس ہوا تو ذہن میں فراق کا یہ شعر بار بار آ رہا تھا

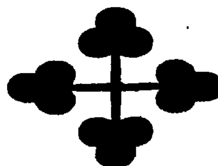
اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی

بھوپال میں میرے قیام کے دوران انہوں نے اپنی وضعداری برقرار رکھی۔ میں نے انہیں جب بھی خط لکھا انہوں

نے ہمیشہ جواب دیا۔ کبھی کبھی خود بھی یاد کر لیتے تھے۔ خاص
طور پر اس زمانے میں جب میرا خط ملے ہوئے عرصہ گذر جاتا
تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت سے استعفیٰ دیکر جب
میں اپنی پرانی ملازمت پر گیا واپس آیا تو حالات بہت
بدل چکے تھے۔ لیکن میرے ساتھ ان کے رویے میں کوئی
فرق محسوس نہیں ہوا۔ ایک بار کالج کے کسی معاملہ کو لے کر
ہمارے درمیان ہلکا سا اختلاف بھی ہوا۔ لیکن ذاتی مراسم
پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کی
ذاتی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ ان کی
اکلوتی بیٹی رینا اپنے شوہر اور بچیوں کے ساتھ مستقل
طور پر دہلی میں مقیم تھی۔ کلام صاحب اور شاہدہ بھابھی
دونوں کی بے پناہ محبت اس پر مرکوز تھی۔ چنانچہ ان کا
کافی وقت دہلی میں گذرنے لگا۔ بعد میں انہوں نے دہلی
میں ایک مکان بھی بنا لیا۔ اس طرح گیا سے ان کا تعلق
دھیرے دھیرے کم ہونے لگا۔ لیکن اپنے شدید قلبی حملہ
کے بعد جب وہ نہایت پیچیدہ آپریشن کے ذریعہ صحت
یاب ہوئے تو گیا کی یاد انہیں بری طرح ستانے لگی۔
ان کے اس زمانے کے لکھے ہوئے خطوط سے ان کے دل
و دماغ کی اس کیفیت کا صاف طور پر پتہ چلتا ہے۔
عزیزی شہزاد انجم جب دہلی سے گیا آتے تو کلام صاحب
کی مفصل خیریت معلوم ہو جاتی۔ اور ان کی گفتگو سے
اس بات کا اندازہ ہوتا کہ گیا کے دوستوں اور عزیزوں
کے لئے ان کے دل میں کتنی محبت تھی۔ اور جب وہ
گیا لوٹے تو ایک ایک سے اس طرح ملے جیسے ایک مدت
گذر گئی ہو۔ ان کی محبت اور تڑپ کا اندازہ ان کی ہر
بات سے ہوتا۔ لیکن اچانک وہ بجھے بجھے سے نظر آنے
لگے۔ ہر طرح کی آسانی اور آسائش کے باوجود وہ افسردگی
کے شکار دکھائی دینے لگے۔ جو شخص زندگی بھر جد وجہد
کشمکش اور سعی و عمل کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ وہ نہ جانے
کیوں اداس اداس سا لگنے لگا۔ شہرت، مقبولیت
اور عزت سب ان کے حصہ میں آئی۔ پھر یہ افسردگی
اور اداسی کیوں ——— ؟ شاید ان کو موجوں
کے اضطراب اور طوفانوں کی تندی سے ایسا قلبی لگاؤ
تھا کہ وہ بے حس سکون کو جھیل نہیں سکتے تھے۔

بقیہ: ان میں سے ایک

اشاعت تک محدود نہیں۔ انہوں نے ایک ایسے نگارخانے
کی تعمیر کی ہے جس میں ہماری ادبی اور تہذیبی دنیا کی مختلف
تصویریں محفوظ ہیں۔ یہ دوسروں کے لئے بھی تخلیقی محرک کی حیثیت رکھتی
ہیں۔ اپنی مصروف عملی زندگی کے بعد تخلیقی، سماجی اور ادبی
گوشے کی دریافت کا مسئلہ بڑا مشکل ہے۔
کلام خاموش رہے ہیں لیکن یہ خاموشی عمل کی دنیا
میں نہیں ہے ایک تخلیقی عمل کا چراغ برابر جلتا رہا ہے۔ اندر
ہی اندر یہ آگ سلگتی رہی ہے۔ آنے والے باذوق اہل علم
اس انجمن کو اپنے وجود کے اشتہار کے لیئے ایک سہارا کی
تصور کرتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ بکھرے ہوئے
اوراق جنہیں زمانہ کی طوفانی ہواؤں اور پاگل آندھیوں
نے مختلف جغرافیائی حصاروں میں پھینک دیا ہے ایک
بار عوام دوستی کی ایک ایسی قندیل روشن کریں جن کی روشنی
ان کے خوابوں کی تعبیر بن سکے۔ کلام کی ترقی پسندی زندگی کو
خوبصورتی سے برتنے کے فن سے بھی زندہ رہی۔ ان کے دل
میں انسان کی ازلی نیکی پر قوی ایمان ہے اور ایمان کی اسی
دولت کو انہوں نے کبھی ضائع نہیں کیا۔
یاروں کا یار، دوستوں کا محبوب جانے کتنے سنہرے
خوابوں کو اپنی آنکھوں میں چھپائے ایک چھوٹے سے مگر عظیم
تاریخی شہر میں عملی شکل دے رہا تھا۔ کلام حیدری ایک
فرد کا نام نہیں۔ بلکہ تاریخ کی معنویت اور آگے بڑھتی ہوئے





افصح ظفر

حکایتوں اور داستانوں کی روایت کا سلسلہ تو کہانی کی دنیا میں بڑا پرانا سلسلہ ہے ۔ لیکن اردو میں مختصر افسانہ کے دور کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا سے ہوتا ہے ۔ اس وقت سے لے کر آج تک مختصر افسانہ کے فکر و فن میں ماحول ، ماجرا ، اور کردار کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے ۔ اس پورے عرصے میں اردو افسانے نے ایک سے بڑھ کر ایک کہانیاں پیش کی ہیں ۔ ان کہانیوں میں ہمیں ماحول ، ماجرا ، اور کرداروں کی دلکش صورتیں ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں ۔ بعض کہانی ، بعض واقعہ اور بعض ارتو ایسے ہیں کہ ہم انہیں آج تک بھولے نہیں ہیں ۔ اس صدی کے سب سے بڑا ابتدائی ستون تو پریم چند ہے جنھوں نے کردار نگاری کے معاملے میں شروع سے لے کر آخر تک ارتقائی رویّہ اپنایا ہے ۔ اور ایسے کردار تخلیق کر کے دیئے ہیں جو آج بھی جاذب النظر معلوم ہوتے ہیں ۔ وہ چاہے ان کے سب سے پہلے اور سب سے مشہور مجموعہ "سوز وطن" کا کردار شیخ مخمور ہو ، یا ان کے آخری دور کے مشہور افسانہ "کفن" کا کردار گھیسو ۔ پریم چند نے اپنے عہد کے فنی اور فکری تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کرداروں کی تخلیق کا ایسا شعور ہمیں بخشا کہ جس کے ذریعہ ہمیں یہ احساس ہوتا رہا ہے کہ پریم چند ایک بامقصد افسانہ نگار ہونے کے باوجود اپنی کردار نگاری میں حقیقت پسندی کا خیال رکھتے ہوئے کردار نگاری کی ایک ایسی دلکشی پیدا کر دیتے ہیں کہ جس سے کردار سپاٹ اور اکہرا ہونے کے باوجود کچھ منفرد سا دکھائی دیتا ہے ۔

یہاں پریم چند کے توسط سے بعض باتیں ذہن میں ادرا ابھرتی ہیں ۔ اور ہمیں کردار نگاری کے شعور کا کچھ نیا سا احساس دلاتی ہیں ۔ پریم چند کے افسانوں کو تسلسل سے پڑھنے کے بعد یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ پریم چند کردار کی تخلیق میں مثالیت پسندی کو بھی کافی اہمیت دیتے ہیں دراصل کردار کے سلسلے میں آدرش کا یہ معاملہ کچھ ہماری سماجی زندگی سے گہرا ربط رکھتا ہے ۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک اردو مختصر افسانہ بڑی حد تک اخلاقی لمحے سے مرعوب رہا ہے ۔ اس کے نتیجہ میں ہمارے افسانہ نگاروں نے زیادہ تر اس بات کی کوشش کی کہ کردار کی تصویر کشی اس طرح کی جائے کہ اس کا وجود تیسری سمت کو نظر انداز نہ کر سکے ۔ لیکن جب ہندوستانی طرز

معاشرت میں نئے زمانے کی پیچیدگیاں زندگی کے کڑے کوس کا منظر نامہ بن کر سامنے آنے لگیں تو کردار کی شخصیت تہہ در تہہ ہوتی چلی گئی۔ لیکن شاید وہ پہلی باضابطہ نئے فکر و فن میں ڈوبی ہوئی وہ مختصر کہانی ہے جو حقیقت سے اور آگے چل کر سُرریلسٹ (Sunnealist) نقطۂ نظر کی نشاندہی کرنے لگتی ہے۔

کوئی مانے یا نہ مانے لیکن یہ ایک سچائی ہے کہ پریم چند کی اس روایت پر چلتے ہوئے بعد کے افسانہ نگاروں نے کردار کی اہمیت کو فنی طریقے پر اور آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ پریم چند کے بعد جب افسانہ کا شعور کچھ بالغ النظر افسانہ نگاروں کے ساتھ آملتا ہے تو وہ اپنی کرداروں پر پوری گرفت حاصل کر لیتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو نے یہاں تک دعویٰ کیا کہ اس کے افسانوی کردار ہر وقت اس کی جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ جب اس کا جی چاہتا ہے انہیں وہ اپنی جیب سے نکال کر الفاظ میں اس طرح قید کرتا ہے کہ وہ زندہ ہو جاتے ہیں۔ اس دعویٰ کا مفہوم یہ ہے کہ منٹو کے نزدیک کردار کی تجسیم کا عمل بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ اور اس عہد میں افسانہ نگار الفاظ کے سہارے اپنے اظہار پر قادر معلوم پڑتا تھا۔ لیکن سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی وغیرہ کا دور جب گذر جاتا ہے تو کرداروں کی تخلیق کے تصور میں جدید عہد کے پس منظر میں ایک اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جہاں منٹو، کرشن، بیدی اور عصمت جیسے لوگ الفاظ پر بھروسہ کر کے کردار کی تجسیم و تشکیل کرتے تھے۔ وہاں ان کے بعد آنے والے افسانہ نگاروں کے یہاں کردار کے تصور میں یہ محسوس کیا جانے لگا کہ کردار کی تخلیق میں الفاظ افسانہ نگار کا ساتھ نہیں دیتے۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ نئے واقعات، نئے خیالات اور زندگی کے نئے اسباب کی راہیں اظہار کے وسیلے کے تحت مسدود ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جبکہ اس کے برخلاف منٹو اور کرشن کے دور میں کردار کے لئے الفاظ آب حیات کا کام کرتے تھے۔ بعد کے افسانہ نگاروں کے لئے الفاظ کردار کا وزن اٹھانے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مختصر افسانہ کے تصور فن میں کردار نگاری کے دو رویے جاری وساری نظر آتے ہیں۔ ایک رویہ تو وہ ہے جس کی ابتدا اور انتہا پریم چند نے کی اور پھر بعد میں جس کو توسیعی طور پر ترقی پسندوں نے اپنایا۔ اس کے بعد ہمارے یہاں بعض نئے تصورات کے تحت وہ دوسرا رویہ پھلتا پھولتا دکھائی دیتا ہے جسے ہم عام طور پر کہانی کے فکر و فن کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا دور کہتے ہیں۔ اس دور میں ہمیں نہ شیخ مخمور دکھائی دیتے ہیں نہ گھیسو نہ کالو، نہ ساوتری۔ بلکہ اس دور میں ہمیں وہ ضمائر نظر آتے ہیں جو، وہ، میں، تم اور ہم کی صورت میں کردار نگاری کی ایک تہہ نشین تشکیل کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اگر کوئی افسانہ نگار اس سے آگے بڑھتا ہے یا اس سے راستہ کاٹ کر نکلنا چاہتا ہے تو وہ کردار نگاری کے فن کو ٹوٹی ہوئی شخصیت، بکھری ہوئی ہستی اور بھیگے اور سہمے ہوئے لوگوں میں مشخص کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اس تذکرہ کے بعد جب ہم اردو افسانوں کے مقبول، مشہور اور معقول کرداروں کی بھیڑ سے گزرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ان کرداروں میں سے چند ایک کردار کا انتخاب کوئی معمولی کام نہیں۔ اور ایک مختصر سے مضمون میں اس کی گنجائش اس لئے بھی نہیں کہ یہ کردار تہہ در تہہ کیفیتوں اور حالتوں سے گزر کر سامنے آتے

ہیں اور ان کی تفہیم میں ایک اچھا خاصہ طویل مقدموں کی
ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اردو میں ایسے بہت سارے
کردار ہیں جو اپنی مخصوص نمایاں فطرت رکھتے ہیں۔ اسی
لئے ان افسانوں میں نمایاں کردار کی تلاش سے بہتر
کوشش یہ ہوگی کہ ان کی پیش کش میں کچھ نمایندگی کا
خیال رکھا جائے، ویسے تو اردو کے ہر اچھے اور بڑے
افسانہ نگار کے یہاں ایک دو نہیں بلکہ کئی کردار مل جاتے
ہیں۔ جو ہمیں زندہ اور متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے
اپنے طور پر اسی لئے کردار نگاری کے ان تصور سے جن
کی ابتدا پریم چند نے کی، سہیل عظیم آبادی کے ایک
کردار ساوتری کو منتخب کیا ہے۔ مجھے اس کردار میں
کردار نگاری کی اس روایت کی بھرپور نمائندگی دکھائی
دیتی ہے جس کی ابتدا پریم چند نے کی تھی۔

ساوتری سہیل عظیم آبادی کا وہ افسانوی کردار ہے جس
کی صورت، سیرت اور جس کے ماحول میں ہمیں کسی قسم کی
کوئی اجنبیت نہیں محسوس ہوتی ہے۔ یہ کردار اپنے
ماحول کے پس منظر میں سچ اور جھوٹ کے دھوپ چھاؤں
سے لڑتا ہوا گزرتا ہے۔ یہ کردار اس ماحول کی پیداوار
ہے جس ماحول میں اس نے کبھی آنکھیں نہیں کھولیں۔ اسے
حالات کی ستم ظریفی نے ایک جانے پہچانے صاف ستھرے
ماحول سے اٹھا کر اجنبی اور گندے ماحول میں لا پٹکا۔
یہاں بھی ماجرے کے الٹ پھیر کی روایت سے سہیل
عظیم آبادی نے فائدہ اٹھایا ہے۔ ہمارے یہاں طوائفوں
کے گرد تخلیق پذیر ہونیوالی کہانیوں کی ایک روایت وہ ہے جو
مرزا رسوا کی دین ہے سہیل عظیم آبادی کے اس افسانے سے یہ
محسوس ہوتا ہے کہ ساوتری کا ایک انسان دوست
خریدار جب ساوتری کے رویے کا تجزیہ کرنا چاہتا ہے
تو اس سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے، ساوتری جو خارجی
طور پر اس کے سامنے طوائف کی شکل میں ابھر
تو اس کا باطن اس انسان دوست خریدار کی
سے اوجھل رہتا ہے۔ اور وہ ساوتری کے رو
اور اس کے سلوک کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔
جب حالات کے کروٹ بدلنے پر بھی ساوتری ا
کے دوست کی بیوی بن جاتی ہے تو اس کا انسان
خریدار جس سے بنیادی فطرت کے تحت ساوتری
کرتی تھی۔ اس سے گذارش کرتی ہے کہ وہ اب ا
پاس نہ آیا کرے کہ اس کے آنے سے اس کی برائی
کی تجدید ہونے لگتی ہے۔ اور وہ نہیں چاہتی کہ ا
پھر وہ اپنے کردار کے ظاہر و باطن میں ایسی صورت
پیدا کرے کہ جس سے اس کی ہستی مشکوک ہو ج
دیکھنے میں ساوتری کا کردار ایک عام ڈھرے
معلوم ہوتا ہے۔ لیکن غور کرنے پر ایسا لگتا ہے
سہیل عظیم آبادی نے اس کردار کو تراشنے میں
وعجیب قسم کی ہنرمندی سے کام لے کر اس سید
سادے کردار کو ایک نئی سمت دیدی۔ اور یہ
کردار کی وہ خوبی ہے جو اسے زندہ کردار کی شکل
ہمارے سامنے لاکھڑا کر دیتی ہے۔ ساوتری ک
شخصیت کہانی کے چلتے پھرتے واقعات میں ج
طرح کروٹ لیتی ہے اس سے اس کردار کی ایک
حیثیت مستحکم ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

جب اردو افسانہ نگاری میں فکر و فن کا
آنے لگا اور جب افسانہ کا فن ٹوٹ پھوٹ
ہونے لگا تو ہمارے سامنے ایسی کہانیاں آنے
جن میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ افسانے
کردار کو نہ شہر کے دائرہ میں رکھا جائے اور نہ
کے، نا اسے ماضی، حال اور مستقبل کے خانوں

کیا جائے۔ بلکہ کوشش یہ کی گئی کہ افسانوی اسلوب کے روایتی تیور سے اس طرح انحراف کیا جائے کہ اسلوب ایک سیل رواں بن کر زمان و مکان کے حدود سے آگے چلا جائے۔ ایسے افسانوں میں اگر کوئی کردار بنے تو اس کا چہرہ اس کردار سے مختلف ہو جو اردو افسانہ کی روایت کا نتیجہ تھا۔ یعنی ایسے افسانہ نگار اپنے افسانوں میں اپنے کرداروں کو آدمی اور انسان سے الگ کر کے اسے کچھ عجیب و غریب مخلوق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے کرداروں کا کوئی نام نہیں رکھتے ان کا تصور یہ ہے کہ ان کے کردار ایک مکمل گلی میں جیتے ہیں۔ یہ کردار ان کے نزدیک اپنی شخصیت میں خانے اور تہہ خانے بناتے چلے جاتے ہیں۔ جو اگر مکمل روشنی میں آتے بھی ہیں تو اپنے دھندلے وجود کو اوڑھے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایسے افسانوں میں ایک افسانہ یاد آرہا ہے جسے "تج دو تج دو" کے عنوان سے غیاث احمد گدی نے لکھا ہے اس افسانہ میں کچھ ایسے داخلی عناصر کو موضوع بنانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جس سے افسانہ میں کچھ تجریدی شکل بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اور کچھ تمثیلی صورت بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس افسانہ کا وہ ایک ایسا کردار ہے جو اپنے آپ میں مکمل نہیں ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کی تکمیل میں ایک اجنبی پرندہ بھی سہارا دیتا ہے تو دوسری طرف "دم کٹا کتا" اس کی ہستی کی سیری تکمیل کرتا ہے۔ اگر آپ اس افسانہ کو غور سے پڑھیں گے، تو محسوس کریں گے کہ اس افسانہ میں اس کی بیوی ریز بھی خالص انسانی شکل میں ابھرتی ہوئی اس کی شخصیت کو مکمل بناتے ہیں معاونت کرتی ہے۔ غیاث احمد گدی کی اس کہانی میں صحافت کی چوتھی ریاست

کے پس منظر میں نوکر شاہی کے توسط سے جو کہانی کا مرکزی ڈھانچہ تیار ہوتا ہے ہمیں اس کہانی کا ہیرو اپنے آپ میں مکمل کردار بنتا ہوا نہیں دکھائی دیتا ہے۔ اس کہانی کا وہ ہیرو ریز سے کرداری تعاون حاصل کرتا ہے تو باطن میں اجنبی پرندہ اور دُم کٹا کتا اس کی تکمیل کرتا ہے۔ لیکن اس کہانی میں دراصل ضمیر کے مرنے اور جینے کی کہانی ہے۔ فنی طور پر بنیادی کہانی کی تجسیم ٹھوس طریقے سے نہیں کر پاتی۔ اگر کسی کردار کی تکمیل میں مخلوقات کا داخلہ ہو جاتا ہے تو شخصیت عجیب الخلقت بن جاتی ہے۔ اس لئے فنی طور پر اس کہانی میں کردار یک لجاپن کا شکار ہو گیا ہے۔ ظاہر بات ہے جب انسانی شخصیت کی تکمیل میں تمثیلی طریقے پر پرندے اور چرندے بھی شامل ہو جائیں تو کہانی زندگی کے کھرے پن میں ملفوظی نہیں بن سکتی اس لئے کہ کہانی کار کو ایک الگ انداز سے سوچنا ہوگا۔ اور غیاث احمد گدی اس ملفوظی فکر پر بالکل قدرت نہیں رکھتے۔ یہ غیاث احمد گدی کی کمزوری نہیں بلکہ مجبوری کہی جا سکتی ہے۔

یہاں پر اگر ہم کلام حیدری کی کہانی بعنوان "کس کی کہانی" کا ذکر کریں تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ کردار نگاری کے نئے تصور کے تحت یہ ایک نمائندہ کہانی ہے۔ جس کا تجزیہ کر کے ہم نئے فکری رویے کی شناخت کر سکتے ہیں۔ اس کہانی کا کردار "میں" ایک ایسا دھندلا کردار ہے جو براہ راست ہماری بصارت کو اپنی تجسیمی کیفیت سے مطمئن نہیں کرتا۔ یہ کردار بھی کسی ایک کردار سے مل کر بنتا ہے لیکن اس شخصیت کو مکمل کرنے میں اس کی بہن بہنوئی اور بھانجے اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اسی کردار کو مکمل بنانے میں Genetic سہارے لے کر "میں" کے کردار کو مکمل کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ "کس کی کہانی" میں کردار نگاری کا دھندلا پن ہے

اس میں ایک کوشش پائی جاتی ہے۔ اگر آپ یہاں پر یہ بھول بھی جائیں کہ اس کہانی کا بڑا گہرا تعلق کلام حیدری کی ذات سے بھی ہے تو بھی یہ کہانی فنی طریقے پر اپنی دلچسپی نہیں کھوتی۔ دلچسپی کی خاطر اگر کلام حیدری کے افسانوی مجموعہ " گولڈن جوبلی " کے آخری صفحات کو پیش نظر رکھیں جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے کچھ سچ " کے عنوان سے ایک مختصر سا سوانحی خاکہ پیش کیا ہے تو اس میں آپ کو ایک ایسی عبارت ملے گی جس کا تعلق " کس کی کہانی " سے قائم ہو جاتا ہے :-

" شاہدہ باجی (خالہ زاد بہن) جب شادی ہوئی تو مجھے یاد ہے کسی لمحے رویا نہیں، اور اس سے زیادہ خوشی مجھے اپنی چھوٹی بہن افیضہ کی شادی میں بھی نہیں ہوئی، ان کے شوہر عبدالقیوم ملک اپنے وقت کے بہار کے نامی گرامی فٹ بال پلیئر رہے تھے تقسیم ملک کے بعد ان کو پاکستان جانا پڑا "

اس مندرجہ بالا اقتباس کی مدد سے آپ " کس کی کہانی " کے آخری ٹکڑے کو پڑھئے :-

" میں اب برداشت نہیں کر سکتا، میں زور سے سسکیاں لینے لگتا ہوں، میں زور سے رونے لگا ہوں۔ میں اس نوجوان سے لپٹ کر رو رہا ہوں، جو جاگ گیا ہے اور حیران نظروں سے دیکھ رہا ہے ——— تم میرے بیٹے ہو، میرے بھانجے ہو، میری باجی ہو، میرے دُلہا بھائی ہو ——— تم ——— اکیلے تم ——— اکیلے تم میرے دُلہا بھائی ہو۔ میری باجی ہو، میرے بیٹے بھی ہو، میرے بھانجے بھی ——— تم ماضی بھی ہو، تم حال بھی ہو ——— تم مستقبل بھی ہو ——— میں اب بے ہوش ہو رہا ہوں کیا ——— ؟ "

ان دونوں اقتباس کو پڑھ لینے کے بعد کہانی کا ابہام دھندلا پن کم ہوتا ہے، وہاں کہانی کی معنویت گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں " میں " ایک کردار بھی ہے جس کی اپنی ایک ذات ہے۔ جو اپنے ہونے کے کو اپنے تخیل کے سہارے جس طرح متصور کرتا ہے اس سے ایک نسلی رشتے کی آبیاری بھی ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ ساز منظر نامہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ جو ہمارے ماضی اور حال کو ایک خاص سماجی اور سیاسی صورتحال سے جوڑ دیتا ہے۔ یہ کہانی اپنی جگہ " میں " کی نشاندہی بھی کرتی ہے اور اس کرب کو بھی پیش کر دیتی ہے جو بر صغیر کی غلط سیاست کا خمیازہ ہے۔ میری نظر میں کردار نگاری کا یہ انداز " کس کی کہانی " کا طرۂ امتیاز ہے۔

" آج کل یہ بات شدت سے سننے میں آرہی ہے کہ اردو افسانے پر جمود و تعطل طاری ہے میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ آج افسانے کے موضوع میں تنوع نہیں اور یہ یکسانیت کے شکار ہیں لیکن کلام حیدری کے افسانے متنوع موضوع پر ہیں، دراصل بات یہ ہے کہ تنوع اس فنکار کے یہاں ملتا ہے۔ جس کا عمیق مشاہدہ اور مطالعہ وسیع ہو۔ کلام حیدری کی شخصیت اس خوبی سے مزین ہے۔ مزید برآں کلام حیدری آسان اور سہل زبان استعمال کرتے ہیں جس میں فلسفیانہ کسک اور شاعرانہ حلاوت ہے "۔

عبدالمتین ———

(سہ ماہی ورق ورق، جولائی ۸۰ء)

ورق تمام ہوا

معین شاہد، گیا

کلام حیدری صاحب ۴ر فروری ۱۹۹۴ء کو ہم سبھوں کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دار فانی سے دارالبقاء کو چلے گئے۔ جب اس پیکر مہر و وفا کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کرنے بیٹھا ہوں تو اس ہجوم یاس والم میں، عرض ستم ہائے جدائی کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہا ہوں تو الفاظ بھی نوحہ کناں ہیں کہ اور میرے جذبات کا ساتھ دینے میں معذور و بے بس دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ کسی عام انسان کی موت کا سانحہ نہیں ہے، بلکہ اس شخص کی موت کا حادثہ ہے، جس کی شخصیت کی کئی جہتیں ہیں۔ مختلف الجہات والی اس عظیم شخصیت نے نصف صدی سے زیادہ ادب، صحافت اور ملک و قوم کی خدمت کی۔ اس شخصیت کا مکمل احاطہ کرنے سے قلم قاصر ہے۔ میرے لئے قلم بند کرنا آسان نہیں۔ بقول غالب

درد دل لکھوں کب تک؟ جاؤں انکو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

تو اب اپنی سوختہ جانی اور خوں فشانی کس کو جا کر دکھلاؤں دیکھنے والا تو پیوند خاک ہے۔

کلام حیدری صاحب میرے بھائی بھی تھے، مونس و غم خوار بھی، مربی بھی اور محسن بھی، ہمراز و دمساز بھی، وہ مجھ سے جدا ہو گئے ہیں اور یادوں کی صلیب پر میں لٹکا ہوا ہوں۔ یہ یادیں کسی کے لئے حرز جاں بھی ہوتی ہیں اور عذاب جاں بھی، میرے لئے یہ یاد ماضی عذاب ہے۔ ان یادوں کی کڑیاں اتنی طویل ہیں کہ سوچتا ہوں کہ کہاں سے کس کڑی کو ذہن فکر رسا سے قرطاس پر اتاروں۔ ہر کڑی ان یادوں سے جھنجھنا رہی ہے۔ ٹوٹتی جاتی ہے، جڑتی جاتی ہے۔

کلام صاحب میں شان قلندری بھی تھی اور شان استغنائی بھی۔ وہ صبر و قناعت اور تسلیم و رضا کے پیکر تھے۔ یوں تو اللہ تعالے نے ان کو دنیا کی بہت ساری نعمتوں سے نوازا تھا عزت و دولت، جاہ و حشمت، گاڑی، کوٹھی، کارخانہ، پریس، اشاعتی گھر، سب کچھ تھا۔ لیکن اس مال و متاع کا ان کو غرور اور گھمنڈ نہ تھا۔ وہ بے جا اپنے مال و دولت اور جائیداد کا ڈھونس نوواردوں پر جمانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ صبر و قناعت اور تسلیم و رضا کا دامن پکڑے رہتے۔ اور کہتے یہ حسین ابن علی کی سنت ہے۔ زندگی میں یہ چار چیزیں

سب سے بڑی دولت ہیں۔ اگر یہ گئیں تو زندگی میں کچھ نہیں
رہے گا۔ ظاہری دولت مال اسباب کے بغیر بھی انسان جی
لے گا۔ صبر و قناعت اور تسلیم و رضا کے بغیر جی نہیں سکتا۔
اسے حرص و ہوس مار ڈالے گا۔ اور وہ حریصِ مال و زر جی
نہیں سکتا۔ وہ غالب کا یہ شعر اکثر گنگناتے تھے ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

شانِ قلندری اور شانِ استغنائی ان کی زندگی کا خاصہ
تھی ___ یہ شانِ استغنائی ہی تھی کہ انہوں
نے اردو ادب کو اپنی کہانیوں اور تحریروں سے مالا مال
کیا۔ لیکن انہوں نے اس بات کی کبھی کوشش نہیں کی
کہ کوئی ناقد یا کوئی صاحبِ قلم ان کی تخلیقات پر لکھے۔
ان کی ادبی و صحافتی شخصیت کو اجاگر کرے۔ وہ
تعریف و توصیف سے بے نیاز لکھتے چلے گئے۔ اور زندگی
کی اعلیٰ قدروں کو اجاگر کرتے چلے گئے۔ وہ تخلیقی ادب
میں سچ بولنے کو ایک بہت بڑا وصف گردانتے تھے۔
انہوں ۲۸ اگست ۹۳ء کو "دعائے نیم شبی" کی رسم
اجرا ادا کرتے ہوئے بڑے ہی پر زور لفظوں میں کہا تھا:

"اس زمانے میں سچ بولنا اور لکھنا قابل
تعزیر ہے۔ فن کار کو بار بار پھانسی
چڑھنا پڑے گا۔ ایک اچھے ادب کی تخلیق
کے لئے سچائی اور سچائی کا اظہار بہت
ضروری ہے۔ اور سچائی کو تو سزا ملے گی ہی۔
اسے کوئی بڑا ادبی انعام، اعزاز، چیئرمین
شپ یا کونسل کی ممبری کی توقع نہیں کرنی
چاہیئے۔ اس کے لئے تو جھوٹ بولنا پڑیگا"

اور انہوں نے اپنی کہانیوں میں کہانیوں کے کرداروں
کے ذریعہ زندگی کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی۔
اور زندگی کی سچائیوں کے اظہار کو اپنے لئے ایک
عبادت تصور کیا۔ اور اس کی سزا انہیں اس طرح ملی
کہ انہیں ان کی تخلیقات پر کوئی بڑا انعام نہیں دیا گیا۔
اور ان کی ادبی و صحافتی خدمات اور صلاحیتوں کے
اعتراف میں اردو کی کسی کمیٹی کا چیئرمین مقرر نہیں کیا گیا۔
ان کو ترسیل و ابلاغ پر اور پریس میڈیا کی کمی نہ تھی۔ پریس
میڈیا بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ چاہتے تو اپنی تشہیر
کروا سکتے تھے۔ ادب کا بڑا ایوارڈ بھی ان کو مل سکتا تھا
لیکن وہ اس سے مستغنی تھے ___ آج یہ
بے نیازی کتنوں میں پائی جاتی ہے۔ اردو زبان و ادب
کے ناقد، شاعر اور استاد ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے بھی
میرے اس خیال کی تائید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دوسروں کو اعزاز و احترام بانٹنے
والا ادب دوست شاعر و ادیب کی
سماجی حیثیت کو بلند بنانے والا کلام
حیدری جس طرح بے نیازانہ اس دنیا
سے رخصت ہو گیا وہ خود ہمارے لئے
ایک درس ہے۔ ان کا طریقہ حیات
ہمیں بتاتا ہے کہ ادبی تخلیق انعام و اعتراف
کی محتاج نہیں ہوتی، یہ خود ایک بڑا انعام
ہے جو قدرت ہمیں عطا کرتی ہے۔ ان کی
زندگی ایک سوئی کی طرح رہی جو ہمیشہ
دوسروں کے لئے لباس تیار کرتی ہے
مگر خود بے لباس رہتی ہے"

انہیں اس کا ضرور ملال تھا کہ ان کی قدر نہیں کی گئی۔
اس بھری پری دنیا میں ان کو اپنا بہت کم نظر آیا۔ انہوں
نے کتنے جوانوں کی زندگیاں بنائیں۔ ان سے بہت
سے لوگ فیضیاب ہوئے۔ کچھ لوگ ان کو سبز باغ دکھلا

کر پیسے اینٹھ کر لے جاتے۔ اور وہ مسکرا کر دیدیتے۔
وہ سب کچھ جانتے تھے اور جان کر بھی انجان بن جانے
کی یہ عادت ان میں ایسی تھی کہ اکثر لوگ غلط فہمی میں
مبتلا ہو جاتے، لوگوں کو اس طرح غلط فہمی میں مبتلا کر
کے ان کو سکون ملتا۔ وہ اس بڑی سچ سے آگاہ تھے
کہ انسان اپنی غرض کا بندہ ہے۔ جب میں کچھ کہتا، تو
کہتے:

"ارے یار بے چارہ ضرورت مند ہے
اسی بہانے اس کی مدد ہو جائے تو حرج
کیا ہے۔"

انہوں نے دنیائے ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ لیا نہیں۔
انہوں نے اپنے افسانوں کے مجموعہ "صفر" میں
گیا شہر کے نام انتساب کرتے ہوئے یہ شعر لکھا ہے:

بیگانہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں
بھاگوں ہوں دور سب سے میں کس کا آشنا ہوں

اس شعر میں ان کے دل کا جو کرب چھپا ہوا ہے وہ اہل
دل ہی جانتے ہیں۔ یہ شعر وہ اکثر و بیشتر دہراتے تھے۔
میں غالب کا یہ شعر پیش کرتا

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

ان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں بخشوانے کے لئے یہ دو خوبیاں
کافی ہیں۔ ایک "عفو و درگذر" اور دوسرا اہل بیت
رضوان اللہ اجمعین سے محبت اور عقیدت۔ بڑی سی
بڑی غلطی کرنے والے شخص کو بھی معاف کر دیتے۔ وقتی طور
پر رنجش ضرور ہوتی لیکن وہ پھر اسے درگذر کر دیتے،
رسول کریم، اہل بیت خصوصاً علی کرم اللہ وجہہ
حضرت فاطمۃ الزہرا، اور حسین ابن علی سے ان کو بے پناہ
محبت اور عقیدت تھی۔ ادا سے اپنے ایمان کا جزو
سمجھتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی
زینہ کو بے حد چاہتے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

مشاہدہ حیدری جب میرے بچے کو جنم
دینے والی تھی تو میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے
پروردگار سے یہ دعا کی تھی کہ تو مجھے بیٹی
دینا۔ اور میری دعا اس طرح قبول ہوئی
کہ میری ایک ہی بیٹی ہے"

بیٹی کی اور یہ جذبہ اس وقت انہیں رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کی لاڈلی خاتون جنت، فاطمۃ الزہرا کے حضو
میں ضرور لے گیا ہوگا ——— اور اللہ تعالیٰ سے
ان کی دعا کی مقبولیت کے لئے رسول مقبول نے بھی سفا
کی ہوگی ——— وہ اپنے ہفتہ وار اخبار "مورچہ"
کا کربلا نمبر کا اہتمام و احترام کے ساتھ ہر سال نکالتے
اس کا اداریہ لکھتے وقت میں نے ان کی آنکھوں میں آن
لرزتے ہوئے دیکھے ہیں۔

میں چھ سالوں تک ان کی خلوت و جلوت کا سا
رہا ہوں۔ جب انہوں نے گیا سے ہفتہ وار "مورچہ"
کا اجرا ۱۹۶۳ء میں کیا تو انہوں نے مجھے ۱۴ ستمبر ۱۹۶۳ء
میں مورچہ کی ادارت میں شامل کر لیا۔ ہفتہ وار دوا
چین کے ہندوستان پر حملے کے بعد نکالا گیا تھا۔ اور چین
کی جارحیت اور اس کی توسیع پسندانہ پالیسی کے خلاف
گویا ایک "مورچہ" تھا۔ جسے کلام حیدری صاحب نے
حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر خالصتاً دفاعی نقطہ
نظر سے نکالا تھا۔ یہ ہندوستان کا پہلا اخبار تھا۔ جو
"ملکی دفاع" کے پیش نظر نکالا گیا تھا۔ اس میں زیادہ
مضامین نظم و نثر "ڈیفنس" کے موضوع پر ہی ہوا کر
تھے۔ کلام حیدری صاحب کا اردو صحافت میں یہ ست
بڑا کارنامہ تھا۔

وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنی زندگی سے کچھ مایوس ہو گئے تھے۔ ایک روز کہنے لگے:

"شاہد! ویسے تو میں لوگوں کے درمیان اپنی بیماری کا تذکرہ نہیں کرتا۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ بائی پاس آپریشن کے بعد اب بھی دونوں کندھوں میں درد محسوس کرتا ہوں۔ یہ ۶۳-۶۴ سال کی عمر کوئی عمر ہے۔ اس عمر میں میرے ساتھی دوڑتے دکھائی دیتے ہیں"

اسی لئے وہ سبھوں سے ملنا چاہتے تھے۔ گیا والوں سے محبت کرتے تھے چاہتے تھے کہ لوگ ان کے پاس آئیں۔ ملیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی گاڑی اب چھوٹنے ہی والی ہے۔ اور وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہوں ــــ

"ساتھیو! دوستو! آؤ گلے مل لو، پھر ملیں یا نہ ملیں"

کلام صاحب نے مجھے دہلی سے لکھا تھا "زندگی کا مفہوم اب سمجھ میں نہیں آتا، یا یوں کہنا بہتر ہوگا کہ "کم زندگی کا مصرف سمجھ میں نہیں آیا"۔ دہلی سے گیا آنے کے بعد وہ سب کام کو جلد از جلد نپٹانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی ذاتی لائبریری کی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ حال ہی میں خدا بخش خاں لائبریری پٹنہ کو دیدیا تھا۔

کلام صاحب اپنے آخری دنوں میں بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک خط بمں ۵ جولائی ۹۳ء کو لکھا تھا:

"خواہش ہے کہ دو تین ناول لکھ دوں کیونکہ اب میری بات کہانی میں پوری نہیں ہو سکتی"

افسوس ہے کہ زندگی نے وفا نہ کی۔

کلام صاحب کے اٹھ جانے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ زندگی ایک فریب ہے ؎

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

سچائی تو بس ایک ہے۔ اور وہ ہے موت جس سے مفر نہیں۔ ساقی کو آب بقائے دوام "لانے کے لئے کہا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ یہ تو میکدہ حیات کا نظام ہے۔ جو اس دہر میں آیا ہے۔ اسے جانا ہی ہے۔ لیکن اس موت کو بھی بعض شخصیتوں نے اس طرح جھٹلایا ہے کہ وہ موت کے بعد بھی اچھے کارناموں کے ذریعہ زندہ ہیں۔ کلام صاحب نے اردو زبان و ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ وہ ان کے طفیل زندہ رہ سکتے ہیں۔ ان پر ریسرچ کیا جائے۔ ان کے فکر و فن پر سیمینار کیا جائے۔ ان کے افسانوں کا تجزیہ کیا جائے۔ ان کا اردو ادب میں صحیح مقام تعین کرنے کے لئے "ادبی ورک شاپ" کا انعقاد عمل میں لایا جائے۔ ان کی یاد میں لائبریری قائم کی جائے تو اس طرح ہم کلام صاحب کو صحیح معنوں میں خراج عقیدت پیش کر سکتے ہیں۔ زمانہ انھیں یاد رکھے گا ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

کلام حیدری کی زبان صاف ستھری ہے اور ان کا بیانیہ وضاحت کا حامل ہے کہیں کہیں جملے ٹوٹے ہوئے نظر آتے ہیں جسے وہ قاری کی تفہیم و تکمیل کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر جگہوں پر جملوں کیا لفظوں کی تکرار ملتی ہے جذباتیت کی وجہ سے زبان میں روانی ہے۔ انہوں نے اپنی مختلف ہیئت کی تشکیل کی ہے جس میں وہ کامیاب ہیں مگر یہ ہیئت پرانے اور نئے اسلوب کا امتزاج رکھتی ہے۔

(جواز، شمارہ ۸)

کلام حیدری

(ایک معتبر شخصیت کی کچھ جھلکیاں اور یادیں)

ڈاکٹر ظفر حمیدی، مظفر پور

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

پہلے پہل کلام حیدری کا نام میں نے اس وقت سنا، جب میں ۱۹۵۱ء میں پٹنہ میں ایم بی بی ایس کی تعلیم کے آخری سال میں تھا، پروفیسر اختر اورینوی مرحوم کی شخصیت زیر بحث تھی کچھ دوستوں نے کہا کہ اختر صاحب اپنے تین ہونہار طالبعلموں کے ساتھ زیادتی برتتے ہیں یعنی شکیل الرحمٰن غلام سرور اور کلام حیدری۔ یہ وہ دور تھا جب شکیل الرحمٰن سری نگر کشمیر میں لکچراری حاصل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، غلام سرور صحافت کی داغ بیل ڈال رہے تھے اور کلام حیدری پورنیہ کے نئے قائم شدہ کالج میں لکچرار ہو گئے تھے۔

بعد میں کلام حیدری کی شادی گیا شہر کے مشہور ڈاکٹر ابوالخیر صاحب کی بڑی صاحبزادی سے ہو گئی کچھ مدت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کلام حیدری کو اپنے ہیوم پائپ بنانے کے کارخانہ اور اسٹوڈیو جیسی کے کاروبار کا مدارالمہام بنا دیا اور وہ لکچراری ترک کر کے مستقل سسرال میں آباد ہو گئے۔ پھر انہوں نے مورچہ پریس قائم کر کے مورچہ ہفتہ وار بھی نکالنا شروع کر دیا۔

مئی ۱۹۵۶ء میں انگلستان میں اپنی ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کر کے اور ایم آر سی پی حاصل کر کے جب میں اپنے وطن مظفر پور لوٹا تو یہیں پرائیوٹ پریکٹس شروع کر دی اپنے والد مرحوم کے زیر سایہ۔ کچھ کچھ شاعری تو میں ۱۹۴۸ء سے ہی کرنے لگا تھا مگر اب باضابطہ شاعری کرنے لگا۔ ہندوستان کے مختلف رسالوں میں گاہے گاہے اپنا کلام اشاعت کیلئے ارسال کرنے لگا، ایک بار ہفتہ وار "مورچہ" نظر سے گذرا اور پسند آیا۔ میں نے اپنی نظم یا کوئی غزل کلام حیدری کی خدمت میں ایک خط کے ساتھ ارسال کر دیا انہوں نے نہ صرف میرا کلام ہی نہیں چھاپا بلکہ "مورچہ" کی ایک کاپی مستقل میرے نام سے جاری کرا دیا اور "مورچہ" کے مرحوم و مغفور ہونے تک اس کی ایک کاپی بلاناغہ میرے پاس آتی رہی اور میرا کلام مورچہ میں برابر اشاعت پذیر ہوتا رہا بعد میں کلام حیدری نے ماہنامہ "آہنگ" نکالا بڑی آن بان سے، کبھی کبھی اس کی کاپی بھی ارسال فرمائی مگر میں جذباتی طور پر مورچہ سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اور اسی میں چھپتا رہا۔ پٹنہ کے دوران قیام کلام حیدری سے میرا براہ راست تعارف نہیں ہو سکا تھا۔

انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن (آئی ایم اے) کے بہار برانچ کے سالانہ جلسہ غالباً ۱۹۶۳ء میں گیا شہر میں ہوا، جس میں ایک مندوب کی حیثیت سے میں شریک ہونے گیا، میرے ساتھ برادر مکرم ڈاکٹر نذر امام مرحوم بھی تھے۔

ہم دونوں نے کلام حیدری کے دولت خانہ "بینا ہاؤس" میں قیام کیا طعام کا انتظام جلسہ گاہ میں تھا۔ دو تین دن ہم دونوں ان کے ہاں میں مقیم رہے۔ میں نے پہلی بار کلام حیدری کے پیکر کا غور سے ملاحظہ کیا۔ نکلتا ہوا قد، بھرا بدن، گورا رنگ لمبی ناک، خوبصورت چہرہ، ذہین اور چمکتی آنکھیں، آواز میں کھنک، مزاج میں مزاح اور بذلہ سنجی اور قہقہہ آمیز ہنسی، بے تکلفانہ انداز گفتگو، چند گھنٹوں کی ملاقات کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہم سب دیرینہ مخلص دوست ہوں۔ قیام کے دوران ان سے ادب و شعر و شاعری اور شاعروں و ادیبوں پر باتیں ہوتی رہیں۔ زیادہ تر وہ پریس اور صنعت کاری کی توسیع کے متعلق گفتگو کرتے رہے اور ہم دونوں اپنی اپنی رائے دیتے رہے شاہد و شراب کا ذکر تک نہیں آیا۔ دوسری شام انہوں نے اپنے یہاں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا جس میں چند شعرا شریک ہوئے مجھے صرف شاہد احمد شعیب یاد رہ گئے ہیں اس لئے کہ میں ان کی شخصیت اور شاعری سے متاثر ہوا تھا بعد میں ان سے بھی گفتگو ہوئی اور خط و کتابت کا وعدہ بھی جو صرف وعدہ ہی ہو کر رہ گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نشست میں کلام حیدری نے اپنا افسانہ سنانے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا اور شاعروں کو خوب داد دیتے رہے اس سے ان کی متانت اور وضعداری کا پتہ چلتا ہے دوسرے دن وہ ہم دونوں کو شہر کے کنارے اپنا ہوم پائپ بنانے کا کارخانہ دکھانے لے گئے اور پھر مورچہ پریس لے گئے۔ پریس دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی اور مجھے ایسا لگا جیسے یہ میرا اپنا پریس ہو۔

بعد ازاں کلام حیدری کے اکلوتے سالے ڈاکٹر خالد ملک مجھے اپنا زبردست زیر تعمیر مکان دکھانے کے لئے لے گئے جب ڈاکٹر خالد سے میری بات چیت ہوئی تو مجھ پر یہ تاثر قائم ہوا کہ وہ کلام حیدری سے کچھ شاکی ہیں۔ اور ایسا محسوس کرتے ہیں کہ کلام حیدری ان کے والد مرحوم کے سارے کاروبار پر بلا شرکت غیرے قابض اور دخیل ہیں اور خالد صاحب کے حقوق کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ حقیقت کا علم تو خدا کو ہی ہوگا۔

۱۹۷۱ء میں جب بنگلہ دیش بن گیا تو پاکستانی فوجیوں کے ساتھ ساتھ ڈھاکہ کے بہت سے مہاجر شہری بھی، جو فوجی چھاؤنی میں پناہ گزیں تھے قید ہو کر ہندوستان لائے گئے اور ملک کے مختلف کیمپوں میں رکھے گئے۔ میرے اپنے بہنوئی اور دوست وصی اللہ صاحب بھی مقید ہو کر لائے گئے۔ جب پتہ چلا کہ گیا شہر کے قریب بھی ایک فوجی کیمپ میں لوگ لائے گئے ہیں میں اپنے ایک ہندو فوجی میجر دوست کو ساتھ لے کر اپنی گاڑی سے طویل سفر طے کر کے گیا شہر پہونچا اور کلام حیدری کے دولت کدہ پر حاضر ہوا اور اپنا مسئلہ پیش کیا انہوں نے کیمپ کے مقام کی نشاندہی کی، مگر وہاں تک اپنی رسائی سے معذوری ظاہر کی میں نے میجر صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ درون خانہ تک رسائی حاصل کر لیں گے۔ کلام حیدری نے کہا کہ واپسی میں ان کے یہاں دن کا کھانا کھا کر ہم مظفر پور لوٹیں جب ہم کیمپ پہونچے تو تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ وہاں صرف فوجی جوان ہیں۔ عام شہری وہاں نہیں رکھے گئے ہیں۔ بڑی مایوسی ہوئی ناکام لوٹ کر کلام حیدری کے یہاں واپس ہوئے۔ اوپر جا کر انہوں نے ہم دونوں کو پرتکلف لنچ کھلایا۔ بریانی اور مرغ کی یاد آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔ ان کی پرخلوص دعوت سے کچھ موڈ درست ہوا۔ ان کی بیگم کی خدمت میں شکریہ اور سلام ارسال کرا کر مظفر پور کے لئے واپس ہوئے کلام حیدری کو دعائے دیتے ہوئے۔

۱۹۸۸ء میں جب اپنے گردہ کا آپریشن کرانے کے لئے میں بنگلور گیا تو جناب محمود ایاز (سوغات کے مدیر) سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے رات کے کھانے پر بلایا اور شراب بھی پیش کی مگر میں نے معذرت کر لی جب وہ موڈ میں آ گئے تو انہوں

نے بڑے جذباتی انداز میں کلام حیدری اور ان کی بیگم کو یاد کیا۔ کلام حیدری کی شخصیت کے خلوص اور فن سے کافی متاثر نظر آئے کلام حیدری تفریحی سفر پر نکلے تھے تو ان کے خوبصورت اور گلزار مکان میں تشریف فرما ہوئے تھے۔

۱۹۸۱ء کے مارچ مہینہ میں بہار اردو اکادمی نے بڑے پیمانہ پر کل ہند اردو فکشن سیمینار اور مشاعرہ کا اہتمام کیا مجھے بھی دونوں میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ میں مریضوں کی پریشانی اور اپنی آمدنی کے خسارہ کو مدنظر رکھتے ہوئے سیمینار کے دن نہیں گیا، دوسرے دن پٹنہ گیا اور شری کرشن میموریل ہال میں مشاعرہ میں اپنی شاعری سنانے کے لئے داخل ہوا، پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جب میں اسٹیج کے قریب پہونچا تو بغل میں کلام حیدری کرسی پر براجمان تھے۔ سلام اور مصافحہ کے بعد برجستہ انہوں نے فرمایا "ارے آپ ابھی تک زندہ ہیں" میں نے مسکرا کر کہا "شاید"۔ آگے بڑھا تو سید شہاب الدین ملے ان سے سلام و کلام ہوا۔ اسٹیج پر عصمت چغتائی مرحومہ موجود تھیں۔ ان کو زندگی میں پہلی بار دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی اور ان کی پروقار بوڑھی شخصیت کافی مقناطیسی نظر آئی۔ مشاعرہ میں سب سے زیادہ جوش کے ساتھ کلام حیدری ہی داد دیتے نظر آئے وہ مجھے جب دیکھتے تھے تو اپنے مخصوص انداز میں مسکرا دیتے تھے۔ افسوس ہے کہ یہاں سے میری تیسری اور آخری ملاقات تھی۔ کوئی گفتگو نہ ہو سکی۔ تعجب کی بات ہے کہ اس کے دوسرے دن رات کو تین بجے مظفر پور سے مجھکو فون پر یہ اندوہناک خبر سنائی گئی کہ میرا اپنا چھوٹا بھائی ضیاء اللہ حیدری ایکزیکیٹو انجینئر (پی ڈبلیو ڈی) کے دل کے دورے سے ایک بجے شب میں انتقال کر گیا۔ اس وقت ان کی عمر انچاس سال تھی۔ وہ مجھ سے سات سال چھوٹا تھا مجھے کلام حیدری کا جملہ "ارے آپ ابھی تک زندہ ہیں" یاد آگیا۔ یہ جملہ Prophetic ثابت ہوا، میرا اکلوتا اور بہت ہی پیارا بھائی اچانک مر گیا اور اس عظیم سانحہ کے بعد سے آج تک میں DEPRESSION کا شکار ہوں اور پچھلے تیرہ سالوں سے قریب قریب نیم مردہ اور گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہا ہوں۔ کچھ پریکٹس کر رہا ہوں میں، مگر شاعری کی لت باقی ہے۔

ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

بہت بعد میں پتہ چلا کہ کلام حیدری بھی دل کے عارضہ میں مبتلا ہیں اور گیا شہر سے منتقل ہو کر دہلی میں اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ رہنے لگے ہیں۔ سارا کاروبار اور پریس ٹھپ ہو چکا ہے۔

آخر ۱۹۹۴ء میں وہ اپنے وطن گیا شہر میں ہی میرے بھائی کی طرح اچانک دل کے دورے سے وصال فرما گئے اور ہزاروں لوگوں کو سوگوار چھوڑ گئے۔ کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَہٗ اللہ کریم و رحیم ان کی روح کو اپنے جوار رحمت میں مقام عطا فرمائے۔ آمین

کلام حیدری اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کی شخصیت بڑی فعال اور زندگی سے بھرپور تھی۔ وہ قنوطیت سے دور ایک رجائیت پسند انسان تھے وہ اسلام کے خارجی احکام پر سختی سے عامل تو نہیں تھے مگر ان کا دل مومن تھا، ورنہ اپنے افسانوں کا مجموعہ کا نام "الف لام میم" نہیں رکھتے۔ وہ کبھی کسی انجمن تحسینی باہمی کے رکن نہیں رہے ان کا commitment صرف انسانیت، انسان دوستی اور اردو زبان و ادب کے ساتھ تھا وہ مگدھ یونیورسٹی کی تعلیم اور نظام تعلیم سے بھی متوصل رہے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ بہتر صحافی تھے یا بہتر افسانہ نگار، وہ بے باک صحافی اور ترقی پسند افسانہ نگار تھے۔ بہرحال ان کا اپنا ایک اعلیٰ مقام تھا اور اردو کی تاریخ ادب میں رہے گا۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

وہ جسمانی سطح پر باقی نہیں رہے ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

اس لئے میری حقیر تجویز ہے کہ ان کے مکان "رینہا ہاؤس"

کلام حیدری ۔ ایک زندہ آدمی

عبدالصمد

کلام حیدری ہمارے درمیان نہیں رہے ۔
وہ ہمیشہ کے لئے یہ دنیا چھوڑ گئے ۔

اس بات پر یقین کرنے کے لئے ہمیں اپنے دلوں پر کتنی کٹھور محنت کرنی پڑے گی ، یہ ہم شاید خود بھی نہیں جانتے اور اس کی بھی گارنٹی نہیں کہ اس کے بعد ہمیں یقین آ ہی جائے گا ـــــ اس قدر زندہ شخص مر بھی سکتا ہے ۔ ؟

انہوں نے قدم قدم پر اپنے اس قدر نقش چھوڑے ہیں کہ جس محفل میں بھی نگاہیں اٹھیں گی ، ان کا سایہ سا لہراتا ہوا نظر آئے گا ۔ نگاہیں انہیں ڈھونڈیں گی اور جب وہ نہیں ملیں گے تب ـــــ

تب پھر اپنے آپ پر قابو پانا کتنا مشکل ہوگا ، اپنے آپ کو سمجھانا ، اپنے دل کو یقین دلانا اور اس بات پر ایک بار پھر ایمان لانا کہ موت ایک زندہ حقیقت ہے آج وہ گئے ہیں ، کل ہم جائیں گے پرسوں .....

کلام حیدری ایک افسانہ نگار کا نام تھا ۔
لیکن نہیں ، کلام حیدری تو بہت سی شخصیتوں کا نام تھا ۔ اگر آپ کلام حیدری افسانہ نگار کو جانتے ہیں تو آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ پھر آپ کے لئے کوئی مشکل ہے ہی نہیں ۔ مشکل تو ان لوگوں کے لئے ہے جو ایک کلام حیدری کے اندر بے شمار کلام حیدریوں کو جانتے ہیں ۔ مشکل میں پڑنے والوں کی اس فہرست میں ایک نام میرا بھی لکھ لیجئے ۔

بارہا ایسا ہوا کہ آپ کلام حیدری ، افسانہ نگار سے باتیں کر رہے تھے ، اچانک ان کے اندر سے ایک شخص اور برآمد ہوا ، یہ کلام حیدری تاجر تھا ، دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کلام حیدریوں میں زبردست جنگ شروع ہو گئی ـــ افسانہ نگار کی پوری کوشش ہے کہ وہ تاجر کو شکست دیدے اور تاجر بھلا ایک افسانہ نگار سے کیوں ہار ماننے لگا ـــــ جنگ جاری رہی ۔ ۶۵ سال تک یہ جنگ جاری رہی ۔ بالآخر شکست تاجر نے کھائی نہ کہ افسانہ نگار نے ۔

ایک اور شخص کلام حیدری کے اندر سے نکلا ، یہ صحافی کلام حیدری تھا جو تہذیب اور جمہور ، کے اداروں میں باقاعدگی سے شامل رہا ۔ اور بے قاعدگی کی فہرست تو بہت گنجلک ہے ۔ گیا سے ہفتہ وار "مورچہ" نکالا جو صحافت ، ادب اور سیاست کے میدان میں کل ہند پیمانے پر اپنا جھنڈا گاڑ گیا ۔ گیا سے ماہنامہ "آہنگ" نکالا جس کی ادبی خدمات کے طور پر ۱۹۶۰ء کے بعد کے بیشتر افسانہ نگاروں کے نام لکھے جا سکتے ہیں کبھی کبھی تو ایسا لگتا کہ صحافی کلام حیدری ، افسانہ نگار اور

تاجر پر حاوی ہو جائے گا۔ اور وہ دونوں آپس میں لڑتے ہی رہ جائیں گے۔ لیکن نہیں صاحب، یہ صحافی افسانہ نگار کو تو نہیں ہرا سکا۔ البتہ تاجر کو ڈوج دیکے نکل گیا۔ کاش کہ ایسا نہیں ہوتا ورنہ "موڑ"، "اردو آہنگ" کبھی بند نہیں ہوتے۔ پس یہ ثابت ہوا کہ صحافی نے ایک تاجر کو بھی شکست دیدی۔

اچانک کلام حیدری کے اندر سے ایک اور شخص بر آمد ہوا۔ یہ سیاست داں کلام حیدری تھا۔ یوں اس سیاستداں کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیاست داں تو بہت پہلے ہی جنم لے چکا تھا۔ مظاہرہ، جیل، سیل جلسہ جلوس، اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور کمیونسٹ پارٹی کی تحریکیں، ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں، ــــــــ

اس سیاست داں نے تو آزاد جمہوری ہندوستان کا پہلا سورج بھی نہیں دیکھا۔ کچھ عرصہ کے لئے اس کا نام تلاش گمشدگان کے طور پر بھی سر فہرست رہا۔ کیونکہ اس درمیان میں تاجر نے وقتی طور پر سب کو شکست بھی دیدی تھی جو لیفٹ نے میدان ضرور چھوڑ دیا تھا۔ لیکن شکست ہرگز نہیں مانی تھی وہ تاک میں رہے کہ کب یہ تاجر ہارے، سست پڑے اور وہ چڑھ دوڑیں۔

کلام حیدری ۱۹۶۲ء کے الیکشن میں کانگریس کی امیدواری کے لئے کوشاں۔ چینی حملے کے بعد کلام حیدری نے گیا سے ہفتہ وار "موڑ" نکالا تاکہ ادبی اور صحافتی محاذ پر بھی یہ جنگ لڑی جا سکے۔

بودھ گیا میں مگدھ یونیورسٹی کا قیام ہوا، کلام حیدری اس کے بانیوں میں، مگدھ یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ اور دوسری اہم کمیٹیوں میں کلام حیدری کا نام اور ان کی سرگرمیاں۔

مگدھ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے قیام کے لئے کلام حیدری آگے آگے۔ پارلیامنٹ اور اسمبلی الیکشن کے موقع پر گیا شہر کی دیواروں پر کلام حیدری کی... سے پرچے چھپاں ــــــــ کیا آپ اس موڑ... اپنی زبان اردو کی آواز سن رہے ہیں؟

کلام حیدری انجمن ترقی اردو بہار کے جنرل سکریٹری منتخب۔ سیاست دراصل ایک زندہ شئے ہے، ا... خود غرضی، مفاد اور کرپشن سے (اصولی طور پر) کوئی واسطہ نہیں۔ آج بھی اگر سیاست میں زندگی کی کوئی باقی نہ رہے تو پھر ہم ایک مہذب سماج میں زندہ رہنے بھی چھوڑ دیں۔ ادب، سیاست، سماج، صحافت تقریریں کر کے بور کرنے سے کیا فائدہ۔

کلام حیدری کے اندر ایک ایسا دوست ہوا تھا جو دوستوں کے لئے ہر دم مستعد رہتا تھا دوستوں کے لئے ان کا گھر تھا، ان کی میزبانی تھی... کے رسوخ تھے، ان کے وسائل تھے، ان کی گاڑی تھی ان کا دل تھا اور ــــــــ اس ذمرے کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن کا صیغۂ راز میں رہنا بہتر ہے ورنہ افشائے راز سے ان کے چند دوستوں کے وقار کا خطرے میں... کا اندیشہ ہے۔ دوستوں کے لئے یہ اپنی حدود سے باہر (Out of way) بھی جا سکتے تھے بشرطیکہ صرف یہ کہ انہیں یقین ہو کہ آپ ان کے دوست ہیں۔ بات یہ ہے کہ ایسے آدمی سے تو ہر آدمی دوستی رکھنا چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ سچے دوستوں کی فہرست اتنی طویل نہیں ہو سکتی۔ البتہ کچھ دوستوں کے لئے انہوں نے سب کچھ معاف کر رکھا تھا۔ ان کی گالیاں، ان کے عیب ان کی بے وفائی، ان کی بے رخی، ان کی بے رخی ــــــــ میرے جیسے غیر دوستوں کے لئے اکثر یہ چیز کوفت کا باعث بنی ہے۔ لیکن اس معاملے میں کلام حیدری کے calculations تھے، انہیں کیا فائدہ

آتا تھا، وہی جانیں۔ ہمیں تو کبھی اس میں بڑا نقصان نظر آتا تھا۔

ان کے اندر ایک دشمن بھی تھا۔ لیکن اتنا کمزور کہ وار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ آپ ان سے کچھ بھی دشمنی کر جائیے، یہ جواب میں کچھ نہیں کریں گے۔ سوائے ایک چپ کے۔ اگرچہ اس ایک چپ میں دشمنوں کے لئے بہت سے چھپے وار ہوتے تھے۔ یہ اندر کی کاٹ کرتے، بظاہر کچھ نقصان نہیں پہونچاتے تھے، اگر آپ کو اندر کے کاٹ کی پرواہ نہیں تو پھر کوئی بات نہیں۔

دوستی اور دشمنی کی بات نکلی ہے تو میرے پچیس سالہ تجربے کا نچوڑ بھی سن لیجئے کہ میں آج تک ان کے دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کر پایا۔ دراصل دونوں میں اس قدر باریک لکیر کھینچی ہوئی تھی کہ اسے دیکھنے پہچاننے کے لئے آنکھوں پر بڑا زور دینا پڑتا تھا۔ یوں کبھی کبھار تیز روشنی میں یہ لکیر نظر بھی آجاتی تھی۔ میں نے بارہا دیکھا کہ جو صاحب ان کے پاس سے اٹھ کر گئے۔ ان کے ساتھ ہنس ہنس کر مزیدار گفتگو کر کے، منہ پر ان کی تعریفیں کر کے، مہربانیاں وصول کر کے ــــــــ پیٹھ مڑتے ہی انہوں نے ان کی ایسی غیبت کی کہ بس خدا کی پناہ ـــــ پتہ نہیں یہ بدنصیبی کلام حیدری کی تھی یا ان کے دوستوں کی۔

ان پر پتھر تو اکثر برستے تھے اور یہ پتھر زیادہ تر دوستوں کی کمین گاہوں سے ہی آتے، لیکن وہ ان پتھروں کو پھول سمجھ کر چوما کرتے، شاید وہ اپنے لاکھ سجدوں کے یہی صلہ پاکر بہت خوش ہوتے تھے۔ لیکن اپنے دوستوں اور عزیزوں پر برسنے والے پتھروں کا وہ خوب حساب رکھتے تھے۔ ابھی حال ہی میں مجھ سے کہا کہ یہ جو کچھ لوگ آمادہ ہو رہے ہیں ان کے بارے میں تم نے کیا سوچا؟

میں نے جواب دیا کہ ان پتھروں اور گالیوں سے مجھ کو فائدے پہونچ رہے ہیں، ان سے کیوں محروم چاہتے ہیں آپ مجھے ـ ؟

مسکرا کر چپ ہو گئے۔

ان کے اندر ایک ایسا باپ بھی تھا جسے طور پر اپنی بیٹی پر ناز تھا۔ اکلوتی بیٹی، ماں باپ کا اندازہ پیار، ہر طرح کی آسائش اور آرائش کی ذ ـــــــ بگڑنے کے سبھی اسباب مہیا تھے۔ لیکن نہیں بگڑی۔ وجہ ایک باپ کی ہوشیار اور چوکس ہر دم اس پر لگی ہوئی تھیں، اس میں نہ سختی کا دخل نہ کسی قسم کی تنبیہ کا۔ جو لوگ انہیں قریب جانتے ہیں ان کی بیٹی کو دیکھ کر رشک کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ سبھی معاملوں میں تو افسانہ نگار، تاجر، صحافی سیاست داں اور ان کے اندر سے نکلنے والی بہت سی شخصیتیں ایک دوسرے پر ٹوٹنے لگتی تھیں۔ لیکن اپنے اندر کے باپ کو انہوں نے سبھی شخصیتوں سے بچا کر بالکل الگ تھلگ رکھا۔ جس میں وہ کامیاب ہوئے، بیٹی اور پھر بیٹی کے دونوں بچیوں میں منتقل ہو کر وہ پہلے سے زیادہ بھرپور ہو گئے تھے۔

دیکھنے سننے، پہننے، اوڑھنے اور رہنے سہنے میں وہ بالکل ماڈرن تھے۔ ایک دم اکیسویں صدی پر جانے کے لئے تیار۔ لیکن اندر سے وہ بہت پرانے آدمی تھے، پرانی تہذیب کے دلدادہ، پرانے کلچر کے شوقین اور پرانے زمانے کو یاد کرنے والے۔ ایک دن، دو دن، ہفتہ دو ہفتہ کی بات بڑی آسانی سے بھلا دیتے۔ لیکن آپ ان سے ان کے گاؤں میں پھیلنے والی سبزیوں کے رنگ پوچھ لیجئے جنہیں دیکھے ہوئے چالیس پچاس سال گذر چکے ہیں۔ آپ ان سے گاؤں کے ایک ایک آدمی کی تعریف سن لیجئے۔ ...

تک پہنچنے میں جو دھول انہوں نے کھائی، اس کا مزہ
انہیں ہمیشہ یاد رہا۔ آپ نے اگر ان کے ساتھ کبھی سفر کیا
ہو، آپ کو امید ہی نہیں، یقین کامل ہو کہ اگر چائے پان
کی ضرورت ہوئی تو کم از کم ایک ہی اسٹال کے درشن
ہو جائیں۔ کلام حیدری تاجر اور ان کی خیبٹ کو دیکھ کر یہ
یقین کرنا کوئی ایسا گناہ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن ہوا یہ کہ
راستے میں ایک ڈھابہ نظر آگیا اور گاڑی وہیں کھڑی ہو
گئی۔ اندر بیٹھنے تک کی جگہ نہیں۔ یوں ہی ایک بے ڈھب
سا اسٹول رکھا ہے۔ آپ سوچتے ہی رہ گئے اور یہ
اسٹول پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر پکوڑے اور چائے کی
فرمائش بھی کر بیٹھے۔ آپ نے ناک بھوں چڑھائی اور ان کا
لکچر شروع۔

"ارے کھاؤ میاں ______ تکلف نے تم
لوگوں کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔"

دوسری طرف شہر اور صوبے سے باہر آپ
فائیو اسٹار ہوٹلوں سے نیچے درجے کے ہوٹلوں میں
ٹھہرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ لیکن توبہ کیجئے فائیو اسٹار
ہوٹلوں کو بھی انہوں نے ڈھابہ بنا رکھا تھا۔ آلتی پالتی
مار کر بیٹھنا اور لوٹ میں لگانا فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بھی
انہیں اچھا لگتا تھا۔

کلام حیدری کا جب دوسرا مجموعہ، صفر، شائع
ہوا تو انہوں نے اس میں ایک شعر لکھا۔

بیگانہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں
جاگوں ہوں دور سب سے میں کس کا آشنا ہوں

یہ شہر گیا کے ساتھ ان کے تعلق اور بے تعلقی کا جیتا
جاگتا اظہار ہے۔ انہوں نے مجموعے پر یہ شعر لکھتے ہوئے
کرب کی کون سی سنگین وادیوں کی سیر کی، یہ تو میں نہیں
جانتا لیکن میں شعر پڑھ کر کانپ گیا تھا۔ جب میں ان
کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ شعر فوراً ذہن میں آجاتا ہے

انہوں نے دونوں رسالے بند کر دیئے، پریس
فروخت کر ڈالا۔ بزنس بند کر دیا اور ان کی قیام گاہ رینہ
ہاؤس پر جو بلاشبہ ایک تہذیبی مرکز کی حیثیت
رکھتا تھا، اکثر تالے نظر آنے لگے۔ دلی میں انہوں نے
مکان بنا لیا تھا۔ اکثر تالے نظر آنے لگے۔ دلی میں انہوں
نے مکان بنا لیا تھا اور وہاں دل لگانے کی کوشش
کر رہے تھے۔ دلی سے واپسی پر بظاہر وہ صحت مند
نظر آئے۔ لیکن وہ اندر سے کس قدر ٹوٹ چکے تھے۔
اس کا اظہار ان کی مایوسی بھری باتوں سے اکثر ہوتا تھا
منصوبے اور پروگرام ان کے پاس اب بھی تھے لیکن اب
ان میں کوئی رنگ نہیں تھا۔

وہ سب سے بھاگ کر پھر گیا لوٹ آئے تھے اور
بالآخر گیا کی سنگلاخ زمین نے اپنے سینے پر بیگانہ
وضع رہنے والے اس شخص کو اپنی آغوش میں سمو لیا۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ آدمی کو پہچاننے کی ان میں
صلاحیت نہیں تھی۔ دوسروں کو اس غلط فہمی کا شکار
کرنے میں کسی اور کا نہیں، قصور انہیں کا تھا۔ اتفاق سے
میں ان کے، ان چند لمحات کا گواہ ہوں جب وہ افسانہ
نگار تھے۔ نہ تاجر، نہ صحافی، نہ سیاست داں ______
صرف کلام حیدری اور تب یہ پتہ چلا کہ یہ شخص تو صرف
کلام حیدری ہی رہنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں
اپنے اندر سے جو اتنی شخصیتیں انہوں نے برآمد کی تھیں
وہ سب کے سب اصل کلام حیدری کو چھپانے کے لئے۔
کلام حیدری کو گم کرنے کے لئے۔ تاکہ لوگ افسانہ نگار،
تاجر، صحافی، سیاست داں وغیرہ وغیرہ میں الجھ جائیں
اور اصل کلام حیدری تک نہ پہنچ سکیں۔

یہ حقیقت ہے کہ کلام حیدری تک بہت کم ری

(باقی ص ۱۴۵ پر)

کلام حیدری کی شخصیت کی کچھ جھلکیاں

ڈاکٹر عبد المنان، کلکتہ

کلام حیدری کا تعلق بہار کے ایک مشہور شہر گیا سے تھا
ہاؤس کمپاؤنڈ میں اپنی بلند عمارت رکھتے تھے جو آج بھی
ے اس عمارت کا رنگ اور روغن سفید ہے اس معاملے
نفسیات ہو سکتی ہے ایک یہ کہ وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ
بت سے عمارت کا رنگ سفید رکھا جائے اور دوسری
ادیب کا گھر روغن کے لحاظ سے بھی سادگی کا نمونہ ہو۔
لک عام ہونے کے باوجود سادگی سے عاری نہیں ہے۔
ی ایک نوع کا وقار ہے جو آدمی انفرادیت پسند ہوتا ہے
ہ پر انفرادیت کے نقوش ثبت کرتا ہے۔ کلام حیدری کے
(اس اعتبار سے) کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔

کلام حیدری علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے، شادی
الخیر کی صاحبزادی شاہدہ حیدری سے ہوئی تھی جس
ے ایک بچی ربینہ حیدری پیدا ہوئی تھی۔ اس کی شادی
ے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان سے ہوئی۔ چونکہ ربینہ
دتی اور تمام تر شگفتگیاں اسی کے ساتھ وابستہ تھیں
ن زندگی کے بیشتر اوقات اسی کے ساتھ گذارتے
تا سے اپنے شوہر کے ساتھ دہلی میں رہتی تھی اسی
ری بھی عمر کے آخری دور میں دہلی میں رہنے لگے۔
ب بار گیا آتے تھے ان کے دہلی جانے کے بعد
"آہنگ" (مشہور ادبی جریدہ) اور مورچہ (ہفتہ وار کا)
رفتہ رفتہ بند ہو گیا۔ مورچہ بزنس کے اعتبار سے بھی جاری تھا
اس میں اکثر ربینہ سمنٹ پائپ فیکٹری اور رام شیلا اسٹون
ورکس کا اشتہار ہوتا تھا۔ فیکٹری لمبی چوڑی آراضی میں پھیلی
ہوئی تھی اب ان کے دہلی جانے کے بعد کوئی دیکھنے والا نہ تھا
اس لئے فیکٹری بند ہو گئی۔ کچھ دنوں تک ان کا سالہ ڈاکٹر
خالد جو اس کارخانے کا حصہ دار بھی ہے چلاتا رہا۔ لیکن ڈاکٹری
جیسے پیشے کی عدیم الفرصتی کی وجہ سے پوری توجہ صرف کرنے سے
قاصر تھا، نتیجتاً فیکٹری بند ہو گئی۔ جس انداز سے کلام حیدری وقت
دیتے رہتے تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے
اوقات میں سے ایک حصہ تجارت کے لیے وقف کر لیا تھا۔
اور زیادہ تر حصہ ادب کی تخلیق اور ادیبوں کے ابھرنے کے لئے
موقع فراہم کرنے میں صرف کرتے تھے ادیبوں کو ادیب کی سطح
پر آنے کے لئے موقع فراہم کرنا بڑی ادبی خدمت ہے آہنگ
میں ایک گوشہ بھی ادیبوں کے کارنامے پر اور تعارف سے متعلق
نکالتے رہے کئی ایسے ادیب اور شاعر ہیں جن کو ابھرنے کا
موقع فراہم کیا نئے لکھنے والوں کو حوصلہ عطا کرنا ان کا شیوہ تھا
راقم بھی آہنگ اور مورچہ میں لکھتا رہا اس سے مجھے حوصلہ ملا،
اور [illegible]

اور محمود واجد ایک عرصے تک وابستہ رہے۔ جدیدیت اور
ترقی پسندی کی بحثوں کے شباب کا زمانہ تھا جب کلام حیدری
انہماک کے ساتھ لکھتے رہے تھے ابتدا میں ترقی پسند تحریک سے
وابستہ تھے اور دوران طالبعلمی اور اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی
دور میں کلکتہ میں وقت گذار رہے تھے یہاں کی ادبی فضا
سے آگاہ تھے ابراہیم ہوش، مظہر امام مالک لکھنوی اور دوسرے
فنکاروں سے دوستی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ابتدا میں شاعری سے
لگاؤ تھا لیکن راقم کی نظر سے کوئی نمونہ نہیں گذرا، ممکن ہے
کہ میری کوتاہی کا دخل ہو ہاں یہ ضرور ہے کہ افسانے سے گہرا لگاؤ
تھا۔ ابتدا میں ترقی پسند تحریک کا اثر تھا "بے نام گلیاں" میں
جتنے افسانے ہیں وہ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی یاد دلاتے
ہیں۔ ممکن ہے ادبی فضا کو دیکھکر اس تحریک سے ناتا جوڑا ہو کہ
یہی تحریک اس زمانے میں شباب پر تھی بعد میں دیکھا کہ اس کا
اثر ختم ہو رہا ہے اور نئی تحریک "جدیدیت" کے نام سے ابھر
رہی ہے جس پر عالمی ادب کا بھی اثر ہے تو اس کی طرف توجہ
مبذول کی اور ایسا اثر چھوڑا کہ ایک زمانے تک ان کا بھی نام
آتا رہا لیکن تنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد یہ کہا جا سکے گا کہ انہوں
نے محض تجرباتی انداز سے اس کی طرف توجہ مبذول کی۔ علامتی
اور تجریدی افسانے لکھے لیکن مقام نہیں بنا سکے "الف لام میم"
ان کے ایک افسانوی مجموعے کا نام ہے اور اس سے الف لام
میم کا مخصوص مفہوم بھی ہوتا ہے اس سے پوری زندگی کی تاریخ
واضح ہوتی ہے۔

"تفہیمات" ان کے تنقیدی مقالوں کا مجموعہ ہے۔
جس کی پہلی اشاعت ۱۹۸۳ء میں ہوئی تھی۔ ان میں آٹھ
مضامین ہیں جن میں انفرادی نظریے کی جھلک پوشیدہ ہے
وہ خود فرماتے ہیں:

"میں نے شروع ہی سے الگ راہ بنائی ہے۔
وہ چاہے پگڈنڈی کیوں نہ ہو، میں شاہراہ
بنانے کی اہلیت رکھتا ہوں کہ نہیں یہ فیصلہ
کرنا مستقبل کا اور دوسروں کا کام ہے
میں اپنے اندازِ نظر اور طریقۂ فکر کو جس
اور تکنیک آمیز پاتا ہوں تقلید کرنے اور
مرعوب ہونے کو ہمیشہ کفر جانا۔"

تقلید کرنے اور مرعوب ہونے کو کفر سمجھتے تھے یا نہیں لیکن اپنی
راہ الگ نکالنے میں انفرادیت کم چھوڑ سکے۔ جوش کی انقلابی
شاعری کا پس منظر بیان کر کے ان کے خطیبانہ انداز کو شاعری
کے فن کے لئے مناسب نہیں سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں:

"جوش ایک آگ پھلکنے والا بائی ہے جو
کسی بہت ہی اونچی چٹان پر کھڑا ہو کر آگ
اور خون کی بارش کر رہا ہے ....
آتش فشاں کی طرح آگ اگلے چلے جاتے
ہیں اور عام سطح کا انسان مرعوب ہو کر محض
تماشائی بن کر دیکھتا رہ جاتا ہے"۔

فنکار اپنے تصورات کو موزوں جامہ پہناتا ہے، اندازِ بیان
کو تقدم کا درجہ دیتا ہے۔ فن اور فکر کا حسین امتزاج پیش
کرتا ہے۔ خطیبانہ انداز کی گھن گرج سے دور رکھتا ہے۔ یہ
ساری باتیں جوش کے یہاں کم تھی۔ علاوہ ازیں سماجی علوم
کی بھی کمی تھی جوش کی بغاوت وقتی چیز تھی۔ ان تمام حقیقتوں پر
روشنی ڈال کر جوش کی شاعری کے قابل قدر اثرات کا اعادہ
کرتے ہیں۔

منٹو پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے
ادب میں منٹو کو ایک ناقابل حل مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔ اگر
ترقی پسند ادیبوں کے درمیان منٹو کی کوئی جگہ نہیں ہے منٹو
بھی اعتراف تھا کہ وہ ترقی پسند افسانہ نگار نہیں ہے، کلام
حیدری کا خیال ہے کہ:

"ہندوستان کی ترقی پسند ادبی تحریک کی

شروع ہی سے چند مخصوص کمزوریاں رہی
ہیں، لبرل ازم کی زوال پذیر شکل اس میں
شروع ہی سے رہی ہے۔ ان ہی کمزوریوں
کے نتیجے میں منٹو رجعت پسند ہونے کے
باوجود عام لوگوں میں ترقی پسند سمجھا جاتا رہا،
ترقی پسند ادبی تحریک پر فحاشی اور ابتذال
کے الزامات اغیار لگاتے رہے، چونکہ ثبوت
کے طور پر منٹو موجود تھا۔ ہماری جانب سے کوئی
واضح اور دو ٹوک تردید نہ ہونے پر اس
غلط فہمی نے کسی قدر جڑ پکڑ لی۔"

کلام حیدری کا خیال ہے کہ منٹو اپنی ذہنیت کے اعتبار سے
زندگی کے کسی بھی لمحے میں ترقی پسند نہیں رہا، ان کا موقف سماجی
ضرور رہا ہے لیکن ترقی پسندی پوری طرح جس تفہیم کی وضاحت
میں اپنا کردار نبھاتی رہی ہے اس سے منسلک نہیں تھا

حقیقت نگاری کا ذکر جس تلخی کا رہین منت ہے
اس سے منٹو کی فنکاری اور شخصیت کے نقوش ابھر کر سامنے
آتے ہیں۔ منٹو کے یہاں زندگی کا تصور مثبت چادر میں لپٹا ہوا
ہے تمام تر کہانیوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کا
تصور اور زاویۂ نظر ایک خاص رجحان کا رہین منت ہے۔
گرچہ موصوف کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے ان کے ہاں کوئی
زاویۂ نظر نہیں ملتا ہے۔ لیکن بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک زاویۂ
نظر واضح ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس سے اتفاق کریں یا نہ
کریں۔

تخلیقی عمل میں حیاتیاتی اور نفسیاتی عمل کی عقدہ
کشائی کرکے ادب میں اس کی ناگزیر حیثیت کی وضاحت کی
"تخلیقی عمل" وزیر آغا کی تصنیف ہے جس کا محاکمہ کرکے اس
مضمون کو خدا بخش خاں لائبریری سیمینار (۱۹۷۹ء) میں پڑھا
۔ وزیر آغا کے موقف پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے نظریے
کی عکاسی کی تھی وزیر آغا سے متعلق ان کا مخصوص انداز نظر تھا
جس کی عکاسی اس مضمون میں ہوئی ہے۔

تنقید میں کلام حیدری کا اپنا مخصوص انداز تھا جس
میں تشکیک و تجزیہ کا لہجہ پنہاں تھا۔ میں اس بات کا اعتراف
نہیں کرتا کہ وہ بہت بڑے ناقد تھے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے
کہ ان کا مخصوص زاویۂ نظر تھا۔ اچانک موت نے ایک جانباز
قلم کے سپاہی کو ہم سے چھین لیا۔ موت ایک کھلی حقیقت ہے موت
کی وجہ سے جینے کا مزا ہے۔ غالب کہتا ہے ؏

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

لیکن افسانہ نگار کی حیثیت سے انہوں نے مقام بنانے میں
کہیں ڈگمگائے اور کہیں ثابت قدمی کا ثبوت دیتے رہے۔
اگر وقت نے فرصت دی تو اس گوشے پر اپنا خیال ظاہر کروں گا۔

پرانے یادوں کے خزانے میں

"زینا ہاؤس" میں اپنی موت کی مجلس برپا کردی، دن بھر
شہر کے مختلف محلوں سے آنے والوں کا سلسلہ جاری رہا۔
بعد مغرب رشتے دار، دوست اقارب نمناک آنکھوں
سے کلام حیدری مرحوم کو ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا کر رخصت
ہوگئے، کہانی لکھنے والے کلام حیدری خود کہانی بن گئے،
اور یادیں چھوڑ گئے۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

—— ۰ ——

" کلام حیدری صاحب کا تنقیدی مضمون ان کے وسیع
مطالعہ اور تنقیدی بیان کی مضبوط گرفت کی پوری پوری
نشاندہی کرتا ہے بڑا خوبصورت تجزیہ کیا ہے تخلیقی عمل کا "

(وحید تابش، اردو زبان)

کلام حیدری! تم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

رضوان احمد

کلام حیدری نہیں رہے ۲، فروری ۱۹۹۴ء کی شب میں اچانک ہی انھوں نے جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔

ان کے انتقال کی خبر سن کر اچانک ہی بہت سی بھولی بسری کہانیاں یاد آگئیں۔ کلام صاحب دوستوں کے دوست تھے۔ میں نے تیس سال قبل ان کا نام اس وقت سنا جب ان کے شباب کا زمانہ تھا۔ اس وقت ان کا شمار بہار کی نمایاں شخصیتوں میں ہوتا تھا ایک تو یہ کہ بہار کے نمایاں صنعت کار اور سرمایہ دار تھے ساتھ ہی ساتھ وہ ترقی پسندوں کے ہراول دستے میں شامل تھے۔ ترقی پسند افسانہ نگار تھے۔

میں نے بچپن میں ہی کلام حیدری کے افسانے پڑھے تھے۔ ان دنوں ان کے افسانے "بیسویں صدی" اور "شمع" سے لیکر "شاعر" اور "نقوش" تک میں شائع ہوا کرتے تھے۔

۱۹۶۴ء میں انھوں نے اپنا ہفتہ وار اخبار "مورچہ" نکالنا شروع کیا اور چند ہی شماروں کے بعد اس کی دھوم سارے ہندوستان میں مچ گئی پہلے یہ اخبار سیاسی تھا مگر بعد میں اس کی حیثیت ادبی اخبار کی ہو گئی۔ اس اخبار میں بڑے بڑے ادبی معرکے ہوئے شروعات اس وقت ہوئی جب مرحوم پروفیسر اختر اورینوی نے بمبئی کے کسی ادبی جلسے میں جدیدیت کے خلاف تقریر کی اس کے بعد جدیدیت کے علمبردار کسی اخبار کے "الف" نے ان کے خلاف تحریک چلانی شروع کردی اور یہ بحث بالآخر مورچہ میں آن پڑی۔ پھر تو اس بحث میں پروفیسر احتشام حسین، آل احمد سرور سے لیکر باقر مہدی، قمر رئیس اور وہاب اشرفی بھی کود پڑے۔ برسوں تک یہ بحث چلتی رہی اور لوگ خوب خوب لطف اندوز ہوئے۔ ہر جگہ شدت سے مورچہ کا انتظار رہتا تھا۔

جدیدیت کی دوسری بحث "شب خون" میں شائع شدہ محمود ہاشمی کے مضمون "اوڈی ناشر" سے شروع ہوئی۔ مورچہ کے میدان میں کلام حیدری نے ڈاکٹر وہاب اشرفی کو اتارا جنھوں نے اپنی عالمانہ بحث سے شمس الرحمان فاروقی اور محمود ہاشمی کے نظریات کے تار و پود بکھیرنے شروع کر دیئے۔ وہاب اشرفی گیا میں نئے نئے لیکچرر بن کر گئے تھے ان کا ادب میں تعلق تھا مگر ان دنوں انھیں افسانہ نگار کی حیثیت سے ہی زیادہ جانا جاتا تھا۔ انھوں نے جس انداز سے عالمانہ بحث کی اس نے اس زمانے کے جدید ناقدین کو بھی چونکا دیا جس کے بعد تو وہاب اشرفی کی دھاک جم گئی۔ پھر کلام حیدری کا شمس الرحمٰن

فاروقی، وہاب اشرفی، محمود ہاشمی سب میں صلح مصالحت ہوگئی اور اس بحث کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

مگر اس کے فوراً بعد ہی، ۱۹۷۰ء میں ہی اردو کے لئے دیوناگری رسم الخط کی بحث کا دروازہ کھل گیا ہوا یوں کہ بہار کے قحط زدہ علاقوں کی ریلیف کے لئے ترقی پسند ادبا و شعراء نے پورے ملک کا دورہ کیا اس وفد میں سجاد ظہیر، ساحر لدھیانوی مجروح سلطانپوری، اندیور، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، پرکاش پنڈت، مخدوم محی الدین، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ تھے۔ انھوں نے دہلی، الہ آباد، کانپور، لکھنؤ، بھوپال، پٹنہ، گیا وغیرہ دورہ کیا۔ جہاں بھی گئے۔ وہ ساتھ ساتھ ایک منشور پر اردو، ہندی ادیبوں سے دونوں زبانوں میں دستخط کرواتے۔ ہندی ہماری قومی زبان ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اردو کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے مطالبہ کرتے کہ ہندی کے ساتھ اردو کو بھی بہار، یوپی، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، آندھرا پردیش میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔

پٹنہ میں اس وفد کے پروگرام کا انعقاد کمیونسٹ پارٹی کی مقامی شاخ نے کیا تھا۔ یہ پروگرام رونیدر بھون میں ہوا تھا جس کی صدارت اس وقت کے نائب وزیر اعلیٰ اور وزیر تعلیم کرپوری ٹھاکر نے کی تھی سی پی آئی بھی سیوکت ودھائک دل گورنمنٹ میں شریک تھی۔ اس لئے وفد کو کافی پذیرائی ہوئی تھی۔ اس جلسے میں میری کلام حیدری سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، وہ وفد کو گیا لے جانے کے لئے آئے تھے۔ مرحوم سہیل عظیم آبادی نے مجھے ان قلمکار ادیبوں سے ملایا تھا۔ کیونکہ ان دنوں میں طالب علم تھا اور لکھنا پڑھنا بس شروع ہی کیا تھا۔

اس وفد کا ملک گیر دورہ مکمل ہونے کے بعد وہ منشور اردو ہندی کے اخبارات میں ادبا و شعراء کے دستخطوں کے ساتھ شائع ہوا اور اس کے بعد ایک بھونچال سا آگیا۔ دھرم یگ ساریکا، نئی کہانیاں وغیرہ نے اردو کے خلاف ایک زبردست مہم چھیڑ دی بلکہ اس پر دستخط کرنے والے ہندی کے متعدد سربرآوردہ ادیبوں جیسے سمترانندن پنت، بھگوتی چرن ورما، امرت رائے کملیشور نے تو یہ بیان دیا کہ وہ قطعی اردو کو سرکاری زبان بنانے کے حامی نہیں ہیں اور منشور پر دستخط بغیر پڑھے ہی کروالیا گیا تھا اس کے علاوہ اردو کے لئے دیوناگری رسم الخط کے حامی ہیں اس موقع پر دھرم یگ اور ساریکا نے راہی معصوم رضا کو خرید لیا جنھوں نے ہر شمارے میں اردو کے خلاف مضامین لکھنے شروع کئے اردو والوں کو رسم الخط دیوناگری کر دینے کا مشورہ دیا ان کے ساتھ ساتھ عصمت چغتائی نے بھی اپنی آواز ملا دی بلکہ اس موقع پر انکشاف ہوا کہ دراصل اردو کے لئے دیوناگری رسم الخط کا مطالبہ اردو کے سربرآوردہ ادیبوں نے ۱۹۴۸ء میں منظور کر لیا تھا اور اس کی ایک قرارداد پہ الہ آباد میں دستخط ہوئے تھے جس پر اردو والوں کی جانب سے سجاد ظہیر، سردار جعفری آل احمد سرور، مجروح سلطانپوری وغیرہ نے دستخط کئے تھے

امرت رائے نے ہندی میں ایک کتابچہ شائع کیا "اردو راجکیہ بھاشا کی مانگ۔ کتنی صحیح کتنی غلط"۔ کلام حیدری نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس کتابچہ کا اردو میں ترجمہ کر دوں میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور یہ مضمون تین قسطوں میں مورچہ میں شائع ہوا۔ اور اس کے بعد انھوں نے مجھے کہا کہ اردو کے سلسلے میں دھرم یگ اور ساریکا میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان کا ترجمہ انھیں ارسال کر دوں۔ میں نے بحث کا ترجمہ کر کے انھیں دیا اور انھوں نے تمام مضامین بالاقساط شائع کر دیئے۔

یہ بحث ختم نہیں ہوئی تھی کہ لکھنؤ کی غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کے انعقاد کے بعد پھر بحث کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کانفرنس کا انعقاد ۱۹۷۲ء میں رام نے کیا تھا جس میں کلام حیدری کے علاوہ میں بھی شریک

ہوا تھا یہ بات ۲۰ سال پرانی ہو گئی مگر مجھے اب تک یاد ہے کہ کلام حیدری گل مرگ ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ ان کے ہمراہ لطف الرحمٰن تھے ان کے کمرے میں ادبا کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ کرشن کمار طور، پریم کمار نظر، مظہر امام وغیرہ تو کمرے میں ہی بیٹھے رہتے اور خوش گپیاں کرتے سارا وقت گذار دیتے۔

لکھنؤ کے علاوہ دہلی میں بھی دو سیناروں میں کلام حیدری کے ہمراہ رہا ان میں ایک سینار جامعہ ملیہ اسلامیہ کا فکشن سینار تھا جو کہ ۱۹۸۰ء میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مساعی سے منعقد ہوا تھا جس میں ہند و پاک کے متعدد افسانہ نگار شریک ہوئے تھے اس کا افتتاح وزیر خارجہ نرسمہا راؤ نے کیا تھا جس میں انھوں نے بڑی معرکۃ الآرا افتتاحی تقریر کی تھی جس کا بہت دنوں تک چرچا رہا اور یہ تقریر اس کتاب میں بھی شامل ہے جو پروفیسر نارنگ نے مرتب کی تھی۔

دوسرے فکشن سینار کا انعقاد ۱۹۸۱ء میں دہلی اردو اکاڈمی نے کیا تھا جس میں کلام صاحب نے ایک سیشن کی صدارت کی تھی۔

گذشتہ ربع صدی کے دوران میری کلام صاحب سے سینکڑوں ملاقاتیں رہیں پٹنہ اکثر آتے رہتے تھے وہ عموماً اپنی کار سے آتے اور کسی اچھے ہوٹل میں قیام پذیر ہوتے۔

ان کے آنے کی خبر پا کر ادباء و شعراء ان سے ملنے جاتے اس کے علاوہ وہ خود بھی دوستوں کے یہاں جاتے ان دنوں ادبا کی بیٹھک رحمانیہ ہوٹل میں ہوا کرتی تھی وہ وہاں بھی جاتے اور گھنٹوں بیٹھتے اس کے علاوہ اسی زمانے میں بیٹھک کی جگہ تبدیل ہو کر قبرستانیہ ہوٹل میں ہو گئی وہ وہاں بھی جاتے۔ کلام صاحب دولت مند تھے۔ مگر ادباء اور شعراء اور قلم کار ادب کے ساتھ ان کو فٹ پاتھ پر کہیں بیٹھ کر چائے پینے میں عار نہیں تھا۔ حالانکہ میں ان سے عمر میں اور مرتبے دونوں میں بے حد کمتر تھا اس کے باوجود وقت ملتا تو خاکسار کے غریب خانے میں یا دفتر میں تشریف لاتے اگر کھانے کا وقت ہوتا اور میں ان سے درخواست کرتا کہ دال [illegible] کھا لیجئے تو وہ ذرا بھی تکلف نہ کرتے گیا میں بارہا ان کی مہمانی کا شرف بھی حاصل ہوا جب بھی گیا وہ بے حد خوش ہوئے اور دن رات ساتھ رہے اپنے دوستوں کے یہاں لے گئے اور ان سے تعارف کرایا۔

کلام صاحب نے مورچہ اور آہنگ کے ذریعہ نئی نسل کی تربیت کی۔ کتنے ہی ایسے قلم کار ہیں جن کی پرورش انھوں نے کی تھی ان میں شوکت حیات۔ انور قمر۔ انور خان، عبدالصمد، شمیم افزا قمر، حسین الحق، شفق، سید احمد قادری، علی امام وغیرہ کا نام خاص طور سے لیا جا سکتا ہے۔ جن کا انھوں نے آہنگ میں خصوصی مطالعہ شائع کیا۔

کلچرل اکاڈمی کے ذریعہ درجنوں کتابیں شائع کیں۔ اس کے جلسے برابر کراتے رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے مکان زینہ ہاؤس کو ادبی مرکز بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے زمانے میں پٹنہ کے بعد گیا ایک دبستان کی حیثیت سے ابھرا۔

کلام صاحب اچھے افسانہ نگار ہی نہیں تھے، اچھے مقرر بھی تھے ان کی تقریریں سننے کا بارہا موقع ملا۔ وہ بہت اچھے منتظم تھے، ۱۹۸۰ء کے بعد ان کی طبیعت ہر چیز سے اچاٹ ہوتی چلی گئی تھی۔ ان کی اکلوتی اولاد بیٹی نگار رینہ تھی۔ جس کو وہ بے حد چاہتے تھے اور اس کی شادی کے بعد سے ان کا احساس تنہائی بڑھ گیا تھا۔ اس کے بعد سے ہی انھوں نے اپنا پائپ کا بزنس ختم کر دیا، پریس بند کر دیا، اخبار بند کر دیا۔ ملاقات ہوتی تو انھوں نے دریافت کرنے پر کہا کہ اب صرف لکھنے پڑھنے کا کام کروں گا اس لئے کاروبار کو سمیٹ دیا ہے۔

گذشتہ آٹھ دس برسوں کے دوران ان کا پٹنہ آنا بھی کم ہو گیا تھا۔ انھوں نے دہلی میں مکان بنا لیا تھا۔ اور زیادہ تر وہیں رہنے لگے۔ دو تین بار دہلی میں ملاقات ہوئی۔ اکثر جوگندر پال کے یہاں ملتے تھے۔ دہلی میں بھی ان کا

بے حد محدود تھی۔ ان کی صحت بگڑتی جا رہی تھی لکھنا بھی کم ہی ہوتا جا رہا تھا لیکن اب بھی جب ملتے تو کہتے کہ اسٹنگ شروع کروں گا۔

گزشتہ سال ان کا بائی پاس سرجری آپریشن ہوا تھا۔ ہم نے پتہ معلوم ہوا کہ کسی سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔

اب انتقال کی خبر ملی تو یہ کہہ کر رہ گیا کہ

دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

کلام صاحب کو ایک شکایت ہمیشہ رہی کہ ان کی خدمات یا ان کی صلاحیتوں کا اعتراف نہیں ہوا۔ اور ان کی یہ شکایت بہت حد تک تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے استاد پروفیسر اختر اورینوی کے زیر بے حد شاکی رہتے تھے کہ انھوں نے بہار میں صلاحیتوں کا قتل رجلا وطن ہونے پر مجبور کیا اس سلسلے میں وہ کہتے تھے کہ شکیل الرحمٰن کو کشمیر میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ انور عظیم کو صحافت مانا پڑا، غلام سرور کو صحافت میں پناہ لینی پڑی، ظفر اوگانوی کو جانا پڑا۔ خود ان کو بہار ہی میں پناہ ملی مگر یونیورسٹی جا کر اس طرح انھوں بہار کے باصلاحیت افراد کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔

ادبی تنازعہ پیدا کرنے میں انہیں لطف آتا تھا مگر ان کی شخصیت بھی کم متنازعہ نہیں رہی مگر ان کا ایک خاص وصف تھا کہ آپ ان پر کوئی الزام لگاتے رہیے اس کا جواب نہیں دیتے تھے شاید اسی طرح سے متنازعہ رہنا چاہتے تھے۔

اب ان کا انتقال ہو گیا ہے تو بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ اگر کبھی موقع ملا تو تفصیل سے لکھوں گا۔ ابھی تو بس اتنے پر اکتفا کروں گا ؎

خدا رکھے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

بقیہ : کس کی کہانی۔۔۔

کرتا بلکہ قاری کو سوچنے پر بھی مجبور کر دیتا ہے اور کثرت سے ایسے اشارات کہانی میں موتیوں کی مانند بکھیر دیتا ہے

جو قاری کو اپنے میں جذب کیے رہتے ہیں۔ اس کہانی میں قصے کی بجائے کیفیت اور جذبے کی مصوری کے نشانات بھرپور ملتے ہیں۔ اس کہانی کی نفاست، روانی، ڈرامائی انداز، حقیقت نگاری، منظر کشی، صاف ستھرے بیان، نپے تلے الفاظ اور علاقائی نشانات قاری کو ایک ownership عطا کرتے ہیں۔ کہانی میں قصے سے زیادہ کردار کا خیال رکھا گیا ہے۔ احوال کے بیان میں microscpie تکنک کا جادو ہے۔ ساتھ ہی پیش کش میں کمپیوٹر کی زبان بولتا ہے فنکار تہذیبی، معاشرتی اور ماحولیاتی شناخت اور تقاضے کو کم سے کم الفاظ میں compact بنا کر ہو بہو پیش کرتا ہے۔ ایسے الفاظ کی frequency بڑھا کر رکھی گئی ہے جو ماحول کی حقیقتوں کے آئینہ سازی میں کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ مگدھ کے علاقے کے معاشرے کی پوری ترجمانی اس طرح کی گئی ہے جس سے مگھی روح جابجا بولتی ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ کہانی پر مہاتما بدھ کے نروان کا بھی غلبہ ہے۔ یہ فطرت کے نامیاتی احساس کا بھی دباؤ ہے اور صداقت کی متلاشی روح کے تجربات کا بھی عمل دخل ہے۔ اس کہانی میں اپنے ماضی کو اس طرح Re-collect کیا گیا ہے کہ تہذیب و تمدن کا ایک امڈتا ہوا سمندر چھوٹے سے کوزے میں سمو گیا ہے۔ قصے کی ترتیب نہایت موزوں اور مناسب ہے۔ فن کار اور قاری کے درمیان مکالماتی رشتے شروع سے آخر تک برقرار رہتے ہیں۔ اور اس کی شدت و تمازت میں کہیں کمی نہیں آتی ہے۔ فنکار اپنی تمناؤں کے طلسماتی رویوں کی نبض پر سبک روی سے اپنی انگلیاں دھرتے ہوئے سچائی کے ساتھ Establish facts کرتا ہوا قاری کے دل و دماغ میں اپنا گھر بنا لیتا ہے۔

اپنی ذات میں گم ۔ کلام حیدری

مشتاق احمد نوری، پٹنہ

کلام حیدری کسی فردِ واحد کا نام نہیں تھا۔

کلام حیدری نام تھا ایک ایسے شخص کا جو اپنی ذات میں خود انجمن تھا جس نے اپنی ذات کے گرد لوگوں کیلئے تالاؤں کا ایک ایسا حصار قائم کر رکھا تھا کہ دوسروں کی رسائی ان تک مشکل سے ہو پاتی تھی۔ کلام اپنے قلم کے تیزابی کیفیت کے لئے بھی مشہور تھے۔ ان کے قلم میں تلوار جیسی دھار تھی اور یہی عادت یہی کیفیت اور یہی اسٹائل ان کی انفرادیت بھی تھی۔

میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ ان کے فن پر گفتگو کروں۔ اس کے لئے ایک سے ایک جغادری نقاد موجود ہیں جنہیں غالب و اقبال اور پریم چند سے فرصت ملی تو ان کے فن پر بھی قلم اٹھائیں گے۔

کلام حیدری سے میری ملاقات دو تین ملاقاتیں ہی رہیں۔ ان ملاقاتوں میں جو میں نے تاثر قبول کیا اسے کم و بیش لکھنا چاہتا ہوں۔ ان ملاقاتوں میں ان کی زندگی کے سارے گوشوں سے واقفیت ممکن نہیں تھی جستہ جستہ جو میرے سامنے آیا وہ پیش ہے۔

سب سے پہلے صبح نو کے کسی خاص نمبر میں میں نے کلام حیدری کی تصویر دیکھی تھی۔ تصویر میں وفا ملک، پوری کے دائیں بائیں کلام حیدری اور علیم اللہ حالی تھے۔

۱۹۷۴ء میں جب میں پٹنہ آیا تو ایک بار حالی صاحب سے ملنے فخر الدین ہاؤس گیا وہیں وارانڈے پر بیٹھے ہوئے میں نے کلام حیدری کو پہلی بار دیکھا۔ یاد پڑتا ہے ہی فنکارانہ رہے تھے خلا میں کچھ تلاش کر رہی آنکھیں۔ اس روز ان سے تعارف نہیں ہو سکا۔

۱۹۷۵ء میں میری پہلی پوسٹنگ کشن گنج میں ہوئی وہیں انسان اسکول میں علی الم سے بھی ملاقات ہوئی ان کے یہاں آہنگ اور مورچہ دیکھنے کو مل جاتا تھا۔ ان سے کلام حیدری کے بارے میں مزید جانکاری ہوئی کہ وہ کس طرح نئے قلم کاروں کی مدد کر رہے ہیں اسی زمانہ میں عبد الصمد بھی گیا میں تھے۔ اور آہنگ و مورچہ کی دو پردہ ان پر ذمہ داری تھی۔ میں نے آہنگ کیلئے کئی افسانے اور غیر ملکی زبانوں کے تراجم روانہ کئے۔ کچھ آہنگ میں شائع ہوئے اور ایک کہانی مورچہ میں آئی میں نے مورچہ میں اشاعت پر اعتراض کیا تو عبد الصمد نے لکھا کہ آئندہ خیال رکھا جائے گا۔ زندہ یار صحبت باقی۔ میں چپ رہا لیکن ایک بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ آہنگ اور مورچہ کے جس شمارے میں میری کہانی

آئی وہ شمارہ مجھے نہیں بھیجا گیا۔ میں نے کلامی بھائی کو
بارہا خط لکھا کہ کم از کم متعلقہ شمارہ ریکارڈ کے لئے رکھنا
ضروری ہے۔ اس پر میرا حق بھی ہے اس لئے بھیج دیں لیکن
انہوں نے کبھی نہیں بھیجا۔ کشن گنج میں شمارہ دستیاب نہیں
تھا کچھ تو علی امام سے میں نے حاصل کئے اور کچھ کا صرف
انفارمیشن ہی دوستوں سے ملا لیکن رسالہ آج تک
نہیں دیکھ پایا۔

انہیں دنوں آہنگ کے فکشن نمبر کا اعلان آیا۔
میں نے بھی ایک کہانی بھیجی اسے کلام حیدری نے منظور کرتے
ہوئے لکھا کہ برادرم اپنی تصویر بھی بھیجئے۔ آپ کی کہانی فکشن
نمبر کے لئے منتخب کر لی گئی ہے۔ میں بہت خوش ہوا اور
تصویر بھیج دی۔

غالباً سن ۱۹۸۰ء کا زمانہ تھا۔ میں کشن گنج سے
ٹرانسفر ہو کر پورنیہ آ گیا۔ اس زمانے میں پبلک ریلیشنز
محکمہ کا اشتہار متعلقہ ضلع سے ہی جاری کیا جاتا تھا۔ کلام
بھائی کا ایک محبت بھرا خط ملا جس کا لب لباب یہ تھا کہ
برادرم آپ جانتے ہیں کہ اس زمانے میں کسی ادبی رسالے
کو زندہ رکھنا کتنا مشکل ہے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے
کہ مورچہ ہی آہنگ کو خون سپلائی کرتا ہے۔ آپ جیسے
قلم کار جب اقتدار کی کرسی پر ہیں تو پھر مورچہ اشتہار
سے کیوں محروم رہے؟

میں ذرا جذباتی قسم کا آدمی ہوں بہت جلد میں
جذباتی فیصلہ کرتا ہوں انہیں فوراً خط کا جواب دیا کہ
پورنیہ تو خیر آپ کا ہے ہی میں سہرسہ سے بھی آپ کو
اشتہار بھجواؤں گا۔ وہاں اتفاق سے کلیم اللہ صاحب
ڈی پی آر او تھے۔ اور کمشنری میں ڈپٹی ڈائرکٹر کے
چارج میں بھی تھے۔ میں نے انہیں خط لکھ دیا۔ بعد میں
کلام بھائی کا شکریہ کا خط آیا جس میں انہوں نے یہ بھی تحریر
کیا کہ مورچہ اور آہنگ کے میلنگ لسٹ میں آپ
اور سہرسہ والے کا نام شامل کر دیا گیا ہے۔ اور خدا گواہ
ہے کہ مورچہ اور آہنگ کا ایک بھی شمارہ دیکھنے کو کبھی
نصیب نہیں ہوا۔ اس دوران سہرسہ سے بھی کلیم اللہ صاحب
کا کئی خط آیا کہ لوزی تم نے جس رسالے کی بات کی تھی
میرا نام بھی میلنگ لسٹ میں شامل ہے، وہ تو آج تک
دیکھنے کو نہیں ملا۔ ظاہر ہے جواب میں خاموشی کے علاوہ
میرے پاس کچھ تھا بھی نہیں۔

اس طرح خط و کتابت ان سے ہوتی رہی۔ اور
فکشن نمبر سے قبل آہنگ کے جو شمارے آئے ان میں فکشن
نمبر کا اعلان بھی ہوتا تھا۔ اور قلم کاروں کی فہرست میں یہ
نام بھی شائع ہوتا رہا۔ ان واقعات کی تفصیل اس لئے
بیان کی کہ کلام حیدری کے لئے میں یا میرا نام اجنبی نہیں
رہا تھا۔

یہ شاید ۱۹۸۱ء کا زمانہ تھا۔ بہار اردو اکادمی
کا دو روزہ سیمینار ہوا تھا۔ میں بھی پورنیہ سے اس میں
شامل ہونے آیا تھا۔ فکشن سیمینار تو واقعی جاندار رہا۔
اس کے ایک سیشن کی صدارت کلام حیدری نے بھی کی تھی
اس وقت ہال میں میں بھی موجود تھا۔ اور مظہر امام، شمس الرحمٰن
فاروقی اور عبدالصمد سے ملاقات بھی کرتا رہا تھا۔ کلام
بھائی جب منچ سے اتر کر باہر تشریف لے جانے لگے تو
لپک کر ان کے پاس گیا۔ اور سلام کرتے ہوئے اپنا نام
بتایا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے سوچا
نام سنتے ہی وہ بہت گرم جوشی سے ملیں گے ممکن ہے اشتہار
کا شکریہ بھی ادا کریں۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ انہوں نے
سے میرے سلام کا جواب دیا اور بغیر رکے چلتے بنے۔ میں
ششدر رہ گیا۔ غصہ کے ساتھ شرمندگی بھی بہت
ہوئی۔ جی میں آیا دوڑ کر ان کا گریبان پکڑ لوں اور د

جھٹکے دے کر بتاؤں کہ میں وہی مشتاق احمد نوری ہوں کہ جس نے ....

اس واقعے نے مجھے اتنا شدید ذہنی جھٹکا دیا کہ میں یقیناً کسی بھی سٹیشن میں نہیں رہا۔ اور لوریہ آنے کے بعد میں نے ایک بے حد تلخ خط انہیں لکھا۔ جس میں پورے واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے یہ بتایا کہ میں کس طرح پٹنہ سے تعارف کا زخم لے کر آیا ہوں میں نے بہت صاف گوئی سے اپنے جذبات کے ساتھ اپنی ناراضگی کا بھی اظہار کر دیا اس کے بعد میں نے انہیں کبھی خط نہیں لکھا۔

پھر کئی ماہ بعد میرا پٹنہ آنا ہوا تو دوستوں نے بتایا کہ آہنگ کا فکشن نمبر آیا ہے ان لوگوں نے کہا کہ آپ تو خریدیں گے ہی، ہم لوگ بھی پڑھ لیں گے۔ میں نے بتایا کہ اس میں میری کہانی شامل ہے اس لئے وہ شمارہ مجھے ملے گا ہی پڑھ لینا۔ شام میں جب بک امپوریم آکر فکشن نمبر دیکھا تو حیرتوں میں ڈوب گیا۔ اس میں میری کہانی شامل نہیں تھی۔ میں نے اس واقعے کا اظہار احمد یوسف سے کیا۔ انہوں نے کہا کہ کمال ہے نوری صاحب! آپ نے کلام کو اتنا تلخ خط بھی لکھا اور یہ امید بھی کی کہ آپکی کہانی شامل رہے گی۔ پھر انہوں نے بتایا کہ میں نے کلام سے صرف اتنا کہا تھا کہ بھائی تمہارے پاس پریس تھا بہت ساری سہولتیں تھیں اس لئے امید تھی کہ نمبر بہت شاندار نکلے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس پر ناراض ہو کر انہوں نے مجھے رسالہ بھی نہیں بھیجا۔

میں نے یہ واقعہ کئی لوگوں کو سنایا لیکن کسی نے بھی حیرت کا اظہار نہیں کیا تب مجھے احساس ہوا کہ شاید دیگر لوگ انہیں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

پورنیہ ۱۹۸۵ء میں سہسرام آگیا۔ وہاں سے گیا قریب تھا۔ سوچا ایک چکر لگا آؤں۔ فروری ۱۹۸۶ء میں گیا پہونچا بڑی مشکل سے سید احمد قادری کے یہاں گیا، معلوم ہوا حضرت پٹنہ میں ہیں۔ اب کہاں جاؤں؟ سوچا جمیل منظر کی تلاش کی جائے وہاں پہونچا تو معلوم ہوا وہ بھی پٹنہ میں ہیں۔ اور رات تک واپس آرہے ہیں۔ بھائی مسعود منظر نے خاطر داری کی اور بتایا کہ میں تنہا جمیل منظر کا انتظار کروں کیونکہ انہیں پارٹی میٹنگ کے لئے جہان آباد جانا ضروری ہے۔ گیارہ بجے رات میں جب جمیل منظر نے ایک اجنبی کو اپنے کمرے میں پایا تو انہیں بہت حیرت ہوئی۔ یہ ہم دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ صبح وہ مجھے لے کر بودھ گیا گئے۔ شام میں دوستوں سے ملاقات رہی دوسرے دن واپس آنا تھا لیکن قادری نے روک لیا۔ دوسری شام علیم اللہ حالی سے ملاقات کے بعد میں قادری اور جمیل منظر کلام حیدری سے ملنے گئے۔ جمیل باہر سے ہی واپس ہو گئے۔ کیونکہ ان دنوں ان کے تعلقات کلام حیدری سے بہتر نہیں تھے۔ وجہ انہوں نے ادریس سہسرامی کی رحلت پر ایک تعزیتی نوٹ آہنگ میں شائع کیا تھا جس میں انہوں نے ادریس مرحوم کو اپنا لنگوٹیا یار کہہ کر ان کی کردار کشی کی تھی۔ اس واقعے نے مجھے اتنا دل برداشتہ کیا تھا کہ میں نے غصے میں آکر ایک کہانی لکھی تھی "تھوک" ان دنوں جمیل سے میری ملاقات نہیں تھی

خیر میں قادری کے ساتھ رینہ ہاؤس گیا۔ اندر کلام حیدری کے ایک ملازم نے اس طرح استقبال کیا کہ محسوس ہوا کہ ان کے یہاں کتا پالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے قادری سے دریافت کیا کہ یہ ملازم آپ کو نہیں پہچانتا۔ انہوں نے بتایا کہ اچھی طرح پہچانتا ہے نہ جانے آج کیوں پاگل ہو رہا ہے۔ ملازم نے بتایا کہ صاحب ابھی باہر سے آئے ہیں اس لئے کسی سے بھی نہیں ملیں گے۔ قادری نے بتایا کہ یہ جو صاحب ہیں وہ کل صبح ہی واپس ہو جائیں گے اس لئے ابھی ہی ملنا ضروری ہے لیکن وہ بھونکتا رہا، غنیمت ہے

کہ اس نے منھ سے نہیں کاٹا۔

ہم لوگ مایوس واپس ہوئے۔ لیکن میں ہی سرکٹ ہاؤس تھا تو میں نے قادری سے کہا کہ وہ فون پر کلام حیدری سے گفتگو کر کے میرے بارے میں بتادیں کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فون کر کے کلام حیدری صاحب کو بتلایا۔

"سہسرام سے مشتاق احمد نوری تشریف لائے ہیں وہاں وہ ڈسٹرکٹ پبلک ریلیشنز آفیسر ہیں۔ کل صبح واپس جانا ہے آپ سے ملنے گئے تھے لیکن نوکر نے بھگا دیا۔"

کلام صاحب نے کہا لیکر آجاؤ میں نوکر سے کہہ دیتا ہوں۔

بہرحال ہم لوگ پھر گئے۔ ایک نوکر نے بہت عزت سے کہا تشریف لے چلئے۔ صاحب انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے اخلاق پر حیرت ہوئی۔ میں نے قادری سے دریافت کیا کہ وہ حرامی نوکر کہاں ہے؟ انہوں نے کہا یہی تو ہے جو استقبال کر رہا ہے میں اسے یوں حیرت سے دیکھنے لگا گویا اسے دم نکل آئی ہو۔ آدمی کس کس طرح رنگ بدل سکتا ہے یہ اسی دن معلوم ہوا۔

کمرے کے اندر گیا تو دیکھا جو نہایت معمولی سے بستر لگے تھے، مچھر دانی گری تھی۔ کمرے کے اندر تازہ فنیٹ کی بو تھی جس سے مجھے شدید الرجی تھی۔ ایک کرسی پر کرتا پاجامہ پہنے منحنی سا ایک شخص نظر آیا۔۔۔ وہ کلام حیدری تھے۔ میں نے سلام کیا اور ادب سے سامنے بیٹھ گیا۔ اور اس انتظار میں رہا کہ میرا مکمل تعارف فون پر کرایا ہی جا چکا ہے۔ اور انہیں معلوم ہے کہ میں ان سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ اس لئے شاید وہ خیریت دریافت کرتے ہوئے پوچھیں گے کہ کہو عزیزم کیسے ہو؟ کیسے آنا ہوا؟ ان دنوں کیا کیا لکھ رہے ہو؟ وغیرہ ــــــ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ میں وہاں تقریباً پون گھنٹے بیٹھا رہا۔ لیکن کلام حیدری ایک بار بھی میری طرف مخاطب نہیں ہوئے اور نہ پورے وقت وہ سید احمد قادری سے گفتگو کرتے رہے۔

وہاں سے واپسی پر ملاقات کا دوسرا زخم لگ چکا تھا اور پٹنہ والی ملاقات کا زخم بھی تازہ ہو گیا تھا میں نے قادری سے ہنستے ہوئے بتایا۔

"ایک دن وہ بھی آئے گا جب کلام حیدری ایک ہاتھ میں لاٹھی دوسرے ہاتھ میں لالٹین لے کر مجھے تلاش کر رہے ہوں گے تب میں انہیں نہیں مل پاؤں گا۔"

اس کے تقریباً سال بھر بعد میری کہانی "سقوک" شائع ہو گئی۔ کلام حیدری نے اپنے وکیل کو بلا کر رسالہ دیتے ہوئے مقدمہ کرنے کی ہدایت دی۔ لیکن وکیل نے کہانی پڑھنے کے بعد مشورہ دیا کہ کہانی میں ایسا کچھ نہیں کہ آپ مقدمہ کر سکیں۔ یہ سچ ہے کہ واقعات و حالات آپ کی زندگی سے مماثلت رکھتے ہیں۔ لیکن صرف اس سے مقدمہ نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے پھر وہ خاموش ہو گئے۔

اسی سال مارچ ۸۶ء میں سہسرام سے سمستی پور آگیا۔ سید احمد قادری بودھ دھرتی مجھے برابر بھیجا کرتے تھے۔ نومبر ۸۶ء کے ایک شمارے میں حصیر نوری کا ایک طویل مراسلہ شائع ہوا۔ اس سے مجھے بھی تحریک ملی اور میں نے بھی کافی طویل خط انہیں لکھا جو انہوں نے ۲۶ جنوری ۸۷ء کے بودھ دھرتی میں شائع کیا۔ میں نے اپنے خط میں تفصیل سے اس بات پر روشنی ڈالی تھی کہ ہم بہار والے صرف اپنوں کا جڑ کاٹنے میں معروف رہتے ہیں میں نے یہ بھی لکھا تھا:

"شاد عظیم آبادی، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، انجم مانپوری، سہیل عظیم آبادی اور غیاث احمد گدی کا نام ان لوگوں میں شامل ہے جن پر اردو دنیا فخر کر سکتی ہے جب تک اردو زبان زندہ رہے گی یہ

"یہ نام بھی زندہ رہیں گے۔ مگر علاقائی تعصب
اور دیگر وجوہات کی بناپر بہت سے رسائل
نے انہیں نظر انداز کیا"
میں نے یہ بھی سوال اٹھایا تھا کہ:
"اس بات پر بھی غور کرنا ہوگا کہ ایسا کرنے میں
ہم بہاریوں کا کتنا ہاتھ ہے کیا ہم کسی بھی طرح
اس کے ذمہ دار نہیں"؟
"بہار کے کتنے ناقدوں نے اپنے صوبے کے
قلم کاروں پر قلم اٹھایا، گھر کی مرغی دال برابر
سمجھتے ہوئے انہیں اس لائق نہ سمجھا کہ ان
کے فن کا جائزہ بھی لیا جائے۔ ہاں جن سے
لوگوں کا اثر تھا، پہنچ تھی، خاص حلقوں تک
رسائی تھی ان لوگوں پر مضمون لکھے گئے
ان کے فن کی خوبیاں تلاش کی گئیں، ان پر
نمبر نکالے گئے اور دوستی کا انعام دیا گیا۔
اسی ضمن میں میں نے غیاث احمد گدی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا
تھا (ان کی موت تازہ تھی)
"جو لوگ ان سے قریب تھے ان لوگوں نے بھی
ان پر توجہ نہ دی، گیا سے نکلنے والے ایک
رسالے کے مالک نے جو ان کے دوست
بھی تھے، انہوں نے اپنے رسالے کا نمبر تو
درکنار غیاث احمد پر ایک تعزیتی نشست
بھی نہ کی"
اور بھی دیگر حقائق پر میں نے روشنی ڈالی تھی۔ نشانہ کوئی
خاص آدمی نہیں تھا بلکہ ایک خاص سچائی تھی جس کی نشاندہی
میں نے کی تھی۔ اس خط کو پڑھ کر کلام حیدری بہت ناراض
ہوئے اور انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بودوباش دھرتی
کو ایک خط لکھا۔ آپ بھی لطف لیں۔

عزیزم قادری
بودوباش دھرتی بھیج کر احسان کرتے ہو۔
جب نہ مورچہ ہے اور نہ آہنگ۔ تب بھی
ایک شمارہ کا نقصان مجھ جیسے گیا سے نکلنے
والے ایک رسالے کے مالک" کے لئے
برداشت کرتے ہو۔ میں ایک رسالے کا
مالک اور غیاث احمد گدی کا استحصال کرنے
والے کے علاوہ کیا ہوں؟ کہ غیاث کے
مرتے ہی دم دبا کر بھاگ گیا۔ اور اس سے
دوستی ہونے پر بھی اس نابکار مالک رسالہ
نے اس پر نمبر نکالنا تو درکنار رسالہ ہی بند
کر دیا کیونکہ جب غیاث ہی نہیں رہا جس کا
استحصال کر کے میں رسالہ نکالا کرتا تھا
تو پھر رسالے کا مالک کیونکر بنا رہتا؟
اللہ اکبر۔
کوئی تم کو اشتعال دلا رہا ہے یا ترغیب
دے رہا ہے" اب وقت سوچنے کا نہیں
بلکہ کچھ کر گذرنے کا ہے، کیونکہ آپ کے
پاس آرگن ہے"۔ اب کسی سمجھدار کو تم ہی
سمجھاؤ کہ رسالہ آرگن کہلا سکتا ہے مگر
ماؤتھ آرگن نہیں، جن کے پاس آرگن نہیں
ہیں وہ دوسروں کے آرگن کو اپنا لاؤڈ اسپیکر
بنا سکتے ہیں مگر رسالے کے جس مالک نے
نئے فنکاروں کی رہنمائی کی وہ استحصال
کرتا رہا غیاث احمد گدی کا۔ اللہ اکبر۔
وہ ہیں مشتاق اور ہم بیزار!
کیا کروں شعر مجھے غلط یاد رہتا ہے یہ تو خیر
ایک مصرع ہے، اپنے ہفتہ وار کو تنہا بھی

آرگن نہ بننے دو کیونکہ ڈکشنری میں آرگن کے کئی
معنی ہیں بلکہ آرگن کہنے بھی مت دو، کون
جانے کون کس معنی میں تمہارے ہفتہ وار کو
آرگن کہہ رہا ہے۔
خدا سب کو خوش رکھے کیونکہ خوش رکھنے پر
وہی قادر ہے۔" کلام حیدری

اس خط کے اشاعت کے بعد کلام حیدری کو توقع تھی
کہ میں جواب ضرور دوں گا وہ بار بار قادری سے دریافت
کرتے رہے کہ میرا جواب آیا یا نہیں۔ میرا جواب بودھ دھرتی
کے ۱۰ مئی ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ ملاحظہ ہو۔

بھائی قادری : ہدیۂ خلوص
آپ واقعی قیامت کے نام سے شائع کرتے
ہیں اور لوگوں پر قیامت برپا کر دیتے ہیں
ایک قیامت کا نام آپ نے میرا بھی شائع کیا
تھا اور اپنے نوٹ میں لکھا تھا (اس خط کو)
اس امید پر شائع کیا جا رہا ہے کہ اس خط کی
باتوں کو وسیع تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی
جائے گی۔" لوگوں نے آپ کے نوٹ کو اچھی طرح
سمجھا اور قلب میں وسعت پیدا کی اور کافی
وسیع تناظر میں اسے سمجھنے کی کوشش کی۔
سبحان اللہ!

غیاث احمد گدی کے بارے میں میں نے
بالکل سچ کہا تھا کہ اور وہ بات کسی خاص
آدمی کے لئے نہیں تھی پھر دہراؤں۔ "بہت
سے لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا، ان کا
استحصال کیا گیا اور جو لوگ ان کا دم بھرا
کرتے تھے ان کے مرتے ہی دم دبا کر بھاگ نکلے۔"
یہ ایک ایسا سچ ہے کہ میں اسے ہزار بار دہرانے
کو تیار ہوں۔ میں نے کسی کا نام لیا تھا اور
نہ ہی اشارہ کیا تھا۔ ان "بہت سے لوگوں"
میں کون کون ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ
مجھے قطعی نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس کی فہرست
میرے پاس موجود تھی مگر آپ نے قیامت
کے نام سے فہرست میں پہلا نام خود ہی
جوڑ دیا ہے۔
سبحان اللہ! اسے کہتے ہیں وسعت نظری
اور یہ ہے مثال وسعت قلبی کی۔
"گیا سے نکلنے والے رسالے کے مالک"
پر میرا الزام صرف یہ تھا کہ "اس رسالے
کے مالک نے بھی ان پر نمبر نہ نکالا" کہیں مجھ
سے غلطی ہو گئی؟ اگر یہ غلطی ہے تو خدا ایسی
ہزار غلطیاں کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔
بھائی قادری۔ یہ غیاث کا حق تھا مگر
وہ اس حق سے محروم رہا۔ مگر واہ رے
غیاث ـــ تم بھی خوب نکلے ـــ تم نے
تو مر کر بھی اپنی وفاداری کا ثبوت دیا،
اور اپنا "سارا دن دھوپ" دوسروں
کے نام کر کے خود سائے سے لپٹ کر سو گئے
(غیاث کا آخری افسانوی مجموعہ سارا
دن دھوپ کلام حیدری کے نام منسوب ہے)
سبحان اللہ!
اور ہاں بھائی! آپ کو "بزرگوں" کا
مشورہ ضرور قبول کرنا چاہئے کیونکہ "مشورہ"
کے بغیر آپ زندہ بھی تو نہیں رہ سکتے۔ ہم
میں اور بزرگوں میں بہت فرق ہے بھائی

ہم جھانک بھی لیتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ جونک بھی دیتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
اصل شعر پڑھ جائیے ۔ زمانہ اصل کا نہیں
رہا۔ اس لئے میں نقل شعر ہی یاد رکھتا
ہوں ۔ رہی بات آرگن کی تو واقعی آپ اپنے
اخبار کو آرگن نہ بننے دیں۔ کیونکہ انگریزی
ڈکشنری میں آرگن کے کئی معنی ہوتے ہیں،
کون جانے کون کس معنی میں آپکے ہفتہ وار
کو آرگن کہہ رہا ہے ۔ اگر آپ نے مشورہ نہ
مانا اور اسے اپنا آرگن بنا ہی دیا تو پھر آپ
بھی اپنے اداریوں میں دوسروں سے دشمنی
نبھائیں گے انہیں گالیاں دیں گے" ایک
تعزیتی نوٹ لکھ کر اپنے یار کی بخیہ ادھیڑ کر
خوش ہوں گے کہ چلو یاری نبھا دی ۔
اس لئے بھائی" دوسروں" کے ترغیب
دلانے یا اشتعال دلانے پر کچھ نہ کریں ،
کیونکہ واقعی لوگوں کے لئے اب وقت سوچنے
اور کچھ کر گذرنے کا نہیں ـــــ بلکہ صبر
کرنے کا رہ گیا ہے ۔
اللہ سب کو صبر کی توفیق عطا کرے کیونکہ
وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۔

مشتاق احمد نوری

اس خط کی اشاعت سے قبل کلام حیدری نے
اسے پڑھا اور قادری سے دریافت کیا کہ اسے شائع کرو گے؟
قادری کا جواب تھا ۔ ادبی دیانت داری تو یہی ہے "
پھر وہ خاموش ہو گئے ۔ اور میرے خط کا جواب نہیں دیا ۔
اس کے بعد ایک لمبے عرصے تک ان کے بارے میں
مجھے کوئی جانکاری نہیں ملی ۔ میں نے اردو اکادمی میں کرشن

کے عہدے پر جوائن کیا شروع ہی میں محترم غلام سرور صاحب
سے بھی خط و کتابت ہو گئی جو اخبار کے ذریعہ ہزاروں
لوگوں تک گئی بہت سے لوگوں نے تراشے دہلی تک بھیجے
کلام حیدری دہلی میں ہی تھے ۔ انہوں نے ایک خط لکھا۔ میرا
نام کہیں نہیں تھا لیکن خط میرے لئے ہی تھا کیونکہ آخری جملہ
یہ تھا کیا پتہ آپ مجھے جانتے ہوں، میں تو پورے پٹنہ سے محبت
کرتا ہوں، پورا خط یہ ہے ۔

۹۳،۶،۲۰

محترم ! تسلیم

کہیں سے "زبان و ادب" مل گیا ، مظفر
نواب صاحب کی آپ بیتی کی دوسری قسط
پڑھنے کو ملی ۔ نواب صاحب کو میں تو ذاتی
طور پر بڑی عزت کرتا ہوں ۔ اور ان کی علمی
استعداد کا بھی قائل ہوں ۔ مگر تحریر کے
جادو کا تجربہ نہیں تھا ۔ ان چند دورائیں کو
پڑھ کر بہت مسرت ہوئی کہ میں نے جن کا شخصی
طور پر احترام کیا وہ اپنی تحریر سے بھی لائق
احترام ہے
خدارا پوری کتاب کا مسودہ حاصل کیجئے اور
اکیڈمی سے شائع کیجئے ۔ میں سنہ ۹۲ء اکتوبر
میں یہاں آیا نومبر میں شدید HEART
ATTACK ہوا ۔ پھر "بائی پاس" سرجری
یہاں سے اتنے دنوں دور رہنے کی وجہ کر
بہت سی باتوں سے بے خبر ہوں ۔
کیا پتہ آپ مجھے جانتے ہوں، میں تو پورے پٹنہ
سے محبت کرتا ہوں " آپ کا

کلام حیدری

ان کے خط سے ان کا دہلی کا پتہ معلوم تھا ۔ میں نے فوراً

حاصل کیا اور انہیں برابر زبان و ادب کا شمارہ بھیجواتا رہا پھر وہ گیا آگئے ۲۴ اگست ۱۹۹۳ء کو انہوں نے ایک خط لکھا جو اکادمی کے ایک اسٹاف عبدالسلام ملک کے لئے تھا خط کے اخیر میں یہ جملہ تحریر تھا۔

"اب میں انسانیت کے تقاضے آپکو کیا یاد دلاؤں"

چونکہ انہیں حقیقت کا علم نہیں تھا اس لئے انہیں اس اسٹاف کے سلسلے میں غلط فہمی ہوئی تھی۔ ان کا خط ملنے کے بعد میں نے، ستمبر ۹۳ء کو ان کو فون کیا اور ان کے خط کا جواب دیتے ہوئے انہیں حقیقت بتا دی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے میری باتوں پر رضامندی ظاہر کی۔

ایک رات احمد یوسف صاحب کا فون آیا انہوں نے بتایا کہ کلام حیدری آئے ہوئے ہیں وہ مجھ سے ملنے اکادمی گئے تھے لیکن ملیں نہیں تھا۔ میں نے پوچھا وہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ خدا بخش لائبریری کے گیسٹ ہاؤس میں۔

میں نے دوسرے دن وہیں جاکر ان سے ملنے کا ارادہ کیا۔ اکادمی آنے کے بعد میں وہاں جانے ہی والا تھا کہ دیکھا کلام حیدری میرے چیمبر کے دروازے تک آپہونچے ہیں۔ میں لپک کر اٹھا اور ان کے پاس جاکر انہیں عزت سے لاکر بیٹھایا۔ مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ وہ اندر ہی اندر مجھ سے ناراض ہوں گے لیکن انہوں نے اتنی شفقت کا اظہار کیا کہ میں اندر ہی اندر پانی پانی ہوتا رہا۔

وہ بیٹھے رہے میرے کام کرنے کی تعریف کرتے رہے اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ پھر سینہ کھول کر دکھایا کہ کس طرح ان کی بائی پاس سرجری ہوئی۔ کہاں کہاں سے رگ نکالے گئے۔ نکوٹین کا اثر کہاں ہوتا ہے۔ غرض کہ اتنا چاک و چوبند میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔

ادب پر گفتگو ہوئی۔ کلیم الدین احمد کا ذکر نہ جانے کس طرح نکل آیا۔ انہوں نے فرمایا کہ کلیم الدین احمد نے تو بہت مروت سے کام لیا۔ اور غزل کو نیم وحشی صنف قرار دیا۔ اگر میں ہوتا تو اسے مکمل وحشی صنف قرار دیتا۔ انہوں نے کہا ڈانس آپ نے دیکھا ہے کیا اس میں وحشت نہیں ہے؟ اس کے سُر تال ہیں، اسی پر وحشت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح غزل بھی اپنی سُر تال سے بندھی ہے، پابند بھی ہے اس لئے یہ وحشی ہے۔ اسی طرح بہت سی باتیں وہ کرتے رہے اور میں فرمانبرداری والے اسٹائل سے صرف سر ہلاتا رہا، کیونکہ میں ان کے اتنے اچانک مشفق رویے میں تبدیلی نہیں چاہتا تھا جو میرے لئے سخت غیر متوقع تھا۔

میں انہیں نیچے تک چھوڑنے جانا چاہتا تھا لیکن انہوں نے سیڑھی سے ہی مجھے لوٹا دیا۔ میں نے پوچھا۔

میں نے پوچھا کلام بھائی، آپ زبان و ادب کے لئے کیا بھیج رہے ہیں؟" بولے

سوانحی حصہ ہی بھیجوں گا۔ کلکتہ والا حصہ بھیجوں گا۔ قارئین کو لطف آئے گا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جلدی بھیجئے گا۔ میں ریمائنڈر کا عادی نہیں ہوں"

ہنسنے لگے، پھر بولے۔

"نہیں بھائی! بھیجوں گا اور ضرور بھیجوں گا۔"

پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ یہاں سے میری آخری ملاقات ہوگی۔

پھر میں نے ایک پروگرام بنایا کہ اکادمی کی طرف سے "ایک شام کلام حیدری کے نام" منایا جائے گا اور ساری تیاری کرنے کے بعد انہیں بلاؤں گا اور اچانک انہیں سرپرائز دوں گا۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ کلام حیدری نام تھا اس شخص کا جو زندگی بھر دوسروں کو سرپرائز دیتا رہا وہ مجھے، ہمیں بلکہ سارے زمانے کو سرپرائز دے گیا۔

ان کے جانے کے بعد کئی بار ان سے فون پر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ کئی چیزیں تیار ہیں۔ وہ صاف نہیں کر پا رہے ہیں اس لئے تاخیر ہو رہی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ ویسے ہی بھیج دیں میں خود صاف کرا لوں گا۔ بولے۔ صاف کرتے وقت میں بہت سی تبدیلی کر دیتا ہوں۔ اس لئے یہ تو مجھے ہی کرنا ہے۔

مرنے سے پندرہ بیس روز قبل ان کا ایک خط آیا، لکھا تھا۔

گیا۔ ۷ر ار ۹۴ء

برادرم! میں آپ سے شرمندہ ہوں کہ زبان و ادب کے لئے کچھ نہ بھیج سکا۔ دراصل جو چند کہانیاں لکھی ہیں ان کو پھر سے دیکھنا ضروری ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں کسی اور سے بھی صاف کرا لیتا اور آپ کو بھیج دیتا یہ بات بھی آپ کو دیر سے لکھ سکا۔

برادرم! صمد سے ملاقات ہو تو ان کو دعائیں کہیئے۔ آپ کے زیر اہتمام زبان و ادب میں جو بہتری آئی ہے وہ آپ کا حسنِ نظم اور سحر ذوق ہے۔ اس میں نکھار آتا جائے یہ میری خواہش اور دعا ہے۔ کام آپ کر سکتے ہیں یہ مجھے مختلف طریقوں سے معلوم ہو جاتا ہے اور میں خوش ہوتا ہوں۔

آپ کا۔ کلام حیدری

میں سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی چیزیں ضرور بھیجیں گے۔ وہ اپنی سوانح کے ساتھ ناول کے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے اس پر علیم اللہ حالی سے ان کی گفتگو بھی ہوئی تھی لیکن قدرت کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔ ان کی زندگی کے بہت سے گوشے میری پہنچ سے دور تھے لیکن میں نے ذاتی طور پر جب جیسا پایا اسے پوری ایمانداری سے تحریر کر دیا ہے۔

ان سے آخری ملاقات ۔ ان کا محبت بھرا سلوک اور ان کا وہ بڑکپن میں شاید کبھی بھول نہیں پاؤں گا۔ انہوں نے اپنے اس سلوک سے مجھ پر اپنے کردار کا ایک ایسا راز منکشف کر دیا تھا جو میرے لئے اجنبی تھا۔ بڑے لوگ واقعی بڑے ہوتے ہیں، ان کے ہر انداز سے انفرادیت جھلکتی ہے۔ کلام حیدری نے بھی آخری دم تک اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔

ضمیمہ: کلام حیدری کی تنقید نگاری

تنقیدی اصول و ضوابط کے اثرات قائم رہتے ہیں۔ مغربی افکار کا سیل رواں جب دنیائے ادبیات کو سیراب کرنے لگا اور تنقیدوں کے نئے ابواب روشن ہوئے تو اردو تنقید بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی نتیجے کے طور پر کئی اہم ناقدوں کے خیالات نے ادب کی نئی سمت و جہت کا تعین کیا۔ کلام حیدری صاحب کو ان میں یقیناً شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے یہاں جھنجھلاہٹ اور اضطراب نہیں ہے۔ لفظوں کی آرائش خیالات کو دقیع بنا دیتی ہے۔ اور ان کے تنقیدی تیکھاپن اور ایسی بے باکی ہے جو پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ وہ موضوع کی روح میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور فن کی زیریں لہروں پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایسے تماشائی کی نہیں جو کی لہروں کا معائنہ کرتا ہے۔ اور خط اٹھاتا ہے بلکہ ایک ایسے غواص کی ہے جو غوطے لگاتا ہے اور کسی اہم موتی کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے انکا انداز نقد ای ڈگر پر چلتا رہا اور افسانے کے ساتھ ساتھ تنقید پر توجہ دی تو اردو ادب مستفیض ہوتا رہے گا۔ اور ہم ان کے بلند و وسیع اور فکر انگیز خیالات سے روشن ہوتے رہیں گے۔

With Best Compliments From :-

EXEMPLAR CHEMICALS

7 - Karbala Mohammad Street

CALCUTTA - 700 001.

Cable - EXEMPLAR





254521-255490-254846 (Office)

483110-483265-484517 (Residence)

کلام حیدری شخصیت اور کردار

شمس جمال، ارریہ

ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج ارریہ کے چیمبر کے باہر اچانک اردو کے دانشور افروز عالم صاحب ایڈوکیٹ ملے انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ آپکو کچھ نہیں معلوم —— میں پریشان ہوا نہ جانے کیا بتائیں گے۔

"کلام حیدری دل کے دورہ کا شکار ہو گئے"

یہ کہہ کر افروز عالم صاحب آگے بڑھ گئے۔ دوپہر کے ٹھنڈی دھوپ میں بڑھتی ہوئی تمازت کا احساس ہوا۔ ارد گرد کا ماحول گویا زہر آلود ہو گیا۔ اور پھر وہ دوپہر مجھے اندھیرا سا لگا۔ سورج کی روشنی مدھم سی نظر آنے لگی۔ میں اپنے چیمبر میں واپس آیا تو "ہندوستان ٹائمز" کے کالم میں پڑھا کہ کلام حیدری اب اس دنیا میں نہ رہے۔ ہندوستان کی ایک عظیم ادبی شخصیت خلاؤں کی بے نام گلیوں میں کھو گئی!

سرزمین بہار کی نمائندہ ادبی شخصیت شاہ جمیل نے مجھے کہا کہ آپ اپنے تاثرات کلام حیدری کے بارے میں لکھیں تو میں یہ سوچنے لگا کہ غم کی داستان لکھوں یا کلام حیدری کا نوحہ، یا پھر یاد ماضی کے ان لمحات کو سپرد قلم کروں جو کلام حیدری سے وابستہ ہیں اور بہت ہی حوصلہ افزا اور جاں گداز بھی ہیں۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ سرزمین جہان آباد کے صوفی منش پروفیسر فضل امام صاحب پٹنہ کالج کے شعبۂ اردو صدر تھے۔ وہ ایک دن ایک اجنبی شخصیت کے ہمراہ اردو ٹیوٹوریل کلاس میں آئے۔

"یہ کلام حیدری ہیں آپ لوگوں کے نئے پروفیسر" جسمانی اعتبار سے ہلکی سی شخصیت، کرتہ، پائجامہ اور شیروانی میں ملبوس۔ مجھے یہ شخصیت عجیب سی لگی میرے ہم جماعت صدر العالم نے کلاس کے اختتام پر کہا کہ یہ مولوی لگتے ہیں۔ اب ہمیں وعظ و نصیحت کے درمیان جینا ہوگا۔ میں ان کی بہت ساری کہانیاں بیسویں صدی دلی وغیرہ کے جرائد میں پڑھ چکا تھا۔ ان کہانیوں کے پس منظر میں ان کی شخصیت بڑی عجیب سی لگی تھی۔ اس یادگار دن کی شام کو میں اور صدر العالم نے فیصلہ کیا کہ اپنے نئے پروفیسر کا انٹرویو لیا جائے۔ پروفیسر فضل امام نے ان کی رہائش کا انتظام خود میں مدھو بنی مسجد سے متصل ایک کھپر پوش مکان میں کیا تھا ہم وہاں پہونچے اور کمرے میں بیٹھے تو دیکھا کہ ایک چھوٹی سی چوکی پر بستر ہے اور کمرے میں چاروں طرف کتابیں ہیں، رسالے ہیں، اخبارات ہیں، قلم اور کاغذات ہیں —— ہم گئے تو تھے بڑے طمطراق کے ساتھ! مگر رسمی جملوں کے علاوہ اور کچھ نہ بول پائے۔ ان کی شخصیت پورے ماحول میں چھائی ہوئی محسوس ہوئی۔

آپ اردو کتابیں پڑھتے ہیں ؟

یہ سوال عجیب سا لگا۔ اردو ہمارے آباؤ اجداد کی زبان ہے۔ اردو کے ماحول میں ہماری نشو و نما ہوئی ہے، مگر میں نے سوچا یہ کوئی جواب نہیں ہے۔ وہ ہمیں تکتے رہے تھے نگاہوں کی وہ حرارت آج بھی محسوس ہو رہی ہے۔ میں نے کہا۔ 'دراصل ہم اردو ادب و شاعری کی گہرائیوں میں جھانکنا چاہتے ہیں۔' انہوں نے اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا اور ہمیں مشورہ دیا کہ ادب و شاعری کی تفہیم اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک مطالعہ وسیع تر نہ ہو۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد یہ حالت تھی کہ تقریباً ہر شام کلام حیدری کی قیام گاہ پر کسی نہ کسی نوعیت کی ادبی نشست ہونے لگی۔ جس میں ہر زبان کے ساہتیہ پریمی اساتذہ و طلبا شریک ہوا کرتے تھے۔ ایسی تربیت اب کالج و یونیورسٹی اساتذہ کے ہاتھوں کہاں ہوا کرتی ہے۔

پورنیہ میں آل انڈیا نکہت کلب الہ آباد کی ایک شاخ قائم تھی جس کا میں جنرل سکریٹری تھا۔ نکہت کلب میں قومی سطح پر ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، اجمل اجملی، جمال رضوی اور عباس حسینی (مدیر ماہنامہ نکہت الہ آباد) وغیرہ بھی شامل تھے۔ میں آل انڈیا نکہت کلب کا نائب صدر تھا۔ پورنیہ میں نکہت کلب کی باضابطہ ادبی بیٹھک ہر ہفتہ ہوا کرتی تھی۔ میں نے کلام حیدری سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا یہ تو آپ لوگ بڑا ادبی کام کر رہے ہیں۔ میں ہر پروگرام میں ضرور شامل رہا کروں گا۔ نکہت کلب کی تمام نشستوں میں وہ شامل رہا کئے۔ ان نشستوں میں مضامین، کہانیاں، پڑھی جاتی تھیں اور شعر و اشعار اور نظموں کی محفلیں جمتی تھیں۔ جن میں انتظار عالم (جو پرنسپل مارواڑی کالج کشن گنج ہوئے) طلعت محمود (جو مشہور ایڈووکیٹ کٹیہار ہوئے) اور صدر العالم جو بہار ہینڈلوم انڈسٹری کو ایک نئی دشا دینے والے ہوئے) وغیرہ شامل

ہوا کرتے تھے ہر ایک تخلیق پر بحث ہوتی تھی اور آخری خطبہ کلام حیدری کا ہوتا تھا۔ اور اس سے نئے لکھنے والوں کو نئی دشا ملتی تھی۔

پروفیسر فضل امام بھی ان محفلوں میں شامل ہوا کرتے تھے مگر کلام حیدری کے تصورات سے انہیں ہمیشہ اختلاف رہا۔ ایک دن پروفیسر فضل امام نے مجھ سے کہا کہ یہ ادبی سرگرمیاں تو ٹھیک ہیں مگر ایسا لگتا ہے کہ کلام حیدری ایک کمیونسٹ ہیں۔ میں ایک صوفی منش ہوں، مجھے الگ رکھا کیجئے۔ اس بات کی خبر کلام حیدری کو ہوئی تو انہوں نے پروفیسر فضل امام سے کہا کہ اگلی نسل کو ترقی پسندی کی راہ سے الگ نہ کیجئے۔ ورنہ یہ لوگ رجعت پرستی، فرقہ پرستی اور بنیاد پرستی کے شکار ہو جائیں گے۔ پروفیسر فضل امام اس بات پر خاموش ہو گئے۔ اور حسب سابق نکہت کلب کی ادبی محفلوں میں شامل ہو کر ہماری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

اس سلسلے میں ایک بات جو مجھے یاد آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ بہار کے مشہور محقق اور صحافی جناب اکمل یزدانی نے کشن گنج سے انہیں دنوں ماہنامہ 'ساحل' کا اجرا کیا تھا۔ جس کی ایک اشاعت میں میری نظم 'اردو' چھپی تھی۔ میں نے خوش خوش ماہنامہ ساحل کا وہ نمبر کلام حیدری کو اس آرزو کے ساتھ دکھایا کہ وہ میری مطبوعہ نظم کو دیکھ کر خوش ہوں گے مگر وہ تو مجھ پر برس ہی پڑے اور کہا کہ 'ساحل' جماعت اسلامی کا آرگن ہے اور اس میں میرے شاگرد کا کلام چھپے یہ میرے لئے انتہائی تکلیف دہ بات ہے۔ میری ساری خوشیاں ہرن ہو گئیں اور اس کے بعد میں نے اس رسالے کے لئے کچھ نہیں لکھا۔ حالانکہ اکمل یزدانی سے میرے دیرینہ تعلقات تھے اور اب بھی ہیں۔

میری کہانیاں بیسویں صدی دلی۔ صبح نو پورنیہ اور سہیل گیا وغیرہ جرائد میں چھپتی رہیں۔ اور جب ہر اشاعت

پر مجھے مبارکباد دیتے رہے۔

پورنیہ سے اس زمانے میں ماہنامہ صبح نو جناب وفا ملک پوری نکالتے تھے۔ جناب وفا ملک پوری کی خواہش پر کلام حیدری صبح نو کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہو گئے اور صبح نو کی چمک دمک میں بہت ہی گرانمایہ اضافہ ہوا۔ بعد میں صبح نو کا دفتر پٹنہ میں منتقل ہو گیا۔ اور علیم اللہ حالی بھی اس سے منسلک ہو گئے۔

ہندی داں حلقے میں بھی کلام حیدری کی ادبی پہونچ بہت دور تک تھی۔ اردو زبان و ادب کی آبیاری کے علاوہ انہوں نے ہندی زبان و ادب کو بھی پورنیہ میں ایک نئی دشا دی۔ پروفیسر لکشمی نرائن شرما کیساتھ مل کر انہوں نے ہندی جریدہ "دھرتی" کا اجرا کیا۔ پورنیہ سے۔ جو ایک عرصے تک نکلتا رہا۔ اور پھر اپنی یاد چھوڑ کر ماضی کے نہاں خانوں میں گم ہو گیا۔

۱۹۵۳ء کی بات ہے کلام حیدری نے خواہش ظاہر کی کہ پورنیہ میں ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرہ ہو۔ میں راضی تو ہو گیا مگر ان سے کہا کہ یہ بڑا معاملہ ہے کیسے ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ نکہت کلب کی میٹنگ میں فیصلہ کرو۔ شاعروں کی ذمہ داری میرے سر رہی۔ اس زمانے میں محمد سلیمان پورنیہ کالج کی اردو سوسائٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔ اور میں جوائنٹ سکریٹری تھا۔ ان سے مشورہ ہوا تو وہ راضی ہو گئے۔ نکہت کلب کی میٹنگ میں فیصلہ ہوا۔ اور صدر العالم، آل احمد مومن طلعت محمود، النظا رعالم وغیرہ پروگرام کو کامیاب بنانے پر کمربستہ ہو گئے۔ اور پورنیہ کی سرزمین میں پورنیہ فیشکنگ سنگھ کے احاطے میں پہلی بار ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرہ ہوا۔ جس میں اس دور کے مشہور شعراء قاسم شبیر نقوی، حسن نعیم وفا ملک پوری اور راہی معصوم رضا وغیرہ شامل ہوئے۔ راہی معصوم رضا اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ مگر ان کے اشعار جو انہوں نے پورنیہ کے اس یادگار مشاعرہ میں پڑھے تھے اب تک ذہن میں گونج رہے ہیں ؎

ایک نیتا ہے تقریر کے لئے
ایک نیتا ہے تصویر کے لئے
اور جنتا ہے فقط زنجیر کے لئے

یہ ۱۹۵۳ء کی بات تھی اب جنتا حلقۂ زنجیر میں ہو نہ ہو مگر جنتا ہر لمحہ گولیوں کی زد میں ضرور ہے۔

عجیب وہ دن تھے۔ پورنیہ کالج میں ایک سے ایک منتخب لوگ تھے۔ پرنسپل جنار دھن پرشاد دویج (ہندی اور کے عظیم ادیب و شاعر) وائس پرنسپل پروفیسر دنیشور مشر (جو بعد میں للت نرائن مشر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے) ہندی شعبہ کے مایہ ناز صدر پروفیسر جنگالی پرشاد سنگھ، شعبۂ فلسفہ کے صدر پروفیسر لکشمی نرائن شرما، شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر فضل امام وغیرہ قابل قدر اسٹاف میں شامل تھے وہ سبھی سوائے پرنسپل دویج کے کلام حیدری کی کھپڑ پوش رہائش گاہ پر سر شام جمع ہوا کرتے تھے۔ اور مختلف زبانوں و شعبۂ حیات کے مسئلوں پر بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا ایسی محفلوں میں کلام حیدری کی شخصیت ایک نمائندہ کردار کی حیثیت سے ابھرتی تھی مجھے آج یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اگر یہ ماحول مجھے نہیں ملتا تو شاید آج میں جو کچھ بھی ہوں وہ نہیں ہوتا۔

انہیں دنوں کی بات ہے ایک بار کسی سلسلے میں مجھے پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر علامہ جمیل مظہری اور پروفیسر اختر اورینوی سے پٹنہ میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے ان یادگار زمانہ ہستیوں سے کلام حیدری سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا تو انہوں نے مسرت ظاہر کی اور ادب کی دنیا میں کلام حیدری کی انفرادیت کا اظہار کیا۔ اور ایک دن پٹنہ کے شاد ہوٹل میں شکیل الرحمن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں تنقیدی مضامین وہ بہت لکھا کرتے تھے وہ کلام

حیدری سے ادبی بغض رکھتے تھے۔ ان کا رویہ مجھے اچھا نہ لگا۔ جس کا اظہار میں نے کلام حیدری سے کیا تو انہوں نے کہا تھا کہ ادب کی دنیا میں کچھ لوگوں کا احتجاجی رویہ ہوتا ہے۔ جس میں سنجیدگی کا عنصر نہیں ہوتا۔ شکیل الرحمٰن صاحب وائس چانسلر ہونیکے علاوہ بھارت سرکار کے منتری بھی ہوئے لیکن اس کے باوجود میں محسوس کر رہا ہوں کہ کلام حیدری کی شخصیت ایک مینارہ بلندی ہے وہ چاہتے تو کچھ بھی ہو سکتے تھے۔ مگر ان کی انا نے انہیں کبھی اس کی اجازت نہیں دی کہ کہیں سر جھکا کر کوئی مرتبہ حاصل کیا جائے۔

غالباً ۱۹۵۵ء یا ۱۹۵۶ء کی بات ہے میں نے کلام حیدری کی شخصیت و کردار پر ماہنامہ صبح نو میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں میں نے ان کی زندگی کے دوسرے بہت سارے پہلوؤں کو اجاگر کیا تھا۔ میرا وہ مضمون وہ پڑھ کر مسکرائے تھے حالانکہ کچھ نکتوں پر وہ مضمون تیکھا تھا۔ اور آج جب میں کلام حیدری سے وابستہ عہد رفتہ کے دوسرے پہلوؤں کو قلمبند کر رہا ہوں تو وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ لیکن جس دور کی بات میں لکھ رہا ہوں اس دور میں کلام حیدری کے برادران عزیز فیاض حیدری اور آصف حیدری بھی پورنیہ میں زیر تعلیم تھے اور ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ شاہدہ خیر اسی دور میں شاہدہ حیدری ہوئی تھیں۔ انہوں نے پورنیہ کی سرزمین میں کبھی قدم نہیں رکھا۔

نہ جانے میرے اس مضمون کو پڑھکر شاہدہ حیدری فیاض حیدری اور آصف حیدری کا ردعمل کیا ہوگا۔ میں اس مضمون کا اختتام اردو کے معروف شاعر جناب شاہد جمیل کے اس شعر پر کر رہا ہوں ؎

بھٹکتی پھرتی ہیں یادوں کی کشتیاں کیا کیا
عجب ہے دل کا سمندر کہ راستہ ہی نہیں

ــــ ۰ ــــ

بقیہ: کلام حیدری ۳۱۲ کا

ایک ایسی تپک آمیز بات نظر آتی ہے جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا، اس دنیا میں زندہ رہ جائے گا۔ وہ اچھا بھلا لڑکا ہے۔

چندر کا سنگھ میرے ساتھ ہی چلا آیا اور سریش کو لے کر ابن آباد چلا گیا۔ میں بھی چھٹی لے کر اس کے ساتھ چلا گیا۔ سریش کو بخار نے نہیں چھوڑا۔

چندر کا سنگھ اور اس کی بیوی دن رات اس کی تیمارداری میں لگی رہیں۔ سریش مجھے ممنون آنکھوں سے دیکھتا اور زبان سے احسان مندی کا اظہار کرتا۔

اس کے چہرے پر طمانیت کی بے حد خوبصورت لہر آ گئی۔ مگر وہ اپنی بیماری سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کے باوجود درد زہر دراس کی گرفت میں جکڑ گیا۔ آشا اور لتا بہنوں کی طرح اس کے بستر کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ ہفتوں کے اندر لگتا تھا کہ چندر کا سنگھ سچ مچ اس کے باپ ہیں، ان کی پتنی سچ مچ ماں ہیں، لیکن سریش اچانک ایک رات مر گیا۔

میں شاید اس کی خواہش کے وجود کے احساس سے آگے نہیں جا سکا تھا۔ میں نے خاندان، گھر، ماں باپ بھائی بہن کی خواہش کی گہرائیوں کا اندازہ لگانے میں سخت غلطی کی تھی۔ میں نے اس سمندر کے اندر کہاں تک جھانکا تھا۔ تھانے میں جب داروغہ نے چندر کا سنگھ سے پوچھا "مرنے والے کا نام؟" تو اس نے کہا "سریش سنگھ امیٹھیا ـــ باپ کا نام ـــ چندر کا سنگھ" اس نے میری جانب دیکھا اور بولا۔

"چندر کا سنگھ امیٹھیا ـــ!"

رفت گذشت

مشرف عالم ذوقی

(۱)

"گذری باتیں بھلا دینے کیلئے ہوتی ہیں
اس لئے کہ، گذری باتوں میں غم رکھا ہوتا ہے"

(۲)

بہت پہلے، میں نے اپنی ایک کہانی "اللہ ایک ہے
پاک اور بے عیب ہے" کی شروعات کچھ اس طرح کی تھی ....
میں بیتے ہوئے تمام لمحوں کو سمیٹ کر جی نہیں سکتا
اس لئے کہ ان میں کچھ لمحے ایسے بھی ہیں
جو اپنے سچے تعلق کی بنا پر
میری موت کو آسان بنا دیں گے

(۳)

مئی ۹۴ء کا پہلا ہفتہ
مسعود منظر کے پوسٹ کارڈ پر نظریں جمی ہوئی ہیں
آپ کو خبر ہوگی .... کلام حیدری ہمارے بیچ نہیں رہے۔
ایک بار .... دو بار .... نظریں جیسے تحریر پر
جم سی گئی ہیں .... آنکھوں میں کئی دھندلے سے خاکے
تیر گئے ہیں .... بہت کچھ یاد آرہا ہے .... ان میں کچھ
کھٹی میٹھی یادیں بھی ہیں۔ کچھ تلخ افسانے بھی ....

(۴)

بات ۸۰ء کے آس پاس کی ہے۔ ایک انتہائی
پرجوش لڑکا ہوا کرتا تھا۔ اب اتنا جوشیلا کیوں تھا۔
یہ تو وہ خود جانے، یا خود ہی بتائے، لیکن ہم اس کا تجزیہ
یوں کر سکتے ہیں کہ چھوٹے سے ایک شہر میں اسے وہ ملاقات
ہاتھ آئی تھی کہ اترایا اترایا پھرتا تھا۔ انتہائی کم عمری سے
اس نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ
اس کی کہانیاں چھپنے بھی لگیں۔ کم عمری میں اپنے نام کو جلی
حروف میں دیکھنا، معرکہ طے کرنے سے کم نہیں لگتا۔ گھر میں
صرف ادب کا ماحول ہی نہیں تھا بلکہ مطالعہ کرنے پر سخت
زور دیا جاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ایسے میں وہ اگر خود کو کوئی
تیس مار خاں سمجھنے لگا ہو، تو عمر کے لحاظ سے یہ کوئی بُری
یا عیب کی بات بھی نہ تھی۔

تب گیا سے آہنگ اور مورچہ نکلتا تھا۔ ان
دونوں کی بڑی دھوم تھی۔ گھر میں بڑے بھیا کے پاس موجود
آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ آہنگ کا بھی مطالعہ کر لیتا جہاں
موٹے موٹے حرفوں میں کلام حیدری کی کتابوں کے اشتہارات
جگمگایا کرتے۔

آپ بہتر جانتے ہیں کہ کبھی کبھی کوئی نام جب بہت
طرح سے، بہت بار نظروں کے سامنے آتا ہے تو اس نام
سے ایک خاص طرح کی اپنائیت جاگ اٹھتی ہے، ایک
انس پیدا ہو جاتا ہے۔ ۸۰ء میں اس لڑکے کی عمر ۱۷ سال
کی تھی۔ ۸۰ء میں اس کا پہلا افسانہ "موڑ" مورچہ

میں شائع ہوا۔ اور پیچھے بعد دیگرے کچھ ایک افسانے آہنگ کی زینت بھی بنے۔

۱۹۸۶ء کی بات ہے۔

اچانک کسی ضروری کام سے گیا جانے کا اتفاق ہوا۔ کام کے علاوہ گیا جانے کا ایک اور بھی رشتہ خود بخود پیدا ہوگیا تھا۔ وہی اپنائیت والا رشتہ یعنی کلام صاحب سے ملاقات کی خواہش۔ ہزاروں بار رینا ہاؤس، بیراگی جیسے نام اس کے ذہنوں میں گونجتے رہے تھے۔ گیا اس کے خوابوں کی سرزمین تو نہ تھی مگر ادب کا ایک سرچشمہ یہاں سے بھی پھوٹتا تھا۔

بیراگی، رینا ہاؤس.....

دل میں ہولے ہولے بیقراری کا سیلاب رواں تھا۔

وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ.....

مگر نہیں، سب کچھ شاید یہیں سے بدلا تھا۔

بدلا تھا یا بدگمان کر گیا تھا۔

یا کہیں کوئی خواب ٹوٹا تھا۔

ٹوٹا تھا.... یا لہولہان کر گیا تھا....

یا نہیں۔ خواب اور آدمی کے بیچ ریوالونگ چیئر کا فاصلہ تھا۔

چھوٹے سے شہر کی تنگ دستی، کم عمری کے تجربوں کے چھوٹے ہاتھ اچانک براق سفید دیواروں سے نکلتی اجنبی شعاؤں سے ڈر رہے تھے۔

یہ آدمی ...

نہیں، یہ وہ آدمی نہیں ہے، برسوں جیسے وہ اخباروں اور رسالوں کے اشتہاروں میں پڑھتا رہا ہے

یہ آدمی اسے پہچانتا کیوں نہیں ہے۔ اس آدمی میں اس قدر غیریت کیوں ہے؟

یا عمر اور تجربوں کی فصیل پر کھڑے سارے لوگ وہی کرتے ہیں۔

زیادہ بات نہیں ہو سکی، اور وہ لڑکا کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس کے بعد دو سال نکل گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلام صاحب آہنگ میں لگاتار خصوصی گوشہ شائع کر رہے تھے۔ خورشید حیات پر، شاہد انور پر اور....

ایک خط اس لڑکے کو بھی ملا۔ اپنی کئی کہانیاں اکٹھے بھیج دیجئے تاکہ دیکھ سکوں کہ آپ میں شناخت کیا بات ہے؟۔

اپنے آپ سے مطمئن اس لڑکے نے اپنی چھ سات کہانیاں ایک ساتھ آہنگ کے لئے بھیج دیں۔ کچھ دنوں بعد کہانیاں واپس ہوئیں تو ایک رقعہ ساتھ تھا۔

اتنی ڈھیر ساری کہانیاں۔ تاب نہیں لا سکتا۔ واپس کر رہا ہوں۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ لڑکا کون تھا مگر حق بات یہ ہے کہ کلام صاحب کے اس رخ کو میں زندگی بھر نہ پہچان سکا۔ ان سے عقیدت اس منزل میں رہی کہ مجھے ادب کے گہوارے میں زندگی بھر انہوں نے پہل دکھائی۔ شکایت اس بات کی رہی کہ وہ مردم شناس نہیں رہے۔ ورنہ خود ہی کہانی طلب کرنا اور جھنجلاہٹ میں واپس کر دینا۔ وہ یہ لکھ دیتے کہ کہانی نہیں آئی۔ تو یہ اور بات تھی۔ لیکن ان کے جھنجلاہٹ بھرے خط سے یہ ظاہر تھا کہ کسی نے میرے خلاف کان بھرے ہے۔ ادھوری رہ گئی ایک حسرت کہ ان سے زندگی کبھی دوبارہ ملاقات ہو پاتی۔ ہاں دلی میں دو ایک سمیناروں میں کافی دور سے انہیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مگر تب تک جوشیلی بیباکیاں کر چکی تھیں۔

سیمیاگر

مشفق

میں جب بھی یادوں کی بکھری ہوئی کلیاں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں تو ہاتھ گرد آلود ہو جاتے ہیں۔

اس دور انہدام نے اتنی تباہ کاریاں مچائی ہیں کہ ہر طرف گرد ہی گرد ہے اور اس گرد میں سامنے کی چیزیں بھی مشتبہ ہو گئی ہیں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ سچ ہے؟ یہ اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ ہم سچائی سے کتنے فاصلے پر ہیں میری نظروں میں ایوان او قرارداد کے بہانے زنجیروں میں جکڑا، خون میں نہایا ہوا بغداد ہے اور اسی ایوان او قرارداد سے محفوظ بیہاچ شہر پر توپیں آگ برسا رہی ہیں، مسجد ابراہیم میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور گروزنی پر وحشیانہ بمباری اور مہر بلب دنیا۔ سر جو کٹا ہے ۶ دسمبر کا سنگ میل ...... سیاست کا پہیا گھوم رہا ہے امریکہ میں بیٹھا افراسیاب سحر کر رہا ہے بوسنیا میں تاریک مشکل کش چھینٹے مار رہی ہے، ٹانگیں چیر رہی ہے ہڈیاں چبا رہی ہے اور اسرائیل میں عفریت طلسمی سو دو سو آدمیوں کے چھینکے مار رہا ہے۔ اور کہیں امیر حمزہ نہیں طلسم کشا اسد نہیں، ایرج، نورالدہر اور قاسم نہیں جو ظالموں کے پنجے مروڑ دے۔ کسی سے مدد کی امید بھی نہیں۔ کسی کا انتظار بھی نہیں جھیلنا ہے اور جھیلتے رہنا ہے، ایسے میں یادوں کو صیقل کرنا کتنا مشکل کام [illegible]

مقروض ہو۔

میں دور بہت دور دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر حسن آرزو کے یہاں ماہانہ شعری نشست ہے، لوگ آ چکے ہیں کچھ خاص لوگوں کا انتظار ہے۔ حسن آرزو میرے کالج کے استاد ہیں۔ اس لئے استاد کے گھر کا ادب ملحوظ ہے۔ میں دبے پاؤں دالان میں داخل ہوا ہوں مگر انہوں نے دیکھ لیا ہے دور ہی سے کہنے لگے آئیے آئیے آپ کو کلام حیدری پوچھ رہے تھے۔

میں ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گیا وہ دوسروں سے باتیں کرنے لگے مگر میرے اندر اتھل پتھل ہونے لگی ابھی تو میری تھوڑی کہانیاں چھپی ہیں، کلام حیدری تو بڑے افسانہ نگار اور مورچہ کے مدیر ہیں، انہوں نے بھی میری کہانیاں پڑھیں اور کیا پوچھ رہے تھے ــــ کیسا کیسا جی چاہا کہ تفصیل معلوم ہو مگر نشست شروع ہو چکی تھی اور رات گہراتی جا رہی تھی۔ مگر اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ سرور کی ایک لہر بار بار مجھے شرابور کر دیتی ہے۔ کلام حیدری پوچھ رہے تھے میں نے اپنی چھپی کہانیاں پھر سے پڑھیں لیکن بیکار ...... کس کہانی نے انہیں متوجہ کیا ہوگا ...... کبھی کبھی حوصلہ افزائی کا ایک جملہ زندگی [illegible]

منزل تک پہونچنے کی جستجو کہ اس وقت منزل بیسویں صدی اور شمع تھی اور جب اس منزل پر پہونچا تو شب خون کا اجرا ہو چکا تھا۔

میں نے پہلی علامتی کہانی "کھڑکی" آہنگ کو بھیجی ۔ کلام حیدری کا جواب آیا، نام کے آگے دربھنگوی بھاگلپوری اور سہسرامی کیا لگانا، کیا شہر کے نام کے بغیر شناخت نہیں ہو سکتی اور میں نے کئی دن اس پر غور کیا میں صرف سہسرام کا ہوں یا ہندوستان بلکہ ساری دنیا کا۔ کرشن، بیدی، منٹو کہیں ہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے لہذا میں نے انہیں لکھا کہ میرے نام کے آگے سہسرامی ہٹا کر صرف شفق کے نام سے کہانی شائع کیجئے۔ مگر ابتک کی کہانی کے ضائع ہونے کا ملال بھی تھا۔ کھڑکی "شائع ہو گئی اور یہ کھڑکی میرے جدید افسانوں میں جھانکنے کی کھڑکی بن گئی جس سے نئی دنیا، نئی صورتیں نظر آنے لگیں، اس وقت کام ہی کیا تھا، کورس کی کتابیں پڑھنا اور کہانیاں لکھنا، ایک بار جب یونیورسٹی کے کام سے گیا جانا ہوا تو سوچا کلام حیدری سے ملتا چلوں مگر دربان نے گیٹ پر روک دیا، صاحب اوپر چلے گئے ہیں۔

تم جا کر کہو کہ سہسرام سے فلاں آئے ہیں۔

نہیں ـــ آپ شام کو آئیے جب صاحب نیچے آئیں تو مل لیجئے گا

میں نے حیرت اور افسوس کے ساتھ سفید سنگ مرمر جیسی عمارت کی اوپری منزل پر نظر ڈالی اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ پھر وہیں کسی نے بتایا جب کلام صاحب اوپر چلے جاتے ہیں تو بڑے بڑے آدمی سے نہیں ملتے، یہاں تک کہ وائس چانسلر نربد لشیور بھی کئی بار لوٹ چکے ہیں۔ اور پھر ان کی حیثیت کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑے سرمایہ دار ہیں۔

اور میں تو بہت چھوٹا ہوں ۔ میں نے بددلی سے سوچا پھر کا ہے کو ملنا تھا اب نہیں جاؤں گا ۔

ایم اے کے امتحان میں حسین الحق اور فخر رضوی میرے ساتھ امتحان میں شریک تھے۔ ایک شام انہوں نے حیدری سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ میں جانا نہیں چاہتا تھا مگر ساتھ چھوڑ کر تنہا کہاں بھٹکتا، بڑا سا ہال، صوفہ سیٹ ٹیلیفون، ٹیوب لائٹ اور ڈھیر سے آدمی، ڈاکٹر وہاب اشرفی، غیاث احمد گدی، اور گورے چٹے نرم و نازک بدن مگر پرکشش چہرے والے کلام حیدری، غیاث صاحب سے پہلے سے واقفیت تھی مگر وہ بھی وہاں لئے دیئے بیٹھے رہے، وہاب صاحب اکڑا مزاج اور کلام صاحب چپ ۔ ۔ ۔ ۔

یا اللہ کہاں پھنسایا ان لوگوں نے ـــــــ

میں نے سوچا ہی تھا کہ کلام صاحب کی آواز سنائی دی: اتنی دیر ہو گئی اور آپ کو پتہ نہیں چلا۔ اب تک آپ کو سارے پتے زبانی یاد ہو جانا چاہئے تھے میں چونک کر کلام صاحب کی طرف دیکھا۔ ایسا تحکم، کیا ماتحت کی عزت نہیں ہوتی اور ماتحت بھی وہ جو میرے ساتھ امتحان دے رہا تھا۔ جانے کے وقت کلام صاحب نے پوچھا، پرچے کیسے گذر رہے ہیں، میں نے اچھے کہا اور ہم سفید سنگ مرمر جیسی عمارت سے باہر آگئے۔

پھر میں نے آہنگ کے لئے ایک کہانی "سیاہ کو" بھیجی۔ ان دنوں میرا قیام جھریا میں تھا۔ ایک دن غیاث گدی کہنے لگے کلام صاحب تم سے بہت ناراض ہیں۔ تم وہی کہانی انہیں بھیجی، جو تازہ "شب خون" میں چھپی ہے شب خون میں کہانی بھیجے کئی مہینے ہو گئے تھے وہاں سے جواب نہیں آیا تو میں نے سمجھ لیا کہ یا تو کہانی کھو گئی یا پسند نہیں آئی ۔ ان دنوں پہ کاشف فکری کلام صاحب کے معاون تھے اور آہنگ کا کام دیکھ رہے تھے سو ان کے ساتھ ان کا سخت خط آیا کہ اب آپ کی کوئی کہانی آہنگ میں شائع نہیں ہوگی۔ معرکہ محمود درد وہاب کی وجہ سے آہنگ

بعد مقبول ہو گیا تھا۔ اور ان دنوں نئے فنکاروں کے گوشے
نکل رہے تھے۔ علی امام، شوکت حیات اور حسین الحق کے
خصوصی مطالعے شائع ہو چکے تھے اور کچھ کے اعلان ہو چکے
تھے۔ اس آہنگ میں بڑی بھیڑ تھی۔ لہٰذا اس کے مدیر کا یہ جارحانہ
انداز حیرت انگیز نہیں تھا۔

میں نے جواب میں دریافت کیا کہ اس شمارہ میں شرون
کمار ورما اور فلاں فلاں کی چیزیں بھی شائع شدہ ہیں، کیا آپ
انہیں بھی نہیں چاہیں گے اور یہ کہ میرے لئے پرچوں کی کمی نہیں۔
میں خود ہی کوئی کہانی نہیں بھیجوں گا۔

تو اور سخت خط آیا کہ آج تک کوئی رسالہ تخلیقات
کی کمی کی وجہ سے بند نہیں ہوا ہے۔

گیا میں مگدھ یونیورسٹی ہونے کی وجہ سے میرے لئے
اس شہر کی بڑی اہمیت تھی۔ انفی لٹیڈ کالج کی ملازمت کے
بعد گیا میں میری آمد و رفت اور بڑھ گئی تھی۔ ایک دن عبدالصمد
کہنے لگے۔ کلام حیدری صاحب آپ کو پوچھ رہے تھے چلئے
مل لیجئے۔

کلام حیدری صاحب ـــــ میں نے انکار کرنا
چاہا تھا مگر ان کے اصرار پر جانا پڑا۔

آج کلام صاحب چھوٹے کمرے میں تھے میز کے نیچے
ان کے پاؤں کے پاس شاید مچھر بھگانے والی ٹکیہ جل رہی
تھی کمرے میں ہلکا ہلکا دھواں پھیلا ہوا تھا۔

سنتا ہوں تم بہت گیا دوڑ رہے ہو کیا معاملہ ہے؟
ـــــ انہوں نے پوچھا۔

میں نے اپنی پریشانی بتائی۔ وہ بغیر کچھ کہے ٹیلیفون
کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔ باتیں میری متعلق تھیں۔ پھر فون رکھ
کر کہنے لگے۔ میں نے کمیشن کے سکریٹری احمد سے کہہ دیا ہے
تم کل پٹنہ جا کر ان سے مل لو۔ اور آج تم میرے یہاں ٹھہرو گے۔
میں حیران سا کلام صاحب کا یہ نیا انداز دیکھ رہا تھا

پھر کہانیوں کی باتیں چھڑ گئیں۔ میرے لئے مہمان خانہ
کھول دیا گیا، نوکر رات کا کھانا لایا۔ اس مہمان خانے
میں ادب کی بڑی بڑی ہستیاں ٹھہری ہوں گی کہ ادب میں
گیا اور کلام حیدری ایک ہی نام تھا۔ جیسے آگرہ اور تاج محل
لکھنؤ اور نیر مسعود، گیا اور کلام حیدری۔

میں اپنے کلینک حیدر کے چھوٹے سے کمرے میں
جو آرام محسوس کرتا تھا وہ یہاں نہیں ملا، ایک نامعلوم سی
بےکلی نے تمام رات پریشان رکھا۔ اور جب گھڑی نے چار
بجائے تو میں دربان سے گیٹ کھولنے کے لئے کہہ رہا تھا

پھر کلام صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ بہت
اچھی باتیں کرتے تھے، بڑی کاٹ دار اور نوکیلی، ہر موضوع
پر ان کا انداز فکر دوسروں سے مختلف تھا۔ وہ چونکانے
والی باتیں زیادہ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی تازہ کہانی
"الف لام میم" کا کچھ حصہ سنایا، اور میں مسحور ہو گیا، اتنی
گہری معنویت ایسی خوبصورت زبان، لہجے کے اتار چڑھاؤ
نے مجھ کو مسحور کر دیا جی چاہتا سنتا رہوں اور وہ سناتے رہیں۔
یہ اور بات ہے کہ وہی کہانی جب خود پڑھی تو ویسی نہیں تھی
کلام صاحب کی کہانیوں میں وہ کاٹ نہیں ملتی جو ان کی گفتگو
میں تھی اگر وہ کاٹ ان کی کہانیوں میں پیدا ہو جاتی تو ان کی
کہانیاں یادگار بن جاتیں، ان کی کہانی "کس کی کہانی" کو ان
کی شاہکار کہانی سمجھا جاتا ہے۔ مگر مجھے کتاب لکھنؤ میں چھپی
کہانی۔ زندانی۔ ان کی سب سے اچھی کہانی معلوم ہوئی تھی۔
موضوع نیا نہیں تھا مگر اس کا ٹریٹمنٹ ایسا تھا کہ وہ کہانی
آج بھی مجھے یاد ہے، مگر وہ کہانی ان کے کسی مجموعے میں نظر
نہیں آتی۔

انہیں دنوں میں نے سہسرام سے اسلوب نکالا۔
اس کے لئے ان سے کہانی مانگی اور انہوں نے بھیج دی، پھر
اسلوب بند ہوا تو کلام صاحب کا خط آیا اسلوب کو کسی

طرح جاری رکھو۔ مگر بیچ کی کڑی کھو گئی تھی، وزیر معصوم غائب ہو گئے اور اب بنارس جا کر کاتب کو پکڑنا اور پریس کے چکر لگانا میرے بس سے باہر تھا۔ تب کلام صاحب نے لکھا کہ آہنگ کی ذمہ داری تم سنبھالو اور پھر میرا نام مہمان مدیر کی حیثیت سے آہنگ میں نظر آنے لگا۔

کلام صاحب مجھ پر بے حد مہربان تھے، مگر ان کے سلسلے میں میں نے کچھ باتیں محسوس کی تھیں، کلچرل اکیڈمی سے وہ جس کی کتاب چھاپتے ہیں اس سے ان کے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں، وجہ جو بھی ہو، انہوں نے مہدی جعفر کی کتاب "نئے افسانے کا سلسلۂ عمل" کلچرل اکیڈمی سے چھاپی مگر ایک خط میں انہوں نے مجھے لکھا حیرت ہے تم مہدی جعفر کو کہانی سمجھنے والا سمجھتے ہو۔ دوسری بات یہ کہ کلام صاحب کی مہربانیوں عرصہ طویل نہیں ہوتا۔ تیسری بات یہ کہ وہ ادب میں ہلچل کے قائل ہیں، ان دنوں وہ صلاح الدین پرویز کے ڈرافٹ کے فوٹو آہنگ کے سرورق پر چھاپ رہے تھے چوتھی یہ کہ درباریوں نے ان کا داہنا کان بڑا کر دیا ہے۔

اس لئے میں محتاط رہا ان کے کاندھوں پر چڑھ کر اچھل کود نہیں مچائی اور جس دن آہنگ کے مہمان مدیر سے میرا نام غائب ہوا، میں نے سمجھ لیا کہ مہربانیوں کا سلسلہ موقوف ہوا۔ تو اس سے نہ دکھ ہوا نہ خوشی کہ میں آہنگ کے لئے کچھ بھی نہیں کر رہا تھا در اصل میں آہنگ اور کلام حیدری کے لئے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا میں بہت چھوٹی چیز تھا۔

پھر خبر ملی کہ کلام صاحب نے اپنا پریس فروخت کر دیا۔ آہنگ اور مورچہ بند ہو گیا اور پھر خبر ملی کہ وہ دہلی چلے گئے۔ اور وہاں سے کوئی رسالہ نکالنے والے ہیں پھر خبر ملی کہ وہ گیا واپس آ گئے اور آخری خبر بڑی اندوہناک تھی، وہ نہیں رہے۔

میں سوچتا ہوں کلام صاحب صحافی بھی تھے، مبصر، افسانہ نگار اور بزنس مین بھی، وہ ایماندار بھی تھے سادہ زندگی بغیر لالچ اور امید کے ادب کی خدمت کر مگر اپنے قلندرانہ مزاج کے بدولت کسی ایک کے رہے اور اب وہ سینکڑوں من مٹی کے نیچے لیٹے احتساب کر رہے ہوں گے۔

انہوں نے دوست زیادہ بنائے یا دشمن بھی کہ انہوں نے زندگی بھر گھاٹے کا سودا کیا۔

بقیہ کلام حیدری کے افسانے میں صلہ ۴۶

اپنی آوازیں، صفر، الف لام میم، حاشیہ وغیرہ - بقول پروفیسر وہاب اشرفی -

"بے نام گلیاں" سے لے کر "الف" ان کا فن مسلسل ارتقا پذیر ہے - ..... اس حیدری پرانے صنف کے افسانہ نگار بھی جدید نسل سے بھی ان کا رشتہ قائم ہے -"

(ترقی پسند ادب - پچاس سالہ سفر مرتب قمر رئیس اور عاشور کا

اسٹائل اور موضوع کا تنوع انہیں تھا۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو افسانوی ان کی بقا کی ضامن ہیں۔

عمر کے آخری ایام میں وہ اپنی شدید علا باوجود دوبارہ رسالہ "آہنگ" کو زندہ کرنے سوچ رہے تھے۔ کوئی ناول لکھنا چاہ رہے نہ جانے کیسے کیسے خواب ان کی آنکھوں میں تھے۔ صد حیف! کہ بے رحم موت نے انہیں ہی نہیں دی۔ اور ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

کلام صاحب

شاہد جمیل

یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔

تب میں سہسرام کے ایس پی جین کالج میں B.Sc. کا اسٹوڈنٹ تھا۔ ادب کا طالب علم نہ ہونے کے باوجود ادب پڑھنے لکھنے کی دلچسپیاں جو ڈیڑھ دو برس قبل ابتدائی کوششوں کی صورت میں جاری تھیں اب باقاعدہ "تخلیقات" میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ اور لکھی ہوئی چیزیں بچوں کے رسائل کے علاوہ ادبی جرائد مثلاً سہیل (گیا)، رنگ سنگ (کانپور) معیار (آرہ) وغیرہ میں جگہ پانے لگی تھیں۔ یہ میرے ادبی مشغولیات کا ابتدائی دور تھا۔ اور اپنے عروج پر تھا۔ شعر و ادب ہمہ وقت اوڑھنا بچھونا ہو رہا تھا۔ قلم اور مطالعے نے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ داستان ابن صفی کی سیر ہو چکی تھی۔ خلیل جبران سے ہو گئی تھی۔ پریم چند، منٹو، اور کرشن چندر نے اپنا تعارف کروا دیا تھا۔ غالب، اقبال، یا فیض وغیرہ پرانی چیز ہوتے۔ ناصر کاظمی، مظہر امام اور ظفر اقبال وغیرہ تھے نئے آئیڈیل بنے تھے۔ یہ کاشف فکری، سلطان اختر، ابد ظہیر صدیقی دل و دماغ میں الگ گھر بنا رہے تھے۔ شاعری میں جدیدیت کا دور دورہ تھا۔ نئی کہانی میں علامت اور تجریدیت کے کھیل تماشے اپنے شباب پر تھے۔ ادبی رسالے نہایت خشوع و خضوع سے پڑھے جاتے۔ اور ان میں چھپنے والے فنکاروں کو بے حد احترام کی نظر سے دیکھا جاتا۔ انہی دنوں موجب اور آہنگ کے تعلق سے میں پہلی بار کلام حیدری کے نام سے آشنا ہوا۔

اور ان ہی دنوں [illegible] لائبریری کے ذریعے میں ایک کتاب میرے ہاتھ آئی۔ نام تھا۔ بابا لوگ۔ عجیب سا نام کہ بابا لوگ۔ پڑھنے کی لت تو لگ ہی چکی تھی آناً فاناً پوری کتاب پڑھ ڈالی۔ لیکن اس پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے کہ افسانوں کے عنوان پلاٹ اور کردار بہت جلد ذہن سے محو ہو گئے۔ وجہ ظاہر ہے پڑھنے والے کی عمر کا کچا پن تھا۔ اس وقت ان کہانیوں کے مطالعے کے لیے موزوں ہی نہ تھا۔ البتہ پوری کتاب میں ایک جملہ ضرور ایسا ملا کہ جس نے نہ صرف مجھے چونکا دیا بلکہ نگاہ پڑتے ہی جیسے کسی برقی رو کی طرح شدت کے ساتھ اڑا اور اڑ کر سیدھا میرے ذہن کے نہاں خانے میں جا پہنچا۔ وہ فقرہ تھا — "اٹھو اور لکھو" — اور یہ الفاظ تھے کلام حیدری کے۔ جو کتاب کے [illegible] کرتے وقت پیش لفظ میں ان کے قلم سے نکلے تھے۔ آج برس ہو گئے، "بابا لوگ" پڑھے ہوئے لیکن یہ جملہ اسی قوت اور کیفیت کے ساتھ مجھ میں اب بھی SPARKLE کرتا رہتا ہے —— "اٹھو اور لکھو"۔

"اٹھو اور لکھو" کی آکاشوانی نے کلام حیدری کو گرد

بنایا لیکن اس "الہام" کو پیمانہ تقدیر ریکارڈ کرنے والا ذہن کوئی معمولی نہیں تھا۔ کلام حیدری کی تحریر کی قوت کا میں ان ہی دنوں قائل ہو گیا۔

اگلے برس ۱۹۶۸ء سے میری نگارشات مورچہ میں بھی شائع ہونے لگیں یہ عین انسانی فطرت ہے کہ اگر کسی حلقے میں آپ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں تو اس جگہ، ماحول یا اشخاص کی محبت میں آپ گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، چنانچہ لگاتار شائع ہوتے رہنے کی بنا پر مجھے جہاں مورچہ سے انسیت پیدا ہو گئی وہیں میں مورچہ والے (یعنی کلام حیدری صاحب) کے سحر میں بھی گرفتار ہوتا گیا اور اس "ساحری" میں صرف ان کی صحافتی دانشوری یا مدیرانہ قد و قامت کا ہی دخل نہ تھا بلکہ جوں جوں میں کلام صاحب کے بارے میں دلچسپی لیتا تھا ان کی ہمہ جہت شخصیت کی تہیں مزید کھلتی جاتی تھیں۔ یہ مجھے آگے چل کر معلوم ہوا کہ "بے نام گلیاں" اور "صفر" نے بہت پہلے ثابت کر دیا تھا کہ کلام حیدری جدید اردو فکشن کا کوئی غیر اہم نام نہیں ہے۔

اس وقت ہندوستان سے شائع ہونے والے اہم اور جدیدیت کے علمبردار اردو رسائل میں جہاں صبح نو، کتاب، شب خون اور تحریک مقبول ہو رہے تھے، وہیں آہنگ کا شمار بھی معیاری جرائد میں ہوتا تھا بلکہ یوں کہا جائے کہ اس کے اپنے ہی تیور تھے اپنا بانکپن تھا۔ اپنا ایک مزاج تھا جو کسی دوسرے ادبی رسالے سے اسے منفرد اور ممتاز بناتا تھا۔ اس کا ایک ایک شمارہ اپنے مرتب کی موجودگی کا احساس کراتا تھا اور صاف پتہ چلتا تھا کہ پرچے کو خاصی محنت اور توجہ سے ایڈٹ کیا جاتا ہے (احتشام حسین نمبر کی مقبولیت اس کی بہترین مثالوں میں سے ایک ہے) مورچہ اور آہنگ دونوں ہی ادب پر چھائے ہوئے تھے اور خاصے مقبول و مشہور ہو رہے تھے دیکھا جائے تو ایک طرف مورچہ کا انتہائی طمطراق سے ہر ہفتے بلاناغہ اور اسی ادارے سے آہنگ کا ادب کی تازہ ترین ... ساتھ ہر مہینے جلوہ گر ہونا ——— بلاشبہ کلام حیدری کے توسط سے اپنی موجودگی ہمارے ذہنوں میں برقرار رکھے ہوئے تھے۔ ادب کے سلسلے میں رسائل کی ٹھیک پر اشاعت اور اس کے تواتر کی خاص اہمیت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کلام حیدری کے یہ دو اس وقت کی نئی نسل کی سوچ کو ایک سمت عطا ... بے حد کامیاب ثابت ہو رہے تھے۔ یہاں ان کی وہ نسل بھی تھی جو ۱۹۶۰ء کے آس پاس اپنی شناخت ... تھی۔ اور ترقی پسند کے ایوان کو وہ مسمار کرنے کے ... کی بنیادیں مستحکم کر کے بڑی تیزی سے عمارتوں پر کھڑی کر رہی تھی ؎

آتے جاتے ہر دم ٹوکا کرتے تھے کھڑکی دروازے
جھلا کر آزاد ہوئے تو توڑ دیے کھڑکی دروازے

(مظفر حنفی، آہنگ ستمبر ...)

آٹھویں دہائی گزر گئی ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء آ گیا کئی ... کلام صاحب سے ملوں، لیکن خود کو MANAGE ... اس دوران آہنگ میں بھی تبدیلیاں آئی تھیں۔ نو ... ایڈیٹر ہو گئی تھیں۔ مگر "مزامیر" کلام صاحب ہی کے ... آگے چل کر کلام صاحب چیف ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ اور عبدالصمد کا نام بھی رفقائے ایڈیٹرز کے طور ... کیا گیا تھا۔ لگا کہ کلام صاحب کا ...VEMENT آہنگ میں کم ہو گیا ہے۔ رسالے کا مزاج بھی متو ... ایک آدھ شمارہ صلاح الدین پرویز وغیرہ کو ... چونکا دینے والا آیا۔ ادبی اسکینڈلوں کے راز فاش ... مجھے محسوس ہوا کہ آہنگ اب رسالہ کم، رسالے ... میں اخبار زیادہ ہو گیا ہے۔ معیار بھی اب وہ ...

جو ۱۹۶۸ء/۱۹۶۹ء کے اوائل میں اپنے عروج پر تھا۔ اس طرح کی رعایتی اور ادبی تحریریں بھی آہنگ میں اب بآسانی جگہ لے رہی تھیں۔ مثلاً:

ہم بھی تو رہے ہیں اسی امید پہ خادم
کب دیکھیں شبِ غم کی بَلا سر سے ٹلے ہے
(ص ۴۹ آہنگ فروری ۸۲ء)

یا

ہم نے مانا کہ بہار آئی ہے گلشن میں مگر
بات کیا ہے کہ کھلا گل ہے نہ ہنسا غنچہ کوئی
(ص ۵۰ آہنگ فروری ۸۲ء)

اس کے باوجود میں ان آٹھ دس برسوں میں کلام حیدری کی شخصیت، ان کی علمیت، ذہانت اور دانشوری کا تقریباً قائل ہو چکا تھا۔ مجھے کہانیوں میں کوئی اور کلام حیدری نظر آتے تھے اور صحافت میں کوئی اور۔ سیاست پر ان کی گہری نظر، چونکا دینے والی پکڑ، بے حد مدبرانہ بصیرت، اور ان کے تفکر آمیز تنقیدی رویے کا میں پوری طرح قائل ہو چکا تھا۔ ان کے اداریے مجھے متاثر کرتے تھے، جن میں عصری صورت حال پر ان کے ردِ عمل کا برملا اور بے باک اظہار ملتا تھا۔ ان کا وہ اسلوب جو مجھے بنیادی لگتا تھا۔ اور جسے میں ان کے شخصی اسلوب سے تعبیر کرتا ہوں۔ چٹخا چٹخا سا ہوا ہوتا ہے جس میں کہیں کہیں ہلکے طنز کی آنچ ہوتی تھی۔ جس میں ایک کاٹ تھی، ایک دھار تھی، ایک نوکیلا پن تھا جو مجھے جھنجھوڑتا تھا۔ کسی ادب میں تازہ ابھرتی ہوئی نسل کی ذہنی تربیت کے کیا پیمانے ہوتے ہیں اور کسی تخلیقی فنکار کو ادبی معاشرے میں PROJECT اور ESTABLISHMENT کرنے اور اسے PROMOTE کرنے کے تعلق سے ایک ذمہ دار مدیر کی کیا سوچ اور انداز فکر ہونا

ان کے فکر کا مکمل اعتراف نامہ تھا۔ اور ان کی شخصیت کا آئینہ بھی۔ انہوں نے آہنگ کو (اس کے آغاز اور اس کے ارتقا میں) جس طرح ENJOY کیا اسی طرح اس میں لکھنے والوں کو (بالخصوص نئے لکھنے والوں کو) اس کا شدید احساس دلایا کہ ان کے اندر فن کا جو خالق بیٹھا ہوا ہے اس کی شناخت کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے۔ مجھے یاد آتا ہے سلطان اختر کی شاعری پر آہنگ کے کسی شمارے میں بڑے نرالے انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے کچھ اس طرح لکھا تھا:

"غزل کو جدیدیت اور جدیدیت کو غزل سے
ٹکرا کر چنگاریاں پیدا کرتے ہیں۔"

نئے شاعروں کے گوشے، بالکل نئے افسانہ نگاروں کے خصوصی مطالعے جس کروفر اور شان و شوکت کے ساتھ آہنگ میں شائع کئے جاتے تھے وہ کسی کم ہمت اور ادنیٰ مدیر کا کام ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ فکشن نمبر کی شاندار مقبولیت کے علاوہ آہنگ میں وقتاً فوقتاً "میں" کا تعارف، اور بہار اکادمی کی مطبوعات میں ارتقاء کی تدوین اس کی بہترین مثالیں ہیں جنہوں نے ثابت کیا کہ صحافت کی میزان پر ادب میں اتنی دیانت داری اور ایمانداری کو عبادت کی طرح سنبھال کر چلنے والی ہستیاں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہیں۔

"میں تو ان دنوں فراز دار سے بھی کارواں
در کارواں دیکھا تھا تب میں نے اپنی گرم
شیروانی فرش پر بچھا دی اور اپنے آپ سے
باتیں کئے بغیر سو گیا۔ ان دنوں اپنے آپ سے
باتیں کرنے کی عادت نہیں پڑی تھی سینکڑوں
ہزاروں سے باتیں کرنے والا اپنے آپ سے
کیا باتیں کرتا۔" (الف لام میم)

کلام صاحب کی تحریروں سے جو ذہانت ابھرتی تھی

مرشم ہوتی تھی وہ کسی کو بھی مرتسم کرنے کے لئے کافی تھی۔
کلام صاحب کو سب سے پہلی بار دیکھنے سننے کا مجھے اتفاق ہوا وہ ایک ادبی محفل تھی۔ اور اس بزم میں ان کے تعلق سے ایک انتہائی دلچسپ ادبی لطیفہ وجود میں آگیا جس کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

یہ غالباً ۱۹۶۲ء کا واقعہ ہے میں پٹنہ آگیا تھا ملازمت کے تعلق سے وہیں رہائش بھی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مختلف دمقابلے کے امتحانات کی میری تیاریاں بھی چل رہی تھیں۔ پٹنہ کی ادبی محفلوں میں وقت نکال کر شامل ہونے کی خواہش بھی رہتی۔ ان ہی دنوں حسرت موہانی پر ایک سیمینار بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ بہار کی تقریباً سبھی لکھنے پڑھنے والی ہستیاں موجود تھیں، گیا سے کلام صاحب بھی تھے باہر سے آنے والوں میں عنوان چشتی مجھے یاد ہیں۔ مقامی لوگوں میں شین مظفر پوری، سلطان اختر، ظہیر صدیقی اور اسلم آزاد کے علاوہ بہت سے لوگ تھے (جو اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں) میں جس وقت پہنچا تھا عنوان چشتی اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے کلام حیدری ان کے دائیں جانب والے ROW تک تیسری یا چوتھی نشست پر تھے۔ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ بائیں ROW والی ایک نشست پر تقریباً ایک کنارے جا بیٹھا۔ یہ سمینار گاندھی میوزیم کے قریب لے این سنہا انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا تھا۔ پہلی بار کلام صاحب کو میں نے وہاں دیکھا۔ کتابی سفید چہرہ، چھوٹے چھوٹے بال، عینک کے اندر سے جھانکتی آنکھوں سے جھلکتی ذہانت جو مقابل کو نظریں ہٹانے پر مجبور کر دے۔ بہترین تراش خراش کے لباس سے ہم آہنگ ایک بے حد اسمارٹ شخصیت۔ دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ تو یہ ہیں کلام صاحب آہنگ والے۔ میں نے طے کیا کہ سیمینار ختم ہونے کے بعد مجھے ان سے ملنا چاہیئے۔ ایک عرصے سے اشتیاق بھی تھا مگر اچانک ایک واہیات خیال ذہن میں آیا۔ اگر وہ کہیں خلوص کے ساتھ پیش نہ آئے تو ——؟؟
میں نے سوچا خود سے ملنا مناسب نہ ہوگا ویسے اس قسم کے معاملات میں کچھ عجب نفسیات ہے میری یعنی جن شخصیتوں کو میں بے حد احترام اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہوں ان سے ایک دوری بنائے رکھنا چاہتا ہوں اور بے تکلفی سے ملنے اور خواہ مخواہ قربت حاصل کرنے سے قصداً احتراز کرتا ہوں۔ پھر پتہ نہیں مجھ سے مل کر وہ کیسا محسوس کرتے۔
میں یہی سب سوچتا رہا۔ اچانک میری توجہ کلام صاحب سے ہٹ کر عنوان چشتی صاحب پر چلی گئی۔ کیونکہ ان کے مضمون میں حسرت موہانی کی جگہ پتہ نہیں کیسے مولانا حالی کا ذکر بار بار آنے لگا تھا۔ پہلی بار نام آیا تو کلام صاحب نے ہی نے ٹوکا۔

"حالی نہیں حسرت"

عنوان صاحب کچھ نہ بولے، پڑھنا جاری رہا پھر نام آیا "حالی . . . . ."

کلام صاحب نے پھر کہا — "حسرت"

اس بار کچھ لوگ مسکرائے بھی زیر لب، ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ تیسری بار بھی عنوان صاحب نے حسرت کی جگہ "حالی" ہی پڑھ دیا اس بار کلام صاحب نے کھڑے ہو کر کہا۔

"عنوان صاحب! آپ بار بار حسرت موہانی کی جگہ مولانا حالی کا ذکر کیوں کر رہے ہیں"

اس پر عنوان صاحب لمحہ بھر کے لئے خاموش رہے پھر انتہائی نفاست ہی سے بے حد نرم لہجے میں بولے۔

آپ بیٹھئے SIT DOWN اور سن لیجئے کہ جہاں جہاں میں مولانا حالی کہوں وہاں وہاں سب لوگ "حسرت" سمجھیں۔

میں میں دنگ رہ گیا عنوان صاحب کے اس انداز
گفتگو پر۔ جیسے کسی نک چڑھے استاد نے کسی شریر شاگرد
کو ڈانٹ پلائی ہو۔ لیکن اس سے زیادہ حیران کر دینے والا
رویہ خود کلام صاحب کا تھا۔ اس کا انہوں نے کوئی جواب
نہ دیا۔ اور نہایت خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔
میں کلام صاحب کی اس خاموشی پر جیسے گنگ رہ گیا۔ اور
حاضرین کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ چہ میگوئیاں تک نہ ہوئیں
بہرحال عنوان صاحب نے مقالہ ختم کیا اور پھر اس پر تبصرے
شروع ہوئے۔ سب سے پہلے جو شخص اٹھا تھا۔ وہ کلام حیدری
تھے۔ کلام صاحب نے انتہائی متانت اور سنجیدگی سے کہا۔

"ابھی آپ نے جناب عنوان جشتی سے ان کا مقالہ
سنا۔۔۔۔۔۔"

میں آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا! خداوندا! کلام صاحب
سے ایسی لغزش؟ چشتی کو جشتی کہہ رہے ہیں۔ حاضرین
نے بھی ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا کہ
کلام صاحب نے جملہ پورا کیا۔

"۔۔۔۔۔۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے میں جہاں جہاں
جشتی کہوں وہاں وہاں لوگ چشتی سمجھیں۔"

اس کے بعد پوری محفل میں کتنی دیر تک قہقہے
گونجتے رہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے تو یہ تھا کلام صاحب کی
ذہانت اور حاضر جوابی کی عمدہ مثال۔

سیمینار ختم ہو گیا۔ میں اپنے ایک ادیب
دوست سلطان اختر کے ساتھ باہر نکل [illegible] شب کو [illegible]
وہیں سلطان اختر صاحب [illegible]
حسرت [illegible] کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔
"کیا لکھتا [illegible] حسرت [illegible] آئے۔" پھر
سلطان صاحب کسی اور ہی جانب متوجہ ہو گئے۔ اس
دالان کے اندر سے لوگ نکل نکل کر باہر آ رہے تھے۔

دفعتاً اسی بھیڑ میں مجھے عنوان صاحب دکھائی دیئے
جو کسی سے محو گفتگو تھے۔ پس منظر میں کلام حیدری بھی نظر
آئے، تنہا ہی تھے۔ ان کا رخ کہیں دوسری طرف تھا
کہ اتنے میں عنوان صاحب نے انہیں پکارا۔

"کلام صاحب! او کلام صاحب!" پھر لپکتے ہوئے
ہوئے آگے بڑھے اور نہایت بے تکلفی سے کلام صاحب
کا ہاتھ تھامتے ہوئے ان سے بغل گیر ہو گئے۔ کلام صاحب
نے کوئی تعرض نہ کیا۔ اور دونوں حضرات محو گفتگو ہو گئے
مجھ پر ایک بار پھر حیرتوں کا حملہ ہوا۔ تو یہ تھے کلام صاحب
یعنی ابھی ابھی جس شخص نے بھری محفل میں ان سے ایسی
اہانت آمیز گفتگو کی تھی، اس کا اسی طرح خیر مقدم کیا تھا
جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ کیا اتنی آسانی سے کوئی شخص
ایسی تلخی کو پی سکتا ہے؟ اس طرح ان کی تہہ دار شخصیت
کا ایک اور گوشہ مجھ پر منکشف ہوا جس میں وسیع القلبی
اور اعلیٰ ظرفی کی ایک جھلک دیکھنے کو ملی۔ کلام صاحب
سے یہ میری پہلی "بے مکالمہ ملاقات" تھی۔

کلام صاحب سے میری اگلی ملاقات سچ مچ کی ملاقات
تھی اور وہ بھی خاصی ڈرامائی انداز کی۔ غالباً ۸۵ء کی
بات ہے میں اپنی پہلی POSTING (ضلع سیتامڑھی)
سے تبدیل ہو کر ٹکاری (ضلع گیا) آ گیا تھا۔ اور وہاں
سب رجسٹرار کا چارج سنبھالے ہوئے مجھے تقریباً ایک
برس ہو چکا تھا۔ میرا ضلع ہیڈ کوارٹر گیا میں تھا جہاں دفتری
مشغولیات کے تحت اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ ایک دن
کسی سلسلے میں [illegible] آفس [illegible] صاحب رجسٹرار اس
وقت لنچ پر تھے۔ [illegible] گیا۔ رجسٹرار
صاحب کسی سے [illegible] مجھے دیکھ کر مسکرائے بیٹھنے
کا اشارہ کیا۔ پھر چائے کے لئے چپراسی کو آرڈر دینے کے
[illegible]

گفتگو ہوئی ۔ اس کے بعد انہوں نے میری ادبی مشغولیات
کے بارے میں بھی ایک دو سوال کئے ۔ پھر چونک کر بولے ۔
" ارے آپ ان سے ملئے ۔ یہ گیا شہر کے پرانے رئیس
ہیں ۔ معززین میں شمار ہوتا ہے ۔ اور اردو لٹریچر میں بڑی
حیثیت رکھتے ہیں ۔ آپ جانتے ہوں گے حیدری صاحب
ہیں یہ ـــــ " انہوں نے ان صاحب کی جانب دیکھ کر کہا ۔
جو میرے پاس والی کرسی پر تھے ۔

" حیدری صاحب ! " ایک جھماکا میرے ذہن میں
ہوا " کلام حیدری صاحب "

میں اضطراری طور پر مارے شرمندگی کے اپنی کرسی
سے اٹھ کھڑا ہوا ۔ اور کھڑے ہی کھڑے ان سے مصافحہ کیا ۔

" کلام صاحب ! بے ادبی معاف فرمائیں گے ـــــ میں
ٹھیک سے پہچان نہیں سکا " وہ مسکرا کر رہ گئے ۔

پھر میں نے اپنے بارے میں مختصراً بتایا ۔ تھوڑی دیر
بعد رجسٹرار صاحب تو معذرت کر کے اجلاس پر چلے گئے ۔
اور میں نے موقع غنیمت جان کر کلام صاحب سے بہت ساری
باتیں کرنے کی ٹھان لی ۔ شاید انہیں بھی جو کام تھا اس کے
لئے وہاں کچھ دیر رکنا تھا ۔ اس لئے میں نے اپنا تعارف ذرا
تفصیل سے کرایا ۔ مورچہ اور آہنگ سے اپنی پرانی انسیت
کا ذکر کیا ۔ ان رسائل کا ذکر آتے ہی لگا جیسے گفتگو میں
ان کی دلچسپی بڑھ گئی ہے ۔ بولے ۔

" بھئی ! مورچہ اور آہنگ نے تو ہمیشہ نئے TALE
NTS کو متعارف کرانے اور آگے بڑھانے کا کام کیا ۔"

پھر میں نے آہنگ کے بارے میں کئی سوالات کئے ۔
انہوں نے بتایا " اسے دوبارہ جاری کرنے کا ارادہ ہے
OFFSET پر شائع ہوگا ۔ اور سارا کام دلی سے ہوگا ۔
آہنگ کو پہلے سے بہتر بنایا جائے گا ۔"

پھر ادب کی تازہ صورت حال پر بھی ہلکی پھلکی
باتیں ہوتی رہیں ۔ وہ بولتے رہے اور میں سنتا رہا ۔
اس دوران میں نے "مچھلی اور چشتی" والا لطیفہ بھی
انہیں یاد دلایا ۔ جو حسرت والے سمینار میں ان کی گفتگو
سے تخلیق ہو گیا تھا ـــــ ہنستے رہے دیر تک ۔ اِدھر اُدھر
کی باتیں ہوتی رہیں ۔ اس کے بعد کئی سال تک ان سے
ملاقات نہ ہو سکی ۔

پھر ٹکاری سے میرا تبادلہ ارریہ ہو گیا ۱۹۹۱ء کے
اخیر میں ۔ میں یہاں چلا آیا ۔ اسی دوران کلام صاحب کی
دلی میں رہائش کی خبر ملی ۔ ان کی بیماری اور صحت یابی
کے بارے میں بھی اچھی بری خبریں ملتی رہیں ۔ میں ذاتی خطوط
لکھنے کے معاملے میں بچپن سے ہی سست اور بے پروا
واقع ہوا ہوں ۔ اس لئے صرف سوچ کر رہ گیا ۔ ان کی خیریت
کے لئے ہی سہی ایک خط بھی نہ لکھ سکا ۔

میرا پہلا شعری مجموعہ "خوابوں کے ہمسائے "
کے نام سے ۱۹۹۳ء میں پوری طرح منظر عام پر آچکا تھا ۔
یہ کتاب سید احمد قادری نے اپنے ادارے مکتبہ غوثیہ
گیا سے شائع کی ہے ۔ اگست ۹۳ء میں مجموعے کے سلسلے
میں چند ضروری امور پر گفتگو کے لئے قادری صاحب سے
گیا میں ملاقات کی ٹھہری تھی ۔ اس وقت تک بہت کم لوگوں
کتاب بھجوائی جا سکی تھی ۔ قادری صاحب نے مشورہ دیا
کہ ایک جلد کلام صاحب کو بھی دی جانی چاہئے ۔ میں متذبذب
ہو گیا ۔ دراصل کلام صاحب کا میں فین ضرور تھا ۔ لیکن
مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ میری کتاب اس قابل بھی ہے کہ
ان جیسے اہل نظر کو پیش کی جا سکے ۔ خدا جانے میرا معمولی
سرمایہ ان پر کس طرح اثر انداز ہوتا ۔ بہرحال میں غور کرتا
رہا ۔ شام کو ہم لوگ ڈاکٹر علیم اللہ حالی سے ملنے گئے حالی
صاحب سے غالباً ڈیڑھ برسوں بعد ملاقات ہوئی تھی ۔ بڑی
گرمجوشی اور خلوص سے ملے ۔ مجموعے کی تعریف کی اور اس

اپنی رائے دینے کا پُرخلوص اور محبت آمیز وعدہ کیا۔ پھر کلام صاحب کی بات چھڑ گئی معلوم ہوا کہ علاج کے بعد ابھی چند ہی روز قبل دلی سے لوٹے ہیں۔ میں نے سوچا ضرور ملنا چاہیئے۔ پھر حالی صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا۔

"آپ اتنی دور سے آئے ہیں ضرور مل لیجیے اور اپنی کتاب بھی انہیں پیش کر دیجیے"۔

بہرحال شام کو تقریباً ساڑھے سات بجے میں سید احمد قادری صاحب کے ساتھ ریتہ ہاؤس پہونچا۔ خبر بھجوائی گئی، کلام صاحب موجود تھے۔ فوراً بلوا لیا۔ اوپر والی منزل پر ایک کشادہ صحن سے گذر کر انتہائی آراستہ ڈرائنگ روم میں پہونچے۔ ڈرائنگ روم تو چھوٹے موٹے بھی ہو سکتے ہیں۔ دیوان خانہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ چند لوگ پہلے سے موجود تھے۔ جن سے کلام صاحب محوِ گفتگو تھے۔ میں نے دیکھا۔ بعد سلام قادری صاحب نے کچھ میرا تعارف کرایا اور کچھ ہم لوگ صوفے پر بیٹھے۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کیوں کہ میں تو اس شخص کو دیکھ رہا تھا جسے بارہ برس قبل پہلی بار پٹنہ میں دیکھا تھا۔ اور اس کے بعد دوسری بار گیا میں ہی ایک اتفاقیہ ملاقات میں (ذکر اوپر آ چکا ہے) اور آج اس کے پانچ برسوں بعد نہایت شفاف کرتے پاجامے میں ملبوس، وہی ہینڈسم چہرہ، وہی وجاہت وہی تمکنت اور عینک چڑھی ہوئی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی وہی جگمگاتی ذہانت! سب کچھ وہی۔ مگر وہ صحت کہاں تھی؟۔

کیا یہ شخص کلام حیدری ہی ہے؟؟ میرے دل نے سوال کیا۔ دل کا آپریشن واقعی ان پر اثر انداز ہوا تھا۔ ہلکی سی رسمی گفتگو کے بعد میں نے کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔

کتاب الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر بولے

"یہ محمود ہاشمی کو کیسے پٹا لیا آپ نے؟"۔

بس مجھے یقین آ گیا کہ یہ کلام حیدری ہیں۔ اس قسم کا ریمارک انہیں کا ہو سکتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم ہوا کہ کتاب کے BACK COVER پر جو محمود ہاشمی کی رائے تھی اس کو اس وقت انہوں نے کس طرح لیا۔ لیکن میں نے کلام صاحب کی بات کا صرف اتنا جواب دیا۔

"بس چند منٹوں کی ملاقات میں محمود صاحب نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ اور لکھ دیا تھا۔"

پھر میں نے بات کو آگے بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ ممکن ہے ادبی سطح پر محمود ہاشمی سے ان کے نظریاتی اختلافات ناپسندیدہ حد تک رہے ہوں۔ (ویسے ان کا یہ تبصرہ مجھے بڑا عجیب لگا تھا) پھر اسی دوران مزید کچھ لوگ آ گئے۔ اور کلام صاحب باری باری سب کی طرف متوجہ ہوتے رہے ہیں اور قادری صاحب ناشتے میں آئی مٹھائیاں اور پھل تھوڑا تھوڑا کر کے کھاتے رہے۔ چائے بھی آ گئی، چائے کے دوران کلام صاحب کو میں نے ۱۹۸۴ء میں ان سے اپنی ملاقات کی یاد دلائی۔ لگا کہ ذہن پر زور دے رہے ہیں۔ پھر حالیہ POSTING کے بارے میں انہوں نے پوچھا۔ میں نے جب ارریہ بتایا تو ان کی دلچسپی بڑھ گئی۔ کہنے لگے۔

"بھئی! وہاں ایک وکیل صاحب ہیں شمس جمال"

"میں نے بتایا کہ ملاقات ہے جمال صاحب سے میری"

اس پر انہوں نے کہا۔

"اس بار جب ملاقات ہو تو آپ ان سے کہیں کہ میں ان کے علاقے سے ایم پی کے لئے الیکشن لڑنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں وہ ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

مجھے حیرت ہوئی کہاں تو اکثر ایسے غلغلے اٹھتے رہے کہ کلام صاحب کو فلاں یونیورسٹی کا V.C بنایا جا رہا ہے اور کہاں یہ خبطِ سیاست! تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اجازت چاہی، کلام صاحب نے مجھ سے کہا

"گیا آتے رہیے اور ملتے بھی رہیے"۔

چلتے چلتے قادری صاحب نے کہا: کلام صاحب اس کتاب پر ہم لوگ آپ کے تاثرات کے خواہش مند ہیں۔

میں اگلے دن اڑیسہ چلا آیا۔ آنے سے پہلے میں نے قادری صاحب سے یہ ضرور پوچھا کہ کلام صاحب میری ناچیز کتاب پر کیا لکھیں گے میں کوئی بڑا نقاد بھی نہیں ہوں پھر وہ جلدی کسی پر لکھتے بھی نہیں۔ آپ کی خواہش خالی جائے گی۔ خواہ مخواہ۔

اڑیسہ آنے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد قادری صاحب سے فون پر میری بات چیت ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ

"بھئی کلام صاحب آپکو یاد کر رہے تھے، اگلی بار گیا کب آرہے ہیں، ملنا چاہتے ہیں۔"

مجھے حیرت ہوئی، میں نے کریدنا چاہا۔ انہوں نے لاعلمی ظاہر کی پھر اس پر زور دیا کہ اگلی بار میں گیا کا پروگرام بنا کر کلام صاحب سے ضرور مل لوں۔

اس کے تقریباً ڈیڑھ ہفتے بعد فون پر ہی ایک گفتگو میں قادری صاحب سے میں نے کلام صاحب کی خیریت دریافت کی اور ان کی صحت کے بارے میں خصوصیت سے پوچھا۔ وہ بولے

"کلام صاحب بخیر ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے خود ہی مجھ سے آپ کے بارے میں دریافت کیا۔ بھئی ادھر آنا ہو تو ضرور مل لیجئے آکر۔ ویسے لگتا ہے کتاب اثر چھوڑنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔"

اور مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔ جی چاہا کلام صاحب کو فون کر کے خود خیریت دریافت کر لوں مگر کسی وجہ کر فون پر ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔

اکتوبر ۹۵ء کے پہلے ہفتے میں میرے آبائی مکان پر (سہسرام میں) شادیوں کی تقریبات تھیں۔ میں ستمبر کے آخر عشرے میں ایک ماہ کی چھٹی لے کر سہسرام چلا گیا تھا۔ ۲۶ر یا ۲۷ ستمبر کو تقریباً ۹ بجے شب فون کی گھنٹی بجی۔ گیا سے سید احمد قادری تھے۔ انہوں نے مبارکباد دیتے ہوئے یہ خبر سنائی کہ کلام صاحب نے پانچ صفحے کا ایک مضمون بعنوان "شاہد جمیل" قلم بند کر کے انہیں بھجوا دیا ہے۔

یہ انتہائی چونکانے والی اطلاع تھی۔ مجھے خوشی بھی ہوئی اور حیرانی بھی۔ میں نے قادری صاحب کا اس اطلاع کے لئے شکریہ ادا کیا۔ پھر انہوں نے فون پر ہی متعلقہ مضمون سے چند اقتباسات اور اشعار سنائے اور کہا کہ کلام صاحب نے مضمون کو کتاب نما، شاعر اور ادب لطیف وغیرہ میں سے شائع کرانے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ (افسوس کہ یہ مضمون ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا)

سلسلہ منقطع کر کے میں نے کلام صاحب کو فوراً ڈائل کیا۔ غالباً جاگے ہی ہوئے تھے۔ رابطہ قائم ہو گیا۔ میں نے مضمون کے لئے ان کا خاص شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی ممنونیت کا اظہار کیا۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ وہ فی الحال کسی سنجیدہ ادبی اور ذہنی کام کے لئے شاید خود کو تیار نہ کر سکیں گے۔ صحت انہیں اس کی اجازت نہ دیتی مگر وہ کلام حیدری تھے۔ ہر وقت فعال رہنے والے، ہارنا کسے کہتے ہیں نہیں سیکھا تھا۔ فون پر تو تقریباً دس منٹ تک باتیں ہوتی رہیں۔ ٹوکتے ہوئے کہا۔

"بھئی اس میں شکریے اور احسان کی کیا بات ہے آپ کی کتاب میں اتنے موضوعات ہیں اور شاعری میں اس قدر تنوع ہے کہ ایک ایک تخلیق پر مضمون لکھے جانے کی ضرورت ہے میں نے تو مختصراً کچھ لکھ دیا ہے۔"

میں نے ان کا مکرر شکریہ ادا کیا۔ پھر کتاب کے تعلق سے مزید باتیں ہوتی رہیں جن کا یہاں موقع نہیں۔ بس وہ بولتے رہے اور میں سنتا رہا۔

کلام صاحب سے یہ میری آخری گفتگو تھی۔

اور پھر فروری ۱۹۹۶ء کے اوائل کی ایک شام ——

بوجھل، اداس اور سرد،

میں اڑیسہ بازار میں ایک بک اسٹال پر کوئی رسالہ

یحیدہا تھا کہ ایک شخص نے پاس آکر کہا۔
"سر، کچھ سُنا آپ نے؟ کلام حیدری صاحب کا انتقال ہو گیا ۔۔۔۔"
"انتقال ہو گیا! ؟ کب؟ کیسے؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"
یہ انتہائی دل دہلانے والی خبر تھی۔ کلام صاحب کا انتقال، ۔۔۔۔ اوہ خدایا ۔۔۔۔ کیسے ہوا؟ یقین نہیں آرہا تھا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک میں وہیں سکتے کے عالم میں رہا۔
پھر بے حد تذبذب اور بے یقینی کے عالم میں قریب ہی کے ایک ٹیلی فون بوتھ کی طرف لپکا، کیا سے رابطہ کر کے تفصیل معلوم کی جا سکتی تھی۔ لیکن ناکارہ نکلی۔
وقفے سے واپسی پر میں اپنے کمرے میں پہونچا۔ چند ہی منٹوں میں اندر پچھلے کئی دنوں کے اخبارات الٹ پلٹ دیئے گئے۔ افسانہ نگار رفیع حیدر انجم بھی اتفاق سے کہاں آ گئے تھے۔ آخر کار قومی تنظیم میں ایک جگہ انہوں نے ڈھونڈ نکالا ۔۔۔۔ ۸ فروری ۱۹۹۴ء! کلام صاحب واقعی ہمارے درمیان سے اٹھ چکے تھے ۔۔۔۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک طویل وعریض سناٹا۔ اچانک میرے دل و دماغ میں پھیل گیا ہے ۔۔۔۔ دور تک
کلام صاحب نہیں رہے۔ لیکن کلام صاحب ہیں۔ اس لئے کہ کلام حیدری ہے۔ وہ جن کی شخصیت عہد سازانہ تھی ہے۔ جن کی ذات خود ایک انجمن کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ جن کی دانشوری ایک مکتب فکر کی طرح کئی نسلوں کو متاثر کرتی ہے۔ وہ لوگ ہمیشہ رہتے ہیں۔ اور صدیوں پر محیط ہوتے ہیں۔ ایسی ہستیاں ذہنوں میں سفر کرتی ہیں اور یہ سفر نسل در نسل جاری رہتا ہے۔ اپنی موت سے چند ماہ قبل سید ظفر ہاشمی (مدیر دو ماہی "گلبن" احمد آباد) کے نام ایک مکتوب میں انہوں نے لکھا تھا:
"۔۔۔۔ اس جھوٹ اور فریب کی دنیا اور زمانے میں جو قلم سچ لکھ دے وہ غازی یا پھر شہید ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ میں نے آہنگ میں جہاں نئے افسانہ نگاروں اور شاعروں کے خصوصی مطالعے شائع کئے وہاں میں نے کئی نقاب پوشوں اور فراڈ اشخاص کے پول بھی کھولے۔ معتوب ہوا مگر بیس سال تک کا آہنگ اور تقریباً بیس سال تک کا مورچہ ہفتہ وار اپنے فائلوں میں اپنے عصر کی ادبی حالت چھپائے ہوئے ہیں۔ جس کو آنے والی نسلیں پڑھیں گی۔۔"
(کلام حیدری)

بقیہ: کلام حیدری ایک زندہ آدمی

لوگ پہنچ سکے۔ لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جس شخص کی انتھک کوششوں سے زندگی اسے دریافت نہیں کر سکی، اسے موت نے دریافت کر لیا۔
کیا اسے زندگی پر موت کی فتح سمجھی جائے۔؟
مگر موت نے اس پر فتح حاصل کر کے اسے تو زندہ جاوداں بنا دیا۔
کیا اس کے اور ہمارے درمیان مٹی کا پردہ ہو جانے سے دوری ہو گئی ۔۔۔۔؟ نہیں ۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔
وہ زندہ رہے گا ہمارے دلوں میں، ہمارے فن پاروں میں۔ ہمارے قلم میں، ہم اسے کبھی بھول نہیں پائیں گے۔
اور صرف ایسا کر کے ہی ہم موت کی سازش کو ناکام بنا سکیں گے۔

کلام حیدری — جو سنا، جو دیکھا، جو سمجھا

ڈاکٹر غنی حیدر

کلام حیدری کے متعلق میری واقفیت ٹھیک اسی طرح نامکمل ہے جس طرح کسی بھی آدمی کی واقفیت اس کی اپنی زندگی سے متعلق ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی ترجمانی ایک شاعر نے یوں کی ہے ؎

بس حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

کلام حیدری کی ابتدائی زندگی سے میری واقفیت کے ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔ کیونکہ عمر میں مجھ سے کہیں بڑے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی ابتدائی زندگی گیا میں گذری بھی نہیں تھی۔ گیا سے تو ان کا تعلق ۱۹۵۶/۵۷ء میں ہوا جب ان کی شادی گیا کے ایک مشہور و معروف ڈاکٹر جناب ابوالخیر صاحب کی صاحبزادی شگوفہ حیدری سے انجام پائی تھی۔

کلام صاحب سے متعلق میری واقفیت اس وقت ہوئی جب میں کالج کا طالب علم تھا۔ اور کلام صاحب گیا کے ادبی اور سماجی امور میں باضابطہ اپنا ہاتھ پیر پھیلانا شروع کر چکے تھے۔ اس وقت سے لے کر کلام صاحب کی وفات تک جو کچھ میں نے کلام صاحب کے متعلق جانا وہ ان کے سلسلے میں میرا First Hand Knowledge کہا جاسکتا ہے بقیہ اس سے قبل کی حکایت ہستی سے متعلق میری معلومات محض سنی سنائی باتوں یا ایسے تذکرے جو ان کے متعلق فراہم ہیں یا ان کی خود نوشت سوانح حیات وغیرہ کی رہین منت ہیں۔ لہٰذا میں پہلے ان حکایات ہستی کی تفصیل پیش کرتا ہوں جو میرے احاطۂ علم میں SECIND Hand Knowledge کی طرح آتی ہیں۔

کلام صاحب کی پیدائش کی تاریخ کے سلسلے میں کوئی بات وثوق سے کہنی مشکل ہے۔ کیونکہ خود ان کے مطابق یہ تاریخ مشتبہ ہے، وہ لکھتے ہیں:

"مجھے اپنی پیدائش کی تاریخ یاد نہیں ہے
لیکن میری ماں نے مجھے بتایا کہ میں ۱۹۲۰ء
وغیرہ میں پیدا ہوا۔"

اس جملے میں وغیرہ کا لفظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کلام صاحب اس تاریخ سے مطمئن نہ تھے۔ بہرحال یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ کلام صاحب پیدا ہوئے تھے اور یہی اشتباہ سے بعید ان کی پیدائش کا سنہ رہا ہوگا۔

کلام حیدری کے حسبی و نسبی تفصیلات کی کھوج کی پر پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک مقبول اور معتدد گھرانے کے چشم و چراغ تھے جس گھرانے کی اپنی روایت تھی اور جس گھرانے کے اکثر و بیشتر افراد شعر و ادب کی فضا میں معروف رہے تھے

کلام صاحب کی دادیہال موضع پچپا ضلع مونگیر ہے اور مونگیر ان کی جائے پیدائش ہے۔ نانیہال بھی مونگیر ضلع کے ہی ایک گاؤں موضع داکڑا میں واقع ہے۔ ان کے والد جناب انعام الحق صاحب مرحوم پولس ڈیپارٹمنٹ کے کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اور پر دادا مرحوم جناب امیر حیدر صاحب اپنے زمانے کے جید عالموں میں تھے جو آصف بہاری کے استاد تھے۔ اس طرح ان کا خاندان اپنے علم و فضل اور داد و دہش کی بدولت نہ صرف اپنے علاقے میں بلکہ صوبہ بہار میں مشہور تھا۔ اسی خاندان میں کلام حیدری نے نشو و نما پائی۔ اور یہاں سے وہ سب کچھ حاصل کیا جسے علمی ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کہہ سکتے ہیں۔

کلام حیدری کی ابتدائی تعلیم ان کے نانا کے زیر نگرانی شروع ہوئی۔ اور اس وقت سے بارہ سال تک یہ ان ہی کی تربیت میں رہے، ان ہی سے انہوں نے اردو فارسی وغیرہ پڑھی۔ اور قرآن اور اسلامی تعلیم سے بہرہ مند ہوئے۔

کلام حیدری کی ماں بہت ہی نیک اور عبادت گذار خاتون تھیں۔ یہ ہمیشہ اپنی اولاد کی اچھی تعلیم و تربیت کے لئے فکر مند رہتیں۔ اور انہیں راہ مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرتی رہتیں۔ ان کی ایک رشتہ کی خالہ تھیں جو اپنے دور کی اردو فارسی، نیز تاریخ حدیث کی جید عالموں میں تھیں۔ جو موضع ملک چک بربگیہ میں قیام پذیر تھیں۔ کلام حیدری نے ان سے بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔

کلام صاحب بارہ سال کی عمر میں اسکول کی تعلیم کے لئے پٹنہ بھیجے گئے جہاں ان کا داخلہ مسلم ہائی اسکول میں ہوا۔ یہاں سے انہوں نے آٹھواں درجہ پاس کیا۔ اور تب لوئیس میں رام موہن رائے سمنری میں داخلہ لے لیا۔ یہ زمانہ ۱۹۴۲ء کا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ۱۹۴۲ء کی اہمیت مسلّم ہے کیونکہ یہی وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں "انگریز بھگاؤ" کی تحریک زوروں پر تھی۔ اور سودیشی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ لڑکے اور کالج چھوڑکر آزادی کی جنگ لڑنے کو کمر بستہ ہو گئے تھے۔ اساتذہ نے اس مہم کو سر کرنے کے لئے اپنی اپنی خیرآباد کہنا شروع کر دیا تھا۔ وکلا نے وکالت چھوڑ دی۔ رائے بہادر اور خان بہادر صاحبان اپنے خطابات واپس کر رہے تھے۔ کلام حیدری بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ اس تحریک کے پاداش میں بہت سارے مجاہدین آزادی نے صبر آزما حالات کا سامنا کیا۔ بیشتر سکریٹریٹ میں گولیاں چلیں۔ اور نہ جانے کتنے نوجوان مار ڈالے گئے۔ کلام صاحب بھی اسکول کے طالب علم ہونے کے باوجود پکٹنگ کرنے والوں میں شریک ہوتے تھے۔ جب انگریز سپاہیوں نے رام موہن رائے سمنری میں تالا بند کر دیا تھا انہوں نے طلبہ کی اچھی خاصی تعداد کے ساتھ بڑھ کر اس تالے کو توڑ دیا تھا۔ اور خود کو آگے رکھ کر نہ جانے کتنے آزادی کے متوالوں کو اسکول میں داخل کر دیا تھا۔

یہ واقعہ کلام کی زندگی میں بے حد اہم تھا۔ اس وقت اس تحریک کو کچلنے کے لئے انگریز سرکار ہر طرح کا حربہ کام میں لا رہی تھی۔ اور دوسری طرف کلام کے گھر والے ان سے بڑی توقعات وابستہ کئے بیٹھے تھے۔ بہر حال آزادی کے متوالے اپنی دھن میں زندگی اور کیریئر کا خیال کئے بغیر اپنا وجود منوانے پر تلے ہوئے تھے۔ یہیں سے کلام کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ جس کے باعث ان کی تعلیمی زندگی پر بڑا اثر پڑا۔ یہ اسکول سے نکالے گئے کچھ دنوں تک ملک چک میں روپوش رہے۔ پھر جلد ہی حالات قابو میں آ گئے اور جب حالات کچھ نار[مل]

ہوئے تو انہوں نے مسلم ہائی اسکول سے ۱۹۴۵ء میں میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد کلکتہ چلے گئے جہاں ایک نائٹ کالج میں کامرس پڑھنے کے لئے داخلہ لیا۔ اور وہیں سے ۱۹۴۷ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو یہ کھولنا چلے گئے جہاں انہوں نے رنگ پور میں ایک ریستوران کھولنا چاہتے تھے کہ تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہے مگر چونکہ ان دنوں کالج نہیں تھا اس لئے کچھ دنوں تک ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع رہا۔ اور جب ہند و پاک کے درمیان پاسپورٹ کا سلسلہ شروع ہونے کو تھا تو یہ ہندوستان لوٹ آئے ان دنوں ان کے والد رانچی میں پوسٹڈ تھے اس لئے وہاں رانچی کالج میں بی۔ اے آنرز میں اردو میں داخلہ لیا۔

رانچی میں یہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور انجمن ترقی پسند مصنفین اور کمیونسٹ پارٹی سے قریب ہوگئے دریں اثنا انہوں نے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے پٹنہ میں ہونے والی صوبائی کانفرنس میں شرکت کی۔ اور تب ۱۴ جنوری ۱۹۵۰ء میں سیاسی قیدی بناکر جیل بھیج دیئے گئے۔ بہر حال جب جیل سے چھوٹے تو انہوں نے آنرز کا امتحان دیا۔ اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ اور یہیں سے ۱۹۵۲ء میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ اردو میں ایم۔ اے کیا۔

کلام کی اردو صلاحیت اپنے گھرانے کے اثرات کے باعث قابل لحاظ تو تھی ہی، پٹنہ یونیورسٹی کے بے مثال اساتذہ مثلاً پروفیسر اختر اورینوی، جناب صدرالدین صاحب وغیرہ کی صحبت میں انہوں نے اور بھی بہت کچھ سیکھا۔ اس یونیورسٹی میں انہیں ذہین باشعور محنتی اور اردو شعر و ادب کے رسیا طالبعلموں کی ایک Galaxy ملی جن کی صحبت میں ان کی ذوق ادب اور شوق افسانہ نگاری کی مزید آبیاری ہوئی۔ کلام کے ان دوستوں میں الفر عظیم، منظر شہاب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جب تعلیم کی تکمیل ہو چکی تھی تو روزی روٹی کا مسئلہ درپیش ہوا زندگی کی اس منزل پر کچھ استادوں نے استادی دکھائی مگر کلام اس سے دل برداشتہ نہ ہوئے بلکہ انہوں نے فوری طور پر کوپرنیہ کالج کے شعبۂ اردو میں لکچراری کی اسامی قبول کرلی۔ یہاں وہ ۵۲ء سے ۵۵ء تک رہے اسی درمیان ان کی شادی ہوگئی۔

شادی کے بعد کلام کی زندگی ایک کروٹ لے گئی، انہوں نے لکچراری چھوڑ دی اور بزنس میں لگ گئے۔ ایک کنکریٹ فیکٹری کے مالک ہوگئے، انہوں نے اپنی تجارت کو خوب خوب فروغ دیا، کئی جگہ پہاڑ کاٹنے کا کنکریٹ بنانے کا کارخانہ کھولا، یہاں تک کہ دیکھتے دیکھتے کلام حیدری کا شمار گیا کے اہم تاجروں اور سرمایہ داروں کے درمیان ہونے لگا۔

اول اول سرمایہ داری کے اس Glamour نے ان کو بہت رجھایا، اب اس کے باعث کلام حیدری گیا کے چھوٹے بڑے حلقے پر چھا گئے۔ اسی کی بدولت وہ کانگریس پارٹی میں شریک کئے گئے۔ اس پارٹی کا ان دنوں بڑا بول بالا تھا، بہار کی وزارت تھی اور اسمبلی یا پارلیامنٹ کا ممبر بننا INTLECTUAL کے لئے بھی قابل فخر سمجھا جاتا تھا، لہٰذا کلام نے بھی کانگریس کی ٹکٹ کی جگہ میں بہار تک رسائی حاصل کی۔ بہار کی سیاست میں ان دنوں انوگرہ بابو کے بیٹے ستیندر نرائن سنگھ کی چلتی تھی۔ کلام کو ان کی قربت کا شرف بھی حاصل ہوا۔

اور یہ دو دو بار الیکشن کے ذریعہ سینیٹ کے ممبر منتخب
ہوئے۔ الوگرہ کالج کی انتظامیہ میں بھی شامل کئے گئے۔
اور گوتم بدھ مہیلا کالج میں بحیثیت EDUCATIONIST
کے مقام حاصل ہوا مرزا غالب کالج گیا کے مجلس منتظمہ میں بھی
شریک کئے گئے۔ اور جوائنٹ سکریٹری کے عہدہ پر متمکن ہوئے
کلام حیدری کی زندگی کا دور عروج کا دور تھا۔
ایسا لگتا تھا کہ کلام کے لئے قدرت نے ساری راہیں ہموار
کردی ہیں اور شاید آنے والا کل ان کو پارلیامنٹ یا اسمبلی
کی ممبری یا اس سے بھی بڑھکر وزارت کے عہدہ پہ متمکن کرنیوالا
والا ہے یہ وہ دور تھا جب گیا کے BIG GUNS
خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان کی جگھٹ ریٹہ ہاؤس میں ہر وقت
دیکھنے کو ملتی اور کلام بھی اپنا وجود منفرد منوانے کی خاطر ہر طرح
کی سعی کرتے رہتے کبھی ادبی اور کبھی سماجی مجالس منعقد کرکے
اور کبھی شہرہ آفاق شاعروں اور سیاسی بازی گروں کو
اپنے یہاں مقیم رکھکے جشن نوبہاراں کا منظر اپنے یہاں
پیش کرتے رہتے۔

مشاغل تجارت میں انہماک کے باوجود وقت
نکال کر وہ سماجی نیز ادبی مسائل سے وابستہ رکھکر ہمیشہ
تحریکی بنے رہے۔ ذوق ادب کی تسکین کی خاطر اور زبان
وادب کی خدمت کے لئے انہوں نے ۱۹۶۳ء میں کلچرل
اکادمی کی بنیاد رکھی جہاں سے بہت ساری علمی اور ادبی
تحریکیں ابھریں اور ایک عیش کرنے لگ گئیں اسی کلچرل
اکاڈمی کے تحت انہوں نے آزاد ڈے منایا جن میں دہلی کے
اردو کے جید ناقدوں اور علماء وفضلا کو دعوت دی اور
گیا ملکہ اہل بہار کے سامنے آزاد کی قومی خدمت، ان کی علمی
ادبی، سیاسی اور ثقافتی صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔ اس موقع
پہ پروفیسر شعیب اشرف، پروفیسر عبدالعلیم، احتشام حسین،
خلیل الرحمن اعظمی، راہی معصوم رضا، صدر الدین فضا،

اور ریاست علی ندوی وغیرہ جیسے جید عالموں کی شر
بابرکت نے یہ ثابت کردیا تھا کہ ادب کی دنیا میں کلام کو
خاصی حمایت حاصل ہے۔
کلام کی اس کاوش نے گیا کی ادبی سرگرمیوں کو
بار پھر تیز کردیا یعنی یہ کہ گیا کی وہ ادبی محفل جو انجم مانپوری
ندرہ کے بعد ویران ہو چکی تھی اور اگر کچھ قائم تھی محفل تا
اور کتاب منزل میں جمع ہونے والے استاذ شعراء بسمل گیا
علامہ سرکا بری، عزیز عظیم آبادی، شمس گیاوی، مولانا
پھلواری اور ان کے شاگردان شاہ لعل قادری، کیفی
اشک، تمنا، احمد عاصی، فرحت گیاوی، منیر واحدی، اد
حسن ادیب، اور غنی حیدر وغیرہ تک جو وہاں بیٹھ کر شعر
ادب کے چرچے کیا کرتے تھے، اس کے علاوہ گیا کی ادبی ز
میں ایک ٹمٹماتا چراغ ماہنامہ سہیل تھا جو تاج پریس سے
شائع ہو کر گیا کی ادبی زندگی کو قائم رکھے ہوئے تھا
کلام حیدری کے گیا آنے کے بعد اس کی ادارت میں شر
ہوئے اور اس دم توڑتے ہوئے ماہنامے کو ایک بار
سے زندہ کیا۔ وہ اس طرح کے کچھ ہی دنوں میں انہوں نے
کا جمیل نمبر شائع کیا، وہ جمیل نمبر جو آج بھی جمیل کی شاعر
اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے ایک قیمتی دستاویز ہے
جمیل نمبر کی اشاعت کے ساتھ ہی کچھ عقائدی مسائل
پہ اختر قادری مرحوم اور جمیل مظہری کے درمیان ایک
چھڑ گیا اب کیا تھا دونوں طرف کے حمایتی کمر کس کے م
میں آگئے۔ اور اچھی خاصی علمی وادبی بحث کی گرما گرمی
ہوئی۔ ان دنوں ایک رسالہ آئینہ نکلتا تھا۔ اس کے
اور کئی جرائد دلی اور پٹنہ سے شائع ہوتے تھے جس
جمیل اور اختر کے حوارین طرح طرح سے ایک دوسرے
معاونت اور مخالفت میں اپنا اپنا زور قلم ہر ماہ دکھلاتے
اس طرح نہ صرف گیا کی ادبی محفل کی سرگرمی بڑھی، ا

پورے ہندوستان میں سہیل کے حوالے سے یہ جنگ چلتی رہی۔ اس ادبی جنگ کے باعث لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق بڑھا اور رسالے اور جرائد کی اشاعت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کلام نے اپنی صلاحیتوں سے گیا اور بہار کا ندیم کے بعد از سر نو ایک نیا پس منظر تیار کیا اور اس پس منظر میں ۱۹۶۴ء میں انہوں نے ہفتہ وار "مورچہ" کا اجرا کیا۔ اور پھر ۱۹۶۸ء میں ماہنامہ آہنگ نکالا۔ یہ دونوں پرچے ۱۹۸۴ء تک شائع ہوتے رہے۔

ان دونوں جریدوں نے گیا کی تہذیبی قدر و منزلت کو اردو دنیا میں دوبالا کیا۔ اہل علم سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ان دونوں جرائد نے کتنے ادبی معرکے سر کئے ہیں۔ پڑھنے لکھنے والے جانتے ہیں کہ مورچہ کا "میرا صفحہ" اور "ان کا صفحہ" جو معرکہ وہاب اشرفی اور محمود ہاشمی کے نام سے مشہور ہے اس نے واقعتاً ادب کی رفتار تیز کرنے میں کیا کچھ فرض نہیں انجام دیا ہے اسی معرکے کی بدولت دلی اور یوپی والوں کو پتہ چلا کہ اردو ادب کے تنہا جاگیر دار وہی نہیں ہیں، آہنگ کا فکشن نمبر اس کے بے لاگ تبصرے اور اس کی تنقیدیں ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اس طرح کلام نے ستھرے مذاق ادب کی بدولت کلچرل اکیڈمی کے تحت اردو کے فروغ اور اس کی اشاعت میں بڑی معاونت کی اور اس کے ساتھ ساتھ گیا کو اردو کے میپ میں ایک مخصوص جگہ دلوائی۔

کلام نے نئے لکھنے والوں اور طالبعلموں کے ذوق ادب کی تربیت کا بھی فرض انجام دیا ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی کی خاطر ان کا خصوصی مطالعہ شائع کیا ہے اور انہیں نہ صرف ادب کی دنیا میں روشناس کرایا ہے بلکہ ان کے فن کی آبیاری میں ہاتھ بٹایا ہے۔ اور انہیں ادب کی دنیا کا غازی بنا کر رکھا ہے۔ آج جو بہت سارے ادیب افسانہ نگار اور ناول نگار جو اردو دنیا میں مقام رکھتے ہیں ان کی شہرت اور کامیابی میں کلام کے جرائد مورچہ اور آہنگ کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

کلام نے ۷۱/۷۰ء میں بی ایل کا امتحان بھی پاس کیا تھا لہٰذا شوقیہ طور پر وکالت کے پیشے سے بھی خود کو جوڑنے کی کوشش کی۔ ان کی بے لاگ علمی صلاحیتوں اور دیانت کے باعث انہیں گیا ضلع کے بار ایسوسی ایشن اور گیا کے کنزیومر گڈس ایسوسی ایشن وغیرہ میں لوگوں نے وائس چیرمین وغیرہ بنایا۔ سچ تو یہ ہے کہ کلام نے عوامی سطح پر بھی سماجی خدمت کا فرض انجام دیا ہے۔

کلام کے اندر انتظامیہ کی بڑی بے مثال صلاحیت موجود تھی۔ آزاد ڈے کانفرنس ہو یا ادبی و شعری محفل کا انعقاد کلچرل اکاڈمی میں پہلی جنوری کے موقعے سے فنکشن ہو یا خود ان کی بچی کی شادی کی تقریب، ان سب میں کلام کی سلیقہ مندی کا حسن دیکھنے کو ملتا۔ جب بھی کسی مہم کی منصوبہ بندی کرتے تو سارا نقشہ قبل سے ذہن میں تیار کر لیتے۔ اور پھر اسی ترتیب سے عملی اقدام کیا کرتے اور اس طرح انجام کار ان کی دور بینی خوش اسلوبی، نفاست اور کام کرنے کے انوکھے انداز کا مظاہرہ ہوتا۔ وہ اپنی کارگزاریوں میں وضع کردہ اصولوں پر سختی سے کاربند رہتے دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ بچی کی شادی کے موقع پر انہوں نے مہمانوں کی لسٹ کی فائل، امور مطبخ سے متعلق فائل، جہیز کی فائل، پنڈال کی سجاوٹ اور استقبالیہ کمیٹی کی فائل وغیرہ الگ الگ طور پر بنا رکھی تھی۔ اور اس طرح الگ الگ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو کام سپرد کر کے خود سپروائز کرتے۔

کلام حیدری بحیثیت انسان بھی بہت ساری خوبیوں کے حامل تھے وہ شریف آدمی تھے، مہذب تھے، وضعدار تھے۔ خوب سیرت تھے اور خوبصورت بھی۔ یہ آداب معاشرت سے واقف تھے۔ باتیں بے حد سنجیدگی سے کیا کرتے، خوش لباس اور جاذب نظر۔ ان کی ہر بات میں ایک نفاست کا

سلیقہ مندی ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ کسی کی باتوں کا جواب ہنس کر اور کبھی بے حد سنجیدگی سے دیتے۔ علمی بحث ہو یا مذاکرہ کی صورت ان کی خوش طبعی اور راست گفتاری کا ہر جگہ مظاہرہ ہوتا۔ غصے کا اظہار بھی بے حد سلیقے سے کرتے ایک بار کا ذکر ہے کہ غالب کالج کی مجلس منتظمہ میں کسی ریٹائرڈ پولیس افسر نے جو مجلس منتظمہ کے ممبر بھی تھے ان کو بہت ہی سخت سست کہا ان کی باتیں سن کر یہ ایک لمحہ کے لئے خاموش رہے پھر جواباً کہا جناب ان سے سخت الفاظ بھی میری ڈکشنری میں ہیں مگر میں ان کا استعمال آپ کے لئے نہیں کروں گا کیوں کہ میں آپ کو ان سے بھی بدتر سمجھتا ہوں۔

کلام حیدری اسم با مسمّٰی تھے یعنی کلام کو کلام کرنا آتا تھا خدا نے ان کو بے مثال تقریری صلاحیت عطا کی تھی، فطرت میں جرأت رندانہ تھی زبان پر گرفت تھی اور ان دونوں نے مل کر سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا۔ ہمیشہ بے حد تسلسل کے ساتھ کسی موضوع پر اظہار خیال کیا کرتے تھے ان کی باتوں میں منطقی دلائل اور فصاحت و بلاغت کا ٹھاٹ ہوتا۔ سامع ان کی باتیں سن کر مسحور ہو جاتے۔ یہ بات کرنے کا فن جانتے تھے اور ہمیشہ اپنی خوش طبعی گفتار اور جولانی اظہار سے لوگوں کا دل موہ لیتے تھے۔

کلام کی طبیعت میں بلا کی شوخی تھی۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار بہار اردو اکادمی کی کسی محفل میں پروفیسر عنوان چشتی حسرت موہانی پر اپنا مقالہ سنا رہے تھے اس محفل کی صدارت اردو کے اہم ناقد کلیم الدین احمد کے ذمہ تھی۔ جب چشتی صاحب اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے تو جہاں جہاں حسرت کا نام آتا وہ مولانا حالی پڑھ دیا کرتے۔ مجمع میں سے ایک شخص نے ان کی تصحیح کرنی چاہی تو آپ نے فرمایا کہ میں جہاں جہاں مولانا حالی کہوں آپ اسے حسرت موہانی سمجھئے گا۔ چشتی صاحب کے فوراً بعد کلام صاحب کو تقریر کرنی تھی انہوں نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے آج علم و ادب کا معیار کس قدر گر چکا ہے کہ بہت معلمان اردو بھی کسی ایسے ویسے سے کسی ایک شخصیت عام نوعیت کا مقالہ لکھوا لیتے ہیں اور اسے ہمیشہ مقام کی تبدیلی کے ساتھ مختلف ادبی سیمیناروں میں پڑھ جیسے چشتی صاحب نے ابھی آپ کو اپنا مقالہ سنایا۔ اگر میں انہوں چشتی کے چ کو پیش کے ساتھ ادا کیا اور کسی نہ کسی عنوان سے کہا کہ چشتی صاحب نے کہا، چشتی نے فرمایا وغیرہ وغیرہ۔ تو چشتی صاحب غصہ میں کھڑے اور فرمایا کہ حضرت پہلے آپ اپنا تلفظ تو درست کر تقریر کریں گے۔ کلام صاحب ایک توقف کے بعد بو حضرات میں جہاں جہاں چشتی کہوں آپ چشتی سمجھئے پر سارا مجمع قہقہہ لگانے لگا۔ خود کلیم صاحب بھی سنجیدہ رہنے کے باوجود اور نہایت سنجیدہ مزاج ہونے مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

کلام بے حد بے باک تھے سچ کہنے میں ذرا چوکتے، اپنی بات اور اپنا سوچا ہوا موقف بہرحال کے سامنے رکھ دیتے۔ تقریر کے علاوہ تحریر میں بھی بیبا ہوتی، اپنے اداریوں میں سرکار کی پالیسی پر کھلی نکتہ اور سہ بالا کے خلاف نعرہ حق بلند کرتے۔ اس طرح وہ شان حیدری کا مظاہرہ کرتے، ان کی جرأت مندی کی شہادت ان کی کتاب "برملا" دیتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک بے حد اہم واقعہ یوں اردو گھر کی افتتاح کے موقع پر دلی میں لوگوں نے ڈیسائی کو دعوت دی تھی ان دنوں وہ ہندوستان وزیر اعظم تھے مرار جی نے اس جلسے میں کسی قدر بہی کیا اور کہا کہ جب اردو گھر کی افتتاح کا معاملہ تھا تو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ مرار جی کی تقریر کے بعد کلا

مائنگ پر گئے اور انہوں نے مرارجی کے سامنے بلا کسی خوف دہراس کے اپنی تقریر میں کہا کہ انہوں نے مرارجی ڈیسائی کو اردو گھر کے افتتاح پر دعوت نہیں دی ہے بلکہ ہندوستان کے پرائم منسٹر کو بلایا ہے جو سیکولر ہوتا ہے اور ہندوستان کے سیکولر کنسٹی ٹیوشن کا رکھوالا ہوتا ہے جو اردو والا یا ہندی والا نہیں ہوتا وہ ان تمام زبانوں کا محافظ ہوتا ہے جو ہندوستان کی تہذیبی سرمایہ ہیں لہٰذا اردو گھر کے افتتاح پر وزیر اعظم کو برہم نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ ہم اردو والوں کے ووٹ کی بھی قیمت ہے جو آئندہ الیکشن میں یہ طئے کرنے کو کافی ہے کہ ہندوستان کا وزیر اعظم جو بھی ہوگا سیکولر ہوگا۔

اس طرح کلام کی شخصیت میں بہت سارے TRAIL ایسے تھے جن کی بنیاد پر کلام کی انفرادی پہچان بنتی ہے سچ تو یہ ہے کہ کلام کو اللہ تعالےٰ نے دولت و ثروت کے ساتھ بلا کی ذہانت بے مثال تقریری اور تحریری صلاحیت عطا کی تھی۔ نیز جرأت رندانہ سے بھی نوازا تھا مگر ان تمام خوبیوں کے باوجود ویسی عوامی مقبولیت جو اس طرح کے انسانوں کو حاصل ہو سکتی ہے کلام کے حصے میں نہیں آئی اس ناکامی کا سبب محض ان کی بے باک گفتاری نہ تھی بلکہ اس میں اپنے مزاج اور رویے کا بھی حصہ تھا۔

کلام حیدری کے مزاج میں اپنے منفرد ہونے کا احساس جاگ گیا تھا ایسی صورت میں ان کے یہاں ایک ایسی انا پلنے لگی تھی جس کا اظہار رجا بہ جا ان سے ہو جاتا جو ان کی انکساری کے ساتھ چلتی تھی۔ اپنے اسی مخصوص وصف کے باعث عوام الناس میں یہ گھل مل نہیں سکتے تھے۔ حالانکہ آج کی سیاست تو ان ہی باتوں کی متقاضی ہے الغرض خواص کے درمیان رہنا اور ذرا اپنے مخصوص اناتی مزاج کے باعث یہ عوام کے درمیان فٹ نہیں ہو سکے۔

نتیجے کے طور پر تعلیمی میدان کو جس سیاست کے ...

یہ چھوڑ کر آئے تھے وہاں بھی ان کو ناکامی ہی ملی۔ یہاں تک کہ جہاں جہاں سے ان کو کچھ حاصل ہونے کی توقع تھی وہاں وہاں سے بس مایوسیوں کا تحفہ ملا اسمبلی یا پارلیامنٹ کے لئے باوجود شدید کاوش کے ٹکٹ نہ مل سکی اس لئے حلقہ وزارت میں شرکت کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ للا نرمدلیشور کی وائس چانسلری کے دور میں پرو وائس چانسلر بن کر چاہا کہ پھر سے تعلیم کی دنیا میں سربراہی کریں تو یہ تمنا بھی راس نہ آئی چنانچہ رفتہ رفتہ انہیں اپنی سارگذاریاں سعی لاحاصل محسوس ہونے لگیں اور اس وقت ان کی زندگی میں ایک موڑ آیا جس وقت ان کو احساس ہوا کہ وہ جو کچھ تخلیق ادب کے ذریعہ پا سکتے تھے اس سعی لاحاصل میں اس کو بھی انہوں نے کھو دیا ہے۔ پھر اس شدید احساس ناکامی اور احساس شکست کے باوجود کلام نے خود کو سنبھالے رکھا دوسرا ہوتا تو کب کے گھٹ کے مر گیا ہوتا کلام تو بڑے جی گردے کے آدمی تھے انہوں نے اس مقام پر پہنچ کر اپنا راستہ بدل لینے کا فیصلہ کیا جیسا کہ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے ملاحظہ کیجئے ؎

"۱۹۷۸ء میں میری زندگی کا وہ موڑ ہے جب
میرے کیریر میں بحران آیا...... ایک زلزلہ...
ایک قیامت ..... شاید خدا نے مجھے سبق
دیا ہو کہ ادب میرا منتظر ہے اور اپنی بقیہ
زندگی میں ادب کو کچھ نہ دے سکا تو میری
زندگی کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا اس
میں اپنے آپ کو سمیٹنا چاہتا ہوں اور ادب
میں ڈوب جانا چاہتا ہوں"

اور کلام نے ایسا ہی کیا بھی۔ وہ ادب کی دنیا میں از سر نو نئے خیالات، گہرے تجربات اور بسیط مشاہدات کے ساتھ داخل ہوئے اور اردو افسانوں کی دنیا میں صفِ الف لام ...

بڑا" کی پیش کش گردانی اور تنقید و تبصرہ میں ماہنامہ شعور کے ذریعہ نئی جہت بخشا تھا یہاں کلام کی کما حقہ پذیرائی بھی ہوئی۔ یہ کارنامے ان کی زندگی میں ہی ادب کی دنیا میں گرانمایہ تسلیم کیئے گئے تھے اور اردو کے زندہ رہنے تک ان کی اہمیت تسلیم کی جاتی رہے گی حقیقت تو یہ ہے کہ کلام کی ادبی کاوشیں بہیں رہتی دنیا تک زندہ رکھنے کو کافی ہیں۔ ادھر ان کی ساری زندگی کا ایک لازوال اور بے مثال انعام کہی جا سکتی ہے۔

ادب کی دنیا میں اس پذیرائی کے باوجود وہ مطمئن نہ تھے اوائل کی زندگی کی تشنہ تمناؤں اور شکست خوردگی نے انہیں بری طرح ذہنی کشمکش میں مبتلا کر رکھا تھا یہ ایک قسم کی احساس کمتری کا شکار ہو گئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان والپنے بڑے ہونے کا ایسا احساس ہو گیا تھا جو ان کی تمام تر شخصیت پر حاوی تھا۔ ان نفسیاتی گرہوں کا مظاہرہ تادم حیات ان کے اقوال و افعال سے فرائڈ کی WIIK TIME TIHMING LBWRY کے مطابق ہوتا رہا۔

کبھی گیا کالج میں طلباء کی خدمت کے بہانے کلاس لینے کی صورت میں، اور کبھی اپنوں، دوستوں، اور ہم نشینوں کی کارگزاریوں پر مداحی کے بجائے نکتہ چینی کی صورت میں۔ اور کبھی اپنے ملنے والوں کو یکسر نظر انداز کرنے کی صورت میں اور غالباً یہی وجہ تھی کہ انہیں ایک بیگانہ روشی کا احساس ابھر گیا تھا جس کی جانب انہوں نے اپنی کتاب "صفر" کو گیا کے نام انتساب کرتے وقت ایک شعر کے ذریعہ اشارہ کیا ہے ملاحظہ ہو

بیگانہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں
سچا کوں ہوں دور سب سے میں کس کا آشنا ہوں

اس بیگانہ روشی نے تادم مرگ کلام کے دل کو کچوکے لگائے اور جب کلام نے اپنی روش بدلنی چاہی تو موت نے مہلت ہی نہ دی حالانکہ علاج غم دل کی خاطر یہ دل کے آپریشن تک کے مرحلے سے گذرے پھر بھی دل کی پھانس اپنی جگہ پر رہی

اور اس خلش میں کسی طرح کی کمی نہ آئی اور آخر ۲ر فروری ۱۹۹۴ء کو نہ جانے وہ کتنی حسرتیں لئے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون ٥

کلام اپنی کمزوریوں کے باوجود بحیثیت مجموعی ایک اچھے آدمی تھے شریف اور قابل قدر ایسے بڑے فنکار تھے قلم کے سپاہی۔ اردو کے حق کے پاسدار، دشمنوں کے دشمن دوستوں کے دوست، ان کی موت سے ادبی دنیا کو بڑا جھٹکا لگا ہے اس وقت جبکہ اردو مبتذل حالات کا شکار ہے۔ ادب کی دنیا میں ایک بحران ہے افسانہ نگاری کا سیار گر رہا ہے اردو صحافت کے آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہیں کلام کی بڑی ضرورت تھی، کاش وہ کچھ اور دن زندہ رہتے، اور ابھی نہ مرتے۔

بقیہ صفحہ ۱۰۳ کا

میں (جوان کے حصہ میں آیا ہے) ایک "کلام حیدری اسٹڈی سرکل" قائم کر دیا جائے ان کی پیدائش کی تاریخ یا تاریخ وفات کی برسی کے موقع سے صحافت و ادب پر ہر سال ایک سیمینار منعقد کیا جائے ان کے شایانِ شان گیا شہر کے اردو نوازوں پر کلام حیدری مرحوم کا یہ حق ہے

"تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں"، یہ مدیر آہنگ کلام حیدری کا تبصرہ متوازی اور رعنا جا بند اولانہ ہے اسے میں آہنگ گیا میں پڑھ چکا ہوں لیکن "اردو زبان" میں اس کی اشاعت سے پاکستانیوں کو یہ سمجھنے کا موقع ملے گا کہ ہمارے ادب پارے غیر ملکی دانشوروں کی نظر میں کیا مقام رکھتے ہیں۔"

(اعجاز اعظمی، ملیشیا)

کلام حیدری ــ یادیں باتیں

مناظر عاشق ہرگانوی

کلام حیدری سے میری پہلی ملاقات باضابطہ طور پر ان کے پہلے افسانوی مجموعہ "بے نام گلیاں" سے ہوئی۔ یہ مجموعہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ لیکن میرے مطالعہ میں ۱۹۶۳ء میں آیا۔ یہ مجموعہ ان کے خسر ڈاکٹر ایم اے خیر صاحب کے نام معنون تھا۔ جن کا نام اس وقت میرے لئے کلام حیدری سے زیادہ شناسا تھا۔ کیونکہ گیا سے میرا تعلق بہت گہرا ہے۔ میرے خاندان کے بیشتر لوگ گیا میں آباد ہیں۔ اور مضافات کے کسی گاؤں میں ہماری زمینیں تھیں میرے والد اور میرے دادا کا زیادہ وقت گیا میں ہی گذرا ـــ ان کی زبانی ڈاکٹر خیر صاحب کا نام اکثر سننے میں آتا تھا۔ وہ روشن خیال، عالی ظرف، بے باک صاحب گفتار و کردار اور اپنے فن کے ماہر فرد تھے۔

اس وقت یعنی "بے نام گلیاں" کی اشاعت کے وقت کلام حیدری ڈگری کالج پورنیہ میں لکچرر تھے حالانکہ ان کی پیدائش بچپنہ ضلع مونگیر میں ہوئی تھی

لیکن اس افسانوی مجموعہ کی چودہ کہانیوں میں سے چار پانچ ہی مجھے پسند آئی تھیں جس کا اظہار میں

ہی مختصر لیکن خوشخط تحریر مجھے ملی تھی ـــــــ اور پھر ان کا اخبار "مورچہ" پابندی سے ملنے لگا تھا۔ مورچہ میں تحریری تعاون کے لئے خطوط میرے پاس تاج الور کے آتے تھے۔ لیکن کلام حیدری سے ایک قرب خاص پیدا ہو چکا تھا۔

پھر ۱۹۶۹ء میں گیا کی زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے مجھے وہاں جانا ہوا تو تاج الور نے مجھے کلام حیدری سے ملوایا۔ حالانکہ اس سے بھی قبل بھی گیا جاتا رہا تھا۔ لیکن ہر بار یہی معلوم ہوا کہ وہ آؤٹ آف اسٹیشن ہیں۔ میری ملاقات ان کے پریس میں ہوئی میں تاج الور کے پاس بیٹھا ہوا مورچہ کے تازہ شمارہ کی تیاری دیکھ رہا تھا۔ کلام حیدری بے حد مختصر وقت کے لئے پریس آئے تھے۔ مجھ سے سرسری طور پر مل کر وہ تاج الور سے مخاطب ہو گئے مجھے وقتی طور پر برا لگا۔ لیکن فوراً ہی خود پر شرمندہ ہونا پڑا۔ وہ جانے کے لئے اٹھے تو بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "چلئے" میں اٹھ گیا اور ان کے ساتھ رینبو ان پہونچا۔

وہاں جب باتیں شروع ہوئیں تو کلام حیدری نے بڑی بے

میں سٹپٹا گیا۔ کیونکہ رو برو اس بے باکی کا اظہار کرنے کی ہمت خود میں نہیں جٹا پا رہا تھا۔ جس کا اظہار میں نے اپنے خط میں کیا تھا آخر ہمت جٹا کر میں نے کہا۔

"بس پسند نہیں آئے"۔

"کوئی وجہ تو ہوگی؟" کلام حیدری نے کریدا۔

"دراصل ان افسانوں میں کئی افسانہ نگاروں کی جھلک نظر آتی ہے"۔

کلام حیدری مسکرا کر مجھے دیکھنے لگے۔ انہوں نے بھی برا نہیں مانا تھا۔ میں نے مزید کہا۔ اس مجموعہ کا پہلا افسانہ "کھلیان اور سلاخیں"، جب سہیل عظیم آبادی کے رسالہ "تہذیب" میں شائع ہوا تو ہنس راج رہبر نے آپ کو جو کچھ لکھا تھا اس سے میں متفق ہوں کہ اس افسانہ میں مواد کو پیش کرنے کا طریقہ پُراثر اور کامیاب نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اعداد و شمار جمع کر دیئے گئے ہیں"۔

کلام حیدری نے فوراً گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

اس پہلی ملاقات کا تاثر لے کر جب میں ہرگانوان واپس لوٹا تو کئی دنوں تک کلام حیدری کی مسکراہٹ اور ان کی خاموشی کے بارے میں سوچتا رہا اور اپنے آپ سے الجھتا رہا آخر ایک دن میں نے انہیں خط لکھا جس میں دیگر باتوں کے ساتھ یہ بھی تحریر کیا کہ:

آپ سے گفتگو کے بعد یہاں آکر میں نے "کھلیان اور سلاخیں" دوبارہ پڑھا۔ اور میں رضیہ سجاد ظہیر کی اس رائے سے متفق ہوں ــــــ جو انہوں نے سہیل عظیم آبادی کو ایک خط میں لکھا تھا، یعنی:

"کلام کا افسانہ دیکھ لیا اور ختم کرنے کے بعد میرا بے اختیار جی چاہا کہ کلام کو مبارکباد دوں۔ بڑا زوردار افسانہ ہے! میں نے تو کلام کا نام بھی نہیں سنا تھا اور یہ افسانہ دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہوئی، ہمارے یہاں کیسا TALENT ہے۔ کتنے جواہرات ہیں۔ جن کی دمک ہم نے ابھی دیکھی ہی نہیں ہے۔ کلام کو میری طرف سے بہت بہت پیار کہنا، بہت دعا کہنا۔ ...... ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات .... ان کے بارے میں مجھے لکھو، کیا عمر ہے؟ کیا کام کرتے ہیں؟۔ کہاں کے رہنے والے ہیں اور ان فی الحال کیا لکھ رہے ہیں۔ ...... بھئی کیا کہوں میرا تو دل چاہتا ہے اس افسانہ کی تعریف ہی کئے جاؤں، حالات کی کتنی اچھی عکاسی کیسی پیاری زبان، عوام کا کتنا گہرا درد، اور ان کی کیسی صحیح UNDER ....STANDING ہماری تحریک اور ہمارے ادب کو ایسے لکھنے والوں کی بڑی ضرورت ہے"۔

کلام حیدری کا جواب پوسٹ کارڈ میں آیا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ میں نے اپنی رائے اتنی جلدی کیوں بدل دی۔

دوسری ملاقات آل انڈیا ریڈیو پٹنہ میں ہوئی۔ میں وہاں پروڈیوسر سہیل عظیم آبادی کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ کلام حیدری آگئے اور سہیل عظیم آبادی انہیں اور مجھے لے کر گرینڈ ہوٹل چلے گئے۔ جہاں چائے ناشتے کے دوران گھنٹہ بھر باتیں ہوتیں۔ اور مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ کلام حیدری کو سہیل عظیم آبادی سے کتنی عقیدت تھی۔ اس دن گرینڈ ہوٹل کا بل کلام حیدری نے چکایا تھا۔ سہیل عظیم آبادی مجھ سے بولے۔

"کافی مالدار آدمی ہیں"
میں نے تصدیق کی "ان کے گھر پیالے سے مل چکا ہوں"
پھر اکثر کلام حیدری سے ملاقات ہوتی رہی بلکہ ہوتی رہی۔
ایک بار آل انڈیا ریڈیو پٹنہ میں ملاقات ہوئی تو وہ
شمیم فاروقی اور ڈاکٹر عبدالخالق (دونوں پروگرام ایگزیکیٹیو
) پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ بات فراق گورکھپوری کی نکلی تو کلام
حیدری کہنے لگے "میں محمود احمد ہنر کے ساتھ فراق سے ملنے
گیا۔ باتوں کے دوران وہ مجھ سے پوچھنے لگے" آپ پڑھے لکھے
بھی ہیں اس لئے بتلایئے کہ میر کے پہلو بہ پہلو اردو کے کس شاعر
کو کھڑا کیا جاسکتا ہے؟"
"اختیار مجھے دیا گیا ہے، اس لئے میں خود کو کھڑا کرتا
ہوں" کلام حیدری کا جواب تھا۔
"فراق پر اس جواب کا کیا ردعمل ہوا؟" میں نے پوچھا۔
"وہ مسکرا کر رہ گئے یہ مسکراہٹ معنی خیز تھی"
میں ایک دن رینہ ہاؤس پہونچا تو کلام حیدری
ہال میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ
رینہ ہاؤس میں تنہا نظر آئے ہوں۔ علیک سلیک
بعد میں نے حیرت ظاہر کی۔
"آج آپ تنہا نظر آرہے ہیں"؟
"شاید وقت سے پہلے آپ آگئے ہیں"
میں نے گھڑی دیکھی، تین بجے تھے۔ اور کلام حیدری
نام، احباب والی شام، پانچ چھ بجے کے بعد ہوتی تھی۔
"اس دن کلام حیدری نے ایک تجویز رکھی۔ سن ۱۹۶۰ء
اردو افسانہ پر آپ اپنی رائے دیں میں ٹیپ کروں گا"
چند لمحے کے پس و پیش کے بعد میں نے اپنی رضامندی
ور پر ظاہر کی کہ کلام حیدری کے افسانوں پر بات کرنے
ہش ظاہر کی۔
پہلے تو وہ چونکے پھر مسکرا کر کہا "پھر کوئی افسانہ
پسند نہیں آیا کیا؟"
"نہیں، ایسی بات نہیں ہے، بلکہ ادھر بیشتر آپ
کے افسانے پڑھے ہیں، نظام صدیقی کا مضمون اور الغوذ
سدید کی رائے بھی پڑھ چکا ہوں"
"پھر آپ کیا کہتے ہیں؟"
آپ کے یہاں تنوع اور جدت پسند رجحان سے
زیادہ ملتا ہے۔ اور ہیئتی اور موضوعاتی تجربوں کا سراغ
بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ آپ کی نئی تجرباتی کہانیاں
زبان و بیان کے اعتبار سے خاصی مختلف ہیں۔ افسانہ
"عنابی کانچ کا ٹکڑا" داخلی خود کلامی کی سنگلاخ تکنیک
میں تراشیدہ انتہائی نازک اور لطیف علامتی افسانہ
ہے۔ ہندو مسلم فساد کے المیہ کو بیان کرتے وقت آپ
جس درد و سوز سے گذرے ہیں، اسی میں آپ کی فنکاری
ہے۔ سوشیل کے مانند اپنی روح کی آنکھوں میں جھانکتی
دو آنکھوں سے ہزاروں دوسری مظلوم آنکھیں نکل آتی
ہیں۔ آپ کی یہ کہانی ان دبی دبی آرزوؤں، تمناؤں،
ارمانوں اور حسرتوں کا دلدوز مرثیہ ہے جو کبھی باقاعدہ
شعور کی روشنی میں واضح نہیں ہو سکی، اور پروان
چڑھنے سے قبل زندگی کے مقتل میں لہولہان ہوگئی۔
افسانہ "زندانی" ایک ایسی عورت کی دوسری
زندگی کا آئینہ خانہ ہے جو اپنے شوہر کی آغوش میں خود کو
اجنبی، تنہا، اور حرماں نصیب پاتی ہے۔ اور اس کی روح
ایک دوسرے مرد کی حسرت میں سسکتی ہوئی چند لمحوں
کے لئے اپنی ذات کی کھلی فضاؤں میں بھٹک رہی ہے۔ اور
اس کی یادیں، اس کی غمزدہ روح سے لپٹ کر قائم کر رہی ہیں
جو ایک خوشبو کی مانند اس کی زندگی میں در آئی ہیں۔ آپ
نے اس افسانہ میں بیوی کے آرزومندانہ احساس و تاثر
اور فکر و خیال کی رو کے ذریعہ اس کی رومانی زندگی کے

مختلف نقوش اجاگر کئے ہیں اور اس میں کامیاب ہیں۔

افسانہ "کس کی کہانی" بظاہر سادہ لیکن بباطن اہم بے چیدہ افسانوی تجربہ ہے۔ اس افسانہ کو پڑھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ایک ادبی کہانی ہے جو اس افسانے کے پیچھے چل رہی ہے۔ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی قیامت خیزیوں سے کسی طرح اپنی جان بچا کر پہلی بار ہندوستان میں اپنے ناآشنا ماموں کے گھر پناہ گزیں سویا ہوا بیس سالہ نوجوان قطعی ناواقف ہے کہ وہ "میں" کی روح کا زندہ اور دھڑکتا ہوا حصہ ہے۔

روح میں تازگی، گرمی، اور روشنی افسانہ "صفر" سے حاصل ہوتی ہے۔ "لا" اور "اسیر" میں انتہائی تجریدیت کے باوجود دلچسپی، اشتیاق اور جستجو کا عنصر شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔" درد کا میں" بظاہر معاشرہ کا بے حد کامیاب اور مقبول ترین فرد ہے لیکن درحقیقت نفسیاتی گرہوں کا مجموعہ، خواب و خیال کا پیکر اور ذہنی اضطراب کا مجسمہ ہے۔"

اس تفصیلی رائے سے کلام حیدری کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی اور میں نے بھی طمانیت محسوس کی تھی۔

ماہنامہ "آہنگ" کلام حیدری کا خواب تھا اس خواب کی تکمیل کے لئے انہوں نے کتنے ہی نئے قلمکاروں کو بھرپور تعاون دیا۔ اور بیشتر بڑے فنکاروں سے آہنگ کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۷۱ء کے آخری مہینے کی بات ہے۔ میں کلام صاحب کے یہاں گیا تو باتوں کے دوران انہوں نے "آہنگ" کا نیا شمارہ یہ کہتے ہوئے دیا کہ ڈاک سے پہونچنے میں ابھی ہفتہ دن کی دیر ہے۔ میں وہیں ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن ابتدائی صفحات الٹتے ہی میں چونک پڑا۔ اداریہ "مزامیر" کے عنوان سے خود کلام حیدری لکھا کرتے تھے لیکن اس شمارہ کا مزامیر "ڈاکٹر وزیر آغا کا لکھا ہوا تھا۔ استفسار پر انہوں نے بتایا۔" وزیر آغا کا یہ احساس مشعل ہدایت ہے۔ ادب ایک مقصد۔ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ جیسے موضوع پر میں۔ اصرار کر کے ان سے لکھوایا ہے۔"

مجھے اچھی طرح یاد ہے وزیر آغا نے اس اداریہ میں لکھا تھا کہ:

> کہ جدید دور سے قبل کسی بھی زمانے میں معاشرے کی تقسیم اس طور نہ ہوئی تھی کہ اس کا بایاں بازو دائیں بازو سے پوری طرح دست و گریباں ہو جاتا۔ مگر آج صورت حال یہ ہے کہ ساری دنیا دو واضح گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک گروہ معاشی انصاف اور مساوات کے حصول کو زندگی کا واحد مقصد گردانتا ہے۔ اور فرد کو معاشرے کی کل میں محض ایک پرزے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے یہ گروہ ادب کو معاشی انصاف کے حصول کے لئے ایک حربے کے طور پر استعمال کرنے پر بضد اور اسے مقصود بالذات قرار دینے سے منکر ہے دوسرا گروہ مساوی نہیں ہو سکتا نیز معاشرے کو اس بات کی اجازت نہیں ملنی چاہئے کہ وہ فرد کو ہڑپ کر جائے۔ تخلیق ادب کے سلسلے میں اس گروہ کا یہ موقف ہے کہ ادب بجائے خود اپنی منزل ہے اسی کسی اور مقصد کے حصول پر مامور کرنا ادب کے سارے طریق کار کی نفی کرتا ہے بلکہ

اس گروہ کا تو یہ تک خیال ہے کہ شعوری
طور پر ایسا کیا جائے تو ادب وہ ساری
پراسراریت اور خود روانی چھین جاتی ہے۔
جو فن کا جوہر یا عطر ہے ـــــــــ
ادب دریافت اور تخلیق کا عمل ہے تقلید
اور تشہیر کا نہیں۔"

"زیر آغا کے "مزامیر" کا یہ ایک حصہ ہے جو میری ڈائری
میں ہے پورا اداریہ "آہنگ" میں محفوظ ہے۔ یہ اداریہ
پسند کیا گیا کہ بعد میں یعنی اکتوبر ۱۹۸۳ء میں "آہنگ" کا
"کلیم الدین احمد نمبر" نکلا اور جنوری ۱۹۸۴ء کا "مزامیر"
حسین نے لکھا تھا۔

کلام حیدری سے میرا اختلاف بھی ہوا اور زبردست
سے ہوا۔ ۱۹۸۱ء میں "آہنگ" کا فکشن نمبر منظر عام
پر آیا۔ اسے میں نے فرکشن نمبر کا نام دیا تھا۔ ان دنوں
"گلبن" احمد آباد اور ہفتہ وار "عظیم آباد ایکسپریس" پٹنہ
سے کالم لکھتا تھا۔ "گلبن" میں تو مختصر لیکن "عظیم آباد
..." میں بہت ہی طویل تبصرہ میں نے لکھا۔ جس شمارہ
میں تبصرہ شائع ہوا اسی میں ڈاکٹر علیم اللہ حالی کا بھی تفصیلی
تبصرہ چھپا تھا۔ سب سے پہلے "عظیم آباد ایکسپریس" کے مدیر نے
اپنا نوٹ شائع کیا تھا:

ان کی (کلام حیدری کی) صحافتی بددیانتی
کا عالم یہ ہے کہ مقالہ نگاروں سے بغیر اجازت
اپنے ناپسندیدہ افراد کا نام مقالے سے نکال
دیتے ہیں۔ مہدی جعفر کی کتاب شائع کی تو
نہ صرف میرا نام تمام مقالات سے نکال دیا
بلکہ ایک پورا مقالہ جو میرے افسانوں پر
تھا اسے حذف کر دیا۔ آج ان کی فہرست سے
غیاث احمد گدی، شفیع جاوید، شفیع مشہدی

مناظر عاشق ہرگانوی، شمیم افزا قمر، ذکیہ
مشہدی کے نام بھی خارج ہو چکے ہیں۔
جو شخص اپنے نظریات میں اتنا ڈھلمل
یقین ہو وہ نہ اچھا ادیب ہو سکتا ہے
نہ صحافی۔ نہ سیاست داں نہ اچھا انسان۔
ایسے شخص کو ذہنی طور پر مریض کہا جا سکتا ہے"

ڈاکٹر علیم اللہ حالی کے تبصرہ سے یہ اقتباس دیکھئے:

"اس پورے نمبر کو مرتب نے شاہکار بنا کر
پیش کرنا چاہا ہے اس کی ہر ادا انہیں
پیاری ہے اور قارئین کو یہ نمبر MAG
-NIFYING GLASS
لگا کر دکھانا چاہتے ہیں۔ کہانیوں پر جو تبصرے
کئے گئے ہیں۔ انہیں وہ تنقید کہتے ہیں۔
ہر جگہ مبصر کی جگہ نقاد کا لفظ استعمال کیا
گیا ہے۔ جگہ جگہ مرتب نے غیر ضروری طور
پر SELF دیگر NOTES
PROJECTION کا مظاہرہ کیا
ہے۔ ٹائیٹل پیج حد درجہ فرسودہ بدرنگ
اور REPULISIVE ہے۔ کتابت
اور طباعت کی بے پناہ غلطیاں ہیں لگتا
ہے پروف ریڈنگ کی زحمت بھی نہیں کی
گئی۔ تصویریں بے شمار ہیں مگر اکثر و بیشتر
پہچانی نہیں جاتیں۔ کاتبین اور پریس
وغیرہ کی تصویر کا کسی ادبی رسالے سے کیا
تعلق ہو سکتا ہے؟ ـــــ ۳۵ روپے
میں خرید کر اگر کوئی یہ نمبر پڑھتا ہے تو پھر اس
کا اردو زبان و ادب سے گہرا عشق ہوگا۔
یہ اور بات ہے کہ رسالہ پڑھنے کے بعد

اسے بھی یہ کسی عشق پر رونا آجائے گا۔

عجیب اتفاق کی بات ہے کہ " الفاظ " علی گڑھ کے افسانہ نمبر جلد اول میں افسانوں کی وہی تعداد ہے جو آہنگ میں ہے یعنی دونوں ۲۸ افسانے ہیں الفاظ کے اس شمارہ کی قیمت صرف ۱۶ روپے ہے ۔۔۔ آہنگ میں اپندر ناتھ اشک، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، جیلانی بانو، غیاث احمد گدی، دیوندر اسر، رام لعل، اقبال مجید، کنور سین، سلیم اختر، آمنہ ابوالحسن سلام بن رزاق جیسے ناموں کی کمی، اور " الفاظ " میں ان کی موجودگی " آہنگ " کو بہت کمزور کر دیتی ہے۔ کیا ان ناموں کے بغیر بھی آج افسانہ نمبر شائع کر کے خوش ہوا جا سکتا ہے ؟ "

اور میرے تبصرے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے :

" آہنگ " کا " فکشن نمبر " کلام حیدری کی خود نمائی کا پلندہ ہے۔ شعوری طور پر انہوں نے خود نمائی چاہی ہے اسی لئے انور سدید اور مہدی جعفر کے علاوہ کوئی بڑا ناقد اس ۲۸۰ صفحے کے شمارے میں نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا ایک اہم مضمون تو شائع کیا گیا ہے لیکن اس مضمون کو غلط ثابت کرانے کی بھی ناکام کوشش کی گئی ہے بلکہ اس کے ساتھ زنا بالجبر کیا گیا ہے ۔۔۔ ساتویں اور آٹھویں دہائی کے افسانے کو سمجھنے کے لئے بالیدہ شعور اور ناقدانہ نظر چاہئے۔ اور علامت، تجرید، استعارے اور جدید حسیت سے آشنائی ہی نہیں بلکہ ان پر مضبوط گرفت ضروری ہے۔ کلام حیدری نے چونکہ یہ شمارہ اپنی پبلسٹی کے لئے نکالا ہے یہی وجہ ہے کہ دوستوں کی بیساکھی کو سہارا بنا کر لنگڑے لولے نافہم احباب کو ناقد کی سولی پر لٹکا دیا ہے اور یہ اپاہج دوست چیخ چیخ کر احتجاج کر رہے ہیں کہ " میں افسانہ نگار نہیں ہوں اور نہ افسانوں کا ناقد (۶۹) لیکن کلام حیدری ان کی پیٹھ تھپکتے نظر آتے ہیں۔ اور علامت، تجرید، استعارہ اور جدید حسیت کا زہریلا پیالہ ان کے حلق میں زبردستی انڈیل رہے ہیں تاکہ ان کی ساکھ قائم ہو جائے۔ نتیجے میں کہیں کہیں پر ایسا معجون تیار ہو گیا ہے جس کا اثر قاری کے ذہن پر صحت بخش طور پر نہیں رہا ہے "

تبصرہ کی اشاعت کے بعد کلام حیدری مجھ سے سخت برہم ہو گئے۔ ایک ملاقات میں سید احمد قادری (مدیر بودھ دھرتی گیا) نے ان ہی دنوں بتایا کہ کلام حیدری آپ کے خلاف سخت و سست کہہ رہے تھے آپ سے سخت ناراض ہیں "

رضوان احمد نے صحیح لکھا تھا کہ کلام حیدری ذہنی مریض ہو چکے ہیں " آہنگ " کے اس " فکشن نمبر " کے بعد ان کا مرض میں اضافہ ہوتا گیا۔ انہوں نے " مورچہ اور آہنگ " بند کر دیا۔ پریس فروخت کر دیا۔ اور کاروبار پر توجہ کم کر دی۔ ان ہی دنوں ایک دن میں گیا کورٹ کسی کام سے گیا تو کلام حیدری کو کالا کوٹ پہنے ایک ٹائپسٹ کے پاس بیٹھے دیکھا۔ علیک سلیک بھی ہوا۔ لیکن وہ سرد مہ

سے مجھ سے ملے ــــــ بعد میں سید احمد قادری نے بتایا کہ وہ ان دنوں وکالت کر رہے ہیں۔ اور روزانہ کچہری میں آکر بیٹھتے ہیں۔ احباب کی آمدان کے گھر پر کم ہوگئی ہے اور وہ بے حد تنہائی میں وقت گذار رہے ہیں۔

کلام حیدری سے میری آخری ملاقات ۹ سال قبل خدا بخش لائبریری میں پٹنہ میں ہوئی تھی۔ افسانہ اور دانشوری پر لائبریری میں سہ روزہ سمینار تھا۔ "بہار میں اردو افسانے کی آدھی صدی" کے عنوان سے اس کنونشن میں تیس کے قریب قدیم، متوسط، جدید اور جدید تر نسل کے افسانہ نگاروں نے حصہ لیا تھا۔ محمد محسن، شکیلہ اختر، شین مظفر پوری، کلام حیدری، قمر التوحید، احمد یوسف معین شاہد، شفیع مشہدی، حسین الحق، عبد الصمد، علی امام، شمیم افزا قمر، قمر جہاں، شمیم صادقہ، شبیر احمد، مناظر عاشق ہرگانوی، وغیرہ نے افسانے سنائے تھے۔ اور اپنا تعارف پیش کیا تھا۔ صدارت محمد محسن نے کی تھی۔ اور سمینار کے آخری دن ۲۲ جولائی ۸۸ء کو خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے افسانے کو گفتگو سے کس رخ پہ لے جانا ہے اور کیا کچھ طے کرنا ہے۔ اس سلسلے میں بحث کے آغاز کی ساری ذمہ داری کلام حیدری اور احمد یوسف کو سونپ دی تھی۔ سب سے پہلے کلام حیدری مائک پر آئے تھے۔ اور بحث کا آغاز کرتے ہوئے انہوں نے چند سوالات رکھے تھے:

ہم نے عہد غلامی میں کس طرح کے افسانے لکھے؟ عہد غلامی میں لکھے گئے افسانوں کی ترتیب کس طرح ہو؟ متضاد افسانے لکھے گئے ہیں اس لئے کسے رکھا جائے کسے نظر انداز کیا جائے؟ ــــــ پریم چند کے افسانے میں جو دیہات ہے وہ اتر پردیش کا ہے بہار کا دیہات نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پریم چند کے یہاں پورے ہندوستان کا دیہات ہے لیکن میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ سہیل عظیم آبادی کے یہاں جو دیہات ہے وہ بہار کا ہے۔ کسی نے اردو افسانوں میں دیہات کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے غیاث احمد گدی کا نام لیا ہے لیکن غیاث احمد گدی کے کسی افسانے میں دیہات نہیں ہے۔ آج افسانے پر لکھتے وقت لوگ بلونت سنگھ کا ذکر نہیں کرتے، جبکہ بلونت سنگھ کے یہاں دیہات ہی دیہات ہے ــــــ سجاد حیدر یلدرم اسی زمانے میں لکھ رہے تھے جب پریم چند لکھ رہے تھے۔ لیکن یلدرم کے افسانے میں کیا ہے؟ قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے آج لوگ یلدرم کا ذکر کر دیتے ہیں۔ وہ بھی اس لئے کہ ممکن ہے قرۃ العین حیدر کسی کمیٹی کے صدر ہوں۔ اور ذکر نہ کرنے والا انعام سے محروم نہ رہ جائے۔ یلدرم کے افسانے "ماخوذ" ہوئے تھے۔ پڑھنے والا سمجھ جاتا تھا کہ ترکی افسانے سے ماخوذ ہیں۔ ــــــ ایلیا اہرین برگ جرنلسٹ اور ناولسٹ تھے انہیں محاذ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ یہ عام خیال تھا کہ جرمن قوم کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ لیکن کتنی بڑی بات ہے کہ جو پہلے راؤنڈ میں قتل ہوئے ہیں وہ ہم ہی ادیب اور شاعر ہی

ہم انٹلکچوئل کے ہی سینے سے گولی نکلتی ہے۔
چاہے یہ گولی روسی ہو یا جرمن ہو ____
آزادی یعنی تقسیم ملک کے بعد جس طرح لوگوں
نے لوٹ کھسوٹ کی اس کے پس منظر میں کرشن
چندر نے "ہم وحشی ہیں" اور "پشاور ایکسپریس"
جیسے افسانے لکھے لیکن اس نے بھی پلڑا برابر
رکھا کہ تو ہندو ادھر مرے تو تو مسلمان ادھر
مارے گئے ____ راجندر سنگھ بیدی
اس عرصے میں خاموش تھا۔ فلم کا ڈائیلاگ
لکھتا رہا۔ اور پیسے کماتا رہا۔ چھوٹے چھوٹے
لکھنے والوں سے ڈائیلاگ لکھواتا رہا۔ گھوسٹ
رائٹروں سے ____ لیکن اسی عرصے
میں عصمت چغتائی نے "چوتھی کا جوڑا" لکھا
____ پھر بعد میں آئے تو دہلی سے
موٹے موٹے رسالے نکلے۔ ان میں شامل
مضامین میں لکھا گیا کہ منٹو ایک افسانہ نگار
تھا اور دوسرا افسانہ نگار طراح میں رہا ہے۔
جس نے سات افسانے لکھے۔ ایک ہی جست
میں منٹو سے میں ذرا بڑا آگیا ہوں ____
ایک نقاد نے میراجی پر مضمون لکھا اور یہ
انکشاف کیا کہ میراجی کی شاعری دراصل
جدید شاعری کا آموختہ ہے غالب کے بعد۔
____ آج یہ کہا جا رہا ہے کہ کہانی
ملٹی ڈائمنشن کی ہے۔ اس لئے کہ اب
تھری ڈائمنشن کی فلمیں بننے لگی ہیں ____
۱۹۴۰ء میں جب چاول ۴۰ روپے من
ہو گیا تو کرشن چندر نے "ان داتا" لکھا۔
لیکن آج کوئلہ چالیس روپے من ہے تو کوئی
"ان داتا" نہیں لکھتا ____
میں یہ چاہتا ہوں کہ آنے والی نسل
اردو افسانہ پڑھے تو اسے آج کی تاریخ
سے واقفیت حاصل ہو۔ آپ سب کی
باتیں سنئے لیکن مشورہ کسی کا مت مانئے۔
آپ کا ضمیر یا آپ کی ایمانداری جو کہے
وہی لکھئے۔ چھپنے کی خواہش مت کیجئے۔
دو دو سو سال بعد بھی لوگ دریافت
ہوئے ہیں۔ جیمس جوائس کی مثال سامنے
ہے۔ اسٹرن کے ناول کے لوگ بکواس
کہتے ہیں کیونکہ اس کے یہاں ڈیڑھ ڈیڑھ
لائن کا چیپٹر ہوتا ہے۔ لیکن اس کی دریافت
بیسویں صدی میں ہوئی۔ آج اس پر لوگ
پی ایچ ڈی کر رہے ہیں"
اس کنونشن میں کلام حیدری کی اس تقریر یا
شین مظفر پوری کی گرفت کرتے ہوئے محمد محسن
افسانہ "انوکھی مسکراہٹ" کو نصابی گردانے کی میر
کوشش کا چرچا خوب ہوا تھا۔ میں نے شین مظ
سے اختلاف کرتے ہوئے کہا تھا:
ابھی ابھی شین صاحب نے ڈاکٹر محمد محسن
اور "انوکھی مسکراہٹ" کا حوالہ دیا ہے
کہ آج بچے بچے کی زبان پر ہے لیکن میں کہتا
ہوں کہ بچوں پر یعنی یونیورسٹی کے طلبا پر
یہ افسانہ لادا گیا ہے۔ حالانکہ یہ نفسیاتی
افسانہ طلبا کی سمجھ سے اونچی چیز ہے۔ پھر
اگر یہ افسانہ گزشتہ تیس پینتیس سال سے
مسلسل نصاب میں شامل نہ ہوتا تو اتنا
مشہور نہ ہوتا۔ آج علی امام، عبدالصمد

حسین الحق، مناظر عاشق ہرگانوی، قاسم خورشید وغیرہ کے افسانے نصاب میں شامل رہیں اور مستقل طور پر رہیں تو آنے والی نسل میں وہ افسانے مشہور ہو جائیں گے۔ اور بچے بچے کی زبان پر رہیں گے۔

اسی شام سات بجے کے بعد جب ہم سب خدا بخش لائبریری کے نئے آڈیٹوریم میں دن بھر کی کارروائی کی ویڈیو ریکارڈنگ دیکھنے بیٹھے تو اتفاق سے میری اور کلام حیدری کی نشست پاس پاس تھی۔ میں نے کلام حیدری کی تقریر کی تعریف کی، انہوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے نصیحت کی کہ اس طرح ادبی جھگڑے کیوں کھڑا کرتا ہوں۔ اور پھر ہم دونوں بہت ہی کھل کر مسکرائے۔ اور باتیں ہوئیں۔ اس شام ایسا لگا تھا کہ سارا غبار دھل گیا ہے۔

اس کے بعد کلام حیدری سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ دو تین سال قبل پتہ چلا کہ وہ دہلی میں بس گئے ہیں، انہوں نے فلیٹ خرید لیا ہے۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے خاموش تھے۔ کلام حیدری میرے تئیں سوچتے رہے تھے۔ گذشتہ سال مظہر امام کے ایک خط سے اس کا اندازہ ہوا تھا۔ یکم ۱۹۹۳ء کے خط میں مظہر امام صاحب نے مجھے لکھا:

کلام حیدری برابر فون کرتے رہتے ہیں۔ طویل گفتگو ہوتی ہے انہیں احساس ہے کہ آپ ان سے خفا ہیں وہ بدگمانی یا غلط فہمی کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ فکر مند نظر آئے کوئی رسالہ نکالنا چاہتے ہیں جس کی مجلس مشاورت میں وہ مجھے اور لطف الرحمٰن کو رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کی اجازت ہوگی تب۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ بات انہوں نے صرف مجھے کہی ہے کیونکہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا ہے وہ Folder چھپوائیں گے ـــ کلام حیدری نے سہیل عظیم آبادی پر آپ کی کتاب نہیں دیکھی ہے۔ پچھلے دنوں ان کی Bypass Surgery ہوئی تھی۔ اب بہتر ہیں۔"

مظہر امام صاحب کا خط ملتے ہی میں نے کلام حیدری صاحب کو خط لکھا اور ان کی خیریت دریافت کی۔ لیکن میرا وہ خط انہیں نہیں ملا۔ مظہر امام صاحب نے ۶ جولائی ۱۹۹۳ء کے خط میں مجھے اطلاع دی۔

"کلام حیدری کو آپ کا خط اب تک نہیں ملا میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ آپ انہیں خط لکھ رہے ہیں"

پھر مظہر امام صاحب نے ہی اطلاع دی کہ کلام حیدری گیا جا رہے ہیں۔ اور چند مہینے وہیں گذاریں گے۔ میں نے سوچا گیا میں ان سے مل لوں گا۔ لیکن میرا گیا جانا نہیں ہوا اور کلام حیدری ہم سے ہمیشہ کے لئے دور چلے گئے۔

"ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو افسانہ نگار، شاعر نقاد جس قدر دیا ہے اتنا اب تک کسی تحریک یا رجحان نے نہیں دیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی دین سے انکار کرنا ناخلفی کے سوا اور کچھ نہیں"

(کلام حیدری۔ ایک سوال کے جواب میں)

مطبوعہ زبان و ادب، پٹنہ

داخلہ جاری ہے　　　داخلہ جاری ہے

گیا میں طالبات کی معیاری تعلیم کیلئے اپنی نوعیت کا منفرد کالج

مرزا غالب کالج، گیا

- گارجین کے متواتر اصرار پر اب لڑکیوں کے لئے باقاعدہ کلاسز کا اہتمام
- اعلیٰ تعلیمی ماحول
- پریکٹیکل کا معقول انتظام
- کمپیوٹر سائنس کی ٹریننگ

اس کے علاوہ کئی دوسرے جدید اور مفید شعبہ جات میں داخلہ شروع۔

اب آپ اپنی بچیوں کا بھی داخلہ کرائیں۔

تاکہ قوم کی بچیاں ترقیاتی میدان میں پیچھے نہ رہ جائیں۔

سید مفتی امام　　　ڈاکٹر شکیل احمد

یادوں کے خزانے میں ایک اہم نام
کلام حیدری

فیاض حالی

زندگی میں بہت ساری شخصیتیں سامنے آتی رہتی ہیں جن میں بیشتر ایسی ہوتی ہیں جن کے نقش دیرپا نہیں ہوتے لیکن کچھ شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو یادوں کے خزانے میں محفوظ ہوکر ثبت ہو جاتی ہیں اور شعور پر ہمیشہ غالب رہتی ہیں۔ کلام حیدری بھی ان شخصیتوں میں ہیں جن کی یاد کبھی دماغ سے محو نہیں ہوتی۔

برصغیر میں اردو کے مشہور افسانہ نگار اور صحافی کلام حیدری پر جب لکھنے بیٹھتا ہوں ان کی شبیہ خفیف مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی دکھائی دینے لگتی ہے بار بار سوچتا ہوں کہ آخر کون سی وجہ ہے کہ کلام صاحب مسکراتے چہرے کے ساتھ نمودار ہو جاتے ہیں۔ نہ وہ میرے ہم عمر تھے نہ رشتہ دار، نہ ان سے میرا کوئی کاروباری واسطہ ہی۔ وہ اردو ادب اور صحافت کی دنیا میں ناقابل فراموش شخصیت کے مالک، اور میں ان ساری باتوں سے دور۔ بہت سوچتا ہوں، غور کرتا ہوں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہم وطن ہونے کے سبب یا اردو تحریک اور نظریاتی ہم آہنگی کے بنا پر شاید لاشعوری طور پر یہ نفسیاتی عمل ہو رہا ہے۔ گاؤں کے بزرگوں سے کلام حیدری کا ذکر سنا تھا لیکن ان سے میری پہلی ملاقات ۶۳ء میں ہوئی جب میں نے گیا کالج میں اپنا نیا داخلہ لیا تبھی سے تعلقات کا سلسلہ قائم ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گیا شہر میں کلام حیدری کے خوب چرچے تھے بہت ساری تعلیمی، سماجی اور ادبی اداروں سے ان کی وابستگی کا ذکر عام تھا۔ وہ سماج کے اوپری سطح کے نمائندہ کی حیثیت سے جانے جاتے اور بہت ہی فعال نظر آتے تھے۔ گیا شہر میں کلام صاحب کے سلسلے میں لوگوں کی مختلف رائیں سننے میں آئیں۔ کچھ لوگ انہیں سرمایہ دار کا درجہ دیکر اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ کچھ لوگ کمیونسٹ کہکر مذہب بیگانہ قرار دیتے۔ کچھ لوگ اردو تحریک وادب کا علمبردار قرار دیتے۔ گویا ہر کوئی کلام صاحب کو اپنی اپنی عینک سے دیکھتا نظر آتا تھا تاہم اس بات سے کسی کو انکار نہیں تھا کہ کلام حیدری نے گیا میں تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں کی جو جوت جگائی تھی اس کی لو آج بھی روشن ہے۔ اختلافات وشکایت سے بالاتر ہو کر کلام حیدری اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔ نئے ادیبوں کو ادبی منظر نامے پر پیش کر کے انہیں منزل کی جانب گامزن کراتے رہے اور ان کے لئے "مورچہ" و "آہنگ" کا شمارہ وقف کرتے رہے "آہنگ" کے شماروں نے جناب عبدالصمد، حسین الحق، شوکت

حیات، علی امام، انور خاں اور دیگر بہت سارے افسانہ نگاروں کو شہرت کی بلندی تک پہونچنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ کلام صاحب خود ادیب تو تھے ہی ادیب گر بھی تھے۔

کلام حیدری نے اپنی مشہور ادبی انجمن کلچرل اکاڈمی کی جانب سے "آزاد ڈے" کا پروگرام منعقد کر کے مولانا ریاست علی ندوی، ڈاکٹر سید عبد العلیم، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر خلیل الرحمن اعظمی اور دیگر اہم شخصیتوں کو گیا میں مدعو کر کے ایک یادگار تقریب کی تھی۔ انہوں نے ہفتہ وار "مورچہ" کے اجراء سے اردو ادب و صحافت کی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز کیا اور رسالہ "آہنگ" نے اردو ادب میں بہار کو وقار بخشا۔ ان دونوں رسالوں نے کم ہی مدت میں ملک گیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ آج جس کی کمی ادبی حلقوں میں شدت سے محسوس کی جاتی ہے

ایک زمانہ تھا جب کلام صاحب کا مکان "رینا ہاؤس" ادبی و ثقافتی محفلوں و تحریکوں کا مرکز بنا رہا تھا۔ وہاں اکثر کوئی نہ کوئی جلسے ہوا کرتے جس میں مقامی و غیر مقامی ادیب و شاعر نقاد محقق و عالم شامل ہوتے رہتے تھے یکم جنوری کو ہر سال "رینا ہاؤس" میں ادبی و شعری محفل سجا کر نئے سال کی ابتدا کرنا کلام حیدری صاحب کا محبوب ذوق تھا۔

کلام حیدری اپنے دور طالبعلمی میں کمیونسٹ تحریک "اسٹوڈینٹس فیڈریشن" کے ممبر کی حیثیت سے فعال رہے اس تحریک سے وابستگی کے سبب انہیں جیل کی چہار دیواریوں میں بھی قید ہونا پڑا تھا۔ کچھ وقتوں تک کلام حیدری کانگریس سے قریب رہے لیکن اس جماعت سے قربت کے باوجود حیدری صاحب کے خیالات میں تبدیلی نہیں آئی۔ اور وہ تحریر و تقریر میں اپنے ترقی پسند نظریہ کی نمائندگی کرتے رہے۔ کلام حیدری چونکہ دور طالبعلمی سے ہی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اسی لئے پروفیسر منظر شہاب، انور عظیم، ڈاکٹر شکیل الرحمن، مظہر امام، اختر پیامی اور ان جیسی بہت ساری شخصیتوں کے ساتھ ان کی نظریاتی اور ذاتی قربت بہت زیادہ رہی۔ عمر کی آخری دہائی میں وہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر اور تا مرگ یہ رشتہ قائم رہا۔

ادب میں کلام حیدری بیک وقت افسانہ نگار ہیں، صحافی بھی، مبصر بھی ہیں اور مقالہ نگار بھی لیکن ان کی حیثیت تو تسلیم شدہ ہے اول افسانہ نگار کی دو رسم صحافی افسانوں کی دنیا میں ان کے کئی مجموعے سامنے آئے، "نام کلیاں"، "بے چہرہ"، "صفر"، "الف لام میم" اور "گولڈن جوبلی"، مجموعوں میں اظہار کے حسن کا ارتقائی سلسلہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ مذکورہ مجموعوں کے ذریعہ کلام صاحب نے کچھ بے مثل کہانیاں اردو ادب کو عطا کیں۔ آج جب ہم پریم چند، کرشن چندر، بیدی، جوگندر پال، احمد یوسف، انتظار حسین اور عظیم آبادی کی کہانیوں کے جائزہ لیتے ہیں تو ان میں سے بھی کم کلام حیدری کا قد نیچا نہیں لگتا۔ بلکہ اظہار اور کی تخلیقی بلاغت کو سامنے رکھتے ہیں تو کلام حیدری بہتوں سے سربلند نظر آتے ہیں۔

بائی پاس سرجری کرانے کے بعد کلام صاحب گیا تشریف لائے بظاہر صحت مند نظر آتے تھے لیکن ان کی باتوں سے صاف ظاہر ہوتی تھی وہ بہت زیادہ زندگی سے ناامید ہو چکے تھے ۲ فروری ۱۹۹۴ء کو علی الصبح رہائش گاہ "شاداب منزل" میں خبر ملی کہ کلام حیدری انتقال کر گئے، اس خبر نے سکتہ طاری کر دیا۔ کچھ دیر کے لئے سوچنے سے عاری ہو گیا کہ کدھر جاؤں، پھر خود کو سنبھالنے کے بعد "رینا ہاؤس" کی جانب روانہ ہوا۔ جہاں حیدری صاحب کو کپڑے میں لپٹا پاکر بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ کلام حیدری صاحب کو ابدی نیند میں دیکھ کر "رینا ہاؤس" کی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں جہاں مرحوم ادبی و شعری و ثقافتی محفلیں آراستہ کیا کرتے تھے، آج اسی کلام حیدری۔

بقیہ صفحہ ؟

کلام حیدری بحیثیت استاد

شیریں اختر، گیا

ے تمہیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کے زندہ ہو
تمہاری خوبیاں باقی تمہاری نیکیاں باقی

میں نے زندگی میں کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا
ن پر فخر کرسکوں۔ ہاں کچھ نسبتیں ایسی ضرور ہیں جن پہ فخر
بل تو بے جانہ ہوگا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کلام حیدری
رحوم) میرے استاد تھے اور مجھے اپنے علمی و ادبی کاموں
سلسلے میں ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۳ء تک اکثر و بیشتر ان کی خدمت
حاضر ہونے اور ان کے علم و فضل سے استفادہ کرنے
قع ملا۔

جب میں گیا کالج سے اردو میں ایم اے کررہی تھی
زمانے میں کلام حیدری نے بلا کسی اجرت کے ایم اے کا
لینا شروع کیا تھا۔ پہلی دفعہ جب وہ کلاس میں
تب انہیں قریب سے دیکھا ان سے میرا یہ پہلا تعارف تھا
روز انہوں نے۔ اردو فکشن۔ پر لکچر شروع کیا اور ایسی
فشانی شروع کی کہ ہم طلبہ یہ بھول گئے کہ کب پیریڈ ختم ہوا
حیدری صاحب بہت اچھے استاد ثابت ہوئے۔
کے بعد ہم لوگوں کو کلاس میں ان کی آمد کا بے چینی سے
رہنے لگا۔ وہ داستانوں سے لے کر سرسید، حالی، شبلی

آزاد، پریم چند، قرۃ العین حیدر اور دوسرے ادیبوں کی نثر
کو بڑی توجہ سے پڑھاتے۔ پریم چند اور قرۃ العین حیدر ان کے
کے پسندیدہ رائٹر تھے۔ اردو ادب کے جدید رجحانات
پر بھی کلام حیدری کی گہری نظر تھی اور انگریزی ادب سے بھی خاصی
واقفیت رکھتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جب وہ محسوس
کرتے کہ طلبا فکشن کی باریکیاں نہیں سمجھ پا رہے ہیں تو مشکل
الفاظ کے معنی بتاتے۔ محاورے اور زبان کی خوبیاں اجاگر
کرتے۔ ان کے برمحل جملے میرے لئے کشادگی ذہن کا باعث
ہوتے تھے۔

ایک روز میں اپنی کلاس فیلو کے ساتھ کلام حیدری
صاحب کی قیام گاہ۔ ریناہاؤس۔ گئی ہماری آمد کی اطلاع پاکر
آنٹی (بیگم کلام حیدری) آئیں اور بڑی محبت سے ملیں۔ سر
اس وقت گھر پر موجود نہ تھے۔ آنٹی نے فون کرکے انہیں
فوراً بلوالیا۔ سر بھی اپنی مخصوص شفقت سے پیش آئے۔ اور
آنے کی وجہ پوچھی تو میں نے دبی زبان سے کہا کہ سر آپ ہمیں
قرۃ العین حیدر کے ناولٹ پر کچھ نوٹس تیار کروا دیں۔ سر
کاؤچ پر کشن لگاکے بیٹھ گئے۔ اور ہم لوگوں نے صوفوں پر جگہ لی۔
انہوں نے اور آنٹی نے بڑی دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو
کی پھر اپنے افسانوی مجموعے اور دوسری اہم تخلیقات کی

تفصیل بتائی۔ کہ وہ کہاں اور کب شائع ہوئیں۔ آنٹی کی
باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی ادب کا نکھرا ذوق رکھتی ہیں۔
میں نے اس روز سر سے آٹوگراف بھی لیا تھا۔ جس پر انہوں
نے یہ جملہ لکھا تھا۔ اردو کو اپنے گھروں میں زندہ رکھو۔ اس
کے بعد کلام صاحب نے ہم لوگوں کو اگلے روز آنے کے لئے
کہا۔ غرض کہ اس دن کی ملاقات کا ایک خوشگوار تاثر ابھی تک
میرے دل و دماغ پر قائم ہے۔

اس طرح ہم لوگوں کو کلام حیدری سے اکتساب فیض
کے بہت مواقع حاصل ہوئے۔ ان کی گفتگو سے بھی اور ان
کے لکھائے نوٹس سے بھی۔ وہ ہمارے ہر مضمون کی نوک پلک
درست کرتے۔ اور اپنی معلومات کی خزانے سے لسے وقیع بنا
دیتے۔ آنٹی بھی ہمیشہ چائے ناشتہ سے تواضع کرتیں۔ امتحانات
کی تیاریوں کے دوران سر اقبال اور فیض کی نظمیں بڑے شوق
سے پڑھاتے تھے۔ فیض کی تنہائی، انتساب، بول، آج بازار
میں پابجولاں چلو وغیرہ نظموں کا تجزیاتی مطالعہ انہوں نے ہمیں
بڑی محنت سے ذہن نشین کرایا تھا۔ ایسا لگتا ہے آج بھی ان
کی سحر انگیز آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ افسانہ نگاری ہو کہ
شاعری، ہر موضوع پڑھانے کے بعد سر ہمیں یہ بھی بتاتے کہ فلاں
موضوع پر اور کون کون سی کتابیں موجود ہیں۔ اور ضرورت پڑنے پر
اور اپنی الماریوں سے کتابیں نکال کر نصاب کے مطابق پڑھنے
کو بھی دیدیتے۔ جب ہم لوگ ان سے پڑھنے جاتے تو سر
زیادہ تر اپنے دفتری کمرے میں پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتے
اکثر بے تکلف ملنے والے بھی وہیں آکر بیٹھ جاتے۔ ان کے گھر
میں آنے جانے والوں کے دم سے بڑی رونق رہا کرتی تھی۔
اور لوگوں کے لئے کشش کا سبب کلام حیدری صاحب کی
ذات تھی۔

ایک واقعہ جو اس وقت میرے ذہن میں ابھر رہا ہے
وہ یہ کہ کلام صاحب نے ہمیں ملا وجہی کی تصنیف "سب رس"

پر کسی مصنف کے لکھے کچھ مواد دکھائے۔ دو
دن پہلے پرچے کا امتحان ہونے والا تھا اور وہ نوٹ
مجھے اور میری ساتھی دونوں کو پڑھنا ضروری تھا۔
دیر خاموش رہے پھر اپنے ملازم ہری کو بلوا کر اپنی
روپے نکال کر دیئے اور اس مواد کو زیروکس کا پی
کو کہا۔ پہلے تو ان کی یہ بات غیر ضروری معلوم ہوئی
جب انہوں نے وہ زیروکس کاپی مجھے حوالے کر دی
بہت شرمندہ ہوئی، خدا ان پر رحمت و مغفرت
برسائے۔

میں سر کی کن کن خوبیوں اور باتوں کو
ان کے اوصاف بے شمار تھے اور صفحات محدود
طالبعلموں کو اپنی علمیت سے مرعوب کرنے کے
ان کے اندر مضمون سے شغف پیدا کراتے تھے۔ ان
کی خصوصی مہربانیوں سے "مورچہ" اور "آہنگ" کے
شمارے اور خاص نمبروں کے مطالعہ کا موقع ملا۔
کی کئی مطبوعہ کتابیں بھی کلام حیدری صاحب نے ہمیں
کیں۔ کئی نئی رسالوں سے روشناس کرایا۔ اور خریدنے
کی سختی تلقین کی تھی۔

ایک مرتبہ ہم لوگ کسی مقالے کی تیاری کے
کے پاس گئے۔ سردی کا مہینہ تھا۔ دن کے تین بجے
گیٹ پر ملازم نے بتایا، صاحب ابھی آرام کر رہے
ہم لوگوں نے کچھ کہلوانا مناسب نہ سمجھا۔ اور سر کے ا
میں نچلی منزل کے برآمدے میں رکھی کرسیوں پر
گئے۔ تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا۔ اتنے میں سر
دکھائی دیئے۔ ہمیں دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے
دیر سے آکر بیٹھے ہیں اور انہیں خبر نہیں۔ تھوڑی دیر
دیکھا کہ وہ ملازم پر خاصے ناراض ہو رہے ہیں۔ اد
ہیں کہ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ اس کے علاوہ ح

زرہ وقت پر پڑھنے کے لئے پہونچتے اور سر کو ضروری کام پڑ
تا تو اکثر ہمارے لئے چھوٹی سی پرچی چھوڑ جاتے اس پر لکھا
ناکہ بیٹا لوگ! آج میں کچھ ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں،
لوگ فلاں روز فلاں وقت آ جانا۔ ہم مطمئن ہو کر لوٹتے
نے بڑے عظیم ادیب کا اپنے شاگردوں کا اس طرح خیال
نا ان کی کشادہ دلی کا ثبوت ہے۔

کلام حیدری صاحب کو میں نے کئی بار گیا کالج کی
ب محفلوں میں بھی شریک ہوتے ہوئے دیکھا ہے محلس
یا محفل، مذاکرہ ہو یا سیمینار ہر جگہ ان کی اختراعی شان
رندرت پسندی عیاں ہو جاتی۔ سر کے مزاج کی شوخی اور
کی ظرافت زبانی ہو یا تحریری۔ کبھی کبھی بھرپور طنز کا کام
اتی، جس کے باعث بعض حضرات ناخوش ہو جایا کرتے تھے
بلکہ کیا کرتے تھے۔ پھر بھی میرا مشاہدہ ہے کہ انہوں نے کبھی
نے مخالفوں کی پروا نہیں کی۔ ہر جگہ حق بات کہی۔ صاف اور
نگ کہی۔ اسی زمانے میں ان کا ایک مضمون رسالہ کتاب نما
، غالب خستہ، کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جسے
م حیدری نے غالب پر لکھے کسی فاضل مصنف کے مضمون
تردید میں لکھا تھا۔ اور ادبی حلقوں میں اسے بہت سراہا گیا
۔ مجھے اس مضمون میں کلام حیدری صاحب کا لکھا یہ جملہ بہت
ند آیا تھا۔

"انگریزی کے حوالے قابلیت کی دلیل ہو سکتے
ہیں لیکن ذہانت اور نکتہ رسی کا ثبوت نہیں"

ب میں نے اردو ایم اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس
تو کلام حیدری صاحب نے بے حد خوشی کا اظہار کیا تھا۔
، درمیان وہ دلی چلے گئے تو کئی مہینوں تک ان سے ملاقات
ہو سکی۔ اس کے بعد اتفاق سے گیا کالج میں طلبا کی الوداعی
ئی کی تقریب میں سر سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ تقریب
۔ اختتام پر جیسے ہی ان کی نظر مجھ پر پڑی، نہایت بے تکلفی

سے ملے۔ خیریت دریافت کی اور فرمایا — بیٹا آج کل کیا
کر رہی ہو؟ کوئی مضمون وغیرہ لکھا یا نہیں؟ میں نے نفی
سے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے مجھے گھر پر آ کر ملنے کو کہا
دوسرے دن جب میں ان کے مکان پر ملنے گئی تو کلام حیدری
صاحب اپنے دفتری کمرے میں سکریٹری کے ساتھ بیٹھے
کچھ کام کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے "آؤ بیٹا، بیٹھو۔ پھر
میری پڑھائی کا احوال پوچھنے لگے تو میں نے اپنی ڈائری ان
کے سامنے رکھ دی جس میں میں علیم اللہ حالی صاحب کی
کتاب نخل جنوں (شعری مجموعہ) پوری کی پوری نقل کر لی تھی،
خلاف توقع سر بہت خوش ہوئے۔ اور اپنی ادبی فائل
سے چند مواد نکال کر نقل کے لئے مجھے دیا۔

کچھ عرصے کے بعد کلام حیدری صاحب پھر دلی چلے گئے
اس کے بعد یہ بری خبر سننے کو ملی کہ انہیں شدید قلبی دورہ پڑا
ہے سن کر میرے دل پر گہری اداسی اور مایوسی چھا گئی۔ میں
نے ان کی صحت یابی کے لئے بہت دعا مانگی۔ اللہ نے
سن بھی لی۔ آپریشن ہو جانے کے بعد جب کلام حیدری صاحب
دلی ہاسپٹل میں زیر علاج تھے۔ تو میں نے انہیں ایک خط
بھی لکھا اور جس کا جواب طبیعت کی ناسازی کے باوجود انہوں
نے دیا۔ ان کا وہ خط میرے لئے تعویذ سے کم نہ تھا۔ دلی سے
صحت یاب ہو کر لوٹنے کے بعد کلام حیدری صاحب سے
میری ملاقات اگست ۹۳ء میں ہوئی تھی۔ وہ اپنائیت
اور خلوص کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھے اور اپنے مخصوص
ٹھہرے ہوئے پرسکون انداز میں باتیں کرنے لگے۔ انہیں سبھی
جاننے والوں کے نام لے لے کر مجھ سے تفصیلی خیریت معلوم
کرتے رہے۔ بیچ بیچ میں کلام حیدری صاحب کی بیماری کا
تذکرہ تھا۔ پھر آنٹی کے ساتھ خود بھی مجھے دروازے تک
چھوڑنے آئے۔

چند روز کے بعد کلام حیدری صاحب نے مجھے بلا کر

اپنے نام لکھے سہیل عظیم آبادی کے خطوط کی نقل کرنے کو دی۔ وہ ان خطوط کو مرتب کرنا چاہتے تھے جب میں نے سارے خطوط نقل کر کے دی تو بہت خوش ہوئے نوازا انعام کی شکل میں ایک معقول معاوضہ دیا۔ پھر انہوں نے ایک اور ادبی فائل نکالی اور اپنے نام لکھے ہند و پاک کے مشہور و معروف ادبا و شعرا کے خطوط نقل کرنے کو کہا اس میں ان کے کئی شاگردوں کے خطوط بھی شامل تھے جنہیں سر پد نیہ کالج میں پڑھایا کرتے تھے ان خطوط کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ طلبا کے درمیان کلام حیدری کتنے مقبول تھے۔

کلام حیدری صاحب کو میں نے قنوطیت کا شکار ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا بلکہ وہ تو رجائیت کے علمبردار تھے معلوم نہیں کیوں وہ کچھ مہینوں سے زندگی سے مایوسی کا اظہار کرنے لگے تھے۔ دسمبر ۹۳ء کے وسط میں ایک دن بات چیت کے دوران انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ بیٹا! میری طبیعت اب کسی چیز میں نہیں لگتی، کوئی اچھی بات بھی مجھے خوش نہیں کر پاتی۔ یہ الگ بات ہے کہ تم لوگ مجھے ظاہری طور پر نارمل دیکھ رہی ہو مگر یہ اندازہ نہ کر سکو گی میں اندرونی طور پر بیمار ہوں۔ پھر کہنے لگے اگر کسی انسان کو یہ پتہ چل جائے کہ وہ زیادہ دن نہیں جی سکے گا تو سوچو اس کے دل کی کیفیت کیا ہو گی!، میں نے اس بات پر انہیں ٹوکا بھی کہ سر آپ کیوں اس طرح زندگی سے شکست کا اظہار کر رہے ہیں۔ جبکہ خود ہی آپ نے "تفہیمات" (کلام حیدری صاحب کا تنقیدی مجموعہ) میں جوش والے مضمون میں لکھا ہے کہ "جوش کی فلاں نظم سے شکست کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ بد دلی پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان کی قوت عمل مفلوج ہو جاتی ہے وغیرہ۔ سن کر کلام حیدری صاحب زیر لب مسکرانے لگے اور پھر گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ آنٹی بھی ان کی اس قسم کی باتوں سے فکر مند ہو جایا کرتی تھیں۔

۳۰ جنوری ۹۴ء کو جب میں کلام حیدری صاحب کے پاس ان کے ضروری کاغذات لے کر گئی تو اس روز وہ خلاف معمول بہت فکر مند تھے اس وقت یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ میری آخری ملاقات ہے ۳ فروری کو صبح کو اچانک یہ منحوس خبر ملی کہ کلام حیدری صاحب نہیں رہے، دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور ایسا محسوس ہوا کہ کوئی اپنا مہربان ہمدرد اور سرپرست ہم سب سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ اور اب کلام حیدری صاحب (مرحوم) ہمارے درمیان موجود نہیں تو میں سوچتی ہوں کہ جو ادبی سرمایہ وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں جو پرخلوص یادیں ہمارے دلوں میں ان کی ہیں اور جو شفقت و محبت انہوں نے ہم طلبہ پر نچھاور کیں وہ کلام حیدری صاحب کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

وہ کون سی کشش تھی، وہ کیا شئے تھی کہ گوتم نے جب دھیان کا سوچا اور نروان کے لئے اس کی روح مضطرب ہوئی تو وہ اس بستی تک کھنچے چلے آئے۔

اس پیپل کے پیڑ سے میں نے بارہا پوچھا کہ وہ نروان کے لئے تڑپتی ہوئی گوتم کی روح کا حال بتائے مجھے کیا آ کر ہی نروان پراپت ہو سکا۔ وہ کون سا لمحہ تھا وہ کون سی گھڑی تھی؟ مگر ان بے شمار بولتے ہوئے پتوں کے لبوں سے نکلے ہوئے لفظوں کو میں معنی میں نہ ڈھال سکا، میں ان تقدس میں ڈوبے ہوئے الفاظ کے پیچھے دوڑا، مگر کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ وہ پتے بول رہے تھے جھوم جھوم کر —— وجد میں آ کر بول رہے تھے مگر میں گنہگار ان کی پوتر زبان کو کیا سمجھتا،،

"زندہ شہر گیا" کلام حیدری کی ایک تحریر سے اقتباس"

شام بھی تھی دھواں دھواں

شاہدہ حیدری

۷ فروری ۱۹۹۴ء کی رات اچانک مجھے یتیم بنا کر
گئی۔ ڈیڑھ سال قبل بھی میری زندگی میں ایسی ہی ایک رات
تھی ۲، نومبر ۱۹۹۲ء کو ——— اور اس وقت بھی میں پتھر کی طرح
ساکت ہو گئی تھی۔ مگر پھر نہ جانے کیسے زندگی کو رحم آ گیا تھا مجھ
ساکت ہاتھ پاؤں میں جینے کی رمق پھر سے ایک بار
گئی تھی۔ ——— کلام صاحب کو دل کا شدید دورہ پڑا
پہلی بار ۲، نومبر ۱۹۹۲ء کو۔ اس وقت بھی ان کی ایسی ہی
ہو گئی تھی۔ جو ۷، فروری ۱۹۹۴ء کی منحوس گھڑی میں ہوئی۔
مگر اس وقت ہم لوگ دلّی میں تھے۔ پاس ہی کے ایک
تال میں جلد ہی جلدی انھیں داخل کرایا گیا تھا۔ ڈاکٹروں
دیکھتے ہی جواب دے دیا تھا۔ اور کہہ دیا تھا کہ بس چند
کے مہمان ہیں۔ مگر FIRST AID کے سارے
امات وہاں مہیا تھے۔ ڈاکٹروں نے مل جل کر کوشش
چھوڑی تھی انھیں بچانے کی۔ اور آخر صبح ہوتے
وہ سنبھل گئے تھے اور پھر تو ایسے سنبھلے تھے کہ بالکل
بھلے ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ دل کا شدید دورہ پڑا
تھا۔ اس لئے ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اسکارٹ
اسپتال میں ہر قسم کی طبی جانچ کا سلسلہ شروع ہو گیا
خر میں ڈاکٹروں کی ٹیم کا یہ فیصلہ ہوا کہ آپریشن ہونا
چاہئے۔ کیونکہ دل کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ اگر آپریشن
نہ کیا جائے تو آئندہ کی کوئی امید نہیں تھی۔ تین چار مہینے
آرام کے بعد جب انھیں طاقت آ گئی تو آپریشن بھی ہوا۔
ڈاکٹر نریش ترہن (DR. TREHAN) نے اپنے ہاتھ سے
اور انہماک سے یہ آپریشن کیا۔ اور مجھے بتایا کہ یہ آپریشن کرنے
میں انھیں بے حد دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا چونکہ دل
کی بیماری بہت ابتر حالت میں پہونچ چکی تھی ———
اور یہ بھی کہ انھیں صحت مند میں کچھ زیادہ وقت لگے گا مگر یہ
صحت یاب ہو جائیں گے۔ جب آپریشن ہو چکا اور یہ صحت مند
ہونے لگے اور ہمیں یقین ہو گیا کہ آپریشن کامیاب ہوا ہے۔
تو میری مایوسی آہستہ آہستہ خوشی میں بدلنے لگی۔

اب ایک سال ہونے کو آ رہا تھا۔ ۲۴، فروری
۱۹۹۳ء کو ان کا آپریشن ہوا تھا۔ اور ۷ فروری ۱۹۹۴ء
تک وہ اتنے تندرست اور سرخ و سفید ہو گئے تھے کہ
کوئی شائبہ نہ تھا کہ آگے اتنا بڑا عدم کا اندھیرا ان کا
انتظار کر رہا تھا۔

حالانکہ یہ خود اکثر و بیشتر یہی کہا کرتے تھے کہ میرا
آپریشن شاید ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ یہ ظاہر میں اچھا لگتا
ہوں پھر بھی مجھے اچھا نہیں لگتا ——— اور اس

احساسات کے ساتھ بہت ہی بادلِ ناخواستہ برداشت کیا کرتے تھے۔ لیکن اکثر ٹینشن سے بھی ہوجاتے اور دو، تین گھنٹوں کے جمنٹ میں بیٹھ کر خوش گپیاں بھی کرتے اور اس وقت میں سوچتی یہ تو بس تنگ کرتے ہیں خواہ مخواہ اچھے خاصے تندرست ہیں اور صرف مجھے ڈرانے کے لئے کہتے ہیں کہ میں اچھا نہیں ہوں۔ یہی بات میں ان سے بھی اکثر کہتی، آپ تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں پھر کیوں ہر وقت گھبراتے رہتے ہیں۔ صرف مجھے پریشان کرنے کے لئے، میں نہیں جانتی تھی کہ آپ اتنی بڑی سزا دینے کی تیاری کر رہے تھے۔

ڈاکٹروں نے بھی یہی کہا کہ اب اچھے ہوگئے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مایوسی اور DEPRESSION اکثر آپریشن کے بعد ہوجاتی ہے جو آہستہ آہستہ خود بخود ختم ہوجائے گی۔ میں بھی ڈاکٹروں کی باتوں میں آگئی۔ اور ان کی ہر طرح سے دل جوئی کرتی رہی، اور یہ یقین دلاتی رہی کہ اب کوئی ڈر نہیں۔ اب تو سال بھی لگ رہا ہے۔ اب آپ اچھے ہوگئے ہیں اب تو ہم آگے اپنی زندگی پھر سے شروع کریں گے۔ لیکن اس شام جب کہ ۲، فروری ۱۹۹۴ء کا دن ہنسی خوشی گذر چکا تھا ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ علیم اللہ حالی آئے ہوئے تھے۔ اور ہم مل کر بڑی اچھی باتیں کر رہے تھے۔

کلام صاحب نے فراقؔ کا ایک یہ شعر پڑھا تھا ؎

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

اور اس کے بعد ایسے ایسے کئی خوبصورت اشعار کا ذکر باتوں ہی باتوں میں نکلتا چلا گیا تھا۔ اور ہم اس ہلکی پھلکی ادبی گفتگو کے حصار میں تھوڑی دیر کے لئے کھو گئے رہے تھے۔ حالی ان سے کچھ سوالات انٹرویو کے انداز میں پوچھتے جاتے تھے اور وہ ان کے جواب دیتے جاتے تھے۔ جیسے حالی جلدی جلدی نوٹ کرتے چلے جاتے تھے

یہ سلسلہ تھا۔ [illegible] اور [illegible] کہا تھا ۔۔۔ ۔ [illegible] اس طرح سے تو میں ناول بھی لکھ ہی ڈالتا ہوں پلاٹ ذہن میں کب سے تیار ہے۔ بس آنکھوں کی کمزوری اور موتیا بند کی وجہ کر لکھنے سے مجبور ہوجاتا ہوں بس تم یہ رجسٹر رکھو۔ اور اس میں ہی تم لکھتے جانا۔ میں بولتا جاؤں گا۔ چلو ناول بھی میں بات کی بات میں مکمل ہی کرا دوں، کل سے کام شروع۔ حالی نے کہا۔ کل سے کیوں، آج ہی سے کیوں نہیں۔ کم از کم نقشہ تو آج بتا دیجئے ناول کا۔ میں نوٹ آج ہی سے کئے لیتا ہوں تفصیلی کام کل سے ہوگا۔ کہنے لگے نہیں کل ہی سے، کل اچھا دن بھی ہے۔

اور وہ کل کبھی نہیں آیا۔ حالی کو ساڑھے نو بجے اپنے گھر واپس جانا تھا تو میں نے کھانا کھا کر جانے [illegible] نے جواب دیا، نہیں بھابھی، چلتا ہوں دیر ہوجائے گی۔ اور حالی نے کلام صاحب سے رخصت لی اور چلے گئے

پھر ہم دونوں نے مل کر ہر روز کی طرح کھانا کھا ہر روز کی طرح میں نے انھیں کچھ دوائیاں کھلائیں۔ اور سونے سے پہلے یہ باتھ روم کی طرف گئے حسب معمول ۔۔۔ مگر لوٹے، تو آکر دیوان پر لیٹ گئے۔ میں نے پیشانی پہ ہاتھ رکھا تو پسینہ تھا۔ حالانکہ سردی کافی پڑ رہی تھی۔ پوچھا طبیعت مگر دیکھا کہ سانس بھی تیز چل رہی ہے۔ سمجھ گئی کہ قسمت میرا ساتھ چھوڑنے والی ہے شاید ۔۔۔ کہ وہی دورہ سے ہوگیا جو ڈیڑھ سال پہلے ہوا تھا۔ اور جس نے مجھے پتھر کی طرح ساکت کر دیا تھا۔ مشین کی طرح جو ہو سکا میں نے کیا۔ فون کیا۔ بہن بھائی سب آگئے۔ ہارٹ اسپتال جو گیا جیسے ناقص شہر میں میسر تھا اس میں لے گئے ۔۔۔ پندرہ منٹ گھر پر اور شاید مشکل سے پندرہ منٹ اور اسپتال میں لگے۔ اسپتال میں آکسیجن تک کا تو کوئی انتظام نہیں تھا کہنے کو CARDIAC CENTRE

ہ تقدیر کی قائل تو نہیں تھی مگر نوشتۂ تقدیر کا تماشہ
رہی جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ آپریشن کے باوجود
ت مند ہونے کے باوجود پھر وہی دورہ گیا جیسے چھوٹے
ہو گیا ہے گویا آپریشن کامیاب نہیں ہوا۔ اور اب
ئے پناہ نہیں میرے لئے۔ اسپتال میں مشکل سے
منٹ لگے۔ پھر زندگی ہمیشہ کے لئے تھم گئی۔ میں پتھر ہو گئی
یار وشن ماضی بھیانک اندھیرے میں ڈوب گیا۔
چھ منوں مٹی تلے دب گیا۔ ایسا جیالا، زندگی کو بھر
نے کی بھر پور تمنا لئے ہوتے مجھے ایسی زندگی جھیلنے
ے تنہا چھوڑ گیا۔ ——— ہاتھ آزاری ہوئی پچھلی
کی جھلکیاں جو کبھی یادوں کے جھروکے سے تقویت
میں۔ اب وہ بھی موت کے اندھیرے غار میں ڈوب
ے۔ انھیں یاد کر کے بھی آنسو، — انھیں بھول کر بھی
— آنسوؤں کی یہ لڑی میری زندگی کا ہار بن گئی ہے
قبل نظر آ رہا ہے نہ حال سمجھ میں آتا ہے۔ سب کچھ
STILL تصویر بن کر رہ گئے۔ سب عدم کے غار
ن ہو گئے۔ لیکن اتنا اچانک کیوں ؟ ——— اتنا
ے کہ ابھی تو میرے گھر کے ہر کونے ہر دالان سے
ہ قدموں کی جانی پہچانی آہٹ بھی سنائی دے رہی ہے
ہ کھانسنے کی آواز، ان کی باتوں کی بازگشت کہاں سے
ہ کانوں میں ہر وقت گونج رہی ہے۔

کمرے میں رکھی ہوئی ان کی ہر چیز یہ اچانک مجھ
نسوؤں کی زبان میں کیوں باتیں کئے جا رہی ہے۔؟
روب میں رکھے ہوئے ان کے کپڑے اپنی خوشبوؤں
سے ابھی تک تر و تازہ کیوں ہیں ؟ واش بیسن کے آئینے
ے ہوئے برش، شیونگ کا سامان، اب یہ سب
انتظار کر رہے ہیں؟ یہ اچانک مجھے کیا ہو گیا کہ اب
یہ ان سب کے حصار سے نکل نہیں پا رہی ہوں

حالانکہ ساری دوائیاں، جنھیں وقت پر کھلاتے
ہوئے میں نہیں تھکاتی تھی۔ اب ایک ساتھ مل کر میرا منہ
چڑا رہی ہیں، کہہ رہی ہیں، اب اور کھلاؤ دوائیاں۔
کون ہے جسے کھلا کر جلاؤ گی؟ تم نے تو لاکھ جتن کرلئے مگر
کیا نوشتۂ تقدیر سے لڑ سکیں۔ نہ دوا سے نہ دعا سے۔
——— پھر یہ ہاتھ اٹھا کر خدا سے کیا مانگ رہی
ہو؟ ان کی مغفرت کی دعا ——؟ ہاں! بس اب یہی تمہاری
قسمت ہے اور تم اب قسمت کے اسی حصار میں گم رہو۔
یہاں تک کہ تمہیں بھی موت کی گود میں پناہ مل جائے۔

" اردو کے افسانوی ادب کی روایات پر نظر
ہوتا، اس کا احترام ہوتا، اور اردو نثر کی صفات بھی پیش نظر
ہوتیں تو اردو کا افسانوی ادب مغرب کا افسانوی ادب
کا اثر اس طرح قبول کرتا پڑتا کہ خود مغرب کے افسانوی
ادب کو اردو کے افسانوی ادب سے اثر قبول کرنا پڑتا۔
مگر اردو کے افسانہ نگار کا عالم یہ ہے کہ میر امن کو اس
نے مرصاحب سمجھ کر اسی طرح نظر انداز کیا جس طرح مذہب
کی دنیا میں بے چارے مؤذن کا حشر ہوا کہ ہزار پکارتا ہے اور
کوئی نہیں سنتا "
کلام حیدری، ایک گفتگو میں (مطبوعہ زبان و ادب پٹنہ)

بغیر پلاٹ کی کہانی یا پلاٹ والی کہانی کی میری نظر میں
ایک حیثیت ہے شرط صرف ایک ہے کہ کہانی تخلیق کے
رتبے کو پہنچ گئی ہو۔ کسی بھی تخلیق کیلئے کوئی چوکھا بنانا یا اس کے
لئے کسی معجون کے نسخے کی طرح اجزائے ترکیبی تجویز کرنا یا تلاش
کرنا نہایت غیر تخلیقی کام ہے۔ (کلام حیدری ایک سوال کے جواب میں)
(مطبوعہ زبان و ادب)

نقد و فن

کلام حیدری اور صحافت

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی

سہیل گیا کلام حیدری خصوصی نمبر نکال کر عظیم آبادکی
رہا ہے جو مستحسن ہے۔ کلام حیدری جو اپنے فروری
کو داغِ مفارقت دے کر واصل بحق ہو گئے۔
اردو ز متعدد ابعاد و منازل کے حامل تھے۔
گیا جو قبل مسیح صدیوں سے علم و عرفان کا گہوارہ
کلام حیدری صاحب مرحوم
تھا۔ کلام حیدری صاحب نام و مقام کے حامل
تھے ہی اعلیٰ اوصاف کے صحافی تھے۔ زیر
مضمون میں مرحوم کی صحافتی ظفریابیوں کا جائزہ مقصود

ملحوظ رہے، صحافت و ادب میں فاصلہ کیا
ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر ادیب صحافی اور
ادیب ہونے کی خفی صلاحیت رکھتا ہے تو بہ
سے درست ہوگا۔ ادب اور صحافت کے
پر اردو میں بہت کم کام کیا گیا ہے۔ دیکھئے نا
انگریزی میں خبر کو کہانی کہا جانے لگا ہے
پہلے پہل اس نئی اصطلاح سے کان نامانوس تھے
کا استعمال کچھ عجب سا معلوم ہوتا ہے۔ غور
کرنے پر حقیقت تک رسائی ہوتی۔ کوئی واقعہ ہو
اس کے بیان کرنے میں کچھ نہ کچھ بیان کرنے والے کا
اپنا مخصوص اندازِ بیان بھی شامل بیان ہو جاتا سمجھ میں
آنے والی بات ہے۔ اس طرح ہر خبر میں کہانی اور
ہر کہانی میں خبر کی شمولیت ہوتی ہے۔

چونکہ فکشن نگاری پر ان کی ادبیاتی صلاحیتوں
کا ارتکاز زیادہ رہا اور مرحوم نے الف لام میم جیسا
شاہکار ناول (لاہی) یادگار کے طور اردو کو دیا ہے۔
اسی افسانوی پیشکش سے صحافت کی جانب ان کے رجحانات
کی بھی آئینہ داری ہوتی ہے۔ انھوں نے گیا کلچرل اکیڈمی
قائم کی جس کی تاسیس کے کچھ بعد ہی ایک ادبی رسالہ
"آہنگ" کا اجرا کیا۔ آہنگ جلد ہی ممتاز مقام و
مرتبہ کا حامل ہو گیا۔ آہنگ اردو ادب کے فروغ و
ارتقا میں دو دہائی سے زیادہ عرصہ تک ترجمان کی حیثیت
سے سرگرم عمل رہا۔ کلام حیدری صاحب تحفظاتِ
ذہنی و معذرات قلبی کے خلاف تھے۔ اس حقیقت
کی نشاندہی ایک مثال دے کر کرنے سے بات صاف
ہو جائے گی، اور وہ بات ہے کلیم الدین احمد سے متعلق۔

کلیم الدین احمد ایسے ناقد تھے جو متعدد موضوعات سے متعلق ایسی
رائے زنی کر دیتے تھے جو تحفظات و مضمرات ذہنی میں
ملوث اشخاص برداشت نہیں کر سکتے تھے اور نتیجتاً انکے
دشمن ہو جاتے تھے، درآنحالیکہ ان میں اتنی جرأت نہ
تھی کہ وہ ان کے استدلال کی تکذیب کر سکیں مثال
طور پر دو باتیں لوگوں کو ناراض کیئے ہوئے تھیں :۔

۱۔ " اردو میں تنقید کا وجود معشوق کی موہوم کمر ہے
یا اقلیدس کا فرضی نقطہ ۔ ۔ ۔ ۔ "

۲۔ " اقبال کا عالمی شاعری میں کوئی مقام نہیں ہے ۔ اس
موضوع پر ان کا فاضلانہ مضمون "آج کل" نومبر
میں شامل کیا تھا اور جکو وگیان بھون نیو دہلی میں
منعقدہ اقبال جشن صدسالہ سیمینار میں تیسرا کا میں
تقسیم بھی کیا گیا تھا ۔ اسی شمارے میں فراق گورکھپوری
کا اقبال کی شاعری پر اعتراضات پر مشتمل مضمون
بھی شمولات میں تھا ۔ اسی نوعیت کا میرا مضمون
سہ ماہی "تناظر" میں نکلا تھا ۔ سیمینار کے جملہ
مقالے پیش کرنے والوں نے ان تینوں مضامین
کو سنجیدگی سے مطالعہ کیا ۔ ہر مقالے کے بعد
جو سوالات کیئے جاتے ہیں اور مقالہ پیش کرنیوالا
جوابات دیتے ہیں ان میں ان مضامین کا پرتو بھی
جھلکتا ہے ۔ صباح الدین عبدالرحمن مرحوم ، پروفیسر
(اڈیٹر اوپنیورسٹی) پر بھاکر ماچوے ، ملک
راج آنند اور ایک ماہر اقبال جن کا اسم گرامی
بتانا نہیں چاہتا میرے کیئے سوالات کا اکثر
و بیشتر جواب دینے میں مجبور محض ہو رہے ۔ یہ
حقیقت ہے جس کی تصدیق کی جا سکتی ہے ۔

۳۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد کلیم الدین احمد نے
پوری کتاب اقبال پر لکھ کر کلام اقبال کی
کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ ثابت کیا
اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں
کلیم الدین احمد کی اقبال کی متذکرہ تصنیف دقیع بھی
اور ناقدانہ ژرف نگاہی کی آئینہ دار بھی ۔ اس
کے جواب میں ایک فرزانہ بہار نے پوری کتاب
ہی کلیم الدین احمد کے خلاف لکھ ڈالی ۔ اقبالیے
میں رجال الاقبال بھی کہتا ہوں اس موخر الذکر
سے بہت خوش ہوئے اور لگے بغلیں بجانے
پس منظر میں کلام حیدری صاحب نے جو رویہ اپنایا
آہنگ کی فائلوں کی ورق گردانی و مطالعہ سے
مترشح ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر مصفدر نے کلیم الدین کے
لکھی گئی بکواس کا جواب اپنے مضمون میں دیا اور
"آہنگ" میں شائع ہوا ۔ یہی نہیں کلام حیدری
نے ادارتی نوٹ میں واشگاف طور پر لکھا کہ
صاحب کے خلاف کتاب ادبیات نہیں ہے
طرازی ہے گالم گلوچ ہے ۔ میرا خیال ہے کہ ا
بیباک صحافی ہی مضمون کو اپنے رسالے میں
سکتا ہے اور ادارتی نوٹ بھی دے سکتا
فرزانہ بہار کی جماعت اسلامی سے وابستگی
آہنگ کے مدیر کو خوف زدہ نہیں کر سکتی
کلام حیدری اس حقیقت سے کہ اردو قار
اپنے مخصوص جذبات سے مغلوب رہتے

بخوبی واقف تھے۔ وہ کلیم الدین احمد کے مقام و مرتبہ کے مداح رہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ کو سپرد قلم کرنا بے محل نہ معلوم ہوگا۔ مگدھ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو اور ڈاکٹر حسنین صاحب بھی کلیم صاحب ہی تنقیدی کاوش کو ضرب کلیم سمجھتے ہیں۔ انھوں نے کلیم الدین احمد کے خلاف مسموم انفضا کو مدنظر رکھتے ہوئے کلیم صاحب پر انگریزی میں سیمینار منعقد کرانے کا پروگرام ترتیب دیا اور اس کے افتتاح اور نظامت کا فرائض انجام دینا میرے سپرد کیئے۔ بالفاظ دیگر، ڈاکٹر حسنین صاحب نے کوشش یہی کی تھی کہ سیمینار کا کلیس انگریزی میں انعقاد سے وسیع ہو جائے گا اور اگر اردو سامعین کم تعداد میں بھی شریک ہوئے تو بھی سامعین کی حاضری خاطر خواہ رہے گی۔ میں نے حسنین صاحب کا گرامی نامہ ملتے ہی اپنی رضامندی سے انہیں مطلع کر دیا۔ اور اس موضوع پر کلام حیدری کو بھی ایک خط لکھدیا۔ کلام حیدری نے میری ہمت افزائی کی اور اپنی جانب سے پورا تعاون کا وعدہ بھی کیا۔ سیمینار کے دعوت نامے بھی چھپ گئے مگر وائے ناکامی، حسنین صاحب کو ایسی صورتحال پیدا کر دی گئی کہ موصوف کو سیمینار کو ملتوی کرنا پڑا۔ یہی نہیں ہمارا اردو اکیڈمی کا سہ ماہی پرچہ زبان وادب بھی کلیم الدین احمد خصوصی نمبر نکالنے میں ناکام رہا۔ مدیر زبان و ادب نے مجھے مطلع کیا کہ صرف آپ ہی کا مضمون موصول ہوا ہے۔ زبان وادب ابھی تک کلیم الدین احمد نمبر پیش نہیں کرسکا ہے۔ کلام حیدری صاحب کو دونوں باتوں کا اثر ہوا، وہ ایسے رویہ کو اردو کی بدقسمتی سمجھتے تھے۔ ایسی ذہنیت اردو ادبیات کے فروغ و ارتقا میں نئے سنگ منازل نصب کرنے کیلئے سازگار نہیں ہوتی۔ تنقید کے پیش نظر شاعر یا ادیب کی پیش کش ہوتی ہے۔ ملحوظ رہے، کوئی تنقید حرف آخر نہیں ہوتی۔ ہر تنقید کا بھی تنقیدی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ مثلاً نیاز فتح پوری کی اس رائے کہ اقبال کی شاعری کے محرکات میں اسلام نہ ہو کر اسلامی تاریخ ہے اور وہ بھی عہد وسطیٰ کی میں بھی اتفاق کرتا ہوں۔ نیاز فتح پوری جگر مرادآبادی کی شاعری کو خارش کہا کرتے تھے۔ کلام حیدری کے آہنگ میں میرا مضمون "شعر جگر ..... بھٹی سے چلے تک" شائع ہوا۔ میری رائے میں جگر کی پہلے دور کی شاعری ہوسناکی کی غماز اور دوسرے دور کی یا دہوسناکی کی ہے۔ یہ ایسا مضمون ہے جسکو شائع کرنے کیلئے جگر داری کی بھی ضرورت ہے۔ اور کلام مرحوم ژرف نگاہی کے ساتھ دل و گردے کے حامل صحافی تھے۔ اقبال کی جن خوبیوں کو میری تنقید میں سراہا گیا ہے ان مضمون بعنوان "رجال الاقبال" بھی مشمولات میں دیکھا جاسکتا ہے بلکہ اسکو مورچہ ہفتہ وار میں بھی شائع کیا گیا۔ کلام حیدری صاحب اقبال کے خلاف نہیں تھے مگر وہ تنقید کی اہمیت سمجھنے والے صحافی تھے۔

چونکہ وہ صاحب طرز فکشن نگار تھے، کلام

حیدری کی ترجیحات و ترغیبات میں افسانوی ادبیات مرکزی اہم کا حامل رہا۔ بحیثیت صحافی انھوں نے محسوس کیا کہ فکشن پر ایک سیمینار منعقد کیا جائے۔ اس میدان میں پروفیسر گوپی چند کے کوائف سے بہتر اور کوئی انقیا دیاتی ادیب نہیں معلوم ہوا۔ کلچرل اکیڈمی گیا میں متذکرہ سیمینار منعقد ہوئی۔ جس کا افتتاح کے لیے پروفیسر نارنگ کو ہی مدعو کیا گیا۔ پروفیسر نارنگ نے اپنا کلیدی مقالہ بھی پیش کیا، ایسا مقالہ جو فکشن پر تحقیقی کام کرنیوالوں کو ہمیشہ مرجع رہیگا۔ رسالہ آہنگ کا خصوصی نمبر جسمیں سیمینار کی مکمل روداد شائع ہوئی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، فکشن سر عشق، والہانہ عشق ہی ایسا خصوصی نمبر نکالنے میں محرک ہوا۔ گو آہنگ مرحوم ہو چکا ہے مگر آہنگ کی فائلیں اردو لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

کلام حیدری کی فکشن میں سماجی مناظر مرکز و محور رہتے ہیں اور یہ رجحان اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ ان کو معرض وجود میں لانیوالا شخص، سماجی فلاح و بہبود پر خون جگر بہانے والا فعال کارکن تھا۔ غالبًا اسی خیال کی کارفرمائی نے کلچرل اکیڈمی کے تصور کو بھی پیدا کیا ہوگا۔ آہنگ کے ذریعے ادب کی خدمت اور مورچہ ہفتہ وار سے سماج کی خدمت کرنا کلام حیدری کا مطمح نظر تھا۔ ہفتہ وار خبروں کا جائزہ، رفتار زمانہ، اگر دو پیش کا جائزہ وغیرہ شامل ہوا کرتے تھے مشمولات میں اداریہ بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا تھا مگر چونکہ کلام حیدری مرحوم کی نظریاتی احوال تک رسائی میں کمی کا احساس کھٹکتا تھا۔ معاشرتی و ملکی مسائل پر ان کے تبصرے کبھی کبھی ان کے پیش اصرار و نفسیاتی تحفظات سے متاثر نظر آتے تھے۔ بایں ہمہ یہ ہفتہ وار ایک ضرورت کو ضرور پورا کرتا تھا کہنا چاہیے ہمارے یہاں اس زمانے میں کوئی ہفتہ وار نہ تھا لہذا یہ کمی تھی اور اس کمی کو پر کرنے کی کوشش مرحوم کے پیش نظر رہی ہوگی۔ میں نے برادرم سہیل عظیم آبادی کے سانحہ ارتحال کی خبر مورچہ ہی میں پڑھی تھی، جو میرے لئے المیہ کے برابر تھی۔ دو تین سال بعد، مورچہ نکلنا بند ہو گیا اور کچھ عرصے بعد آہنگ کی اشاعت بھی لڑکھڑا گئی۔ غالبًا، کلام حیدری نے اپنی صحت کے پیش نظر یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے ادارت کے فرائض اپنے کسی عزیز کو تفویض کر دیئے۔ مگر کوئی مشکل ایسی لاحق ہو رہی تھی کہ آہنگ بند ہی ہو گیا۔

کلام حیدری مرحوم، ان کے ترجمان آہنگ و مورچہ اور افکشن میں معیاری کام وغیرہ ایک صورت میں تحلیل ہو گیا اور ادبیات و صحافت میں شامل ہو چکے ہیں۔ وہ اچھے افسانوی شاہکار پیش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ صحافتی خصوصیات کے حامل تھے اور وہ اچھے کوائف کے صحافی تھے کیونکہ وہ افسانوی ادبیات کے خد و خال پر بھرپور نظر ڈال سکتے تھے۔ ہنوز بھارت میں جرائد و رسائل پر مشتمل مخصوص لائبریریوں کی تیاری کا دور شروع نہیں ہوا ہے۔ مگر ہر بڑی لائبریری میں نئے اور پرانے رسائل کی مختلف فائلیں رکھنے کا اہتمام عمل میں آچکا ہے۔ ہر بڑی لائبریری میں آہنگ کی فائلیں دیکھی جا سکتی ہے۔ امید کہ سہیل کیلئے لکھا گیا یہ مضمون آہنگ اور کلام حیدری پر ریسرچ کرنے کی ترغیب ثابت ہوگا۔ خوش و خرسند رہے وہ شعلہ جوا

بے نام گلیوں کا مسافر

ڈاکٹر قمر رئیس

کلام حیدری صرف ایک ادیب یا افسانہ نگار
ہیں تھے جس نے ایک انفعالی انہماک سے اپنی ذات
صرف تخلیقی کام کے لئے سپرد کر دیا ہو۔ زندگی، علم و
ہی، کلچر اور زبان و ادب سے ان کی دلچسپی درجہ بدرجہ،
ائرہ در دائرہ بڑھتی رہی۔ انہیں فکر و عمل کے درمیان
د اور معاشرہ کے درمیان، نظر اور نظریے کے درمیان
ز عقل اور جنوں کے درمیان، ایک ایسے توازن کی تلاش
تی جو ان کے خوابوں کو حقیقت کی تعبیر دے سکے۔ اس
ے زندگی میں انہوں نے کسی طرح اور کسی سطح کے تجربہ سے
ریغ نہیں کیا۔ چائے کے ڈھابے اور سینما گھر کی منیجری سے
الج کی پروفیسری اور صنعت کاری تک انہوں نے روز
رہ زندگی کے نہ جانے کتنے ہفت خواں طے کئے۔ جارحانہ
طن پرستی، انگریز دشمنی سے اشتراکیت دوستی تک وہ
تنے ہی تند خو نظریاتی اور سیاسی دھاروں سے گذرے۔
ید و بند کے سفاک تجربے سے دوچار ہوئے۔ کلکتہ
در بہار کے فسادات میں موج خوں کو سر سے گذرتے
یکھا اور جس المناک تجربے نے زندگی کی آخری سانسوں
ک انہیں آتش زیر پا رکھا وہ شب گزیدہ سحر کے داغ داغ
اجالوں اور اندھیروں کا کربناک احساس تھا۔ ۱۹۹۰ء
کے اپنے اپنے کالم میں لکھتے ہیں:

"میرے جیسے چند جنونی اسے (آزادی کو)
آزادی کا نام دیتے ہوئے کانپ کانپ
جاتے ہیں کہ وہ ایک جھوٹ کو سچ کہنے کا گناہ
نہیں کرنا چاہتے۔ یہ تو تبادلۂ اقتدار
TRANSFAR OF PAWER
تھا پھر اس کے آگے چل کر اس عمل کی، جو
شرطیں تھیں ان کو نہ صرف یہ کہ پورا نہیں
کیا گیا بلکہ ان شرائط کی دھجیاں اڑا دی گئیں"

یہ حق پرستی اور جرأت اظہار ساری زندگی ان کی شخصیت
کا ایک درخشاں پہلو بنا رہا جو ان کی ادبی اور صحافتی تحریروں
میں روشن نظر آتا ہے۔

ترقی پسند تحریک اور اشتراکی نظریہ و فکر سے
وابستگی نے یوں تو انہیں بہت کم دیا لیکن جس شے پر
انہیں ہمیشہ ناز رہا وہ زیر دستوں اور غریبوں کی حمایت
تھی جس نے دردمندی اور انسانی دوستی کے ایک
شگفتہ رشتے سے سدا کے لئے جوڑ دیا اور وہ الّٰہ بے

نام نہم تاریک گلیوں میں داخل ہو گئے۔ جہاں بے نام لوگ رہتے ہیں۔ جہاں مہلک بیماریوں اور وباؤں کے ڈیرے ہیں۔ اوجھڑی شاہ کے مزار ہیں جہاں لوگ لاکھوں مرادیں اپنے دل میں لئے آتے ہیں۔ ان گلیوں کے جھونپڑیوں کے مکین بدلتے رہتے ہیں لیکن وہاں ٹیڑھی بیٹیوں والی کھٹولہ نما چارپائی، چولہا، ٹاٹ، کنستر اور چند چیتھڑے ہمیشہ بنے رہتے ہیں۔ نالیوں کی بساند اور کیچڑ سے مچھروں اور کیڑوں کے بادل اڑ کر آتے ہیں اور ان گلیوں پر چھا جاتے ہیں۔
کلام حیدری آخر میں لکھتے ہیں:

"مگر تم دیکھو یا نہ دیکھو یہ حکم تو رکے گا ان
گلیوں کا کچھ نہ کچھ نام تو رکھنا پڑے گا مگر
کب؟
میں اس جان انتظار کا نام نہیں لوں گا "

اور تقریباً نصف صدی انہوں نے اس جان انتظار کے انتظار میں گذاری جو ان بے نام گلیوں کو کوئی نام دے۔ انہیں کوئی پہچان دے۔ انہیں بھی انسانی وقار، سماجی برابری اور علم و آگہی کی دولت نصیب ہو، انسانی حقوق ترقی اور جمہوری نظام کی برکتیں ان کے ہاتھوں تک بھی پہونچیں۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو جب آزاد اور جمہوری ہندوستان کا پہلا دن طلوع ہوا۔ کلام حیدری جیل کی تاریک کوٹھری میں قید تھے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء تک انہوں نے اپنے اردگرد کی گلیوں میں جن برہنہ سچائیوں کا مشاہدہ کیا انسانی دردمندی کے رشتے نے انہیں جس عذاب میں مبتلا رکھا اور ایک انسان دوست فنکار کی حیثیت سے انہوں نے جو خواب دیکھے اس کی ادھوری کہانیاں ان کے اس پہلے مجموعہ "بے نام گلیاں" کے اوراق میں زندہ ہیں۔

کھلیان، اور سلاخیں پریم چند اور سہیل عظیم آبادی کے حقیقت پسندانہ اسلوب میں لکھی ہوئی ایسی کہانی ہے جو آج کا قاری بھی دلچسپی اور شوق سے پڑھے اس لئے کہ اس میں انسانی رشتوں اور انسانی دکھ سکھ کے نقوش تخلیقی حسن کے ساتھ ابھارے گئے ہیں۔ اس کا مرکزی کردار ایک کسان سرجو کا کردار ہے۔ جو اپنے گاؤں کے لوگوں اور اس کے ماحول کی ساری خوبصورتی سے بندھا ہوا ہے۔ کلام نے حیرتناک مہارت سے اپنے اس اولین افسانہ میں گاؤں کی زندگی کے کھلے اور فطری رشتوں کا نقش ابھارا ہے۔ جب اکال پڑتا ہے تو سرجو بیل بیچ کر برمو کھانوں میں مزدوری تلاش کرنے جاتا ہے۔ وہاں بھی مزدوروں کا ہجوم ہے اور کام نہیں۔ مزدوری گھٹائی جاتی ہے تو مزدور ہڑتال کرتے ہیں پولس کے لاٹھی چارج میں سرجو بھی گرفتار ہو جاتا ہے۔

"اور سرجو حیران اجنبی نظروں سے سلاخوں
کو تکتا رہا۔ جن سے باہر اکال تھا اور اندر"

کلام حیدری صاحب نے جب لکھنا شروع کیا، تو کرشن چندر کی انتہائی مقبولیت کا زمانہ تھا۔ نوجوان ادیب ان کی رومان پرستی اور سیاسی انقلابی فکر دونوں سے متاثر تھے۔ ترقی پسند تحریک بھی ادعائیت کا شکار تھی حیرت ہوتی ہے کہ کلام حیدری اس دور میں اشتراکی نظریات سے متاثر ہونے کے باوجود کرشن چندر کی رومانیت اور انتہا پسندی سے کیونکر محفوظ رہے۔ اس عہد میں انہوں نے مسلم معاشرہ کے بعض اہم سماجی مسائل پر خوبصورت کہانیاں لکھی ہیں۔ آزادی کے بعد تعلیم یافتہ اور آسودہ حال مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ پاکستان ہجرت کر گیا تھا۔ نچلا متوسط طبقہ اپنی روایات کے گہوارہ میں معاشی پسماندگی، غربت

۔حالات نے اس کو ذہنی اور اخلاقی طور پر بھی
۔۔ معذور بنا دیا تھا۔ قیامت ۔ اسی طبقہ کی
۔وہ کہانی ہے ۔ جسے کلام نے متوسط گھرانہ کی ایک
۔کی کی زبانی بیان کیا ہے ۔ اسّی روپے ماہانہ کی تنخواہ
۔فی وقار اور اس کی سفید پوشی کو قائم رکھنا کتنا
۔رہا تھا۔ معنی خیز جزئیات ۔ کے سہارے وہ اس کے
۔اتے ہیں۔ ہر سال ڈربی لاٹری کے ٹکٹ خریدے
۔اس کے لیے دعائیں اور نمازیں ہوتی ہیں لیکن
۔اس کا کوئی رشتہ بھی نہیں آتا ۔ نانی قرب قیامت
۔ے کر نماز کی تاکید کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

اور میں اس خیال سے کہ اس قیامت کو
کچھ دنوں کے لئے روکے رکھا جائے
تین وقت کی نماز شروع کر دیتی۔ اس
لئے کہ دیگر دو وقتوں کی نماز بذات خود
قیامت سے کم نہ تھی ۔ صبح ہی صبح اٹھنا،
۔ف .... اللہ کتنا مزہ آتا ہے صبح کو سونے
میں، اور عشاء کی نماز ـــــ اوخ یہ تو
پڑھتے بیٹھو تو نو ضرور بج جاتے ہیں۔ اور
پھر یکبارگی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے
پیٹ میں آگ لگ گئی ہو،، ص ۵۸

۔زوال کے پاتال میں گرتا جاتا ہے ۔ ماں باپ کے
۔اری لڑکی ایک بڑے گناہ کے بوجھ کے تلے دبی
۔آخر کار ایک مسلمان دوشیزہ پر ترس کھا کر
۔ی صاحب اسے اپنے نکاح میں قبول کرنے پر
جاتے ہیں ۔ اور وہ ایک ایسے شخص کے سر د آغوش
میں جلنے کے لیے ڈال دی گئی جس کے ماتھے اور
سکنیں تھیں سفید داڑھی کے اندر سے جیا لکھے
بھیانک قہقہے تھے۔ اور جو شرعی پاجامہ، لمبا کرتا

اور گول ٹوپی پہنے تھا۔ کیا وحشیانہ ظلم کی یہ روایت
آج بھی مسلم معاشرہ میں جاری نہیں۔

کلام حیدری کا تخلیقی رویّہ اردو افسانہ میں
ایک بیانیہ اسلوب کی بشارت دیتا ہے ۔ بعض دوسرے
حقیقت پسند افسانہ نگاروں کی طرح ان کا اسلوب
سپاٹ نہیں ۔ وہ شگفتہ اور استعاراتی انداز بیان
سے جگہ جگہ کرداروں کی شدت جذبات کا نقش ابھارتے
ہیں ۔ اور افسانہ میں پیکر تراشی سے کام لیتے ہیں۔ یہ
عبارت دیکھئے:

"مگر اللہ کے دربار میں اب بھی دیر
تھی، اندھیر تو خیر ہو ہی نہیں سکتا۔ گھر
میں پھر وہی الجھی الجھی خاموشیوں کے
پرندوں نے اپنے پر پھیلا دیئے۔ پراسرار
سائے لمبے اور گہرے ہو گئے۔ خاموشیوں
کی پرچھائیوں کے اندر جیسے گو یا تی بیٹھی
تھی...... اور پھر آشا کے پالنے کی
ریشمیں ڈوریوں کو نراشا کی قینچی نے کاٹ
دیا اور خاندان دھم سے زمین پر آ گرا" صفحہ ۶۲

ایک دوسری کہانی "روپ بہروپ" بھی اسی
سماجی مسئلہ کی شدت کو سامنے لاتی ہے ۔ ایک مولوی
صاحب غریبی اور کبر سنی کے بھنور میں ہاتھ پاؤں مار رہے
ہیں ۔ ان کی دوسری جوان لڑکی کے لئے کوئی لڑکا نہیں
ملتا۔ مولوی صاحب ایک نوجوان اور لوفر پروفیسر کو
طرح طرح سے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں
لیکن کامیاب نہیں ہوتے ۔ ان کی اقتصادی حالت
دگرگوں ہوتی جاتی ہے ۔ نوجوان پروفیسر ان کا ہمسایہ
ہے وہ لڑکی دربار اسے سر راہ ملتی ہے ۔ اور دعوت نظارہ
دیتی ہے ۔ پھر اسے ایک دن ایک پرزہ ملتا ہے:

" بھیا کی معرفت کچھ روپے ہوں تو عنایت فرما دیجئے۔ یہ قرض بہت جلد ادا کردوں گی آپ کا احسان ہوگا۔۔۔۔ آج ملنے گا آپکی"

مولوی صاحب کی بیٹی یہ قرض بار بار لیتی اور بار بار ادا کرتی ہے لیکن رات کے اندھیروں میں اپنا گھر بلا کر۔ المیہ یہ ہے کہ مولوی صاحب بھی اس راز سے بے خبر نہیں ہیں مسلم معاشرہ میں کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جو اندر ہی اندر اسے دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں، کلام حیدری نے بڑی جرات اور صفائی سے ان مسائل کو بے نقاب کیا ہے۔ ہندو سماج کی ذات برادری کی عصبیت کی طرح مسلم سماج میں شیعہ سنی، بریلوی اور اہل حدیث وغیرہ کی تفرقے اور عصبیتیں مدت سے جگہ بنائے ہوئے ہیں۔ اپنی کہانی " دعا" میں کلام نے اس پر طنز کا بھرپور وار کیا ہے۔

ایک دوسرا مسئلہ ہے ازدواجی زندگی میں شوہر کی حاکمیت بے لگام آزادی کا۔ اگر چند سال تک عورت ماں نہ بنے تو مرد یہ سوچ کر کہ وہ بانجھ ہے دوسری شادی کرلیتا ہے۔ وہ اپنے روایتی تصورات اور جہالت کی وجہ سے اپنا اور بیوی کا طبی معائنہ کرانے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا۔ "بھول" نام کی کہانی میں کلام نے متوسط طبقہ کے مسلمانوں کی ان کمزوریوں اور کج فہمیوں کا مذاق اڑایا ہے۔ آج بھی یہ کہانیاں اپنے تاثر، فنی ساخت اور نفس موضوع کے اعتبار سے معنویت سے خالی نہیں۔

" مثلث" اور بعض دوسری کہانیوں میں کلام حیدری نے نوجوانوں کے مسائل پر بھی ایک روشن اور عقلی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ نوجوان بے روزگار ہیں، پریشان حال ہیں، محرومیوں کے شکار ہیں صلاحیتوں کے باوجود انہیں فلاح اور ترقی کے اور ایک باوقار، باعزت زندگی گذارنے کے راستے مسدود نظر آتے ہیں ان کے اردگرد رشوت ستانی، بدعنوانی اور اقربا

پروری کے عفریت وحشیانہ رقص کرتے ہیں۔ یہ ان کے دلوں میں نفرت، بیزاری، برہمی اور سرکشی جذبات بھر دیتے ہیں لیکن وہ اپنے خوابوں سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ ایک منصفانہ اور فلاحی معاشرہ کے یہی خواب انہیں ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کا دکھ بٹاتے ہیں اور زمین پر امن اور انسانیت کے دشمنوں کے خلاف جدوجہد میں حصہ لینے کا عزم کرتے ہیں۔

"بے نام گلیاں" کلام حیدری کے تخلیقی سفر کی پہلی منزل ہے۔ اس کی تخلیقی زبان، شگفتہ پیرایۂ بیان اور کردار نگاری میں ان کی ذہانت اور خلاقی کی چنگاریاں روشن نظر آتی ہیں۔ بعد میں ان کی توجہ اور سرگرمیوں کا دائرہ وسیع تر ہوگیا اور افسانہ کا فن جس سنجیدگی، انہماک اور کاوشوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ اسے نہیں دے سکے۔ جدیدیت کی رو سے متاثر ہوکر انہوں نے چند تجربے کئے جن سے جدیدیت کے تخلیقی رویوں کی اشاعت میں ممکن ہے کچھ مدد ملی ہو لیکن چند خوبصورت استثنائی کہانیوں سے قطع نظر یہ تجربے ان کے تخلیقی سفر کی کسی منزل کی نشان دہی نہیں کرتے۔ اور نہ ہی ایک تخلیق کار کی حیثیت سے ان کی کوئی ایسی منفرد شناخت بنا سکے ہیں جو ان کے بعض معاصرین کا حصہ بنی۔

" کلام حیدری کے افسانے "الف لام میم" میں افسانہ نگار کی لاشعوری رو اس افسانے کو لکھواتی چلی گئی ہے جو اس نے محسوس کیا یا دیکھا وہ بلا کم و کاست لکھتا چلا گیا، شاید اس میں خود کلامی زیادہ ہے اور افسانہ نگار اپنی کو ٹٹولتا ہوا سا نظر آتا ہے"   طاہر نقوی، پاکستان

اوراق۔ ۱۹۹۰ء جنوری فروری۔

کلام حیدری کے افسانوں میں عورت

• پروفیسر عبد الواسع

صنعتی انقلاب نے جہاں زندگی میں سہولتیں پیدا کیں وہاں اس کو پیچیدہ تر بھی کیا۔ فکری، تہذیبی، جذباتی اور نفسیاتی سطحوں پر انتشار شکست و ریخت کی منزلوں سے گذرا۔ مروجہ اصناف میں بدلتی ہوئی زندگی کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے ناول نگاری اور افسانہ نگاری کی داغ بیل پڑی۔ ان میں بدلتی زندگی کی تصویریں نظر آنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم مدت میں یہ صنفیں مقبول عام ہوئیں اور تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کیں اردو میں افسانہ بہرحال مغرب سے آیا اور مشرقی زندگی کے پیچیدہ تر ہونے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا گیا۔

خوشی کی بات ہے کہ اردو میں افسانہ نگاری کے آغاز سے بہار کے فنکاروں نے اس صنف میں خصوصی دلچسپی لی۔ اس کے گیسوئے تابدار کو تابدار کرنے کا کام دل وجان سے کیا۔ چنانچہ اختر اورینوی، محسن عظیم آبادی، سہیل عظیم آبادی، شین مظفر پوری، اور انور عظیم کے ہاتھوں یہ ارتقائی سفر طے کر کے بالغ نظر ہو گیا۔ کلام حیدری نے افسانہ نگاری کا آغاز اسی پس منظر میں کیا۔ ان کا پہلا مجموعہ "بے نام گلیاں" کے نام سے شائع ہوا۔ ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا اس مجموعے کے افسانوں میں عشق و رومان کا رنگ گہرا ہے۔ بعض افسانے ترقی پسند نظریات کے زیر اثر لکھے گئے ہیں "کھلیان" اور "سلاخیں" سے متعلق رضیہ سجاد ظہیر کا خیال ہے۔

"...... حالات کی کتنی اچھی عکاسی،
کیسی پیاری زبان، عوام کا کتنا گہرا درد، اور
ان کی کیسی صحیح انڈر اسٹینڈنگ۔۔۔
ہماری تحریک اور ہمارے ادب کو ایسے
لکھنے والوں کی بڑی ضرورت ہے"

مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کلام حیدری خوب سے خوب تر کی تلاش میں ترقی پسندی کو اپنی منزل قرار نہیں دیتے تھے۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ بے نام گلیاں کے افسانوں کو ابتدائی کوشش کہتے تھے۔ بلکہ کہانی لکھنے کا ہنر جب آیا تو اس کو خیرآباد کہہ دیا۔ ان کا دوسرا مجموعہ "صفر" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر وہاب اشرفی نے لکھا ہے:

"...... میں اگر یہ کہوں کہ کلام حیدری
EXISTENTIALIST ہیں تو
چونکنے کی ضرورت نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ
انہوں نے کارل بارتھو، پال، ٹلیچ، جبریل
مارسل، کارل لیسپرس کارکو باضابطہ پڑھا ہے

انہیں اپنے افسانوں میں برتا ہے مقصود
یہ ہے کہ ان کو گرفت میں لانے کی کوشش
تشکیک، اجنبیت، قدروں کا انہدام،
داخلیت، اپنی تلاش اور عقلیت کے
خلاف بغاوت کا جو رجحان وجودیوں کے
یہاں حیرت انگیز طور پر کلام حیدری کی افتاد
طبع بھی ہے ۔"

افسانہ رومانی ہو، عشقیہ ہو، ترقی پسند ہو، جدید ہو، ہر حال میں عورت مثلث کے ایک ضلع کے بطور جلوہ فگن ہوتی ہے اور دوسرے اضلاع سے مل کر قسم قسم کے زاویے بناتی ہے کیونکہ نہ صرف یہ کہ اس سے دنیا میں رنگ و لوہے بلکہ زندگی کے کارزار میں برابر کی شریک ہے ۔ لہٰذا کلام حیدری کے افسانے اس کے وجود سے عاری نہیں ہو سکتے ۔ میرے پیش نظر ان کے مندرجہ ذیل افسانے ہیں (۱) بابو (۲) سپنج (۳) کھول (۴) وہ مکان (۵) مجرم (۶) کھایان اور سلاخیں (۷) کس کی کہانی (۸) عنابی کانچ کا ٹکڑا ۔ ان افسانوں کی عورت بے کس مجبور اور محبوب ہے وہ ماں ہے، بہن ہے، بیوی ہے معشوقہ ہے مگر ہر حیثیت میں پس پشت ڈال دی گئی ہے وہ پسماندہ طبقے سے آتی ہے متوسط طبقے سے یا اعلیٰ طبقے سے ہر حال میں پس پشت پڑی ہے ۔ مشرقی انداز و آداب کی پیروکار ہے ۔ اور صبر و شکر کے ساتھ ہر مصیبت کو خاموشی سے جھیلتی ہے نہ کبھی صدائے احتجاج بلند کرتی ہے اور نہ کبھی فرسودہ روایتوں کی گرتی دیواروں کو ٹھوکر مارتی ہے بلکہ تن بہ تقدیر سب برداشت کرتی ہے ۔

" بابو " کی نسوانی کردار محض چند لمحوں کے لئے سامنے آتے ہیں ان کا ہونا اور نہ ہونا سب برابر ہے کیونکہ ان کے بارے میں جو خبر ملتی ہیں تشنہ ہیں اور افسانہ نگار کے قلم کی رہین منت ہیں ۔ فی الواقع پورے افسانے میں ایک عورت سے ملاقات ہوتی ہے ۔ جو تالا فیکٹری میں ملازم لیسین کی نوبیاہتا بیوی ہے لیسین کی بیوی کا ذکر دو مقام پر ہے ایک اس مقام پر جب زخمی لیسن بابو کے کمرے میں ایک اٹیچی رکھنے کو آتا ہے ۔

" ان لوگوں کا کیا ٹھکانہ، پتہ کیا کہیں ڈاکہ
ڈالا ہو، کہیں جھگڑا کر بیٹھا ہو کہیں، میں بس
اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ ایک تالا بنانے
فیکٹری میں کاریگر ہے اور میرے اس بلاک
میں اپنی نئی بیاہتا بیوی کے ساتھ رہتا ہے ۔"

دوسرے اس مقام پر جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے اور کھولی کے دوسرے افراد کو اس کا علم ہوتا ہے ۔

" باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا تو سامنے لیسن
کی کوٹھری کھلی ہوئی تھی وہ اور اس کی بیوی
دونوں کے پر اسرار فرار پر عورت مرد سبھی
باتیں کر رہے تھے ۔"

یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ لیسین کی بیوی سے یہ سرسری ملاقات ہے بلکہ اس کا غائبانہ تذکرہ ہے نہ اس کے خد و خال اجاگر ہیں اور نہ اس کے طور طریقے ۔ کردار نگاری تو دور کی بات ہے ۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ افسانے میں دوسری عورت کا ذکر ہے جو لیسین اور اس کی بیوی کے پر اسرار فرار پر باتیں کرتی ہیں ۔ مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کون ہیں ۔ دوسرا افسانے " سپنج " میں مولا بخش کی بیوی سکینہ کا غائبانہ تعارف ان لفظوں میں کرایا گیا ہے ۔

" میرے ٹیبل کے سامنے ایک لمبا سا ٹیبل
ہے جس پر کئی دوسرے لوگ بیٹھے ہیں ان
میں سے ایک کو میں پہچانتا ہوں جو شطرنجی
ڈیزائن کی لنگی پہنے ہوا ہے اور جس کی گنجی
کے بٹن فیتے سے بند ہونے والی ہے ۔

میں اسے صرف اس وجہ سے پہچانتا ہوں
کہ وہ مجھ سے مہینہ میں ایک بار منی آرڈر
لکھواتا ہے کبھی پچاس کبھی چالیس اور
کبھی سو بھی۔
یہ کہاں رہتا ہے یہ میں نہیں جانتا ہوں
یہ کیا کرتا ہے یہ بھی میں نہیں جانتا یہ منی
آرڈر کہاں بھجواتا ہے صرف یہ میں جانتا
ہوں۔ بی بی سکینہ بمعرفت شرافت حسین
بیڑی دوکان پورنیہ۔
بی بی سکینہ کے بارے میں مجھے اتنا ضرور
معلوم ہے کہ یہ شطرنجی ڈیزائن کی لنگی والے
کی بیوی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا
نام مولا ہے اور منی آرڈر لکھواتے وقت
اپنا نام مولا بخش لکھواتا ہے۔"

بی بی سکینہ عام مشرقی عورتوں کی مانند پردیس گئے ساجن کے انتظار میں زندگی کے شب و روز گزار رہی ہے۔ انتظار مشرقی عورتوں کا مقدر ہے۔ ساجن بچے اور اچھے دن کا انتظار مشرقی لڑکیاں جوان ہوتے ہی شاہزادے کا خواب دیکھتی ہیں۔ اور شہنائی بجنے کے انتظار میں شام کو سحر کرتی ہیں کبھی یہ انتظار اتنا طول کھینچتا ہے کہ حشر میں ملنے کی آرزو لئے دار فانی سے کوچ کر جاتی ہیں بی بی سکینہ کا انتظار بھی طویل ہو گیا اس کا شوہر پردیس میں مر گیا اور اس کو خبر بھی نہیں ہوئی وہ مستقل انتظار میں ساجن کی راہ پر پلکیں بچھائے سانسوں کی تار گن رہی ہے۔

"بکس کی کہانی" واحد متکلم میں ہے اس میں دو نسوانی کردار ہیں ایک واحد متکلم کی اہلیہ اور دوسری اس کی بہن جو شادی کے بعد اس سے بچھڑ گئی ہے۔ اس کا بیٹا اپنے ماموں ماموں سے ملنے آیا ہے۔ بھانجے کو دیکھتے ہی واحد متکلم بھولی بسری یادوں میں گم ہو جاتا ہے۔ ماضی کے دریچے وا ہوتے ہیں اور وہ اپنی باجی کو دیکھتا ہے جو اس سے بے حد پیار کرتی تھی، بچپن کی نت نئی شرارتوں میں شریک راز داں اور غم گسار تھی۔ ایک عرصہ کے بعد جب اس نے اپنے بھانجے کو دیکھا تو اس کی آنکھ، لب، چہرے، بشرے اور جسم کے ہر عضو میں بہن، بہنوئی کی شبیہ نظر آئی وقت کی گرد صاف ہوئی اور بچپن کی ایک ایک بات یاد کر کے وہ جذبات کے دریا میں غوطے کھانے لگا۔

"میں اس نوجوان سے لپٹ کر رو رہا ہوں جو
جاگ گیا ہے اور حیران نظروں سے دیکھ رہا
ہے۔ تم میرے بیٹے ہو، میرے بھانجے ہو،
میری باجی ہو ـــــ میرے دولہا بھائی
ہو، تم ـــ اکیلے تم ـــ اکیلے تم میرے
دولہا بھائی ہو، میری باجی ہو، میرے بیٹے
بھی ہو، میرے بھانجے بھی ـــ تم ماضی
بھی ہو، ـــ تم حال بھی ہو ـــ تم
مستقبل بھی ہو ـــ میں ـــ
میں اب بے ہوش ہو رہا ہوں کیا تم۔"

اس افسانے میں عورت کی تصویر بہت دھندلی ہے، باجی سے متعلق بعض باتیں تو افسانہ نگار کہہ گزرتا ہے مگر اپنی اہلیہ کے بارے میں تو اتنی تفصیل بھی روا نہیں رکھتا۔

"میں ایک نوجوان کو لے کر اپنے ڈرائنگ
روم میں آ گیا ہوں، اور اپنی بیوی کو آواز دی
ہے، بیگم دیکھو کون آیا ہے۔"

"میری بیوی ڈرائنگ روم میں آ گئی ہے اور
وہ نوجوان اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے، پھر دونوں
بیٹھ گئے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے

ہیں مگر ان میں کوئی کسی کو پہچانتا نہیں ہے۔"

"دیکھو ...... یہ تمہاری ...... وہ نوجوان
جملہ پورا کر دیتا ہے، میری بیوی اٹھ کر لوکر
کو کہنے چلی گئی ہے ۔ شاید کھانا لگانے کے
لئے ، کیونکہ اب دو بج رہے ہیں۔"

آپ نے غور کیا اس افسانے میں جن دو عورتوں سے ملاقات ہوتی ہے وہ کس قدر مجہول ہے ۔ ان کے منہ سے ایک جملہ بھی ادا نہیں ہوتا ۔ کھانا پکانے یا پکوانے کے علاوہ ان کی زندگی کا دوسرا کوئی مقصد نہیں ہے ۔ وہ کتنی بے بس ہیں کس قدر مجبور ہیں غور و فکر کرنا تو بڑی بات ہے معمولات زندگی کی ادائیگی میں بھی خاموشی کو اپنا زیور سمجھتی ہیں گویا اشرف المخلوقات کے صنف کثیف کی خدمت گذاری کے لئے پیدا ہوئی ہیں ۔ یہی ان کی عبادت ہے ، یہی ایمان و زندگی بھی ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بابو ، سمی اور کس کی کہانی کی عورتیں مجہول ہیں ۔ ان کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہے ۔ اور نہ اپنے عمل اور کارکردگی کی بنیاد پر کھڑی ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں ، گھر کی چہار دیواری میں محصور ہیں باپ ، بھائی اور شوہر کے ذریعے کھینچی گئی لکچھمن ریکھا کو پھلانگنے کی ہمت نہیں رکھتیں ۔ وفا ، خلوص ، ایثار و قربانی کی دیوی ہیں ۔ دوسرے کرداروں سے مل کر افسانے کی تکمیل کرتی ہیں اور زاویئے بھی بناتی ہیں ۔ گمان گذرتا ہے کہ یہ کردار نہ ہوں تو افسانے کا مثلث مکمل نہ ہوگا ۔ اور زندگی کا لطف جاتا رہے گا ۔ یہ سب بہت خوب ہے مگر معاشرے میں عورتوں کی زبوں حالی برقرار رہتی ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ کلام حیدری روایت پرست ہیں ، ترقی پسندی سے قربت اور جدیدیت سے وابستگی نے بھی ان کی روایت پرستی کو کم نہیں کیا ۔ روایت کے سائے سے باہر آنا سب کو نصیب نہیں ہوتا ۔ کوئی عالی ہمت ہی اس سے بغاوت کرتا ہے اور ذہن کو ۔

"عنابی کانچ کا ٹکڑا" کے نسوانی کردار میں پرائیوٹ سکریٹری ، اسیلز مین سے الجھتی جوان خوبصورت اور طرار لڑکی ، سوشیل کے سامنے والے مکان میں رہنے والی اٹھا سالہ لڑکی جس کی کھڑکی میں عنابی شیشے لگے تھے اور جس کو فسادکی عفریت نے نگل لیا ۔

"اٹھارہ سالہ لڑکی نہ زندہ تھی نہ مردہ ،
وہ کہاں گئی ؟ وہ کہیں تو ہے اور اس
لڑکی کا گھر سونا پڑا ہے اس نے برسوں خواب
میں جاگتے ہوئے اس مکان میں شہنائیوں
کی آوازیں سنی ہوں گی ۔ ڈھولک پر دس بھرے
گیتوں کی موسیقی اس کے کانوں میں گونجتی
رہی ہو گی ، خوابوں میں اس نے اپنے ہیرو
کو دیکھا ہوگا ۔ اپنا ڈولا اٹھتے ہوئے دیکھا
ہوگا اور آنگن میں لگے ہوئے مہندی کے
پیڑ سے اس نے ملتے کیا ہوگا کہ رنگ سرخ
آنا چاہئے ۔"

ایک کنواری لڑکی کے کنوارے پن ان میں بکھرے پڑے ہیں ، ہیرو کا انتظار ، شہنائی بجنے اور ڈھولک کی آواز سب معصوم سپنے ہیں جو ہر مشرقی لڑکی اپنے پلکوں پر سجاتی ہے مگر سب خاک میں مل گئے اور فرقہ وارانہ فساد کی آگ میں جل کر خاکستر ہو گئے ۔ دوسرے کردار میں سوشیل کی مار بہن ، قادر بیگ ریٹائرڈ کمشنر کی صاحبزادی ، انکم ٹیکس کمشنر کی صاحبزادی اور ڈپٹی چیف انجینئر کی پانچ صاحبزادیاں سب کی سب اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہیں ۔ صرف سوشیل کی والدہ ، ممتا کے آنچل میں ڈھیروں پیار لئے کھڑی ہے جبکہ سوشیل کی بہن کی خبر ان کے خط سے ملتی

کمشنر زادے انجینیر کی صاحبزادیاں اعلیٰ سوسائٹی سے آتی
ہیں مگر وہ عمل سے محروم ہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ کمشنر
اور انجینیر کی صاحبزادیاں شہر میں ہوئے فساد سے قطعی لاتعلق
ہیں یہ لڑکیاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے تبادلے پر ہونے والی پارٹی
میں شرکت کی غرض سے انٹرنیشنل کلب میں اپنے ڈیڈی
اور پاپا کے ساتھ آئی ہوئی ہیں۔ ان کی گفتگو اور حرکات
وسکنات سے اندازہ نہیں ہوتا کہ شہر میں بھیانک فساد ہوا
ہے اور لاتعداد لڑکیاں اغوا کی گئی ہیں۔ اس کے برعکس
یہ لڑکیاں مردوں کی مرکز نگاہ ہونے کے لئے ہر طرح سے سج
دھج کر آئی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں پارٹی،
گلیمر اور عشق کے علاوہ کوئی دوسری چیز اہم نہیں ہے ان کی
گفتگو اور حرکات وسکنات سے ظاہر ہوتا ہے کہ:

• "ڈوڈانیا نے جلدی سے ایک کرسی کھینچی،
اور چاہا کہ انکم ٹیکس کمشنر کی یہ نازک سی
اٹھلائی ہوئی صاحبزادی اس پر بیٹھ جائیں
مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی فیصلہ کرتیں ___
نوجوان آئی اے ایس مسٹر شرن نے انہیں
اُچک لیا اور مس کوڑان کے ہاتھوں میں
ہاتھ ڈال کر کلب کے اس کنج کی جانب چل دیں
جہاں شاید اتفاق سے یا انتظاماً دو
فولڈنگ اسٹیل کی کرسیاں رکھی ہوئی
تھیں ___،،

سوال یہ ہے کہ لڑکیاں اس قدر بے حس کیوں ہیں۔
یا معاشرے سے یہ کٹ گئی ہیں اس کا سبب میری سمجھ میں یہ
ہے کہ کلام حیدری اس تضاد اعلیٰ سوسائٹی کے بے حسی کو نمایاں
کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ایسی بے حسی غیر فطری ہے اور مجرمانہ بھی۔
شہر تو بہت دنوں تک اس کو برداشت نہیں کرے گا۔
شہر سے کٹ کر جینا بہت مشکل ہے

کمیونسٹ تحریک میں شامل ہے معاشرے سے
سمجھوتہ نہیں کرتی بلکہ اس کو بدلنے کی آرزومند ہے اور اس
کے لئے جدوجہد بھی کرتی ہے۔ مگر ایک روز گرفتار ہو جاتی ہے۔

"یہ نہیں ہو سکتا ___ یہ نہیں ہو سکتا
سیتا گھوس کو چھوڑنا پڑے گا۔ میرے پاؤں
اس مکان پر جاکر جیسے زمین میں گڑ گئے ___
جس کے دروازے پر بڑا سا تالا پڑا ہوا تھا،،

"وہ مکان" میں سیتا گھوس کا کردار فعال ہے مگر اتنے کم وقت
کے لئے نظروں میں آتا ہے کہ اس کے نامکمل ہونے پر یقین
ہوتا ہے علاوہ ازیں اس سے متعلق جو خبریں قاری کو دی جاتی
ہیں واحد متکلم کی زبان سے دی جاتی ہیں جو مرد ہے۔ اس طور
پر کہا جا سکتا ہے کہ سیتا گھوش پس پشت ڈال دی گئی
ہے اور جہاد زندگانی میں اپنا رول ادا نہیں کرتی۔

"کھلیان اور سلاخیں" میں دو عورتوں سے ملاقات
ہوتی ہے۔ ایک سرجو کی بہن چھٹکی اور دوسری اس کی
اہلیہ۔ سرجو کی بہن چھٹکی کو اس کے شوہر نے نافرمانی کے
جرم میں ماخوذ کرکے گھر سے نکال دیا ہے۔ اس کا جرم یہ ہے
کہ وہ اپنے شوہر کی حکم عدولی کرتی ہے اور زمیندار کے گھر
دودھ پہونچانے نہیں جاتی کیونکہ اس کو اندازہ ہے کہ زمیندار
کی نظر بری ہے چنانچہ بھائی کے ساتھ اس کے گھر آجاتی ہے
اور بھابھی کی لعن طعن سنتی ہے اور روتی ہے یہ کردار
پس ماندہ طبقے سے آتے ہیں۔ اس کہانی کی تعریف میں
رضیہ سجاد ظہیر نے جو لکھا ہے۔

تعجب ہے کہ رضیہ سجاد ظہیر نے کہانی کے مقصد
کو لے کر اس کی بڑی تعریف کی، مگر عورتوں پر ہونے والے
ظلم کے خلاف ایک لفظ نہیں لکھا۔ "کھلیان اور سلاخیں"
کے نسوانی کرداروں پر حسب عادت کلام حیدری نے توجہ
نہیں دی۔ غریبوں اور مزدوروں پر ہونے والے ظلم کو

نمایاں کرنے کے لئے انہوں نے سرجو کی کردار نگاری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا مگر چھٹکی کی کردار نگاری میں کوئی توجہ نہیں برتی۔ چھٹکی کو اس کے شوہر نے بے قصور گھر سے نکالا۔

" اسے نکالنے کی کوئی خاص توجہ بھی تو نہیں
بس یہی ناکہ یہ دو دھوبے کر بھاگ آئے زمین دار
کے یہاں جانا نہیں چاہتی، اسی زمین دار
کے یہاں جس کے تم برا ہل ہو ــــ مگر چھٹکی
نے تو یہ کہا تھا۔ زمین دار اچھا آدمی نہیں ہے۔"

پھر بھی چھٹکی کو شوہر کا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ وہ صرف روتی ہے اور خوشی خوشی ظلم برداشت کرتی ہے۔ وہ تو یہ کہنے کی ہمت نہیں جٹا تی کہ زمین دار کی نظر بری ہے۔ اس کے اس انکار نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔ اور وہ تن بر تقدیر بھائی کے گھر میں پناہ گزیں ہو کر اپنی جوانی مٹی ہوتے دیکھتی ہے۔

اسی طرح "بھول" کی سلطانہ بے قصور دار پر چڑھائی جاتی ہے۔ اس کی شادی شمس سے ہوئی جو خوشحال گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ شادی کو تین سال ہوئے مگر وہ اولاد سے محروم رہا۔ والدین کے دباؤ میں آکر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کا ایک ڈاکٹر دوست دوسری شادی نہ کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ طرح طرح سے سمجھاتا ہے کہ صرف عورتیں بانجھ نہیں ہوتیں، بعض مرد بھی بانجھ ہوتے ہیں۔ یہاں تک یہ افسانہ سلطانہ کے حق میں ہے اور معاشرے میں پھیلے اس توہم کو دور کرنے میں کامیاب ہے کہ ماں بننے کی ذمہ داری صرف عورت کی نہیں، مرد کی بھی ہے۔ بہت سی عورتیں ماں بننے کی اہلیت رکھتی ہیں مگر مرد باپ بننے کی صلاحیت سے محروم رہتے ہیں۔ افسانے کا کلائمکس میرے نزدیک سلطانہ کے خلاف ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے سلطانہ ماں بننے کی اہلیت رکھتی ہے قبل از شادی اس کے دامن کو داغدار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جبکہ وہ شادی شدہ ہے۔ یہ تو عذر گناہ بدتر از گناہ ہے لطف کی بات یہ ہے کہ ساری باتیں اور سارے فیصلے سلطانہ کی عدم موجودگی میں لئے جا رہے ہیں۔

" سنو میں سلطانہ کو اور اس کے گھر
کو ایک عرصے سے جانتا ہوں اور اس گھر
کی تمام باتوں سے باخبر ہوں۔ جیسے گھر
والے۔ میں ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے گھر کا
بھیدی ہوں۔ میں جانے کیوں تمہارے
سامنے اس راز کو رکھ رہا ہوں شاید اس
لئے کہ میں سلطانہ کو مغموم نہیں دیکھ سکتا
وہ بہت اچھی لڑکی ہے بہت معصوم بہت
بھولی اور جب اس کے بھولپن سے چوک ہوگئی
تو وہ تم سے شادی ہونے کے قبل ماں بن گئی
ــــ سنا تم نے۔"

سوال یہ ہے کہ سلطانہ کو جس جرم میں ماخوذ کیا جا رہا ہے اس جرم سے بری الذمہ کرنے کے لئے اس کے دامن کو داغ کیوں کیا گیا۔ اس کے شوہر شمس کا ڈاکٹری معائنہ کیوں نہیں کرایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مقام پر کلام حیدری سے چوک ہوئی۔ توہم پرستی کے خلاف لکھتے لکھتے عورت کے دامن کو انہوں نے داغدار کیا ہے جبکہ اس کے بغیر بھی وہی تاثر قائم کیا جا سکتا تھا۔ جو وہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ کلام حیدری نے افسانوں میں عورت کی تصویر ٹیڑھی ترچھی بنائی ہے۔ اس کو صحیح خدوخال نہیں بخشا ہے۔

کلام حیدری کے افسانوں میں "مجرم" قدرے مختلف ہے اس کی ہیروئن زبیدہ ہے بعد میں اپنی زبیدہ بائی اپنی کارکر کے باوصف زندہ رہنے والی عورت ہے۔ اس کی شخصیت دوسرے افسانوں کی عورتوں سے نمایاں ہے۔ وہ عورت کو مرد کی ہوسناکی کا ذریعہ نہیں سمجھتی بلکہ ایک آزاد خود

دیتی ہے، اپنی مرضی سے طوائف ہونا قبول کرتی ہے مگر خان بہادر کی ہوسناکی کا شکار نہیں ہوتی۔ خان بہادر کی دلوڑی سے راتوں رات بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوتی ہے اور چکلے پر جا بیٹھتی ہے، بہت مشہور طوائف بنتی ہے، اس کی شہرت سن کر خان بہادر اپنی دیرینہ ہوس کی تکمیل کے لئے اس کے کوٹھے تک جا پہونچتے ہیں۔ زبیدن انہیں کی پستول سے ان کا خون کر دیتی ہے۔ اپنے بوڑھے شوہر کی جس سے زبردستی اس کا نکاح کیا گیا تھا ہر ماہ بیس روپے بھیجتی ہے تاکہ جس لالچ میں اس نے زبیدن سے نکاح کیا تھا وہ ملتا رہے زبیدن نہ صرف یکایک مکمل عورت ہے بلکہ عورت ذات کی ناموس کی علمبردار بھی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جب تک خان بہادر جیسے لوگ زندہ ہیں زبیدن کی عزت نیلام ہوتی رہے گی۔ بھری عدالت میں صاف صاف کہتی ہے۔

> "خان بہادر کو میں اس لئے مارا کہ میں نے اسے ضروری سمجھا۔ میں نے اپنی کھوئی عزت کا بدلہ نہیں لیا۔ بلکہ میں نے ان کی کوٹھی میں رہنے والی ان بچیوں کی عزت بھی بچائی ہے، جو جوان ہوکر خان بہادر کے بوڑھے نوکروں سے بیاہ دی جاتی ہیں تاکہ وہ بڑے اطمینان سے ان کا مصرف لے سکیں اور جو اس کے لئے تیار نہ ہوں وہ یا تو زبیدہ بائی بن جائیں یا حمیدہ کی طرح خودکشی کرلیں"

زبیدن کو عورت کی عزت کا اتنا پاس ہے کہ خان بہادر کے خون کے جرم میں پھانسی لگنے کا ذرا بھی ڈر نہیں کرتی۔ بلکہ عدالت سے مطالبہ کرتی ہے۔

عورت کو اگر آپ "شے" قرار نہیں دیتے اور ایک فرد کی حیثیت میں قبول کرتے ہیں تو تسلیم کرنا ہوگا کہ کلام حیدری کے افسانوں میں اس کی تصویر کشی صحیح نہیں ہے کلام حیدری پر ہی کیا موقوف ہے اکثر افسانہ نگاروں کا یہی حال ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ فنکار کا ماحول سے پروردہ ہوتا ہے اور گرد سے مواد اکٹھا کر کے فن کی بھٹی میں گلاتا ہے تب فن کے نمونے وجود میں آتے ہیں، ہمارا جو ماحول ہے اس میں عورت ایک آزاد اکائی کی حیثیت میں قبول نہیں کی جاتی۔ مگر بہت دنوں تک یہ صورت حال باقی نہیں رہے گی اس لئے افسانے ہو یا ناول عورت کی تصویر کشی صحیح تناظر میں کرنی چاہئے۔ وہ پس پشت نہ ڈالی جائے بلکہ مکمل عورت ہو جو خود فیصلے کرے اور خود نتائج کی ذمہ دار ہو۔ ورنہ بہت سی تسلیمہ نسرین عورتوں کے حق میں مردوں کے خلاف کمانیں اٹھائیں گی۔

مبصر کلام حیدری

ظفر ؔ

بعض تخلیقیں کئی چہروں کی مالک ہوتی ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہر چہرہ مکمل اور نک سک سے درست بھی ہوتا ہے ان کی اس ہمہ جہتی سے جہاں بیشتر احباب نظر خوش ہوتے ہیں وہیں کچھ لوگ ان کی خلاقیت پر بھنویں بھی چڑھاتے ہیں۔ عموماً یہ معاصرانہ چشمک کا نتیجہ ہوتا ہے جیسے مولانا الطاف حسین حالی کی معرکۃ الارا کتاب "حیات جاوید" پر حضرت شبلی نے مدلل مداحی کا ریمارک فرما کر حالی اور سر سید کے بارے میں اپنی ذہنیت کا ثبوت دیا تھا اس سے حالی کا کچھ بگڑا اور نہ سر سید کا ـــــ حضرت شبلی کی کتاب سر سید کی مولانا محمود شیرانی نے دھجیاں اڑا دیں وہ تو اکابرین ادب نے بیچ بچاؤ کرا کر وا دیا ورنہ "شعر العجم" کی رہی سہی وقعت بھی خاک میں مل جاتی۔

تبصرے کتاب اور مصنف کا صرف تعارف ہی ہوں تو اشتہار بن کے رہ جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اشتہاری تبصروں کی بھی کمی نہیں مگر بے لاگ تبصرے کرنے والے بھلے ہی کم سہی ان کے پڑھنے والے بہت ہیں۔ نیاز فتح پوری، ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور شمس الرحمن فاروقی جیسے مبصرین نے اردو ادب میں تبصرے کے فن کو نکھارنے سنوارنے میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔ (ان لوگوں نے مختلف کتابوں پر جو پیش لفظ لکھے ہیں وہ ظاہر ہے تبصرے کی روایت سے الگ ہیں)

ہم جیسے کلام حیدری کو بہت ممکن ہے ارباب دانش ایک اچھے افسانہ نگار، ایک بے لاگ صحافی اور ایک ذہین مدیر کی حیثیت سے جانتے اور پسند کرتے ہوں۔ مگر الف لام میم سے وسواس الخناس تک کے اس سفر میں کلام حیدری کی مبصرانہ بصیرت نے چونکایا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں میرا پہلا شعری مجموعہ "اقرا" شائع ہوا تھا۔ "پھر آہنگ" مئی جولائی ۱۹۸۰ء کے شمارے میں تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید اختر کے لکھے ہوئے پیش لفظ کے بعض جملوں پر حرف گیری کی تھی۔ ڈاکٹر وحید اختر نے لکھا تھا:

> ظفر کی احتیاط پسندی اور تخلیقی صلاحیت نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں اس بھیڑ چال سے گریز کر کے ان کے اصناف کو طرح دار رکھا ہے اور انھیں بیجا تجربے کی زد نہ دی ہے ـــــ اس پر کلام حیدری نے لکھا کہ

"میری خواہش رہی ہے کہ رائے حاصل کرنے کی
اس بھیڑ چال سے بھی گریز کرنا چاہیئے مگر ہوتا یہ
ہے کہ دانش گاہوں کے جلیل القدر مرتبوں پر فائز
اساتذہ کرام کو یوں بے مصرف چھوڑا نہیں جاتا۔"

"زبان و بیان پر ریاض اور شعر سے والہانہ شیفتگی کے عناصر
پر گرفت کرتے ہوئے کلام حیدری نے میری پہلی غزل کے مطلع

ابھی نگاہ کو پیغمبرانہ ہونا ہے
سے
کہ فلسفوں کو ابھی عامیانہ ہونا ہے

پر تنقید کی کہ لفظ "عامیانہ" ریاض زبان و بیان کا ثبوت
مہیا کرتا ہے کہ نفی کرتا ہے؟"

میں نے اس مطلع میں یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ جب نگاہ پیغمبرانہ
ہو جائے تو تمام ازم اور فلسفے گھٹیا عامیانہ لگنے لگتے ہیں۔
مگر شاید کلام حیدری نے اسے عمومیت کے معنی میں لیا تھا اور
میری عجز بیانی پر گرفت کی تھی ۔۔ یا پھر کلام حیدری نے پیغمبرانہ
اور عامیانہ کو مطلع میں بطور قافیہ استعمال کرنے پر اعتراض
کیا تھا۔ انہوں نے "ایطا" پر گرفت کر کے اپنی زبان
دانی اور شعری نزاکتوں سے واقفیت کا ثبوت دیا تھا
پھر بھی میں چونک اٹھا تھا کہ ایک افسانہ نگار ہوتے
ہوئے کلام حیدری شعر کے محاسن و معائب سے اس قدر
واقف ہیں کہ اس ایطا پر گرفت کی جس پر عام شعراء کی
نظر نہیں جاتی ۔ دراصل بے جا پابندیوں کا کبھی میں قائل نہیں
رہا پھر بھی زبان و بیان کا پورا پورا خیال رکھنے کی کوشش
کرتا رہا ہوں مگر اتنی بادیہ کا روادار نہیں کہ شعر کا اصل خیال
محض زبان کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائی جائے۔ کبھی کبھی
حق شاعرانہ POETIC LICENCE سے کام بھی لیتا

ہوں۔ کلام حیدری نے میری غزلوں سے زیادہ
کو بہت پسند فرمایا تھا اور مجھے نظم کا شاعر
بہر حال کلام حیدری کے تبصروں کی
ان کے قلم کا گرویدہ بنا لیا۔ مجھے یہ میدان
پسند ہے کہ میں نے خود بے شمار کتابوں
لکھے۔ اکثر رسائل میں دیگر تخلیقات سے
پڑھ لیا کرتا ہوں۔ کچی عمر میں میں جب نگار
نکلوا کر پڑھا کرتا تھا تو مہربان (لائبریرین
نگار کے مذہبیات اور انتقادیات کے حصے
منع کرتے تھے اور مزے کی بات یہ کہ میں
شوق سے پڑھتا تھا۔

کلام حیدری کے تبصروں میں کڑوی
مزہ دیتی ہیں۔ قلم بھی تلوار کی طرح کسی مرد
اچھا لگتا ہے ۔۔

کلام حیدری پکے ناقدین اور کچے
تھے۔ انھوں نے اس SOCALLED
طبقے کی بڑی کھنچائی بھی کی ۔ ڈاکٹر علی احمد فا
"تاریخی ناول" فن اور اصول" پر آہنگ
کرتے ہوئے کلام حیدری فرماتے ہیں کہ
پر لکھنا ہی دراصل قلم کا جوہر دکھانا ہے
مضامین کے مجموعوں نے بہت ریڈر اور
اور انھوں نے یونیورسٹی لائبریریوں میں
مقالوں کو اس لیئے دفن کر دیا کہ ان کے
سے بہت سے ادبی جرائم کا پتہ چل جا
(آہنگ —

لہجے کی یہ کاٹ کلام حیدری کی خود اعتمادی کی غماز ہے۔ بعض دفعہ تو بڑی دلچسپ صورتحال بھی سامنے آتی ہے جیسے گیا کی ایک جانی پہچانی شخصیت نے ڈاکٹر ابو محمد سحر کی تحقیق من و عن اپنے نام سے داخل کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے لی تھی جسے بعد میں یونیورسٹی نے ان سے واپس لے لی۔ اس قسم کے ادبی جرائم کے مرتکب مع تحقیق پر دہ گمنامی میں ہی رہ جائیں تو بہتر ہے۔

کلام حیدری تساہل پسند مقالہ نگاروں پر چوٹ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

اردو میں خدا کے فضل سے جہاں پروفیسر و کی قوم میں قابل، مستند، ذہین ادبی محققین اور نقاد ہیں وہاں چند ایسے مقالہ ساز بھی موجود ہیں جو زندگی بھر میں کسی ایک شاعر پر بھی کوئی بزور مقر اکش لکھ لیں تو سمینار کسی شاعر کے متعلق ہو وہ (اسی) مضمون (کے ذریعہ) محض شاعر کا نام بدل کر اور کچھ نمونۂ کلام دے کر کئی سمینار سنبھال لیتے ہیں!۔۔۔۔۔۔۔'' (آہنگ دسمبر ۸۱ء)

ڈاکٹر فاطمی کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کلام حیدری نے اپنی تاریخی بصیرت کا ثبوت بھی دیا۔

"HISTORY IS A FICTION AGREED UPON"

اور بیرفیلڈ کے قول "تاریخ آدھی کہی، آدھی سنی، آدھی پڑھی، آدھی حقیقت اور آدھی جھوٹ پر مبنی ہوتی ہے" کے حوالے سے فاطمی کی محنتوں کو سراہا بھی ہے۔

کلام حیدری کے تبصروں کی خوبی یہ ہے کہ وہ مختلف موضوعات کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ہر موضوع سے اپنی اچھی خاصی واقفیت کا اظہار کرتے تھے۔ شعری مجموعوں پر کرتے تو یوں لگتا گویا شاعری کے ناگزیر مراحل سے وہ خود گزر چکے ہیں۔ افسانہ کے میدان کے وہ مرد تو تھے ہی۔ تاریخ پر بھی گہری نظر تھی بیالوجیکل سائنس سے بھی وہ اتنا ہی واقف تھے جتنا میر و غالب، کرشن چندر بیدی وغیرہ سے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "تخلیقی عمل" پر ملا تبصرہ کیا۔ وزیر آغا نے عدیم الفرصت احباب کی خاطر اسکی تلخیص بھی دے رکھی تھی اس کیپسول CAPSUL سے کلام حیدری کی تشفی نہیں ہوئی انھوں نے بالاستیعاب اس کتاب کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہونچے کہ :-

وزیر آغا نے ذہنی یکسوئی، کھلی آنکھ اور قوت ہاضمہ کے ساتھ یہ کتاب لکھی ''

کلام حیدری نے ہر چند کہ انکسار سے کام لیتے ہوئے یہ کہا کہ وہ بیالوجی سے ناواقف ہیں اور اپ ٹو ڈیٹ UPTODATE تحقیقات کا انھیں علم نہیں لیکن اس کے باوجود ناقابل تردید بنیادی مباحث کے حوالے سے انسانی ذہن کی نفسیاتی اور حیاتیاتی دائرہ در دائرہ پھیلتی سچائیوں کا احاطہ بھی کیا۔ ارتقاء کی کہانی بس مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ :-

"۔۔۔ حیات جست کرتی ہے اور اپنے دائرے سے

سے نکل جاتی ہے اور پھر اپنے گرد دائرہ دیکھتی ہے
وہ پھر جست کرتی ہے اور آزاد ہو جاتی ہے
مگر اس سے بھی بڑے دائرے میں خود کو زندانی
پاتی ہے اور یہ سلسلہ شاید ازل سے ابد تک
چلتا رہے گا۔"

"تخلیقی عمل" پر تبصرے کے دوران کلام حیدری کے کثیر المطالعہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ حیاتیات، معدنیات، نباتات، جمادات کے علم کے ساتھ ساتھ وہ نفسیات، فلسفہ و منطق، تصوف، سیاسیات و سماجیات وغیرہ وغیرہ کی موشگافیوں پر بھی اشارے کر جاتے تھے۔

معاشرہ کیا ہے ایک بے نام شئ ہے، اصل فرد ہے جو معاشرے کی تخریب و تعمیر کا کھیل کھیلتا رہتا ہے۔ یہی زندگی ہے۔ وزیر آغا خود بڑے WELL VERSED فن کار کا نام ہے ان کی کتاب تبصرے کے لیئے کم سے کم ان کی سطح تک تو مبصر کو آنا پڑتا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ کلام نے وہ حق ادا کیا ہے۔ جس طرح وزیر آغا کی یہ کتاب ان کے عالم و فاضل ہونے کے علاوہ ایک تخلیق کار ہونے کا ثبوت بھی بہم پہونچاتی ہے اور صرف علم و فضل کے سہارے ایسی کتاب لکھی نہیں جاسکتی تھی اسی طرح اس کتاب پر تبصرہ کرنے کی جسارت بھی وہی کر سکتا تھا جسے مختلف علوم فنون کسی نہ کسی سطح پر مس ضروری ہو۔

کلام حیدری کا بے لاگ اور بے باک لہجہ

آگے پیچھے نہیں دیکھتا۔

چندر بھان خیالؔ کے مجموعے "شعلوں کا شجر" کے بارے میں فرمایا کہ اس شعری مجموعہ کو غور سے پڑھنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں پیدا ہو سکا۔ (آہنگ مئی ۱۹۷۹ء)۔

علیم اللہ حالیؔ نے اپنے مجموعے "سفر جلتے دلوں کا" میں لکھا تھا کہ:—

" دراصل شاعری کو سمجھنے کیلئے نیم مجنونانہ، نیم وحشیانہ بلکہ کسی حد تک احمقانہ کیفیت کا ہونا ضروری ہے۔

اس پر کلام حیدری نے بڑا دلچسپ تبصرہ یہ کیا:—

" میری بدقسمتی ہے کہ، ان تینوں کیفیات میں سے مجھے کوئی ایک بھی میسّر نہیں" (آہنگ مئی ۱۹۷۹ء)

ستمبر ۱۹۷۹ء کے شمارے میں جناب مظہر امام کے خاص معتقد ڈاکٹر مناظر عاشق کا ایک مراسلہ بھی آہنگ میں چھپا کہ علیم اللہ حالیؔ کے مجموعہ کا نام "سفر جلتے دلوں کا" نہ صرف جناب مظہر امام کے مجموعے "اکھڑے خیموں کا درد" کی نقالی میں رکھا گیا ہے بلکہ مزید یہ کہ علیم اللہ حالیؔ کی ایک نظم "آخری الزام" بھی مظہر امام کی نظم اکھڑے خیموں کا درد" کی نقالی ہے۔

مناظر عاشق پوچھتے ہیں:—

" حد تو یہ ہے کہ دونوں (کی) نظمیں
کی بحر بھی ایک ہے۔ اس دھاندلی کو
سرقہ کہیں گے یا توارد؟"

اللہ ہر امام کو ایسا معتقد ہی نصیب فرمائے۔ جو امام

کے پیچھے آمین بالجہر کا قائل ہو اور ایمان بالغیب بھی لائے امام کی طرح داڑھی بھی کوئی رکھ لے تو اس سے خفا ہو جائے۔

عرش صدیقی کے افسانوں کے مجموعے "باہر کفن سے پاؤں" پر تبصرہ کرتے ہوئے کلام حیدری نے افسانہ نگاروں کیلئے ایک لمحہ فکر بھی دیا:۔

"جیسے ہم آج (رتن ناتھ) سرشار بننے کی خواہش نہیں رکھتے ویسے ہی نیا لکھنے والا انتظار حسین بننا نہیں چاہتا اور اسے بننے کی کوشش کرنی بھی نہیں چاہیئے۔

آہنگ۔ جولائی اگست ۱۹۷۹ء

کمار پاشی نے اپنے رسالہ ماہنامہ "سطور" کا محمد علوی نمبر جون اگست ۱۹۷۸ء میں نکالا تھا اور لکھا کہ نمبر نکالنے کا مقصد "ادبی بُت بنانا نہیں ہے" اس پر کلام حیدری نے تبصرہ کیا کہ "پوجا کے لائق ہو تو ادبی بت بنانا ایسا بُرا کام یا ادبی کفر نہیں ہے" مگر اس کے بعد کلام حیدری نے جو بت شکنی کی ہے تو اسکی زد میں خود آنند (کمار پاشی) بھی آگیا اور پھر آخرکار تھوڑا اسی بت کے ہاتھ میں تھما دیا اور جب پجاریوں نے پوچھا کہ یہ کس کی حرکت ہے تو کہا "اسی بت سے پوچھ لو" اور بُت تو بے چارہ بے زبان ٹھہرا —— کیا جواب دیتا۔

جن آزروں نے پتھر میں اس بت کے خد و خال ابھارے ان میں مجتبیٰ حسین، زبیر رضوی اور مخمور سعیدی تھے (جنھوں نے اس نمبر میں علوی پر خاکے لکھے تھے) کلام حیدری نے ایک ایک سنگ تراش کی خبر لی۔ مثلاً مجتبیٰ حسین نے اپنی اور محمد علوی کی ہم مشربی کا ذکر کچھ یوں فرمایا تھا۔

"ہم (مجتبیٰ حسین) نے بھی جب ادب سے دلچسپی لینی شروع کی تو (علوی کی طرح کی طرح) احمد ندیم قاسمی اور شفیق الرحمن کا دامن ہی پکڑا (پتہ نہیں اگلا دامن کہ پچھلا!)

بریکیٹ پاکر کلام حیدری نے زبردست چٹکی لی تھی۔ محمد علوی نے ایک جگہ شاعری کو ذلیلوں کا پیشہ کہا ہے (اس کے باوجود وہ خود کو یہ مس کرتے ہیں خیر)۔ وارث علوی نے اپنے چچازاد محمد علوی پر حسب روایت قدیم ایک طویل مضمون لکھا جو تیرہ صفحات پر مشتمل ہونے کے باوجود ان کے امریکہ جانے کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا۔

محمد علوی پر مغنی تبسم کے طویل بے رس مضمون کے بارے میں کلام حیدری نے بڑا پُر مغز ریمارک کیا ہے کہ "مغنی تبسم نے محمد علوی کی شاعری کا مطالعہ پیش کیا ہے تو لگتا ہے کہ یہ محض مطالعہ ہے قاری سے کوئی مطالبہ نہیں ہے —— بلکہ یہ محمد علوی کے مطالعہ کے لئے سہولتیں بہم پہونچانے کی کوشش ہے۔"

محمد علوی کے بارے میں مظہر امام کے مضمون کے تعلق سے کلام حیدری فرماتے ہیں کہ "مجھے مظہر امام سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح کے غیر ذمہ دارانہ جملے بھی لکھ سکتے ہیں (دیکھئے) خالی مکان ہندوستان میں اردو کی جدید شاعری کا غالباً پہلا باقاعدہ مجموعہ

کلام حیدری کے افسانے

عبدالمتین

زندگی اپنا رنگ اور روپ بدلتی رہتی ہے یہ کبھی ایک شکل و صورت میں نہیں رہتی ہے یہ کبھی شعلہ ہے تو کبھی شبنم۔ یہ متنوع اور متضاد ہے ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ لہٰذا اس میں تنوع اور تضاد ہوتا ہے۔ ایک عظیم ادیب کی پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی تخلیقات متنوع ہوتی ہیں۔ کلام حیدری ان ہی ادیبوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے افسانے کے موضوع ہی میں نہیں بلکہ اسلوب میں بھی تنوع ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا آغاز اس وقت ہوا جب ترقی پسند تحریک نقطۂ عروج پر تھی۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ افسانہ "کھلیان اور سلاخیں" ہیں۔ یہ افسانہ پہلی بار "تہذیب" پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ رضیہ سجاد ظہیر بے حد متاثر ہوئی تھیں اور انہوں نے اس کے بارے میں سہیل عظیم آبادی کو لکھا تھا:

> بڑا زوردار افسانہ ہے...... سچی کیا کہوں
> میرا دل چاہتا ہے اس افسانہ کی تعریف کئے
> جاؤں حالات کی کتنی اچھی عکاسی کیسی
> پیاری زبان عوام کا کتنا گہرا درد اور ان کی
> صحیح Understanding ہماری
> تحریک اور ہمارے ادب کو ایسے لکھنے والوں
> کی بڑی ضرورت ہے۔

بلاشبہ یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔ اس کا ہیرو ستر جو گیا ضلع کے ایک گاؤں کا باسی ہے۔ مگر وہ پورے بہار کے کسانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس افسانے کے مگہی الفاظ پر مشتمل مکالموں میں سارے بہار کے محنت کشوں اور کسانوں کے جذبات و احساسات مرتعش ہیں۔ تین دہائی کے گذر جانے کے بعد بھی یہ افسانہ تر و تازہ ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس میں عوام کا گہرا درد اور ان کی صحیح Understanding ہے

بقول حافظ شیراز ؎

> خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
> بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

اس مجموعے کا بہترین افسانہ "بے نام گلیاں" ہے۔ اس میں عظیم آباد کی چند گلیوں کے مکینوں کی زندگی کی عکاسی نہایت فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے۔ یہ افسانہ حقیقت نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ یہ انور عظیم کے افسانہ "جہاں میں رہتا تھا" کی یاد دلاتا ہے۔ جس میں انہوں نے ذکریا اسٹریٹ کے باسیوں کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ مگر دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ کلام حیدری ان گلیوں کے مکینوں کی زندگی کی عکاسی

کرتے ہوئے طنزیہ اور فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہیں جبکہ انور عظیم کی پر زور تحریر اور جزئیات نگاری میں ایک انقلابی کی بے چین روح مضمر نظر آتی ہے ۔

" ماتا مستقبل اور ایٹم بم " بھی اس مجموعہ کا قابل ذکر افسانہ ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ امن کے موضوع پر ہے ۔ پانچویں دہائی میں امن کے موضوع پر لکھنے کا شدید رجحان پایا جاتا تھا ۔ کرشن چندر نے اس موضوع پر " امن کی انگلیاں " اور " ہائیڈروجن بم کے بعد " جیسے فن پارے پیش کئے ۔ اردو کے دوسرے فنکاروں نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کی ۔ کلام حیدری کا یہ افسانہ اسی رجحان کے تحت لکھا گیا مگر ان کے ذاتی مشاہدات اور تجربات نے اسے تقلید کی سطح سے بلند کر دیا ۔ اس افسانہ کی ہیروئن ناہدہ قاری کے ذہن پر ایک گہرا تاثر چھوڑتی ہے ۔

" صفر " کلام حیدری کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے یہ ۱۹۷۲ء میں منظر عام پر آیا ۔ اس مجموعہ کے اشاعت کے ساتھ ان کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے اور ان کی افسانہ نگاری ایک نئی موڑ لیتی ہے ۔ وہ ترقی پسندی کو خیر آباد کرتے ہیں اور جدیدیت کی طرف رجوع ہوتے ہیں حالانکہ یہ بات بے تامل کہی جا سکتی ہے کہ اگر جدیدیت معرض وجود میں نہ بھی آتی تو ان کا فن اسی مقام پر رہتا، جہاں آج ہے ۔ اس مفروضہ کی بنیاد یہ ہے کہ ان کے ابتدائی افسانے مثلاً " بے نام گلیاں، میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، اور دو آنکھیں، ایک کھڑکی " میں اس اسلوب کی نشاندہی آسانی سے ہوتی ہے جسے جدید افسانے کا طرہ امتیاز تصور کیا جاتا ہے اور وہ خود کلامی (Soliloquy) پر مبنی ہے ۔

لہٰذا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ کلام حیدری جدیدیت کی طرف رجوع نہ ہوئے بلکہ اپنے بنائے ہوئے راستے پر تیز گام ہو گئے ترقی پسندی کو خیر آباد کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ وہ صاحب مسلک نہ رہے اور نظریات کے شکنجے سے آزاد ہو گئے ۔

اس مجموعہ میں سولہ افسانے شامل ہے اس کا پہلا افسانہ " گلابی کانچ کا ٹکڑا " ہے اور آخری افسانہ " صفر " ہے " گلابی کانچ کا ٹکڑا " میں خود کلامی کی تکنیک کو بہت چابکدستی سے استعمال کیا گیا ہے یہ افسانہ اپنے اسلوب کی بنا پر ایک کامیاب فن پارہ ہے اور سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ " صفر " ایک علامتی افسانہ ہے ۔ جدید افسانہ میں عموماً علامت کے ذریعہ ابہام پیدا کرتا ہے اور اسے افسانہ نگاری کی امتیازی خصوصیت تصور کیا جاتا ہے مگر " صفر " میں علامت کا استعمال مرکزی خیال کے ارد گرد ابہام کے دھند کو صاف کرنے کی غرض سے کیا گیا ہے چنانچہ افسانہ کے اختتام پر قاری خود کو گنجلک خیالات میں گھرا ہوا نہیں پاتا ہے بلکہ وہ سب کچھ پا لیتا ہے جس کے ابلاغ کے لئے افسانہ نگار ابتدا میں مضطرب رہتا ہے ۔

" درد " اور " سیتی " اس مجموعے ہی کے نہ بلکہ اردو کے اچھے افسانے شمار کئے جا سکتے ہیں ۔ جدید افسانہ کی معراج یہ بتائی جاتی ہے کہ نظم ہو جائے بلا اشتباہ " درد " اس زمرہ میں رکھا جا سکتا ہے " درد " کو درد کی طرح محسوس کیا جا سکتا ہے، بیان نہیں کیا جا سکتا ہے ہاؤس مین HOUSE Man نے شاعری کی یہی تعریف کی ہے ۔

" سیتی " موپاساں کے " نکلس " اور ہنری کے " کرسمس کا تحفہ " کے قبیل میں شمار کیا جا سکتا ہے " سیتی " کا المیہ موپاساں کے " نکلس " اور او ہنری کے " کرسمس کا تحفہ " کے المیے کی نوعیت کا ہے ۔

۱۹۷۹ء میں کلام حیدری کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ " الف لام میم " اشاعت پذیر ہوا ۔ اس میں چودہ افسانے ہیں اس کا پہلا افسانہ " الف لام میم " ہے ۔ اور دو ہم صفحے پر محیط ہے ۔ اس افسانہ کا موضوع آئیڈیالوجی کی شکستگی

چیسے شعور کے رو کی تکنیک کے ذریعہ اس خوبی کو پیش کیا
یا ہے کہ قاری آغاز سے اختتام تک خود کو ایک خواب سی
ت میں ڈوبا ہوا محسوس کرتا ہے ایسا لگتا ہے کہ اس افسانہ
و افسانہ نگار کے خون جگر سے ہوئی ہے۔ "الف لام میم" کے
بل ذکر افسانے "قاتل"، "حاشیائی آدمی"، "جانے کون
اب" ہیں۔ قاتل میں ایک سرمایہ دار کو پیش کیا گیا ہے
دولت کی بنا پر جنسی کجروی اور توہم کا شکار ہو جاتا ہے۔
یہی کمزوریاں اس کی موت کا باعث ہوتی ہیں۔ افسانہ کا
رع اپنے اندر فحش نگاری اور عریاں نگاری کے امکانات
لیے ہے۔ مگر افسانہ نگار کی سلامت روی نے اس افسانہ کو
ان ہونے سے بچا لیا۔ "حاشیائی آدمی" ایسے فرد کی کہانی
جو ایک بڑے عہدے پر فائز ہے اور مصروفیتوں میں محصور
وہ خود کو سماج سے الگ تھلگ محسوس کرتا ہے مگر کامیو کی
ک سائیڈر کی طرح اس کی خواہش ہے کہ ... مجھے کتابیں
بائیں، وقت مل جائے، رقص ہو، موسیقی ہو کتابیں ہو،
ری ہو، افسانہ نگار نے اس کے داخلی کرب کو نہایت
لانہ انداز اور کامیاب طور پر پیش کیا ہے۔ "جانے کون
راسیدھی سادی بیانیہ کہانی ہے۔ مگر درحقیقت ایسی
یا ہے۔ یہ اپنے اندر تحیر کی ایک دنیا بسائی ہوئی ہے
ی دنیا جو ہمیں موپاساں اور ڈوٹوفسکی کے ہاں ملتی ہے۔
ب" میں ایک فنکار کے دل کی دھڑکن اور ایک دانشور
روح کی بے چینی محسوس ہوتی ہے۔

حال میں کلام حیدری کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ
لڈن جوبلی" شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ بھی ۱۴ افسانوں پر
تمل ہے۔ اس مجموعہ میں "نوح کا بیٹا" اور "ایک سال
راستے سے ہٹا" بہترین افسانے ہیں۔

کلام حیدری کے افسانے کمیت اور کیفیت دونوں
[illegible]

مگر منٹو اور بیدی سے مختلف، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے
یہاں ایک فلسفیانہ تجسس پایا جاتا ہے۔ کلام حیدری کے
افسانے میں اکثر بہار کے متوسط طبقے کی جھلک ملتی ہے انہوں
نے بہاری بولی خصوصاً مگہی کے الفاظ اس برجستگی اور
خوبصورتی سے استعمال کیا کہ ان میں ایک ادبی وقار پیدا
ہو گیا۔ مثلاً گوئٹھا، ڈھرکوا، کیا۔ آگنی وغیرہ

ان کے جدید افسانوں میں بھی مقامی رنگ اور مقامی
الفاظ ملتے ہیں بلاشبہ مقامی رنگ اور مقامی الفاظ کا پایا جانا
ایک وصف ہے نقص نہیں۔ موپاساں اور ڈی ایچ لارنس
کے یہاں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔

میکسم گورکی نے ایک بار کہا تھا:

A WRiter must have
a Knowladge of The
History of literature

کلام حیدری کو اردو ادب ہی سے نہیں بلکہ انگریزی ادب سے
گہری واقفیت ہے یہی وجہ ہے کہ نقاد سے نالاں ہونے کے
باوجود ان کے اندر کے نقاد نے ان کے فن کو ہمیشہ سنوارا
اور نکھارا ... اور آج وہ اردو افسانہ کے ایک اہم نام ہیں۔

"تازہ پرچے میں کلام حیدری کا مضمون بڑا فکر انگیز تھا
انہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے مضمون لکھا ہے۔"
(اسحاق قریشی، اردو زبان)

"تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں" ڈاکٹر وزیر آغا کی
تحقیقی تصنیف پر کلام حیدری کا مقالہ اپنے اندر کافی وزن
اور مواد رکھتا ہے۔" (رئیس مالیگانوی، اردو زبان)

کلام حیدری — فن کی خراد پر

حسین الحق گیا

کلام حیدری ایک معتبر، مضطرب، مشتبکل اور قیل شناس افسانہ نگار ہیں۔ اردو افسانے کا جو منظر ح تک سامنے آچکا ہے اس کے پیش نظر کلام حیدری کے لحاظ سے اس منزل میں ہیں جب آدمی کا ہسیک اور بننے کی سرحدوں میں داخل ہونے لگتا ہے اور نئ "اس کے جیسا" لکھنے کی کوشش کرنے لگتی ہے۔

برسبیل تذکرہ عرض ہے کہ کلام حیدری افسانہ کی اس صف کا حصہ ہیں جس نے آزادی کے خواب ستے اور ایک نئے انقلاب کا انتظار کیا تھا (ایک اور راستے سے ہٹا ہے یہ سادے نوجوان اس زمانے میں بازو کی جد و جہد کی ثمر آوری اور سرخ روی کا اعلامیہ لیسے میں "شکست خواب" کی منزل سے لوگذرنا ہی ہے، اب میں ذاتی طور پر آج کے ان بزرگوں اور کل کے الوں سے آج تک یہ پوچھنے کی ہمت نہ کرسکا کہ پریم چند اصلاح پسند گاندھی وادی اور رام راجیہ کے طرز شاہد طرز بیان کو اپنا کر وہ کسی نئے انقلاب کا رجز کیوں پڑھ ستے اور انتظار یہ کیوں لکھ رہے تھے؟

بہرحال! یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ بات کلام حیدری صاحب کی تھی کہ وہ اس صف کا ایک حصہ ہیں جس نے آزادی کے خواب دیکھے تھے، اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ ان کی ذہنی بلوغت کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان ایک عبوری دور سے گذر رہا تھا۔ اور سوا سعادت حسن منٹو (ٹوبا ٹیک سنگھ، کھول دو وغیرہ) اور راجندر سنگھ بیدی (لاجونتی) کے زیادہ تر افسانہ نگار جذباتیت کا شکار تھے (لبشمول کرشن چندر جن سے کلام حیدری کے گہرے روابط تھے) کہا جاتا ہے اور مشاہدے میں بھی آتا ہے کہ اچھا ادب عام طور پر عبوری اور بحرانی دور میں ظہور پزیر ہوتا ہے۔ غالب اور اقبال اس کی مثال ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ وہ زمانہ کلام حیدری اور ان کے ہم عصروں مثلاً غیاث احمد گدی، اقبال مجید، جوگند رپال اور الورعظیم کے بہترین افسانوں کی نمود کا زمانہ نہیں تھا۔ بلکہ اس زمانے میں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے اپنی صلاحیتوں اور فن کاری کا بہترین ثبوت دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبوری اور بحرانی دور کسی "نمونۂ معراج فن" کے منصۂ شہود پر آنے کا سبب نہیں بنتا بلکہ حسن اتفاق سے اس زمانے میں جن کا مشاہدہ وسیع ہوسکتا ہے جن

کی ذہانت عروج پر پہونچ جاتی ہے جن کا فنکارانہ ہنر تکمیلیت
آشنا ہونے لگتا ہے وہی نمونۂ فن معراج بھی پیش کر
پاتے ہیں۔ ورنہ کیا سبب ہے کہ غالب کے زمانے میں ذوق
و مومن اور اقبال کے زمانے میں حسرت موہانی مشہور زمانہ
ہو کر بھی غالب اور اقبال کے قد تک نہیں پہنچ سکے۔

بہرحال! یہ بھی ایک جملہ معترضہ تھا، بات کلام حیدری
صاحب اور ان کے ہم عصروں کی تھی کہ یہ لوگ آزادی کے
آس پاس کے زمانوں میں سامنے آتے ہیں۔ اور ۴۸ء، ۴۹ء
گذرتے گذرتے متعارف ہونے کی پوزیشن میں آجاتے ہیں
گویا میری گفتگو ایک ایسے فنکار کے بارے میں ہے جس کی
تخلیقی عمر کم از کم پچاس برس ضرور ہے۔

گذشتہ پچاس برسوں میں کلام حیدری کے چار
افسانوی مجموعے سامنے آئے۔ جن میں انہوں نے تقریباً
پچاس افسانے منتخب کئے ظاہر ہے کہ پچاس برسوں
تک فن کے ساتھ جڑے رہنے والے آدمی کے پاس پچاس
ہی افسانے تو ہوں گے نہیں۔ لہٰذا یہ دراصل ان کے سخت
SELECTIVE MIND (انتخاب پسند ذہن)
ہونے کا ثبوت ہے جو عام طور پر فنکاروں کو نہیں نصیب
ہوتا۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔

ان تینوں مجموعوں کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ
ہوتا ہے کہ خواہ وہ ترقی پسند رہے ہوں یا اشتراکی مگر
دنیا کو انہوں نے نظریوں کی نظر ... ورنہ
رات کتنی باقی ہے، اور تاریخ اور جگہ، جیسے افسانے
نہیں لکھے جاسکتے تھے۔ KALAM HAIDRI IS A
COMMITTED WRITER BUT NOT
COMMITTED IN WRITING HE IS ONLY
COMMITTED TO WRITING
کلام حیدری کے تین مجموعوں میں شامل افسانوں
میں سے پہلے افسانے، عنابی کانچ کا ٹکڑا، آخری افسانے
قہقہے پیچھے تک ایک عجیب اضطراب کا عالم دکھائی دیتا ہے۔

وہ افسانہ نگار جو، الف لام میم، گولڈن جوبلی،
ایک سال اور راستے سے ہٹا، اور وہ مکان، میں انقلابی
دکھائی دیتا ہے وہی، رات کتنی باقی ہے، میں آدرش
وادی انقلابی کے بجائے حقیقت پسند انقلابی کی
حیثیت سے اشیاء و مظاہر کے مطالعے میں مصروف
نظر آتا ہے اور پھر کس کی کہانی، تاریخ اور جگہ، کہانی
ستو گے، اور روشنی کی ضمانت وغیرہ میں خاصا ناسٹیلجک
نظر آنے لگتا ہے۔ پھر سنی، زندانی، درد، واپسی، ادھ
حادثہ، بابو، بھیک، تلاش، کچھ سمت بدلو، کون جانے
نامرد، پیکٹ، اور خودکشی وغیرہ میں ایک ایسا ناظر جو صرف
نظارے کا قائل ہے۔ ان کہانیوں میں انقلابی کلام حیدری
ناسٹیلجک کلام حیدری اور دانش ور کلام حیدری آپ کو
شاذ و نادر ہی نظر آئے گا۔ بلکہ اکثر و بیشتر آپ کو کلام
حیدری دکھائی ہی نہیں دے گا۔ بلکہ دنیا دکھائی دے گی
زندگی دکھائی دے گی، زندگی کے مختلف رنگ عکس اور
خط دکھائی دیں گے، سنی میں آپ کی ملاقات ایک ایسے
کردار سے ہوگی جو تعلیم یافتہ تو ہے مگر غریب بھی ہے۔
اس لئے ذکریا اسٹریٹ (کلکتہ) کے غریبوں سے بھی اس کا
ربط بنا رہتا ہے، انہیں غریبوں میں سے ایک اس سے منی
آرڈر لکھواتا ہے اور یہ تعلیم یافتہ غریب کردار ایک مرتبہ
اس کا منی آرڈر خود لے لیتا ہے اور اس کے گھر والوں
کو بھیجنے کے بجائے وہ پیسہ خود خرچ کرتا ہے اسی درمیان
جس نے منی آرڈر کرنے کو دیا تھا اس کا ایک حادثے میں
انتقال ہوجاتا ہے اور اس کے کفن دفن کے لئے چندے
کی نوبت آجاتی ہے اسی درمیان یہ کردار جس نے اس
غریب کا منی آرڈر چرا لیا تھا اتفاقاً وہاں پہونچ جاتا ہے

اور بچے ہوئے بائیس روپے کچھ آنے اس کی لاش پر پھینک کر آگے بڑھ جاتا ہے، کہانی کے اختتام پر کہانی کار اپنی طرف سے کوئی تبصرہ نہیں کرتا مگر عنوان سوال کرتا ہے کہ سخی کون ہے ؟ مرنے والا ؟ یا منی آرڈر جانے والا ؟ (جبکہ مزے کی بات یہ ہے کہ سخی ان دونوں میں سے کوئی نہیں ہے)

"زندانی" میں ایک شادی شدہ جوڑے کا ایک لمحہ لفظوں میں قید کیا گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں اپنے اپنے ماضی میں گم ہیں مگر جب دونوں ایک دوسرے کی طرف پلٹتے ہیں تو ڈارلنگ ڈارلنگ کہہ کے ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں یہاں میاں اور بیوی دونوں ایک دوسرے کے زندانی ہیں، دونوں وقت کے زندانی ہیں، دونوں لمحہ موجود کے زندانی ہیں، دونوں اپنے اپنے ماضی کے زندانی ہیں، دونوں اپنے اندر موجود مکر کے زندانی ہیں، دونوں اپنی اپنی مجبوریوں کے زندانی ہیں، دونوں ایک دوسرے کے جسم کے زندانی ہیں اور دونوں اپنے اندر موجود روح کے زندانی ہیں، دونوں ہوس کے زندانی ہیں، دونوں عشق کے زندانی ہیں عجب افسانہ اور عجب عنوان ہے کہ زنداں کی در و دیوار ربر کی طرح پھیلتے جاتے ہیں اور قاری خود اس افسانے کا زندانی بنتا جاتا ہے۔

"درد" میں راوی کو بلڈ پریشر کا مریض ہے۔ مگر افسانے کا عنوان "درد" ہے اور یہ درد خود افسانہ نگار کے الفاظ میں "کہاں ہے یہ نہیں معلوم" تو گویا کہانی ایک ایسے درد کی روداد سناتی ہے جو محسوس ہوتا ہے مگر کہاں محسوس ہوتا ہے اس کا پتہ نہیں۔ اور انسانی جسم میں ایک شئے ایسی ہے جو ہے تو مگر کہاں ہے اس کا پتہ نہیں۔ اسے روح کہتے ہیں اور پھر یہ درد کہاں ہے پتہ نہیں۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ یہ "بلا مقام درد" روح میں ہی ہے اور جس کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ اسے "ہمہ اوست" کہتے ہیں یہ فلسفہ تصوف کی ہے اور اس افسانے کا "مبتلائے درد" کردار بھی بہار شریف حضرت مخدوم الملک کی درگاہ کی طرف دوڑ پڑا ہے اور راستے بھر PATCHS میں سوچتا ہے PATCHS میں سوچنا فن افسانہ کے پیش نظر تجریدی عمل ہے مگر معاملہ یہ ہے کہ جو درد بلا مقام (یا ہمہ مقام) ہو وہ بھی دراصل ایک ایبسٹریکٹ کیفیت ہے لہٰذا تجریدی درد میں گھرنے والا اگر بالترتیب انداز میں سوچتا تو شاید وہی غیر فطری ہوتا۔ پس عرض یہ ہے کہ بڑے ہی فطری انداز میں راوی ٹکڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے جوڑتا، مگر پھر بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوتا اور کسی صورت اپنے کچھ ٹکڑے بچانے کی کوشش کرتا، بہار شریف بڑی درگاہ میں پہونچتا ہے تو وہاں اپنے ممدوح اپنے شاہ صاحب کو جذب کے ٹرانس میں آیا دیکھتا ہے اور پھر افسانہ نگار کو بائبل کی ایک آیت یاد آجاتی ہے کہ بے بی لون ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑے گا۔ اور پھر یہ عظیم شہر صفحہ ہستی پر کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ اب یہاں یہ پتہ نہیں چلتا کہ تباہ ہوجانے والا یہ عظیم شہر کون ہے ؟ راوی، بادشاہ صاحب یا درد؟

اسی طرح ایک کہانی ہے "واپسی" جس میں شوہر درمیان سفر حادثے کا شکار ہوتا ہے اور ہوش آنے کے بعد سوچتا ہے کہ اس کی بیوی رشیدہ ٹھیک کہتی ہے کہ اسے زیادہ دنیاوی آسائش اور رتبہ حاصل کرنے کے لئے آئی اے ایس ہوجانا چاہئے مگر شوہر کی بے ہوشی کے دوران بیوی کو شوہر کی محبتیں یاد آتی ہیں اور وہ بھی شوہر کی محبت میں اپنا خیال تبدیل کر لیتی ہے اور محسوس کرتی ہے کہ زندگی میں اصل چیز عیش و آرام اور رتبہ نہیں، اصل چیز گھر کی چہار دیواری کے اندر رہنے والوں کی باہمی ربط محبت ہے۔ گویا جب دو مخلصین درد کے شراکت دار بنتے ہیں تو ایک دوسرے کے اور قریب آجاتے ہیں۔

پھر ایک کہانی ہے ”اُدھار“۔ اس میں دو بنیادی
کردار دکھائی جاتے ہیں ایک راوی کا کردار ہے اور دوسرا
کردار ہے مسٹر ایچ اے ٹرنر کا۔ ٹرنر کے بارے میں یسین
گھڑی ساز نے بتایا تھا کہ وہ دو چار لاکھ روپے کا مالک
ہے اور خود ٹرنر بھی ایسی فضول خرچی کے ساتھ زندگی بسر
کرتا تھا کہ راوی کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ ٹرنر واقعی ایک مالدار
آدمی ہے مگر راوی نے ایک مرتبہ ایک کابلی پٹھان کو تقاضہ
کرتے دیکھا تو اسے یسین کی بات جھوٹ معلوم ہوئی اور نتیجتاً
جب ٹرنر نے راوی سے قرض مانگا تو راوی نے یہ سوچ کر صاف
انکار کر دیا کہ اس مفلس کو پیسہ دینا گویا پیسہ ڈبونا ہے، مگر
جب راوی کو ضرورت پڑی تو اس نے ایک بڑی رقم راوی
کے حوالے کر دی اور پھر بعد میں اس کا خط ملا کہ زمانۂ جنگ
میں جو دس لاکھ کی رقم پھنسی تھی وہ اب واپس ملنے والی ہے
گویا کہانی کار نے یہ کہنا چاہا ہے کہ کسی کے ظاہر کو دیکھ کر اس
کے باطن کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح ایک کہانی ”حادثہ“ ہے جس میں دو کردار
ہیں لڑکی۔ شامی لڑکا۔ وہ، وہ تو شامی سے محبت کرتا دکھائی
گیا کیونکہ وہ شامی کے لئے خطرے بھی مول لینے کو تیار رہے۔
مگر شامی نے اسے دھکا دے دیا۔ اور دلچسپ بات یہ ہے
کہ اس کے باوجود وہ شامی سے صرف اتنا سننا چاہتا ہے
کہ شامی نے اسے دانستہ طور پر دھکا نہیں دیا یہ محض ایک
حادثہ تھا، مگر شامی یہ بھی نہیں کہتی، کیوں نہیں کہتی؟ وہ
لڑکا شامی سے اتنی محبت کرتا ہے تو شامی اس کی جان
کے درپے کیوں ہے؟ سوال سر اٹھاتا ہے مگر جواب
نہیں ملتا۔ پھر بھی زندگی کی ایک اور تصویر ایک اور رُخ
کرداروں کے میلے میں سے اٹھایا گیا ایک اور کردار۔

ایک کہانی ہے ”بابو“۔ اس میں بھی ایک کردار خود
راوی کا ہے اور دوسرا کردار کلکتہ کا ایک بجھو دکھم کا فرد
یسین۔ یسین راوی پر اعتماد کر کے نوٹوں سے بھرا بکس
(جو غالباً اس نے کسی لوٹ یا اسمگلنگ کے نتیجے میں حاصل
ہو گیا ہوگا) راوی کے حوالے کر دیا اور خود (غالباً پولس کے
خوف سے) مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) فرار ہو گیا۔
ادھر راوی وہ سارے روپے لے کر اپنے پرانے شہر
لوٹ آتا ہے اور قرینہ اغلب ہے کہ اسی روپے کے بل پر
بزنس کر کے بڑا آدمی بن جاتا ہے۔ مگر جب اس کا ڈرائیور
بھولے بسرے بھائی کو اس سے ملوانے لاتا ہے تو راوی
پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی یسین ہے جس کا روپیہ لے کر خود
راوی فرار ہو گیا تھا ادھر یسین نے بھی اسے پہچان لیا۔
اور تب ایسے میں راوی کے پاس ایک ہی چارہ کار بچا ہوا
تھا وہ یسین کو فارن ایکٹ کے تحت گرفتار کرا کے اطمینان
کی سانس لیتا ہے یہ دراصل آدمی کی کمینگی کی کہانی ہے۔

ایک اور سسکتی سی کہانی ہے ”بھیک“۔ دل کے
درد کے احساس کا ایک لمحہ جس میں اچانک جو کچھ بیت چکا
سب کچھ سمیٹنے کو جی چاہے مگر ہر پل اپنے ہاتھ سے نکلتا
اور بھاگتا محسوس ہو، ایک پل کی بھی بھیک نہ ملے اور
تب ایسے میں اس کی بچی اس سے پیار کرتی ہے تو اسے
سکون ملتا ہے ایسا سکون جیسے فردوس کی راحت مل
رہی ہو۔

مذکورہ بالا آٹھ کہانیوں پہلے مجموعے سے سلسلہ دار
اٹھالی گئیں اور قارئین نے ملاحظہ کیا ہوگا، ہر کہانی میں
ایک نیا تنوع رخ کائنات کی ایک اور جھلک دکھانے کی
تڑپ، ہر کہانی میں ایک اضطراب کا عالم۔

یہ اضطراب آگے بھی لگاتار جاری ہے تلاش،
اپنی آوازیں، کس کی کہانی، الف لام میم، قاتل، بازو
کیوں کٹے، ہماشمائی آدمی، کون جانے، کہانی سنو گے،
نامرد، تاریخ اور جگہ، خودکشی، گونگان جوبلی، لات کتنی

باقی ہے، روشنی کی ضمانت، وہ مکان، کون پہچانے وغیرہ میں مسلسل تخلیقی اضطراب کا عالم دکھائی دے گا۔

اب ایک اور کہانی "تلاش" کو بھی سامنے رکھئے۔ تو وہی اضطراب والی بات سچ ہوتی نظر آئے گی۔ مرد کسی کے انتظار میں ہے اس بیچ ایک اجنبی عورت اس کے پاس آتی ہے اور باتوں باتوں میں پتہ چلتا ہے کہ دونوں سے دوست کی تلاش میں ہیں۔ عورت مرد کو لئے اپنے گھر چلی آتی ہے یہاں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ اور جب مرد اس سے پوچھتا ہے کہ دوست کی تلاش ختم ہوئی تو وہ اس اجنبی مرد کی آغوش میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ اور روچکتی ہے تو اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے اور دروازہ بولٹ کر لیتی ہے۔ بظاہر بڑی عجیب سی کہانی ہے شروع میں عورت فلرٹ دکھائی دیتی ہے پھر گھر پہونچتے پہونچتے عورت مرد دونوں فلرٹ دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اور انجام کار دونوں ایک ایسی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں جس کا کوئی نام نہیں ہوتا، ٹھیک ہی کی طرح یہ بھی جذبے کی کہانی، جذب جس کا کوئی چہرہ نہیں ہوتا، مگر بڑی بات ہے کہ دونوں کہانیوں میں کہانی کا چہرا موجود ہے۔

کچھ کہانیوں میں ناسٹلجیا کا وفور دکھائی دیتا ہے مثلاً کس کی کہانی، الف لام میم، کہانی سوگئے، تاریخ اور جگہ، روشنی کی ضمانت اور کون پہچانے وغیرہ۔ اس سلسلے میں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اب ناسٹلجیا کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ ایک زمانے میں گالی یا مذاق بنا ہوا تھا مگر آج اسے تخلیقی مراحل کو مہمیز کرنے والے ایک اہم عنصر کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے۔ عینی صاحبہ سے راقم الحروف تک (جن کے بیچ میں انتظار حسین، کلام حیدری اور قاضی عبد الستار وغیرہ آتے ہیں) یہ ناسٹلجیا طرح طرح سے افسانہ نگاروں کو مہمیز کرتا رہا ہے۔

کلام حیدری کے یہاں بھی ناسٹلجیا، مرکزہ کی سی حیثیت رکھتا ہے، ناسٹلجیا ان کے لئے کوئی جامد شئے یا راستے کی رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ وقت کے عرفان کا ایک ذریعہ ہے پردہ جو گر گیا اس کے پیچھے کیا تھا۔ کوہ قاف: جو جھانک کر دیکھا یا تو گونگا ہو جاتا یا جذب کے ٹرانس میں چلا جاتا۔ کلام حیدری کوہ قاف کے اس پار دیکھتے ہیں مگر نہ گونگے ہوتے ہیں نہ مجذوب بنتے ہیں۔

(۱) "کیا میں کیپسول میں غلط تاریخ کو بند کر کے
زمین میں دفن کرنے کے زمانے کا آدمی ہوں
یا میں سام اور نریمان کے ساتھ جی رہا ہوں
کوئی مجھے سیمرغ کے پر دیتا۔
"کہ میں اسے جلا کر سیمرغ کو بلاتا اور اسے
بتاتا کہ میرے جسم پر کتنے زخم ہیں، میری
زخموں سے چور چور ہے"

(الف لام میم)

(۲) کبھی لگتا ہے وقت دھیرے دھیرے
بہہ رہا ہے تیزی سے بھاگ رہا ہے کبھی
لگتا ہے وقت کہاں سے آتا ہے اور کہاں
جاتا ہے۔
یزاڈوے ——— کیا یہ ریستوران
ابھی ہے۔ (الف لام میم)

(۳) میں اپنی کار سے ایک شادی میں شریک
ہونے گیا تو میں نے سوچا تو چلو اپنے گاؤں
چلتے ہیں جہاں صرف مہنگو نانا ہی رہ گیا۔
مہنگو نانا بے سدھ چارپائی پر پڑا تھا کچھ
دیر کے لئے ہوش میں آتا اور پھر سب بھول
جاتا۔ مجھ سے پوچھنے لگتا۔
ڈاڑھی پر کچھ ہے ——— بڑکی بو کیسن

ہے؟ دولہا بابو کی حال چال کہو۔؟ ہر ایک
کو کمبل نا دیہو؟
میں نے دیکھا ہنگو نانا اچھے خاصے بستر پر
ہے اور اچھے خاصے قسم کا کمبل اس پر پڑا ہے
مگر اس نے اپنے ناتی سے کمبل مانگا
میں نے اپنے ہولڈال سے ایک فارن کمبل
نکال کر ہنگو نانا کو اوڑھا دیا تو اس نے مجھے
ایسی نظروں سے دیکھا جسے میں کیا بڑے
سے بڑا ادیب اور شاعر نہیں بیان کر سکتا۔
(تاریخ اور جگہ)

جہاں جہاں کلام حیدری ناسٹلجیا کے سہارے تخلیقی طور پر فعال ہوتے ہیں وہاں وہاں وہ وقت کو ایک "رواں عنصر" کی حیثیت سے بھی دیکھتے ہیں جس کے بدلاؤ پر فنکار افسوس کے حصار میں آتا ہے مگر جانتا ہے کہ اس "روانی" اور تغیر کو روک لینا انسانی طاقت سے باہر کی بات ہے ظاہر ہے یہ مجبوری ایک حساس دل کو اضطراب میں مبتلا کرتی ہے اور یہ اضطراب ناسٹلجیا کے سہارے صرف گذرے ہوئے بسرے ہوئے، مٹتے ہوئے اور کھنڈر ہوتے ہوئے وقت، چہروں، اشخاص، شہروں اور عمارتوں تک محدود نہیں ہے۔ وہ انقلاب جس کا انتظار کلام حیدری کی نسل کر رہی ہے اب تو وہ بھی ناسٹلجیا ہی ایک حصہ بن چکا ہے۔

یہ وہ دن تھے جب دستک سے ڈر نہیں
لگتا تھا یا جب میں نے دستک کو اپنا مقدر
نہیں سمجھا تھا، دنیا بدل سکتی ہے، دنیا
بدلی جا سکتی ہے۔ بہتر بنائی جا سکتی ہے
اسے میں بہتر بنا سکتا ہوں کیونکہ میری کلائی
پر پلاسٹر تھا اور پیشانی پر وہ چھوٹا سا
زخم ابھی پوری طرح بھرا نہیں تھا جو اقتدار
نے لگایا تھا اور جس اقتدار کے جبر کے
آگے سینہ سپر ہو جانے کا حوصلہ رکھتا تھا
...... میں ان دنوں آزاد بادل تھا۔
اور دھرتی کے چھوٹے چھوٹے حصوں کو
بچانے کے لئے چھڑکاؤ کرتا تھا ....
یہ مجھے قید نہیں کر سکا تھا"
(الف لام میم)

پہلی منزل کو تم نے آخری منزل سمجھا تھا؟
کیا انقلاب یوں آتے ہیں؟ یوں انقلاب
آتے ہیں کہ محبت ادھر رہ جاتے اور
منصوبے اور خواب ادھر چلے جائیں۔
انقلاب یوں آتے ہیں کہ گودیاں ادھر رہ
جائیں اور دلارے دھرتی کی کئی فرلانگ
چوڑی دراڑیں پھلانگ جائیں......
کہ لوریاں ادھر رہ جائیں اور نیند خواب
آور گولیوں کی محتاج ہو جائے۔ تم سلیپنگ
پلس کھاتے کھاتے تھک چکے ہو کیوں؟
کیونکہ سلانے والی لوریاں اپنی اونچی
لرزتی نیند میں ڈوبی تانوں سمیت کہیں
آسمانوں میں کھو گئی ہیں
(کہانی سنو گے)

سنا کہ مسٹر نشار جس ملک کی خبریں سناتے
تھے اس کا نام ہی بدل گیا اور وہ اس نام
کے اتنے رسیا ہو گئے تھے کہ اسی نام کے
ملک میں چلے گئے اور پھر خبریں سنانے
لگے، مجھے ان کی خبریں سننے کا اکثر شوق ہوتا

مگر ایک آدھ منٹ کے بعد لگتا ہے
نا کی اور زمین آرمی کے بوٹوں کی چاپ
ٹاپ ٹاپ ٹاپ..... اور تب مجھے
سٹر سینما کے پردوں پر نظر آنے لگتا

WE WANT BRENDS
NOLISENCE CELEIRATE
INDE PENCIENCE

یہ پوسٹر ہمیں ملیٹری کیمپ کی چہار دیواری
پکانا تھا۔
نے لئی بنا کر ہانڈی میں رکھی تھی اور
شار پوسٹر زردوں کر کے بغل میں دبائے
. اور آسمان بادلوں سے گھرا تھا.. اور
ت کے گیارہ بج چکے تھے جب ہم تینوں
ری کیمپ کی سڑک پر پہونچے، دوسرے
آزادی کا دن تھا، اور ہمیں یہ پوسٹر
ت بھر میں چہار دیواری پر چپکا دینا تھا۔
ار دیواری کے چاروں طرف بڑا نالہ
سوکھا تھا مگر نہیں کہیں اس میں پانی
ا اور گیٹ کئی تھی بڑے بڑے، ہم
لے میں چلتے ہوئے گیٹ کے پاس کل
ٹ کے اندر گھس گئے، پہرے کا سپاہی
ا ہوا گیٹ تک آتا پھر واپس جاتا۔
ہم اس کی واپسی پر ایک دو پوسٹر
پکا دیتے،...... ہمارے سروں پر
ری بوٹوں کی چاپ ہتھوڑے لگا رہی
......
مسٹر شا جب خبریں سناتے ہیں تو

کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔ اور
میں اپنا ریڈیو بند کر دیتی ہوں اور آنکھیں
بند کر لیتی ہوں اور کان کھلے رکھتی ہوں
(ایک سال اور راستے سے ہٹا)
اور اس انقلابی ناسٹالجیا کی آخری منزل بھی ملاحظہ
کیجئے اور ایمان لائیے کہ ٹرانفکا لاعتراف کے مراحل میں
جوش ملیح آبادی سے کم باہمت نہیں ہوتا۔
منہ اندھیرے میں نے نثار نے مرنال
نے رینو نے ارون کمار نے اور سب نے
اس ریلوے پل کے نیچے انقلاب کو دیکھنے
کے لئے ساری رات آنکھوں میں کاٹ
دی تھی اور ساری رات ریلوے لائن
کے اوپر آرمی کے سپاہی کے بوٹ
کی آوازوں پر غصے سے اپنے دانت
بھینچ لیتے تھے .... صبح کا انتظار تھا
جو اپنے جلا سے انقلاب لا رہی تھی۔
۹ مارچ ـــــــ ۹ مارچ ـــــــ
ہمارے دلوں کی دھڑکن ۹ مارچ کی تال
پر دھڑک رہی تھی
مگر ـــــــ
تمہیں یاد ہے دیدا ـــــــ ۹ مارچ
کی صبح کو کھڑکھڑاتی ہوئی ٹرین پل کے
اوپر سے پٹریوں پر کھڑکھڑاتی گذر رہی تھی۔
اور ہم نے پورب سے پچھم کو جاتی ہوئی
اس ٹرین کو کتنی حیرت اور شکست
خواب کے کیسے اذیت ناک احساس
کے ساتھ دیکھا تھا (الف لام میم)

کلام بھائی کی صف کو شکست خواب کا بھی
ایک اذیت ناک احساس نہیں جھیلنا پڑا، اس صف
والوں کے مسائل واقعی بڑے گمبھیر ہیں، ان کے آگے کرشن
چندر ان کے معاصرین اور ان کے فوراً بعد آنے والوں کا طرز
احساس اور طرز بیان اور ان کے پیچھے (۶۵-۶۰ء کے آس
پاس سے) بدلتا ہوا طرز بیان اور طرز احساس جوئین را، آغا
ہمیش اور اکرام باگ وغیرہ جیسے انتہائی مبہم افسانہ نگاروں
کی نمود و فروغ کا سبب بنا۔ ظاہر ہے کلام حیدری ہوں یا
کوئی بھی حساس اور باخبر فنکار وہ اپنے عہد کی بدلتی فکری
اور اسلوبیاتی قدروں سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ اسی "باخبری"
نے کلام حیدری کے یہاں "صفر" "خواب" اور اب
"عنابی کانچ کا ٹکڑا"، "ایک ہزار آٹھ سو بانوے"، "ٹرنک سے
انگیج ہوں"، "ستر اور بے ستری"، "اور نوح کا بیٹا" جیسی
کہانیوں کو ابھرنے کا موقع دیا۔ ان کہانیوں میں کہانی
کا چہرہ مدھم ہوتا اور خیال کا چہرہ زیادہ روشن، اور چمکدار ہوتا
دکھائی دیتا ہے لیکن جس درجے سے کوئی منتقل میں گیا وہ
شان سلامت رہتی ہے یہی کیا کم ہے کہ کلام حیدری نئی
نسل کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں اور اس کے باوجود
ابہام کا شکار نہیں ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا
سکتا ہے کہ "صفر" جیسی کہانیوں میں خیال کے بطن سے
واقعہ سر اٹھانے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے اب یہ تو کتابی
ناقدوں کی عادت ہے کہ وہ بنیئے کی ترازو لے کر بیٹھیں
اور دیکھیں کہ پلاٹ کے چھٹانک ہے، کردار نگاری کتنے
پاؤ ہے اور کہانی کے سیر ہے میں تو اسی بات پر کلام صاحب
کے اعجاز فن کا قائل ہوں کہ خیال کے گھنے بادلوں سے
کہانی کا چہرہ روشن دکھائی دے۔ یا مدھم خیال تو مدھم نہیں
ہے یہ دراصل تخلیق کار کے CREATIVE OUT
LOOK کا مسئلہ ہے راقم الحروف نے تو درجنوں
کہانیاں اور دو عدد ایسے ناول بھی پڑھے جہاں سب
کچھ موجود، مگر تخلیقی نظر کا پتہ نہیں۔ یہ تخلیقی نظر کلام حیدری
کے یہاں ہر حال میں موجود ہے۔

اکہتر کے بعد ایک نیا فکری آفاق اردو والوں
کے لئے روشن ہوا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اس افق پر بھی کلام
صاحب نے تخلیقی نظر ڈالی نتیجتاً وہاں بھی ان کا
CREATIVEOUT LOOK پوری طرح موجود ہے
نتیجتاً لٹ پٹ کر بنگلہ دیش سے آنے والے نوجوان کو
وہ صرف ایک سپاٹ روایتی اور جذباتی نگاہ سے نہیں
دیکھتے، ایک پناہ گزیں کو انہوں نے (شاید) برصغیر کے
مسلمانوں کی علامت بنا دیا۔

"تم میرے دولہا بھائی ہو، میری باجی ہو،
میرے بیٹے بھی ہو میرے بھانجے بھی، تم ماضی
بھی ہو، تم حال بھی ہو، تم مستقبل بھی ہو"
(کس کی کہانی)

یہ پناہ گزیں ماضی اور حال تو ہوا مستقبل کیسے ہوگا؟
کہیں یہ برصغیر الیشائی مسلمان تو نہیں جو ہندوستان
سے مشرقی پاکستان جاتا ہے، مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان
جاتا ہے مغربی پاکستان سے عرب اور یورپ بھاگتا ہے۔
پھر افغانستان سے پاکستان آتا ہے، افغانستان سے ایران
جاتا ہے، افغانستان تاجکستان جاتا ہے اور بنگلہ دیش
سے آسام آتا ہے اور آخر آخر اجودھیا سے فیض آباد آتا ہے۔
میری دعا ہے کہ پناہ گزیں کے مستقبل ہونے کی
بات صرف اتفاق ہو مگر پھر خوف آتا ہے کہ اتفاق کیسے
مانوں؟ تخلیق کار کا۔
تو اس کے بعد والی منزل کی طرف بھی اشارہ کر چکا ہے:

"میں ہوائی جہاز کے پرواز کرنے کا منتظر
کھڑا ہوں، جو میرے سامنے ہے اور وسیع

وہ ریفیس ایرپورٹ ہے اس کے آگے سڑک
ہے اور اس سے آگے ..... ایک پہاڑ ہے،
اس ہوائی اڈے سے ہوائی جہاز اڑتا ہے
تو اسے اوپر اٹھنے کے لئے بہت کم فاصلہ
ملتا ہے ——— اور پھر لیپت چھوڑنے
کے بعد اسے سیدھے اوپر اٹھنا ہوتا ہے ورنہ
——— وہ پہاڑ ———
ہوائی جہاز اب اچانک اوپر اٹھنا شروع
ہو گیا ہے ——— عودی ——— فرید
کہاں جا رہا ہے؟
یہ اس کی موت کی کون سی قسط ہے؟"

ایرپورٹ کے آگے پہاڑ... اوپر اٹھنے کے لئے بہت کم فاصلہ ... ہوائی جہاز اوپر اٹھ رہا ہے ..... فرید کہاں جا رہا ہے؟ .... یہ اس کی موت کی کون سی قسط ہے؟ اس میں کون سا جملہ ہے جو برصغیر ایشیا کے مسلمانوں کا کا ستعارہ نہیں؟

اور اسی لئے میں نے اپنی بات اس جملے سے شروع کی تھی کہ کلام حیدری ایک معتبر، مضطرب، مشکل اور مستقبل شناس افسانہ نگار ہیں۔

——— ۲ ———

کلام حیدری کے سارے افسانے ایک موڈ کے نہیں ہیں اور اس لئے ایک طرح کے بھی نہیں ہیں۔ اور ایک طرح کے نہ ہونے کے سبب کلام حیدری TYPED افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانے نہیں جا سکتے۔ میرے خیال میں کلام حیدری کی فنی پہچان میں یہ ایک بڑا اہم نکتہ ہے بوجود وتسلسل توڑنا فکری سطح پر بھی اور اسلوبیاتی سطح پر بھی یہ ہمت چوکنے والی ہی جیسے بڑے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ تو چونکہ کلام صاحب کے یہاں یکسانیت نہیں ہے اس لئے وہ قاری کے لئے نہ تو بدمزگی کا سبب بنتے ہیں اور نہ ہی ایک لکیر کے فقیر کے نظر آتے ہیں۔ موضوع اور تنوع کا بیان ان کے افسانوں کا بنیادی وصف ہے۔ اور اس تنوع میں تحت نعرہ یا تحت تحریکی طرح ناسٹلجیا جس میں تقسیم بھی شامل ہے طبقاتی شعور اور شکست خواب کی اذیت ان کا بنیادی آہنگ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اور کلام حیدری کا یہ بنیادی آہنگ "الف لام میم"، کس کی کہانی، تاریخ اور جگہ، روشنی کی ضمانت، اور رات کتنی باقی ہے جیسی شاہکار کہانیوں میں اپنی پوری تخلیقی وفور کے ساتھ موجود ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں کلام حیدری کی یہ پانچ کہانیاں کلام حیدری کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ ان کہانیوں میں جو فنی توازن، تخلیقی کرب، ناسٹلجیائی تڑپ، احساس ثقافتی اور تمدنی بصیرت غیر متعصب نظر اور غیر متعلق تعلق نظر آتا ہے وہ خود کلام حیدری کی دوسری کہانیوں میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے جیسے سنی، بابو، لالوشنی، کہانی سنو گے؟ عنایات کا ریخ کا ٹکڑا، دلدل، تلاش، باز کبوتر کٹے ناخن اور ایک سال اور سلاخ سے ہٹا وغیرہ بہ لحاظ کہانیاں کلام حیدری کی اچھی کہانیاں ہیں۔ اور کئی اچھی کہانیاں ہیں۔ ایسی کہانیاں ہیں جنہیں پڑھ کر کائنات اور اشیا و مظاہر کے بارے میں نئی آگہی ملتی ہے جو یاد رہ جاتی ہیں، جنہیں پڑھ کر رشک کیا جا سکتا ہے مگر وہ جو 'اک آنچ کی کمی' کی بات کی جاتی ہے۔

پھر کلام حیدری کی کچھ کہانیاں ایسی ہیں جن میں اسلوبیاتی انفرادیت موجود ہے اسلوبیاتی انفرادیت سے میری مراد یہ ہے کہ (۱) آپ لاکھ کوشش کریں ان میں کسی سینیئر افسانہ نگار کے طرز بیان کا عکس بھی تلاش

نہیں کرسکتے (۲) ان میں افسانہ نگار اپنے غالب طرزِ بیان سے الگ ہو کر بیان کرتا نظر آتا ہے (۳) اکثر بڑے افسانہ نگاروں کے یہاں، کبھی کبھی ایک سرجوشی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ایک ترنگ، ایک کیف، ایک مست الست کیفیت (جس میں شاعر کہہ اٹھتا ہے ؎

بیا جاناں تماشہ کن کہ در انبوہ جانبازاں
بہ صد سامان رسوائی سر بازار می رقصم

یا پھر وہ شعر کہ ؎

بہ ہر قلم جو کشند تیغ نیم سر بسجود
او بہ ناز سے مجھے من بہ نیاز سے مجھے)

تو اگر نثری بیان میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو یقیناً یہ بھی اسلوبیاتی انفرادیت ہی کے ذیل میں آئے گا۔ اور ایسی منفرد اسلوب کی کہانیوں میں روشنی، جھیک، عنابی کانچ کا ٹکڑا، الف لام میم، کہانی سوگئی ہے، خواب، تاریخ اور جگہ، رات کتنی باقی ہے، روشنی کی ضمانت، ایک سال اور راستے سے ہٹا، اور کون پہچانے، وغیرہ بطور خاص شمار کی جاسکتی ہیں۔

ظاہر ہے جب جام میں، ظرف میں، سمندر میں سرجوش پیدا ہوتا ہے تو کبھی کبھی مقدار جوش کر بڑا جاتا ہے ایسے میں یہ عین ممکن اور عین فطری ہے کہ "بادۂ فن" سے "شراب فن" کچھ زیادہ چھلک گئی ہے۔ اتنی چھلکی ہو کہ اسے جہاں پہونچنا تھا وہاں نہ پہونچ کر آس پاس کہیں اور گر گئی ہو، یا دہ خواری میں کمال بادہ خواری تو "بے ہوشی با ہوش" ہے تو اگر بے ہوشی کا غلبہ ہوا اور ہوش مغلوب ہوا تو گرفت تو ہوگی مگر سرجوشی کی اپنی قیمت ہے اپنا مول ہے، اپنے قسمت ہے، اپنا مزہ ہے اور یہ سب کو نصیب نہیں ہوتا۔ ان کہانیوں میں کلام حیدری "مقام کیف" پر واقع ہیں۔ اور یہ بہر حال اعلیٰ مقام ہے۔

"کلام حیدری کی خصوصیت بحیثیت مبصر یہی ہے کہ وہ اپنی بات بڑے اعتماد کے ساتھ نہایت پرجوش لہجے میں کہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان کی رائے سے اختلاف بھی ہو تب بھی ان کی دیانت داری اور خلوص پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس دور میں تبصرے تو کجا ہماری تنقید بھی مصلحت کوشیوں، نظریاتی جانبداریوں اور گروہ بندیوں کا شکار ہے۔ کلام حیدری کی یہ تحریریں حق گوئی اور بے باکی کا ایک بلند معیار قائم کرتی ہیں۔ ان تبصروں میں کلام حیدری نے بڑے سے بڑے ادبی بت پر وار کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی، ان حالات میں بھی نہیں جب متعلقہ شخصیت سے ان کے دوستانہ مراسم رہے ہوں۔"

(ڈاکٹر مظفر حنفی۔ کتاب نما نومبر ۱۹۸۰ء)

"کلام حیدری کی زبان صاف ستھری ہے۔ اور ان کا بیانیہ وضاحت کا حامل ہے۔ کہیں جملے ٹوٹے ہوئے نظر آتے ہیں جسے وہ قاری کی تفہیم و تکمیل کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر جگہوں پر جملوں کی یا لفظوں کی تکرار ملتی ہے۔ جذباتیت کی وجہ سے زبان میں روانی اور SPONTANITY ہے، انہوں نے اپنی مختلف ہیئت کی تشکیل کی ہے جس میں وہ کامیاب ہیں مگر یہ ہیئت پرانے اور نئے اسلوب کا امتزاج رکھتی ہے۔" (جواز شمارہ ۸)

کلام حیدری کی تنقید نگاری

ڈاکٹر عبد المنان

کلام حیدری اردو ادب میں ایک معتبر نام ہے۔ ان کا اصلی میدان افسانہ نگاری ہے۔ اور فن افسانہ نگاری کی مشاطگی ہی زیادہ توجہ صرف کی۔ ظاہر ہے یہ فنکار کا میلان طبع افسانہ نگاری کے کوچہ میں طواف کرکے نئے خیالات وافکار کے نگار خانے سجاتا ہو اور اپنی غایت توجہ سے اس فن کی آرائش کے فرائض انجام دیتا ہو۔ وہ دوسری اصناف کا دعویدار نہیں ہوتا۔ لیکن اردو ادب کی دنیا میں ایسے بے شمار فنکار ملیں گے۔ جنہوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء جس صنعت سے کی ہے غایت میلان نہ ہونے کی بناء پر کنارہ کش ہوئے اور اس صنف میں پناہ لی۔ جہاں اپنے مزاج وافتاد کا جوہر دکھا سکتے تھے۔ کلام حیدری صاحب تقریباً ۴۰ سال سے ادب کی خدمت انجام دیتے رہے چلے آرہے ہیں لیکن انہوں نے خاص توجہ افسانہ نگاری کی طرف صرف کی ہے۔ اب تک چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ "بے نام گلیاں"، "صفر"، "الف لام میم" اور "گولڈن جوبلی"۔ بحث بڑی طویل ہے۔ کہ ان تینوں مجموعوں کے دوران افسانہ نگاری کی فنی وفکری سطح پر کتنی تبدیلیاں پیدا کیں اور اپنے مشاہدے کا کس طرح مظاہرہ کیا۔ فی الحال یہ میرا موضوع نہیں۔ مجھے یہ دیکھنا مقصود ہے کہ افسانے کی دنیا میں اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی منزلیں طے کرنے والا فنکار جب تنقید نگاری کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اپنی قابلیت اور منفرد زاویۂ فکر سے اردو تنقید کو نئی سمت وجہت عطا کرتا ہے۔

کلام حیدری صاحب کی تنقید نگاری کا جائزہ لینے کے لئے ان مقالوں کی طرف توجہ مبذول کرنا ہوگی۔ جو موقع بموقع مختلف ادبی وسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ "آہنگ" اردو ادب کا معیاری اور باوقار ادبی رسالہ ہے۔ جو صرف کلام حیدری صاحب کی تسکین طبع کی وجہ سے پابندی سے شائع ہوتا رہا ہے نہ تو پیسے کمانا مقصود ہے اور نہ سستی شہرت یہی وجہ ہے کہ وہ کسی دوست سے یہ درخواست نہیں کرتے کہ اس رسالہ کی سالمیت کے لئے اسے خرید کر پڑھا جائے اور مزید خریدار بنائے۔ قدرت نے انہیں اردو ادب کی بے لوث خدمت کا جذبہ عطا کیا ہے۔ اس لئے اپنے ذوق اور تسکین کی خاطر آہنگ اور مورچہ نکالتے رہے۔ آہنگ کے اداریے میں اردو ادب کے مختلف گوشوں پر جس انداز سے بصیرت افروز روشنی دکھائی ہے اور دو ٹوک خیالات

پیش کئے ہیں۔ انہیں ایک مجموعی شکل بھی عطا کی گئی ہے جسے مزامیر کا نام دیا گیا ہے۔ نوشابہ حق صاحبہ نے ترتیب دیا ہے اور گزارشات مرتب کے عنوان سے چند خیالات بھی پیش کئے ہیں۔ مزامیر سے متعلق ان کے خیالات درج ذیل ہیں۔

"مزامیر میں نے مرتب کیا ہے اور پہلی بار یہ فخر مجھے ہی حاصل ہو رہا ہے کہ میں کلام حیدری کی تحریروں پر پیش لفظ لکھ رہی ہوں جس سے ان کا شاید کچھ نہ بنے، میرا بگڑ جائے اس کا اندیشہ مجھے ہے۔ میں نے آہنگ سے صرف ان ہی تحریروں کو جو مزامیر کے عنوان سے خود کلام حیدری نے ادبی موضوعات پر کبھی جمع کر دی ہے اور تاریخیں اس لئے دے دی ہیں کہ ہر تحریر کا عصری منظر بھی قارئین کے سامنے رہے۔

مزامیر برسوں کی محنت کا گلدستہ ہے جس میں مختلف نظریات و خیالات کے پھول سجائے گئے ہیں اور یہ اس لئے ممکن ہے کہ ایک مدیر نہ صرف مختلف فنکاروں کی تخلیقات کی اشاعت کو حاصل سمجھتا ہے بلکہ کسی خاص عہد میں ادب کے فنکار و مختلف اصناف میں پیدا ہونے والے رجحانات اور فنی تجربے سے آگاہ ہو کر اپنا نظریہ پیش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اردو ادب اور زبان کی تنزلی و ترقی کے جو شوشے مختلف سیاسی سطح پر ہوتے ہیں۔ ان کے اثرات کس طرح قائم ہوتے ہیں اور مستقبل میں علم و ادب اور فن و زبان کو کتنا فائدہ یا نقصان ہو سکتا ہے اس کا تجزیہ کرتا ہے۔

کلام حیدری کے اداریئے کی اس پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ کون سا سیاسی نقطۂ نظر ہے جس پر اعتماد کیا جائے۔ عام نظروں میں ہوس کا ڈھل ہے اور مصلحتوں کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ظالم اب ظالم نہیں کہا جاتا۔ غلط اب غلط نہیں رہا ہے۔

معیار نام کی چیز زندگی کے کس شعبے میں باقی ہے؟

سیاست اس سے عاری۔ اخلاق اس سے خالی۔ ادب اس سے باغی۔ سماجی اور تہذیبی نقطۂ نظر پر بھی یقین نہیں رہا ہے کیونکہ تینوں کے ساتھ نقطۂ نظر گم ہو رہے ہیں۔ ان کی جگہ ایک بے نام سا خلا ہے۔ جو آدمی سے اس کا حوصلہ زندگی چھین کر اس طرح بکھیر رہا ہے کہ وہ خود کو سمیٹنا بھول چکا ہے

..... شاعر کسی چیز کو خوبصورت شاعری بنا دے جبکہ کسی چیز پر یقین نہیں ہے۔ شاعر اور فنکار کا اس میں کیا قصور ہے۔ زندگی کی تیز رفتاری میں۔ راستے میں دونوں جانب تیزی سے دوڑتے ہوئے پیڑ پودے اور کھمبے کون دیکھ سکتا ہے کہ پہچان سکے۔ ...... رفتار کے ہاتھوں انسان کی جو بے بسی ہے اس کا اظہار شاعری میں بھی موجود ہے، اور انسانوں میں بھی ہے۔ اس کے بکھرنے کی آواز اور بکھرنے کی شکل کھو دینے کی کیفیت جدید شاعری میں بھی موجود ہے

مذکورہ بالا اقتباس جو ۱۹۷۱ء کے اداریے سے لیا گیا ہے۔ میں نے مختصر طور پر انہیں جملوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ جن میں مدیر کا نقطۂ نظر سمٹ رہا ہے۔ یہاں ایک بھرپور مقالہ کا اختصار یا تلخیص موجود ہے۔ جو یہ واضح کرانے کیلئے کافی سے بھی زیادہ ہے کہ ہمارے عہد نے بڑی تیزی سے کروٹیں بدلی ہیں۔ قدریں ٹوٹتی بکھرتی رہی ہیں اور بھاگتے ہوئے تیز لمحوں کے ساتھ ہماری زندگی بھی رواں دواں ہیں بے سمت جہت۔ ایسی زندگی کا اظہار جدید افسانوں میں بھی ہے۔ اور شاعری میں بھی۔

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

سچ کا بیوپار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اسے کرنسی میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی تخلیق طمانیت بخش سکتی ہے۔ اس میں کھو کر اپنے آپ کو پایا جا سکتا ہے۔ اس میں دھنسا ہوا جا سکتا ہے مگر اس کی تجارت

کی جاسکتی ۔ فرمانروائے وقت کے الفاظ کبھی حاصل
جا سکتے ۔۔۔۔۔ سچ کی تخلیق ماضی بھی ہے حال بھی
ستقبل بھی ۔۔۔ سچ کے گرد کوئی حصار نہیں کھینچ
نہ عصر کا نہ مکان کا ۔ عصری ادب سے بڑھ کر جھوٹ
کے ادب میں کوئی نہیں ہے ۔ جھوٹ سے ادب کا تعلق ؟
پد کہ بعض مرتبہ رفع حجت کے خیال سے یہ کہہ دیا جاتا ہے
ب عصری ہوتے ہوئے ادب ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔ مگر
ہ ادب مفاہمت کا نہیں ہے ۔ تو ان کا نام بھی نہیں
ان حصاروں میں اسے بند کرنے کی نہ کوششیں نئی
اور نہ ان کوششوں کی ناکامی نئی ہے (نومبر ۱۹۸۲)
دیر کی ذمہ داریاں گوناگوں ہوتی ہیں ۔ وہ بیک وقت
کی مختلف اصناف کے فن سے واقف ہونے کے علاوہ
ئے نظریات و تصورات سے واقف ہوتا ہے ۔ اس کی
بلنے میں دبے پاؤں آنے والی تبدیلی اور انقلاب پر
ہوتی ہے ۔ وہ کسی قوم کی بربادیوں کے منشور سے آشنا
طرح ہوتے ہیں بڑی گہری نگاہوں سے نہ صرف دیکھتا
بلکہ اس کا منصفانہ تجزیہ کرتا ہے ۔ یہ عمل ایک ایسی
ش ہے جو فال نیک صورت اختیار کرتا ہے ۔ یہاں یہ
اعتراف کرنا ہوگا کہ مدیر زمانہ کی سمت رفتار اگر ناخوش
ہے تو اس کا روکنا اپنا فرض سمجھتا ہے ۔ علاوہ ازیں
ب میں نئے رجحانات و تحریکات کی صالح مثبت
وں کو رواج دینے اور فرسودہ تخلیقات سے ادبی
دنیا کو پاک رکھنے میں بڑی ہنرمندی اور ہوشیاری
دت دیتا ہے ۔ الغرض وہ ایک ایسا معمار ہے جس میں
تعمیر کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں ۔ اس کی نظر
تر تخلیقات کے ڈکشن اور رنگ پر پڑتی ہے وہ
نظر سے دیکھا اور تنقیدی بصیرت سے مملو ہوتا ہے

یہی وجہ ہے کہ اس کے خیالات خلاؤں میں پرواز کرنے والے
نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس کی تنقیدی بصیرت وہ ہاتھ ہوتے
ہیں جو رہ رہ کر تخلیقات کے مندر کی گھنٹیاں بجاتے رہتے
ہیں ۔

کلام حیدری نے اردو ادب کے مختلف فکری و
فنی تجربوں پر روشنی ڈالی ۔ مختلف رجحانات کا جائزہ لینا
اور عصری ادب کے بارے میں اپنے خیالات ہمیشہ کے
ہمارے نقاد کسی نہ کسی تحریک یا نظریے سے وابستہ ہونے کی
بنا پر اپنے نظریات سے مشکل خیالات پر ملمع چڑھاتے اور
دیگر تحریک و نظریات کی مخالفت کرنے کو جزو ایمان سمجھتے
ہیں ۔ جو قطعی توازن و تناسب سے عاری ہے لیکن کلام
حیدری کی تنقید نگاری کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو تناسب
انداز ملے گا ۔ اور ایسی بصیرت افروز نگاہ جو تخلیق کی زیریں
لہریں اور اصل محرکات تک پہنچ جاتی ہیں ۔

بقول کلام حیدری ANGRY YOUNG
MAN زندگی کے ہر شعبہ میں کی طرح ادب میں بھی ہے یہ مستقبل
کا مالک بھی ہے ۔ اور یہ ماضی سے متنفر حال ناآسودہ ،
اور مستقبل سے مایوس بھی کرتا ہے ۔ بڑا ادب جمالیاتی
تسکین بخشتا ہے ۔ جمالیاتی تسکین کا یہ چشمہ کبھی خشک
نہیں ہوتا ۔ وقت گذر جاتا ہے لیکن چشمہ کا فیض جاری
رہتا ہے ۔ ایسے بے شمار موضوعات ہیں جن پر بے باکی کے
ساتھ رائیں دی ہیں خواہ آپ کلام صاحب کی رائے
سے اتفاق کریں یا نہ کریں ۔ وہ اپنی آراء محض آپ کو خوش
کرنے کی غرض سے پیش کرنا اپنے مزاج کے منافی سمجھتے ہیں

کلام حیدری کا تنقیدی موقف کھلی تفہیمات میں
سامنے آتے ہیں ۔ تفہیمات آٹھ مختلف تنقیدی مقالات
کا مجموعہ ہے ۔ جو مختلف ادبی موضوعات کا اپنی آغوش

میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ سارے مضامین ایک وقت میں
نہیں لکھے گئے بلکہ تقریباً ۔ سالوں کی پیداوار ہے جن کے
کے مطالعہ سے کلام حیدری کے خیالات کے طویل سفر کا اندازہ
ہو سکتا ہے اور اس سفر کے درمیان ان کے نظریات میں جو
تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں ان کا اندازہ ہوتا ہے۔ تنقیدی
مضامین لکھنے والوں کی بھیڑ میں اپنے نقد کی شناخت چھوڑنا
پڑا۔ دور رس اور دقت طلب فعل ہے۔ آج افسانہ اور
شاعری کرنے والوں کی طرح تنقید کی طرف ہر کوئی اس
کا قدم لغزش کھا رہا ہے۔ یہ بوالہوسی ہے۔ حسن پرستی
نہیں۔ اس لئے اعتبار شیوۂ اہل نظر ایک بڑا سوال ہو گیا
ہے۔ کسے اہم ناقد کہا جائے اور کسے دریا میں کہا جائے
جس نے بوالہوسی کی اس نے ایسی زور زوری کی کہ زمانے
نے خوف سے آنکھیں جھکا دیں۔ مگر دل نہ جھک سکا۔ تنقید
اگر تخلیقی فن ہے تو دل گداختہ کی کارفرمائیوں سے نکھر
سکتا ہے۔ اور اس کے حسن کا فروغ بصیرت کی لالکاری
سے ممکن ہے۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

کلام حیدری صاحب ناقد ہونے کے دعویدار
نہیں۔ یہ ان کی منکسر المزاجی کا ثبوت ہے۔ لیکن ان کے
تنقیدی مقالات ان کے بلند موقف اور تنقیدی
صلاحیت کے غماز ہیں۔ جن پر کسی بت یا ازم کا لیبل نہیں
دیا جا سکتا ہے۔ ان کا غایت میلان ترقی پسندانہ رہا ہے
یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ ہر زمانہ کا ادب ترقی پسند رہا ہے
شرط یہ ہے کہ اس میں نظام حیات کے تمام نئے نقوش و
نقوش سمٹ آئے ہیں۔ کلام حیدری نے ہر تخلیقی فن اور
ہر فنکار کے یہاں زندگی تلاش کی ہے اور تاثرات کی

انتہائی کا سلسلہ پایا ہے۔

کلام حیدری کے موقف سے آشنا ہونے کے لئے
تفہیمات کے دیباچہ کو پڑھنا ضروری ہوگا۔ جس میں انہوں
نے واضح طور پر اشارہ کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک الگ
راہ نکالی ہے۔ ایک نئے ڈگر پر چلنے کی کوشش ہے اور بیباک
نقد و تبصرہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"میں نے شروع ہی سے اپنی راہ الگ بنائی ہے وہ
چاہے پگڈنڈی ہی کیوں نہ ہو شاہراہ بنانے کی اہمیت
رکھتا ہوں کہ نہیں یہ فیصلہ کرنا مستقبل کا اور دوسروں
کا کام ہے۔ اپنے انداز نظر اور طریقۂ فکر کو حسین
آئینہ پاتا ہوں۔ تقلید کرنے اور مرعوب ہونے کو ہمیشہ کفر
جانا، عالم کا احترام کرنا، علم کی قدر کرنا اور صاحب نظر
سے متاثر ہونا میرا مزاج ہے۔

تفہیمات کا پہلا مضمون "جوش کی انقلابی شاعری"
کے عنوان سے لکھا گیا ہے جس میں مختصر ترین لفظوں میں
شاعری کے ارتقائی سفر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ واضح
کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حالی کے اثرات کے نتیجے
ادب زندگی کے حقائق کی ترجمانی میں معاون ثابت ہوا۔
لیکن جنگ عظیم کے بعد شاعری وقت کے تقاضوں سے
ہم آہنگ ہوئی۔ اقبال نے نصف اخلاق اور محبت
کا درس دیا ہے۔ اردو شاعری میں گہری فلسفیانہ باتیں
پیش کیں۔ ہندوستان کی بساط سلطنت پر انگریزی
حکام نے اپنے مہرے چن دیئے۔ اور غلامی کی زنجیروں میں
جکڑا ہوا ہندوستان ظلم و استبداد سے گھبرا کر بساط
اور جوش کے یہاں سیاسی رجحانات غالب ہیں۔ لیکن ان
دونوں شعراء کے یہاں بنیادی فرق یہ ہے کہ اقبال کے یہاں
گہری مفکرانہ سنجیدگی ملتی ہے۔ اور حیات و کائنات کے

بلند تصورات نظر آتے ہیں جبکہ جوش کے ہاں انقلاب کا تصور کلام حیدری صاحب کے جوش ملیح آبادی کے انقلابی شاعری کو بلند دقیع اور گہری سنجیدگی سے تعبیر نہیں کیا ہے۔ جوش حالات اور نتائج پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے ان کے یہاں ایک نوع کا تخلیقی ابال ہے۔ جو لفظوں کی گھن گرج کے ساتھ چڑھتا اترتا ہے۔ جوش کے یہاں شاعرانہ فن ان کی سطحی جذباتیت میں مجروح ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ گہری سنجیدگی اور بلند تصور پیش کرنے سے قاصر ہوتے ہیں موصوف جوش کی انقلابی اور رومانی شاعری کے ضمن میں فرماتے ہیں۔

فن کار اپنے فن سے اس وقت تک عوام کو متاثر نہیں کر سکتا جب تک اپنے تصورات کو موزوں جامہ نہ عطا کرے۔ شاعر ہو کر کچھ کہنا چاہتا ہے وہ یقیناً بہت اہم ہے مگر یہ کم اہم نہیں ہے کہ وہ اپنی بات کس طرح کہتا ہے۔ جھنجھلاہٹ اور غصہ سے مل ملا کر جوش کی شاعری کو خطیبانہ رنگ میں اس حد تک غرق کر دیا ہے کہ شعریت مردہ ہو گئی ہے۔ وہ بیان اور انداز بیان انقلاب و شعر میں خوشگوار توازن قائم نہ کر سکے۔ وہ واعظ ہیں۔ باغی ہیں، مگر شاعر نہیں۔

کلام حیدری نے جوش کی انقلابی شاعری پر توجہ صرف کی ہے۔ اور اس نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے کہ جوش کے انقلابی تصورات میں صرف جوش ہے اور کچھ نہیں۔ یہ سچ ہے کہ جوش کی شاعری میں جھنجھلاہٹ اور غصہ کی شدت ہے جو خطیبانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ مگر میں اس بات سے متفق نہیں کہ جوش شاعر نہیں تھے۔ موصوف نے جوش کی شاعری کے ایک گوشہ کی طرف توجہ صرف کی ہے جوش کی کل متاع ذکر و فکر میں ایسی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں جو شاعری کے اعلیٰ نمونوں میں شمار کی جائیں گی۔

بہرکیف کلام حیدری صاحب نے جوش کے اس گوشہ پر خامہ فرسائی کی ہے جس پر جوش کی شاعری کے متعدد حصہ کی اساس قائم ہے۔ اور کئی اہم نکتوں پر نگاہ نقد مرکوز کی ہے و ولی کی غزلوں کی ایک خصوصیت میں موصوف نے ولی کی شاعری کی جس ایک خصوصیت پر زور دیا گیا ہے اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں ولی کی شاعرانہ خصوصیات کا عطر سمٹ آیا ہے۔ وہ ولی کی شاعری میں ہندوستانیت پر زور دیتے ہیں۔

کرشن چندر، منٹو، پریم چند جیسے مشہور و معروف افسانہ نگاروں کے فکری و فنی گوشے پر بڑی عمیق نگاہ ڈالی ہے۔ اور بعض ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو مذکورہ فنکاروں کی تخلیقات کا مطالعہ واضح اور روشن کرتے ہیں۔

"تعبیرات" کے تمام مقالات کا تجزیہ کرنے بعد اس نتیجہ تک پہنچا کہ آسان ہو جاتا ہے ناقد کا اصلی میلان کیا ہے اور ان کے تنقیدی نظریات کیا ہیں۔ کلام حیدری صاحب نے اپنے نظریات میں موقع بموقع تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ یہ تبدیلیاں OPPORTUNISM کے قطعی مترادف نہیں بلکہ خارجی حالات کے تغیرات کے نتیجے میں اردو ادب کی دنیا میں جس قدر تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں اور فکری اور فنی سطح نے جتنی کروٹیں لی ہیں اس کا حسین روپ ہیں۔ کلام حیدری کسی ایک مقام پر رکنا نہیں چاہتے۔ وہ حالات کے ساتھ ساتھ شعراء ادب میں تبدیلی کے بھی قائل ہیں۔ لہٰذا تنقید کے اصول میں تبدیلی کے بھی قائل نظر آتے ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ حالی کے بعد اردو تنقید نگاری میں واقعی اضافہ ہوا ہے۔ اور مختلف رجحانات و



تخلیقی نقاد

ارتضیٰ کریم

کلام حیدری کی ادب میں ایک سے زیادہ فتوحات شامل ہیں۔ اس میں تو کلام ہو سکتا ہے کہ وہ کامیاب صحافی تھے یا ماہر تخلیق کار، افسانہ نگار بہتر تھے یا تنقید نگار۔ ان کی صلاحیتیں سیاسی اداریے لکھتے ہوئے زیادہ اجاگر ہوتی تھیں یا ادبی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے —— لیکن اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک بڑے ادیب اور اہم فن کار تھے۔ ان کی افسانہ نگاری پر ان کی حیات میں بھی کافی لکھا گیا اور یہ سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔ ہندوپاک کے موقر جریدوں میں ان کی تخلیقات بھی شائع ہوتی رہیں۔ اور ان پر لکھے گئے قارئین اور دانشوروں کے اہم ناقدین کے ردعمل بھی سامنے آتے رہے۔ ان کے ناقدین میں پروفیسر قمر رئیس، جناب وزیر آغا، پروفیسر عقیل رضوی ڈاکٹر حسن آرزو، جناب علی حیدر ملک، جناب شہزاد منظر وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ راقم الحروف نے اسی لیے ان کی افسانہ نگاری کی بجائے تنقیدی نگارشات پر گفتگو کرنے کی سعی کی ہے

کلام حیدری کی تنقیدی تحریروں میں تنوع موضوعات شامل ہیں۔ یعنی انہوں نے سیاسی معاملات پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی اور ادبی، سماجی اور ثقافتی صورت حال کا بھی انتقادی جائزہ پیش کیا۔ کبھی کتابوں پر تبصروں کی شکل میں کبھی "آہنگ" یا "مورچہ" کے اداریے میں۔ لیکن ان تمام نگارشات میں ان کی تنقیدی صلاحیتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں اور جو رویہ سامنے آتا ہے، اسے تخلیقی رویہ کا ہی نام دیا جا سکتا ہے ان تمام مضامین پر اس مختصر مضمون میں نہ گفتگو ممکن ہے نہ مناسب کہ سیاست سے میری دلچسپی نہیں اور جہاں ادب میں اٹھنے بیٹھنے والے افراد ان کی ادبی تحریروں سے ہی زیادہ سروکار رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ یہاں ان کی ادبی تنقید کو ہی زیر بحث لایا جائے گا —— ادبی تنقید کے بھی اس بڑے سرمائے کو دو حصوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ ایک تنقید شاعری اور دوسرے "نقد فکشن" یہ تحریریں یوں تو منتشر صورت میں ہیں مگر ان کا بڑا حصہ "تفہیمات" "مزامیر" اور برملا جیسی کتابوں میں یکجا بھی ہو گیا ہے "تفہیمات" ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ وہ مضامین جو انہوں نے ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۸۰ء کے درمیان لکھے۔ اسی طرح مزامیر میں کیا ہے! - یہ اس کتاب کے مرتب سے سنیے:

"میں نے آہنگ سے صرف ان ہی تحریروں کو جو مزامیر

کے عنوان سے خود کلام حیدری نے ادبی موضوعات پر لکھے،
جمع کر دیا ہے اور تاریخیں اس لئے دی ہیں کہ ہر تحریر کا عقبی
منظر بھی قارئین کے سامنے رہے۔"

"برملا" ـــــــ میں کلام حیدری کے وہ تبصرے ہیں
جو انہوں نے ادبی کتابوں پر کئے ہیں۔ مگر یہ تبصرے کتابوں کو
سونگھ کر نہیں لکھے گئے ہیں بلکہ یہ تبصرے کتابوں کی روح تک
اترجاتے ہیں۔ تینتیس کتابوں پر ان کے طویل اور مختصر تبصرے
اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ ادب میں نہ قرابت داری کو روا
رکھتے ہیں، نہ دوستی اور مصلحت کوشی ان کے پاؤں پکڑتی
ہے بلکہ وہ "برملا" اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ اوپر ذکر
آچکا ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں کے بہت بڑے سرمایے
کو دو بنیادی حصوں یعنی تنقید شعر اور تنقید نثر اور تنقید
نثر میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ میں یہاں صرف ان مضامین پر
گفتگو کروں کا جن کا تعلق "فکشن کی تنقید" سے ہے
کہ کلام حیدری خود بھی ایک بامراد افسانہ نگار تھے اور
فسانے کی تنقید سے ان کو خاص شغف بھی تھا۔ اگرچہ ان کا
اولین مضمون "جوش کی انقلابی شاعری" کے عنوان سے تھا
اور اس وقت کے نہایت ہی موقر اور معتبر رسالے "نگار"
میں شائع ہوا تھا جس پر نیاز فتحپوری کا نوٹ بھی تھا۔ نیاز
فتحپوری نے نہ صرف یہ کہ مضمون کی پسندیدگی کا اظہار کیا
تھا بلکہ یہ بشارت بھی دی تھی کہ مقالہ نگار کا مستقبل
محفوظ ہے۔ یہ بشارت بڑی حد تک درست بھی نکلی کہ
کلام حیدری نے "تنقید اور تخلیق" ہر دو میدان میں اپنے
قلم کے جوہر دکھائے۔

کلام حیدری کی تنقیدات کو پڑھتے ہوئے جس بات
کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے وہ یہ کہ وہ کوئی موٹی
مرعوب کن اصطلاحات کا استعمال کم سے کم کرتے ہیں۔

فلسفہ طرازی اور لفظی بازی گری سے گریز کر
نہ تو گنجلک یا پیچیدہ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔۔
نوشابہ حق ۔ (مرتب: مزامیر)

"کلام حیدری کی نثر کی ایک نمایاں
صفت اختصار اور اس کی کاٹ ہے، کہیں بھی
گنجلک نہیں بناتے، بہت ہی آسان عبارتیں
پیچیدہ ادبی نکات کو یوں بیان کر جاتے ہیں کہ
جس کو پیچیدہ سمجھ رہے تھے، وہ اتنا آسان"

فکشن پر کلام حیدری کے مضامین مع
بھی ہیں اور تعداد میں وسیع بھی۔ وہ نہ صرف
بحث کرتے ہیں بلکہ اس موضوع پر لکھی گئی یا دی گ
کی رائے کو بھی زیر بحث لاتے ہیں کسی تنقید نگ
پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے براہ راست متن سے
ہیں اور بڑے تخلیقی انداز میں اپنی بات کہتے ہیں
کھیت جاگے" ـــــ پر انہوں نے جس معروضی
اسلوب میں اظہار خیال کیا ہے وہ اپنی مثال آ
وہ خود ترقی پسند ادیب تھے مگر انہوں نے کرش
کے ہم مسلک یا ہم مشرب ہونے کا خیال نہ ک
غیر جانبدار تنقید نگار کی طرح ان کی فنی کمزوریا
دی کی ۔ کرشن چندر کے اس ناول "جب کھ
پر وامق جون پوری، سردار جعفری اور ظ ا
نے بچ بچا کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مگر
نے اس کے عیوب اور محاسن پر کھل کر لکھا ہے
ناول اور افسانے کے فن ہی زیر بحث آگئے ہیں
اقتباسات ادھر ادھر سے:
"جب کھیت جاگے" سے ہمارے ناو
کوئی اہم اضافہ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ

ملکست وسے کبھی نہیں ابھر سکا ہے۔ . . . ایسا کیوں
ا ہے کہ ایک آمنا بڑا فن کار اپنے گذشتہ خامیوں کو دور نہیں
سکا ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ وہ محنت سے جان چراتا ہے،
نت کی عظمت کا قائل ہونے کے باوجود وہ عجلت سے کے
تقوں کھلونا بن جاتا ہے اور اس کو اس کی ضرورت بھی
با ہے جبکہ اس نے بغیر محنت ہی بقول سرار جعفری عظمت
سرحدوں میں قدم رکھ دیا ہے"۔ حالانکہ اسے بھی
س کا احساس ہے کہ کرشن چندر فنی تقاضوں کو اس میں
ر ا نہیں کر سکا ہے: "اس میں نہ تو اس قسم کا پلاٹ ہے
سے ادب کے کٹھ ملاؤں نے چوکھٹے کی طرح بنا دیا ہے"
می اگر اسے ناول کے چوکھٹے میں رکھ کر دیکھا جائے تو
اس میں نشانہ ہوگا۔"

وامق جونپوری نے مذکورہ ناول کو MARK LAND کہا ہے ان کی باتوں کو سمیٹتے ہوئے اور ناول کے فن پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کلام حیدری نے لکھا ہے کہ سی تخلیق کو ناول کہنے کے لئے چند بنیادی باتیں ہوتی ہیں۔ دل کے کچھ اصول اور ضوابط ہوتے ہیں۔ علم الحساب کی طرح محل ٹھوس تعریف چاہے ادب کی کسی صنف کی نہ ہوسکتی ہو مگر لکیریں تو ہوتی ہیں۔ جن کے اندر رکھ کر کسی تخلیق کو کسی خاص منف ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کو ناول کے فنی معیار پر لصنے والوں کو "ادبی کٹھ ملا" کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔

انہوں نے پوری گفتگو میں استدلال اور تجزیہ سے کام لیا ہے۔ پر تخلیقی اسلوب کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ کلام حیدری تنقید کو تخلیق سے قریب کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ چنانچہ اس مضمون میں بھی ان کا یہ وصف نمایاں نظر آتا ہے ـــ ان کا ایک اور مضمون "منٹو" کے حوالے سے "شاعر" کے خاص نمبر (١٩٩٢ء) میں شائع ہوا تھا، جہاں ترقی پسندی بھی زیر بحث آگئی ہے۔ لکھتے ہیں ـــ جملہ معترضہ کے طور پر یہ کہہ دوں کہ "ارض پاک" کی ترقی پسندی بھی ایک مخصوص ڈھنگ کی ہے۔ اور اسے پچھلی صدی کے اواخر میں بسل ازم سے تشبیہ دینا بالکل بجا ہے۔ کم از کم مجھے نقوش، سویرا، ادب لطیف اور ان کا ترقی پسندی میں دیانتداری اور خلوص نہیں ملتا۔ "ترقی پسند ادب کا ترجمان" ان کے لئے اشتہار کی پرکشش سرخی سے زیادہ معنی نہیں رکھتا یہی وجہ ہے کہ ایسی "مسلمانی" کو "ارض پاک" ہی میں جگہ مل سکتی ہے۔

"مطالعۂ منٹو" میں کلام حیدری کا یہ مضمون انفرادی حیثیت اور غیر معمولی تنقیدی اہمیت کا حامل ہے یہ غالباً پہلی تحریر ہے جس میں منٹو کی شخصیت اور ان کی تحریروں کا معروضی طریقے سے مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ منٹو نے جس نوع کے افسانے لکھے ہیں، سماج کے جس پہلو پر سے جس انداز سے نقاب کشائی کی ہے ان کے حوالے سے منٹو کو ترقی پسند ادیب کہنا، بہت زیادہ مناسب نہیں ہوگا۔ انہوں نے عزیز احمد، آل احمد سرور، ابواللیث صدیقی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ: منٹو کے افسانوں کے موضوعات پر نظر ڈالنے سے اکثر یہ دھوکہ ہو جاتا ہے کہ منٹو کے یہاں غضب کی حقیقت نگاری ہے، مگر دراصل یہ حقیقت نگاری نہیں ہے، اسے زیادہ سے زیادہ واقعیت نگاری کہا جاسکتا ہے۔ منٹو کے موضوعات میں اوباش مرد عیاش عورتیں، رنڈیاں، بھڑوے، کلرک، مزدور، بمبئی، دہلی، فلمی دنیا، بازار، کالج، ہوٹل، چائے خانہ، بچے، جوان، بڈھے، عورتیں ہیں ـــ مگر سب سے جاذب نظر

کا موضوع ہے جس کے بغیر منٹو افسانے کا تصور بھی نہیں
کرسکتا۔ ان تمام کرداروں اور موضوعات پر منٹو کی نظر
جاتی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ گہری نظر جاتی ہے،
کوئی تہہ نہیں چھوٹتی۔ مگر یہ نظر صرف نظر ہے .... دراصل
منٹو کے پاس زندگی کا کوئی مربوط فلسفہ نہیں تھا....
اس نے اپنا کوئی معیار نہیں بنایا۔ کوئی زاویۂ نظر مقرر
نہیں کیا جس کے بغیر فن کار عظمت کی سرحدوں میں داخل
نہیں ہوتا۔" اور صاحب نظر نہیں کہلاتا۔"

یہاں کتنی وضاحت کے ساتھ اور دو ٹوک انداز
میں منٹو پر تنقید کی گئی ہے۔ جو دوسروں سے مختلف بھی
ہے اسی لئے اختلاف کی راہیں بھی کھولتی ہے۔ ایک اور مثال
"پریم چند کے افسانوں پر لکھتے ہوئے جدید افسانہ نگار
عموماً ناک پر رومال رکھ کر گذر جانے کی کوشش کرتے
ہیں۔" انتظار حسین کا کہنا ہے کہ اردو افسانے کو سب سے
زیادہ نقصان پریم چند نے پہنچایا۔ کسی کا خیال یہ ہے کہ
نیا افسانہ نگار پریم چند کی پیروی نہیں کرسکتا۔ کلام
حیدری نے ایسے منکروں کے لئے جو جوابات فراہم کئے
ہیں ان سے نہ صرف پریم چند کی عظمت سامنے آتی ہے بلکہ
خود کلام حیدری کے صاحب کلام ہونے کا ثبوت ملتا
ہے۔ لکھتے ہیں۔

"یہ بات صحیح ہے کہ نیا افسانہ نگار آخر کس
معنی میں نیا ہوگا۔ اگر وہ پریم چند کی پیروی کرتے لیکن
آدم سے اپنی مشابہت سے نہ آدمی انکار کرسکتا ہے
اور نہ پریم چند سے مشابہت سے نیا افسانہ نگار ....،
علیہ السلام کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔ قدس سرہٗ
تکنیکل اعتبار سے صحیح ہوگا۔ معنوی اعتبار سے میں پریم
چند کو مد ظلہ کہوں گا۔"

تنقید کی یہ وہ زبان اور اسلوب ہے جو کلام حیدری
کا خود ساختہ ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ انہوں نے باضابطہ
تنقید نہیں لکھی لیکن ان کے یہاں جو بے پناہ خلاقانہ ذہن
ہے۔ ان کی تنقید کو بے لاگ بنا دیا ہے اور اسے بے کیف
یا خشک ہونے سے بچا لیا ہے۔ ان کے ایک جملے میں ہزارہا
معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جس طرح ان کے افسانوں
میں اختصار رہتا ہے اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں جہاں
معنی آباد ہوتا ہے اسی طرح ان کے تنقید پاروں میں بھی
چبھتے ہوئے جملے اور اچھوتے تراکیب نئے معنی دیتے
ہیں۔ مثلاً پریم چند کے حوالے سے علیہ السلام، قدس سرہٗ
یا مد ظلہ جیسے الفاظ و القاب کا استعمال اردو تنقید
میں عام کہاں ہے؟ راقم الحروف اسی لئے انہیں تخلیقی تنقید
کا نمائندہ نقاد تصور کرتا ہے۔ خورشید الاسلام اور
راہی معصوم رضا کی تنقیدوں میں "تخلیقیت" کا مزہ
اور چٹخارہ ملتا ہے۔ کلام حیدری کی تنقیدی نگارشات
کا تعلق بھی اسی اسکول سے ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ آئندہ
سطور میں ان کی تحریروں کے تجزیئے سے اور شفاف
طریقے سے سامنے آئے گا۔ ان کی تمام تنقیدی تحریروں
کا جائزہ ممکن تو نہیں ہے۔ پر یہاں اردو افسانے کے
تعلق سے چلنے بلکہ چھڑنے والے اس بحث کا ذکر ضرور
کروں گا۔ جب ایک حلقہ افسانے میں حقیقت نگاری، بیانیہ
واقعہ وغیرہ پر زور دے رہا تھا۔ اور دوسرا گروہ ان
تمام جزئیات یا لوازمات کو مسترد کرنے میں یقین رکھتا
ہے۔ ایسے میں کلام حیدری نے اپنے مشہور رسالے
"آہنگ" کا نہ صرف فکشن نمبر شائع کیا بلکہ اس میں
اردو افسانے پر بڑی معنی خیز تحریریں، مضامین اور تجزیئے
کی شکل میں شامل کیں۔ انہوں نے کبھی علامتی تجریدی

اور ناتمام کہانیوں کے افسانے کے نام پر لبیک نہیں کہا چنانچہ انہوں نے شاعر کے افسانہ نمبر (۱۹۵۱) میں جدیدیت کے زیر اثر لکھی جانے والی "افسانہ نما" تحریروں کے متعلق نہایت اہم بات کہی ہے کہ:

"اس میں (یعنی جدید افسانے کے زوال کے بعد جو کہانی لکھی جا رہی ہے) تہذیب آگئی ہے۔ وحشت گھٹ گئی ہے، جہاں تک موضوع کا تعلق ہے گذشتہ آٹھ دس برس میں زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہمیں یہ مان لینا چاہیئے کہ پہلے جو پانی ہم نلوں میں استعمال کرتے تھے۔ وہ FILTERED نہیں ہوا تھا۔ اور جو استعمال کرتے ہیں۔ وہ FILTERED ہے۔ اب ہمیں کم سے کم اتنا تو یقین ہو گیا کہ اس میں کسی قسم کی بیماری نہیں پھیل سکتی، وہ مرض۔ جو محمود ہاشمی اور شمس الرحمٰن فاروقی نے پھیلایا۔ اب نہیں پھیل سکتا۔"

جدیدیت کے نام پر بے ہنگم تحریروں کی بھیڑ بھاڑ کو "وحشت" کا نام دینا UNFILTERED کہنا اور پھر کہانی میں کہانی پن یا بیانیہ کی واپسی کو "تہذیب کی واپسی" تصور کرنا ـــ افسانے کی تنقید کے حوالے سے نہایت اہم باتیں ہیں۔ ان میں تنقید تو ہے ہی تخلیقی اظہار نے رنگ اور روپ کھا کر دیا ہے۔ کلام حیدری نے فکشن کی تنقید کے حوالے سے بھی اپنے اندیشوں اور وسوسوں کا اشارہ کیا ہے۔

(آہنگ (شمارہ جولائی، اگست ۱۹۸۰ء)

میں انہوں نے اس موضوع پر لکھا ہے کہ

"افسانوں یا ناولوں پر جو تنقید یں ہمارے یہاں بہاں آتی رہی ہیں۔ وہ افسانوں اور ناولوں سے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں نہیں ہیں۔ یہ بات ہمارے لئے کچھ ایسی شرم کی بھی نہیں ہے کیونکہ مغربی نقادوں کو بھی یہ احساس ہو چکا ہے۔ کہ جو معیار یا تھیوری انہوں نے فکشن کو پرکھنے کا برتا ہے۔ وہ دراصل فکشن کے لئے نہیں ہے، بلکہ انہوں نے شاعری ہی سے اخذ کردہ تھیوریز کو افسانوں پر بھی لاگو کرنے کی کوشش کی ہے اور یوں وہ فکشن پر زیادتی کرنے کے مرتکب تو ہوئے ہی ہیں۔ افسانے اور ناولوں کو پرکھنے کا کوئی خالص معیار بھی نہیں بنا سکے ہیں۔ مثلاً علامت کا استعمال شاعری میں اور علامت کا استعمال فکشن میں دونوں شاید ایک نہیں! مگر ہم نے کیا یہ ہے کہ شاعری کے توسط سے جو کچھ ہم نے علامت کے ذریعہ پایا ہے۔ اس کی تلاش فکشن میں بھی کرتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ افسانوی ادب پر صحیح تنقید نہیں ہو سکی ہے اور تنقید کا کوئی معیار ہی بن پایا ہے۔۔۔"

کلام حیدری کی کسی بھی تنقیدی تحریر کا مطالعہ ہمیں دو سطحوں پر متاثر کرتا ہے۔ ایک تو اس میں تنقید کا نشتر ہوتا ہے۔ اور ایسی کاٹ ہوتی ہے کہ قاری اور تخلیق کار کسمسا کر رہ جاتا ہے ـــ دوسرے یہ کہ چونکہ ان کی زبان خالص تنقیدی اصطلاحوں سے بوجھل نہیں ہوتی اسی لئے اس میں ایک طرح کی تخلیقی شان "پیدا ہو جاتی" ہے اور وہ اس کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ان کے الفاظ ہیں۔ نقاد کی بدنصیبی دیکھیں ہے۔ وہ دامن جھٹک نہیں سکتا، یہ ہے کہ وہ تخلیق کو ان الفاظ سے مختلف الفاظ کے ذریعہ پرکھتا ہے جو تخلیق میں استعمال کئے ہوتے ہیں۔ تخلیق کے الفاظ اور تنقید کے الفاظ کی "دوری" پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ "دوری" کیا کرتی ہے؟ یکسے تنقید کو متاثر کرتی ہے۔ اور اسے تخلیق سے قربت کی بجائے دوری عطا کرتی ہے۔ ۹، اسی لئے

کلام حیدری نے اپنی تنقید کے الفاظ کو تخلیق کے الفاظ سے قریب کرنے کی سعی کامیاب کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس نوع کے جملے لکھتے ہیں۔

"مجھے اس سے غرض نہیں کہ پریم چند کو کس نے عَلَم بنایا کس نے تعزیہ!"

"ہم مہاتما بنانے کے عادی ہیں۔"

کوئی بات قطعیت سے قریب یا قریب تر کہنے کی اپنے پاس نہ ہو تو سوائے پرشکوہ مردہ الفاظ سے مقبرے بنانے کے چارہ بھی کیا ہے؟

"کیا نقاد کا یہی کام رہ گیا ہے کہ وہ اپنی بہترین خواہشات کا اظہار کرتا رہے؟ اگر ایم اسلم تیسرے درجے کا لکھنے والا نہ ہوتا تو اپنے دور کا عظیم ناول نگار ہوتا۔ اس "اگر" کے بعد تو بہت سی احمقی باتیں بھی "ہونہار" معلوم ہونے لگتی ہیں۔"

کچھ اور مثالیں دیکھئے اور تنقید اور تخلیق کا امتزاج بھی ملاحظہ کیجئے۔"

"حسن عسکری نے منٹو کے مخصوص چونکا دینے والے انداز کو "چونکانے" کے ایک وسیع معنی میں لیا ہے۔ سوویت روس نے مصنوعی سیارہ اچھال کر بھی دنیائے سائنس کو چونکایا۔ مگر اس چونکانے اور شب برات میں کسی راہگیر پر پٹاخہ پھینک کر چونکانے میں جو فرق ہے وہی فرق اعلیٰ ادبی تخلیق اور منٹو کے افسانے کے چونکانے میں ہے۔"

ہر چند کہ وزیر آغا نے پوری کتاب نہ پڑھ کر اپنے صرف چند سطور سے مطمئن ہونے کا نسخہ بھی بتایا ہے لیکن میری تشفی ان کے CAPSULE سے نہیں ہو سکی۔ "

پورا باب پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وزیر آغا نے کتنی ذہنی لیک سوچی کھلی آنکھوں اور قوت ہاضمہ کے ساتھ یہ باب لکھا ہے۔

"محض علم و فضل کے سہارے ایسی کتاب نہیں لکھی جا سکتی۔"

"ماں، ماں کے احساسات کو سمجھ سکتی ہے — بانجھ انداد تخلیقی نقاد کو کیا سمجھے گا؟"

"اقبال کی شاعری کو خانۂ کعبہ کا غلاف اڑھانے والے اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ غلاف کی زیارت کے سوا کچھ حاصل ہی نہیں ہو سکا۔"

یہ جملے اور ایسے جملے نقل کرتے جائیں تو پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ یہاں نہ یہ ممکن ہے اور نہ مناسب مقصد تو یہ ہے کہ کلام حیدری کی تنقید کے اس وصف کی نشاندہی کی جائے اور ان جملوں کے حوالے سے اپنے خیال کو تقویت دی جائے

جو مذکورہ بالا جملوں سے پیدا ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ ایسا وصف ہے جو کلام حیدری کو اردو تنقید میں انفرادیت بھی بخشتا ہے اور بہت دور سے ہی ان کا اسلوب پہچانا جا سکتا ہے۔ شاید انہیں بھی اس کا احساس رہا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے "تفہیمات" میں لکھا ہے کہ۔

"میں نے شروع سے ہی اپنی الگ راہ بنائی ہے وہ چاہے پگڈنڈی ہی کیوں نہ ہو۔ میں شاہراہ بنانے کی اہلیت رکھتا ہوں کہ نہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مستقبل کا اور دوسروں کا کام ہے۔ میں اپنے انداز نظر اور طریقۂ فکر کو تجسس اور تشکیک آمیز پاتا ہوں۔"

سچ تو یہ کہ کلام حیدری جس تخلیقی ذہانت کے مالک تھے ان کا مطالعہ جتنا وسیع تھا تنقید کے مفہوم سے

(باقی ۲۴۶ پر)

کلام حیدری اور اُنکے افسانے

(گولڈن جوبلی کی روشنی میں)

بدر اورنگ آبادی

"کلام حیدری ہندو پاک کے چند معتبر افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔"

"یہ تو مبالغہ آرائی ہے، ان کی کہانیاں بس غنیمت ہیں"

"کلام حیدری ایک اچھے صحافی ہیں۔"

"نہیں بھائی۔ کلام حیدری نہ کامیاب افسانہ نگار ہیں اور نہ اچھے صحافی۔"

یہ باتیں ہوتی تھیں کلام حیدری کی زندگی میں، اور
ب جب کہ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے تو ہمیں حقیقت
ستجو کرنی چاہئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسانی زندگی
تقریباً ہر شعبے میں جس طرح کوئی نہ کوئی مسئلہ متنازعہ فیہ
تا ہے اسی طرح فن اور فنکار بھی متنازعہ فیہ رہے ہیں۔
ل کے متعلق کلیم الدین احمد اور رشید احمد صدیقی صاحبان
خیالات میں تعلیمین کا فرق ایک روشن مثال ہے عجیب
اق ہے کہ کلام حیدری کا نام اس تنازعہ میں سرفہرست تھا
ی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ "کھلیان"
سلاخیں"، اور "سچی جیسی کہانیاں لکھنے والے سے "گولڈن
لی" جیسی کہانی کی توقع نہیں کی جا سکتی حالانکہ یہ ایک
امفروضہ ہے۔ اس بنیادی بات کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا
کہ کس طرح ہر شاعر کے سبھی کلام معیاری نہیں ہو سکتے، ہر
آرٹسٹ کی سبھی تصویریں یکساں طور پر کامیاب نہیں
ہو سکتیں۔ اسی طرح ہر افسانہ نگار کی تمام تخلیقات میں
یکساں بلند معیار کی تلاش بھی بے سود ہے۔ کیا میر و غالب
کے دیوان میں صرف بلند پایہ کلام ہی ملتے ہیں؟ "شکست"
اور "ان داتا" کا خالق "ایک گدھے کی سرگذشت"
بھی لکھ سکتا ہے؟ لیکن پھر بھی فنکار کی عظمت برقرار رہتی
ہے۔ ایک تخلیق کار کی کامیابی کا راز اس میں مضمر ہے کہ
فن کو برتنے میں کوئی ڈھیل نہیں ہو، تکنیک میں کمزوری
نہ آنے پائے، اسلوب کی آب و تاب میں پھیکا پن نہ آ جائے
تجربہ کی پختگی کے ساتھ اجزا سازی میں کساؤ موجود رہے۔
واقعات کے اظہار میں دیانت برقرار رہے۔ اور قلم پر گرفت
مضبوط تر ہو۔ آئیے گولڈن جوبلی میں شامل افسانوں کی
روشنی میں ہم دیکھیں کہ ان تخلیقات نے قارئین کو مایوس کیا
یا ان سے امیدیں پوری ہوئیں۔

"اپنی زندگی کے کچھ سچ" کے تحت کلام حیدری
نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو جس دیانت داری سے
بیان کیا ہے اس کی ہمت شاید بہت ہی کم لوگوں میں ہو
—— میٹرک پاس کر لینے کے بعد انہیں ایک دوست
نے خط پر خط لکھ کر کلکتے بلا لیا۔ اور وہ دو سال تک اس کے

ساتھ اس طرح رہے کہ "حساب دوستاں دل سے کبھی باہر نہیں ہوا"۔ (ص ۱۶۷) اور ستمبر ۴۷ء میں رنگ پور (سابق مشرقی پاکستان) اسٹیشن کے ٹھیک سامنے مشرقی بنگال کے قاعدے سے بانس کی دیواروں اور پھوس کی چھاونی کے ساتھ ایک ریسٹوران کھولا۔ (ص ۱۶۹) اس پس منظر میں اور اس زمانہ کے مزاج کے پیش نظر یہ کوئی متعجب کی بات نہیں، کہ کلام حیدری نے اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شریک ہو کر اس کی کارروائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور نتیجتاً ۲۴ اور ۲۵ جنوری ۱۹۵۰ء کی درمیانی رات میں "اپنے آپ کو پولیس کی حراست میں پایا رانچی جیل ...... سیاسی قیدی بنا کر نہیں رکھا گیا، بلکہ سیل میں بند کر کے رکھا گیا"۔ (ص۔۷۱) یہ ایسے واقعات ہیں جن کے نقوش کسی بھی حساس دل پر بڑے گہرے اور بہت دیرپا ہوتے ہیں۔ کلام حیدری اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ایسے ہی زخمی دل سے نکلی ہوئی کہانیاں ہیں "رات کتنی باقی ہے"، "وہ مکان" اور "بابا کہاں ہو؟" ـــــ

ان کہانیوں کے واقعات نئے نہیں، اور نہ ہی کردار ان جانے ہیں لیکن ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد جو تاثر مرتب ہوتے ہیں ان سے قاری کے دل میں کانٹے چبھنے لگتے ہیں اور یہ ہے فنکار کا کمال ـــــ "حمید بابو" جیسے زمیندار اور "گنگو" اور "گوپی" سے کون واقف نہیں اور اس بات سے بھی لوگ ناواقف نہیں کہ اسی تکون سے "رمیش بابو" جیسے لوگ اور "کسان دل" جیسی تنظیمیں جنم لیتی ہیں ـــــ یہ ہے کلام حیدری کا اسلوب جو انہیں دوسرے افسانہ نگاروں سے ممیز کرتا ہے۔

ـــــ اور پھر وقت ایسا بھی آیا کہ وہ کلام حیدری جو کبھی کمیونسٹ پارٹی کے روپوش کامریڈ تھے، جو کبھی کلکتہ کی کھولا باڑی میں رہتے تھے اور جنھوں نے ۱۹۴۹ء کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس (منعقدہ بھیونڈی) میں مندوب کی حیثیت سے شرکت کی تھی، کارو بار اور صنعت کی دنیا میں آگئے ـــــ ایرکنڈ کمروں میں رہنے لگے، کار کے بغیر کہیں جانا محال ہو گیا فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام کرنے لگے۔ خارجی طور پر بدل گئے لیکن ان سے قریب رہنے والے لوگ جانتے ہیں کی داخلی کیفیت نہیں بدلی۔ اور نہ ہی جذبۂ ہمدردی آئی۔ آڑے وقتوں میں وہ کس کس کے اور کیسے کیسے کام آ یہ الگ کہانی ہے۔ ان کے اندر بیٹھا ہوا انسان اور دونوں ایمانداری برتتے رہے۔ ننھیال کی صرف بڑی "اختر منزل" ہی یاد نہیں رہی بلکہ قصبہ کے محلہ لوٹش ہر مکان کی ایک ایک اینٹ یاد رہی۔" جلبیسر گھنگھ کا شہر ہے اور ان گھنگھروؤں کی موسیقی آج بھی میرے میں گونجتی رہتی ہے"۔ (ص ۱۶۲) میں اس کمرے کو ڈھ ہوں جس میں میری نانی اماں مجھے رضائی میں سلاتی تھیں گرم گرم بھوبل والی بورسی میں مرغی کے انڈے بھون کے کھلا دیتی تھیں"۔ (ص ۱۲۰) اگر کلام حیدری دیانت دار نہ ہوتے تو کہانی "کون پہچانے؟" وجود میں نہ آتی سوہان روح یادوں کی اذیت ناکی بیان کرتے ہیں ورنہ نہ ہوتی جو اس افسانے کے جملے میں سموئی ہوئی۔

"جس کے پاس کھنڈر نہ ہو وہ اپنی جڑیں تلاش کرتا پھرتا ہے اور اس کے بدلے میں اسے ریال ملتے ہیں۔ ڈالر ملتے ہیں، ..... اجنبی ملتے ہیں اکھڑے ہوئے پیڑ کی شاخوں کو ..... (ص۔۱۱۸)"

"خان بہادر مشتاق احمد ملک کے مکان کے کھنڈروں میں کبوتروں کے جھنڈ رہتے ہیں ـــــ ٹوٹی چھتوں اور پھٹے ہوئے فرشوں میں سانپ رہتے ہیں۔ اور ان کی اولاد۔

ریال کماتی ہے

پونڈ کماتی ہے!
ڈالر کماتی ہے!
اور وہ کسی امریکی کی طرح اپنے پردادا کے بارے
میں کوئی علم نہیں رکھتے۔ (ص ۱۱۹)

اچھی نثر اور طرز نگارش کے بغیر ہر تخلیق بے لباس رہتی
ہس کی تزئین اور آرائش کے لئے ضروری ہے کہ تخلیق کار کا
ن سوچنے والا ہو۔ فکر کرنے والا ہو اور اس کے قلم میں ہنرمندی
بھی یہ ممکن ہے کہ ایسے الفاظ منتخب کئے جا سکیں جو سادگی
وجود ایسے سلیس ہوں کہ قاری کے دل و دماغ پر چھا جائیں
لیق کار جو کہنا چاہتا ہے اس کا ایک منظر نامہ تیار ہو جائے
یدری کو الفاظ کے استعمال پر قدرت و تونگری حاصل
۔ انہیں لغت سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ثقیل الفاظ نکالنے
ضرورت پیش نہیں آتی تھی بلکہ وہ بہت معمولی الفاظ کو
ا ایسی سچویشن میں اس ڈھنگ سے استعمال کرتے تھے
نے پیکر تراش کر رکھ دیتے تھے: "ایک سال اور راستے
ہٹا" کا یہ چھوٹا سا اور عام جملہ —— "غروب ہوتے
ئے سورج عجلت میں ہوتا ہے جیسے طلوع ہونے پر سرشار
ور جلدی سے ڈوب جانے کے لئے مضطرب ہو" (ص ۱۳۴)
برداشت کرنے سے انکار لیکن جبر کو ختم کرنے کی صلاحیت
فقدان کو جس عجیب و غریب ڈھنگ سے پیش کرتا ہے
اپنی مثال آپ ہے۔ "بابا کہاں ہو؟" کے دو جملوں میں
ن کا ایک جہان آباد ہے "اے عزیز! تم نے عبرت کو اپنے
ر داخل کر لینے کے لئے ذہن کے دروازوں کو کھلا رکھا ہے
یں؟" (ص ۱۳۲) اور کل کی فکر کرنے والے کو ناشکرا کہا
لیا ہے۔

"تلاش اور جستجو کرنے والے کو ——
سوال کرنے والے کو پاگل خانے بھیج دیا جاتا ہے

زندگی کی اذیتوں کو مختلف فن کاروں نے مختلف
رنگ میں پیش کیا ہے اور ان کربناکیوں کا گراف مختلف
النوع پیرائے میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ لیکن جو حریری لباس
کلام حیدری نے عطا کیا ہے وہ ان کے قلم کی چابکدستی اور
ان کی ہنرمندی Craftsmanship کا ثبوت ہے۔
—— اور "درویش کی صدا ..." ملک
کے تاریخی سانحہ کو فن کا وہ روپ عطا کیا ہے کہ اس عہد کا
سارا کرب رگ و پئے میں گھلتا نظر آتا ہے:

"دیکھنے میں دو بھائی کے محض دو حصے ہوئے
مگر دراصل تین ہو گئے ..... پھر ایسا ہوا کہ
تم نے ہم نے محض دس سال پہلے دیکھا کہ تیسرا
حصہ خود بخود الگ ہو گیا اور لفظ قانون کو
صفت کی ضرورت پڑ گئی ...... قانون
جب تک قانون رہتا ہے تو انسانیت
کچھ نہ کچھ زندہ رہتی ہے ..... مگر قانون
میں کوئی دوسرا لفظ جڑ جاتا ہے تو وہ قانون
باقی نہیں رہتا کیونکہ ایسا کرنے والے افراد کو
ہنستے بولتے دیکھنے کو پسند نہیں کرتے"

خون دل میں ڈبوئے ہوئے قلم سے کلام حیدری نے ان
زہرناکیوں کی تصویر کشی اس پیرائے میں کی ہے کہ ہر لمحہ کا ہر واقعہ
تیر کی مانند سرعت کے ساتھ تو نہیں لیکن دھیرے دھیرے
دل میں اترتا جاتا ہے اور پھر کسک سی محسوس ہوتی ہے۔
اور یہ کسک بڑھ کر برچھی کی انی کی شکل لے لیتی ہے اور
قاری تڑپ کر رہ جاتا ہے: "..... کاش کوئی درویش کوئی
فقیر، خود کو نفرت کی آگ میں ڈال کر ٹھنڈک تقسیم کرتا ...
ہاں! ایک ایسا درویش تھا لیکن" اس درویش کی دی
ہوئی خوشگوار ٹھنڈک کے عوض ہم اپنے عہد کو کیا دے رہے ہیں

حساس مگر کومل دل کی ترجمان ہے تو دوسری طرف فن افسانہ نویسی پر ان کے عبور کی آئینہ دار ہے۔ اسے فراموش کردینا آسان نہیں۔

کیا یہ حیرت اور افسوس کی بات نہیں کہ ان تمام خوبیوں کے باوصف تین افسانوی مجموعوں کے خالق اور ایک معتبر ہفتہ وار اور ایک قابل قدر ماہنامہ کے مدیر کا کشکول خالی ہی رہا اور کلام حیدری کا کوئی مقام متعین نہیں ہوسکا۔؟ آخر کیوں؟ اس کی وجہ زبیر رضوی نے اپنے ایک خط میں بڑی خوبصورتی سے بیان کی تھی کہ کلام حیدری دھوپ میں کھڑے نہیں ہوسکتے۔ لیکن کون سی دھوپ؟

زبیر رضوی کے ذہن میں کون سی دھوپ تھی یہ تو وہی جانیں لیکن میرے خیال میں یہ دھوپ تھی ان ادبی گروہوں کی جنھوں نے تخلیق کاروں کا قد بڑھانے اور گھٹانے کا ذمہ اٹھا رکھا ہے۔ یہ کلام حیدری کی وضعداری تھی کہ انہوں نے مانگے کے اجالے سے خود کو اخیر دم تک محفوظ رکھا...... اگر کبھی کسی نے اپنے اوپر سے کلام حیدری کا قرض اتارنے کی کوشش بھی کی تو اسے ذدک دیا گیا اور میں ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ لوگ قرض ادا کر سکتے تھے لیکن لوگ کترا گئے اور کلام حیدری کے لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ مدھم نہیں ہوئی۔ لوگوں کو وہ بونے نظر آئیں تو آئیں لیکن کلام حیدری کی انفرادی شخصیت لکڑی کی ٹانگیں لگواکر ڈنڈی بجانا برداشت نہیں کرسکتی تھی یہ ان کی انا کا مسئلہ تھا۔ ان کی شخصیت اور ان کا فن دونوں ہی مزید توجہ کے مستحق ہیں۔

بقیہ: کلام حیدری اور ان کے افسانے

وہ جس قدر دروا قف تھے، اس کے نتیجے میں وہ ادب میں شاہراہ بنانے کی ہی اہلیت رکھتے تھے۔ اور بڑی حد تک انہوں نے ایسا ہی کیا بھی۔ پس وہ صد درجہ مصروف انسان تھے۔ ادبی اور صحافتی نوعیت کے دو دو رسالے کو شائع کرتے رہنا، اشاعتی ادارے کی حیثیت سے دوسرے ادیبوں کی کتابیں چھاپنا، سیاسی اور سماجی سطح پر مقامی اور صوبائی کارگذاریوں میں عملی طور پر شریک کار رہنا، اور ان سب کے علاوہ "مختلف تجارتی ذمہ داریوں" کی نگہداشت کرنا۔ کوئی کار آسان تو نہیں تھا۔ اگر وہ صرف ادب سے سروکار رکھتے (جس کی وہ بار بار کوشش بھی کرتے تھے)، تو یقیناً ایسی شاہراہ فراہم کرتے جس پر آج کا اردو ادب گامزن رہتا۔ دیکھئے کتنی حسرت سے وہ اپنی تمنا کا اظہار کر رہے ہیں:

"اپنی عدیم الفرصتی کو روتا ہوں کہ اب تک یک موضوعی تنقیدی کتاب اردو کو نہیں دے سکا ...... بعض ایسے موضوعات ہیں جن پر کتاب لکھنے کے لئے طبیعت مچل مچل جاتی ہے، لیکن ہائے رے غم روزگار!"

کلام حیدری نے "غم روزگار" میں گھرے رہ کر بھی اردو ادب کو بہت کچھ دیا۔ افسانے میں تو ان کا مقام محفوظ ہے ہی۔ اردو تنقید میں بھی ان کی اہمیت اور انفرادیت مسلم ہے کہ وہ اردو کے تخلیقی نقاد تھے۔

کلام حیدری بحیثیت مبصر

ابن کنول

یوں تو کلام حیدری کی شناخت افسانہ نگار
سائی کی حیثیت سے نمایاں ہے لیکن اگر ان کی قلمی خدمات
ائزہ لیا جائے تو بحیثیت مبصر بھی ان کا علیحدہ مقام
سکتا ہے۔ تبصرہ تنقید ہی کی ایک مختصر شکل ہے عموماً تبصرہ
رسائل کے کالم کو بھرنے کے لئے کتاب پر سرسری نگاہ ڈال
ب بندھی ٹکی یعنی تعریفی و توصیفی رائے دیدیتے ہیں۔
طرح اس رسالہ کا کالم بھر جاتا ہے۔ اور صاحب کتاب
وش ہو جاتا ہے۔ تبصرہ کا لہجہ اس وقت تلخ بھی ہو جاتا
جب مصنف اور مبصر کے تعلقات ہموار نہ ہوں۔
صورت میں سرورق سے لے کر کتابت تک انتہائی
یاد کھائی دینے لگتی ہے۔ جبکہ ہونا یہ چاہیئے کہ کیونکہ تبصرہ
ب کا تعارف ہوتا ہے۔ اور کسی بھی چیز کا تعارف ایماندارا
" چاہیئے۔ کلام حیدری کے تبصروں میں ایماندارانہ اثر
لتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی کتاب تبصرہ کرتے ہوئے پتہ
ا کیوں میرے ذہن سے ساری باتیں غائب ہو جاتی ہیں۔
سلم گرچہ میرے ہاتھ ہوتا ہے مگر لے سپچ اپنے قبضے میں لے کر
تا ہے۔ تمام باتیں غائب ہوتا ہے مراد یہ ہے کہ تبصرہ کرتے

اور سچائی کو ابھارا جاتا ہے۔

کلام حیدری جس طرح کہ زندگی میں بے باک اور نڈر
تھے۔ اسی طرح اپنے تبصروں میں بھی نظر آتے ہیں بسلالان
کے ادبی تبصروں کا مجموعہ ہے جس میں اکتیس تبصرے شامل
ہیں۔ ان میں ناول بھی ہیں غزلوں اور افسانوں کے مجموعے بھی
تنقیدی اور تحقیقی کاوشیں بھی ہیں۔ اور ادبی رسالے بھی
بعض کتابوں اور رسالوں پر کلام حیدری نے بہت تفصیل
سے گفتگو کی ہے۔ یعنی کتاب اور رسالے کے ایک ایک
مضمون پر تبصرہ کیا ہے۔ ان کا تبصرہ پیشہ ور ناقد کا تبصرہ
نہیں بلکہ ایک ذہین قاری کا تبصرہ ہے۔ انہیں اپنے ناقد
نہ ہونے کا اعتراف ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ

"تنقید میرا میدان نہیں ہے۔ مگر تنقیدوں
کو پڑھ کر متاثر ہونا یا نہ ہونا میرا حق ضرور ہے
تاثرات کو کبھی کبھا لکھ ڈالنا میری مجبوری ہے
کیونکہ تاثرات شدید ہوتے ہیں اور یہ میری خواہش
ہوتی ہے کہ میرے تاثرات دوسروں تک
پہنچیں۔ اگر تنقید سے مجھے ادب کے دامن

ہو کر ادب کا تخلیق کرنے والوں کو پکار کر کہہ
دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس آگ سے اپنے
کا دامن بچاؤ ورنہ تخلیق مر جائے گی۔ ظاہر
ہے اس بات میں ایک خطرہ بھی ہے۔ کہ میرے
تاثرات کسی کو پسند نہ آئیں۔ خصوصاً ادب
کی تخلیق کو فلیتہ لگانے والے نقادوں
کو جو جملہ بازی کو تنقید کا بدل سمجھ کر میرے
تاثرات چھپا کر کے دل ہی دل میں خوش
ہو لیتے ہیں۔ مگر ادبی دنیا میں ان کو داد نہیں ملتی"

کلام حیدری کو اس بات کا علم تھا کہ ان کے تاثرات
تنقید لکھنے والوں کو پسند نہیں آتے۔ کیونکہ وہ نقادوں کو
ادب کے پیچھے لاٹھی لے کر پھرنے والا سمجھتے تھے۔ ان کی نظر
میں ناقدین کے وضع کردہ اصولوں سے تخلیق کاروں کو کوئی
فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ قاری کو کچھ فائدہ حاصل ہو تو ہو
بقول ان کے اگر ذہین قاری نہیں ہے تو نقصان بھی پہنچ جاتا ہے

کلام حیدری صاحب کسی کتاب پر تبصرہ کرتے تھے
تو وہی کچھ بیان کرتے تھے جو ان کا دل کہتا تھا۔ ان کے
تبصرے کی تمہید ہی کتاب اور مصنف پر تبصرے کا کام کرتی
تھی۔ ان کے انداز میں بڑا تیکھا پن تھا۔ ایک کتاب پر
تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" اس کتاب پر تبصرہ لکھنا آسان ہے کیونکہ فلیپ پر
کتاب اور مصنف دونوں کے بارے میں بطور پیشگوئی کچھ لکھا
دکھا گیا ہے۔ یا لکھوایا گیا ہے۔ مثلاً اردو غزل کی تاریخ میں
اس کتاب کو ایک کلاسک کا درجہ ملے گا۔ ایسی پیغمبرانہ پیشین
گوئی کے لئے راقم الحروف کے پاس نہ کوئی سند ہے اور نہ اتنا
حوصلہ۔ مگر ادب کے طالب علم کی حیثیت سے اس جملے کا مفہوم
سمجھنا چاہا تو محسوس ہوا کہ اس کے لئے پہلے کلاسک کے معنی کی
تلاش کرنی ہوگی۔ پھر مزید غور کیا تو عقل نے جواب دے دیا۔
اور اردو غزل کی تاریخ میں تو وہی کتاب کلاسک [illegible]
بن سکتی ہے۔ جو غزلوں کا مجموعہ ہو۔ یہ کتاب تو سرمایۂ
غزل کا جائزہ اور تنقید ہے ۔۔"

کلام حیدری دراصل بنیادی طور پر افسانہ نگار
اور تخلیق کار کے لئے غلطیاں ناقابل برداشت تھیں۔ وہ
معاشرہ کی برائیوں کا حساب کرتا ہے۔ ان پر تبصرہ کرتا ہے
جب کلام حیدری کسی کتاب پر تبصرہ کرتے تھے تو شمشیر بر
جاتے تھے کلام حیدری کے تبصرے کتاب سونگھ کر یا
لکھا جانے والے تبصرے نہیں بلکہ کتاب پڑھ کر ردعمل کا
اور ردعمل اچھا برا دونوں طرح ہو سکتا ہے ردعمل کی شدت
کے تقریباً سبھی تبصروں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مظفر
افسانوی مجموعے "دو غنڈے" نہلن کا تبصرہ قابل توجہ
اس تبصرے کی تمہید خاصی طویل ہے۔ لکھتے ہیں

" اردو میں مختصر افسانے کی قسمت بھی شاید
غزل سے ملتی جلتی ہے۔ شاعری جس نے شروع کی
غزل سے شروع کی جس نے کچھ نہ کیا اس نے غزل
کہی۔۔۔۔۔ ذرا سی اردو آئی غزل بھی آگئی
ٹھیک اسی طرح اردو میں مختصر افسانہ بھی ہے
جس کو غزل کے بعد نثر لکھنے کا شوق ہوا اس نے
مختصر افسانہ جھاڑ دیا۔ ایک سے ایک بھی ایک
سے ایک کند ذہن اور ایک سے چلتا پرزہ
جو دو صفحے صحیح اردو نہ لکھ سکا اس نے بھی
ایک دو درجن مختصر افسانے لکھ مارے۔"

اس طرح کی تمہید سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ رد
قدر شدید ہے اور تبصرہ میں آگے کیا کہا گیا ہوگا۔
و ڈسٹ کور کے اندرونی حصے پر فراق گورکھپو
رائے درج ہے مختصر افسانوں پر فراق کی رائے دلچسپ
جیسے میری رائے استاد فیاض خاں کے گانے کے

تا ہے بے معنی بھی اور نامعتبر بھی۔"

اس مجموعے میں کرشن چندر کی رائے بھی شامل ہے
یدری نے کرشن چندر کی رائے کے متعلق لکھا ہے
رائے سے مظفر حنفی کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں
سکتی ہے۔ کرشن چندر کی اس بات سے کہ مظفر حنفی کی بات
منے آتی ہے۔ اور افسانے کی تخلیق کے سارے لوازم معلوم
"کلام حیدری نے اپنے ردعمل کا اس طرح اظہار کیا ہے۔
"سوال لازم کے جاننے کا نہیں ہے۔ ان کو برتنے کا ہے
کے لوازم کس کو معلوم نہیں؟ مگر جائے بنانا کتنے لوگ
تے ہیں۔"

دراصل کلام حیدری فلیپ یا پیش لفظ کی صورت
گئی ناقدر کی رائے کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے ایک
ری مجموعے "کائنات غم" پر دی گئی رائے پر اس طرح
کرتے ہیں۔ پروفیسر عطا کاکوی کی رائے ہے۔
"کلام حیدری میں تغزل کے تمام عناصر موجود ہیں"
"مطالعہ کلام سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر روایتی نہیں۔
بلا جھجک۔ واردات دلی کا اظہار کرتا ہے۔"
کلام حیدری کا ان جملوں پر تبصرہ یوں ہے۔
"ایسا لگتا ہے کہ جس طرح کسی کیمیاوی مرکب کے
عناصر ہوتے ہیں ویسے ہی تغزل کی بھی مقررشدہ تعداد
عناصر ہوا کرتے ہیں۔
"یعنی اگر شاعر روایتی ہوتا تو اس میں کچھ بوجھ ہوتی
ات دلی کا اظہار نہ کرتا"

یہ بات میں کہہ چکا ہوں کہ کلام حیدری ناقد نہیں بلکہ
تحریر یا ان کا ردعمل ہے۔ انہیں اپنی صاحب نظری کا
نہیں تھا کہتے ہیں کہ صاحب نظر کہہ کر وہاب اشرفی نے
شرمندہ کیا ہے۔ کہیے دیکھئے کہاں کلام حیدری اور کہاں
صاحب نظر میں تو ایک گت ری کی طرح ہوں جس سے صاحب
نظر لوگ محبت کرتے ہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے میں کتنا
خوش نصیب ہوں کہ مجھے ان کے بیچ میں رہ کر کچھ سیکھنے
کا موقع مل جاتا ہے۔ وزیر آغا کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے
لکھا ہے کہ "وزیر آغا کی کتاب "تصورات عشق و خرد اقبال
کی نظر میں" واحد کتاب ہے۔ جو مجھے متاثر کر سکی ہے۔ میرا متاثر
ہونا کوئی سند نہیں ہے۔ مگر میرے لئے مسرت کی بات ضرور ہے
کہ عزیز احمد کی کتاب اقبال نئی تشکیل کے بعد اس کتاب نے
مجھے متاثر کیا۔ کتاب پڑھ کر یہ محسوس کیا کہ میں کتاب پڑھنے
سے قبل جو تھا وہ کتاب پڑھنے کے بعد نہیں ہوں مجھ پر کچھ
انکشافات ہوئے ہیں۔"

یوں تو تبصروں کی تنقید بھی فلیپ یا پیش لفظ
میں دی گئی رائے کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن بعض مبصرین
انتہائی سنجیدگی اور دیانت داری کے ساتھ تبصرہ کرتے
ہیں۔ صحیح معنوں میں تنقید وہی ہے جو سنجیدہ قاری کسی
کتاب کو پڑھنے کے بعد فوری ردعمل کے طور پر پیش کرے
کلام حیدری بھی ان سنجیدہ قارئین میں سے ایک تھے۔

"کلام حیدری صاحب کے بارے میں یوں تو بہت سے
مضامین لکھے گئے ہیں اور متعدد کتابوں میں ان کا تذکرہ کیا
گیا ہے مگر دو کتابیں خاص طور پر ان کے فن پر لکھی گئی ہیں
کلام حیدری کی افسانہ نگاری اور اردو کے تحقیقی افسانے ثانی
الذکر کتاب میں اس کے مصنف ڈاکٹر محسن کرمزو نے علم الاعداد
کی روشنی میں کلام حیدری کے افسانوں اور ان کی شخصیت کا
مطالعہ کیا ہے یہ ایک منفرد اور اپنی نوعیت کا نہایت
دلچسپ مطالعہ ہے۔" (کلام حیدری کے اعزاز میں مجلس
احباب ملت ناظم آباد کراچی کے ایک جلسے کی رپورٹ)

افسانوں کے فروغ میں کلام حیدری کی خدمات

سید احمد قادری

اردو ادب میں کلام حیدری کی شناخت ایک کامیاب افسانہ نگار اور ایک بیباک صحافی کی حیثیت سے ہے اور ان دونوں حیثیتوں سے کلام حیدری نے اردو افسانوں کے فروغ میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کلام حیدری بنیادی طور پر ایک فنکار تھے۔ اور اپنی ادبی زندگی کا آغاز انہوں نے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا تھا۔ پہلا افسانہ "بھابھی" کے عنوان سے ۱۹۴۶ء میں ماہنامہ "جدید اردو" (کلکتہ) کے ایک شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اور یہ سلسلہ انتقال سے چند روز قبل تک جاری رہا۔

کلام حیدری کو خود اپنی افسانہ نگاری کے سلسلے میں ابتدائی زمانہ ہی سے بڑا اعتماد اور بھروسہ تھا۔ فروری ۱۹۵۵ء میں مطبوعہ اپنے پہلے افسانوی مجموعہ "بے نام گلیاں" کے پیش لفظ "باتیں" کے تحت لکھتے ہیں۔

"اگر کہانیوں میں سچ مچ کوئی حسن ہوگا تو یونہی اپنا خراج وصول کرلیں گی۔ اس کا مجھے یقین ہے۔"

"بے نام گلیاں" (۱۹۵۵ء) کے بعد کلام حیدری نے کل تین افسانوی مجموعے "صفر" (۱۹۷۵ء) "الف لام میم" (۱۹۷۹ء) اور "گولڈن جوبلی" (۱۹۸۳ء) شائع ہوئے۔ ان تمام افسانوی مجموعوں کے بیشتر افسانے ایسے ہیں جو ادبی رسالوں اور ادبی محفلوں میں موضوع بحث بنے ہیں۔ میں اس بات کا بھی اظہار کرتا چلوں کہ کلام حیدری کے افسانوں میں ہمارے نقادوں نے اتنی توجہ نہیں دی۔ جتنی توجہ کے وہ مستحق تھے۔ وجہ اس کی۔ کلام حیدری کی ہمیشہ نقادوں اور اردو کے بعض استادوں پر طنزیہ بلکہ کبھی کبھی ہتک آمیز جملے جو بظاہر سچ معلوم ہوتے ہیں لیکن ہر سچ کا اظہار نہیں کیا جا سکتا اور اسی سچ نے کلام حیدری کے فکر و فن کے تجزیے سے نقادوں کو دور رکھا ہے۔

کلام حیدری حساس فنکار تھے۔ اور انہوں نے اپنے اردگرد کے بدلتے ہوئے حالات، ظلم و ستم اور استحصال کو دیکھا اور شدت سے محسوس کیا اور ان ہی محسوسات نے اس فنکار کے کئی نمائندہ افسانے

لکھوائے اور قاری کو نہ صرف متوجہ کیا۔ بلکہ چونکایا بھی ہے۔

سہیل عظیم آبادی کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ "تہذیب" (پٹنہ) میں کلام حیدری کی کہانی کھلیان اور سلاخیں شائع ہوئی۔ تو بحیثیت قاری رضیہ سجاد ظہیر کو نہ صرف چونکایا بلکہ افسانہ کے ایک ایک جملے نے انہیں تڑپایا۔ جو یقینی طور پر ابتدائی مراحل سے گزرنے والے کسی بھی افسانہ نگار کے لئے بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ رضیہ سجاد ظہیر مذکورہ افسانہ پڑھ کر سہیل عظیم آبادی کو اپنے ایک خط میں لکھتی ہیں۔

کلام کا افسانہ دیکھ رہی تھی۔ اور ختم کرنے کے بعد میرا بے اختیار جی چاہا کہ کلام حیدری کو مبارکباد دوں۔ بڑا تور دار افسانہ ہے میں نے تو کلام حیدری کا نام بھی نہیں تھا۔ اور یہ افسانہ دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہوئی کہ ہمارے یہاں کیسا کیسا ہے کتنے جواہرات ہیں جن کی دمک ہم نے ابھی دیکھی ہی نہیں۔ کلام کو میری طرف بہت بہت پیار کہنا، بہت دعا کہنا۔ ... ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ... ان کے بارے میں لکھو کیا عمر ہے، کیا کام کرتے ہیں کہاں کے رہنے والے ہیں اور اب فی الحال کیا لکھ رہے ہیں ... بھئی کیا کہوں میرا تو دل چاہتا ہے کہ اس افسانہ کی تعریف کئے جاؤں حالات کی کتنی اچھی عکاسی کتنی پیاری زبان، عوام کا کتنا گہرا درد اور ان کی کیسی صحیح ہے، ہماری تحریک اور ہمارے ادب کو ایسے لکھنے والوں کی بڑی ضرورت ہے۔

(بے نام گلیاں ص ۶)

رضیہ سجاد ظہیر جیسی قاری کے ایسے بے ساختہ تعریفی جملوں نے یقینی طور پر کلام حیدری کے فن کو آگے بڑھایا اور وہ پوری خود اعتمادی کے ساتھ ایسے افسانے لکھتے چلے گئے۔ جو زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بڑے منفرد آرٹ اور تکنک کے ساتھ ایک خاص معنویت بخشی۔ وقت میرا موضوع کلام حیدری کی افسانہ نگاری کے فکری محرکات نہیں ہیں۔ ویسے وقتاً فوقتاً حیدری کی افسانہ نگاری سے متعلق جو رائے قائم کی وہ نہ صرف اہمیت کے حامل ہیں۔ بلکہ ان کی توضیح بھی ضروری ہے۔

کلام حیدری کے خیال میں افسانہ نگاری شاعری کے مقابلے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس کے لئے جو اثر انگیزی معنی خیزی خلاقانہ اعتماد اور تسلسل ہم آہنگی چاہئے وہ شاعری میں ممکن نہیں۔ کلام حیدری کے نزدیک شاعری کی بھی قدر تھی لیکن افسانہ نگاری کو انہوں نے فنی فکری طور پر ہمیشہ ترجیح دی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"شاعری کرنا، افسانہ یا ناول لکھنے کے مقابلے آسان کام ہے چند اثر انگیز اور دانشوری سے بھرپور لکھنا اتنا مشکل کام نہیں ہے جتنا صفحے کے صفحے نثری لکھنا جو تخلیق کے ان تمام تقاضوں کو پورا کرتے جو ضروری ہے۔ یعنی پہلے جملے سے آخری جملے تک ایک سی رفتار، ایک سی اثر انگیزی، ایک سی معنی خیزی ایک خلاقانہ اعتماد اور ایک سا تسلسل، رابطہ، ہم آہنگی اور قدروں کا انضمام ــ نثری بیانیہ افسانے میں کام یقیناً نظم لکھنے سے مشکل ہے۔ اس کی اندرونی مثال قرۃ العین حیدر کے افسانے اور ناول ہیں۔ مراد یہ نہیں ہے کہ اور کسی کے یہاں یہ بات ہے ہی نہیں / بلکہ مراد یہ ہے کہ دوسرے کے یہاں کوئی کچھ

بکھری بکھری صورت میں ہے

صرف افسانہ لکھنے والوں ہی ہے یہ بات منٹو کے یہاں ہے ۔ اس کی نثر جدید نثر کی سادگی سے لئے ہوئے ہے ۔ جو مطلب سے مطلب رکھتی ہے ۔ کرتب اور شعبدے سے تعلق نہیں ہے ۔،،

(ماہنامہ "ترسیل" سید احمد قادری نمبر ص ۲۶)

یہ اقتباس اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ کلام حیدری کی افسانے کے سلسلے میں اپنی ایک فکر تھی ۔ اور اس فکر کی ترویج و اشاعت میں بھی وہ پیش پیش رہے ۔ بدلتے ہوئے وقت اور حالات کے تقاضے کا انہیں شدت سے احساس تھا ۔ اور وہ ایک جانب جہاں وہ اس بات کا اعتراف پوری ایمانداری سے کرتے ہیں کہ ۔

" اردو ادب کا بے ایمان مؤرخ ہی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے قابل فخر کارناموں کا منکر ہوگا ۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ اردو ادب میں جو افسانہ نگار اور شاعر روایت بن گئے ہیں ان کو ابھارنے نکھارنے اور سنوارنے کا کام اس انجمن سے زیادہ کسی نے نہیں کیا ۔

(مزا میر ۔ ص ۲۰)

دوسری طرف وہ انتہا پسند جدیدیت کے علمبردار افسانہ نگار سریندر پرکاش ، احمد ہمیش وغیرہ کو وہ افسانہ نگار ہی تسلیم نہیں کرتے اور جب انہیں کبھی موقع ملا ۔ وہ اپنے اداریوں اور تبصروں میں ایسے رجحانات کے سخت مخالف نظر آتے ہیں ۔ جو افسانے کو افسانہ کی بجائے معمہ بنانے پر تلے ہوئے تھے ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ [illegible]

تھے اور جدید رجحانات کے قائل تھے ۔ اور اس کی وکالت بھی کرتے تھے ۔ جس کے لئے انہوں نے خود کاربن کے ٹکڑے ،، جیسے کئی افسانے لکھے ۔ اور اپنے کئی ہم عصر افسانہ نگاروں مثلاً غیاث احمد گدی انور عظیم ، احمد یوسف ، رام لعل ، الیاس احمد گدی اور جوگندر پال وغیرہ کے کئی ایسے افسانے اپنے ۔ آہنگ میں شائع کئے ۔ جن میں پریم چند جیسے دیو کو اپنے کاندھوں سے اتارنے کی کوشش کلام حیدری کا خیال تھا کہ

" فنکار سے کوئی اس کے جدید بننے کے حق کو نہیں چھین سکتا ہے ۔ فنکار اپنے ماضی سے اس طور مطمئن نہیں ہوسکتا کہ وہ اس سے آگے جانے کی ضرورت ہی نہ محسوس کرے ۔ ایسا فنکار یقیناً اپنے اندر تخلیق کا جذبہ نہیں رکھتا ہے ۔ جو ماضی کو آخری حد سمجھ لے ۔ اختراع ، تخلیق ، دریافت اقدار کی تخلیق سچے فنکار کے لئے ضروری ہے ۔ ،،

(مزا میر ص ۱۶)

اپنے اس خیال کی آبیاری کے لئے کلام حیدری نے ہر ممکن کوششیں کیں ۔ جس کے ثبوت بڑے نمایاں طور پر "آہنگ ،، کے صفحات کے ساتھ ساتھ ،، ... کا افسانہ نمبر (ایسے کلام حیدری نے ترتیب دیا تھا) ،، آہنگ " کا فکشن نمبر ارتقاء (۱۹۷۶ء ۔ ۱۹۸۰ء تک کے منتخب افسانے) اور ،، آہنگ ،، کے فکشن سیمینار نمبر وغیرہ میں موجود ہیں ۔

کلام حیدری نے اردو افسانے کو ماضی سے آگے بڑھانے اور اس کے معیار اور وقار کو اعلیٰ مقام دلانا اپنی ذمہ داری تصور کیا تھا ۔ جس کا اظہار وہ ہمیشہ کی

موت پراپنے ایک اداریہ میں اس طرح کرتے ہیں ۔

" تم نیوی نے اردو افسانوں کے اتنے اونچے معیار کی آتنی بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے کہ ہم تم سے بحرشرمیے ہوئے ہیں ۔ اور نہیں کو سکتے ہیں کہ تم آتنی بڑی ذمہ داری ہم پرڈال گئے ہو کہ ہم سے اسے قائم رکھنا محال ہے "

(" آہنگ " دسمبر ۱۹۴۲ء)

کلام حیدری نے اس ادبی ذمہ داری کو نباہنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ۔ اس کا اعتراف کیا ہی جانا چاہیئے ۔ ہم اس امر سے بھی انکار نہیں کرسکتے کہ کلام حیدری نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اردو کے افسانوی ادب کو اپنے فکر و احساس سے اس قدر مالامال کیا ہے کہ اردو افسانے کی تاریخ ان کی خدمات کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگا ۔

کلام حیدری کی ادارت میں شائع ہونے والا خالص ادبی رسالہ " آہنگ " جو بقول کلام حیدری ۔

" آہنگ " کوئی منصوبہ بند رسالہ نہیں ہے اس لئے کہ یہ دہلی یا بمبئی کی جگمگاتی، چکا چوند کر دینے والی ان روشنیوں سے محروم ہے ۔ جو اندھیروں کو دور کرنے سے زیادہ خود اپنی نمائش کا مظاہرہ کرتی ہیں "

" آہنگ " قصباتی اندھیروں سے لڑتے اور لڑکھڑا کر پھر لو کو تیز کرنے والا ایک دیا ہے ۔ جسے ایک ادبی فقیر نے اس لئے جاری کر رکھا ہے کہ ادب کے شہنشاہوں کی ملکیت میں فقیر نہ ہو تو ادب سے محروم رہ جائے گا ۔"

(مزامیر ص ۸۶)

کلام حیدری کی اسی ادبی کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ آج ہمارے سامنے دوسری کئی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے اردو افسانے میں زیادہ باوقار، معیاری اعلےٰ نمونے ملتے ہیں ۔ آج ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ کلام حیدری کی نسل کے بعد ایک ایسی نسل ہے سامنے موجود ہے کہ جس نے نہ صرف کامیاب افسانے لکھے بلکہ اس قابل بنایا کہ آج ہم بلا جھجک دوسری کئی ترقی یافتہ کتابوں زبانوں کے افسانوی ادب کے مقابلے ایک منفرد پہچان بنا سکتے ہیں بقول کلام حیدری ۔

" خود مغرب کے افسانوی ادب کو اردو افسانوی ادب سے اثر قبول کرنا پڑا ۔ "

(عکس ، ص ۱۳۳)

کلام حیدری نے نئی نسل کو پورے کرنے کی اسکیم کو بروئے کار ... بات دیگر ہے کہ شعراء کے مقابلے نئی نسل کے افسانہ نگاروں کو انہوں نے ترجیح دی اور سلام بن رزاق، شوکت حیات، انور خان، شفق، حمید سہروردی اور م۔ ق خاں وغیرہ پر خصوصی شمارے فنکاروں کا تعارف کے ساتھ پانچ چھ افسانوں کو ایک ساتھ میں شائع کیا ۔ جس سے پذیرائی بھی ہوئی اور نئی نسل افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی بھی ۔ آہنگ کے کئی خصوصی گوشوں سے کلام حیدری نے نئے نئے افسانہ نگاروں کو حوصلہ اور اعتماد بخشا ۔ اور ان کے فن اور فکر روشناس کرانے کا اہم ادبی فریضہ کو پورا کیا ۔ اور انور خاں کے افسانوی مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کلام حیدری لکھتے ہیں ۔

" اس کتاب کی اشاعت سے پانچ سال کی بات ہے کہ مجھے کسی غیر اہم رسالے میں ایک افسانہ

ملا۔ انور خاں نے بہت حاصل کیا اور طے کیا کہ اس افسانہ نگار کی جانب اپنے بے تعلق نقادوں کو متوجہ کروں۔ اس لئے آہنگ نومبر ۱۹۷۱ء کے شمارے میں انور خاں کا تعارف اور خصوصی مطالعہ کے لئے ان کے چھ افسانوں کو ایک ساتھ شائع کر دیا۔ ان چھ افسانوں میں سے تین اس مجموعے میں شریک ہیں۔ اور ایک کو ،، راستے اور کھڑکیاں کتاب کے نام کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔

اس خصوصی مطالعہ کے پانچ سال بعد جب یہ مجموعہ دیکھا تو اپنے انتخاب پر فخر ہونے سے زیادہ مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ انور خاں باضابطہ افسانہ نگاروں کی صف میں آگئے۔ آہنگ دسمبر ۱۹۷۱ء میں کئی ادیبوں اور قارئین نے انور خاں کے افسانوں کو پسند کیا اور یہ توقع ظاہر کی کہ انور خاں آگے جائیں گے۔

سترہ افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ بہتر طور پر اس قابل ہے کہ اسے پڑھا جائے اور محسوس کیا جائے کہ جدیدیت کو بطور تحریک اختیار نہ کرنے والے بھی کچھ لکھ رہے ہیں۔ "کوؤں سے ڈھکا آسمان ،، راستے اور کھڑکیاں بھیڑیں ،، اسیر زلیست ،، ان سب افسانوں میں انور خاں موجود ہیں۔ موجود ہے مگر سواد نہیں ہے۔،،

(ص ملا ۱۵)

اس مطالعہ کے تبصرہ اس تبصرہ کے مطالعہ سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں ایک تو یہ کہ کلام حیدری فنکار کے اندر سے فن کو پورے اعتماد اور اعتبار سے باہر لانے کا حوصلہ دیتے تھے۔ اور جدیدیت کو تحریک کے بجائے فن کا درجہ دینے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ انہوں نے جدیدیت کی انتہا پسندی کے دور میں بھی جدیدیت کو تحریک نہیں [illegible]

پیش کرنے کی کوشش کی۔ کلام حیدری نے نئے نئے افسانہ نگاروں کو متعارف کرانے میں کبھی بھی اسے جغرافیائی حدود میں محدود نہیں کیا بلکہ ان کے ذہن میں شہر افسانہ نگاری کا تصور تھا جس کا اظہار انہوں نے ماہنامہ "ترسیل" کے سید احمد قادری نمبر (جنوری ۔ ۱۹۸۹ء) شہر افسانہ نگار کا معزز شہری" کے عنوان سے راقم الحروف کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے بڑے خوبصورت الفاظ میں کیا ہے۔

کلام حیدری کی اردو افسانے کے فروغ میں جو نمایاں خدمات رہی ہیں انہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ••

بقیہ: کلام حیدری کا آخری تبصرہ

منظر کاظمی شاید اپنی تحریر میں بحیثیت ادیب بندگی کے کسی اونچے درجے پر متمکن ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ انتہا درجے کی غیر معمولی بات ہے کہ منظر کاظمی کی تحریر بہت سی جگہوں پر دائرہ قرآن شریف سے TAN-GENT بناتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ ماشاء اللہ یہ افتخار منظر کاظمی کو اس دنیا اور اس دنیا دونوں میں سرخ رو رکھے گا۔

کلام حیدری

۲ر فروری ۱۹۹۴ء



کلام حیدری کی تبصرہ نگاری

نشاط الایمان کلکتہ

اردو ادب کی مقبول اور زبان زد صنفیں شعر و شاعری، افسانہ نگاری، ناول نویسی، ڈرامہ نگاری، انشائیہ اور تنقید وغیرہ ہیں۔ تبصرہ نگاری اور انٹرویو ان صنفوں میں یا تو گمنام کی حیثیت رکھتے ہیں یا ان کا وجود معشوق کی جھلک اور برائے ہیئت کے ہے۔ کیونکہ اب تک کسی ناقد نے ان پر توجہ نہیں دی ہے حالانکہ تبصرہ نگاری ہو یا انٹرویو، ان موضوع کو ہمہ گیر تحریر کا جامہ پہنانا سب کے بس کی بات نہیں ــــــ میں یہ بات پاکستان کے اردو ڈائجسٹ کے ایڈیٹر الطاف قریشی کے انٹرویو اور کلام حیدری کی تبصرہ نگاری کے پیش نظر کہہ رہا ہوں۔

الطاف قریشی کا انٹرویو اپنی نوعیت اور وسیع درجہ کے لحاظ سے بڑا جامع، مجنہلے فکر، نظر اور معلومات کا خزینہ ہوتا ہے اسی طرح کلام حیدری کا تبصرہ برائے تبصرہ نہیں بلکہ اس میں فنکار اور اس کے فن پاروں کی بھرپور فوٹوگرافی اور تنقیدی جائزہ ہوتا ہے۔

کلام حیدری بنیادی طور پر فکشن نگار ہے مگر اس نے افسانہ نویسی کے ساتھ صحافت اور تبصرہ نگاری کو بھی اپنی خداداد ذہانت اور فطانت سے ایک نیا موڑ دیا [illegible]

کو جلا بخشی ہے۔

یاد نہیں کلام حیدری کا وہ کون سا تبصرہ تھا جسے پڑھ کر میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ وہ بڑا تیکھا، بڑا ناپا تُلا، اور بڑا بے لاگ تبصرہ تھا۔ وہ تبصرہ نہ تقریظ کا نمونہ تھا، اور تنقیص کا خاکہ تھا بلکہ بڑی دیانت داری اور صاف گوئی کے ساتھ مصنف اور اس کے فن کو پرکھا گیا تھا۔ اس کا لب و لہجہ اتنا عالمانہ، موثر اور سلجھا ہوا تھا کہ پڑھئے اور عش عش کیجئے ـ بشرطیکہ قاری تنگ دل اور تنگ نظر نہ ہو ــــــ آہنگ جب بھی میرے پاس آتا اگر اس میں کلام کا کوئی تبصرہ ہوتا تو سب سے پہلے اسی کا مطالعہ کرتا۔ اور مرحوم کی صلاحیت اور مبالغہ سے پاک تجزیہ اور انداز بیان کو سراہتا تھا۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کلام کے ارتحال کے بعد اس کے افسانوں پہ نہیں اس کی تبصرہ نویسی پر قلم اٹھانا ہوگا تو آہنگ کے ہر شمارہ کو سینت کر رکھتا مگر مجھ سے یہ نہ ہو سکا۔ آہنگ کے تقریباً تمام شمارے احباب کی نذر ہو گئے ــــــ بہرحال اس وقت جو کچھ میرے پیش [illegible]

پر اپنے تجزیاتی تاثرات پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ جرأت اس لئے کہ میں تنقید کا سوداگر نہیں ہوں۔ میں کلام حیدری کی بنیادی صنف کی راہ کا ایک راہی ہوں۔ اور پھر یہ تاثرات میرے قطعی ذاتی ہیں میں انہیں آپ کے سر تھوپنے کی بھی جرأت نہیں کروں گا۔ ویسے آپ انہیں توصیف کی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کا یہ فعل "فعل رندانہ" ہوگا۔

کلام حیدری نے جہاں لئے دیئے اور جگادری قسم کے ادبا، شعرا کی کتابوں پر "فرشی سلام" کئے بغیر دو ٹوک پیرایہ میں تبصرہ کیا۔ وہاں اس نے ادب میں نئے آنے والوں کو بھی اپنی صاف ستھری اور کسی طرح کی ملاوٹ سے پاک رائے سے محروم نہیں کیا اس نے اپنے تبصروں کی زد میں آنے والے مصنفوں کو نہ قطب مینار پر چڑھایا (جیسا کہ منصوبہ بند مبصروں کا ہنر ہے) اور نہ اس نے انھیں اتھاہ گہرائی میں پھینکا (جیسا کہ حلقہ بند مبصروں کا کمال ہے) ظاہر ہے یہ انداز بیان وہی اختیار کر سکتا ہے جو حقیقت میں دانشورانہ اور عالمانہ خوبیوں کا مالک اور اردو زبان وادب کا بے لوث خادم ہو۔

"دہلی سے ضخیم رسائل کا نکالنا جہاں اردو ادب کی خدمت ہے وہاں دہلوی منصوبہ بند ادبا اور ان کے ارد گرد گھومنے والے ادیبوں اور شاعروں کو مبالغے کے ساتھ پروجیکٹ کرنا بھی ہے۔"

یہ نئی دہلی سے شائع ہونے والے "معیار" کے دوسرے شمارے ۱۹۷۷ء پر تبصرہ کا انداز ہے۔ اس پیراگراف سے پہلے جو پیراگراف ہے اس کا اندازہ بھی ملاحظہ کیجئے۔

"ہم اس خیال سے کہ تبصرہ پڑھنے والوں کو ذہن کو ادھر ادھر بھٹکنے نہ دیں ہر بات سے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔"

ظاہر ہے اپنی ایسی تحریر کے بعد مبصر نے کیا لکھا ہوگا۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ثبوت کے لئے دوسرے بار سے متعلق (اردو غزل آزادی کے بعد ہندوستان میں) یہ پیراگراف دیکھیں:

مصنف نے لکھا ہے صحیح معنوں میں جدیدیت کا فروغ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۲۵ء کے درمیانی دور میں ہوا۔ ہندوستان کی تاریخ پڑھیئے اور دیکھئے کہ ہندوستان ۱۹۰۷ء اور ۱۹۲۵ء کے درمیانی دور میں کہاں رہا ہے۔ ڈی ایچ لارنس کا خیال ہے کہ ۱۹۱۵ء وہ سال ہے جب پرانی دنیا کا خاتمہ ہو گیا۔ ڈی ایچ لارنس کا خیال ایک مخصوص سیاق وسباق اور مخصوص خطہ زمین سے رشتہ رکھتا ہے اسے ہندوستان پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ غلطی ہمارے اردو کے وہ عالم وفاضل کرتے ہیں جن کا مطالعہ مغربی فلسفوں، تاریخ اور ادب کے ادوار کا گہرا ہوتا ہے مگر جو ہندوستان اور اردو تک لاتے لاتے در جنوں اس طرح ناموں کی فہرست پیش کر دیتے ہیں جس طرح معیار صفحہ ۳ سے لے کر صفحہ ۳۹ ہے۔

اور یوں ایسے عالم وفاضل اردو ادب کے قارئین اور طلبا پر اپنے غلط مطالعہ اور غلط تجزیہ اور حوالے کا رعب بھاری بھرکم الفاظ میں ڈالنے کی سعی کرتے ہیں ـــــ کلام نے بغیر کسی لگی لپٹی باتوں اور لفظوں کے سہرے

ایسے نام نہاد اردو کے عالموں، دانشوروں اور محققوں
کا پوسٹ مارٹم کیا ہے اور اس کا یہ انداز تبصرہ اوروں
سے بلاشبہ الگ اور انوکھا ہے۔

معیار پر اس کا تبصرہ قدرے طویل ہے مگر ہمہ گیر
اور افادی پہلوؤں سے خالی نہیں ہے لیکن اردو کے
بیشتر محقق، ناقد اور عالم چکنے گھڑے ہیں۔ وہ کیوں ایسے
بے لاگ تبصرہ کو خاطر میں لاتے ہوں گے۔

بدیع مشہدی کے چھوٹے بھائی شفیع مشہدی
کے افسانوں کے مجموعہ (شاخ لہو) پر تبصرہ کے پہلے ہی
پیراگراف کا یہ تیکھا لب ولہجہ دیکھئے۔

" شاخ لہو کی اضافت کو برداشت کر
لینے کے بعد تبصرہ کرتے ہوئے ایک
مسرت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔
اپنے قبیلے میں ایک اور فرد کا خوشگوار
اضافہ "

(کلام حیدری نے اس کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے
یع مشہدی سے اپنے دیرینہ تعلق کو کھڑکی کے کارنس
یونکہ اب جدید گھروں میں بمشکل طاق نظر آتا ہے)
لکھ دیا تھا اور شفیع کی سوچ اور فنی فروگذاشتوں
اظہار میں کسی طرح کی رعایت نہیں کی۔ اور تبصرہ
صحت مندانہ پہلو کو آنچ سے بچا کر گذر گیا۔

جان پہچان والوں کی کتابوں پر تبصرہ کل بھی
ے تھے اور آج بھی دیکھ رہا ہوں۔ مگر کل کے مبصروں
سوائے کلام مرحوم کے کوئی یاد نہیں یا اور آج کے تبصرہ
وں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا کہ جس آگے کی منزل کی
دہی کلام نے کی تھی اس کی شاہراہ پر گامزن ہو۔ میں
لوگ اظہار کے لئے قطعی معذرت خواہ نہیں ہوں۔
رسائل اور جرائد میں چھپنے والے تبصروں پر نگاہ دوڑا
لیجئے۔ ادارے کے کسی رکن کا شاذونادر ہی کوئی تبصرہ
دکھائی دیتا ہے ــــــ کیا آپ ایسے تبصروں
اور آرا کو ایماندارانہ اظہار خیال کا نمونہ کہیں گے، جو
اپنے احباب اور شناسا محقق سے لکھوا کر ادارہ کو
بھجوا دیتے ہیں! اور ادارہ گلوخلاصی کے طور پر انہیں
شائع کر کے مصنفوں، مبصروں اور اردو ادب پر احسان
کرتا ہے۔ کلام حیدری آہنگ میں خود تبصرہ کرتا تھا۔ اگر
کسی وجہ سے اس کی نوبت نہیں آتی تھی تو وہ اپنے مزاج
سے قریب حضرات کے تبصرے طبع کرتا تھا۔

میں یہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ کلام حیدری کے تبصرہ
سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ بے عیب تو قادر مطلق
ہے مگر طرفہ تماشا یہ ہے کہ دل جلے اسے بھی بخشنے کیلئے
تیار نہیں ہوتے ـــــ بہرکیف! اب تک
کے اظہار سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ تبصرہ نگاری میں
کلام کی راہ دوسروں سے الگ تھی۔

آیئے! میرے پیش نظر ایک آخری تبصرہ کے
چند نکتوں کو بھی ملاحظہ کر لیجئے ــــــ

علیم اللہ حالی اردو زبان و ادب کے ایک معروف
اور فعال شاعر ہیں یہ کلام کے شناسا اور دیرینہ ادبی سفر
کے مسافر ہیں۔ جب ان کا شعری مجموعہ "سفر جلتے دنوں
کا" تبصرہ کے لیے کلام کی میز پر آیا تو مرحوم نے اس پر بھی
بے لاؤ لپیٹ تبصرہ کا حق ادا کیا اور تعلق کو جگہ نہیں دی۔
اس تبصرہ کے ایک پیراگراف میں وہ حالی کی غزلوں کے
بارہ میں لکھتا ہے:

" غزل میں ان کے جدید ہونے کی تلاش
مجھے عبث معلوم ہوئی غزل ایسی صنف
ہے کہ دو چار اشعار خوبصورت اور
کبھی کبھی یاد پڑ جانے والے شاعر کہہ دیتا ہے

اس شعری مجموعہ سے مجھے محسوس ہوا کہ آگے
چل کر جو ہو لیکن اس شعری مجموعہ کی حد
تک حالی کی غزلیں بس غزلیں ہیں جن سے
شعری مجموعہ کی ضخامت بڑھائی جاتی ہے
اور بڑھائی گئی ہے "۔

اور حالی کی نظم کے بارے میں بیان ہے:

" نظم ایک لمحہ عمل کا، پہلی بار پڑھنے کے
بعد سمجھ میں آجاتی ہے، دوسری بار پڑھنے
کے بعد اپنی سمجھ پر شبہ ہونے لگتا ہے کہ
نظم پڑھنے سے پہلے جو میں تھا وہ نظم پڑھنے
کے بعد نہیں "۔

باتیں عیاں ہیں میں اس پر مزید کچھ نہیں کہوں گا۔

کلام حیدری کتنا دور بیں، دور اندیش اور کس قدر افادیت پسند تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں اردو شعر و شاعری کے "ٹڈی دل" کو دیکھ کر اس پر اپنا خیال پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اور اس کی فوٹو گرافی کتنی صاف تھی کہ آج ہم آجکل، سہیل اور ایوان اردو جیسے گیسوئے اردو کو سنوارنے والے رسالوں میں اردو شعر و شاعری کی سہیات اور اس کے مجموعے کے سیلاب پر تنقیدی نگاہیں اٹھنے لگی ہیں۔

کلام حیدری اچھی تخلیقوں اور ان کے خالقوں کو سراہنے اور ہمت افزائی کرنے میں بخالت نہیں کرتا تھا مگر اس کی ایسی تحریر اس شعر کے ہم معنی ہوتی تھی ؎

ایک پتھر کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ طریقہ سے تراشا جائے

کلام مرحوم نے بلاشبہ تبصرہ نگاری کو ایک روشن سمت عطا کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ دوسرے مبصر اس سمت کو اور روشن اور اس فن کو مزید گوناگوں بنائیں ـــــ

ورنہ کون روکتا ہے:

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

"سہیل ـــــ بسمل ـــــ شمسی پریس ـــــ یہ ایک ایسا مثلث ہے جس کے بغیر گیا کا ذکر نامکمل رہ جاتا ہے۔ تینوں ایک چیز کے تین نام ہیں، ناممکن ہے کہ ایک کو یاد کیجئے، اور باقی دو کو چھوڑ دیجئے۔

بسمل سہسرامی کا شمسی پریس اور ماہنامہ سہیل ہندوستان کے ادبی اور صحافتی تاریخ کا ایک حصہ ہے "۔

(کلام حیدری کی تحریر "زندہ شہر گیا" سے اقتباس)

"مجھے قرۃ العین حیدر سے صرف ایک گلہ ہے، کہ وہ ایک بزدل خالق ہیں اور جہاں پر معاملہ جنس کا آنکلے اسے یا تو پھلانگ جاتی ہیں یا کنارے کنارے نکل جاتی ہیں۔ حالانکہ یہ کام بھی وہ بے حد ہنرمندی سے کرتی ہیں اور اس کی گرفت کرنا آسان کام نہیں "۔

(کلام حیدری۔ ایک گفتگو میں)

(مطبوعہ خیال و ادب)

کلام حیدری کے افسانے میں ترقی پسند تحریک کے اثرات

قمر جہاں

کلام حیدری۔ اردو افسانے کا ایک اہم نام، اب ہمارے درمیان [نہیں] رہا۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے۔ جس کو ہم [جھٹلا] نہیں سکتے۔ لیکن کے افسانے، ان کی باتیں، [ان کی] مسکراہٹ، ابھی بھی ہمارے کانوں میں گونج [رہی] ہے۔ اور ہمیں یہ احساس دلا رہی ہیں کہ فنکار [کی اص]ل زندگی تو اس کی موت کے بعد ہی شروع [ہوتی] ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ کلام بھائی اب [پہلے] سے بھی زیادہ توانا اور صحت یاب نظر آرہے [ہیں]!

بہار کی سرزمین نے سیکڑوں لعل وگہر دیئے۔ [لیکن ان ہ]ستیوں میں سب کہاں، کچھ ہی لالہ وگل کی [صو]رت نمایاں ہوتی ہیں۔ ورنہ بیشتر تو تہہ خاک [پ]نہاں ہوگئیں۔ اس سلسلہ میں ہماری تساہل [پسن]دی اور قدر ناشناسی کے چرچے عام ہو چکے ہیں۔ یہاں اب ان دہرائی ہوئی باتوں کو [دہر]انا نہیں، بلکہ اس امر پہ خوشی کا اظہار کرنا

کے تعین کی کوشش تو کی گئی یہ ایک مستحسن ادبی فعل ہے اور وہ تمام حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں جن کی کوششوں نے اس مستحسن ادبی فریضے کو عملی صورت دی ہے۔

کلام حیدری کے افسانوں میں، ترقی پسند تحریک کے اثرات کی جستجو اور نشاندہی ابھی ہمارا مدعا اور موضوع ہے۔ ”ترقی پسند تحریک“، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، اپنے عہد کی ایک ہمہ گیر ادبی تحریک رہی ہے۔ اس نے اردو ادب کی مختلف اصناف کو اچھا خاصا متاثر کر رکھا تھا۔ تاثرات کا محاسبہ کرتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شاعری کے مقابلے میں اردو نثر پر، اس تحریک کے اثرات زیادہ مثبت انداز میں مرتسم ہوئے ہیں۔ خصوصی طور پر اردو افسانے پر ترقی پسندی کے بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اردو افسانہ نگاروں کی ایک بڑی آبادی جزوی یا کلی طور پر اس تحریک کے زیر اثر پروان چڑھی ہے۔ بات دراصل یہ ہے

[illegible]

کا عنصر ہمیشہ قوی ہوتا ہے۔ غزل ہو یا نظم اظہار ذات یا
عرفان ذات کا عمل دخل ان میں کچھ زیادہ ہوتا ہے لیکن
افسانے کی صنف میں تفہیم کائنات کا رجحان قوی تر
سمجھا جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر شاعری جتنی داخلی ہو گی۔
اس کی کشش اتنی بڑھتی جائے گی۔ برعکس اس کے
افسانے میں کائنات کے اسرار و رموز کو ادھیڑنے کی جس
قدر جستجو کی جائے گی۔ اس کا تاثر اتنا ہی گہرا اور دلفریب
ہوگا۔ اب ہم اس روشنی میں کلام حیدری کے افسانوں
کو زیر بحث لاتے ہیں۔

ابتدائی عمر کی کہانیوں میں وہ اپنی ذات سے
بہت زیادہ علٰحدہ نہیں ہو سکے ہیں۔ اکثر کہانیاں
آپ بیتی کا سا رنگ رکھتی ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک سچ ہے
کہ ترقی پسندی کے اثرات اسی زمانے میں انہیں اپنے
حصار میں لے چکے تھے۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے
"بے نام گلیاں" کی سب سے پہلی کہانی "کھلیان اور
سلاخیں" اور بعض دیگر اہم کہانیاں جن کا ذکر آگے
کیا جائے گا۔ اس بات کا بیّن ثبوت ہیں۔

مجموعہ "بے نام گلیاں" فروری ۱۹۵۵ء میں
منظر عام پر آیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند
تحریک زندہ تھی۔ اور بقول مظہر امام :-

"تقسیم ہند کے بعد ابھرنے والے
بہار کے افسانہ نگاروں میں سب سے
پہلے انہیں کا مجموعہ "بے نام گلیاں"
کے نام سے شائع ہوا۔"

(بہار میں اردو افسانہ از مظہر امام زبان و ادب
پٹنہ میں ۱۵-۱۴ اشارہ ۲)

۱۹۴۶ء تک کلام حیدری کا نام افسانوی ادب
میں غیر معروف تھا۔ ایک کہانی "عجیب" کے عنوان
سے کلکتہ کے ایک رسالہ "تجلی" اگست ۱۹۴۶ء
میں آئی تھی۔ اس وقت وہ اپنے نام کے ساتھ کلام
مونگیری لکھتے تھے۔ ویسے ان کا مکمل نام ملک کلام
حیدری ہے۔ مقام پیدائش زنکرڈ (نانیہال) ضلع
مونگیر اور دادیہال مونگیر ضلع کا ایک چھوٹا سا قصبہ
"لکھمنیا" ہے۔ جو ادبی اور علمی اعتبار سے اپنی پہچان
رکھتا ہے ـــ کلام صاحب کے افسانوں کی شہرت
کا زمانہ ۱۹۵۵ء کے آس پاس ہے لیکن اس عہد کے
افسانوں میں فنی ارتفاع کی جگہ نو مشقی اور عجلت
نمایاں ہے۔ "بے نام گلیاں" کے بعد اسلوب و بیان
ان کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ
ان کے فن میں بھی بالیدگی اور ہنرمندی کے نقوش اُبھرتے
چلے گئے۔ دوسرا مجموعہ "صفر" اور اس کے بعد "الف
لام میم" کے افسانے فنی نقطہ نگاہ سے زیادہ اور ترا...
ہیں۔ لیکن جہاں تک ترقی پسند میلانات کا سوال ہے
اس کا اثر ابتدائی کہانیوں پر زیادہ حاوی و محیط ہے۔

فن اور فنکار کا رشتہ اپنے عہد اور ماحول سے
بڑا گہرا ہوتا ہے فنکار چاہے یا نہ چاہے اس کی شخصیت
کی تعمیر میں جن عوامل و عناصر نے حصہ لیا ہے۔ ان کا عکس
فن پر بھی مرتسم ہو ہی جاتا ہے۔ کلام حیدری کی کہانیاں
اس کی حقیقت کی روشن مثالیں ہیں۔ بیشتر افسانوں
کے موضوعات وہی ہیں جو ترقی پسندوں کے محبوب
موضوعات تھے۔ پیٹ کی آگ ہر زمانے میں اہم
ہے لیکن ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اس
شعلے کو جتنا ہوا دے کر پیش کیا ہے وہ انداز کلام
حیدری کے یہاں بھی موجود ہے۔ شاید اسی لئے...

اور ظہیر جنہیں وہ بھائی کہہ کر یاد کرتے تھے۔ اپنے ایک خط میں کلام صاحب کے افسانہ "کھلیان اور سلاخیں" کی تعریف کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:۔

"...... بھائی کیا کہوں، میرا تو دل چاہتا ہے اس افسانہ کی تعریف ہی کئے جاؤں، حالات کی کتنی اچھی عکاسی، کیسی پیاری زبان، عوام کا کتنا درد اور ان کی تجزیہ صحیح

ہماری تحریک اور ہمارے ادب کو ایسے لکھنے والوں کی بڑی ضرورت ہے"

(رضیہ سجاد ظہیر خط بنام سہیل عظیم آبادی)

کلام صاحب کے شروع کے افسانے ان کے میلانات کو سمجھنے میں جس طرح معاون بنے ہیں ان کچھ تفصیلات ان کے افسانوں کے حوالے سے ملاحظہ ہوں ــــ

"...... سرجو نے محسوس کیا کہ اسے پیٹ سے جتنی محبت ہے، اتنی اپنے کھیت سے نہیں ہے۔ اتنی گاؤں سے نہیں ہے اتنی اپنے آخری لاغر بیل سے نہیں ہے۔ وہ بمبئی جائے گا اس نے فیصلہ کر لیا اور اس نے آخری لاغر بیل راگھو مل بنیا کے ہاتھ بیچ دیا۔"

(افسانہ "کھلیان اور سلاخیں" صفحہ ۱۹)

اس افسانہ کا مرکزی کردار "سرجو" ایک ایسا انسان ہے جو پیٹ کی بھوک اور اپنی ذمہ داریوں کی وجہ سے مجبور ہو کر اپنے پیارے گاؤں، کھیت کھلیان، بیل، بیوی بچے، بہن سب کو چھوڑ کر بمبئی مزدوری کرنے جا رہا ہے۔ مگر وہاں بھی بیکاری پھیلی ہوئی ہے۔ جس وقت وہ سب کچھ لٹا کر وہاں پہنچا ہے تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ ضرورت سے زیادہ مزدوروں کے آئے دن آنے کی وجہ سے مزدوری بہت گھٹ گئی ہے۔ مزدور طبقہ میں ہڑتال شروع ہو گئی ہے۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگ رہے ہیں۔ ویسے میں وہ بیچارہ گاؤں کے بھولا بھالا نوجوان پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو کر جیل کی سلاخوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ افسانے کا آخری پیراگراف بڑی تیکھی حقیقت نگاری کا آئینہ دار ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"...... تم یہاں آئے تھے بھیا! میں جانتا ہوں تم اکال سے بچنے کے لئے یہاں آئے تھے۔ مگر کام کا یہاں بھی اکال ہے۔ اپنے دیس میں اب اکال ہی اکال ہے۔ اناج کا اکال ــ کام کا اکال،، اور ...... اور سرجو حیران اور اجنبی نظروں سے سلاخوں کو تکتا رہا جن سے باہر اکال تھا اور اندر ــــ؟"

پیش نظر افسانہ میں، حقیقت پسندی کا رجحان واقعی بڑا تیکھا اور بے باک ہے اور بے باکی ہمیں ترقی پسندوں کی یاد دلاتی ہے۔

"راہی نے پہچانا" بھی اسی انداز کی کہانی ہے جس میں زیدی نام کے ایک کردار سے ہمارا تعارف ہوتا ہے۔ زیدی، جو سچائی پر ثابت قدم رہنے والا نوجوان ہے۔ اور ضمیر کی آگ کو روشن رکھ کر زندگی گذار رہا ہے۔ وہ ضمیر کی پاکیزگی کو محفوظ رکھنے کیلئے

شعوری طور پر ہر ممکن جدوجہد کر رہا ہے۔ لیکن اس
ضمیر فروش نظام حیات میں ضمیر کی پاکیزگی کی بھلا کیا
قدر ہو سکتی ہے؟ زیدی جیسا انسان در بدر کی ٹھوکریں
کھاتا ہے۔ غریبی اور مفلسی نے اس کی بیوی بچوں سبھی
حسین رشتوں اور خوابوں سے اسے محروم کر دیا۔
انجام کار وہ مجرم کے کٹہرے میں ایک دن حاضر ہوتا
ہے۔ اور کہانی کار میں ،، جو اپنی مصلحت پرستی کی وجہ
سے اونچے عہدے پر پہنچ چکا ہے۔ اور ایسے تمام ساتھیوں
اور یادوں سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتا ہے جو اس
کی راہ میں مثل کانٹا معلوم ہوتے ہیں۔ وہ امن
کانفرنس میں شرکت کے لئے اندر سے بیقرار ہو
اٹھتا ہے۔ مگر اس کی مصلحت پسندی، اس
خیال سے اسے کوسوں دور کر دیتی ہے۔ وہ اپنے
عزیز دوست کامریڈ ستیش اور زیدی سے
بھی آنکھیں ملاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ کیوں کہ وہ
ایک اونچے عہدے کا مالک ہے اور ایک اونچے
عہدے کا مالک اندر سے کس قدر کمزور اور بزدل
ہو جاتا ہے۔ اس کی بڑی بھرپور تصویر کشی اس
افسانے میں کی گئی ہے۔ آدمی کسی غلط کام کو کرنے
کے لئے کیسے کیسے بہانے ڈھونڈتا ہے کیسے کیسے جواز
پیش کرتا ہے لیکن ضمیر کی آگ اسے کبھی چین لینے
نہیں دیتی۔ آخر کار ایک دن زیدی کی سچائی سے
متاثر ہو کر وہ خود اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دیتا
ہے۔ اور نہایت اطمینان اور قلبی سکون کے ساتھ اخبار
میں درج اپنے استعفیٰ کی خبر پڑھ کر خوشی محسوس کر
رہا ہے۔ کہانی کے آخر میں کامریڈ ستیش کا یہ جملہ:

،، وہ تمہارا راستہ نہیں تھا۔ تم لوٹ
آؤ گے اس کا مجھے یقین تھا ... ،،

کلام حیدری کے سیاسی و سماجی نظریئے کی
خوبصورت تصویر کشی ہے۔ زیر بحث افسانے اس تح
سیاسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ جسے ہم ہندوستان
کی تاریخ کا ایک اہم موڑ گردانتے ہیں۔ اس افسانے
کے بعض مکالمے بہت تیکھے ہیں۔ اور تلخ حقیقت
نگاری کی مثالیں ہیں، مثلاً۔

،، تاری صاحب! ہندوستان
میں لوگ لڑکیاں نہیں چھوڑتے، نوکریاں
لوگوں کو چھوڑ دیتی ہیں ... ،، (یہ)
،، روٹی سے تو دلچسپ ضرور ہے،
اب چاہے کوئی نوکری ہو ،،

پیش نظر افسانہ کے گہرے مطالعے سے اس
کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کلام حیدری صاحب
ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شریک ہونے
کے دل سے خواہاں تھے۔ مگر ان کی زندگی کی کچھ
مجبوریاں تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ دور ہی دور
اپنی تربت کا اظہار کرتے رہے افسانہ کا اقتباس
ہو!

،، اور میرے اندر بے اطمینانی کی لہر
تھی ،، کیا میں امن نہیں چاہتا ...؟
میں نے کانفرنس میں شرکت نہیں کی،
کیوں ۔۔؟ ،، جیسے ضمیر مجھے کاٹ رہا ہو۔
اور میں ایسی تکلیف میں مبتلا ہوں
جس کا اظہار بھی نہیں کر سکتا ۔۔ ،،

حد تو یہ ہے کہ وہ اس افسانے کے مکالموں
وسیلے سے اپنا مطمح نظر بیان کرنے میں یہاں تک

جاتے ہیں کہ

"زبیدی صاحب! آپ جانتے
ہیں کہ عصر حاضر کی کیا پالیسی ہے آپ اتنے
دنوں سے کام کرتے ہیں۔ ہمیں آپ کے
اداریوں پر سخت وارننگ ملی ہے۔ اس
پر آپ کے اور کمیونسٹ پارٹی کے
میں کیا فرق ہے۔؟"

"کیا فرق ہونا ضروری ہے۔؟ میں
نے پوچھا۔ (افسانہ راہی نے پتھر
پہچانا ص ۳۲)

افسانہ مجرم میں زبیدہ بائی کا کردار جس نے
بہادر کو خود انہیں کے پستول سے قتل کیا تھا اور
طرح اس کے الفاظ میں :-

"میں نے اپنی کھوئی آزادی عزت کا
بھی بدلہ نہیں لیا۔ بلکہ کوٹھی میں رہنے
والی ان بچیوں کی عزت بھی بچائی ہے
جو جوان ہو کر خان بہادر کے بوڑھے
نوکروں سے بیاہ دی جاتی ہیں تاکہ وہ
بڑے اطمینان سے ان کا مصرف لے سکیں
اور جو اس کے لئے تیار نہ ہوں وہ یا تو
زبیدہ بائی بن جائیں یا حمیدہ کی طرح
خودکشی کرلیں۔"

(افسانہ مجرم ص ۱۹۷ - ۱۹۸)

یہ افسانہ عورت ذات کی مظلومیت اور ایک طبقہ
اتھوں اس کے استحصال پر لکھا گیا۔ ایک دلکش
افسانہ ہے۔ "دو آنکھیں ایک کھڑکی"، بے نام
[illegible]

جن کا سرا کسی نہ کسی صورت ترقی پسندی سے جا
ملتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ وہ ترقی پسند تحریک سے ذہنی
اعتبار سے بے حد قریب تھے۔ اور یہ قربت آخری
عہد تک ان کو وفادار بنائے رہی۔ اگرچہ ان کے
افسانوں میں بہت سارے رنگ آئے اور گئے
لیکن "ترقی پسندی" کے اثرات بعد کے افسانوں
میں جھلک آتے ہیں۔ مثلاً بابو، سنی، قاتل وغیرہ
اسی انداز کی کہانیاں ہیں۔ جن کے اظہار و اسلوب
پر جدیدیت کا رنگ غالب ہے۔ مگر موضوعی اعتبار سے
یہ افسانے ان کی ترقی پسندی کے ضامن ہیں۔ انہیں
ہم ان کی ترقی پسندی کی تجدید کہیں تو بہتر ہوگا۔
یہ کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ کلام صاحب کے یہاں
ترقی پسندانہ اثرات جامد اور ٹھوس نہیں ہیں بلکہ
ان میں ان کی کہانیوں کی طرح باضابطہ ارتفاع
پایا جاتا ہے۔ ان کے ترقی پسندانہ نظریات
ارتقا کی منزلوں سے گذر کر اظہار و اسلوب میں
مزید توانائی اور نیرنگی کا سبب بنے ہیں۔

کلام حیدری کی غالباً سب سے آخری کہانی
"پورب کی جوتی" (مطبوعہ ماہنامہ "مریخ" شمارہ ۳
۸۵ء) میں میرے بیان کی تائید میں پیش کی جاسکتی
ہے جسمیں انہوں نے اپنے ترقی پسندانہ رجحانات
کا اظہار بڑے بے باک انداز میں اس طرح پیش
کیا ہے۔ ملاحظہ ہو افسانے کے انجام کی چند سطریں جو
ان کے نظریے کی بین مثال ہیں۔

"ایک ہی حکم روزانہ جاری ہوتا تھا
[illegible]

پورب سے پچھم سے، دکھن سے اتنی گردنیں جھکا کر
کاٹ لو، گردنیں جھکا دو کہ آج تم سب کی
باری ہے [illegible] کوئی ایک گردن بھی نہیں
جھکی کوئی ایک تلوار بھی نہیں اٹھ سکی۔
گردنیں نہیں جھکیں۔ ان سب کی
نگاہیں سامنے دور دیکھ رہی تھیں ...
گردنیں اب بھی نہیں جھکیں گی۔ کیوں کہ
انہوں نے پورب سے ابھرتی ہوتی جیوتی
میں تپتی ہوئی گردنیں دیکھ لی ہیں۔"

(افسانہ پورب کی جیوتی، صد ۲۱ شاعر بمبئی)

یہاں پورب کی جیوتی ایک اشارہ ہے کلکتہ کی کمیونسٹ عہد حکومت کی طرف۔ افسانہ میں گیا شہر کا بھی ذکر ہے۔ کلکتہ گیا سے پورب ہے۔

کلام صاحب کے سلسلے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں میں ترقی پسند نظریات کا اثر بڑا واضح، اور روشن ہے لیکن ۱۹۵۵ء کے بعد خود ترقی پسند تحریک مشکوک ہو گئی۔ اور بہت جلد سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد ایک ادبی تحریک کے سامنے آگئی۔ جسے ہم جدیدیت کا نام دیتے ہیں۔ ادب اور زندگی میں بہت ساری نئی قدریں پیدا ہوئیں نئی تبدیلیاں آئیں۔

کلام حیدری اپنے عہد کے باشعور اور ذہین آدمی تھے۔ وہ مختلف تحریکات سے آشنا تھے ہوا کی کے رخ کو بھی پہچاننے کی صلاحیت ان میں تھی۔ جہاں تک میری عقل خام نے ان کو سمجھنے کی سعی کی ہے بیشتر ذہین آدمی کی طرح وہ بھی مختلف اضداد کا دلکش مجموعہ تھے۔

؎ ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے ک
کی کشاکش سے غالباً ان کو بھی گزرنا پڑا تھا۔ ایک طرف نظریاتی اعتبار سے وہ ترقی پسند در ساتھ تھے۔ دکرشن چندر کی موت پر ان کا تا مضمون بھی اسی حقیقت کا غماز ہے) اور دو جانب عمل کے میدان میں وہ "جدیدیت" کو ف دینے پر مجبور رہتے۔ وہ اپنی ذات میں، ایک انج تھے۔ کہانی لکھنا تو لکھنا، پڑھنے میں بھی ان کی ا کاری مشہور تھی۔ ذرہ کو آفتاب بنانے میں بھ انہیں کمال حاصل تھا۔ نئے قلمکاروں میں، عب شوکت حیات، شفق م، ق، خان، شمیم صاد شین، کون ایسے جدید نام ہوں گے۔ جن کے ت اور توسیع میں کلام حیدری نے "آہنگ" کے ذ سے خصوصی تعاون نہ دیا ہو۔ اگر میں یہ کہوں کہ کلا حیدری نے اردو افسانے میں خود اپنی کہانیوں میڈیم سے کوئی نیا افق نہیں دیا ہے لیکن انہو اردو افسانے میں نیا افق تلاش کرنے کی کوشش کی ہے — تو شاید بیجا نہ ہوگا۔

سنہ ۱۹۷۰ء کے بعد ان کی ترقی پسندی، جدید میں ضم ہونے لگی تھی۔ یہی سبب ہے کہ اس دور اس کے بعد کے زمانے میں انہوں نے بعض ایسی کہ تخلیق کی جو نئے ادبی مزاج کی بھرپور عکاس ہیں — کی کہانیوں میں عصری ہیئت اور بدلتے ہوئے ر شعور نے ان کے یہاں دانشوری کے بہت سارے روشن کیے ہیں حد تو یہ ہے کہ انہوں نے تجریدی ع سریت پسند اور مخفی افسانے بھی تحریر کیے ہیں اور قلم کے بعض کامیاب نمونے پیش کیے ہیں مثلاً۔

(ناگ [illegible])

کلام حیدری بحیثیت صحافی

اسلام عشرت

کلام حیدری دنیائے اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ کلام حیدری کو لوگ ہند و پاک میں ایک کامیاب افسانہ نگار، ایک اچھا مبصر، ایک ایماندار ایڈیٹر، ایک سیاسی مفکر اور ایک اہم صحافی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کلام حیدری کی فطرت میں افسانہ نگاری اور صحافت نگاری دونوں شامل تھی۔ چنانچہ ان کے دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر محض ان کی صحافت نگاری پر روشنی ڈالنا یہاں مقصود ہے

کلام حیدری ایک ذہین اور ذکی الحس انسان کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی سیاست نے کوئی اہم کروٹ جب بھی لی ہے یا بے بس اور مظلوم زبان اردو پر کوئی برا وقت آپڑا ہے تو کلام حیدری نے اس کے خلاف بلند آواز اٹھائی ہے۔ کلام حیدری کی ایک خاص صفت ہے کہ وہ جب بھی قلم ہاتھ میں لیتے تھے تو اکثر سچ بولتے تھے۔ سچ بولنے کی وجہ کیا تھی یہ وہ خود کہتے تھے "قلم جب ہاتھ اٹھاتا ہوں تو قلم بولنے لگتا ہے سچ لکھو اور ایمانداری کے ساتھ لکھو۔" شاید یہی وجہ ہے کہ کلام حیدری اپنی صحافتی تحریروں میں نہایت ایماندار اور حق گو نظر آتے ہیں۔ بے باکی، ایمانداری اور حق گوئی کا یہ حال ہے کہ وہ حکومت وقت کے خلاف بھی لکھنے سے گریز نہیں کرتے تھے مثلاً یہ پیراگراف ملاحظہ ہو۔

.... بہار میں دو تین ہزار اردو ٹیچروں کی بحالی کا جو اعلان عام چیف منسٹر نے مہینوں پہلے ایک کیبنٹ منسٹر کے یہاں ہونے والے استقبالیہ میں کیا تھا۔ وہ آج تک جزوی طور پر بھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ بہت سے ایسے پرائمری، میونسپل اور دیگر اسکولوں کے ان ٹیچروں کو جو کسی دوسرے مضمون کے ٹیچر تھے اردو ٹیچر کا لقب دے دیا گیا اور تعداد و شمار تیار کر دیئے گئے کہ اتنے اردو ٹیچر بحال کر دیئے گئے۔ ڈیڑھ سو اردو والوں کی تعداد رکھنے والی آبادی میں ایک اردو ٹیچر دینے کا وعدہ اور اس کے اعلانات ان دنوں محض کی دہائی عام جلسوں میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں جو اقلیت کے نمائندے سمجھے اور بتلائے جاتے ہیں لیکن حال کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے اسے مسلم اقلیت دیکھ رہی ہے۔

(ماہنامہ "آہنگ" نومبر ۱۹۷۵ء)

عصر حاضر میں اردو زبان جس زبوں حالی اور کسمپرسی کے عالم میں ہے۔ اس حقیقت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے ارباب حکومت سے جو تعاون ملتا ہے وہ در اصل اردو کے تحفظ و بقا کا ضامن نہیں ہے بلکہ اردو کے لئے اس کی حیثیت سم قاتل کی ہے۔ چنانچہ کلام حیدری نے بھی بہ حیثیت ایک صحافی اور اردو زبان کی بے چارگی کا ذکر نہایت غمگین اور افسوسناک لہجے میں کیا ہے۔ اور اردو کو درپیش موجودہ مسائل کے حل کا کون سا سب سے کارآمد اور مناسب طریقہ کار ہو سکتا ہے۔ اس مسئلے پر بھی انہوں نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ بلاشبہ اگر ان کے مندرجہ ذیل مشورہ پر عمل کیا گیا تو اردو کا مستقبل یقیناً روشن اور تابناک ہوگا

"ہم ایک بار پھر اردو کے انجمنوں سے درخواست کر رہے ہیں۔ کہ خدا کے لئے اردو پڑھنے والوں کی کم ہوتی ہوئی تعداد کو روکئے اور اردو پڑھنے والوں کی تعداد بڑھائیے۔ سرکاری انعامات، اکیڈمیوں اور بورڈ میں الجھ کر نہ رہ جائیے۔ خدارا اصل مسئلے کو سمجھئے اردو زبان کی بقا آج ہندوستان میں اردو والوں کے لئے اصل مسئلہ ہے۔ اردو ادب کی ترقی کا مسئلہ اس کے بعد آتا ہے۔"

(دو امیر ــ کلام حیدری صفحہ)

کلام حیدری کبھی ترقی پسند مصنفین کے منشوروں اور قاضیوں کے نقلی چہرے کا پردہ چاک کرتے ہیں کبھی ادب میں جمالیات پسندی کے قائل لوگوں کو ٹوکتے ہیں کبھی اس امر کی جانب سے لوگوں کی توجہ مبذول کراتے ہیں کہ جدید ادب عدم توازن کا شکار کیوں ہو رہا ہے؟ کبھی وہ یہ بتاتے ہیں کہ دراصل جدید ادب کیا ہے؟ کبھی وہ آرٹ کیا ہے؟ اس کا جواب تفصیل سے دیتے ہیں۔ کبھی "خالص ادب" اور "مقصدی ادب" کی اصطلاحوں کے متعلق بحث کرتے ہیں۔ اور اگر اردو ادب کا کوئی ادیب کسی عظیم فنکار کی شخصیت کو سیاسی ضرورت و مقاصد کی تکمیل کے لئے مجروح کرتا ہے تو اس ادیب کی بھی خوب خبر لیتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے "آہنگ" کے شمارہ ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء کے اداریہ میں گوپال متل کو بڑی کامیابی کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔ پھر جب ہمارے ہندوستان میں اردو رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کر دینے کا شور و ہنگامہ برپا ہوا تو اس مسئلے پر بھی کلام حیدری نے انتہائی سنجیدگی سے روشنی ڈالی اور انہوں نے دلائل سے ثابت کر دیا کہ اردو رسم الخط کو بدلنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اور آج سے بیس سال قبل بھی ہوئی ان کی بات حقیقت ہے اور حقیقت ہی رہے گی۔ مثلاً

"اردو کو اپنے رسم الخط کے ساتھ زندہ رہنے ترقی کرنے اور اپنے حقوق کی حفاظت کا جمہوری حق حاصل ہے۔ جو چند ادیبوں کے دیوناگری میں لکھنے کی وجہ سے مالی منفعت حاصل کر لینے سے ختم نہیں ہو سکتا ہے۔ اور نہ اس کا تخلیقی ادب اتنا ہلکا ہے کہ یہ تعداد سے مرعوب ہو کر دیوناگری کا نقاب اوڑھ لینے کی

رت محسوس کرے۔

"اردو کا نام اردو" اس کے رسم الخط
کے ساتھ ہے۔"

(ماہنامہ "آہنگ" اپریل ۱۹۷۱ء)

کلام حیدری نے "اپنا محاسبہ کرنا ضروری ہے"
ان کے تحت ہفتہ وار "مورچہ" کے ۹ مئی ۱۹۶۳ء
ء میں ویسے حضرات کی دل کھول کر تعریف کی
غیر مسلم ہوتے ہوئے بھی بڑی بے باکی اور انتہائی
دی کے ساتھ اپنا بیان دیتے ہیں۔ ۲۶ اپریل ۱۹۶۴ء
وسے تحریک کے چار رہنماؤں اور ان کے علاوہ
سیاسی و سماجی کارکنوں نے جو ایک مشترکہ اخباری
یا۔ اس اداریہ میں انہی بیانات و خیالات کو
بنایا گیا ہے۔ اداریہ مثال دی گئی ہے کہ آپ نے
سقراط کی طرح بہت کم لوگ ہیں جو حق گوئی کے
زہر کا پیالہ بھی پی سکتے ہیں۔ "ہندوستان کے
کے عنوان سے مورچہ کے شمارہ ۲۱ اکتوبر
ء میں جو باتیں کلام حیدری نے کہی ہیں وہ اتنے
بیت جانے کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ
کا موضوع ہے۔ اس میں سرسنڈ فسادات میں
ائٹنگ کا پورا پورا پول کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔
نہ سالوں میں جمشید پور، سیتا مڑھی، بہار شریف
بمبئی، پٹنہ، رانچی، دلی، بنارس، میرٹھ،
ی، فیض آباد، اور دوسرے مقامات پر فسادات
ح پر پولس نے جو بربریت اور مظالم کا ننگا ناچ
ہے۔ وہ کسی کے لئے ڈھکی چھپی بات نہیں۔ البتہ
س بات پر ہوتی ہے کہ اتنے برسوں کے بعد بھی
اپنے مظالم بھرے رویے سے باز نہیں آئی کہ

"ہندوستان کا وقار" (۲۰ اپریل ۱۹۶۸ء) کے
موضوع پر کلام حیدری نے اظہار خیال کرتے ہوئے یہ
وجہ بیان کی ہے کہ دوسرے ممالک میں پہلے کے مقابلے
میں ہندوستان اب اپنا وقار دن بہ دن کیوں کھوتا
جا رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آر ایس ایس اور جن سنگھ
جیسی فرقہ پرست جماعتیں ہندوستانی سیاست میں
کیا رول ادا کر رہی ہیں۔ اس نکتے پر بھی تفصیلی گفتگو
کی گئی ہے۔ بے شک ہم ان باتوں سے درس حاصل کر
سکتے ہیں۔ اور ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے اجودھیا سانحہ کے
تناظر میں اس صحافتی تحریر کی اہمیت و عظمت اور
زیادہ بڑھ گئی ہے۔

کلام حیدری کی صحافت نگاری کا ایک نمایاں
اور ممتاز وصف یہ بھی ہے کہ وہ مقفیٰ و مسجع عبارت
آرائی سے احتراز کرتے ہیں۔ اور اس کے برعکس نہایت
سادہ شستہ، رواں دواں، آسان اور عام فہم
عبارت لکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ پیچیدہ
سے پیچیدہ تر مسائل و ادبی نکات کو بھی اتنے سہل
زبان میں تحریر کرتے ہیں کہ پیچیدگی کا احساس ہی نہیں
ہوتا۔ اور گنجلک اور خشک موضوعات کو بھی اختصار
سے، کم سے کم الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں گویا
دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہو۔ مثال کے لئے ایک
پیراگراف ملاحظہ فرمائیے۔

"۔۔۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ ادب تخلیق
کر کے روزی کمانے کے حق کو دستور میں
تسلیم کیا جائے۔ ادب تخلیق کرنے والے
کو کلرکی، تجارت، اور ادب سے دور
کرنے والے پیشے اختیار نہ کرنے پڑیں۔

میں کرشن چندر، ہیدی، سردار، گوپال متل، قمر رئیس،
وہاب اشرفی، محمود سعیدی، اعجاز صدیقی، اور تمام ہندستانی
ادیبوں، شاعروں کو آواز دیتا ہوں کہ دستور میں اس
حق، کو شامل کرنے کے لئے پرائم منسٹر، کانگریس کے صدر اور
شری چوہان سے اپیل کریں۔ ورنہ آہنگ گیا ـــ ایک دن
وہ آئے گا جب ہندوستان میں ادب کے نام پر فلمی اشتہارات
اور فلمی اخبارات ہی بچے رہیں گے۔ اور اردو اکیڈمی، مستقبل
اکیڈمی کی حیثیت بھولے ہوئے عبادت خانوں کی ہو جائے گی"
(ماہنامہ "آہنگ" جون، جولائی ۱۹۶۷ء)

کلام حیدری ایک کامیاب اور دور اندیش صحافی
تھے انہوں نے آج سے تقریباً ۲۸ سال قبل پاکستان کے متعلق
جو پیشین گوئی کی تھی وہ آج اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود
صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ مستقبل
پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے ۱۵ رمئی ۱۹۶۵ء کے مورچہ میں
ایک اداریہ "حملہ آور پاکستان" کے عنوان سے لکھا تھا جس
میں یہ ظاہر کیا گیا تھا۔ کہ پاکستان ہندوستان کے متعلق
توسیع پسندانہ خیالات رکھتا ہے تب ہی تو پاکستان
کا رویہ ہندوستان کے ساتھ ابتدا ہی سے جارحانہ رہا
ہے۔ اور آج یہی صورت حال جیوں کا تیوں ہے کشمیر
اور پنجاب کے حالات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل
قریب میں عین ممکن ہے پاکستان، ہندوستان پر پھر حملہ آور
ہو۔ اس اداریہ میں مستقبل کی بشارت ملتی ہے۔ کلام
حیدری نے "مورچہ" کے ۲۶ رجون ۱۹۷۰ء کے شمارہ میں
"بڑی طاقتوں کا رویہ" کے تحت یہ بات واضح کر دی کہ دنیا
کے تمام بڑی طاقتیں مکار، پرفریب اور چاپلوس ہیں۔ سبھی
طاقتیں مفاد پرست ہیں اور بلا شبہ یہ ایک انسانی نقطہ ہے
جہاں امریکہ، روس، فرانس، برطانیہ اور سبھی بڑی قوتیں
آپس میں مل جاتی ہیں۔ دنیا کے تمام ممالک کے لئے
باتیں لمحہ فکریہ ہیں۔ کہ آخر بڑی طاقتیں ایسا کیوں کرتی
ہیں؟ " اچھا ہے دل کے پاس رہے........
عنوان کے تحت کلام حیدری نے اس بات پر روشنی
ڈالی ہے کہ اردو کے ساتھ ناانصافیاں ہو رہی ہیں
لیکن اس میں اردو دشمن عناصر کے علاوہ خود ہماری
آپ کی (یعنی اردو والوں کی) بھی کوتاہیاں شامل
ہیں۔ ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد بھی کلام حیدری
کا تجزیہ آج تک درست ہے۔ کیا یہ ایک اچھے صحافی
کی پہچان نہیں ہے؟۔ مثال ملاحظہ ہو۔

"تاریخ ایسے تمام لوگوں کو، ایسے
تمام انتظامات کو، ایسی تمام تحریکات کو
جو اردو کو اس کے جائز مقامات دینے سے
گریز کرتی ہیں۔ مجرموں کے کٹہرے میں
کھڑا کر رہی ہے۔ مگر مجرموں کے کٹہرے
میں اردو کے کھلے دشمن ہی نہیں ہیں۔ ذرا
غور سے دیکھئے اس میں اردو والے بھی ہیں
...... " اس میں ہم بھی ہیں جو اردو کے
مقدمے لڑتے ہیں۔ ہم جو قلم کے سپاہی
ہیں۔ ہم جو اردو بچاؤ کے نعرے لگاتے ہیں
ہم جو ایک سے ایک اداریے، مضامین اور
احتجاجی تجاویز لکھتے ہیں۔ ہم جو اردو میں لکھتے
ہیں، ہم جو اردو کی روٹی کھاتے ہیں، ہم
جو کالجوں میں پڑھاتے ہیں، اسکولوں میں
پڑھاتے ہیں ہم بھی مجرموں کے کٹہرے میں
کھڑے ہیں ـــ "

(ہفتہ وار "مورچہ" اکتوبر ۱۹۶۶ء)

کلام حیدری کی صحافت نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بڑے بڑے مسئلوں کے علاوہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل کے پہلوؤں کو بھی شدت التزام کر دیتے ہیں وہ اپنے مخصوص تخلیقی انداز میں دوسروں کو غور و فکر کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ جس سے ان کی ذہنی وسیع المشربی اور سلامت روی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی صحافتی تحریروں میں اردو کے مشاہیر اہل قلم کی اہم کمزوریوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اور خصوصاً فکشن کے ضمن میں جو اظہار خیال کیا ہے اب وہ معتبر کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے لئے "آہنگ" جولائی و اگست ۱۹۷۸ء اور آہنگ ستمبر و اکتوبر ۱۹۷۹ء کی تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر خوف طوالت کے باعث عبارت درج کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔

کلام حیدری نے اردو کی بعض صنفوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کبھی کبھی بڑی اہم اور قابل قدر باتیں کہہ دی ہیں، ایک جگہ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ شاعری اور افسانوں کی تنقید کے لئے ایک میزان و معیار قائم کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ دونوں اصناف کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ اور ان کے تقاضے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں۔ وہ رقم فرماتے ہیں "۔

"افسانوی ادب کی تنقید کے لئے
شاعری کے ذریعہ مرتب کردہ اصول و ضوابط
سے الگ ہی اصول و ضوابط مرتب کرنے
ہوں گے، یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم شعر
سے اپنی جان چھڑالیں، یہ محسوس کریں کہ
نثر تہذیب کی دین ہے۔ اس کو پرکھنے کا
معیار اور اصول بھی علیحدہ ہوگا۔"

(ماہنامہ "آہنگ" ستمبر و اکتوبر ۱۹۷۹ء)

عہد حاضر میں بنگلہ دیش اور مغربی پاکستان اور مہاجرین کے جو حالات ہیں اس تناظر میں کلام حیدری کا آج سے تقریباً ۴۵ سال قبل کا تحریر شدہ اداریہ "مشرقی بنگال میں بہاری" ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں تفصیل کے ساتھ اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ بہاریوں نے مشرقی بنگال کے افراد کے ساتھ روز مرہ کی زندگی میں کیا سلوک کیا تھا۔ اور اس میں جو پیشین گوئی کی گئی تھی وہ بالکل صحیح نکلی مثال کے لئے ذیل میں پیراگراف درج ہے۔

"....... بنگلہ دیش تم کو ابھی خواب لگتا
ہے، مگر وہ قوم کیا کر سکے گی جو خواب نہیں دیکھتی
ہے۔ یہ خواب ابھی ادھوری حقیقت ہے
کل ٹھوس اور مکمل ہوگی۔ تم کتنے ہو جو کراچی
اور لاہور جا سکو گے۔ اور چلے گئے تو کیا
گارنٹی ہے کہ سندھ اور پنجاب میں تم کو بہاری
نہ کہا جائے گا ...."

(ہفتہ وار "مورچہ" ۲۴ اپریل ۱۹۶۸ء)

آج سے اٹھارہ سال قبل کلام حیدری نے "اسرائیل یا نازی" عنوان کے تحت ان اہم نکات پر غور و فکر کیا تھا کہ اسرائیل نے عرب پر قبضہ کیوں کر لیا؟ اور واقعات و حالات کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے لکھا تھا کہ اگر عربوں کے اندر اتحاد قائم ہو جائے تو پھر کیا مجال کہ اسرائیل یا دنیا کی کوئی طاقت ان سے ٹکرا جائے۔ میرا ابھی یہی خیال ہے کہ عربوں کی شکست فتح میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ تمام عرب ممالک متحد ہو جائیں۔ یہاں پر میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اتنا پرانا اداریہ بھی نیا معلوم ہوتا ہے اور بلا شبہ یہ آج کے کسی بھی اخبار کا موضوع بن سکتا ہے۔ یہی

ایک کامیاب صحافی کی اصل پہچان ہے۔

عصر حاضر میں ہندوستان میں تعلیم کا وقار بےحد مجروح ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم کے معیار میں دن بدن تیز رفتاری سے گراوٹ آتی جا رہی ہے۔ لیکن صد افسوس کہ اس اہم مسئلے پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ کلام حیدری کی دور رس نگاہوں نے آج سے اٹھارہ سال قبل یہ محسوس کر لیا تھا چنانچہ انہوں نے "ہمارا تعلیمی معیار" عنوان کے تحت اس مسئلے پر دعوتِ فکر و عمل دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ہمارا تعلیمی معیار پست کیوں ہے؟ اور کس طرح یہ بلندی پر پہنچ سکتا ہے۔ انہوں نے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کیلئے جو تجویز بتائی ہے وہ درست ہے۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو معیار بلند و بالا ہو سکتا ہے۔ مثلاً۔

"طبقاتی تقسیم ختم کی جائے۔ ایک طرح
کے میڈیکل کالج ملک کے کونے کونے اس
کونے سے اس کونے تک کھولے جائیں اور
امیر و غریب سب کے لئے ایک میڈیکل
نصاب، ایک ہی کالج اور ایک ہی قسم کے
اساتذہ ہوں۔ ہم نے اپنے عوام کو طبقاتی
خانوں میں بانٹ کر ملک کے عام معیار ہی کو گرا دیا
ہے۔"

(ہفتہ وار "مورچہ" ۱۱ مارچ ۱۹۶۶ء)

کلام حیدری کی صحافت نگاری کی ایک اہم قابل ذکر خصوصیت یہ کہ اس میں عاجزی و انکساری اور لہجے کی نرمی پائی جاتی ہے۔ اور یہ نرمی ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی مسافر گرمی کی چلچلاتی اور جلتی ہوئی دوپہر میں دور دراز کا سفر طے کر کے کہیں سے جب آئے تو اس کو برف کا شربت پیش کیا جائے۔ ان کے یہاں جو طرز ادا، اسلوب اور طرز بیان ملتا ہے۔ وہ نہایت عمدہ اہم اور منفرد ہے درج ذیل اقتباس کا مطالعہ کیجئے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کلام حیدری کی زبان و بیان اور انشائی کے حسن سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔

"آہنگ" قصباتی اندھیروں سے لڑنے اور
لڑکھڑا کر پھر لو کو تیز کرنے والا ایک دیا ہے جسے
ایک ادبی فقیر نے اس لئے جاری کر رکھا ہے
کہ ادب کے شہنشاہوں کی مملکت میں فقیر نہ ہو
تو ادب تپسیا سے محروم رہ جائے گا۔"
"آہنگ" ایک تپسوی کی تپسیا ہے
جس کے آگے خود تپسیا ہی ایک مقصد ہے۔"

(ماہنامہ "آہنگ" جنوری و فروری ۱۹۷۸ء)

گزشتہ صفحات میں کلام حیدری کی صحافت کا ایک اجمالی خاکہ و تعارف پیش کیا گیا۔ ان کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ کلام حیدری نے خواہ چھوٹے یا بڑے کوئی بھی مسئلے ہوں، انہیں اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کی صحافتی تحریروں کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے دل میں اردو زبان، ادب، قوم، تہذیب، ثقافت اور اپنے وطن سب کے لئے جگہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جب غریب قوم، تہذیب ثقافت، کمزور وطن اور بیچاری اردو پر آفت آئی ہے تو اس کے خلاف انہوں نے صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ اور یہی نہیں اگر حکومت وقت سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں تو اس کی بھی نشاندہی کی ہے۔ میں کلام حیدری ہی کے الفاظ میں قدرے تبدیلی کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہر ادیب یا فنکار کی شناخت اس کے فن پاروں یا اس کی تحریروں سے ہونی چاہیئے۔ اور مجھے کہنے دیجئے کہ کلام حیدری کی صحافت نگاری یقیناً اس لائق ہے کہ انہیں کسی "بیساکھی" کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ مجھے کلام حیدری نے لکھا ہے

(باقی صفحہ ۳۴۳ پر)

کلام حیدری کے تین کلیدی افسانے

مہدی جعفر

"بے نام گلیاں"
"صفر"
"الف لام میم"

اس سے پہلے میں نے کلام حیدری کی بنیادی تخلیقی رو کی پہچان جبلی رومانیت سے قائم کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ان کے یہاں رومانیت کی حدیں پاکیزگی کو چھونا چاہتی ہیں اور جن میں ایسے رشتوں کی شناخت ہوتی ہے جو ازدواجی زندگی کو باندھنے، دو دلوں کو جوڑنے بھائی بہن، ماں بیٹے، باپ بیٹی اور دوسرے قریبی رشتوں کا احاطہ کرنے کی صورت میں ابھرتی ہیں۔ یہاں تک کہ افسانوں کی ہیئت رشتوں کی لکیروں سے استوار ہوتی ہے اور یہ لکیریں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ یہ سلسلہ کلام حیدری کے یہاں سطحی نہیں بلکہ وہ رشتوں اور انسانی تعلقات کی عمیق اور پیچیدہ بنت کی نباضی کرتے ہوئے جبلت کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوتے ہیں اور اپنا تعلق کسی بنیادی ڈھانچے سے قائم کر لیتے ہیں جسے ہم آرکی ٹائپ بھی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کلام حیدری کی زبان کا جذباتی طور پر متاثر ہو جانا ان کے اپروچ کے عین مطابق ہے۔ بلکہ یہی بات ان کی نئی شناخت میں اضافہ بھی کرتی ہے۔

یہ تینوں افسانے تین مختلف دہائیوں کو ریپریزنٹ REPRESENT کرتے ہیں یعنی چھٹی ساتویں اور آٹھویں دہائیاں۔ افسانے کے ساتھ دہائیوں کا ربط اہم ہے اس لئے کہ ہر افسانہ اپنے دور کی شکل لئے ہوئے ہے۔

افسانہ "بے نام گلیاں" بہت سے کرداروں کا نمائندہ ہے۔ ہاں اس میں راوی جو خود فنکار ہی ہے، خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسی نے کرداروں اور واقعات کا انتخاب کیا ہے تاکہ ان کے توسط سے اپنی بات کہہ سکے۔ افسانہ صفر میں کرداروں کی گنتی گھٹتی ہے اور محض ایک رہ جاتی ہے ساری توجہ اسی تنہا کردار پر صرف کی جاتی ہے افسانہ الف، لام، میم تک پہونچکر کردار تعداد میں پھر اضافہ ہوتا ہے ممکن ہے یہ بات اتنی اہم نہ ہو مگر غور طلب ضرور ہے۔

"بے نام گلیاں" میں زندگی معاشرے کی سطح پر اپنی اصلی شکل میں نظر آتی ہے اس اصلی صورت حال سے یا حقیقت کی سطح سے افسانہ عرق نچوڑنے کی کوشش کرتا ہوا آخر کار اختتامیہ میں ٹھہری ہوئی صورت حال کو نچوڑ کی شکل میں پیش کرتا ہے افسانہ صفر میں عرق کا نچوڑ پیش کرنے کا عمل سارے



افسانے کو محیط ہے۔ چنانچہ یہ افسانہ کلی طور پر ابہام کی زد میں
آگیا ہے اور چونکہ کردار ایک ہے اس لئے ابہام کا اثر بھی بھر
پور ہے افسانہ "الف لام میم" میں بجوڑ کا عمل سارے افسانے
کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے اور ابہام کو سرایت کرتے ہوئے
ایک مرکزی کردار کو متاثر تو کرتا ہی ہے مگر ساتھ ہی کئی کرداروں
کو خود کلامی کے ذریعہ جوڑ دیتا ہے اور ان کے تفاعل سے اور
ان کی سطحوں کے ٹکراؤ کے باعث بڑی حد تک واضح ہو جاتا
ہے۔

جہاں تک پلاٹ کا تعلق ہے "بے نام گلیاں" میں اس
کا استعمال واضح طور پر ہوا ہے۔ افسانہ صفر، اور الف لام
میم، میں پلاٹ کی حیثیت اتنی کم ہوگئی ہے کہ اسے ہم ایک
بگڑی ہوئی شکل میں ہی دیکھ سکتے ہیں۔

افسانہ "بے نام گلیاں" میں بیانیہ سیدھا سادا اور
سامنے کی باتوں کو حقیقی طور پر ابھارتا ہے۔ خارج کو جوں کا
توں پیش کرنے کی ٹکنیک کے ذریعہ اپنی بات کہی گئی ہے ظاہر
ہے کینوس پر خارجی اشیاء اور کیفیات زیادہ تعداد میں
راہ پا گئی ہیں۔ مکالمے بھی عام بات چیت کی سطح پر ہیں، افسانہ
صفر، میں بیانیہ حقیقی نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ یہاں توڑ
مروڑ یا ٹوئسٹ TWIST کا عمل ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ
یہاں داخلیت ہے جسے واقفیت کی سطح دی گئی ہے۔
اکا دکا مکالمے جو نظر آتے ہیں وہ بھی بیانیہ کے جز ہیں اور
داخلیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ افسانے کی داخلیت خارج
کا ہی ردعمل ہے جس کا بجوڑ پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ، لام
میم میں بیانیہ دراصل سیدھے سادے اور حقیقی بیانیہ
اور مڑے تڑے ہوئے واقعی بیانیہ یا غیر حقیقی بیانیہ کا
امتزاج رکھتا ہے اس میں جذباتی برانگیختگی اور چھوٹے
ہوئے رشتوں کی آواز ایک جھنجھلاہٹ
پیدا کرتی ہے۔ مکالمے بھی شکستگی کا نقشہ پیش کرتے
ہوئے صورت حال کو ابھارتے ہیں۔ مکالمے اکثر غیر واقعی ہیں
مگر کہیں کہیں واقعی اور حقیقی بھی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھ سکتے
ہیں کہ اس افسانے میں صفر والے داخلی طریق کار اور
"بے نام گلیاں" والے خارجی طریق کار کے امتزاج سے
ایک نئے طریق کار کو خلق کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کرداروں سے متعلق ایک بات اور دیکھی جا سکتی
ہے وہ یہ کہ افسانے کا مرکزی کردار / راوی / فنکار چھٹی
دہائی میں اپنے اردگرد کے کرداروں میں زیادہ دلچسپی
لیتے ہوئے اپنے آپ سے باہر نکل جاتا تھا مگر ساتویں
اور آٹھویں دہائی میں اس کی دلچسپی کا رخ الٹی سمت میں ہوگیا
ہے اب وہ اردگرد کے کرداروں کی توجہ بھی اپنی طرف
سمیٹنے کی سعی رائیگاں میں مبتلا ہے۔ کلام حیدری کے افسانے
چھٹی دہائی سے لیکر آٹھویں دہائی تک ایک دائرہ مکمل
کر لیتے ہیں۔ اب مستقبل کا نیا دائروی سفر ان کا منتظر ہے۔

"بے نام گلیاں" ایک ایسا افسانہ ہے جو شروع ہوتے
ہی اعلان کرتا ہے کہ یہ کوئی کہانی نہیں ہے اور ختم ہوتا
ہے تو اسی اعلان کے ساتھ۔ سوال یہ ہے کہ یہ کہانی
نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ اس لئے کہ اس میں پلاٹ بھی ہے
کردار بھی ہیں۔ قصہ بھی ہے باقاعدہ آغاز بھی ہے اور
انجام بھی۔ اس میں کئی کہانیاں بھی نظر آتی ہیں جو پورے
قصے کو ایک اکائی کی شکل میں باندھ دیتی ہیں۔ پھر
بھی یہ کوئی کہانی کیوں نہیں ہے۔ ظاہر ہے افسانہ نگار
یہاں کہانی کے لغوی اور فرسودہ مفہوم سے بیزاری
کا اظہار کرتا ہے اور محض سچویشن کی بنیاد پر لکھے گئے
قصے کو کہانی کا نام دینا پسند نہیں کرتا۔ مگر بات در
اصل یہ ہے کہ وہ کہانی کے پیرائے میں فرسودہ طرز
اظہار سے اکتایا ہوا ہے وہ خبروں کو جوں کا توں
پیش کر دینے کی ایک نئی شکل تلاش کرنا چاہتا ہے

اسے محسوس ہوتا ہے کہ پرانے طرز اظہار ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ چنانچہ اس افسانے میں ہم پرانے فارم کو توڑنے کی کوشش کو پہچان سکتے ہیں۔ اگر چہ کہ فنکار احمد ہمیش کے ذریعہ آئندہ استعمال ہونے والے طریق کار کو قبل از وقت محسوس کر لیتا ہے مگر وہ اپنے افسانے کے تانے بانے خارج کی دنیا میں بنتا ہے ظاہر ہے وہ اسود ہ نہیں ہے۔ آگے چل کر احمد ہمیش نے افسانے مکھی میں خارج کی غلاظت کو نفسیاتی طور پر کردار کی داخلیت میں سمویا ہے۔ بہر حال اس تبدیلی کا پیش خیمہ "بے نام گلیاں" ہے۔ جیسے کلام حیدری نے چھٹی دہائی میں تحریر کیا ہے احمد ہمیش کی تحریروں کا ایک خاص تاثر کم وبیش کلام حیدری کے مندرجہ ذیل جملوں سے ملتا جلتا ہے۔

(۱) لال باغ نام بہت سندر اور خوبصورت ہے۔ یہاں اتنی ہی خوبصورت بیماریاں بھی رہتی ہیں، گرمیوں میں کالرا، سدا بہار ٹی بی، ملیریا، فالیریا اور ایسی بیماریاں بھی جن کا نام میں نہیں لینا چاہتا۔

(۲) ناہموار فرش کمروں کی چھتوں کو تکتا رہتا ہے۔ چھت جس کا پلاسٹر جگہ جگہ سے اکھڑ گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چھت کو برص کا عارضہ ہو گیا ہو۔ برص میں مبتلا کوٹھریوں مکانوں اور جھونپڑیوں کی یہاں کمی نہیں ہے ان بے نام گلیوں میں ہر چیز اس مرض میں مبتلا ہے۔ گلیوں کا فرش غلیظ اور تنگ مکانات ان سے لٹکتے ہوئے ٹاٹ کے پردے اور ان سے جھولتی ہوئی لاتعداد مکھیاں، جب ٹاٹ کے پردے ہوا کے تیز جھونکے یا کسی شخص کے چھو دینے سے ہل جاتے ہیں۔ تو مکھیاں بھن بھن کرتی ہوئی احتجاج کرتی ہیں۔

(۳) اپنی مرادوں کے حصول کے لئے لال باغ کی عورتیں اور رکشا والے کی قبر پر اودھڑی روئی چڑھاتے ہیں اور مرادیں پاتے ہیں۔

(۴) ان میں کچھ بوڑھی عورتیں ہوتی ہیں۔ جو اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر جوئیں تلاش کرتی ہیں اور مل جانے پر ناخنوں کے بیچ رکھ کر ہیٹ سے کر دیتی ہیں۔ اور ایک ہاتھ میں ناریل کے حقے سے ایک کش لیکر پانچ منٹ تک کھانستی اور تھوکتی رہتی ہیں۔

(۵) عورتیں جانتی تھیں کہ خیراتی محلہ کی جوان لڑکیوں کو ایک دو دن کے لئے بھی کبھی غائب کر دیتا ہے لڑکیوں والے اسے بدنامی کے خوف سے چھپا دیتے اور مشہور کر دیتے کہ وہ ماموں، چچا، اور خالہ کے گھر گئی تھیں

(۶) کئی دنوں تک نالیوں سے نکالی ہوئی، سیاہ اور بدبودار کیچڑ یونہی گلیوں میں پڑی رہتی اور رات کو کوئی انجان آدمی اپنے جوتوں میں اسے بھر لیتا اور گالیاں دیتا ہوا چل دیتا۔

ظاہر ہے سارا قصہ سچویشن کی نمائندگی کرتا ہے اور اس سچویشن سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہاں ایک بہتری کا انتظار ہے۔

(۷) جب وہ جان انتظار آئے گا۔

میں اس جان انتظار کا نام نہیں لوں گا۔

میں اسے کہانی کا نام نہیں دوں گا۔
کہ یہ کوئی کہانی نہیں ہے۔

کلام حیدری نے افسانہ "بے نام گلیاں" سے "صفر" ایک طویل سفر طے کرلیا ہے یہ سفر خارج سے داخل ہے۔ معاشرے سے فرد کا بھی افسانے کی بدلتی ہوئی کا بھی، حقیقت سے علامت کا بھی، پھیلے ہوئے سے مناظر سمٹے ہوئے کینوس سے نکل کر ایک یا چند کے پھیلاؤ کی طرف مراجعت کا بھی۔

افسانہ "صفر" تجریدی افسانہ ہے جس میں مربوط بیانیہ قائم رکھا گیا ہے۔ اس میں وقت کو ایک دائروی دیا گیا ہے یعنی زمین سے سیڑھی کے ذریعہ اٹھنا میں پر واپس گر پڑنا۔ وقت کو اس افسانے میں ایک سیٹ منٹ بھی ملا ہے یعنی پینگ / جھولے / موسیقی علاوہ ازیں وقت کو جوانی کی تازگی اور حصول کی سے ایک طرف برتا گیا ہے، تھکاوٹ اور عدم کی کیفیت سے دوسری طرف پہچانا گیا ہے۔

افسانہ اس قدر تجریدی ہے کہ اس میں ایک ہی کردار جس کے نہ خط وخال نمایاں ہیں نہ یہ بتایا گیا ہے کہ ن ہے اور کیوں اپنے بے نام اور عجیب وغریب خواہش بل کے لئے آیا ہے۔ وہ زمین کون سی ہے جہاں وہ ہے، وہ سیڑھی کیا چیز ہے اور وہ نقطہ جسے وہ گرفت ینا چاہتا ہے۔ دراصل کیا ہے پھر وہ آوازیں کون لوگوں جن کے درمیان وہ آ گرتا ہے۔

بس ہم دیکھتے ہیں کہ خواہش، لذت، طاقت، وٹ، امنگ، نا فتح مندی کا عزور وغیرہ ایسے احساسات افسانے کے تنہا کردار کی داخلی حسیات ہیں جہاں رجا پہونچا ہے۔ یہ حسیات غیر مرئی ہیں یعنی انھیں ریہج نہیں دی گئی ہے دوسری طرف افسانے کے کردار کو کچھ ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جو اس کے جسم سے باہر کی چیزیں ہیں۔ کیا واقعی جسم کے باہر کی چیزیں ہیں؟ حقیقی چیزیں ہیں یا واقعی؟ حقیقی نہیں، اس لئے کہ سیڑھی کا اوپری سرا حد نظر سے آگے جانے کہاں تھا۔ یہ چیزیں امیجز ہیں۔ سیڑھی، نقطہ، دھندلکا، زمین اور آوازیں

ظاہر ہے افسانے میں مرئی اور غیر مرئی صورت حال کا تفاعل ہے جیسے مضبوط تندرست اور جوان آدمی عمل میں لاتا ہے یا اس کا وجود اس تفاعل کا باعث ہے، وجود اور خواہش یہاں ہم وزن اور ہم معنی ہیں کوشش مضبوطی اور حصول کے بعد فتح مندی کا احساس اپنے اندر بڑھاتا ہے کہ آگے اٹھ کر پھر نقطہ کو پانے۔ ساری توجہ اور انہماک نقطہ پہ ہے جو کشش کا باعث ہے نقطہ جو بے معنی سا ہے کبھی گھٹتا ہے کبھی بڑھتا ہے اور کبھی ایک صورت بن جاتا ہے۔ نقطہ نما چہرہ بن جانا یا چہرہ تباہ دیا جانا اور اس طرح کہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ ہو، اس کے غیر ضروری حصوں کو معدوم کر دیا جانا تاکہ فرد کو متحرک رکھنے کی کوشش اور جاذبیت بڑھ جائے اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہی افسانے کا بنیادی محور ہے جس کے چاروں طرف کردار اس کے خواص اور خواہشات اس کی مراد اور نامرادی وغیرہ کی بنت تشکیل ہوئی ہے۔

سیڑھی کا لاانتہائی سلسلہ ACCOMPLISHMENT اور قدم قدم پر بڑھتی ہوئی کوشش کا اعلامیہ ہے۔

یہ کوشش زمینی نہیں ہے اس لئے کہ سیڑھی کے ہر اگلے ڈنڈے پر جھولنے والا افسانے کا واحد کردار خلا میں معلق ہو کر رہ گیا ہے اس کے قدم زمین کو چھوڑ چکے ہیں اور وہ لذتیت سے سرشار اور مسرور میں غلطاں ہے ہر اگلی سیڑھی پہ نئی مسرت اس کی

تھکاوٹ کو دور کرنا چاہتی ہے مگر کب تک۔

(۸) تب اس نے محسوس کیا وہ جس ڈنڈے کو
پکڑے ہوئے ہے وہ اس کے ہاتھ سے
چھوٹا جاتا ہے رگیں تن گئیں۔ اس کو وہ نہیں
چھوڑ سکے گا۔ اس نے آنکھیں اوپر اٹھائیں
وہ نقطہ وہیں پر تھا۔
اور تب وہ ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ
گیا۔

اس افسانے کی ایک سطح، فنی حسن پر گرفت حاصل کرنے کی سعی اور اس کی سرشاری میں فن کی بلندی کی طرف بڑھنے کا عمل اور زندگی کی نچلی سطح (زمین) سے بے رشتگی کے طور پر ابھری ہے۔

افسانہ الف لام میم قدرے طویل افسانہ ہے طویل ہونے کی دو وجہیں ہیں۔ اول تو یہ کہ اب افسانے کو پھیلنے کی ضرورت ہے تاکہ فنی طور پر وہ کسی صنف سے کم مرتبہ نہ رہے۔ اور اس کے دامن میں نقوش کو مکمل کرنے کی گنجائش ہو جائے۔ دوئم یہ کہ فنکار نے اس میں پرانی اور نئی تکنک کے امتزاج سے نئی شکل ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً صفر کی طرح اس میں ایک بنیادی کردار ہے اور اسی کی طرح داخلیت کا عمل بھی ہے۔ مگر بے نام گلیاں کی طرح اس میں کئی کردار ہیں۔ بے نام گلیاں کی خارجیت خود کلامی کی داخلیت بن کر سارے کرداروں کو لوٹا لاتی ہے ظاہر ہے اس طرح پرانی اور نئی تکنک مدغم ہو گئی ہے۔ اور افسانے میں نچوڑ کو MAGNIFIED شکل میں پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ سوئم یہ کہ فنکار کے یہاں پختگی اور سال خوردگی کی وجہ سے افسانوی گرفت بڑھی ہے اگرچہ کہ اس کے بنیادی محرکات وہی ہیں۔

میرے خیال میں اس افسانے کی اہمیت اس میں ہے کہ کلام حیدری نے اس افسانے میں ایک مخصوص تنہائی کی سچویشن کو زیادہ بھرپور انداز میں ابھار دیا ہے۔ "صفر" میں بھی تنہائی ہے مگر وہ تنہائی ایک مختلف عنوان سے پروجیکٹ کی گئی ہے "الف لام میم" میں جو تنہائی سامنے آتی ہے اس میں مرکزی کردار زمین سے منقطع ہو کر خلا میں جھولتا نظر آتا ہے۔ خلاء الف لام میم میں بھی موجود ہے مگر یہاں مرکزی کردار کے قدم زمین سے اکھڑے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ آوازوں، رویوں، اور ردعمل کے تنوع کے درمیان رہتے ہوئے ایک داخلی تنہائی کا شکار ہے اس افسانے میں HUMAN SITUATION بخوبی ابھر آئی ہے جسے بے رشتگی کے شدید احساس کی حامل نظر سے دیکھا اور پرکھا گیا ہے۔ ●●

"کلام حیدری صاحب کا تنقیدی مضمون ان کے وسیع مطالعہ اور تنقید پر ان کی مضبوط گرفت پوری پوری نشاندہی کرتا ہے، بڑا خوبصورت تجزیہ کیا ہے تخلیقی عمل کا"

وحید تابش، اردو زبان

"کلام حیدری نئے افسانے کے عمائدین میں سے ہیں۔ ان کے افسانے ادب عالیہ کی جانب مائل ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک انسانیت کا درد ملتا ہے۔"

سب رس، حیدرآباد

سخی ۔ ایک تجزیہ

احمد یوسف پٹنہ

کلام حیدری کے افسانے "سخی" کا راوی واحد متکلم میں ہے

افسانہ ذکریا اسٹریٹ کلکتہ کے ایک گندے اور چھوٹے سے ہوٹل سے شروع ہوتا ہے وہاں جو لوگ اس وقت بیٹھے ہیں ان میں ہیں، صرف ایک شخص کو پہچانتا ہے

"وہ شطرنجی ڈیزائن کی لنگی پہنے ہوا ہے، اور جس کی گنجی بجائے بٹن کے فیتے سے بند ہونے والی ہے۔ میں اسے صرف اس وجہ سے پہچانتا ہوں کہ مجھ سے مہینہ میں ایک بار منی آرڈر لکھواتا ہے، کبھی پچاس، کبھی چالیس اور کبھی سو بھی ...... بی بی سکینہ معرفت شرافت حسین، بیڑی دکان، پورنیہ"

(سخی/صفر/کلام حیدری)

اس کے بعد وہ بی بی سکینہ کا بھی تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے

"اس شطرنجی ڈیزائن کی لنگی والے کی بیوی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا نام مولا ہے اور منی آرڈر لکھواتے وقت اپنا نام مولا بخش لکھواتا ہے"

(سخی/صفر/کلام حیدری)

پھر وہ یہیں مولا بخش کے متعلق مزید معلومات فراہم کرتا ہے

"بی بی سکینہ کا شوہر پست قد گٹھا ہوا سیاہی مائل آدمی ہے۔ جس کے کان کی لو تھوڑی سی کٹی ہوئی ہے اور گالوں کی دونوں جانب کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ چہرہ بڑا اور محنتی آدمی کا سا معلوم ہوتا ہے سینہ چکلا اور گردن بھری بھری مگر وسط درجے کی لمبی ہے، آنکھوں میں چمک ہے مگر جیسے وہ دھندلاہٹوں میں ہو، داہنے ہاتھ کی شہادت والی انگلی کا ناخن نکیلا، اور لمبا ہے"

(سخی/صفر/کلام حیدری)

جسم و جاں کے اس درجہ مکمل تعارف سے ہمارے سامنے ایک محنت کش کا نقش ابھرتا ہے، اس کے داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی کا ناخن نکیلا اور لمبا ہے اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ بیڑی مزدور ہے۔

پھر ہوٹل میں دو اور افراد آتے ہیں۔ ایک کے سر پر "دلی والوں" جیسی ٹوپی ہے اور دوسرا ننگے سر ہے، ان میں ٹوپی والا شخص دو شیرمال اور دو سیخ کباب کا آرڈر دیتا ہے۔

مولابخش ابھی وہیں بیٹھا ہے' افسانے کے' میں'
بار اپنی نگاہوں سے ٹٹول رہا ہے۔
وہ قارئین کو بتاتا ہے کہ وہ اخباروں میں کالم وغیرہ
لکھتے میں رہنے کا خرچ نکالتا ہے۔

"جس اخبار کے ایڈیٹر نے مجھ سے یہاں
ملاقات کرنے کا وعدہ کیا تھا، اس کے
آنے کی امید تقریباً ختم ہو چکی ہے"
(سنی/صفر/کلام حیدری)

"ابتک وہ ایڈیٹر نہیں آیا جس نے مجھے ترجمہ
کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور جس سلسلے
میں میں نے سوچا تھا کہ کام ٹھیک ہوتے ہی
کچھ ایڈوانس مانگوں گا جس سے ذکریا اسٹریٹ
کے ایسے ہوٹلوں میں کم از کم چند دن کھپ
سکوں" (سنی/صفر/کلام حیدری)

نے کا میں بے حد فکر مند ہے، لیکن اس پریشانی کے
بھی وہ ادر گرد کا جائزہ لیتا جا رہا ہے۔

"ایک شیر مال رکھی ہوئی ہے، اوپر کا سرخی
مائل حصہ بے حد اشتہا انگیز ہے اور کباب
سے اٹھتا ہوا دھواں میں آسانی سے دیکھ
سکتا ہوں" (سنی/صفر/کلام حیدری)

سے ہم بہ آسانی یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ "میں"
تہ ہے اور کلکتہ میں تلاش معاش کے سلسلے میں
ا ہے اور چونکہ اسے اب تک کوئی معقول سی نوکری
ہے اس لئے وہ اخباروں میں لکھ کر کچھ تھوڑا بہت
ہے۔

وہ ایڈیٹر کے انتظار میں اسی ہوٹل میں بیٹھا ہے
ا رکی ان گھڑیوں میں اس کا ذہن بار بار ان لوگوں
بھٹک رہا ہے جو اس چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھے
ہیں۔ کبھی وہ سوچتا ہے کہ پتہ نہیں مولابخش کی بیوی
سکینہ کیسی ہوگی، کبھی وہ سوچتا ہے کہ پتہ نہیں اسے کوئی
بچہ ہے یا نہیں۔ اور پھر ان لوگوں کے متعلق سوچنے لگتا
ہے جو ہوٹل میں بیٹھے شیر مال اور کباب کھا رہے ہیں۔
ہوٹل میں تھوڑے سے لوگ ہیں اس لئے اس کی نگاہیں
بار بار ان ہی صورتوں کی طرف جا ٹکتی ہیں جنھیں وہ پہلے
بھی دیکھ چکا ہے۔

"اور میں سوچ رہا ہوں، سکینہ ضرور خوب
صورت ہوگی اور یہ جو مولابخش کی آنکھوں
میں جو چمک ہے، وہ اس جوان محبت
کی چمک ہے اور جو یہ چمک کسی قدر دھند
لا ہٹوں میں ہے وہ فراق یار ہے"
(سنی/صفر/کلام حیدری)

ایسے نامساعد حالات میں بھی اس کے اندر جمالیاتی احساس
باقی ہے اور وہ حسن تابندگی وصل اور فراق کے متعلق سوچ
رہا ہے، لیکن یہ سارے جلوے محض وقت گذاری کے لئے
ہیں، ورنہ اصل مسئلہ تو ایڈیٹر کا ہے۔

"وہ ایڈیٹر اب نہیں آئے گا، اور میں نے
چار دن یوں ہی بیکار گذار دیئے، ورنہ
ان چار دنوں میں دوڑ دھوپ کی جا سکتی
تھی۔ کوئی ٹیوشن ہی تلاش کی جا سکتی تھی
مگر چار روز تک اس اطمینان میں بیٹھے
رہنے کے بعد ابھی اچانک اس متوقع کام
سے مایوسی پر، آگے چلنے کی جیسے صلاحیت
ہی نہ رہی ہو" (سنی/صفر/کلام حیدری)

اسے وہ تھوڑا بہت کام بھی نہیں مل رہا ہے جس کے
سہارے وہ کلکتہ میں زندہ ہے اور یوں سخت تنگدستی
کا شکار ہے۔

"تو یہی وہ پیالی ہے، جو مجھے مزید ڈیڑھ آنے
سے محروم کر دے گی۔ اور میری جیب میں پانچ
آنے رہ جائیں گے اور کلکتہ شہر اور زکریا اسٹریٹ
اور یہ دلکشا ہوٹل۔" (سخی/صفر/کلام حیدری)

تب ہی مولا بخش اس کے پاس آکر کہتا ہے:

"ہم کل آئیں گے جی آپ رہیں گے نا۔"
(سخی/صفر/کلام حیدری)

دوسری صبح اس کی جیب میں صرف دو آنے پیسے رہ گئے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ انگریزی کی جو ڈکشنری پڑی ہے اُسے بیچ کر کچھ پیسے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

لیکن اسی وقت ہوا یہ کہ:

"میرے سامنے مولا بخش کھڑا ہے اور میں
اب منی آرڈر لکھ رہا ہوں۔ بی بی سکینہ
معرفت شرافت حسین بیڑی دوکان ـــــ
پورنیہ۔ مولا بخش۔ ساٹھ روپے۔"
(سخی/صفر/کلام حیدری)

تب ہی مولا بخش اسے بتاتا ہے کہ چونکہ اس کے مالک نے اسے جلدی بلایا ہے اس لئے وہ آج منی آرڈر نہیں لگا سکے گا۔ اس پر "میں" آگے بڑھ کر اس کی خاطر یہ خدمت انجام دینے کو تیار ہو جاتا ہے:

"وہ ہچکچاتا ہے، مگر میں اسے ہمت دلاتا
ہوں کہ آخر وہ بھی آدمی ہے ایک کام میں
اس کا کر دوں گا، تو چھوٹا ہو جاؤں گا۔"
(سخی/صفر/کلام حیدری)

اسی طرح اب "میں" کی جیب میں ایک عدد منی آرڈر فارم اور مبلغ ساٹھ روپے ہیں۔ اور وہ ٹیوشن کی تلاش میں جا رہا ہے۔

شام ہوئی تو وہ دلکشا ہوٹل میں جانے کی بجائے پارک سرکس کے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں پہنچ جاتا ہے

"میری میز پر ابھی ابھی بیرا نے ایک شیرمال
قورمے اور سیخ کباب لاکر رکھا ہے اور
میں بغور اس شیرمال کو دیکھ رہا ہوں۔ جو
بہت ملائم بے حد لذیذ اور خوبصورت
نظر آرہی ہے۔" (سخی/صفر/کلام حیدری)

اب اس کے ذہن میں اس ایڈیٹر کا خیال نہیں تھا جس نے دلکشا ہوٹل میں آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن گیارہ بجے سے تین بجے تک انتظار کرنے کے بعد بھی وہ نہیں آیا۔ ٹیوشن نہیں ملی، نوکری نہیں ملی ـــــ ہاں جیب میں ساٹھ روپے ضرور ہیں

"منی آرڈر فارم میں نے کراؤن سینما کے
سامنے پڑے ہوئے پیک کے گملے میں ٹکڑے
ٹکڑے کر کے ڈال دیئے ہیں۔"
(سخی/صفر/کلام حیدری)

متوسط طبقے کا عزت اور ذلت کا تصور بے حد غلط اور بے حد پر رعونت ہوتا ہے۔ "میں" بھی اسی طبقے کا ایک فرد

"میں مولا بخش سے بیس پچیس روپے
مانگ لیتا تو شاید وہ دے دیتا، مگر مولا
بخش کے سامنے دست سوال بڑھانے
کے خیال سے مجھے بڑی ذلت محسوس ہوتی ہے"
(سخی/صفر/کلام حیدری)

لیکن یہ کہ اس فکر میں ایک پچھتاوا بھی چھپا ہوا ہے کئی بلڈنگوں کے چکر لگانے کے باوجود اسے نوکری نہیں ملتی۔

اس کی جیب میں اب بائیس روپے کچھ آنے رہ گئے ہیں اور سکینہ کا منی آرڈر اس نے نہیں بھیجا ہے، اس بائیس روپے کے سہارے وہ کئی دن اور بھی دفتروں کا چکر کاٹ سکتا ہے۔

وہ چلتے چلتے کولوٹولہ تک آجاتا ہے۔ اسے تھیٹر روڈ کی اس کوٹھی کا خیال آتا ہے جہاں اسے آج ٹیوشن کے لئے بلایا گیا تھا۔

ناخدا مسجد کے دروازے کے باہر ایک لاش اسٹریچر پر پڑی تھی اور ایک نوجوان آواز لگا رہا تھا۔

"ایک غریب مرگیا ہے، کفن دفن کے لئے پیسے
دے کر ثواب حاصل کیجئے "

(سخی / صفر / کلام حیدری)

"فیتے سے بند ہونے والی گنجی، ایک کان کی
کٹی ہوئی لو ——— مولا بخش ———
میں اس آواز لگانے والے نوجوان سے یہ
پوچھتا ہوں۔ یہ کیسے مرا۔ ٹرک سے کچل کر؟"

(سخی / صفر / کلام حیدری)

اور پھر یہ ہوتا ہے کہ:

"میرا ہاتھ جیب میں جاتا ہے، بائیس روپے
کچھ آنے اس چادر پر پھینک کر جلدی جلدی
جانے لگتا ہوں، وہ نوجوان مجھے غور سے
دیکھ رہا ہے۔" (سخی / صفر / کلام حیدری)

"سخی" پڑھ کر جانے کیوں مجھے ہمیشہ "کفن" کی یاد آتی ہے۔ دراصل "کفن" ایسے باپ بیٹے اور بہو کے اردگرد گھومتی ہے جن کی اپنی کوئی اقتصادیات ہی نہیں۔ دونوں باپ بیٹے حد درجہ کی ذہنی پسماندگی کا شکار ہیں۔ چماروں کے کنبے سے تعلق رکھنے والے یہ باپ بیٹے گھیسو اور مادھو انتہائی کاہل الوجود اور ناکارے تھے۔ پریم چند کہتے ہیں:

"گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام کرتا،
مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو
گھنٹہ بھر چلم پیتا۔" (کفن / پریم چند کے سو افسانے)

مزدور طبقے کی جفاکشی اور لگن سے کام کرنے کی عادت ان میں بالکل نہیں تھی۔ نہایت ہی بے شرمی اور بے حیائی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ گھر میں کوئی اثاثہ نہیں تھا، کھیتوں سے مٹر اور آلو اکھاڑ لاتے اور اس کو بھون بھون کر کھاتے، یا ادکھ توڑ لاتے اور اسے چوستے رہتے۔ اس طرح وہ اپنے طبقے کے صحیح نمائندہ نہیں ہیں۔ مزدور طبقے کا کوئی فرد ایسی EFFORTLESS زندگی نہیں بسر کرتا ہے۔ جیسے کہ گھیسو اور مادھو بسر کرتے ہیں۔ برعکس اس کے "سخی" کا "میں" کلکتے میں بڑی سخت زندگی گذارتا ہے۔ وہ ٹیوشن کے لئے بھاگ دوڑ کرتا ہے، نوکری کے لئے دفتروں کی خاک چھانتا پھرتا ہے اور اخبار کے کالموں کا ترجمہ چھپنے کی امید میں چار چار دن تک ایڈیٹر کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ اس طرح متوسط طبقے کا وہ نوجوان ان بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں کا حقیقی نمائندہ ہے جو لاکھوں لاکھ کی تعداد میں ملک کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے ہیں۔

"کفن" کے دونوں باپ بیٹے نہایت ہی بہیمانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ افسانے کے سیاق و سباق سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ حد درجہ خود غرض اور SELF CENTERED ہیں اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ دنیا میں صرف اپنی بھوک مٹانے آئے تھے۔ بھوک خواہ بالائے ناف کی ہو یا زیر ناف کی ——— حد درجہ شقی القلب اور ہر انسانی احساس سے بے بہرہ۔

سچویشن یہ ہے کہ مادھو چمار کی بیوی بدھیا جو گھیسو کی بہو تھی۔

"دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ
کر اس کے منہ سے ایسی دلخراش آواز نکلتی
تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔"

(کفن / پریم چند کے سو افسانے)

اس کی آواز سن کر گھیسو مادھو سے کہتا ہے کہ وہ کوٹھری میں

جاکر دیکھ لے کہ بہو کی کیا حالت ہے تو مادھو بہانہ بناکر وہیں بیٹھا رہتا ہے وہ سوچتا ہے کہ اگر کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا (کفن)
اور یہ وہ عورت تھی جس کے متعلق پریم چند لکھتے ہیں

"جب سے یہ عورت آئی تھی، اس نے گھر میں
تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، اور
گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظام
کر لیتی۔ اور ان دونوں بےغیرتوں کا پیٹ
بھرتی رہتی"

(کفن، پریم چند کے سو افسانے)

گویا دونوں باپ بیٹے سخت محسن کش بھی تھے۔

لیکن "سچ کا، میں، تو مولا بخش کی لاش دیکھ کر چونک اٹھتا ہے ہرچند کہ اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ مولا بخش کلکتے میں کیا کام کرتا ہے دائیں ہاتھ کے شہادت کی انگلی کے بڑھے ہوئے ناخن سے ہیں یہ اشارہ ملا تھا کہ وہ بیڑی بناتا ہے۔ لیکن جب اس نے "میں" سے کہا کہ آج مالک نے جلدی بلایا ہے تو پتہ چلا کہ ہمارا اندازہ غلط تھا۔ بیڑی کارخانے کے تو اپنے اوقات ہوتے ہیں وہاں کا مالک وقت سے پہلے کیوں بلائے گا۔ ہاں 'میں' کا مولا بخش سے رشتہ یہ ضرور تھا کہ وہ ہر مہینے اس کا منی آرڈر فارم بھر دیا کرتا تھا۔ لیکن اس مہینے جب مولا بخش نے اسے بتایا کہ اسے آج منی آرڈر لگانے کی فرصت نہیں ہے تو اس نے اس کے آگے یہ تجویز رکھی کہ وہ اس کا منی آرڈر لگا دے گا۔ اور یہ کہہ کر اس سے ساٹھ روپے لے لئے۔ اس کے بعد اس کی نیت خراب ہوگئی۔ اور اس نے ساٹھ روپے اپنی جیب میں رکھ کر فارم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے پیک دان میں ڈال دیے اس کے بعد اس نے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں بیٹھ کر شیرمال قورمہ اور کباب منگوا کر اپنی اشتہا مٹائی۔

اس دن کا واقعہ ہے کہ مولا بخش ایک ٹرک کے حادثے میں جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ مولا بخش کی موت اعتماد کی موت بھی تھی۔ اس کی لاش دیکھ کر 'میں'، کو ایک گہرے تاسف نے آگھیرا تھا۔ اور اس حالت میں اس نے جیب کی بچی ہوئی رقم بائیس روپے کچھ آنے ہتھیلی ہوئی چادر پر پھینک دی تھی۔

'کفن' میں گھیسو اور مادھو کا یہ حال تھا کہ مادھو کی بیوی بدھیا دردزہ سے مر رہی تھی۔ اور وہ دونوں کوٹھری سے باہر بیٹھے بھنے ہوئے آلو کھا رہے تھے۔

"اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ
مر جائے تو آرام سے سوئیں"

(کفن / پریم چند کے سو افسانے)

دونوں باپ بیٹے جہالت اور ذہنی افلاس کے سبب انتہائی توہم پرست بھی ہیں۔ گھیسو بدھیا کے شدید درد کے متعلق سوچتا بھی ہے تو اس طرح سوچتا ہے وہ مادھو سے کہتا ہے

"جاکر دیکھو تو کیا حالت ہے اس کی، چڑیل
کا پھنساؤ ہوگا اور کیا۔ یہاں تو اوجھا بھی
ایک روپیہ مانگتا ہے کس کے گھر سے آئے"

(کفن / پریم چند کے سو افسانے)

سویرے بدھیا کو مرا دیکھ کر، دونوں باپ بیٹے روتے ہوئے زمیں دار کے پاس گئے اور اسے ایک من گھڑت کہانی سنا دی، کہ کس طرح انہوں نے بدھیا کی بیماری میں خدمت کی۔ اور کس طرح ان کے سارے پیسے اس کی بیماری میں ختم ہو گئے۔ زمین دار رحم دل آدمی تھا۔ اس لئے اس نے انھیں دو روپے دیدیئے۔ ہرچند کہ وہ ان سے نفرت کرتا تھا اور کئی بار انھیں چوری کی علت میں، وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں، پیٹ چکا تھا۔

"سچ کا، میں' مولا بخش کے ساٹھ روپے میں سے ایک بڑا حصہ خرچ کرنے کے بعد اس طرح سوچتا ہے:

ہیں مولا بخش سے بیس پچیس روپے مانگتا
شاید وہ دے دیتا، مگر مولا بخش کے
سامنے دست سوال بڑھانے کے خیال سے
مجھے بڑی ذلت محسوس ہو رہی ہے۔"
(سخی/اصغر/کلام حیدری)

FALSE SENSE OF DIGNIT
سط طبقے کا طریقۂ فکر ہے کہ جس کا شکار سخی کا "میں"

ور طلب مسئلہ یہ ہے کہ پھر "میں" نے مولا بخش کی
یوں کی؟ ۔ شاید مجبوری ـــــ کیونکہ مولا بخش
ت اس کے پاس منی آرڈر فارم لکھوانے آیا تھا اس
کی جیب میں صرف ایک دونی تھی، اور وہ ڈکشنری
خلق سوچ رہا تھا ۔

یا ایک طرف علم کو فروخت کرنے کا مسئلہ تھا اور
ف مولا بخش کے اعتماد کو ٹھیس پہونچانے کا ـــ
چا ہوگا کہ علم کو بیچکر شاید دو چار روپے مل جائیں
لیکن یہاں تو اس کے پاس پورے ساٹھ (۶۰)
تھے۔

یسو کے متعلق پریم چند لکھتے ہیں:
ہم تو کہیں گے کہ گھیسو کسانوں کے مقابلے
میں زیادہ باریک بین تھا۔ اور کسانوں
سی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے
بدلے، شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں
شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت
نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و ادب کی پابندی
بھی کرتا۔ اس لئے جہاں اس کی جماعت
کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور کھیلیتے
ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت

نمائی کرتا تھا۔"
(کفن/پریم چند کے سو افسانے)

پریم چند کے اس قول کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ جب
مادھو اور گھیسو پانچ روپے ملنے پر بڑھیا کا کفن خریدنے
گئے تو وہ اس فیصلے پر پہونچے کہ لکڑی تو ہے ہی، اس کے
لکڑی خریدنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر یہ بھی فیصلہ کرلیا
کہ کفن معمولی ہی لینا چاہئے۔
"کوئی ہلکا سا کفن لے لیں گے۔"
(کفن/پریم چند کے سو افسانے)
پھر بھٹکتے بھٹکتے وہ شراب خانے میں پہونچکر پہلے شراب کی
ایک بوتل منگواتے ہیں ـــــ مادھو نے کہا
"لوگ پوچھیں گے کفن کہاں ہے؟"
(کفن/پریم چند کے سو افسانے)
اس پر جہاندیدہ گھیسو اسے سمجھاتا ہے:
"کہدیں گے کہ روپے کمر سے کھسک گئے،
بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔"
(کفن/پریم چند کے سو افسانے)

اور پھر:
"گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں، گوشت
اور سالن اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی
ہوئی مچھلیاں...... دونوں اس وقت
اس شان سے بیٹھے ہوئے پوڑیاں کھا رہے
تھے، جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا
رہا ہو۔" (کفن/پریم چند کے سو افسانے)
گھیسو فلسفیانہ انداز میں بڑھیا کو یاد کرتا ہے۔
"ہماری آتما پرسن ہو رہی ہوگی تو اسے
پُن نہ ہوگا۔" (کفن/پریم چند کے سو افسانے)
جب مادھو بار بار گھیسو سے کفن کے متعلق سوال کرتا ہے

تو گھیسو کے متعلق پریم چند کہتے ہیں کہ وہ شاکر فطرت تھا۔ کہتا ہے۔

اسے کہیں ملے گا تو مانا کیوں نہیں ......
وہی لوگ دیں گے جنھوں نے ابھی دیا ہاں
وہ روپے ہمارے پاس نہیں آئیں گے۔
اور کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اسی طرح
بیٹھے پئیں گے اور کفن تیسری بار ملے گا۔
(کفن / پریم چند کے سوافسانے)

یعنی لوگوں کے اندر کی انسانیت اور ہمدرد دل اور ان کے جذبۂ ترحم کا باربار استحصال کرے گا۔

بھوک اور اچھے کھانے کی اشتہا انسان کی بنیادی جبلت ہے۔ اچھے کھانے کی اشتہا اگر گھیسو اور مادھو کو ستاتی ہے اور وہ ایک ٹھاکر کی بارات کا کھانا یاد کرتا ہے۔

چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور
اصل گھی کی چٹنی، رائتہ، تین طرح کے
سوکھے ساگ، ایک رسے دار ترکاری۔
دہی، چٹنی، مٹھائی، اب کیا بتاؤں کہ اس
بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں
تھی، جو چیز مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ ــــ
لوگوں نے تو ایسا ایسا کھایا کہ کسی
سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے
ہیں کہ سامنے گرم گرم، گول گول مہکتی کچوریاں
ڈالے دیتے ہیں۔
(کفن / پریم چند کے سوافسانے)

تو "سخی" کا میں بھی ہوٹل میں بیٹھا مندیدوں کی طرح اس میز کو دیکھتا ہے جس پر:

ایک شیرمال رکھی ہوئی ہے اور پر کا سرخ ہاٹل حصہ بے حد اشتہا انگیز ہے اور کباب سے اٹھتا ہلکا ہلکا دھواں میں آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔
سخی / صفر / کلام حیدری

بدھیا کے کفن کے روپے جب گھیسو اور مادھو اچھی طرح دو سیر پوریاں، گوشت اور سالن چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں اڑا چکے تو مادھو نے فرط عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔

"...... ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں آج جو بھوجن ملا کبھی عمر بھر نہ ملا۔" (کفن / پریم چند کے سوافسانے)

"سخی" کا میں، جو مولا بخش کے دیئے ہوئے ساٹھ روپے کے ساتھ پارک سرکس کے اوسط درجے کے ہوٹل میں پہنچ جاتا ہے تو اسے دلی والوں کے کھانے کی یاد آ جاتی ہے۔ اور وہ ان کا آرڈر دیتا ہے۔

میرے میز پر ابھی ابھی بیرا نے ایک شیرمال،
قورمہ، اور سیخ کباب لا کر رکھا ہے اور
میں بغور اس شیرمال کو دیکھ رہا ہوں جو
بہت ملائم، بے حد لذیذ اور خوبصورت نظر
آ رہی ہے۔" (سخی / صفر / کلام حیدری)

کفن میں دونوں باپ بیٹے خوب شراب پی لیتے ہیں۔ تو مادھو رونے لگتا ہے۔ اور تب گھیسو اسے سمجھاتا ہے۔ پھر وہ دونوں مل کر ناچنے اور گانے لگتے ہیں۔

"ٹھگنی کیوں نیناں جھمکا دے ٹھگنی"

دیر تک ناچنے اور گانے کے بعد وہ لوگ گر کر ایک طرف پڑ رہتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر ایک سوال اٹھتا ہے کہ اگر مادھو اور گھیسو مولا بخش کی رقم خرچ کر دیتے جتنی "سخی" کے میں

کی تھی تو مولا بخش کا جنازہ دیکھ کر کیا وہ بائیس ۲۲
... آنے کی رقم باقی، چادر پر ڈالنے کی بجائے چپکے سے
... کھسک نہیں جاتے۔ اور کیا آگے بڑھ کر گھیسو دھو
... نہیں کہتا، بیٹا چل شراب خانے چل کر مرنے والے
... گلط (غلط) کریں"

پریم چند کا افسانہ "کفن" ۱۹۳۵ء کے دسمبر میں
ہوا تھا۔ اور کلام حیدری کا افسانہ "سنی" ۱۹۴۷ء
... پاس کے ہندوستان کے ایک بڑے شہر کلکتہ کی دنیا
... کرتا ہے۔ گویا دونوں افسانوں کے درمیان بارہ
... فصل ہے۔ سوچنے کی بات ہے بارہ برس بعد بھی "سنی"
... سط طبقے سے تعلق رکھنے والا بے روزگار نوجوان کفن
... جیسا شاطر، عیار اور بے ضمیر نہ بن سکا۔

"میرا ہاتھ جیب میں جاتا ہے بائیس روپے
کچھ آنے اس جانکیا پر پھینک کر جلنے لگتا
ہوں۔ وہ نوجوان مجھے غور سے دیکھتا ہے۔
میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ نوجوان مجھے اب
بھی غور سے دیکھ رہا ہے"

(سنی / صفر / کلام حیدری)

یہ نوجوان جو افسانے کی آخری سطروں میں آتا
... ایک بہت ہی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کیونکہ وہ افسانے
... واحد متکلم سے یکے بعد دیگرے اپنی خاموش نگاہوں
... ایک سوال پوچھ ڈالتا ہے۔

کیا شہر میں تم ہی ایک سنی رہ گئے ؟
باقی رقم کہاں ہے ؟ ——— مولا بخش نے
تمہیں پورے ساٹھ روپے دیئے تھے ؟
کیا یہ باتیں تمہیں زیب دیتی ہیں ؟
کیا یہ تم بھول گئے کہ زندگی کے نئے سیاق و سباق
میں متوسط طبقہ ایمانداری اور دیانت داری

جیسے اوصاف کا واحد امین رہ گیا ہے ؟۔

• یہ جو لاش تم دیکھ رہے ہو یہ مولا بخش کی لاش
ہے یا بھروسے یا اعتبار کی لاش ہے ؟

واحد متکلم ان سارے سوالوں کا وار چپکے سے اپنے سینہ
پر سہہ لیتا ہے۔ کیونکہ وہ نوجوان جو اس کا زخم خوردہ ضمیر
ہے ہر طرح کی منطق اور دلیل سے لیس ہے۔

> " ہم اردو کے مستقبل کے بارے
> میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہیں۔
> اور نہ اردو والوں کے لئے یہ مناسب
> سمجھتے ہیں کہ وہ ایسی خوش فہمی میں مبتلا
> ہوں۔ کیوں کہ جس ملک میں خود زبان کا
> مستقبل محفوظ نہ لگے وہاں جریدوں اور
> رسائل کا کیا ذکر ؟
> آج فوٹو آفسیٹ پر ایک دو رسالے چند
> بڑے اشاعتی اداروں سے چھاپی گئی
> کتابیں، مختلف سرکاری اکیڈمیوں سے
> ادیبوں، شاعروں کو کتابیں چھاپنے
> کے لئے جزوی مالی تعاون، کتابوں پر بچوں
> کی طرح مٹھائی کھانے کے لئے رقوم بنام
> انعام کیا یہ باتیں کسی زندہ
> زبان کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں ؟"
>
> (آہنگ کے ایک اداریہ سے)

کلام حیدری کے تین افسانے

اُویس احمد دوراں

فنکار اپنے سماج کی پیداوار، اس کا فن سماج کے تابع عمل اور سماج سیاست کی زیر حکمرانی ہوتے ہیں۔ ماؤزے تنگ کے لفظوں میں سیاست ہر چیز پر حاوی ہوتی ہے۔ ادب کا سیاست سے گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فنکار کے فن میں صرف اس کی ذات کا عکس نہیں بلکہ اس کے عہد کی سیاست، اقتصادیات یعنی معاشرہ کا مکمل عکس نظر آنا ناگزیر ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ فن پاروں کی تخلیق کسی آسمانی دشتِ خلا میں نہیں بلکہ ہماری اسی حسین و جمیل دنیا میں ہوتی ہے اور یہ وہ دنیا ہے جو ہمیشہ بدلتی آئی ہے۔ بدل رہی ہے۔ آئندہ بھی بدلتی رہے گی۔ بقول اقبال ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

کائنات کا ارتقائی عمل جاری ہے۔ حالات بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ فنکار انسان ہوتا ہے اور انسان حالات کے تحت بدلتا رہتا ہے۔ کل کا ترقی پسند آج بورژوا خیالات کا حامل ہوتا ہے اور آج کا سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والا فنکار عین ممکن ہے کہ آنے والے کل کے دن ترقی پسند فکر و نظر کا حامل ہو جائے۔ آج کا غریب فنکار کل صنعت و حرفت کا مالک ہو جائے اور اس کی ذہنیت بھی ویسی ہی ہو جائے جیسی ایک سرمایہ دار کی ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔

دنیا کی کہانی تین لفظوں میں پوشیدہ ہے: سنگھرش، تبدیلی اور ترقی۔ سنگھرش کے بغیر تبدیلی اور تبدیلی کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔ تاریخ کا پہیا اسی طرح آگے کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ یہ پہیا کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے رک تو سکتا ہے لیکن پیچھے کی طرف نہیں گھوم سکتا۔ یہ مقولہ کہ تاریخ خود کو دہراتی رہتی ہے سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس کی حیثیت بس ایک مفروضہ جیسی ہے ورنہ اگر یہ صحیح ہوتا تو پہاڑوں کی کھوہ میں زندگی گذارنے والا زمانہ بار بار لوٹتا رہتا۔ فرعون، راجہ اور رتھ والا دور گھوم پھر کر دنیا میں بار بار نمودار ہوتا رہتا۔ مگر ایسا نہیں۔ کبھی نہیں ہوا۔ آئندہ بھی نہیں ہوگا۔ جو گزر گیا سو گزر گیا۔ گذرا ہوا زمانہ پھر کبھی پلٹ کر نہیں آتا۔

ادب بھی طبقاتی ہوتا ہے۔ ہر فنکار اپنے طبقہ کے لئے ادب کی تخلیق کرتا ہے۔ مزدور طبقہ کے ساتھ مل کر طبقاتی و سیاسی جدوجہد کرنے والا فن کار اپنے ادب کے ذریعہ دنیا کو بدلتا ہے۔ نئے نئے حالات پیدا کرتا ہے۔ وہ ظلم و جبر و استحصال کے خلاف اپنے ادب کی دھار تیز کرتا ہے اور ہر قسم کے استحصال سے پاک و صاف معاشرے کے قیام کے لئے مزدوروں اور کسانوں کے دوش بدوش جدوجہد میں شریک ہوتا ہے۔ وہ اپنے طبقہ کے لئے کمیٹڈ ہوتا ہے اسی لئے اس کا ادب بھی کمیٹڈ ہوتا ہے۔ وہ اپنے طبقہ سے

ظر میں نہیں چراتا۔ بے وفائی اور غداری نہیں کرتا۔ لیکن ی ممکن ہے جب وہ اپنے ادب کے ذریعہ طبقاتی کشمکش کی ادا کرنے میں مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ خود کو مکمل وابستہ کر دے۔ ایک بار پھر ماوزے تنگ کے الفاظ ہیں
EAT TO GETHER.LIVE TO GET
WORK TO GET پر عمل کر کے ہی فنکار اپنے طبقہ ہ سچا ادب تخلیق کر سکتا ہے۔ اگر وہ طبقاتی و سیاسی ہد کی راہ سے ہٹ جائے تو پھر اس کے طبقاتی و سیاسی نظر کا دھندلا جانا یقینی ہے۔ ایسے ادیب اور فنکار جاتے ہیں۔ جو سنگھرش کی راہ ترک کر دیتے ہیں۔ کلام ی بھی جب تک اپنے طبقاتی نقطہ نظر کے ساتھ مزدور ے لئے کمٹیڈ رہے اور ادب کے ذریعہ سنگھرش کرتے ب تک وہ بھٹکے نہیں۔ لیکن جب انہوں نے طبقاتی لک کو خیر آباد کہہ دیا اور سنگھرش کے کانٹوں بھرے رک کر دیئے تو ان کے ادب میں طرح طرح کے بھٹکاؤ ا شروع ہوئے یعنی وہ پٹری سے اتر گئے۔ اپنی عمر کے نصہ میں تو وہ تصوف تصوف کی بے روح رٹ لگانے حالانکہ نہ وہ صوفی تھے اور نہ وہ فقیر۔ مگر یہ بھی حقیقت م حیدری نے کارخانہ کا مالک ہونے کے باوجود خود کو انے والی مشین میں تبدیل نہیں کیا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے پچھلی ترقی پسندی آگے چل کر اس وقت مالکانہ ذہنیت لی ہو گئی جب وہ کارخانہ دار ہو گئے لیکن چونکہ وہ بنیادی یب تھے اس لئے صرف روپیہ ان کی ذہنی و قلبی آسودگی ی فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان و ادب کی نشر و اشاعت کا کام پوری ی و دلچسپی اور استغراق و انہماک کے ساتھ کیا۔ اردو دب کی خدمت پہلے اور کارخانہ کی دیکھ بھال بعد میدان کا طریقہ کار کچھ اس قسم کا تھا۔ اور اگر میرا یہ

خیال صحیح ہے تو کلام حیدری اپنے آئے دن کی زندگی میں بہت سی فروگذاشتوں کے باوجود محض اپنی ادبی خدمات کی وجہ سے مدتوں بہار ہی نہیں بہار کے باہر بھی یاد کئے جائیں گے اپنی خوبصورت اور آرام دہ قیام گاہ رہنا یا دس میں صرف عیش و عشرت کے سمندر میں نہیں ڈوب کر کلچرل اکادمی قائم کرنا، ایک معیاری ادبی ماہنامہ "آہنگ" کا اجرا کر کے برسوں اس کی اشاعت میں لگے رہنا اور ہفتہ وار "مورچہ" پر ڈٹ جانا کلام حیدری کے قابل قدر کارنامے ہیں۔ انہوں نے معیاری افسانے لکھے اور اردو کے نقادوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان کی موت سے اردو زبان و ادب کو واقعی نقصان پہنچا ہے۔ وہ کافی ذہین و فطین طباع اور انسانی نفسیات کے ماہر تھے۔ "کس کی کہانی" "بستی" اور "عنابی کانچ کا ٹکڑا" ان کے اہم افسانے ہیں۔ "کس کی کہانی" میں افسانہ نگار کا ماضی ہے بچپن کی سہانی یادیں ہیں۔ گاؤں ہے۔ گاؤں کی البیلی اور سالونی سلونی فضا ہے کھیتوں کی لہراتی ہوئی پگڈنڈیاں ہیں۔ ان پگڈنڈیوں سے سہاگ کے جوڑے میں لپٹی ہوئی دلہن کو ایک خوبرو اجنبی لئے جا رہا ہے۔ سمٹی سمٹائی، شرمیلی لجائی دلہن اپنے اجنبی پیا کے ساتھ دلیس جا رہی ہے۔ یہ دلہن اور کوئی نہیں خود افسانہ نگار کی بہن ہے جس کو وہ پیاری آپا پیاری آپا کہتا رہتا ہے۔ افسانہ میں رومانیت ہے، جو قاری کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے رومانی کسک ہے جو قاری کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتی رہتی ہے۔ جو بھی یہ افسانہ پڑھے گا اس کو اپنا بچپن اور اپنا سہانا گاؤں یاد آئے گا۔ بچپن کی حسین یادیں ناقابل فراموش ہوتی ہیں۔ وہ انسان کو مرتے دم تک تڑپاتی رہتی ہیں۔

تقسیم ہند کے دور کا یہ خوبصورت افسانہ دل میں سما جانے والے ٹچز TUCHES سے بھرا ہوا ہے ہندوستان

اور پاکستان کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ ہندوستان کے لاکھوں مسلمان ٹوٹے پیمانے پر ہجرت کر کے اپنے دلوں میں بے وطنی کا درد لیے سابق مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) اور سابق مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) جا چکے تھے۔ افسانہ نگار کے دل و جان سے پیاری آپا بھی سرحد پار جا چکی تھیں۔ وہ تو دوبارہ لوٹ کر اپنے وطن نہیں آئیں اور نہ ہی وہ خوبرو ابھی آیا جو افسانہ نگار کی بہن کو بیاہ کر لے گیا تھا۔ لیکن اس کا بیٹا جو اپنے خوبرو باپ کی ہو بہو تصویر تھا برسوں کے بعد افسانہ نگار کے گھر آیا ہے وہ سویا ہوا ہے۔ افسانہ نگار اس کے سراپا کا بغور مشاہدہ کر رہا ہے۔ وہی پیشانی، وہی ستواں ناک، وہی تابناک اور خوبصورت عارض اور وہی باوقار شخصیت افسانہ میں فلیش بیک FLASH BACK سے کام لیا گیا ہے۔ آج کل کے نقادوں کی اصطلاح میں افسانہ نگار ناسٹلجیا کی گرفت میں ہے۔ افسانہ پر نرگسیت کی چھاپ ہے جو بڑی خوبصورت اور دلپذیر ہے۔ یہ چھاپ سیدھے اپنے قاری کے دل میں اتر جاتی ہے۔ اور اس کو اس کے بچپن کی یادوں میں محو کر دیتی ہے۔

دوسرا افسانہ بستی۔ افسانہ نگار کے قیام کلکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس زمانہ میں افسانہ نگار بے روزگاری کے کرب میں مبتلا تھا۔ وہ مفلس و قلاش تھا۔ کلکتہ کی سڑکوں کی خاک چھاننا اس کا مقدر تھا۔ کلکتہ کا ذکریا اسٹریٹ و لکشا اسٹریٹ، و لکشا ہوٹل، ناخدا کی مسجد، تھیٹر روڈ، ڈلہوزی اسکوائر، کولوٹولہ اسٹریٹ وغیرہ کے ذکر سے افسانہ بستی بھرا ہوا ہے۔ کلکتہ کے یہ وہ مقامات ہیں جو بہت مشہور ہیں ذکریا اسٹریٹ، و لکشا اسٹریٹ وغیرہ اردو کے ادبا و شعرا کے محور و مدار کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہاں اردو شاعروں اور ادیبوں کی کہکشاں جگمگ جگمگ کرتی رہتی تھی (آج بھی یہ علاقے موجود ہیں مگر اس کی پچھلی تابانیاں معدوم ہو چکی ہیں) افسانہ نگار ٹیوشن

کر کے اپنی بھوک کی آگ بجھانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے۔ ٹیوشن بھی بمشکل ملتا ہے۔ وہ ہوٹل میں آتا ہے اور ایک پیالی چائے لے کر گھنٹوں ایڈیٹر کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے۔ مولا بخش نام کا ایک کردار ہے جو شطرنجی ڈیزائن کی لنگی پہنے رہتا ہے، اس کی لنگی بجائے بٹن کے فیتے سے بند ہوتی ہے یہ اس زمانہ کا ایک نیا اور پرکشش فیشن تھا افسانہ نگار اس کو صرف اس لئے پہچانتا ہے کہ وہ مہینہ میں ایک بار اپنی بیوی سکینہ کے لئے کبھی پچاس، کبھی چالیس اور کبھی سو روپے کا منی آرڈر لکھواتا ہے۔ یہ پوچھنے پر کہ بھیجنے والے کے پتہ کیا ہونا چاہئے مولا بخش جواب دیتا ہے کہ افسانہ نگار اپنا پتہ لکھ دے افسانہ دلچسپ اور اسلوب تقریباً بیانیہ ہے ان میں جتنے کردار ہیں اگرچہ ان میں کوئی مبہم اور دھندلے نقوش کا حامل نہیں ہے۔ پھر بھی افسانہ نگار نے ان کرداروں کو بالکل عریاں بھی نہیں کیا ہے۔ یہی اس افسانہ کا سب سے بڑا ادبی حسن ہے افسانہ کا قاری اکثر ایسے مقامات اور ایسی فضاؤں سے بھی گذرتا ہے جہاں اس کو ڈرامائیت کا احساس ہوتا ہے۔ افسانہ نگار نے اگرچہ تفصیل نگاری سے کام لیا ہے لیکن تفصیل نگاری افسانہ کی فنی خوبیوں کو کم نہیں کرتی افسانہ طویل ہے لیکن اس کی طوالت قاری کی دلچسپی کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔

سکینہ پورنیہ کی رہنے والی ہے۔ اس کا انکشاف خود افسانہ نگار کرتا ہے اور میرے علم کے مطابق افسانہ نگار نے بھی اپنی جد و جہد کی ابتدا غالباً فاربس گنج کالج سے کی تھی۔ افسانہ کا کلائمکس درد انگیز و حیرت خیز ہے مولا بخش اپنی بیوی سکینہ کے نام ۶۰ روپے کا منی آرڈر فارم افسانہ نگار سے حسب معمول لکھواتا ہے۔ اور عسرت و مفلسی کا شکار افسانہ نگار مولا بخش جیسے معصوم و سادہ لوح مزدور کو چکمہ دے کر ۶۰ روپے اپنی جیب میں یہ کہہ کر رکھ لیتا ہے کہ وہ سکینہ کے نام

روے گا۔ مگر وہ روپے کبھی منی آرڈر نہیں کیے گئے۔
روٹیوں کی آج سے پچاس سال قبل زبردست قدر
۔ اتنی بڑی رقم نے افسانہ نگار کو اچانک امیر بنا دیا
ہ ہوٹل میں بیٹھ کر ٹھاٹ سے شیرمال کھاتا ہے اب
کا انتظار ہے اور نہ ٹیوشن کی پرواہ۔ ذکریا اسٹر
رک سرکس، ہٹیٹر روڈ، ڈھوزی اسکوائر وغیرہ
بدولت گھر آنگن بن گئے ہیں۔ جب جی چاہا یہاں
چلے گئے، ٹرام اپنی ہر سواری اپنے، بس اور دوسری
سری جنگ عظیم کے دوران جاپانی ہوائی جہازوں
کلکتہ کی بہت سی عمارتوں کو کھنڈر میں تبدیل

فسانہ کا اختتام پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے
بنا خدا کی مسجد ہے وہی ذکریا اسٹریٹ کے
ں کے دروازے کے باہر ایک لاش اسٹریچر
رپڑی ہوئی ہے اور ایک نوجوان آواز لگا
رہا ہے" ایک غریب مرگیا ہے کفن دفن کے
ئے پیسے دیکر ثواب دارین حاصل کیجئے"
ی اور کی نہیں۔ ٹرک سے کچل کر مرجانے والے
مزدور کی لاش ہے۔ جو سکینہ کے پاس منی آرڈر
پہلے خدا کے پاس پہنچ گیا۔ افسانہ نگار کی جیب میں
پے کچھ آنے اب بھی موجود ہیں۔ ساٹھ روپے خرچ
تے بھی سارے کے سارے خرچ نہیں ہوئے کہ وہ
سیر کا تھا بیس روپے کچھ آنے جلدی سے لاش کے
نک کر افسانہ نگار تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ جاتا
فن کے لئے دو آنے کی خاطر راہگیروں سے اپیل
ل نوجوان افسانہ نگار کو غور سے دیکھتا ہے وہ بھی
مڑ کر دیکھتا ہے افسانہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ سنی
؟ افسانہ نگار ؟ یا مولا بخش ؟ اس کا فیصلہ

مصنف نے اپنے قاری پر چھوڑ دیا ہے۔

جو فن پارے اپنے قاری کے دل پر دیرپا نقش چھوڑ جاتے ہیں وہ کبھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرتے وہ بہت کچھ یا سب کچھ اپنے قاری کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ میری دانست میں کلام حیدری کے زیر مطالعہ افسانہ میں یہ فنی خوبی موجود ہے۔ افسانوی ادب کے زیادہ تر نقاد افسانہ کے اس پہلو کو ادبی حسن تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظروں میں اس قسم کی رازداری و تہہ داری معیاری افسانہ کی بہترین شناخت ہے۔

سب سے تیسرا افسانہ۔ "عنابی کانچ کا ٹکڑا" کلام حیدری کے اس دور کی عکاسی کرتا ہے جب وہ صنعت کار بن چکے تھے۔ اس افسانہ کی زبان فضا اور علامتیں سب کی سب لہولہان ہیں۔ اور افسانہ زیادہ طویل ہے اور پیچ در پیچ ارتقائی مدارج طے کرتا ہوا اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔

۱۹۴۷ء سے ہندوستان میں مسلم کش فسادات ہوتے آرہے ہیں۔ کوئی مہینہ فسادات سے خالی نہیں گذرتا۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ افسانہ میں اسی فتنہ و فساد کی مدد سے ایک نسوانی کردار کی زبان رکھ دیا اور اس کے منہ میں ایک ضعیف العمر عورت کی زبان رکھ دیتا ہے۔ وہ عورت سوشیل کی ماں کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی فنی پختگی اور چابکدستی سے اس عورت کے ذریعہ افسانہ کا آغاز کرایا ہے۔ یہ آغاز بھی ڈرامائیت کا حامل ہے عورت شروع تا آخر سارے واقعات اس طرح دہراتی ہے۔ جیسے وہ ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو۔ سوشیل اس کا نوجوان بیٹا مگر بے روزگار ہے۔ نوکری کی تلاش اس کو در بدر پھراتی ہے۔ وہ بمبئی بھی جاتا ہے۔ افسانہ میں کئی مسائل بیک وقت نظر آتے ہیں۔ افسانہ نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر مسئلہ کو بڑے سلیقے سے پیش کرتا ہے۔

موشیل کی ماں کا لہجہ جذباتی ہے دراصل یہ جذباتی لہجہ خود افسانہ نگار کا ہے۔ مسلم کش فسادات، پی این اوک جیسے جھوٹے اور فتنہ و فساد برپا کرانے والے مغلیہ کا عہد کی تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا۔ اردو کو تقسیم کی زبان قرار دینا یا یہ کہنا کہ اردو کوئی زبان نہیں بلکہ ہندی کی ایک شیلی (اسلوب) ہے۔ یہ اور اسی قسم کے کئی اور مسائل ہیں جو بہت چبھتے ہوئے ہیں، افسانہ نگار چونکہ اس سماج کا ایک فرد ہے جو اقلیت میں ہے اور اس کی مادری زبان اردو ہے جس کی اس نے دل و جان سے خدمت کی ہے اس لئے وہ پی این اوک کی مسلم کش فسادات برپا کرانے والی توڑی مروڑی ہوئی تاریخ دانی سے جز بز ہے۔ تاج محل ایک مغل شہنشاہ کی دین ہے مگر اکثریت کا غرور پی این اوک اور ان کے شاگردوں سے یہ ڈھنڈورا پٹواتا رہتا ہے کہ شاہجہاں نے نہیں بلکہ کسی راجپوت راجہ نے تاج محل کی تعمیر کرائی تھی۔ افسانہ نگار حساس دل و دماغ کا حامل ادیب ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان صرف قتل نہیں کئے جا رہے ہیں بلکہ ان کا ہند ایرانی کلچر جس کے سایہ میں اردو زبان و ادب پروان چڑھے ہیں ملیا میٹ کیا جا رہا ہے۔ ان پر صرف عرصۂ حیات ہی نہیں تنگ کیا جا رہا ہے بلکہ ان کی بری طرح تحقیر و تذلیل ہو رہی ہے ان کا وقار مٹی میں مل رہا ہے افسانہ نگار کی روح یہ دیکھ کر بے چین ہے کہ مسلم معاشرہ کی لڑکیاں غیر مسلم نوجوانوں کی طرف التفات بھری نظروں سے دیکھتی ہیں۔ اس قسم کی شعلہ جوالہ لڑکیاں جن کا تعلق مسلم معاشرہ سے ہے ان بڑے افسروں کی بیٹیاں ہیں جو کلبوں اور رقص گاہوں میں اپنی عصمت ودری کراتی پھرتی ہیں۔ مسلم معاشرہ سے تعلق رکھنے والے افراد کی پامال نفسیات کو وہ غنایی کا نغمہ کا ٹکڑا۔ میں جس فنی مہارت کے ساتھ اجاگر کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ افسانہ نگار افراد کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتا ہے وہ انسانی حقوق کی بحالی کا علمبردار ہے۔

اس کی روح کو یہ احساس ڈستا ہے کہ مسلم معاشرہ سے تعلق رکھنے والے افراد ہندوؤں کے جذبۂ انتقام کا بری طرح شکار ہو رہے ہیں۔ افسانہ نگار چاہتا ہے کہ مسلم کش فسادات کا سلسلہ ختم ہو جائے اور ہندوستانی مسلمانوں کو وہ سارے حقوق حاصل ہو جائیں جو ہندوؤں کو حاصل ہیں تاکہ ہندو ان کے ساتھ برابری سے پیش آئیں مسلمان جو آج نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھے جا رہے ہیں ان کو بھی وہی وقار اور افتخار اور سماج میں وہی قدر و منزلت اور سربلندی حاصل ہوں جو ہندوؤں کو حاصل ہیں اس لئے کہ وہ بھی اس ملک کے درجہ اول کے شہری ہیں، دو نمبر کے شہری ہرگز نہیں ہیں۔ ان کے بزرگوں کی لاشیں یہیں دفن ہیں۔ خود وہ یہیں دفن ہوں گے۔ جنگ آزادی میں بھی مسلمانوں کی بھرپور شرکت رہی ہے۔ اور ہندوؤں کے شانہ بشانہ وہ بھی برطانوی سامراج کے خلاف لڑے ہیں۔ ان کے آبا و اجداد بھی انگریزوں کے ظلم کا نشانہ بنے ہیں۔ مگر آزادی کے بعد مسلمانوں کو ہندوستان کی تاریخ میں وہ جگہ نہیں ملی جس کے وہ مستحق ہیں افسانہ نگار کا یقین محکم اس امر میں پنہاں ہے کہ کوئی سیاسی جماعت یا حکمراں طبقہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود نہیں کر سکتا۔ وہ قتل کئے جاتے ہیں مگر پھر اسی جگہ آباد ہو جاتے ہیں۔ دوب کی طرح پھر ابھر آنے کی صلاحیت رب العالمین نے اپنے ہر بندہ کو بخشی ہے۔ اس قوت نمو سے انسان تو انسان نباتات و جمادات چرند و پرند کوئی محروم نہیں ہے۔ لہٰذا کسی فرد یا سیاسی جماعت کا یہ سوچنا کہ مسلم کش فسادات سے مسلمان مٹ جائیں گے یہ خام خیالی ہے۔ خود وہ سیاسی جماعت فسطائی

...وں۔ سچ تو یہ ہے کہ نہ مسلمان ہندوؤں کو مٹا
...ر نہ ہندو مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے نابود کر سکتے
...ستان میں یا ہندوستان سے باہر بڑی اقلیتیں
...ب کی سب غیر محفوظ ہیں اور چھری کی دھار پر
...رہی ہیں۔ اس جدوجہد کی رفتار کہیں تیز ہے اور
...ہندوستان میں اقلیتوں بالخصوص مسلم اقلیت
...لڑنے والی سیاسی جماعتیں موجود ہیں۔ یہ ہندو مسلم
...دشمن نہیں ہے۔ ہندوؤں میں ایسے ہندو ایک
...کروڑوں کی تعداد میں ہیں جو فسادات کو ناپسند کرتے
...ستان کی ترقی کی راہ میں خون خرابے زبردست
...بنا کرتے ہیں یہ بات کروڑوں ہندو اچھی طرح سمجھتے
...اندر یہ شعور پیدا ہو چکا ہے کہ کشت و خون کا طوفان
...رات نہیں ہونے دے گا، بے روزگاری کا مسئلہ
...سنگین ہو جائے گا جس کی زد میں مسلمانوں سے
...ہندو آئیں گے، اقتصادی بدحالی مزید شدت
...ئے گی، مزدوروں اور کسانوں کو روزی روٹی کے
...یں گے ملکی و بیرونی اجارہ دار سرمایہ داروں
...گی۔ بیرونی سیاسی سازشیں جن کی پشت پناہی
...ہے ہندوستان کو لبنان بنا کر رکھ دیں گی۔
...ستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ کلام حیدری
...د پر اپنی پٹری سے اترنے کی باوجود ان تلخ حقائق
...سمجھتے تھے۔ "عنابی کانچ کا ٹکڑا" ان کا پہلا افسانہ
...میں سمجھتا ہوں کہ یہ برسوں پہلے لکھا گیا ہے اس
...کلام حیدری نے تصوف تصوف چلانا شروع نہیں
...اکر (DERAILMENTS) کے باوجود
...تک ان کے اندر ترقی پسندی کی رمق باقی تھی اور
...نے لکھا ہے کہ ان کے اندر اس بات کا اٹوٹ یقین
...وں کا غول کا غول ہندو اکثریت والے علاقوں

میں بھی اتحاد کا مسلم خاندانوں کو ہمیشہ کے لئے صفحہ ہستی
سے نیست و نابود نہیں کر سکتا۔

اونچی ذات کے فرقہ پرست ہندو صرف مسلم اقلیت
ہی کو نہیں بلکہ ہندوستان کی دیگر اقلیتوں کو بھی جانی و مالی
نقصان پہونچا رہے ہیں۔ وہ بھی سیاسی سازشوں کی زد
میں ہیں۔ ہریجنوں کے گاؤں کے گاؤں پھونکے جا رہے ہیں۔
دلتوں اور آدیباسیوں پر بہار و اڑیسہ اور مہاراشٹر
ہی میں نہیں سارے ہندوستان میں جہاں جہاں وہ ہیں
ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ اونچی ذات کے
ہندو زمین داروں نے غریبوں کی نیند حرام کر دی ہے غریبوں
میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ مسلمان زمین دار بھی جہاں
جہاں ہیں ان کا کردار بھی زبردست ہندو زمین داروں
سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ہندو زمین داروں اور مسلمان
زمین داروں کا طبقاتی مفاد ایک ہے۔ اس لئے دونوں مل
کر غریبوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ مگر مزاحمتوں کا سلسلہ ہر
جگہ جاری ہے۔

"عنابی کانچ کا ٹکڑا" میں بھی راجندر سنگھ بیدی
کے افسانہ "لاجونتی" کی طرح اغوا کا کرب موجود ہے حساس
فنکار اس قبیل کے چبھتے ہوئے مسئلہ کو اپنے لئے روحانی کرب
تصور کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ کرب صحیح ہے تقسیم کے
المیہ کے وقت بھی یہ کرب موجود تھا۔ آج بھی موجود ہے۔
"عنابی کانچ کا ٹکڑا" میں بھی ایک اغوا شدہ مسلمان لڑکی
دکھائی دیتی ہے۔

FLASH BACK

"ہر جوڑی تو ہے لیکن سال کون سا ہے؟
نہیں معلوم۔ فساد شروع ہوا۔ سامنے
والے مکان میں کوئی مسلمان خاندان رہتا
تھا۔ سوشیل کی نیک دل ماں نے دیکھا۔

فسادیوں کا مجمع مکان میں گھس گیا،

"توڑو — مارو — چیخ پکار، — کم از کم ایک گھنٹہ تک یہ ہنگامہ برپا رہا۔ کواڑوں کے ٹوٹنے کی آوازیں، بھاگ، دوڑ اور دس بجے رات میں جب پولس آئی تو محلہ قبرستان کی خاموشی طاری تھی، سامنے کا مکان اجڑا ہوا تھا، دروازے ٹوٹے ہوئے تھے، خالی بکس اور پھٹے کپڑے سڑکوں پر بکھرے تھے۔ دالان میں صرف ایک بوڑھی عورت اور ایک پندرہ سولہ سال کا نوجوان خون میں نہایا ہوا پڑا تھا،"

پھر FLASH BACK

۲ جنوری کی تاریخ جا لگتی ہے۔ فسادات پر قابو پالیا گیا ہے مگر حکمراں طبقہ کے آنجہانی رہنمایان سیاست نے یہ کہکر فسادات کی سنگینی کو ختم کر ڈالا ہے کہ فلاں جگہ کا فساد کسی دوسری جگہ کے فسادات کا ردعمل ہے۔ اور عمل و ردعمل کا یہ ہولناک سلسلہ اپنی پوری شدت اور بربریت کے ساتھ جاری ہے۔ افسانہ نگار پر بھی سامنے والے مکان کے خالی ہوجانے کا ردعمل ہے جس میں غم و غصہ بے چینی اور بے بسی کا عنصر شامل ہے اس لئے کہ اب وہ عنابی رنگ کے شیشہ والی کھڑکی کے کھلنے کے بعد دو خوبصورت آنکھیں دکھائی نہیں دیں گی۔ فسادیوں نے اٹھارہ سالہ لڑکی کو اغوا کرلیا ہے اس کا باپ جو کلکتہ میں پھلوں کی دوکان کرتا تھا جب اپنے محلہ میں آیا تو پاگلوں کی طرح گھوم رہا تھا۔ یہ کہانی غالباً کلکتہ کے مسلم کش فساد ۱۹۶۴ء سے تعلق رکھتی ہے ایک اور اقتباس:

"پیارے بیٹے سوشیل تم کو یہاں سے گئے چھ مہینے ہوگئے۔ مگر میں ماں ہوں اس لئے مجھے لگتا ہے جیسے برسوں بیت گئے۔ پھر تمہارے شہر میں ہندو مسلم دنگا ہونے کی خبر ملی تو میں بدحواس ہوگئی اگر تمہارا تار وقت پر نہ ملتا تو میں تمہارے پاس چل پڑتی چاہے کوئی مسٹنڈا مار ہی کیوں نہ دیتا۔"

مزید اقتباسات:-

"بٹیا تم بھگوان کرے ہمیشہ اچھے رہو۔ سنا ہے اس دنگے میں بہت سے مسلمان مارے گئے ہیں اور بہت سے بھاگ گئے۔ سریندر چودھری مکھیا کا لڑکا کہہ رہا تھا کہ تمہارے شہر میں بہت زیادہ مسلمان رہتے تھے اور بڑا اچھا کاروبار کرتے تھے اور ہندوؤں کو نوکر رکھتے تھے اور ان پر بہت ظلم کرتے تھے۔ کہتا تھا کہ اسے مسلمان کو دیکھکر جی چاہتا ہے کہ کچا چبا جائے۔ ذرا غصیلا ہے نا یہ،"

افسانہ نگار کا مندرجہ بالا ٹکڑا بہت اہم ہے یہ پورے افسانہ کی جان ہے افسانہ نگار کے خیالات کی ترسیل اس سے بخوبی ہوجاتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو بعض علاقوں بلکہ صوبوں میں سیاسیات و اقتصادیات پر آزادی سے قبل مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ وہ اکثر بیشتر ہندوؤں پر ظلم کرتے تھے ظلم کبھی نہ کبھی رنگ لاکر رہتا ہے ظالم خواہ ہندو ہوں یا مسلمان تاریخ ان کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ بدلہ لے کر رہتی ہے۔ مکافات عمل کا سلسلہ در سلسلہ بڑا ہولناک اور تباہ کن ہوتا ہے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے، معصوم اور بے قصور لوگ بھی "روز مکافات" کی زد میں آجاتے ہیں۔ انتقام کی آگ دھیرے دھیرے سلگتی ہے اور ایک نہ ایک دن کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتی ہے۔ بنگلہ دیش میں بہار

کے اردو بولنے والے مہاجرین کے ساتھ کیا کچھ
ہا ہے۔ ہندوستان میں آزادی کے بعد مسلم کش
میں مسلمانوں کا بھی حشر ہوا۔ کلکتہ کے ۱۹۶۴ء
ت نے اقتصادی طور پر مسلمانوں کی کمر توڑ دی۔
بہ کے کارخانے مسلمانوں کے تھے سب کے سب
لے گئے۔ بمبئی کے ۱۹۹۳ء کے فسادات میں مسلمانوں
ی طور پر کچل ڈالا گیا۔ چند مجرم اور قصوروار مسلمانو
ا پوری مسلم قوم کو بھگتنی پڑی۔ تو یہ ہے ہندو اکثریت
جذبہ انتقام کی وہ ہولناک آگ، جس میں صرف
ہی نہیں، سارا ہندوستان جل رہا تھا۔ قومی
جل کر راکھ ہو رہی تھی۔ قومی آمدنی ابتک خسارہ
ہے۔ یہ ہولناک آگ کب؟ اور کیسے بجھے گی؟
صرف ملی جلی مزاحمت اور تاب مقاومت سے۔
فسانے کے کچھ اور کربناک ٹچز (TUOCHIS)
ملی ٹیبل پر مسٹر قادر بیگ ریٹائرڈ کمشنر جھکے ہوئے
نے میں ان کی صاحبزادی بے حد شوخ سرخ
ساری میں ملبوس شعلۂ جوالہ بنی دوسرے کونے
ے یونیورسٹی میں ہسٹری کے ریڈر مسٹر بھارگوا کو
بار رہی تھیں۔ جو گوپی رام ڈوڈا بیا کو سمجھا رہے تھے
ن کی تحقیق کے مطابق تاج محل دراصل شاہجہاں
ا نہیں تھا بلکہ اسے ایک راجپوت راجہ نے تعمیر کرایا تھا۔

ہلو مسٹر بھارگوا! صفدر عارفی نے اچانک
مرے میں داخل ہوتے ہوئے بھارگوا کو للکارا۔
بھارگوا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ
صفدر عارفی کی طرف ہاتھ ہلا دیا،
تو میں کہہ رہا تھا، ڈوڈا بیا جی، تاج محل
ہی نہیں بلکہ دوسری ایسی عمارتیں جو مسلم
ادشاہوں کے کارناموں میں شمار ہوتی

ہوتی ہیں دراصل ہماری ہی بنائی ہوئی ہیں۔ یہ
تو مغل عہد میں لکھی جانے والی تاریخیں
خاص طور پر لکھی گئی ہیں جس سے ہندو
تہذیب کے کارنامے بھی مسلمانوں کی
تہذیبی برتری کے ثبوت میں پیش کئے
جا سکیں۔

یہ ٹچز (TUOCHIS) ہندو اکثریت کے غرور کے عکاس ہیں۔ ان میں موجودہ تاریخ کا جبر پنہاں ہے۔ حالات کے ہاتھوں ایک تہذیب کی پسپائی اور دوسرے کا عروج اور برتری ہے۔ تاریخ کے چہرہ کو رائفل کی لبلبی دبا کر مسخ کرنے کی سازشیں رچی جا رہی ہیں۔ فرقہ پرستی کا زہر ہندوستان کی البیلی اور سہانی فضاؤں میں گھول دیا گیا ہے اوک اور ان کے سپنوا بھارگوا جیسے تاریخ دانوں اور محققین کی تنگی فرقہ وارانہ ذہنیت نے تاریخ کو بری طرح توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے۔ برسوں کی زہریلی تقریروں اور پروپیگنڈوں نے مسجد و مندر کے جھگڑے کو ابھار کر ہزاروں بے گناہوں کا قتل عام کر ڈالا۔ اکثریت کا غرور برتری سب کچھ روند ڈالنے پر تل گیا۔

اور کچھ اور ٹچز:

"کار کے دروازے کھلے، اور ادھیڑ عمر کے
ڈپٹی چیف انجینیر سٹیل پروجیکٹ کے
ساتھ ساتھ ان کے دو صاحبزادے اور
پانچ صاحبزادیاں قوس قزح کے رنگ کے
طرح بکھر گئیں۔

"صفدر عارفی صاحب! ان میں سے ایک
نے پکارا جو ذرا گداز بدن اور اچھے فیگر کی
لڑکی تھی۔

"حاضر، صفدر عارفی سرتاپا عجز و نیاز بن گئے۔"

دوبی، کچلی اور غلامانہ یا مصاحبانہ نفسیات ۔ کارل مارکس کے لفظوں میں
رکھنے والے فرد کی نفسیاتی جھلکیاں ۔ راقم الحروف)

"ریٹائرڈ کمشنر مرزا قادر بیگ کی شعلہ جوالہ
صاحبزادی نے آج ایک خاموش اور تنہا
جگہ ڈھونڈ نکالی تھی وہ وہاں جہاں ہال کے
روشن دان کی روشنی چھن چھن کر پڑ رہی
تھی وہیں ایک چھوٹے سے پیڑ سے لگی جانے
کس سوچ میں غرق تھیں۔"

افسانہ کا ایک اور ٹکڑا:

"اور پورا شہر ساکت ہے، خاموش ہے اور
ـــــ اے رات تو امن ہے! تو شانتی ہے
تو ڈھانکتی ہے! تو چھپاتی ہے۔"

راقم الحروف: اب رات پہلے کی طرح امن اور شانتی نہیں رہی۔ یہ رات ہی ہے جو لٹیروں اور قاتلوں سے نہتے مسلمانوں، ہریجنوں، دلتوں اور آدیباسیوں پر حملے کراتی ہے شب خون رات ہی میں مارا جاتا ہے۔ یوپی کے کرنیل گنج کے مسلمان، نیز بہار اور مہاراشٹر کے دلتوں اور آدیباسیوں پر اونچی ذات کے ہندو زمین داروں نے جو بھی حملے کئے رات کے وقت کئے۔ بستی کی بستی پھونک ڈالی۔ بھاگلپور کی افتاد زیادہ تر رات کی تاریکی میں ہوئی۔ کلکتہ میں پی۔ سی سین کے کانگریسی دور وزارت میں ۱۹۶۴ء کا تقریباً پندرہ روزہ منصوبہ بند مسلم کش فساد رات کے سناٹے میں ہوا۔ حملہ آور ظلمتوں کا لبادہ اوڑھے رات ہی میں حملہ کرتے ہیں۔ وہ زمانہ گذر گیا جب فوج دن میں لڑتی تھی۔ اور رات کے وقت اپنے خیموں میں آرام کرتی تھی۔ یوں بھی رات اور اس کی تاریکی بدی کی علامت ہے۔ دن اور دن کی روشنی خیر و نیکی کی علامت۔ دن کسی نہ کسی طرح کٹ جاتا ہے مگر رات؟ بیماروں اور فاقہ کشوں کی رات؟ بڑی ظالم و جابر اور قاہر ہوتی ہے جس کا کٹنا مشکل ہو جاتا ہے دن کے وقت اگر حملہ آور آئیں تو ان سے مقابلہ یا مزاحمت کے لئے ہزاروں تدبیریں کی جا سکتی ہیں۔ تاب مقاومت پیدا کر کے حملہ آوروں کو مار بھگایا جا سکتا ہے لیکن رات کی تاریکی میں یہ ممکن نہیں کہ رات خوف و ہراس کو جنم دیتی ہے فراق کا ایک شعر یاد آ رہا ہے ؎

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

افسانہ کا آخری اقتباس قابل غور ہے اس میں طنز بھی ہے، رنج و حسرت اور یاس بھی۔ امید بھی اور حوصلہ بھی سوشیل کی ماں جذباتی لہجہ میں کہتی ہے:

"سوشیل، سوشیل: تم ایک ہفتہ بعد
گھر سے لوٹے ہو تو یہ دیکھ کر تمہیں تعجب
کیوں ہو رہا ہے کہ سامنے والے مکان کی
کھڑکی کے شیشے نئے بن گئے ہیں (بازآباد
کاری کی طرف اشارہ: راقم الحروف)
اور مکان کے باہر بڑا سا بورڈ لگ گیا ہے
"دفتر اسلامی ریلیف کمیٹی"

سوشیل کی ماں:

"اپنے سفری بیگ میں کیا ڈھونڈ رہے ہو؟
وہ نہیں ملے گا تمہیں یاد بھی ہے کہ کب اب
دکھا ہے۔"
"اس ٹکڑے کو کیا کرو گے؟ سامنے دیکھو
کھڑکی میں نئے شیشے لگے ہیں۔ کتنے خوبصورت
شیشے ہیں۔ ہرے شیشے ہیں اور اندر سفید
روشنی۔ وہ بھی ہری ہو گئی ہے۔"

سوشیل کی ماں:

کیا ہوا؟ ارے تمہاری تینوں انگلیاں کس
چیز سے کٹ گئیں؟ وہی کانچ کا ٹکڑا، بونا ہی
تھا یہ تو۔ اس کے سبھی کنارے تیز ہوتے
ہیں۔ ٹوٹا ہوا شیشہ ہے۔ اسے جو بھی
چھوئے گا، جو بھی چھوئے گا۔ اس میں ہر طرف
دھار ہے۔ کتنے لوگ ہیں اس میں؟ کھڑکی
کے شیشے کا یہ ٹکڑا۔۔"

انیث ہے لیکن مصنف نے غلطی سے مذکر لکھا ہے۔

ہم نے تین سو بہتر کمبل رفیوجیوں کو تقسیم
کئے، سترہ ہزار تین سو باسٹھ روپے ستاسی
پیسے ان کو کھلانے پر خرچ ہوئے۔ پچیس
خاندانوں کو پھر سے بسایا۔ (یہ جملے قابل
غور ہیں) سترہ اغوا شدہ لڑکیوں کو
غنڈوں سے چھڑایا۔ اب یہ آپ کا فرض
ہے کہ ان لڑکیوں کی شادیوں کا انتظام
کیجئے۔ آپ نوجوانوں سے میں اپیل کرتا ہوں
کہ آگے بڑھ کر یہ ثواب کمائیں۔"

شاید سامنے والے مکان میں کوئی تقریر
کر رہا تھا۔ سوشیل کی ماں کہہ رہی تھی،
ایسے کانچ کے ٹکڑے کو یوں نہ چھوئی اس
کا ہر کنارہ تیز ہے اس میں ہر طرف دھار
ہے۔ یہ چبھ جائیں گے۔"

ارتانیث ہے مگر مصنف نے پھر غلطی کی ہے (راقم الحروف)

زیرِ نظر افسانہ میں سیاسی، اقتصادی، تاریخی،
اور نفسیاتی ادراک و شعور کی رو شروع تا آخر
ی دکھائی دیتی ہے۔ یہ اپنے عہد کی ہو بہو تصویر ہے۔
عبرت انگیزی اور سبق آموزی اپنی جگہ مسلم ہے۔
م ہی نہیں، ظالم بھی مٹ جاتے ہیں جلے ہوئے گھر پھر
آباد ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا قافلہ ایک لمحہ رُکے بغیر
آگے بڑھتا رہتا ہے اس افسانہ کی معنوی روح یہی ہے۔

———o———

" ویسے تو زندہ ہمارے وطن میں
فارسی اور عربی بھی ہے۔ کیا اردو بھی
سرد خانے میں لے جائی جا رہی ہے؟
اندازہ لگانے والے مستقبل کے
بارے میں اچھے خواب دیکھتے ہیں تو وہ
ہر قدم پر سیاسی رکاوٹوں سے بار ٹوٹتے
ہیں اور بکھر جاتے ہیں۔
ہم نالندہ جیسی تاریخ بننے والے ہیں کیا؟
ہم جو ہندوستان کو جنت نشان کہتے
ہیں، تو کیا ہماری گویائی، ہمارے حروف
ہمارے الفاظ، ہماری تہذیب، ہمارا
ورثہ ——— سب کے سب
اتنا کہہ دینے سے محفوظ ہو سکتے ہیں؟
اتنا کچھ اس صفحے پر اس لئے رقم کئے
دیتے ہیں کہ آئندہ آنے والی نسلیں
ہماری فکر کا اندازہ کر سکیں۔ اور ہماری
بے عملی اور انفعالی کیفیت کا اندازہ
کر سکیں۔"

(آہنگ کے ایک اداریے)

"کس کی کہانی" ایک نامیاتی رویہ

علی امام

بیتے ہوئے لمحوں کو اپنے اندر محسوس کرنے کا جذبہ آدمی کے اندر اپنے اپنے پیمانے کے اعتبار سے لازمی طور پر موجود رہتا ہے۔ ساتھ ہی ان لمحوں کو گرفتار کرکے پھر سے بحال کرنے کی حقیقیں بھی انسانی جبلت میں جاری وساری ہیں۔

مگر جب کوئی حساس اور نباض فن کار ان لمحوں کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور پھر سے حیات عطا کر دیتا ہے تو حقیقتوں کے اندر چھپی ہوئی باریک سے باریک حقیقتیں آنکھ مچولی کرتی ہوئی دکھائی پڑتی ہیں۔ پوری تاریخ اور تمام تر تہذیبی اور تمدنی رشتے، جغرافیائی حد بندیاں معاشرتی نظام، اقدار، انسانی رشتے اور اس کی نفسیاتی کش مکش واضح طور پر اپنے اپنے افعال کی روشنی میں ویسے ہی دکھائی پڑتے ہیں جیسے وہ کبھی تھے۔

"کس کی کہانی" کلام حیدری کی کہانی ہے جو ان کے افسانوی مجموعہ "صفر" میں شامل ہے۔ اس مجموعہ کی اکثر کہانیاں ہمیں خود کی دریافت" کی خوشبو مہیا کرتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ "زندگی" اور "زمین" کے گہرے روابط پر مبنی ہیں۔ "وژن" کو کھوج کی آنکھیں عطا کرتی ہیں اور کھوج کو ایک سلیقے اور ضابطے سے روشناس کراتی ہیں۔

"کس کی کہانی" اس وقت تک کلام کی کہانی تھی جب وہ تخلیقی عمل کے مرحلے میں تھی اب وہ تخلیقی عمل کی منزلیں طے کر چکی ہے۔ اب وہ صرف ان کی کہانی نہیں رہی، ہم سب کی کہانی بن گئی ہے۔ جن کے پاس کوئی گاؤں تھا۔ کوئی ندی تھی، کوئی باغ تھا........ جن کا اپنا بچپن اور اپنی جوانی تھی۔ اپنی باجی تھی........ جان نچھاور کرنے والی باجی........ کیا تھا۔ اور سب میں سب کچھ کے ساتھ ایک بلی بھی تھی جو سرحدوں کو پامال کرتی تھی........ نسیم بھات ستو کی روٹی، رسیاول، چاول کی روٹی، پیٹھا، اور امورٹیوں کے ذائقے تھے........ ٹم ٹم پر سوار وہ تھا ڈولی پر سوار باجی تھیں........ فٹ بال کا ایک کھلاڑی تھا.... کالج کے دنوں گرمیوں اور کرسمس کی چھٹیاں تھیں ——— غرض تیسری اور چوتھی دہائی کا ہندستان تھا۔ بہار تھا اور اس میں مگدھ۔ نزدیکیاں دوریوں میں تبدیل ہو گئیں۔ آدمی کے اپنی کارگزاریوں کے قصے پرانے ہو چکے تھے۔ لیکن وقت کا کھیل ابھی جاری تھا ٹھیک بیس سال گذرنے کے بعد ایک بھونچال آیا نزدیکیاں اپنی نئی شکل بدل کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ گویا تمدنی ارتقا کے مختلف دور ایک دائرے نما چکر کی مانند ہیں۔ جیسے ہی ایک چکر ختم ہوا تو دوسرا

جاتا ہے۔ لیکن فنکار وہیں ٹھہر کر دم نہیں لیتا، اس سے آگے اور آگے ہے۔

کسی کی کہانی کا محرک ایک نوجوان ہے جو ابھی ے خطرات سے بچتا بچاتا ہوا کہانی کے ردّ عمل کے یہاں پہنچا ہے۔ اور پھر رد عمل کا ایک سلسلہ پڑتا ہے۔ جس کے نتیجے میں کسی کی کہانی جنم پا گئی ہے انی Dynamics محرک اور رد عمل کے رابطہ کا نتیجہ ہے چنانچہ سلسلہ یوں شروع ہوتا ہے ی اپنے مکان کے پھاٹک پر جس نوجوان آدمی سے ہوئی ہے اور جیسے لیکر میں گھر کے اندر آیا ہوں وہ ا

اس کے بعد ہی ماضی کو اجتماع کرنے کا آغاز ہوتا ہے مشاہدے کے شانے پر نئے علم و اقدار کی بنیاد رکھی ہے۔ جو دل کو چھوتی ہے اور ہر آدمی کے اندر کا حصہ ہے۔ دیکھئے کہانی میں لفظ لفظ کیسے کھلتا ہے۔

وہ میری بہن تھی، میری باجی کو جب گرمیوں میں یاں چلتیں تو ہم کھلی چھت پر بچھی ہوئی چار پائیوں پہ بڑا کراتھتی ہوئی ماؤں، خالاؤں اور پھوپھیوں کو رسیدے بستی کے کنارے والے آم کے اس باغ اگ جاتے جس کے کنارے ایک چھوٹی سی ندی بہتی

پھر کہانی کا "میں" نوجوان کو لیکر اپنے ڈرائنگ روم میں ہے اور اپنی بیوی کو آواز دیتا ہے۔ بھئی دیکھو کون ہے ــــ اس محرک کے فوراً بعد رد عمل شروع ہو جاتا اور "میں" اس باغ میں پہنچ جاتا ہے جس کے نانے رکی امروڑیاں کھٹی ہوتی ہیں، اور اس ٹکی جس کی ڈال جھکی ہوئی ہے اس کی امروڑیاں میٹھی ہوتی ہیں اور پھر ن کا لوٹ لگانا اور بہن کا اپنے چھوٹے سے دوپٹے امروڑیوں کو جمع کرنا ــــ ابھی ختم بھی نہیں ہو

ہو پاتا ہے کہ محرک "میں" کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے وہ اپنی بیوی سے نوجوان کا تعارف کراتا ہے مگر ان میں کوئی کسی کو پہچانتا نہیں ہے ...... اور پھر رد عمل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

آنگن میں جھلنگ چار پائی پر چنے کی ستو کی روٹی کھاتے کھاتے میری بہن جو ہر وقت محض ڈیڑھ سال بڑی ہونے کے گھمنڈ میں رہتی ہے پہلے ڈانٹتی ہے پھر میرے ہاتھ سے میری رکابی چھین کر مجھے ایک تھپڑ مارتی ہے۔ اور میں چیخنے لگتا ہوں"

محرک اور رد عمل کے Automation پہ سوار یہ کہانی اپنے ارتقائی مراحل کو طے کرتی ہوں زماں و مکاں کی تمام تر سچائیاں جیتی جاگتی ہمارے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ اور دریافت کے دروازے پر دستک دیتی ہوئی یوں گویا ہوتی ہے۔

"چند دنوں میں آدمی لٹ جاتا ہے۔ آدمی اپنے اوپر اور سبھوں پر اعتماد کھو دیتا ہے۔ خطروں میں گھرا ہوا آدمی کیا ہو جائے گا.......... کس پر بھروسہ کروگے، حالات پر، حالات کے بدلنے کے یقین پر، سامنے سے گذرتے ہوئے خاک اور خون میں........"

کہانی میں ان نازک لمحوں کو فطری طور پر آنا تھا۔ مگر اس کا فنکارانہ استعمال بے حد سادگی، پاکیزگی اور بڑی ہنرمندی سے کیا گیا ہے۔ لگتا ہے جملوں سے لفظ لفظ ٹپک رہے ہیں۔ اور لفظ سے حرف حرف روشنی چھن رہی ہے۔ آگے بڑھیئے تو کہانی آپ کو ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دے گی، جہاں سے فکری انقلاب نمو پاتا ہے۔

کہانی کا "میں" ایک ہی چار پائی پر اپنی بہن کے ساتھ لیٹا ہوا ہے مگر اس کا منہ ایک طرف کو ہے اور

س کی بہن کا منہ دوسری طرف کو ہے. کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے ہیں........ مگر اچانک ان کی بلی ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے ہیں. ور بلی کی اس مداخلت کی وجہ سے دونوں کی نگاہیں چار ہو جاتی ہیں. دونوں لپٹ کر روتے ہیں. پھر باجی تنبیہہ کرتی ہیں. مگر ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے ہیں.

اور پھر حالات کے ظالم ہاتھ پھیل کر دونوں کے درمیان سرحد بنا دیتے ہیں. تو کہانی کا "میں" شدت جذبات میں ابل پڑتا ہے.

میرے تمہارے بیچ سرحد آگئی ہے. اس سرحد پر کوئی بلی نہیں کودی کہ میں بھی کروٹ بدل لوں اور تم بھی. اور تم مسکرا کر مجھے دیکھو اور میں پھوٹ کر رو دوں....."

یہاں فن کار قاری کے دل کو پیچ کرتا ہوں دماغ کے شگافوں میں طوفان بپا کرتا ہے. "صلح" جیسے اعلے اقدار کے لئے ایک بلی — ؟ یعنی جانور — ؟ انسان اپنے آپ کو کھو آیا ہے؟ کیا وہ Role اور status کے conflict میں اپنے انسان ہونے کو بھول گیا ہے؟ تحفظ کا کیا ہوا؟ امن کہاں جا بسا؟ رشتوں کے تقاضے کو کیا گھن لگ گیا؟ ایسے بہت سے سوالات جنم لیتے ہیں سرحدوں کی بات کرتے ہوئے خود کہانی کے "میں" کو ڈر لگتا ہے. کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آدمی آدمی کی دوری محض سرحدوں سے نہیں ہوتی......... اور بہت سارے سیاسی معاشی، معاشرتی اور ماحولیاتی factors اس کے ذمہ دار ہیں چنانچہ وہ اپنے ہونے کا احساس جگاتا ہے.

میں اس بیڈروم میں ہوں جس میں یہ نوجوان سویا ہوا ہے جو بڑے خطرات سے بچتا بچاتا ہوا یہاں آ دھمکا ہے جس کی پیشانی اس کی جانی پہچانی ہے جس کے بال اس کے چھوئے ہوئے ہیں اور جس کی ناک اس کی دیکھی ہوتی ہے"

کہیں سے کہانی کے "میں" کو وہ نوجوان پہچانا ہوا جان پڑتا ہے اور کہیں سے اجنبی — نامیاتی پس منظر میں دریافت نتیجہ اخذ کرنے کے عمل سے دوچار ہے یہاں بھی اسے ایک سرحد سامنے کھڑی دکھائی دیتی ہے. کیونکہ بیس سال پہلے کے images گو اسے دستیاب تو ہوتے ہیں لیکن کلی طور پر نوجوان نہ "باجی" ہے اور نہ "دلہا بھائی" کہیں کہیں وہ نوجوان اپنے منفرد ہونے کی بھی نشانیاں خود میں سمیٹے ہوئے ہے اور جہاں جہاں سے وہ نوجوان اپنی خاص علامت کا اظہار بنتا ہے وہیں پر "میں" کو وہ اجنبی معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی "میں" اپنے شدت احساس کو روک نہیں پاتا ہے. اور نوجوان کی شناخت پر مہر لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اپنی دریافت کو اس طرح conclude کرتا ہے.

تم میرے بیٹا ہو...... بھانجے ہو........ باجی ہو........ دولہا بھائی ہو......... اکیلے تم میرے ماضی بھی ہو.......... حال بھی......... مستقبل بھی ہو........"

ماضی کو پھر سے بحال کرنے کی خواہش اس کے اندر پروان چڑھنے لگتی ہے اور وہ ماضی کو حال بنا دیتا ہے اور وہ یہیں پر رکتا نہیں ہے بلکہ اسے مستقبل بھی بنا ڈالتا ہے اور پھر خود کو بے ہوش ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے. کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ماضی کو ہو بہو حال نہیں بنایا جا سکتا ہے. اور حال کو ہو بہو مستقبل بنانا تو مشکل ترین مرحلہ ہے.

اس کے باوجود اپنی تمنا کو کہانی کی روح بنا کر قاری کے دل و دماغ میں بڑی ہنرمندی سے پیوست کر دیتا ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے فن کار محض قاری کے جذبات سے آنکھ مچولیاں

(باقی صفحہ [illegible])

الف لام میم ۔ ایک مطالعہ

بدر اورنگ آبادی

کہانی کہنے کا فن بہت پرانا ہے لیکن وقت گذرتا چلا گیا اور انداز بیان وہی ہو۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ وقت بدل گیا، انسانی قدریں بدل گئیں، سوچنے کا انداز بدل گیا فہم ودانش کا معیار بدل گیا۔ اور اس طرح ایک تھا راجہ اور "قصہ چہار درویش" سے "النگا لے" تک قصہ گوئی نے ایک طویل سفر طے کر لیا اور ایسا لگتا تھا کہ افسانہ نگاری نے اپنی منزل ڈھونڈ لی ہو لیکن جنبش شعور کی رو بھلا کہاں ٹھہرنے والی ہے۔

"شکست" جیسے رومانی ناول اور "مہالکشمی کا پل" جیسے ترقی پسند افسانہ کے خالق نے عصر آگہی سے متاثر ہو کر "آن داتا" اور "ہم سب وحشی ہیں" جیسی تخلیقات پیش کیں اور آہستہ آہستہ انسان کھلتا گیا۔ اس کے سامنے کچھ دکھائی نہیں دیتا ۔۔۔ دھواں ہی دھواں ۔۔۔ خلا ہی خلا ۔۔۔ کتنے ہی ادیب راستہ میں رک گئے لیکن کلام حیدری کا قلم نہیں رکا۔ اس لئے کہ ان کے سینہ میں حساس دل کی دھڑکنیں تھیں اور فن افسانہ نگاری پر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی "بے نام گلیاں" اور "صفر" تک کی مسافت انہوں نے بیس سال کے طویل عرصہ میں طے کی لیکن لوگ انہیں بھول نہیں پائے تھے "صفر" کے قاری کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ یہ کلام حیدری کون ہیں؟ اور یہی ایک صفت کسی بھی فنکار کو زندہ رکھنے کیلئے کافی ہے۔

"خبائی کا پنجرہ" کے "ٹکڑے" کی کرچیوں سے پیدا شدہ زخم ابھی مندمل بھی نہیں ہو پائے تھے۔ سکون کی تلاش میں لوگ "صفر" کے خلا میں ڈنڈے پکڑ کر جھول رہے تھے۔ اور "زندانی" کی یاد ابھی اپنے ذہن سے جھٹک بھی نہیں پائے تھے کہ تیسرا مجموعہ منظر عام پر آگیا۔ کلام حیدری کو جاننے والے یہ سوچ کر ضرور پریشان ہوں گے کہ اگر یہ سچ ہے کہ فنکار کو کرب کی ان گنت منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ تو بھلا انہیں کن اذیتوں نے گھیرا ۔۔۔ لیکن "الف لام میم" کا "میں" "سب کچھ کہہ ڈالا ہے" قادری، تلق، کدو، ریوا، پرشوتم، اور ذاکیو کیا تھے کالے گاؤں کی قطار میں کھڑا فنکار جو کبھی جاڑے میں ایک لحاف میں تین دوسرے ساتھیوں کے ساتھ پڑا ہوا اس امر پر غور کرتا تھا کہ انقلاب کیا ہوتا ہے اور جو یہ جاننا چاہتا تھا کہ چالیس کروڑ آبادی کی دھرتی کے بادل کو قید کرکے وہاں بیٹھا تھا۔ وہ "میں" سوم پنچم ہو کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نکل پڑتا ہے تو دوراہے پر پہنچ کر فہم کی گھڑی ملتی ہے۔ نتیجہ ذہنی کشمکش کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ کسی ایک راستہ پر جانا ہی ہے۔ اور آزادی بھی ہے۔ بائیں جا سکتے ہیں، دائیں بھی جا سکتے ہیں...... چلتے چلو...... دوراہے تک تو ساتھ ہیں...... گیس میپر کا راستہ...... یا...... آتما ہی نہیں جب انتظامہ

خواب میں بدل جائے تو اذیتیں ایک وحشت ناک روپ
اختیار کر لیتی ہیں۔ اور فنکار کا قلم بے قرار ہو اٹھتا ہے صبح
کا انتظار رہتا۔ جو اپنے جلو میں انقلاب لا رہی تھی..... مگر
تمہیں یاد ہے ریل ـــ ۹ مارچ کی صبح کو کھڑکھڑاتی ہوئی ٹرین
پل کے اوپر سے پٹریوں پر کھڑکھڑاتی گذر گئی ــــ ہم نے اچانک
محسوس کیا کہ ہماری آنکھوں میں چبھن محسوس کرنے لگتا ہے
یہ ہے فن کا کمال۔

لیکن ابھی ایک اور کچھ کا باقی ہے جب انہیں جغرافیائی
علم کی سچائی زندگی نے شاید بتایا کہ جب ایک ملک کے بیچ
کوئی لکیر کھینچ دے تو اس پار موٹر سروس کا ہی کام کرنا چاہیے
اور.... وہ جو لطافت صاحب ہمارے مقدمے مفت میں لڑتے
تھے۔ وہ کسی فرقہ وارانہ فساد میں مارے گئے.... یہ سب
کیا ہے وفاداری..... کتنی شدید بے بسی اور بے چارگی
ہے۔ اس معصوم سے جملے میں!

اور اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ ہم میں سے کے دل پر
کتنی ضربیں لگیں۔ وہ چوٹ کھاتا ہے تڑپ جاتا ہے لیکن کہانی
پھیل جاتی ہے۔ مگر ایک اور چوٹ ہے۔ جسے وہ برداشت نہیں
کر سکتا اور جس کے بارے میں میرغ کو بلا کر کہنا چاہتا ہے۔ میں
زمین یا تخت پر سو نہیں سکتا۔ میں ایئر کنڈیشنڈ میں ہی جی سکتا
ہوں۔ میں فائیو اسٹار ہوٹل کی تکسٹریز کے بغیر ایک پل نہیں
جی سکتا.... اور تب وہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ فن کار کو
سرمایہ داری نے دبا دیا.... مگر ریوایہ اندر کا فنکار....
اس نے مجھے بڑی اذیتیں دی ہیں۔ یہ مجھے ہر کام پر ٹوکتا ہے
ہر قدم پر روکتا ہے۔

شکست در بحث کی اس کہانی کو بیانیہ اور علامتی
انداز کے امتزاج سے جس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے
وہ اس الزام کو جھٹلانے کے لئے کافی ہے۔ کہ نیا افسانہ ترقی
پسند ادب کا حامل نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ فن کار کے
سوچنے کا اپنا علیحدہ ڈھنگ ہوتا ہے۔ لیکن اگر فن کار سامنے
کے مسائل پر دھیان نہ دے۔ اپنا ماضی بھول جائے اپنے
ثقافتی ورثے کی طرف نگاہ نہ اٹھائے تو وہ قدریں کہاں ملیں
گی۔ فن کا فن متقاضی ہوتا ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ اس کہانی
نے نئے افسانوں کے لئے ایک نئی راہ کھول دی ہے۔

رستم و سہراب کی بھولی بسری کہانی سے بھی جس انداز
سے استفادہ کیا گیا ہے وہ خود ایک نادر مثال ہے اور ایسا لگتا
ہے جیسے یہ کہانی الف لام میم ہی کے لئے لکھی گئی تھی۔ غلام غلام
ہوتا ہے اور وہ ابھی صرف یہی اپنے سہراب کے سینے میں خنجر گھونپ
سکتا ہے ـــ علامت نگاری کی یہ روش بجا طور پر تحسین ہے
اور اس کہانی کی اشاعت کے بعد دوسرے ہم عصر افسانہ نگار
میلوں پیچھے دکھائی دینے لگے ـــ اور پھر کمدار نگاری ـــ
یہ ریلہ کون ہے! وفاداری کون ہے؟ حضرت شاد کون ہیں؟ میں
ہوں! کلام حیدری ہیں؟ کون ہیں یہ لوگ؟

ملک کی تقسیم نے کس دل سے لہو نہیں بہایا۔ لیکن اس
درد کو جس شدت سے کلام حیدری نے محسوس کیا ہے اس کی
جھلک قریب قریب سبھی کہانیوں میں ملتی ہے۔ لیکن کہانی "زنگ"
بے پناہ کرب اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔ کیا انقلاب
یوں آتے ہیں؟ یوں انقلاب آتے ہیں کہ محبت ادھر رہ جائے
اور منصوبے اور خواب ادھر چلے جائیں؟ انقلاب یوں آتے
ہیں کہ گردیاں ادھر رہ جائیں اور دلارے معرفی کی فرلانگ
چوڑی دراڑ میں پھلانگ جائیں ـــ تقسیم کے پس پردہ کار فرما
ذہنیت کی آئینہ دار کہانی "بازدکیوں کئے" اس المیہ کا ایک
نیا رخ پیش کرتی ہے۔ خوش تھے بڑے بڑے ساہوکار اور
سرمایہ داروں نے نجات پالی۔ اور اب ہم بکریوں کے حلقے
میں جانے کی بجائے، ٹیکوں، کارخانوں اور صنعتوں کے لئے جال
آزادی کے ساتھ پھیلائیں گے۔ اور تب اقتصادیات کے
ماہرین اس معجزے سے حیران رہ جائیں گے ـــ لیکن

ہوا کیا؟ — ہوا یہ کہ ہم نے فوجی کمانڈروں کے ذریعے
جمہوریت کو زنداں میں رکھ دیا — لیکن تاریخ تو اس وقت کی
ہوگی جب حق در حق غازی جوشِ حیدر بن سکے کہیں کو
سدھار گئے ..... یہ وہ زمانہ تھا جب زمین شق ہو گئی تھی
اور ایک بازو اس کا کٹ کر الگ تڑپ رہا تھا کیونکہ دوسرے
بازو نے اسے الگ کر دیا۔ اور خود بھی تڑپ رہا تھا۔

نفسیاتی افسانے بہت لکھے گئے۔ جیسے مہندی والا
ہاتھ" (ممتاز مفتی) اور "ننگی مسکراہٹ" (ڈاکٹر محمد
حسن) اور جنسیات پر تو منٹو کے بے شمار افسانے ہیں لیکن
جنسی نفسیات پر اردو ادب میں ایک خلا ہے اس لئے "قاتل"
کے لئے کلام حیدری مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کون کس کی
کشمکش تھی کہ — بیوی ..... بیوی کا فن؟ ... عمر؟ ... یا جبر؟
کون قاتل ہے؟ — کون قتل ہوا؟۔

سامنے کی باتیں تو کہانیوں کی بنیاد ہوا کرتی ہیں
اور کہانیاں خواہ پرانی ہوں۔ ترقی پسند ہوں یا جدید ہوں
سب کی سب روزمرہ کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔
لیکن "نامرد" کو کس خانے میں رکھا جائے؟ اس کا جواب
کہانی کے اختتامیہ جملہ میں پوشیدہ ہے۔ "مجھے لگا
نامرد اس میں اور مجھ میں مشترک ہے" یہ بیانیہ کہانی
اس جملہ کے بغیر بھی مکمل ہے۔ لیکن اس نے کہانی کو نیا لب
بخش دیا۔ سادگی اگر سلیقہ سے استعمال کیا جائے تو
سادگی ہی رنگ بھر دیتی ہے۔

اب "—" "حاشیائی آدمی" — "پکیٹ"
اور "خودکشی" میں بھی تمام تخلیقی صلاحیتیں اجاگر ہیں۔ اور
مجموعی طور سے الف لام میم، اردو ادب میں لازوال نہیں تو بیش
بہا اضافہ ضرور ہے۔ البتہ ایک بات بہت بری طرح کھٹکتی
ہے جس کا ذکر ناگزیر ہے۔ افسانہ نگار کو خود ہی اعتراف
ہے کہ خالق احترام کے لئے ہوتا ہے۔ تمہاری کج فہم تقاضوں
کا نشانہ نہیں ہوتا — تو پھر —

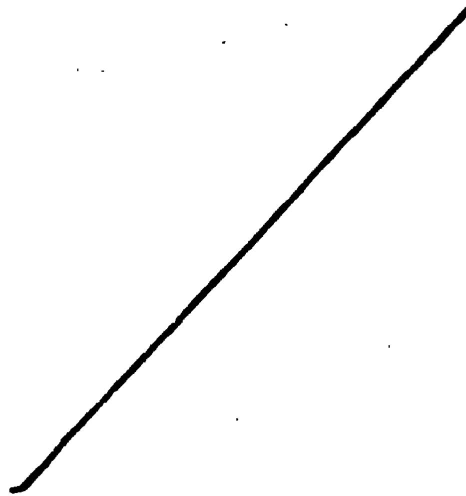
بتاؤ الف کے معنی — !

بتاؤ لام کے معنی — !!

بتاؤ میم کے معنی — !!!

احترام پر قناعت کرنے والو! .... فہم کو کہاں
چھوڑ آئے — ؟ عقیدت اور دانش کو ایک سمجھ کر کس
خانے میں رکھ جاؤ گے؟ — جیسی باتوں سے کیا ہو
ان جملوں کے بغیر بھی کہانی مکمل ہو جاتی اور احترام پر
کرنے والوں پر ضرب بھی نہیں پڑتی۔

نالۂ وداع



چشم وفا ہے اشک فشاں حیدری کے بعد

وفا ملک پوری

مرحوم کلام حیدری نے "حرف وفا" پر چند سطریں لکھتے ہوئے آخری سطروں میں جو کچھ لکھا تھا، میں نے کبھ
بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والی حقیقت کا اظہار ہے ——— "وفا بھائی کی شخصیت پ
مجھ پر آنا ہے کہ ان کے فن پر لکھتے ہوئے میرا قلم رعشہ زدہ ہو جاتا ہے۔ یہ کام مجھ سے زیادہ پا دکھوں کا ہے، میری خوا
اور دعا ہے کہ خدا ان کو کم از کم اتنی دے کہ میں ان کی محبت کی چادر لپیٹ کر دفن ہو جاؤں اور وہ میرا نوحہ لکھیں
میں اس وقت بھی اس تحریر کو پڑھ کر رو دیا تھا، آج بھی رو رہا ہوں اور اسی عالم نالہ و شیون میں لکھ کر
کے لوح مزار کی نذر کرتا ہوں ——— وفا ملک پوری

ہے دل میں ایک درد نہاں حیدری کے بعد — چشم وفا ہے اشک فشاں حیدری کے بعد
آتی ہیں جب بھی یاد وہ شیوہ بیانیاں — اٹھتا ہے داغ دل دھواں حیدری کے بعد
ماتم کی صف بچھی ہے وفا، رینا ہاؤس، میں — دیوار و در ہیں نوحہ کناں حیدری کے بعد
وہ رینا ہاؤس" تھا جو کبھی رشک گلستاں — اب ہے وہی زمین خزاں حیدری کے بعد
اردو کے حق میں "مورچہ" بندی کرے گا کون — وہ جوش وہ امنگ کہاں حیدری کے بعد!
دانشوروں کا ذہن ہے تصویر یاس کی — حیران ہے چشم نکتہ رساں حیدری کے بعد
اب اہل عقل و عشق کی محفل اداس ہے — سونی ہے بزم دیدہ وراں حیدری کے بعد!
محسوس کر رہے ہیں سب اہل قلم اسے — اردو کا جو ہوا ہے زیاں حیدری کے بعد!
ہے کاروبار لوح و قلم آج بھی مگر! — وہ صوت حرف و لفظ کہاں حیدری کے بعد!
نوحہ جو اس کے غم میں لکھوں بھی تو کیا لکھوں — بزم سخن ہے مرثیہ خواں حیدری کے بعد
پہلے بھی بار دوش تھی یہ زندگی مگر! — اب زندگی ہے بار گراں حیدری کے بعد!

یوں احترام دل سے وفا اب کرے گا کون
ہے کون تیرا مرتبہ داں حیدری کے بعد

... یار بے ریا تھا وہ شخص

(کلام حیدری کی یادوں کی نذر)

نصر قریشی

قلم کے شہر میں دنیا بسا رہا تھا وہ شخص — ورق ورق پہ لکھا سب کا ماجرا تھا وہ شخص
تمام عمر زبان و ادب کا شیدائی — دیارِ فکر و نظر کو سجا رہا تھا وہ شخص
یہ اور بات کہ ترسایا روشنی نے اسے — قلم کا نور کتابوں میں بھر رہا تھا وہ شخص
متاعِ لوح و قلم کو بچانے کی خاطر — خود اپنے خون کے دریا میں ڈوبا تھا وہ شخص
نبرد آزما تھا دشمنانِ اردو سے — سیاہ جبر کے آگے بھی مورچا تھا وہ شخص
صفر سے لے کے الف لام میم[۱] تک گویا — اندھیری گلیوں[۲] میں ہر سمت چل رہا تھا وہ شخص
صلہ، ستائش، انعام، ناقدین کرام — تعصبات کی دیوار ڈھا گیا تھا وہ شخص
نحیف کاندھوں پہ بھاری صلیب تھی لیکن — عَلَم حیات کا ہنس کر لئے ہوا تھا وہ شخص
خیال و خواب کا سورج، شب سیاہ کا چاند — ہوا کی زد میں بھی جلتا ہوا دیا تھا وہ شخص
سراب ریگ رواں یا اجاڑ دشت تپاں — تلاشِ عہدِ بہاراں میں کھو گیا تھا وہ شخص
غم حیات، غم ذات اور وجود کا زخم — کہانی بن کے کہانی سنا رہا تھا وہ شخص
فریب کھاتا رہا دوستوں سے اپنوں سے — زرِ خلوص مگر سب میں بانٹتا تھا وہ شخص

فسانہ زلینت کا، آہنگ[۳] عہد نو تھا نصر
کلام حیدری، کیا یار بے ریا تھا وہ شخص

۱؎ ۲؎ کلام حیدری کے افسانوی مجموعے ۳؎ ماہنامہ آہنگ

"قلم کا مجاہد"

مشہور افسانہ نگار و صحافی جناب کلام حیدری کے سانحۂ ارتحال سے متاثر ہو کر

فرحت قادری

ایک مجاہد تھا قلم کا، وہ کلام حیدری
اس کی بے باکی میں تھی تاثیر نام حیدری

ایک صحافی، اک مقرر، اک افسانہ نگار
ایک شخصیت میں ساری خوبیاں تھیں شاہکار

وہ فسانوں کا تھا شہزادہ، قلم کا بادشاہ
رکھتا تھا سارے ادب پر جو بصیرت کی نگاہ

اس کا لہجہ تیر و نشتر تھا بہ رنگ شاعری
گفتگو وہ کشش، جیسے ہو سحر سامری

تبصرے بے لاگ، تنقیدیں تھی چبھتی ہوئی
جیسے گرہیں خواب نادیدہ کی ہوں کھلتی ہوئی

وہ انا پرور بھی تھا، خوددار بھی، بیباک بھی
اس کی نظروں میں نہ تھی کمتر خس و خاشاک بھی

کتنے ڈائمنشن عیاں تھے اک اکیلی ذات سے
کچھ قلم سے، کچھ زباں سے، اور کچھ رشحات سے

طنطنہ تھا، دبدبہ تھا، منفرد "آہنگ" تھا
نکتہ چینوں سے برابر "مورچہ" لیتا رہا

وہ نفیس اللسان تھا، خوش پوش تھا ہمدرد تھا
پھر بھی اللہ جانے، اس کے دل میں کیسا درد تھا

جس نے اس کو اس بھری دنیا میں تنہا کر دیا
رفتہ رفتہ موت کی دیوی پہ شیدا کر دیا!

بس یہی باتیں ہیں جن کو سوچ کر آنکھیں ہیں نم
اب کبھی موتی بکھیرے گا نہ وہ تیکھا قلم

وہ قلم جو اس کا اک انمول سرمایہ بنا
وہ قلم جو اس کے دل کی دھڑکنیں بن کر رہا

چلتے چلتے وہ قلم فرحت اچانک رک گیا
شدت رقت سے آخر اس کا سر بھی جھک گیا

رب اکبر، رحمتوں کی جلوہ سامانی کرے
"آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے"

ڈاکٹر امام اعظم

تاجر سنگ گراں

(کلام حیدری کے نام جو سراپا ادب تھا)

نہیں دیکھا زمانے نے
کبھی انساں بھی ایسا
کہ جس کی شخصیت نے
نقش قائم کر دیا لیکن
زمانہ باخبر تھا
اس کی عظمت اور بلندی سے
مگر پھر بھی
اداروں اور سرکاری اداروں
کا یہ عالم تھا
کہ اس کی شخصیت پہ
ناز کرتے، فخر کرتے، معترف ہوتے
کہ اس نے زندگی کو اک کہانی، ایک قصہ، ایک افسانہ
بنایا تھا
نہیں کچھ فکر کی اس نے
مگر تخلیق کرتا تھا کہانی
تھا اتنا درد، اتنی پیاس اس میں
کہ گویا ہر کہانی بولتی تھی
کہ راز زندگانی کھولتی تھی

گماں ہوتا تھا ہے لفظوں کا ساحر
بہت ہی شوخ تیور تھا بظاہر
مگر اندر سے وہ ٹوٹا ہوا تھا
زمانے بھر سے وہ روٹھا ہوا تھا
ادب کے "مورچہ" پر وہ کھڑا تھا
بڑے "آہنگ" سے وہ بولتا تھا
مگر وہ تاجر سنگ گراں تھا
وہ اپنی ذات سے بھی بدگماں تھا
یہی اک غم جو اس کو کھا رہا تھا
زمانے بھر سے وہ ٹکرا رہا تھا
ہر اک تنقید اس کی پُر اثر تھی
اسے انجام کی لیکن خبر تھی
خدا جانے اسے کیا ہو گیا تھا
اچانک ایک دن وہ سو گیا تھا
پتہ ہے کون تھا، اک انجمن تھا
اسی کے دم سے یہ رنگ چمن تھا
کلام حیدری تھا نام اس کا!
کلام حیدری تھا نام اس کا!

نذر کلام حیدری

مختار احمد عاصی

فکر و فن کی انتہا تھے حیدری
یعنی اک دانش کدہ تھے حیدری
یہ حقیقت ہے مزاج وقت کی
ہر ادا سے آشنا تھے حیدری
ایک تازہ مطلع دیوانِ زیست
سرخوشی کی ابتدا تھے حیدری
نیک طینت نیک فطرت نیک دل
بے طلب بے مدعا تھے حیدری
لغزش پا جس کی منزل درکنار
ایسے رند پارسا تھے حیدری
ضامن عیش و مسرت دہر میں
بحر غم میں ناخدا تھے حیدری
جو چمن میں گل کھلادے علم کے
صبح نو کی وہ ضیا تھے حیدری
ہر کرن تھی جن کی رشک آفتاب
وہ ضیائے پُر ضیا تھے حیدری
ساری دنیا گوش برآواز تھی
اس قدر دلکش صدا تھے حیدری
جتنا میں سمجھا تھا عاصی آج تک
دیکھا تو اس سے سوا تھے حیدری

تعزیتی نظم

ندیم جعفری

بیادگار جناب کلام حیدری مرحوم

جو ایڈیٹر ہی نہیں تھا ناقد اردو بھی تھا
دے رہا تھا وہ قلم سے ساری دنیا کو صدا
جوں ہی ملک الموت نے آکر اسے دستک دیا
اس نے رشتہ ہم سبھوں سے پھر کر لیا منقطع
وہ مفکر تھا، بڑھا دیتا تھا زینت بزم کی
داد دیتے ہیں سب اہل علم اس کے عزم کی
جس سے تھا شاداب اک مدت سے اردو کا چمن
رشک کرتے تھے سبھی اہل ادب اہل سخن
ملک میں اردو ادب کی ایک نرالی شان تھا
ہو سکا اب تک نہ ثانی اس کا کوئی دوسرا
تبصرے بھی اس کے تھے بے لاگ تنقیدیں بھی چست
اردو دنیا میں تھا اس کے نام کا شہرا بہت
آج تک کوئی پکڑ پایا نہیں اس کا قلم
شان سے کرتا رہا اونچا وہ اردو کا علم
شہر کی ہر بزم میں تھا اس کا اٹھنا بیٹھنا
اس کا شیوہ تھا غریبوں کی طرف بھی دیکھنا
وہ بہادر تھا نہ ڈرتا تھا قلم کی جنگ سے
ملک کی خدمت کیا ہے مورچہ و آہنگ سے
پیش کرتا ہے ندیم اس کو عقیدت کا خراج
دے کلام حیدری کو اے خدا جنت کا تاج

میں کلام حیدری کے اچانک انتقال پر انتہائی صدمہ و ملال کا اظہار کرتا ہوں۔
حیدری صاحب ایک بے باک صحافی اور دورِ جدید کے ایک کامیاب افسانہ نگار تھے۔ اردو ادب میں انہوں نے نمایاں مقام حاصل کیا۔
میری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی طاقت عطا کرے۔

(اخلاق الرحمن قدوائی)

عزیز گرامی! خدا آپ کو صبر جمیل عنایت فرمائے۔ یہ غم آپ کے لئے اور مرحوم کلام حیدری کے ایک دائمی اور ناقابل فراموش صدمہ ہے۔ میرے پاس اندوہ و غم کے اظہار کے لئے الفاظ موجود نہیں ہیں۔ میں ان کے کمترین مداحوں میں تھا۔ چند ہی بار ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ زندگی بھر کے دوست ہیں۔ یہی کہہ سکتا ہوں کہ ایسی بے وفائی کی امید نہ تھی خدا ان کی رُوان پاک کو اپنی مخصوص رحمتوں سے شاداب رکھے۔
یہاں ان کے انتقال کی خبر بہت تاخیر سے پہونچی۔ میں خود بھی عرصے سے بیمار و معروف تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان میں ایک ہوں ہمہ وقت حاضر ہوں۔ شریک غم

شبیہ الحسن

عزیز محترم السلام علیکم۔
۲۴ر مارچ کا مطبوعہ خط ۲ر اپریل کو ملا۔
محب محترم کلام حیدری کے اچانک انتقال کی خبر نے بے حد رنج پہونچایا تھا۔ مجھے میرے ایک عزیز سراج الحق صاحب نے ٹیلیفون سے اس حادثہ کی اطلاع دی تھی۔ دیر تک سوچتا رہا تھا کہ ہم نے ایک مخلص انسان کو اور اردو نے ایک اچھے خدمت گذار کو کھو دیا۔
کلام حیدری مرحوم نے گیا میں رہ کر نہایت خاموشی کے ساتھ اردو زبان و ادب کی مختلف سمتوں میں بھرپور خدمت کی۔ بلاشبہ وہ اچھے افسانہ نگار تھے، معتبر ناقد تھے، اور ادبی صحافت میں نمایاں مقام کے مالک تھے۔
اگرچہ میری ملاقاتیں ان سے بہت کم اور مختصر رہی ہیں، لیکن میرے دل پر انہوں نے نہایت اچھا اثر چھوڑا ہے۔ ایک بار گیا میں ملاقات ہوئی۔ ایک دو بار پٹنہ میں، کبھی بہار اردو اکادمی کے کسی سیمینار میں، کبھی کسی اور تقریب میں۔ اس وقت ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے۔
چھریرا بدن، دراز قد، ذہین آنکھیں، کشادہ جبیں، چمکتا دمکتا چہرہ، ہنستی مسکراتی شخصیت۔ یہ تھے کلام حیدری دیکھنے والوں کی نظر میں۔

جب بات کی اور گفتگو آگے بڑھی، تو ان کے لہجہ کی سنجیدگی، خیالات کی گہرائی، باتوں کی مٹھاس اور ملنے ملانے میں اخلاق مجسّم ہونے نے مجھے ان کے اور قریب پہونچا دیا۔ اور کلام حیدری کی شخصیت میرے لئے اور زیادہ پُرکشش بن گئی۔
جب ان کی تخلیقات کو پڑھا تو ان کی تحریروں میں شگفتگی، سادگی، سچائی اور گہرائی، ان کی تنقیدوں میں خلوص اور ژرف نظری کی کارفرمائیاں، ان کے افسانوں میں زندگی کی نرم گرمی اور صداقتوں کی پرچھائیاں، قدم قدم پر مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی نظر آئیں اور میں بار بار ٹھٹھک کر ان کے بارے میں سوچنے لگا۔ کلام حیدری یہ سب کچھ ہیں۔
کبھی کبھار وہ خط بھی لکھ دیا کرتے تھے، تب آدھی ملاقات کا لطف بھی آجایا کرتا تھا۔
کاش وہ صحت مند رہتے اور کچھ اور عمر لے کر آئے ہوتے تو اردو ادب کو کچھ اور مالا مال کرتے اور بہار کو کچھ اور سجانے سنوارنے میں مدد کرتے۔

آپ کا

عبدالقوی دسنوی

مکرمی و محترمی! سلام مسنون
اخبارات کے ذریعہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ جناب کلام حیدری صاحب کا ۲ فروری کو انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے آمین۔
اس کارڈ کے لکھنے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ تاریخ وفات کی تصدیق کرنا ہے دوسرے اگر آپ وقت پر لکھ سکیں تو تحریر کرم ہوگا۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ اگر آپ ان کا کوئی فوٹو بھیج سکیں تو بڑی عنایت ہوگی۔ تعزیتی   میں شائع کروانے کا ارادہ ہے اگر آپ جلد بھیج دیں تو ممنون ہوں گا۔
مجھے معلوم نہیں کہ کس سے خط و کتابت کرنی چاہئے اس لئے مجبوراً مرحوم ہی کے نام یہ خط لکھا ہے۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ میرے پاس مرحوم کے بارے میں ضروری معلومات ہیں۔ لیکن اگر آپ کچھ اور بھیج سکیں تو شکریہ کے باعث ہوگا۔ تکلیف دہی کے لئے معافی کا خواستگار۔ والسلام

مخلص

عبداللطیف اعظمی

میری نہایت عزیز شاہدہ بھابی۔
ان چند روز میں ـــ جب سے کلام کی خبر ملی ہے ـــــ دکھ بھری چپ کے سوا اور کچھ سوجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ ایک دوست کا فون آیا تو یقین نہ آیا۔ کیسے آتا؟ ـــــ جس کی باتیں سمجھنے میں نہ آئیں وہ تو ہمہ دم بولتے ہوئے ـــــ اپنے پورے وجود سے بولتے ہوئے محسوس ہوتا ہے ـــــ اس کی ۱۷ جنوری کی چٹھی مجھے اس کی وفات کے دو چار پہلے ہی ملی تھی جس میں اس کی ڈپریشن محسوس کر کے میں چونک سا گیا تھا۔ اور میری سمجھ میں نہ آیا تھا کہ ایسا کیوں؟۔ اس نے لکھا تھا ـــ "نہ میں وہ ہوں ـــ نہ شاہدہ ـــ ہم لوگوں پر ایک سال کے اندر دس بارہ سال گذر گئے

ہم گیا سے بول رہے ہیں ؟ ــ نہیں ــ ہم زمین کے اندر سے بول رہے ہیں ۔ آواز ملتی ہے آپ کو ـــــ ؟" یہ چیٹھی پاکر میں اس سے بہت سی باتیں کرنے کو بے چین ہونے لگا تھا، مگر اب ـــــــ

ـــــ بھابی میں نے آپ کو یہاں کلام کے پہلو میں بیٹھ کر لگاتار سجدے میں اس کے لئے دعائیں مانگتے ہوئے دیکھا ہے ۔ جو ہمیں اس قدر عزیز ہوں، وہ جہاں بھی جاتے ہیں، بالآخر ہمارے دلوں میں ہی اتر آتے ہیں ۔ دراصل باہر کہیں وہ اس لئے نہیں دکھتے کہ ہمارے دلوں میں اتر آئے ہوتے ہیں ــــــ اپنے دکھ پر قابو پائیے بھابی، آپ کا کلام حیدری اب بھی آپ کے ساتھ ہے، اسی لئے آپ اسے محسوس کر رہی ہیں ۔ آپ اس کے سارے کاموں کی تکمیل میں جٹ جائیے ۔ خدا آپ کی مدد کرے گا اور سکون عطا کرے گا ۔ آپ کا بھائی ۔

جوگندر پال

محترمہ ! تسلیم

کلام صاحب کو اللہ نے اپنے حضور یاد کرلیا ۔ جو اس کی مرضی ۔ دم مارنے کی مجال نہیں ہے بس وہ جیسے جس حال میں رکھے رہے ۔ مختار ہے ۔ جتنا بڑا غم دیا ہے سہنے کی طاقت بھی دے یہی دعا ہے ۔

غم کس نے بانٹا ہے جو آپ کے اتنے بڑے غم کو کوئی بانٹ سکے گا ۔ لیکن یہ دکھ ہزاروں کو ہوا ہے کہ اتنا پیارا آدمی جس نے اتنے ہنگامے مچائے ۔ ان گنت لوگوں کو قلم پکڑنا سکھایا، ادیب بنایا، اسے شہرت بخشی، ایسے بلند آہنگ سے، جینے والے ایسے چپ چاپ جیا کرتے ہیں ۔ اس کا دکھ بار بار جب بھی خیال آتا ہے دل دکھ جاتا ہے ۔ وہ آپ کے لئے تو سب کچھ تھے ۔ مگر ہزاروں کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور تھے ۔ اللہ ان پر اپنی رحمتوں کا سایہ رکھے ۔ اور آپ کو اس غم کا سہارا دے ۔

چہرہ غم کے شریک

عابد رضا بیدار

شاہدہ بھابی ۔ آداب

بھائی کلام حیدری کے انتقال پر ملال کی خبر مجھے دہلی میں ہی ڈاکٹر عبدالصمد نے دی تھی، یہاں اس خبر کی اشاعت آج کے قومی آواز میں ڈاکٹر قمر رئیس کے حوالے سے ہوئی ہے ۔

مجھے بہت ہی افسوس ہوا کہ کلام بھائی اس قدر اچانک اور جلد چلے گئے ۔ آپریشن کے بعد تو وہ ٹھیک ہو گئے تھے ۔ آپکو گہرا صدمہ اٹھانا پڑا ہے ۔ اسے برداشت کرنے کے لئے خدا آپ کو حوصلہ دے ۔ ربا بیٹی کو بھی حوصلہ دینا ۔

شریک غم

رام لعل

شاہدہ!

جو خبر ملی اس پر یقین نہ آیا، سوچ بھی نہیں سکتا کہ کلام نہیں ہے۔ یہ اچانک کیا ہوا؟ آپریشن کے بعد تو ٹھیک تھے۔ گیا جانے سے پہلے فون پر بولے، باتیں کی تھیں۔ دیر تک مختلف مسئلوں پر ہم دونوں گفتگو کرتے رہے۔ تم پر کیا بیت رہی ہوگی خوب سمجھتا ہوں، یہ نقصان ایسا ہے کہ جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ صبر کرو اور ہمت سے کام لو، جانتا ہوں بھی زندگی ہے، جو گئے ہیں نشب جائیں گے، اس دنیا میں کسے رہنا ہے؟ اللہ پاک انہیں جنت الفردوس میں جگہ دیں۔ اور تم لوگوں کو صبر جمیل عطا کریں یہی دعا ہے۔

تم نے ایک رفیقۂ حیات کی حیثیت سے ان کی بڑی خدمت کی ہے۔ آپریشن سے پہلے بھی دیکھا اور اس کے بعد بھی، نیک بی بی ہو، اللہ سے مغفرت کے لئے دعا کرو۔

یونیورسٹی میں ہم دونوں ساتھ رہے ہیں لہٰذا وہ یاد آتے رہیں گے۔ بیٹی اور داماد اور اپنے بھائیوں اور دیگر عزیزوں کو صبر کی تلقین کرو۔ اور مضبوط ارادوں کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ میری دعائیں اور نیک خواہشات تم لوگوں کے ساتھ ہیں

تمہارے غم میں شریک

شکیل الرحمٰن

برادر مکرم مسعود منظر صاحب! سلام و رحمت

۳ر فروری ۹۴ء کا خط تاخیر سے ملا۔ اس میں کلام حیدری صاحب کے انتقال پر ملال کی روح فرسا خبر ہے۔ اس خبر سے رنج ہونا قدرتی بات تھی، سو ہوا۔ اس کی ایک وجہ تو اردو کا تعلق ہے، دوسری وجہ، ان سے میری ذاتی شناسائی ہے جب میں گیا پہونچا تو کلام حیدری ازراہ کرم اپنے ذاتی تعلق کا اظہار فرماتے۔ اور یہاں دہلی ہوتے تو لگاتار کرم فرماتے غرض ان کے انتقال سے اس دوگونہ تعلق کے شکست ہونے پر گہرے دلی رنج و غم میں مبتلا ہونا ایک فطری بات ہے کلام حیدری نے مورچہ اور آہنگ کے ذریعہ نہ صرف ادبی صحافت کی زلف آرائی کی بلکہ اپنی تصانیف سے اردو زبان و ادب کی اہم خدمات انجام دیں۔ انہوں نے فکشن، تنقید، اور ادب کے دوسرے میدانوں میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ برسوں یاد رکھی جائیں گی۔ میں آپ کے کلام حیدری کے ورثا کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ انہیں جنت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی دولت عطا کرے کہ یہی ایک راستہ ہے۔ سوگوار

عنوان چشتی

پیاری بیٹی رینا! خدا تم لوگوں کو صبر و سکون عطا کرے۔

گیا سے واپسی پر مجھے پٹنہ میں زبردست ٹھنڈک لگ گئی۔ اور میں شدید بیمار پڑ گیا۔ دس دن قبل ہی اچھا ہو چکا ہوں لیکن تم کو خط لکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بار بار کوشش کرتا تھا اور ناکام ہو جاتا تھا۔ سچ ہے کہ اب تک یقین

نہیں ہوتا کہ میرا ایک عزیز ہمسفر قافلے سے بچھڑ گیا ہے۔ اور ہم لوگوں کو سوگوار چھوڑ گیا۔ ۱۹۵۱ء میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس طویل مدت نے ہمیں ایک ایسا رشتہ بخشا جسے محض دوستی نہیں کہنا چاہئے بلکہ اس کا مقام دوستی سے کہیں بلند تھا۔ وہ شخص جس کی تم بیٹی ہو ایک بے مثال انسان تھا۔ ایک ادیب، ایک ناقد، ایک صحافی، ایک مقرر، ایک بذلہ سنج، غرض وہ ایک فرد نہیں، ایک انجمن تھا۔ ذہانت اس کی آنکھوں سے ٹپکتی تھی۔ اور دلیری اس کے ارادوں سے جھانکتی تھی۔ وہ اردو کا مرد مجاہد تھا جس کی بقا اور تحفظ کے لئے اس نے دامے، درمے، سخنے ہر طرح اپنا خون جلایا۔

صد افسوس! ایک مخلص بے غرض اور بے خوف دوست نہ رہا۔ بس یہی دعا ہے کہ اللہ پاک اسے جنت الفردوس میں جگہ دے اور اس کے پسماندگان کو صبر جمیل۔

عزیزہ سلمیٰ! تم پر غم کا پہاڑ ٹوٹا ہے لیکن تم ایک میا ور باپ کی بیٹی ہو۔ تمہیں اپنا غم بھول کر اپنی ممی کا سہارا بننا ہے ان کی خوشی کا خیال رکھنا ہے، ان کی خدمت اور اطاعت سے ہی ان کا زخم بھر جائے گا۔ تمہاری آنٹی تمہیں دعائیں اور تمہاری ممی کو سلام کہہ رہی ہیں۔ اپنی ممی کو میرا بھی سلام کہنا۔ ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں، دنیا بہت بے درد جگہ ہے جن حالات کا تمہیں سامنا ہے، ان میں کئی دشواریاں بھی آسکتی ہیں۔ ماشاء اللہ تم لوگ خود ہی دانا اور بینا اور ہر لحاظ سے قابل و عاقل ہو۔ اور میں ایک بہت معمولی آدمی ہوں۔ پھر بھی کسی وقت اگر تم لوگ سمجھو کہ میں کسی کام آسکتا ہوں تو میں اسے اپنے آپ پر اپنے مرحوم دوست کا قرض سمجھ کر ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔

عزیزی افسر کو ہم لوگوں کی دعائیں اور دونوں بچیوں کو بہت بہت پیار۔

شریک غم

منظر شہاب

بھائی صاحبہ! تسلیمات

چونکہ ایسے جانکاہ حادثے زندگی میں کبھی کبھی پیش آتے ہیں اس لئے انسان دم بخود رہ جاتا ہے، کیا کرے اور کیا نہ کرے یعنی یہی سوچئے کہ پرسوں رات سے بار بار کوشش کی کہ آپ کو فون کریں لیکن بخدا ہمت نہیں پڑتی کہ کیا آپ سے کچھ کہہ سکیں گے اور کیا ایسے دردناک حادثے کی تفصیل سن سکیں گے؟

آپ کو یاد ہوگا جب میں اکتوبر میں آپ کے یہاں گیا تھا تو کلام بار بار مجھ سے کہتے تھے کہ میں تین نومبر تک نہیں رہوں گا۔ ۳ نومبر کی تاریخ غالباً ان کے آپریشن کی تاریخ تھی۔ میں انہیں بار بار سمجھا رہا تھا کہ یہ کیا بار بار ایسی باتیں کر رہے ہیں اور میں کئی لوگوں کی مثالیں دے رہا تھا کہ بائی پاس کے بعد دس دس بارہ بارہ سال سے خوش و خرم زندگی گذار رہے ہیں۔ لیکن کلام صاحب کیوں ایسی باتیں کرتے تھے۔ آج تک مجھے سمجھ میں نہیں آیا۔ ۳ نومبر کی تاریخ تو ٹل گئی لیکن ۳ فروری کو واقعی وہ نہیں رہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ حادثے کی تفصیل کس سے پوچھیں، آپ سے فون پر بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ اور ادھر گیا کے کسی خبر پر نظر بھی نہیں پڑی ہے۔

کلام صاحب انتہائی فراخ دل اور کھرے آدمی تھے۔ منافقت تو ان کو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ کسی سے خفا ہوتے تو ایسا

طرح سنا دیا۔ پھر جب خنگی دور ہوئی تو اسے منا بھی لیا۔ بڑے باہمت اور جفاکش انسان تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ خود کو [illegible] [illegible] کیا۔ بلکہ دوستوں اور عزیزوں کو بھی اوپر لے جانے میں ان کی کوششوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ آہنگ کے ذریعہ پوری ایک جنریشن کو اوپر لائے۔ انہیں صحیح طور پر ادبی دنیا سے روشناس کرایا۔ اور ہر شخص کا جائز حق دیتے رہے۔ بھائی وہ بہت عظیم انسان تھے۔ بے حد بلند قامت، ایسے کہ بالشتی ان کی طرف سر اٹھا کر دیکھیں تو ساری ٹوپیاں گر جائیں۔

اللہ نے انہیں بہت کچھ نوازا، بال بچے، گھر بار، مال و متاع، عزت و شہرت، علم و دانش، اور ایک بہت ہی اچھی بیٹی اور ایک بہت ہی عظیم رفیقۂ حیات ——— غرض کیا نہیں دیا انہیں، لیکن وہ جو ایک طریقہ کار ہے خدائی کی، بے شمار خوبصورت پھولوں کے جلو میں ایک کانٹا بھی پیوست کر دیتی ہے۔ سو وہ کانٹا دل کی صورت میں انہیں دیا۔ دل جو بار بار روٹھتا تھا، دل جو بار بار جھٹکے دے جاتا تھا اور بالآخر جس نے ۸ر فروری کو ہمیشہ کے لئے جواب دے دیا ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

کلام میرے عزیز ترین بھائی تھے، میرے عزیز ترین دوست تھے۔ وہ بھی مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان کی بے وقت موت نے مجھے نیم جان کر دیا ہے، دور دور تک کوئی مونس و غمخوار نظر نہیں آتا۔

ادھر جب سے ان کا آپریشن ہوا تھا میں ہر روز فجر کی نماز میں ان کی صحت کی دعا کیا کرتا تھا۔ اب جب نماز میں ان کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں تو دل پھٹ جاتا ہے۔ لیکن سوچتا ہوں کہ ؎

جب احمد مرسلؐ نہ رہے کون رہے گا

(حضور نے بھی ۶۳ سال کی عمر میں دنیا سے پردہ کیا تھا) تو بھائی یہ مصرعہ جب میرے ایک عزیز نے آج سے بارہ سال پہلے ابا جان کے انتقال پر مجھے لکھا تھا، تو میرے دل کو بڑا سکون ملا تھا۔

بار بار فون کی طرف جاتا ہوں کہ آپ سے باتیں کر کے دل ہلکا کروں گا، لیکن پھر ہمت نہیں پڑتی ہے۔

رینا بیٹی اور بچوں کو بھی میری طرف سے سمجھائیے گا ؎

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

خدا ہم سبھوں کو صبر کا حوصلہ عطا فرمائے اور کلام صاحب کو جنت الفردوس میں ایک بڑا مقام دے۔ آمین، غم نصیب

احمد یوسف

"ہماری جان صدقے اے کلام حیدری تم پر"

میں ہمیشہ کلام حیدری کو اسی طرح یاد کرتا رہا مگر افسوس کہ اپنی جان تم پر صدقے نہ کر سکا۔ تم نے مجھے اس کا موقع بھی نہیں دیا۔ اور بقول اپنے میری محبت کی چادر لپیٹ کر سو گئے۔ تم نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ لعنت ہے مجھ پر کہ میں نہ تمہارے جنازے کو کاندھا دے سکا نہ میت دفن ایک مٹھی خاک ڈال سکا جسے زندگی بھر کی محبت کا صلہ کہا جاتا ہے

تم کو بھی ایسی جلدی پڑی تھی ۔ لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

تم نے مجھے اتنا توجہ لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح سے یہ فرض پورا کروں ۔

تمہارا محروم و مغموم وفا ملک پوری

سوگوار شاہدہ حیدری

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو خود آپ اپنی خبر نہیں آتی ، ہائے میرا دوست مجھ سے بچھڑ گیا اور مجھے اس کی خبر نہیں ۔ میں نے ۵ار فروری کو آخری خط لکھا تھا ۔ اور اب تک اس کے جواب کا منتظر تھا ۔ ہائے مجھے کسی نے اس ناشدنی کی خبر نہیں دی ۔ اور جب خبر ملی تو کاشانۂ وفا کے در و دیوار سے ٹپک رہی تھی ۔ کئی دن تک سوچتا رہا کہ تم کو ، پیاری بیٹی ربینا کو کس دل سے تعزیت کا خط لکھوں اور کیا لکھوں ۔ افسوس کہ الفاظ بھی آج میرے جذبات غم کی کیفیت بیان کرنے سے قاصر ہیں ۔ خدا اپنے اس نیک فطرت بندے کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کے چاہنے والے کو صبر جمیل کرامت فرمائے ۔ آمین ۔

تمہارا شریک غم ، سوگوار
وفا ملک پوری

شاہدہ بھابی ۔ آداب

بے حد دردناک خبر ملی ، میرے پاس الفاظ تو نہیں کہ میں تعزیتی جملے لکھوں ، میں نے بے حد پیار کرنے والا بھائی کھو دیا ۔ آپ پر کیا گذر رہی ہوگی اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے ۔ خدا آپ کو صبر کی توفیق عطا فرمائے ۔ شریک غم

شا اختر

محترمہ بھابی صاحبہ ! تسلیم و نیاز

اخبارات کے ذریعہ یہ خبر وحشت اثر ملی کہ کلام بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہے تو میں کافی دیر کے لئے مبہوت ہو گیا جب ہوش و حواس درست ہوئے تو دل غم زدہ کو صبر دلانے کی کوشش کی اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا ۔ ان کی وفات دنیائے ادب کا ایک عظیم نقصان تو ہے ہی میرے لئے بہت بڑا ذاتی غم بھی ہے ۔ جس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں ۔ آپ کے تو وہ جیون ساتھی تھے آپ پر کیا بیتی ہوگی اس کا صرف اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے ، بیٹی نگارینہ پر بھی قیامت گذر گئی ۔ موت تو برحق ہے اور سب کو اس دنیائے فانی کو چھوڑ کر ایک دن جانا ہے مگر ابھی کلام بھائی کے جانے کے دن نہیں تھے لیکن ہم سب موت کے آگے بے بس ہیں ۔ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ ۔ اللہ کو جو منظور تھا ہو گیا ۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی کوتاہیوں کو معاف فرمائے ۔ مغفرت کرے ، ان کی قبر کو اپنی نور سے بھر دے ۔ اور جنت الفردوس میں جگہ دے ۔ نیز آپ کو اور جملہ متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق بخشے آمین ، شریک غم حفیظ بنارسی

محترمہ شاہدہ صاحبہ ! سلام ودعا

مدیرہ سہیل ، کے خط سے اندوہناک خبر ملی ۔ اللہ مرحوم کو جنت نصیب کرے ۔ آمین ۔ تقریباً تین سال قبل کلام حیدری مرحوم سے گیا میں ملاقات ہوئی تھی ۔ کیا خبر تھی کہ ظالم موت انہیں اتنی جلد اٹھا لے گی ۔ اب صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے اللہ آپ کے دل کو مضبوط کرے ۔

شریک غم

قیصر عثمانی

ابھی ابھی ریڈیو سے ایک نہایت جانکاہ خبر برادر محترم جناب کلام حیدری صاحب کی رحلت کی خبر نشر کی گئی ۔ دل کو اس خبر پر یقین نہیں آتا ہے ۔ فون پر مقامی لوگوں سے رابطہ پر بھی یہی معلوم ہوا ۔ یوں تو مرحوم ایک عرصہ سے کی بیماری میں مبتلا تھے ۔ مگر شفایاب ہو کر دہلی سے واپس آنے پر ہم سب لوگوں کو امید تھی کہ اب پھر سربراہ بن کر سالار کارواں بنے رہیں گے ۔ افسوس وہ چراغ بجھ گیا جس کی ضیا سے کتنے لوگوں نے روشنی لی ۔ ہم دعا گو بیگم حیدری ، ان کی صاحبزادی اور دوسرے افراد خانہ کو اللہ صبر عطا کرے ، آمین ۔ اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں دے ، آمین

شریک غم

صابر آروی

بھابی ۔ خدا آپ کی بے چینیوں کو کم کرے ۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا لکھوں ۔ آپ کا دل رکھنے کی باتیں کروں یا خود کو تسلی دوں ۔ دوسروں کی موت انسان روتا ہے ۔ واویلا کرتا ہے ۔ اور صبر کر لیتا ہے ۔ خود اپنی موت پر کوئی کیا کرے یہ تو میری اپنی موت ہے اختر کے بعد میں یہ دوسری بار مرا ہوں ۔

میرے پاس آپ کی تسلی کے لئے نہ لفظ ہیں نہ جذبات ، میں ابھی خود کو ہی تسلی دے سکتا ہوں ، ذرا جذبات پر آ لوں تو پھر آپ سے ملوں گا ۔ ابھی تو میرے اندر آپ کے روبرو ہونے کی جرأت نہیں ۔ آپ جیسا ہی

بدنام نظر

محترمہ بھابی صاحبہ ! السلام علیکم

اخباروں سے کلام حیدری صاحب کے انتقال پر ملال کی اطلاع ملی ۔ پہلے آنکھوں پر بھروسہ نہ ہوا ۔ بار بار خبر پڑھی یقین نہیں ہوتا ۔ ہر انسان کو ایک دن جانا ہے ۔ آپ پر جو پہاڑ ٹوٹا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے ۔ خدا سب کو صبر جمیل عطا فرمائے ۔ اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ۔ (آمین)

مرحوم کے میرے خاندان سے ایک ایسی لگاوٹ تھی جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کی ادبی و علمی

ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ ان کے اٹھ جانے سے ہمارا اور خصوصاً گیا میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جسے آسانی سے پر نہیں کیا جا سکتا۔

شریک غم

منصور احمد اعجازی

محترمہ شاہدہ حیدری! اللہ آپ کو حادثہ جانکاہ پر صبر و شکر عطا فرمائے۔
اخبار و ریڈیو کے ذریعہ بھائی حیدری صاحب کے انتقال کی خبر سے سخت صدمہ ہوا۔ مجھ سے جو موصوف کے تعلقات تھے اس سے آپ بخوبی واقف ہیں جس روز سے یہ خبر آئی ہے میں لستر علالت پر ہوں۔ ورنہ حاضر ہو کر آپ لوگوں کے سکون قلب کا باعث ہوتا۔ مرحوم کا آخری خط جو دہلی سے واپسی پر لکھا تھا۔ وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ جس کے مضمون پر چند آنسو بہا لیتا ہوں۔ گھر میں بھی سب لوگ افسردہ ہیں۔ خدا مرحوم کو نصیب فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل، خاص طور پر بیٹی رینا کو۔

شریک غم

سجاد حسین جعفری

محترمہ حیدری صاحبہ! سلام مسنون۔
یہ جان کر بہت ہی صدمہ ہوا کہ کلام حیدری ہم لوگوں سے جدا ہو گیا۔ یہ خبر مجھے فاروقی تنظیم سے ملی۔ بہرحال جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مرضی سے ہی ہوتا ہے۔ اللہ آپ لوگوں کو صبر عطا کرے۔ اور کلام کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ فقط والسلام

سلطان احمد (ایڈوکیٹ)

محترمہ بیگم صاحبہ! تسلیمات
اخباروں کے ذریعہ محترمی کلام صاحب کے انتقال کی خبر ملی تھی۔ بے حد افسوس ہوا۔ اگرچہ کلام صاحب سے میرے دوستانہ مراسم نہیں تھے۔ لیکن میں تین سال تک آہنگ و مورچہ کی کتابت کے زمانے میں اپنے ساتھ ان کے حسن سلوک سے متاثر ہوں۔ مجھے کلام صاحب کے انتقال کا بے حد ملال ہے۔ خداوند کریم ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ میں آپ سبھوں کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ فقط والسلام

آمیر حسن رضوی

بھابی صاحبہ! تسلیم
کل پٹنہ میں انجم فاطمی سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ اب کلام بھائی ہمارے درمیان نہیں

نہیں لگتا ہے۔ پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ایک مدت سے میرا ان کا کوئی CONTACT نہیں رہا لیکن دوسروں سے ان کی خیریت ملتی رہتی تھی۔ ان کی علالت وغیرہ کی مجھے کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اور اچانک یہ خبر شوم و منحوس۔ سکتے ان کے ساتھ گذارے ہوئے خوشگوار لمحات یاد آنے لگے۔ مسکراتی ہوئی صورت آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی، کرنے کا شہزاد اور دیبا اندازیاد آنے لگا۔ اور ساتھ ساتھ آپ کی اور دینا کی صورت یاد آگئی۔ کیسے آپ لوگوں نے غم کو برداشت کیا ہوگا یہ ایک الگ بات ہے کہ آپ کے شریک غم ہزاروں لوگ ہیں۔ کیونکہ کلام حیدری کسی ایک کا نام نہیں تھا بلکہ یہ دوستی، محبت، خلوص اور وفاداری کے ایک انجکول کا نام تھا۔ ہر کے ساتھ حسن سلوک ان کا تھا۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ بتصدق محمد و آل محمد انہیں جوار رحمت میں جگہ دے۔ آپ کا شریک غم

فیاض حسین

کلام حیدری صاحب معبود حقیقی سے جا ملے۔ اس خبر کو سننے کے بعد میرے دل کو کیا کیفیت ہوئی، اس کا اظہار قطعی لفظوں کی شکل میں نہیں کر سکتا۔ خدا مرحوم کو جوار رحمت میں رکھے۔ جنت الفردوس عطا کرے اور ان کے پسماندگان کو صبر دے کیونکہ فیصلہ خداوندی کے سامنے ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ راضی بہ رضا ہیں۔

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے۔

مرحوم سے میرے کس قدر اور کس قسم کے تعلقات تھے، وہ آپ پر عیاں ہے۔ میں بے حد ملول و افسردہ تھا۔ اپنے غم میں کیسے شریک کروں، کیسے تعزیت نامہ بھیجوں، تو پتہ نہیں کیوں نگاہ یکلخت آپ کے چہرے پر آکر ٹھہر گئی اور آپ کو لکھنے بیٹھ گیا۔ آخری وقت تک کلام صاحب کو آپ کی محبت بے انتہا عزیز رہی۔ یہ میں اچھی طرح جانتا میرے اس خط کا ذکر آپ کلام صاحب کے اعزہ و احباب سے کردیں تو بہتر ہو۔

مرحوم ہند پاک کے مشہور افسانہ نگار، صحافی، دانشور، صنعت کار تو تھے ہی، ذاتی طور پر بھی ان کی بے شمار مجھے ان کی یاد دلا رہی ہے۔ ؎ وہی چراغ بجھا جس کی لو قیامت تھی۔

شہزاد انجم

فن

اُبھرتا سورج

کلام حیدری

اب آئے ہیں تو پراناگیا بھی دیکھ لیں ،
عہد پارینہ کا تقدس ، اس کی عظمت اور رفعتوں کا
اندازہ آثار قدیمہ کے سوا اور کہاں ملے گا؟ ہم اس ملک
کے رہنے والے ہیں. جن کی تاریخیں زمینوں میں دفن ہیں۔
جن کے قصے سینوں کی قبروں میں دفن ہم سے منہ چھپائے پھر
رہے ہیں. جو ہم تک پہنچتے ہیں . وہ پورے کے پورے
نہیں پہنچتے ، وہ ہم تک یوں پہنچتے ہیں کہ ہم ان پر یقین
نہیں کر سکتے .
آدرشوں کے دیس میں آدرش وادی قصوں میں
سے اتنا کچھ کم ہو گیا ہے کہ ہمیں کچھ ملا ہی نہیں.
اب آئے ہیں تو بودھ گیا بھی دیکھ لیں۔
مگر اس وقت ہم نے بودھ کے بھکشوؤں کو مار مار کر
اس دیس سے نکال دیا .
عجیب ہیں ہم پرانے ہماری کہ ہم .
اپنے یہاں کے ہر نفیس ، خوبصورت ، شاداب ،
نازک ، اور بامعنی پیداوار کو دیس نکال دیتے ہیں .
اور اس کے چہرے کو داغدار بنا کر ایسا کر دیتے ہیں کہ آنے
والا زمانہ یہ ماننے میں ہچکچاہٹ محسوس کر سکے۔

یہ وہی چہرے ہیں جن پر آنکھیں گڑی رہ جاتی تھیں
غالب کی غزلیں گا گا کر بھگتی بننے والے ہم۔
غالب کی زبان کی مسکراہٹ کو اس کے چہرے سے
بے کر کے دھو چکے ہیں کہ یہ ہمارے ملک کی زبان نہیں ہے
کیونکہ یہ دائیں سے بائیں والی لپی میں لکھی جاتی ہے۔
زندہ زبان کو دفن کر کے ہم اس کے مقبرے بنائیں
گے اور مقبروں کی زیارت کر کے کمائیں گے ۔ اور سیاحوں
کو بتائیں گے کہ یہ غالب کا مزار ہے . کہ یہ وہ مکان ہے
جہاں فراق گورکھپوری رہتا تھا۔
ANTIQUITED سے عشق کرتے ہیں ہم۔
ششدر ہو کر ہم عہد پارینہ کو دیکھتے ہیں ۔ اور اس طرح
دیکھتے ہیں جیسے ہم خود کو بھی ANTIQUITIES
میں سے ایک ہیں۔
ہمیں دیکھو ، ہمیں دیکھو بھائیو ! ۔ دیکھو کہ ہم
راون کو ہر سال ہزاروں کی تعداد میں جنم دیتے ہیں.
لاکھوں کروڑوں ان اونچے اونچے کاغذ کے راونوں
کو تخلیق کرنے کے لئے بے دریغ خرچ کرتے ہیں.
اور پھر ان سب کو جلا دیتے ہیں۔

حالانکہ راون نہیں جلتا، راون آج تک ہمارے
دل کھربوں روپیوں کی قومی دولت جلاتا چلا آیا ہے
رے ـــ

ہم رام جنم بھومی کی تلاش میں منش اور منشتا
نوں کو دفن کر رہے ہیں۔
ہمارا نام کیا ہے؟
رام ؟
بابر ؟
رام جنم بھومی ؟
یا بابری مسجد ؟
راون بھوتوں پریتوں کی طرح چنگھاڑتا ہے،
خناک قہقہے لگاتا ہے۔ ہماری بود کھتا پر ــــ کر
ہستی دنیا تک اپنی دولت اس کو تخلیق کرنے پر خرچ
تے ہیں گے۔ سو سو فٹ اونچے پتلے بنا کر جلاتے
ہیں گے۔
لودھ گیا سے ہمیں عشق ہے کہ وہ
UNTIQUITI میں سے ایک ہے اور ہر سال
ئے جلا کر اپنی سمپتی جلاتے ہیں۔ بگمان ہزاروں
دن کی روشنی میں ہم ننگے بھوکے بچوں بڑوں
ہیں دیکھ پاتے جو کاسۂ گدائی لئے جو تیوں
ملتے رہتے ہیں اور ہر ایک کا دامن تھام
تے ہیں۔
ہم بھوکے ہیں، ہمارے لئے رام نے راون
مٹا کر ہم پر کتنا بڑا احسان کیا تھا۔ اور ہم ہر سال
ہزاروں روپے پھونک کر اپنے ہی بنائے ہوئے
ان راونوں کو پٹاخوں کی آوازوں اور نقاروں
دھوم دھام سے خوش ہیں۔

اپنی صحت مند پرم پرا بنانے سے زیادہ ہمیں
عہد رفتہ کو پوجنا آتا ہے۔
ANTRUITIES ہمیں اتنا پر جوش کیوں
بنا دیتی ہیں؟
اس لئے کہ حال تشکیک میں حل ہو گیا ہے،
حال پر یقین ٹوٹ پھوٹ سا گیا ہے؟ اور مستقبل؟
حال سے آگے تو وہ دیکھے گا جو حال پر یقین کے
ساتھ اپنے قدم جمائے گا۔ مستقبل تک پہنچنے والی
بصارت اور بصیرت سے ہم محروم ہو گئے ہیں؟
تو یار اٹھو اب چلو پہلے پرانا گیا دیکھ لیں۔
گاڑی ایک جگہ روک دینی پڑی کہ بس آگے
پیدل ہی چلنے کے لائق تنگ گلیاں تھیں۔ اور مکانوں
اور کھنڈروں میں سے ہوتے ہوئے ....
پنڈدان کرنے والے اس پرانے گیا میں ــ بڑے
بڑے بڑے خاندانی پنڈا رہتے ہیں کہ جن کو فخر تھا کہ مہاراجہ
کشمیر تک کے پرکھوں کو پنڈدان، انھوں نے کرایا تھا
اور ہاتھی جو سونے کے زیورات پہنے ہوئے تھا انعام
میں دیا گیا تھا۔ پرکھوں کی روحوں کو نجات دلانے کے
عوض سونے اور جواہرات کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔
اور درجنوں پنڈے ایسے تھے جو راجاؤں اور
رئیسوں پر بھی بھاری پڑتے تھے۔ کیونکہ ان کے پاس
دولت فراوانی کے ساتھ آتی تھی اور وہ روحوں
کو نجات دلانے کا ہنر جانتے تھے۔
- یہاں چار لاکھ سے زیادہ آدمی ہر سال
پتر دیکھش پر آتے ہیں ــ
شاید یہ گائیڈ کی آواز تھی۔
اور میں کہاں تھا؟

ہیں اپنے دوستوں کے ساتھ تھا۔ اور میرا دماغ مجھے چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا!

اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ عجیب بھی نہیں۔ ایسا میرے ساتھ اکثر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب میں کہانی لکھنے بیٹھتا ہوں تو بھی دماغ مجھے چھوڑ کر کہیں چلا جاتا ہے، مارا مارا پھرتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ کہانی بھی ماری ماری پھرتی ہے۔ پیشہ ور لکھنے والوں کی طرح اپنے دماغ کو کہانی کی تشکیل کرنے کو کہتا ہوں کہانی کا خاکہ بنانے کو کہتا ہوں، پلاٹ بنانے کو کہتا ہوں، تعمیر ماجرا اور کہانی پن ــــ اسلوب اور نئے تکنک کی دریافت پر آمادہ کرتا ہوں۔ مگر دماغ عالم دنا فضل نقاد مہر مندوں کی طرح میری باتیں بھی نہیں اسے آوارہ گردی کے سوا کسی بات کا شوق ہی نہیں سرکشی کے سوا کسی بات پر آمادہ نہیں۔

زندگی کتنی بار بدلی ہے!

کس کس طرح بدلی ہے!

زندگی کہاں بدلتی ہے!

وہ بھی زمین کی طرح اپنے محور پر گھومتی رہتی ہے تشکیل کے لئے ٹھہرتی نہیں کہ اسے جامد ہونے نہیں آتا۔ کائنات کے اجزا کیا ہیں یہ مقرر ہو جائے، طے ہو جائے تو کہانی کی تشکیل بھی ہو سکے شاید۔

اور میرے دماغ کو مارا مارا نہ پھرنا پڑے...

وہ سب کے سب دوست بوڑھے گیا، پرانا گیا۔ سب دیکھ کر چلے گئے ہیں۔ وہ دور دور سے لئے تو آئے تھے۔ اور یہاں کے عہد پارینہ کو پورا عہد کرکر دیکھ کر چلے گئے.......

..... حالانکہ ان کو اپنا حال بتانا چاہتا تھا مگر نہیں بتا سکا۔ بتانا چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی کا حال شاید میرے جیسا ہو مگر پھر مجھے اپنی حماقت کا بروقت خیال آگیا اور میں خاموش رہا.....

اس احساس سے ان کو یا کسی کو کیا لینا دینا کہ میرے شانوں پر دو آسیب سوار ہیں۔ اور میرے دونوں کندھے جھکے جا رہے ہیں ــ کہ جبکہ دونوں کندھے فرشتوں کے لئے خدا نے مخصوص کر دیئے ہیں، ایک وہ جو میری نیکیاں شمار کر کے لکھتا ہے۔ دوسرا وہ جو بدی گن گن کر لکھتا ہے۔ آسیب نے دونوں فرشتوں کو بھگا دیا تو دونوں کہاں چلے گئے؟ اور جتنے دنوں سے یہ غائب ہیں اتنے دن تک ..... اور پتہ نہیں کب تک میری نیکیوں اور بدیوں کا شمار کون کر رہا ہوگا کوئی بھی نہیں احساب لکھا ہی نہیں جا رہا ہے۔

اور یہ آسیب ـــــ

یہ میرے دونوں کندھوں پر کیا کر رہے ہیں؟ یہ نہ نیکیاں لکھتے ہوں گے۔ نہ بدیاں ــ پھر قیامت کے دن میرا کیا ہوگا؟ نہ نیکیاں لکھی ہوں گی، نہ بدیاں اور میرے کھاتے کے سادہ اوراق پھڑپھڑا کر اپنی تہی دامنی کا نوحہ کر رہے ہوں گے۔ اور آوازیں دبے رہے ہوں گے۔ ان فرشتوں کو جو میرے کھاتوں کے لکھنے پر مامور تھے۔

آسیبوں نے ان کو بھگا کر میری عاقبت کو ہوا میں معلق لٹکا دیا ہے۔ نہ پلڑا ادھر کا ادھر جھکتا ہے اور نہ ادھر ــ اس تذبذب اور بے رحم بے یقینی کے عذاب میں مبتلا میں سب سے الگ کھڑا ہوں گا۔ اور آہستہ آہستہ سامنے لوگ جنت یا جہنم کا رخ کر لیں گے۔ اور میدان حشر میں میرے اعمال کے کھاتے

کے سادہ اوراق پھڑپھڑاتے رہیں گے ......
...... آئینہ مجھے ڈراتا ہے۔
...... حال مجھے آسودگی نہیں دیتا۔
اور ماضی بہت سہانا بن کر حافظے کے
لیے عذاب بن گیا ہے۔
فرشتو! میرے کندھوں پر آجاؤ کہ آسیب
ہٹیں۔ مگر جن کندھوں پر آسیب ہوں ان پہ فرشتے
کہاں ہوں گے!
خوف کے آسیب نے میرے کندھوں سے
فرشتوں کو غائب کر دیا ہے!
ہیں!
ہم ضحاک بادشاہ کے زمانے کے لوگ کیوں
لگنے لگے ہیں! ہم ضحاک بادشاہ کی رعایا کیسے
ہو گئے!
ضحاک کے کندھوں پر دو مردم خور سانپ ہوا کرتے
تھے۔ اور بادشاہ بڑے کر و فر اور شان و شکوہ
کا تھا۔ وہ ان دونوں سانپوں سمیت بہت بڑی
بڑی خوبصورت دلربا راجدھانی میں لعل کے بنے
ہوئے محلے میں دربار کرتا تھا ——— اور جب جی
چاہتا اپنے وزیروں کو دربار سے نکال دیتا اور
رعایا........
رعایا میں سے دو آدمیوں کو روزانہ قتل کراتا
تھا۔ اور ان دونوں کا مغز دونوں سانپوں کو کھلاتا
تھا........ اور رعایا.....
کیونکہ اگر ضحاک ایسا نہ کرتا تو دونوں سانپ
خود ضحاک کا مغز چبا جاتے ——— !
ضحاک جیسے کر و فر والے بادشاہ کے یہاں
غریبوں اور بزدلوں کی کمی نہیں ہوتی جو اپنے
کندھوں پر آسیب کا بوجھ محسوس کرتے رہتے
ہیں اور ان کے کندھے میری طرح چھلتے رہتے تھے
ایسے ہی لوگوں میں سے دو روزانہ ضحاک کے
کندھوں والے سانپوں کی خوراک بن جاتے ہیں
زندگی بھی زمین کی طرح گھومتی ہے یارو!
زندگی بس اتنی بدلی ہے کہ لعل کے بنے ہوئے
قلعے میں بہت بڑا ضحاک پورے شان و شکوہ کے
ساتھ ہے۔ اس کے سینکڑوں وزیر پوری مملکت
میں پھیلے ہوئے۔ بے شمار وزرا۔ اس کے درباری
اور وزرا سب کے کندھوں پر وہی سانپ ہیں جو
بادشاہ کے کندھوں پر ہیں ——— اور ہزاروں افراد
کی گردنیں روزانہ کٹتی ہیں اور ضحاک اور اس
کے درباریوں اور وزرا، کے کندھوں پر اُگے ہوئے
سانپوں کو ان ہزاروں افراد کے مغز کھلا دیئے
جاتے ہیں۔
تاریخوں کو ANTIQUITIES میں تلاش
کرنے والے ہم بھی ان سانپوں کے خوراک بن جائیں گے
ایک ہی حکم روزانہ جاری ہوتا ہے:
یہاں سے ——— وہاں سے ———
اُتر سے، پورب سے، پچھم سے، دکھن سے
اپنی گردنیں جھکا کر کاٹ لو ———
"گردنیں جھکا دو"
"کہ آج تم سب کی باری ہے"
مگر ———
کوئی ایک گردن بھی نہیں جھکی
کوئی ایک تلوار بھی نہیں اٹھ سکی
گردنیں نہیں جھکیں۔ اُن سب نے اُلٹا ہوا، بلند دروازے کو دیکھ رہی تھیں......!

غلطی

کلام حیدری

مجھے ان چوبیس لڑکوں کا چارج دیا گیا جو کمسن تھے مگر جنہوں نے چھوٹے بڑے جرم کئے تھے، سب کے سب نابالغ تھے اس لئے انہیں اس ادارے میں بھیج دیا گیا تھا جہاں سزا کے بجائے ان کی اصلاح مقصود تھی۔ ان کے جرم معمولی تھے، بڑا سے بڑا جرم جو انہوں نے کیا تھا وہ دکان اور مکان میں چھوٹی موٹی چیزوں کی چوری کی تھی، مارپیٹ، آوارہ گردی، بے مقصد گھومنا اور مکانات کی دیواروں پر گندی گالیاں لکھنا۔ یہ سب غیر سماجی حرکات کے مرتکب تھے ان میں سے کسی کی عمر ۱۴ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

اس ادارے میں نوکری جوائن کرنے سے پہلے مجھے دو ماہ کی جو ٹریننگ دی گئی تھی اس میں بتایا گیا تھا کہ کم سن لڑکے مختلف وجوہات کی بنا پر آوارہ، سرکش اور بے ہودہ ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی بساط کے اندر چھوٹے موٹے جرائم کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔ اگر ان کی اصلاح نہ کی جائے تو آگے چل کر پیشہ ور مجرم اور خطرناک سماج دشمن افراد بن جاتے ہیں۔ ان کو سمجھ بوجھ اور عادی مجرموں سے الگ رکھ کر ان کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ ورنہ عام طرح کے جیلوں میں وہ ان کی صحبت میں گھٹتے ہی جاتے ہیں۔

نفسیات کا طالب علم ہونے کی وجہ سے مجھے ان لڑکوں سے متعلق فرداً فرداً تفصیل سے جاننے کی خواہش ہوتی تاکہ میں ان سے اور قریب ہو کر ان کا مطالعہ کر سکوں اور ان کی اصلاح کے کام کو بہتر اور مکمل طور پر کر سکوں۔

میں نے ان سب کے داخلے کے رجسٹر منگوائے اور اس کے ہر کالم کو بے حد توجہ اور دھیان سے دیکھا۔ مگر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ کیونکہ مقررہ کالموں کے تحت میری دلچسپی کا کوئی مواد نہیں تھا۔ وہ بس اس طرح کے کالم تھے۔ نام، باپ کا نام، باپ زندہ ہے یا مر گیا، ماں زندہ ہے یا مر گئی، مذہب وطن، عمر، کیا جرم تھا؟ پہلا جرم ہے یا اس سے پہلے بھی جرم کیا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔

پھر ایک ذیلی چارٹ تھا جس میں ہر لڑکے کی روزانہ کی حرکات، اس کا سلوک، اور پند و نصائح کا اثر وغیرہ کے متعلق انچارج کی رائیں تھیں ــــ ان رایوں کا پھر ماہانہ اور پھر سالانہ اسسمنٹ تھا۔

داخلے کا رجسٹر دیکھتے ہوئے مجھے ایک لڑکے کے نام کے آگے رک جانا پڑا۔ میں غور سے دیکھا مذہب کے کالم میں لکھا ہوا تھا۔ نام اس لڑکے نے اپنا نام قریشی بتایا ہے

یوں وہ ہندو ہے لیکن یہ لڑکا مسلمان ہے یہ اس محلے کے لوگوں نے بتایا تھا جنہوں نے اسے یہاں داخل کردیا تھا مجھے یہ کیس ذرا دلچسپ لگا۔ جرم کے کالم میں لکھا تھا۔ چوری کرتے پکڑا نہیں گیا مگر ایک گھر کے کمرے میں گھس کر سویا ہوا تھا۔ اکثر اس گھر میں سبھوں کی نظریں بچا کر گھس جایا کرتا تھا۔

ادارے کے معمول کے مطابق کام کرنا تو ایک فرض تھا۔ جسے تنخواہ کے عوض پورا کرنا ہی تھا لیکن مجھے ان لڑکوں سے کچھ ایسی ہمدردی ہوتی جا رہی تھی کہ مجھے لگتا اگر میں اس کا سدھار نہ کر سکا تو میں ایک ایسے فرض سے کوتاہی برتوں گا جو مجھ پر میرے ضمیر اور ذہن نے عائد کر دیا ہے میں نے اپنا معمول بنا لیا کہ روزانہ کسی نہ کسی لڑکے کو لئے ادارے کی عمارت سے باہر سیر کو نکل جاتا اور راستے میں اسے ایک دوست کی طرح مختلف قسم کے موضوعات پر باتیں کرتا۔

سریش کے متعلق رجسٹر میں درج شدہ باتیں میرے لئے تفتیش کا ایک نیا راستہ کھولتی تھیں۔ میں پوری باتیں جاننا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ اور اس کے لئے بے چین تھا۔ لیکن میں پوری احتیاط اور توازن کے ساتھ اس راہ میں بڑھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ سریش کو میں نے بے حد ذہین اور چالاک لڑکا پایا تھا، ہر چند کہ خصوصی طور پر میں نے اس سے باتیں نہیں کی تھیں۔ لیکن سرسری طور پر دیکھنے سے وہ بے حد ہوشیار اور ذہین معلوم پڑتا تھا۔

ایک دن میں سریش کو ساتھ لے کر سیر کے لئے نکل پڑا اور سوچ کر نکلا کہ اس سے بہت سی باتیں پوچھوں گا۔ ادارے کی عمارت سے نکل کر جب ہم وہاں پہنچے جہاں سے ڈھلوان شروع ہوتا تھا اور سڑک خشک ندی پار کر کے آگے جھنڈے سے جنگل میں چلی جاتی تھی تو میں نے پوچھا۔

"بھئی سریش تمہارا نام کیا ہے؟"

"سریش سنگھ اپیتھیا"

"اور تمہارے باپو جی کا نام؟"

"چندر کا سنگھ اپیتھیا"

"نہ، زندہ ہیں؟"

"زندہ ہیں"

"آپ نہیں جانتے سر۔ وہ کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں"

"تمہاری ماں ــ ؟"

"وہ بھی ہیں" "اور سر! میری دو بہنیں بھی ہیں لتا اور آشا۔ اور سر! میرا ایک بھائی بھی تھا۔ نریش جو مر گیا"

میں نے دیکھا وہ اچانک پژمردہ ہو گیا۔

"تمہیں دیکھنے آتے ہیں تمہارے ماں باپ؟"

سریش خاموش رہا۔

"تم خط لکھتے ہو؟"

"ہاں سر! ہفتے میں دو خط لکھتا ہوں۔"

میں نے سوچا میں اگر اپنی تمام بے چینیوں کے سکون کے لئے اور زیادہ پوچھ کچھ کروں گا تو یہ OVERDOING ہو جائے گا۔

ادارے میں واپس آنے کے بعد میں نے ریکارڈ دیکھے تو سچ مچ سریش ہفتہ میں دو خطوط شری چندر کا سنگھ اپیتھیا، گودلم روڈ، امین آباد کے پتے پر لکھتا تھا۔ لیکن مجھے اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ملا کہ اسے جواب بھی ملا یا نہیں یقیناً نہیں ملا ورنہ درج ہوتا۔

میں نے دوسرے دن چندر کا سنگھ اپیتھیا کو خط لکھا کہ آپ کا لڑکا سریش ایک ذہین اور اچھا لڑکا ہے، وہ اچھے سلوک اور پیار کا بھوکا ہے۔ اسے آپ کبھی کبھی

آئے اور نہ آپ نے اس کے خطوط کا جواب دیا۔ اب ہم اسے آزاد کرنا چاہتے ہیں۔ آپ چاہیں تو آکر لے جائیں۔

تقریباً دس دن کے بعد مجھے چندر کا سنگھ کا جواب ملا وہ یوں تھا۔

سریش نام کا کوئی بھی میرا بیٹا نہیں ہے۔ میرا ایک بیٹا نریش تھا، جو مر گیا۔ میری اب صرف دو بیٹیاں آشا اور لتا نام کی ہیں۔ ہاں آپ کے اداراے سے کوئی سریش برابر خط لکھتا ہے اور میرا بیٹا بنتا ہے۔ مگر یہ سچ ہے کہ میں نے اسے کبھی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ ایک تو وہ میرا بیٹا نہیں ہے، دوسرے وہ آوارہ اور بیہودہ لڑکا ہے۔ ہمارے محلے میں ادھر ادھر مارے مارے رہتا تھا۔ کئی بار وہ ہماری نظر بچا کر رات میں ہمارے کسی کمرے میں گھس کر سو جاتا تھا۔

ایک بات اور — وہ ہندو نہیں ہے مسلمان ہے مگر جانے کیوں میرا بیٹا ہونے کی اس نے کہانی گڑھ لی ہے۔ اس کے ماں باپ کا کوئی پتہ نہیں ہے، محلے کے لڑکے اسے اناتھ کہتے تھے تو وہ انہیں مارنے دوڑتا تھا!

سریش اتنا ہنس مکھ، ذہین، مطیع، اور فرمانبردار لڑکا تھا کہ مجھے لگا کہ وہ پاگل تو ہرگز نہیں ہو سکتا — پھر مجھے لگا — سیدھی سی بات ہے، اسے اناتھ کہلانے میں اپنی توہین معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اس نے ذہنی ماں، باپ، بھائی، بہن سب کچھ بنا لیا ہے اور اپنی انا کی تسکین کے لئے، اس توہین اور محرومی کی شرم سے گریز کرنے کے لئے خود کو بھرا پرا خاندان کا لڑکا بتاتا ہے اس نے چندر کا سنگھ اور ان کے گھر کو پوری طرح ذہن میں رکھ لیا کہ یوں کہ نصف وہ خود بھی بھول چکا ہے کہ یہ کہانی جو وہ دوسروں کو سناتا ہے من گڑھت ہے۔

دوسرے دن میں پھر اس کے ساتھ باہر نکلا۔ میں نے سوچا اسے اصلیت سے نبرد آزما ہونے کے لئے تھوڑی جرأت دی جائے۔ حقیقت سے فرار کر کے وہ کہاں جائے گا؟ میں نے پوچھا۔ چندر کا سنگھ تمہارے باپ ہیں!

سریش نے مجھے غور سے دیکھا —

"جب تمہارے باپ ہیں تو انہوں نے تم کو اپنے گھر سے نکال کیوں دیا۔ جہاں تم رات میں سو سکتے تھے!

سریش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر اس نے مجھے جن نظروں سے دیکھا ان کا مفہوم صاف تھا۔

"بھلا میرے باپ ہوتے تو نکالتے کیوں؟

دوسرے لمحے وہ بہت نروس ہو گیا، اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اس کی سانسیں تیزی سے چلنے لگیں۔

چندر کا سنگھ تمہارے باپ نہیں ہیں۔ اور آشا اور لتا بھی تمہاری بہنیں نہیں ہیں۔ جو نریش مر گیا ہے وہ بھی تمہارا بھائی نہیں تھا۔ تم نے فرضی قصہ گڑھ کر مجھے سنایا تھا۔

سریش ایک ٹک زمین پر نظریں گاڑے رہا جیسے اسے بھرے بازار میں باپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو۔

صبح میں سریش ناشتے پر نہیں تھا۔

اسے بے حد شدید بخار آ گیا تھا۔ ڈاکٹر کی دوائیں بیکار ثابت ہو رہی تھیں۔ تین دن تک وہ بخار میں گھومتا رہا۔ پھر بخار کم ہو گیا، مگر لگتا تھا کہ وہ مہینوں سے بیمار ہو، اور تین دنوں کے اندر وہ گھٹ کر نصف رہ گیا تھا۔

میں امین آباد چلا گیا۔ اور چندر کا سنگھ امیٹھیا سے ملا۔ بیچارہ بے حد شریف آدمی تھا۔ "وہ آپ کو باپ مانتا ہے۔ آپ اسے بیٹا مان لیں گے تو وہ بچ جائے گا۔ آپ کا اس میں جاتا کچھ نہیں ہے مگر وہ ایک اناتھ لڑکا ہے جسے گھر، خاندان، بھائی بہن کے بغیر اس دنیا میں رہنا

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

کلام حیدری کا آخری تبصرہ

(انتقال سے چند گھنٹے پہلے لکھا گیا)

گلشن ریکھا کے پہلے اندرونی فلیپ پر جناب وہاب اشرفی نے فرمایا ہے کہ:

"منظر کاظمی کے افسانوں کی قماش ان کے فکری میلان سے مرتب ہوتی ہے، حیات و کائنات کے پیچیدہ مسائل ان کی تخلیقی حیثیت کو مسلسل مہمیز کرتے رہتے ہیں نتیجہ میں جو افسانہ سامنے آتا ہے وہ مسائل سے وابستہ تو ہوتا ہی ہے، فن کی بنیادی قدروں سے آراستہ اور پیراستہ بھی ہوتا ہے۔"

وابستہ، آراستہ، پیراستہ اس تک بندی کے نتیجہ میں منظر کاظمی کے افسانوں کی قماش، ان کا فکری میلان اور حیات و کائنات سب کے سب سر بگریباں ہیں۔

گلشن ریکھا کی اشاعت اردو افسانوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور مزید یہ کہ منظر کاظمی کی پانچوں انگلیاں برابر ہیں۔ یہ بھی وہاب اشرفی صاحب کا ارشاد ہے۔

گلشن ریکھا نام سے کرشن چندر کا ایک ڈرامہ بہت پہلے آچکا ہے۔ منظر کاظمی کی ایک تحریر جو ان کی اس کتاب میں شریک ہے "کانٹوں کا تاج" بھی ہے جس کا آخری جملہ یوں ہے:

"آسمان سے چپکے ہوئے روشنی کے ٹھنڈے طشت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے والا اب لوٹ کر نہیں آئے گا۔"

میں کہوں یا نہ کہوں اس جملے سے شق القمر کا معجزہ دکھانے والے کی طرف واضح اشارہ ہے۔ میں نے "کانٹوں کا تاج" کو تحریر لکھا ہے، اس لئے کہ یہ کہانی نہیں ہے، پر کہانی نہیں ہوتے ہوئے بھی تخلیقی عمل ہے۔ صنف مقرر کرنا میرا کام کبھی نہیں رہا یہ کام جدید نقادوں کا ہے۔ اس پوری کتاب میں دو تین تحریریں ایسی ہیں جن پر پہلی نظر میں کہانی کا گمان ہوتا ہے مگر وہ کہانیاں اس لئے نہیں بن پاتیں کہ وہ حرفوں سے ٹکر لینے کی کوشش میں ہانپ ہانپ کر دم توڑ دیتی ہیں۔

قرآن شریف کے اسلوب اور اس کے METAPHORS اور اس کی نغمگی اور اس کی ششدر کر دینے والی COM-PUTERISED آیتیں، سورتیں اور پھر پورا قرآن شریف منظر کاظمی کے قلب و ذہن پر اتنے دبیز کہاسے کی طرح چھایا ہوا ہے کہ وہ اپنی عبارت تو کیا، اپنی کہانی تو کیا خود اپنے آپ کو بھی بھول گیا ہے اور اس جنون کے عالم میں جو نثر اس کے قلم سے نکلتی ہے وہ افسانہ نہ ہوتے ہوئے بھی افسانے سے اونچے درجے کی کوئی تخلیق ہے جس کا نام رکھنے کے لئے کسی قرآنی عمل سے گذرنا پڑے گا جس کا میں اہل نہیں ہوں۔ اس کی کسی تحریر میں آیۃ الکرسی کی صدائے بازگشت ہے کہیں سورہ رحمٰن کہیں سورہ النساء ہے کہیں "اِنَّا أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرْ" ہے ــــ اور یوں کوثر میں دھلی ہوئی یہ نثر لگتا ہے کہ سحر زدہ کرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ افسانہ بنانا یا افسانہ لکھنا کیا اس سے زیادہ بڑا کام ہے؟

(باقی صفحہ ۲۳۵ پر)

فہرست مطبوعات اردو اکادمی، بہار

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف / مرتب	قیمت	نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف / مرتب	قیمت
۱	کلیات شاد (حصہ دوم)	کلیم الدین احمد	۷۰ روپے	۲۵	بدچلن	سبرت چندر چٹرجی	۶۵ روپے
۲	کلیات شاد (حصہ سوم)	کلیم الدین احمد	〃 ۷۰	۲۶	نغمۂ سنگ	رمز عظیم آبادی	〃 ۲۵
۳	رقص شرر	کلیم الدین احمد	〃 ۲۰	۲۷	حقیقت بھی کہانی بھی	سید بدرالدین احمد	〃 ۶۰
۴	ودیاپتی۔ حیات اور شاعری	شمیم احمد ہاشمی	〃 ۲۰	۲۸	آثار جمیل مظہری	رضا مظہری	〃 ۴۵
۵	سیل آتش	سید فضل احمد	〃 ۲۵	۲۹	چند تنقیدیں	سید ریاست علی ندوی	〃 ۲۵
۶	دنکر۔ حیات اور شاعری	خواجہ بدیع الزماں	〃 ۲۰	۳۰	مقالات عظیم الدین احمد (مجموعہ مقالات)		〃 ۲۵
۷	نامۂ شوق	سید صابر حسین	〃 ۲۵	۳۱	خطوط شبلی بنام آزاد	سید محمد حسنین	〃 ۳۵
۸	محشر انقلاب	علامہ سرکار بری بیانی	〃 ۲۵	۳۲	مولانا ابوالکلام	عبدالقوی دسنوی	〃 ۲۵
۹	سہیل عظیم آبادی اور انکے افسانے	وہاب اشرفی	〃 ۲۵	۳۳	میر انیس	کلیم الدین احمد	〃 ۴۰
۱۰	حافظ محمود شیرانی (مجموعہ مقالات)		〃 ۳۵	۳۴	بہار میں اردو افسانہ نگاری	وہاب اشرفی	〃 ۸۵
۱۱	حسرت موہانی (مجموعہ مقالات)		〃 ۲۵	۳۵	مکتوبات شہباز	صابر حسین	〃 ۳۵
۱۲	دنیا کی لوک کہانیاں	احمد جمال پاشا	〃 ۲۵	۳۶	مولانا ابوالکلام آزاد سیمنار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ		〃 ۳۰
۱۳	مثنوی سحر البیان	میر حسن	〃 ۱۵	۳۷	مضامین مولانا گیلانی	مظفر گیلانی	〃 ۳۰
۱۴	نیرنگ خیال	محمد حسین آزاد	〃 ۱۵	۳۸	تحلیل نفس اور ادبی تنقید	کلیم الدین احمد	〃 ۳۵
۱۵	انتخاب مضامین سرسید		〃 ۱۵	۳۹	مراثی شاد	مرتبہ: نقی احمد ارشاد	〃 ۴۵
۱۶	یادگار سلیمان	عبدالقوی دسنوی	〃 ۵۰	۴۰	باقیات شاد	〃	〃 ۴۰
۱۷	مقالات نصیر حسین خیال	سید نقی احمد ارشاد	〃 ۳۵	۴۱	محل خانہ	مولوی سید سجاد عظیم آبادی	〃 ۵۰
۱۸	اکبر الہ آبادی (سمینار کے مقالات)		〃 ۳۵	۴۲	ہمارا سماج (بچوں کے لیے)	قمر النساء بیگم	〃 ۳۰
۱۹	ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء	اقبال حسین	〃 ۳۰	۴۳	منثورات جمیل مظہری (اول)	ڈاکٹر اعجاز علی ارشد	〃 ۵۰
۲۰	عہد رسالت و خلافت راشدہ	سید ریاست علی ندوی	〃 ۶۵	۴۴	منثورات جمیل مظہری (دوم)	〃	〃 ۶۰
۲۱	قومی تحریک اور ہندوستانی آئین	عبدالصمد	〃 ۳۵		بہار اردو اکادمی کی بالکل نئی اور قابل فخر مطبوعات		
۲۲	گڑیا رانی	رحمٰن حمیدی	〃 ۱۵	۱	مقالات سید حسن عسکری		〃 ۲۰۰
۲۳	اردو کا افسانوی ادب (مجموعہ مقالات)		〃 ۳۵	۲	قاضی عبدالودود سیمنار کے مقالے		〃 ۸۵
۲۴	اپنی تلاش میں (حصہ دوم)	کلیم الدین احمد	〃 ۳۵	۳	کلیم الدین احمد سمینار کے مقالے		〃 ۷۵

شرائط: (۱) کتب فروشوں کو ۵۰۰/- روپے تک آرڈر پر ۳۳ فیصد اور ۵۰۰/- روپے سے زیادہ کے آرڈر پر ۴۰ فیصد کمیشن دیا جاتا ہے۔ (۲) پبلک لائبریری، اسکول اور کالج کے لائبریری، اکادمی سے انعام یافتہ یا دونوں کو ۱۵ فیصد کمیشن دیا جاتا ہے (۳) ڈاک خرچ اور ڈرافٹ کے مصارف بذمہ خریدار ہوں گے (۴) کتب فروشوں سے گذارش ہے کہ کتابوں کا آرڈر دیتے وقت اپنا نام اور پتہ صاف صاف لکھیں اور ریلوے سے منگانے کی صورت میں مقامی ریلوے اسٹیشن کا نام بھی لکھیں (۵) بینک کے ذریعہ کتابیں منگاتے وقت بینک کا نام اور برانچ کا پورا پتہ ضرور لکھیں۔

مشتاق احمد نوری، سکریٹری بہار اردو اکادمی پٹنہ

مکتبہ غوثیہ کی فخریہ پیشکش

نمبر	نام کتب	صنف	مصنف	قیمت
۱	سارا دن دھوپ	افسانے	غیاث احمد گدی	۵۰ روپے
۲	تھکا ہوا دن	〃	الیاس احمد گدی	۴۰ 〃
۳	دھوپ کی چادر	〃	سید احمد قادری	۷۵ 〃
۴	افکار نو	تنقید	سید احمد قادری	۶۰ 〃
۵	خوابوں کے سہارے	شاعری	شاہد جمیل	۸۵ 〃
۶	سوکھے جزیرے کی دعا	〃	یوسف جمال	۳۵ 〃
۷	زینۂ ہند	قومی شاعری	فرحت قادری	۵۰ 〃
۸	گوہر عروض و بلاغت	فن شاعری	گوہر شیخپوروی	۵۰ 〃
۹	ان سے ملئے	خاکے	مظفر گیلانی	۳۰ 〃
۱۰	رگ سنگ	افسانے	بدر سا ورنگ آبادی	۱۵ 〃

یہ معیاری، نایاب اور دستاویزی کتب بھی مل سکتی ہیں

نمبر	نام کتب	صنف	مصنف	قیمت
۱۱	صفر	افسانے	کلام حیدری	۳۰ 〃
۱۲	الف لام میم	〃	〃	۶۵ 〃
۱۳	گولڈن جوبلی	〃	〃	۷۰ 〃
۱۴	ارتقاء (منتخب افسانے)		مرتب کلام حیدری	۴۵ 〃
۱۵	مزامیر	تنقید	کلام حیدری	۱۰ 〃
۱۶	ادب اور تصوف	〃	〃	۲۰ 〃
۱۷	تفہیمات	〃	〃	۳۰ 〃
۱۸	فراز دار	اداریئے	〃	۳۰ 〃
۱۹	برملا (ادبی تبصرے)		〃	۱۵ 〃
۲۰	تذکرہ شعرائے گجرات	تذکرہ	مرتب کلام حیدری	۱۵ 〃
۲۱	مطالعہ اردو (انتخاب ادب)	〃	〃	۱۲ 〃

نمبر شمار	نام کتب	صنف	مصنف	قیمت
۲۲	احتشام حسین نمبر	آہنگ	مرتب کلام حیدری	۵۰ روپے
۲۳	فکشن نمبر	〃	〃 〃	۳۵ 〃
۲۴	اپنی تلاش میں	سوانح	کلیم الدین احمد	۱۲۵ 〃
۲۵	زاویۂ نگاہ	تنقید	خلیل الرحمن اعظمی	۶۰ 〃
۲۶	نئے افسانے کا سلسلۂ عمل	〃	مہدی جعفر	۳۰ 〃
۲۷	اردو کے مخفی افسانے	〃	ڈاکٹر حسن آرزو	۳۵ 〃
۲۸	بابا لوگ	افسانے	غیاث احمد گدی	۵۰ 〃
۲۹	یہ لوگ	خاکے	ڈاکٹر محمد مشتیٰ	۱۸ 〃
۳۰	انتخاب کلام جمیل مظہری	شاعری	〃 〃	۱۷ 〃
۳۱	مردے (جیمس جوائس)		ترجمہ شاہد احمد دہلوی	۴۰ 〃
۳۲	سائنس کی تقدیر (ڈوس ہکسلے)		ترجمہ شیخ صلاح الدین	۱۰ 〃
۳۳	لمحوں کا سفر	شاعری	نرمدیشور پرساد	۲۰ 〃
۳۴	نغمۂ راز	〃	مہجور شمسی	۲۰ 〃
۳۵	کلام حیدری بحیثیت افسانہ نگار	تنقید	ڈاکٹر اسلام عشرت	۲۰ 〃
۳۶	معیار و مسائل	〃	شاہ شکیل احمد	۲۰ 〃
۳۷	میزان	〃	ڈاکٹر انعام ناظمی	۵۰ 〃
۳۸	پرائے چہرے	افسانے	ذکیہ مشہدی	۳۰ 〃
۳۹	دوپہر کے بعد	ڈرامے	شفیع مشہدی	۳۵ 〃

تاجران کتب، کالجوں اور لائبریریوں کے لئے معقول کمیشن
آج ہی اپنے قیمتی آرڈر سے نوازیں

رابطہ

مکتبہ غوثیہ نیو کریم گنج گیا (بہار) ۸۲۳۰۰۱

بہار میں اصلاحات آراضی اور تعلیم

بہار سرکار کی مہم بے زمین غریبوں کو باوقار زندگی دینے کے مقصد سے چلائی جا رہی ہے۔ بے زمینوں کے درمیان زمین کی تقسیم کو اولیت۔ گذشتہ پانچ برسوں میں ۴۰ ہزار ایکڑ زمین بے زمینوں کے درمیان تقسیم کی گئی۔ اس سال ۲۰ ہزار ایکڑ زمین کی تقسیم کا نشانہ مقرر۔ مٹھوں اور مندروں کے نام پر فالتو مقبوضہ زمین سیلنگ حدبندی قانون کے دائرے میں لاکر بے زمین لوگوں کے درمیان تقسیم۔ اس سے ایک لاکھ ایکڑ سے زیادہ زمین حاصل ہوگی۔ ریاستی سرکار غریبی سرحد سے نیچے کے خاندان کے لئے دو دھوتیاں اور دو ساڑیاں پندرہ روپے فی دھوتی اور ساڑی کے در پر مہیا کرانے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے جا رہی ہے۔

تعلیم :-

کمزور طبقہ کے درمیان تعلیم کی روشنی پھیلانے کے لئے تقریباً سرکار نے کئی قدم اٹھائے ہیں۔ جھگی جھونپڑیوں اور مسہر ٹولیوں کے بچوں کے لئے ۲۶۰ اسکول کھولے گئے۔ گائے بھینس، بکری اور بھیڑ چرانے والے بچوں کو تعلیم کا فائدہ دلانے کے لئے تقریباً ۱۵۰ چرواہا اسکولوں کا قیام۔

ہر تین سو کی آبادی پر نئے مخصوص ایجوکیشن سینٹر کھولنے میں سرکار مدد کرنے جا رہی ہے۔ ڈوم، مسہر اور ملکھور ذات کے بچوں کو اسکول جانے میں دلچسپی دلانے کے لئے ہر ایک بچہ کو ہر ایک دن ایک روپیہ دیا جا رہا ہے۔ پرائمری اسکولوں کے ٹیچروں کی بحالی میں ٹریننگ کی شرط ختم۔

ٹیچروں کی بحالی کے لئے ودیالیہ بورڈ کا قیام۔ انٹرمیڈیٹ کونسل اور یونیورسٹی کے ساتھ صلاح و مشورہ کر کے کارگر اور موثر پروگرام تیار کیا گیا ہے۔

اکیڈمی کلنڈر طے کر کے وقت پر بدعنوانی سے پاک اور بہتر امتحان کا انعقاد اور وقت پر رزلٹ کی اشاعت کرتے ہوئے تعلیم کے ماحول میں بہتری لائی جا رہی ہے۔

جاری کردہ : محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار

RRD 95 H (H-35) 96-97 The Sohail October-96

بانی :۔ حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل شہسرامی ۔ یادگار :۔ زین العابدین اختر و ادریس شہسرامی

سہیل گیا
ماہنامہ

- چیف ایڈیٹر -

مسعود منظر

- ایڈیٹر -

جمیل منظر

خوشنویس :۔ سید عبدالاحد گیاوی

- فہرست -

جلد ۵۶ شمارہ ۱۱

— بدل اشتراک —

فی شمارہ ——— ۵؍ روپے

زر سالانہ ——— ۵۰؍ روپے

لائف ممبری ——— ۱۰۰۰؍ روپے

- خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ -

ماہنامہ سہیل

ریلوے سائڈ روڈ، گیا ۔ ۸۲۳۰۰۱

فون :۔ ۲۱۵۷۳ - ۳

جینے کا حق ایک جیسا

مساوات، حفاظت اور عزت

● وزیر اعلیٰ شری لالو پرشاد کے ترقی پزیر اور قابل فخر قیادت میں ان غریبوں، دلتوں، پچھڑوں، استحصال زدہ اور نظر انداز لوگوں کو جن میں زندگی کی تمام آرام و آسائشوں سے لاتعلق دکھایا گیا ہے یا جن کے مستقبل کو رام رحیم کے بھروسے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان کے من میں دبی امیدوں اور آرزوؤں کو حقیقت میں بدل کر ان میں عزت کی زندگی جینے کی امنگ جگانے کا کام کیا ہے۔ غریبوں اور پسماندہ کے چہروں پر مسکان اور سماج کے ہر طبقہ کے لوگوں تک فلاح کی کرنیں پہنچائی جا رہی ہیں اور سماج کی عملی رفتار سے جوڑ کر انہیں سرکار کے منصوبوں اور پروگراموں کا حقیقی فائدہ دیا جا رہا ہے۔

مالیہ اور اصلاح اراضی پروگرام :-

● مارچ 96 تک صوبہ میں 4 لاکھ 16 ہزار 529 ایکڑ قابل زمین کو حاصل کر اور سماج کے پسماندہ طبقہ کے درمیان 3 لاکھ 2 ہزار 871 ایکڑ زمین کی تقسیم!

● سال 96-1995 میں صوبہ کے کل 5 ہزار 783 بے زمین خاندانوں کے درمیان 3 ہزار 679 ایکڑ زمین کی تقسیم

● بہار بھودان یگیہ قانون کے تحت حاصل کل زمین 16 لاکھ 49 ہزار 557 ایکڑ زمین میں سے مارچ 96 تک ایک لاکھ 89 ہزار 880 ایکڑ بھوی شیڈول کاسٹ کو ایک لاکھ 3 ہزار 895 ایکڑ زمین شیڈولڈ ٹرائب کو، 58 ہزار 222 ایکڑ زمین پچھڑی ذات کو کل 7 لاکھ 20 ہزار 151 ایکڑ زمین مستفیدوں کے درمیان تقسیم۔

● آدی باسیوں کے غلط طریقہ سے ہڑپ لی گئی زمین کی واپسی کے لئے مارچ 94 تک 83 ہزار 360 معاملے دائر کل 42 ہزار 291 معاملوں میں 45 ہزار 118 ایکڑ زمین پر آدی باسیوں کو قبضہ دلایا گیا۔

● زمین پر ناجائز قبضہ ختم کرنے کے پروگرام سال 96-95 میں کل 5663 انکروچمنٹ مقدمہ دائر کئے گئے اور 874 مقدموں کا فیصلہ کرکے 624.32 ایکڑ سرکاری زمین کو انکروچمنٹ سے آزاد کرایا گیا۔

جاری کردہ :- محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ بہار

P.R.NO-1. JD(INF-) 96

نمود

رام لعل

رام لعل ہمارے درمیان اب نہیں رہے۔ اُردو دنیا کو چاہے وہ جتنی دور بھی پھیلی ہوئی ہو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ رام لعل کون تھے، انہوں نے اردو افسانے اور اردو زبان کی تحریک بقاء ترقی میں کیا کچھ کیا ہے ــــــ اس سے سارے لوگ واقف ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ رام لعل نے اردو کو متعدد بہتر افسانے دیئے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ وہ اپنی ملازمت کے ابتدائی ایام سے بلکہ اپنی طالب علمی کے دَور سے افسانے لکھتے رہے اور یوں مسلسل مشق و ریاضت اور اپنی بہترین تخلیقی صلاحیت کی وجہ سے اردو کے معتبر افسانہ نگاروں میں اپنا نام پیدا کر لیا۔ سبھوں پر ظاہر ہے کہ رام لعل نے اردو کے ہندو ادیب ہونے کی مراعات حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ اردو سپاہی اور مجاہد ہی نہیں تھے اس کے عاشق بھی تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے اردو کو جو کچھ دیا اس کے معاوضے میں کبھی کچھ نہیں لیا۔ ایک سچے تخلیق کار کی طرح وہ ہمیشہ تخلیق فن میں مصروف رہے۔ وہ اردو کے ایک تپیاگی تھے، تپسیا کی حد تک اس میں مگن تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جب اردو پر مسلمانوں کی زبان ہونے اور اس طرح اس کے حقوق صلب کرنے کی بات آئی تو رام لعل نے اردو کے ہندو ادیبوں اور پرستاروں کی ایک عظیم الشان کانفرنس بلائی اور لکھنؤ کے اس یادگار جلسے میں ہندوؤں کی طرف سے اردو کے لئے زبردست لڑائی لڑی۔

یہ سب باتیں بھولنے کی نہیں ہیں۔ رام لعل ایک مثالی کردار اور اصیل تخلیق کار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اردو سے ان کی بے پناہ محبت ہمارے دلوں میں بھی یہ جوت جگاتی رہے گی۔ یہ امر جیوتی رام لعل کے نام سے قائم رہے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

ــــ مسعود منظر ــــ

کالی داس گپتا رضا

۱۲/۴۳ ایہ، جالدار شین، بمبئی

میر تقی میر — خدائے سخن؟

اس مختصر مضمون میں کئی شاعروں کا ذکر آیا ہے ان میں سے چند کا عہد پہلے جان لینا ضروری ہے۔

سودا	۱۷۰۶/۷ء تا ۱۷۸۱ء
میر	۱۷۲۳ء تا ۱۸۱۰ء
ناسخ	۱۷۷۲ء تا ۱۸۳۸ء
آتش	۱۷۷۸ء تا ۱۸۴۷ء
ذوق	۱۷۸۸/۸۹ء تا ۱۸۵۴ء
غالب	۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء

رشتہ شاگرد، آتش کو چھوڑ کر مندرجہ بالا چھ شاعر اردو شاعری کی عہد ساز شخصیتیں ہیں۔ سودا کے سن بلوغ ۱۷۲۱/۲۲ء سے غالب کی وفات ۱۸۶۹ء تک لگ بھگ ڈیڑھ سو سال ہوتے ہیں۔ اسے اردو شاعری کا سنہری دور کہنا چاہئے۔ سودا، میر سے سولہ سترہ سال سے پہلے پیدا ہوئے اور میر کی وفات سے ۲۹ سال پہلے دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اگرچہ رنگ قطعی جداگانہ تھا مگر کمال فن میں دونوں شعر کے شاعر اور استاد تھے اس لئے برابر کی چوٹیں چلتی رہتی تھیں۔ سودا نے کہا ؎

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

تو میر بھی خاموش نہیں رہے ؎

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یوں ہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

سودا نے جواب میں کہا ؎

نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا جانے

یہ برابر والوں کی باتیں ہیں، وہ جو چاہیں کہیں، جیسا چاہیں نپٹیں۔ ناسخ کو میدان میں آنے میں ابھی دیر تھی۔ سودا کے انتقال کے وقت وہ محض نو سال کے تھے مگر انہوں نے میر کو جی بھر کے دیکھا۔ سنا اور پرکھا تھا۔ جب میر گزرے ہیں تو ناسخ نہ صرف ۳۸ سال کے ہو چکے تھے بلکہ ان کا دیوان اول جمع بھی ہو چکا تھا۔ زمانہ میر کے

نام وکلام سے متاثر تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ، جو
خود ایک جید شاعر اور استاد تھے۔ میر کے محض نام سے
متاثر تھے کلام سے نہیں۔ انھوں نے بے اختیار (شاید
میر کی زندگی ہی میں کسی مشاعرے یا شعری نشست میں)
یہ دیا کہ ؎

شبہ ناسخ کو نہیں میر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

لیکن ناسخ کے دیوان اٹھا کر دیکھ لیجئے، میر سے اعتقاد
کی کوئی جھلک تک کہیں پائی نہیں جاتی۔ آتش، ناسخ
کے ہم عصر تھے۔ ان کے استاد کامل ہونے میں کوئی شک
نہیں۔ ان کے یہاں داخلی شاعری کے نمونے مل جاتے ہیں
مگر انہیں زیادہ سے زیادہ میر کا ادھورا سا لکھنوی
جواب کہہ سکتے ہیں۔ ان سے امید کی جا سکتی ہے کہ
انھوں نے میر کا قصیدہ پڑھا ہوگا۔ میر کی وفات تک
یہ بائیس سال کے ہو چکے تھے۔ بہر حال میر کے بعد میر کا
نام تو باقی ہی تھا۔ اس لئے میر کا کلمہ گو ہونے میں کیا
رکاوٹ ہو سکتی تھی مگر آتش نے ایسا نہیں کیا حق
یہ ہے کہ آتش کا اسلوب ان کا اپنا ہی ہے اور میر
کے اتباع میں نہیں ہے تو انھیں میر کے تابع ہونے پر
مجبور کیوں کر کیا جا سکتا ہے۔

ذوق بھی ناسخ کے لگ بھگ ہم عمر تھے -
ان کے کلام میں زبان وبیان کی مہارت اور اسلوب
ناسخ خوب جھلکتے ہیں۔ ناسخ کا دیوان دہلی آ ہی
چکا تھا۔ ذوق، ناسخ کے کلام کے ساتھ "معتقد میر"
والے مقطع سے بھی متاثر ہوئے۔ میر کا کلام لاکھ نظر
سے گزرا ہو۔ جب طبیعت شعر کی صناعی کی طرف
مائل ہو تو میر کے داخلی شاعری کیا متاثر کرتی۔ البتہ
میر کی شہرت اور ناسخ کے مقطع نے خوب متاثر کیا اور
انھوں نے بھی مقطع کہہ ڈالا ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میں آج کل ذوق کا کلام مرتب کر رہا ہوں (وہ میرے
پردادا استاد بھی ہوتے ہیں) مگر میں نے انھیں کہیں
میر کا انداز اپنانے کی کوشش کرتے ہوئے نہیں
دیکھا۔ ظاہر ہے کہ یہ مطلع یا رسم پوری کرنے کے لئے کہا
گیا ہے یا احتراماً۔

حالی کے ایک بیان کے مطابق غالب، میر کو
سودا پر ترجیح دیتے تھے اور ذوق سودا کو میر پر۔ میں
اس بیان کو معتبر نہیں مان سکتا۔ کیونکہ یہ بات حالی
کے سامنے کی نہیں ہے۔ حالی جب دہلی آئے ہیں لگ
بھگ انھیں دو ایک سالوں بعد ذوق کا انتقال ہوا
ہے۔ یہ بات انھوں نے کسی سے سنی ہوگی۔ یوں بھی
غالب نے جب ناسخ کا یہ مصرع استعمال کیا ہے ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
"آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں"

اس وقت غالب کی عمر تقریباً پچیس سال تھی مگر
ذرا ان کی پچاس سال کی عمر میں کہی ہوئی ایک غزل
کے مقطع کے تیور دیکھئے ؎

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

جب یہ مقطع کہا گیا ہے اس وقت میر کو اس جہان
سے کوچ کئے ابھی چالیس سال بھی نہیں ہوئے تھے۔

اس چالیس سال پہلے کے زمانے کو "اگلا زمانہ" کہا ہے اور وہ میر جن کے پچیس برس پہلے غالب "معتقد" ہونے کا دم بھرتے تھے اب "کوئی میر" ہو کر رہ گئے یعنی انھیں اب غالب ٹھیک سے جانتے بھی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غالب، میر اسکول کے شاعر نہ تھے، ان کے ڈانڈے کھینچ تان کر ناسخ اور انشا سے تو ملائے جا سکتے ہیں مگر میر سے نہیں۔ اس کے علاوہ غالب اتنے بڑے شاعر ہیں کہ میر کے ایسے بڑے شاعر بھی ان کی نظروں میں۔ غلط یا صحیح۔ کچھ کم ہی بار پا سکتے تھے۔ درج بالا مقطع اسی کا غماز ہے۔ تاہم غالب کی اس جرأت کی داد دینی پڑے گی کہ جہاں ناسخ اور ذوق ایسے بھاری بھرکم استادوں نے میر کے رعب میں میر کی روایتی تعریف کر ڈالی۔ وہاں غالب نے اپنے پاؤں پہ کھڑے ہوتے ہی میر کے مقابلے میں خود اپنا مقام متعین کر لیا۔

بعض حلقوں میں میر کو "خدائے سخن" کے لقب سے پکارا گیا ہے۔ یہ لقب میر کے ہم عصروں نے تو قطعی نہیں دیا۔ ہم عہد تذکروں حتیٰ کہ آب حیات میں بھی اس کا ذکر نہیں۔ گویا میر انتقال کے سو سال بعد تک اس لقب سے محروم رہے۔ پھر کسی نامعلوم شخص نے ان کے نام سے پہلے "خدائے سخن" کی ترکیب چپکا دی۔ میر حقیقی معنوں میں بہت بڑے شاعر تھے مگر "خدائے سخن" نہ تھے۔ "خدائے سخن" محض ایک مفروضہ ہے جو خالص اردو والوں کا اختراع ہے۔ کرنے والے تو ابلیس کو بھی "خدائے سخن" سے ملقب کرتے ہیں۔" خدائے سخن" کا سابقہ شاید بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی سے پہلے کا نہیں۔ انتقال کے ایک صدی بعد اس عطائے لقب کے کیا معنی؟

غالب کو فوت ہوئے آج (۱۹۹۶ء) ۱۲۷ سال ہوتے ہیں مگر آج بھی وہ میر کے مقابلے میں کہیں زیادہ مقبول ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ غالب فکر یعنی ذہن کے شاعر ہیں اور میر باطن یعنی دل کے اور کہ آج زمانہ داخلی شاعری کے بجائے فکری شاعری کا ہے اس لئے میر کے مرتبے پر غالب فائز ہو گئے۔ مگر یہ سچ نہیں ہے کیونکہ ایسا ہوتا تو میر کے زمانے کو داخلی شاعری کا زمانہ کہہ جاتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میر کے ہم عصر اور کچھ بعد والے مشاہیر میں سوائے درد (۱۷۲۱ء تا ۱۷۸۵ء) کے کسی میں داخلی یعنی دل کی شاعری کا رجحان نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ غالب کے کلام پر بھی میر کے کلام کی کم سے کم پرچھائیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ آج کا ذہن اس وقت تک کوئی بات قبول نہیں کرتا جب تک کہ وہ ہر طرح اطمینان نہ کرلے۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ دل کو چھو لینے والی بات سے براہ راست متاثر نہیں ہوتا۔ اس لئے آج کے عہد کو فقط باغی دماغ کا عہد نہیں کہا جائے گا بلکہ باغی دل و دماغ کا عہد کہا جانا زیادہ مناسب ہوگا۔

میر اور غالب دونوں غزل کے شاعر تھے۔ دونوں نے مشکل زبان میں بھی اشعار کہے اور آسان زبان میں بھی، مگر میر کے بیشتر آسان زبان کے اشعار ہی مقبول ہیں اور غالب کے مشکل اور آسان دونوں کے۔ شاید غالب کے اشعار میں میر سے زیادہ آفاقیت ہے۔ کم از کم آج کے عہد پر یہی بات صادق آتی ہے۔

راہی فدائی

۶/۱۸۴ برہان الدین اسٹریٹ، کڈپہ ۵۱۶-۰۰۱

مرقع ہائے جاوید

اردو ادب میں سوانح نگاری کی ذیلی صنف خاکہ نگاری کی محمد حسین آزاد سے لے کر پروفیسر ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید صاحب تک ہر عہد میں ایک اعتبار حاصل رہا ہے۔ ہر دور کے ادیبوں نے اس صنفِ نازک کو اپنی قلمی تزئین کاری اور بوقلمونی اسلوب سے نہ صرف آراستہ و پیراستہ کیا بلکہ اس کی نزاکت و لطافت کا کماحقہ لحاظ بھی رکھا۔ یوں تو خاکہ نگاری کی باقاعدہ ابتدا فرحت اللہ بیگ کے خاکے "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی" سے ہوتی ہے۔ مگر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے "گنج ہائے گرانمایہ" اور "ہم نفسان رفتہ" کے ذریعہ اور بابائے اردو مولوی عبدالحق نے "چند ہم عصر" سے اس صنف سخن کی آسمانی بلندیاں عطا کر دیں۔ علاوہ ازیں چراغ حسن حسرت کی کتاب "مردم دیدہ" عبدالمجید سالک کا مجموعہ "یارانِ کہن" شوکت تھانوی کا مرقع "شیش محل" اپنے اپنے گلنار و زعفران زار رنگ و آہنگ کی وجہ سے خاکہ نگاری کی دنیا میں بذلہ سنجی کے روایت کے موجد و مؤسس کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بعد کو اسی راہ پر گامزن یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر، فکر تونسوی، احمد جمال پاشا وغیرہم نے خاکہ نگاری کو طنز و مزاح کی رفعت نما منزلوں سے آشنا کیا ہے۔ شاہد احمد صدیقی (گنجینۂ گوہر) اور (خوش نفساں) محمد طفیل (آپ، صاحب وغیرہ) ممتاز مفتی (پیاز کے چھلکے) نے شخصیت نگاری میں حقیقت پسندانہ نقوش ابھار کر انسانی کردار کا انوکھا البم ادبی دنیا کے آگے پیش کیا ہے۔

ان مجموعوں سے ہٹ کر یکے دکے مگر ناقابل فراموش شخصی خاکے تخلیق کرنے والوں میں عصمت چغتائی (دوزخی) قرۃ العین حیدر (سجاد حیدر یلدرم) ڈاکٹر جاوید اقبال (علامہ اقبال) ڈاکٹر وزیر آغا (مولانا صلاح الدین احمد) بلراج کومل (کرشن ادیب) کے اسمائے گرامی سر فہرست ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خاکہ نگاری کے حدود اربعہ کو لامحدود وسعتیں اور اس کی جہات بستہ کو بیکرانی آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد ہی نصیب ہوئی۔ جن خاکہ

نگاروں نے اس صنف سخن کو فلک نشینی اور کہکشانی بخشی اور چمن زار کی بہیت و نزہت کے لئے سعی مشکور کی ہے۔ ان میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کا اسم گرامی منفرد و ممتاز مقام کا حامل ہے۔ آپ برصغیر ہند و پاک کے مایہ ناز نقاد، بلند پایہ شاعر اور ادبیات اردو کے قابل احترام معلم ہی نہیں بلکہ صاحب طرز انشا پرداز بھی ہیں۔ آپ کے تحریر کردہ خاکوں کا مجموعہ "چہرہ چہرہ داستان" مطبوعہ (۱۹۷۷ء) کا شگفتہ و شائستہ اسلوب اس امر واقعی کا شاہد عدل ہے۔ جاوید صاحب نے خاکہ نگاری کی دنیا میں غالباً ۱۹۶۷ء میں قدم رکھا جبکہ آپ کا اسپ قلم دیگر علمی و ادبی موضوعات پر اپنی بہترین کارکردگی سے اپنے معاصرین بلکہ اپنے اکابرین کو بھی متاثر کئے ہوئے نہ تھا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے اچھے خاکہ نگار کے لئے مردم شناسی واقعہ فہمی اور نفسیات آگہی اوصاف ضروریہ میں شمار ہوتے ہیں۔ تو یہ ادعا بے محل نہ ہوگا کہ جاوید صاحب میں مذکورہ صفات کمالیہ بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ چنانچہ آپ کے مجموعہ میں شامل خاکوں کی قرأت سے اس کی تصدیق بے کم و کاست ہو جاتی ہے۔

جاوید صاحب کے کرشمات قلم سے جن بزرگان علم و ادب کے مرقعے زیب قرطاس ہوئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے آپ کی علمی خد و خال کو مزین کرنے اور آپ کی ادبی شخصیت کو قد آور بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آپ خود اس بات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔ "یہ ان شخصیات کے مرقعے ہیں جنہوں نے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر متاثر کیا ہے۔" جس طرح مختار مسعود نے "علیگڈھ" کی تہذیبی

شخصیت کا خاکہ قلمبند کیا تھا اسی طرح آپ نے اپنا مادر علمی "جامعہ عثمانیہ" کی شخصیت پر بڑا پر اثر خاکہ لکھا ہے۔ جس سے جامعہ کے عروج و زوال کے پس پردہ کارفرما عناصر کی نشاندہی بآسانی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آپ رقمطراز ہیں "معمولی اخلاقی نقطہ نظر سے بھی یہ بات روا نہیں رکھی جا سکتی کہ ایک ایسی جامعہ میں جو اردو بنیاد ہے، اردو ہی کو حرف غلط کی طرح مٹایا جا رہا ہے۔ سیاسی مصالح موقتی ہوتے ہیں، آنی و فانی! اخلاقی قدریں دیرپا، اٹل اور آفاقی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کل کے سیاستدان، آج اور آج کے سیاستداں، کل مجرم قرار دیئے گئے ہیں۔ لیکن اخلاقی قدریں خواہ کل کی ہوں یا آج کی ہر دور میں محترم رہی ہیں۔ ہر معاشرہ میں اور ہر وقت کو سینے سے لگایا گیا ہے۔ سر آنکھوں پر رکھا گیا۔ اگر ہم تاریخ کے ان صفحات کو نظر انداز کر دیں تو مستقبل ہم سے کیا سلوک کرے گا۔ کس طرح پیش آئے گا۔ اس کا قیاس کیا جا سکتا ہے" (صفحہ ۱۵)

جامعہ عثمانیہ سے اردو ذریعہ تعلیم کو ختم کرنے پر اپنے دلی احساسات کا اظہار آپ نے بایں تمثیل کیا ہے۔ "اردو کو جامعہ عثمانیہ میں اس منزل سے گزرنا ہوگا جس منزل سے سقراط کو زہر کا پیالہ پیتے ہوئے اور یسوع مسیح کو صلیب سے دوچار ہوتے ہوئے گزرنا پڑا تھا۔" (صفحہ ۱۳)

پروفیسر سید محی الدین قادری زور صاحب اور پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب آپ کے مشفق محبوب اساتذہ میں ہیں۔ جاوید صاحب نے ان دونوں حضرات کے مختلف الجہات شخصیتوں میں پوشیدہ

زرا امتیاز و جوہر کمال کی نقاب کشائی بڑے ہی ادب
احترام سے کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ مغل سلطنت
نے ہندوستان کو تین چیزیں دی ہیں۔ تاج محل
اردو اور غالب! میرا خیال ہے کہ آصف جاہی
سلطنت نے حیدر آباد کو دو چیزیں دی ہیں۔
جامعہ عثمانیہ اور ڈاکٹر زور ..... "زور
صاحب بڑی بانکی شخصیت کے حامل تھے۔
ان کا انداز گفتگو، ان کا چلنے کا انداز، پان
کھانے کا قرینہ، ان کے لباس کی سج، وہ دکنی
تہذیب کا زندہ مرقع تھے۔ ان صوری خوبیوں
کے علاوہ زور صاحب کو دکن سے بس ایک
لگاؤ تھا۔ جذباتی لگاؤ۔ میں سمجھتا ہوں کہ
دکنی زبان و ادب کے تعلق سے ان کی تحقیقات
اور تنقیدات میں یہی جذباتی وابستگی کارفرما
تھی" (صفحہ ۲۰)

سروری صاحب کی اردو سے محبت
ہر سطح سے اونچی تھی اور ہر قدر سے اعلیٰ
انہیں اس راہ میں مصیبتوں اور دشواریوں
کا سامنا بھی کرنا پڑی۔ رسوائیاں اور بدنامیاں
بھی ہاتھ آئیں۔ ان کے بعض اپنے غیر بھی ہوتے
غیروں کا پوچھنا ہی کیا ہے، لیکن سروری صاحب
نے اس کا اظہار ہی نہ کیا۔ انہوں نے اف تک
نہ کی۔ ان کی جبیں پر شکن تک نہ آئی۔ یہاں
ان کے معرکہ ہائے خیر و شر کی تفصیلات کی
ضرورت نہیں۔ لیکن سروری صاحب نے جس
عالی ظرفی اور بلند حوصلگی سے یہ سب کچھ سہا۔ اس کو
کون فراموش کر سکتا ہے۔ ایسے معرکے سروری صاحب
کے کردار کو بلندی اور سرفرازی عطا کرتے ہیں۔ سروری
صاحب نے یہ سب اردو کے لئے سہا اردو کے لئے کیا"
(صفحہ ۳۶)

علامہ ابوالوفا افغانی بیسویں صدی کے جید
علماء میں سرفہرست ہیں۔ آپ کی بیسیوں کتابیں
ایک جہان علم و فضل کو متاثر کر چکی ہیں۔ آپ
کی فقاہت نہ صرف برصغیر بلکہ عالم عرب سے بھی
اپنا لوہا منوا چکی ہے۔ جاوید صاحب بڑے
ہی خوش طالع اور سعد بخت ہیں کہ آپ کو علامہ
کی نہ صرف صحبتیں نصیب ہوئیں بلکہ آپ نے
علامہ کی محبتوں اور عنایتوں سے بھی اپنا دامن
مراد بھر لیا۔ "مولانا" عنوان کے تحت رقم شدہ
خاکے میں علامہ کی صحبتوں کا ذکر آپ نے
پرلطف مگر باادب و باوقار طریقے سے اس
طرح کیا ہے:

"ہم کو مولانا کی اور اپنی علمی سطحوں کا
پورا پورا احساس تھا بلکہ ہم کو تو اپنے لئے
لفظ "سطح" کا استعمال ہی نہیں کرنا چاہئے
ہماری سطح ہی کیا تھی۔ گفتگو میں ہم مولانا کی
سطح تک کیا پہنچتے۔ مولانا نے ہی کرم کیا کہ ہم کو
ہماری عقل و فہم کے مطابق سمجھانے لگے۔ یہ
مولانا کا بڑا کمال تھا کہ وہ کیسا ہی اہم موضوع
اور کتنا ہی الجھا ہوا اور پیچیدہ مسئلہ ہو اس
کو نہایت عمدگی۔ سلاست اور بے حد عام

فہم انداز میں ایک عامی کے بھی ذہن نشین کرا
دیتے۔ ہمارے دوست قیصر صاحب کے ذہن
میں عموماً کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا وہ اس کو
چھیڑ دیتے۔ معلوم ہوتا مولانا ہماری تفہیم کے
لئے تیار ہی بیٹھے تھے۔ وہ مسئلہ کے تشریح
اور وضاحت شروع کر دیتے۔ نہ کوئی کڑی
اصطلاح نہ بھاری بھرکم الفاظ اور نہ انداز
بیان ادق اور گنجلک۔ پہاڑی چشمے کی
سی روانی کے ساتھ مولانا گویا ہوتے۔
مولانا کا طرز ادا۔ ان کے لہجے کی کھنک،
ان کے صوت و صدا کی گونج ان کی بلند
آہنگی، ایک سحر کی سی کیفیت پیدا کر دیتی"
(صفحہ ۴۲)

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور پروفیسر
رشید احمد صدیقی صاحب کے بلند و بالا اور طبع نازک
شخصیت سے کون ادب کا شیدا واقف نہیں ہے
ان حضرات کی وضعداری رکھ رکھاؤ اور علمی و ادبی
مصروفیات کے اوقات مقررہ سے کون انکار کرنے
کی جرأت کر سکتا ہے۔ ایسی عظیم و جسیم شخصیتوں کو
اپنا گرویدہ بنانا جاوید صاحب ہی کے اخلاق و کردار
اور آپ کے قلم و قرطاس کا کرشمہ ہے: ملاحظہ فرمایئے۔
لکھتے ہیں کہ

"چند لمحے گزارنے نہ پائے کہ ذاکر صاحب
تشریف لائے ان کے قدموں کی چاپ، ان
کی چال، میں آج تک فراموش نہ کر سکا ہوں
جیسے عزم و یقین اور محکم ارادے کی صلابت
کسی پیکر میں ڈھل گئی ہو۔ جیسے تدبر، سنجیدگی
اور متانت نے کسی انسان کا روپ دھار لیا ہو
جیسے فلسفہ و فکر مجسم ہو چکے ہوں۔ جیسے شائستگی
اور شرافت خراماں ہو۔ جیسے کلاسیکی قدریں
گوشت اور پوست کی صورت میں چلی آ رہی ہوں
ابھی میں تسلیم کر ہی پایا تھا کہ ذاکر صاحب نے مصافحہ
کے لئے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے دریافت
کیا۔" کہئے اچھے ہیں آپ؟ آپ کا مقالہ ختم ہو
ہوا۔ ذاکر صاحب کے ان الفاظ نے مجھ میں عجیب
امنگ اور حوصلہ پیدا کر دیا۔ مجھے مسرت ہوئی کہ
ذاکر صاحب نے مجھ کو فراموش نہیں کیا ہے
میں نے انہیں رشید صاحب کی سوانح کا باب پیش
کیا۔ چند لمحوں کے لئے انہوں نے ادھر ادھر
سے اس کو دیکھا۔ اظہار پسندیدگی کیا اور
پھر میرے بارے میں دریافت کرنے لگے۔
مجھے محسوس ہوا جیسے میں اپنے کسی عزیز سے مدت
بعد مل رہا ہوں اور وہ میرے حالات دریافت
کر رہا ہے۔ (صفحہ ۵۸، صفحہ ۵۹)

" جاوید صاحب نے اپنے استاذ ڈاکٹر مسعود حسن
خاں صاحب کے رہنمائی میں رشید صاحب کی
حیات و خدمات پر پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا تھا۔
جس کی وجہ سے رشید صاحب کو قریب سے دیکھنے،
سمجھنے اور پرکھنے کا زریں موقع ہاتھ آیا تھا۔ لہٰذا آپ
نے ان کو تہہ داری اور بلند کرداری کا جائزہ ناقدانہ
بصیرت کے ساتھ بڑے ہی سلجھے ہوئے لب و لہجہ میں کیا
ہے، فرماتے ہیں:

رشید صاحب مجموعی طور پر اوسط خدوخال کے انسان تھے۔ ایسے کہ پہلی ملاقات میں اوروں کو متاثر نہ کر سکیں۔ میں بھی کچھ ایسا متاثر نہ ہوا۔ دراصل وہ ان فنکاروں میں سے تھے جو اپنے ظاہر سے نہیں اپنے باطن سے، اپنے فن سے، اپنی تحریر سے اوروں کو متاثر کرتے اور ان کا یہ تاثر دیرپا، گہرا اور ہمہ گیر ہوتا۔ اس حد تک کہ اردو ادب ان اثرات سے کبھی مکمل خلاصی حاصل نہیں کر سکتا، نہیں کر سکے گا۔ (صفحہ ۷۰)

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ علوم شرقیہ و غربیہ کے مجمع البحرین تھے۔ آپ کے دینی علمی، ادبی اور صحافتی قدوقامت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے۔ جس نے آپ سے بالمشافہہ ملاقات کی یا آپ کی تصنیفات سے استفادہ کیا ہو۔ راقم الحروف بھی ان معنوں میں خود کو خوش نصیب تصور کرتا ہے کہ اس کو مولانا سے شرف نیاز حاصل رہا۔ ہوا یوں کہ مولانا اے۔ جے اردو سیمینار کی دعوت پر خطباتِ سیرتؐ کے لئے مدراس تشریف لائے تھے۔ ہفتہ عشرہ تک مدراس میں قیام پذیر رہے۔ احقر اپنے شفیق استاذ محترم مولانا سید شاہ صبغت اللہ بختیاریؒ کے ہمراہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی صحبتوں سے مستفیض ہونے کے لئے مدراس حاضر ہوا۔ الحمدللہ دامن مراد بھر لیا۔ جاوید صاحب مولانا کی عظمت علمی، بلند کرداری کا نقشہ اپنے دل آویز و حقیقت پسندانہ اسلوب میں یوں پیش کرتے ہیں۔

ماجد صاحب اردو دنیا میں چراغ راہ بھی کر رہے ہیں۔ اب تو چراغ منزل ہیں۔ مینارۂ نور! انہوں نے اپنے طور پر ادب کی اہم انسانی خدمات انجام دیں۔ لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے نہ جانے کتنوں کو روشنی دکھائی، کتنوں کی رہبری کی، کتنوں کے ذوق کو صیقل کیا۔ کتنوں کے ادبی صلاحیتوں کو ابھارا۔ ماجد صاحب کی ذات استعداد آفریں تھی۔ وہ ایک شجر سایہ دار تھے نہ جانے آج اردو کے صف اول کے کتنے ممتاز ادیب، نقاد اور انشاء پرداز ہیں جن کا قلم ماجد صاحب کی حوصلہ افزائی کا مرہون منت ہے۔ اور ماجد صاحب کے غم میں خونچکاں اور سوگوار بھی۔ (صفحہ ۸۲/۸۳)

پروفیسر مبارز الدین رفعت صاحب

ڈاکٹر جاوید صاحب کے استاذ درسیات نہ سہی، محسنِ روحانی ضرور تھے۔ جاوید صاحب نے جس طرح آپ کے کمالات کا اعتراف کیا ہے اس سے ممدوح کی عظمت و تقدس کے ساتھ ساتھ قلمکار مادح کی وسعت مطالعہ اور نکتہ سنجی و نکتہ رسی کا ادراک بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ رقمطراز ہیں۔

" رفعت صاحب نے ترجمہ نگاری میں ایسی مشعلیں روشن کی ہیں کہ وہ ہمیشہ جگمگاتی، جاگتی اور آنے والی نسلوں، کوئی منزلوں کا پتہ دیتی رہیں گی۔ رفعت صاحب نے ترجمہ نگاری کی تقدیر ہی بدل دی۔ اپنے دلنواز اسلوب، موضوع سے وابستگی اور متعلقہ زبانوں کے اسرار و رموز سے آگہی کے باعث انہوں نے ترجمہ کو تصنیف کا

درجہ دیدیا ہے۔ تاریخ ادبیات ایران رضازادہ کی
تصنیف ہوتے ہوئے بھی مبارز الدین رفعت کی تصنیف
ہے۔ انہوں نے اپنی بے پناہ فنکارانہ صلاحیتوں کے
باعث اس ترجمہ کو اردو ادب میں اتنا بلند معیار بنا
دیا ہے کہ گویا یہ ان کی اپنی کتاب ہو۔ رفعت صاحب
نے اور ترجمے بھی کئے ہیں: "عرب اور اسلام" ایک
مشرقی کتب خانہ اور "اسلامی فن تعمیر" وغیرہ۔ ہر ہر
ایک میں مترجم موضوع کی روح سے آشنا فن ترجمہ
نگاری کو نئی گہرائیوں اور دلنواز پہنائیوں سے ہمکنار
کرتا گزر رہا ہے۔ (صفحہ ۱۰۳)

جاوید صاحب نے مذکورۃ الصدر خاکوں کے
علاوہ بھی بہت سارے شخصی خاکے قلمبند کئے ہیں۔ جس
خصوصیت نے ان خاکوں کو اردو ادب میں مقام بلند
عطا کیا ہے اور جس صفت، خامی نے مرقعوں کو
جاودانی بخشی ہے، وہ ہے آپ کی تحریر کا جادو۔
مثبت و منفی پہلوؤں کا توازن، حقیقت پسندانہ
اسلوب اور زبان و بیان کا دیانت دارانہ لطیف و
شریف طرز تحریر۔

آپ کا یہ کہنا بجا اور قابل قبول ہے کہ "میں
یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے ان شخصیات کی صحیح طور
پر ترجمانی کی ہے۔ البتہ میرے احساسات میرے
اپنے احساسات ہیں۔ میری دلی کیفیات کے ترجمان
ہیں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری کوشش یہی رہی ہے
کہ ان شخصیات کو اس طرح پیش کروں جیسا کہ میں نے
محسوس کیا ہے۔"

● بقیہ :- خیالات

دنیا کے وسیع حلقے تک نہیں پہنچی۔ انہوں نے اپنے
"انشائیوں" کے مجموعے "نشاط خاطر" کے دیباچے "سخن
گسترانہ بات" میں لکھا ہے۔

" اردو کے اس نوزائیدہ نثری اسلوب کو تقسیم ملک
کا نتیجہ سمجھنا یا سرگودھا کو انشائیہ کی جائے پیدائش قرار دینا
تاریخی حقائق سے لاعلمی یا دانستہ چشم پوشی ہے۔ دانش گاہ
پٹنہ کے شعبۂ اردو میں نہ صرف انشائیہ کی داغ بیل ڈالی
گئی، بلکہ تدریسی سطح پر بھی انشائیہ نگاری کی تفہیم اور
ترویج میں سبقت کی گئی۔ یہ ۱۹۴۱ء کا ابتدائی زمانہ
تھا۔

تاریخ اردو ادب میں وہ پہلی کتاب جو "انشائیہ"
سے موسوم ہے "ترنگ" ہے۔"

بہرحال، یہ مسئلہ اس وقت زیر بحث نہیں ہے
یوں بھی ادب کے مباحث آسانی سے طے نہیں ہوتے۔
یہاں تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ پرسنل یا لائٹ ایسے
(LIGHT ESSAY) کے لئے "انشائیہ" کے لفظ پر اب
اتفاق رائے ہے، اور یہ لفظ ان معنوں میں اردو ادب
کو اختر اورینوی کی دین ہے۔ اس کی تصدیق ڈاکٹر
وزیر آغا کے بیان سے بھی ہو جاتی ہے۔

● پرنٹر پبلشر ابن منظر نے سہیل آرٹ پریس
شاہ گنج پٹنہ ۶ سے چھپوا کر دفتر سہیل
ریلوے سائیڈ روڈ، گیا سے شائع کیا۔

مظہر امام
میور وہار، دہلی ۱۱۰۰۹۱

قسط ۲

خیالات

انشائیہ: کب اور کیسے؟

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے انشائیوں کے چوتھے
مجموعے "سمندر اگر میرے اندر گرے" جو ۱۹۸۹ء میں شائع
ہوا ہے، کے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے۔
"میں نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک کے عرصے میں
"ادب لطیف" میں متعدد پرسنل ایسے تحریر
کئے تھے جنہیں لائٹ ایسے، انشائے لطیف،
لطیف پارہ، مضمون لطیف وغیرہ ناموں کے
تحت شائع کیا گیا تھا، مگر چونکہ ایسے
(ESSAY) کے لفظ نے خود مغرب میں بہت
سی غلط فہمیوں کو جنم دیا تھا جنہیں ہمارے
انگریزی پڑھانے والوں نے وراثت میں حاصل
کیا تھا۔ لہذا میں چاہتا تھا کہ پرسنل یا لائٹ
ایسے کے لئے کوئی نیا اور منفرد اردو نام تجویز
کیا جائے۔ انہی دنوں [illegible] ترجمہ [illegible] کسی
رسالے میں انشائیہ کا لفظ پڑھا اور مجھے یہ اتنا
اچھا لگا کہ میں نے میرزا ادیب صاحب سے جو
ان دنوں "ادب لطیف" کے مدیر تھے، اس نام
کو پرسنل ایسے کے لئے مختص کرنے کی تجویز پیش کر دی
جسے انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ بعد ازاں مجھے
معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے ڈاکٹر سید حسنین
"انشائیہ" کا لفظ لائٹ ایسے کے معنوں میں
استعمال کر چکے تھے۔ مگر جن لائٹ ایسیوں کے
لئے انہوں نے یہ لفظ استعمال کیا تھا، وہ سرے
سے لائٹ ایسے تھے ہی نہیں۔

پچھلے دنوں اس سلسلے میں مزید دو
انکشافات ہوئے۔ ایک تو یہ کہ تقسیم سے پہلے
علی اکبر قاصد کے مضامین کے مجموعہ "ترنگ" کے
دیباچے میں اختر اورینوی نے انشائیہ کا لفظ استعمال
کیا تھا اور اس سے مراد پرسنل یا لائٹ ایسے
لی تھی، لیکن خود علی اکبر قاصد کے مضامین کا انتخاب

سے دور کا واسطہ نہیں تھا۔۔۔۔"

دوسرا "انکشاف" غیر متعلق ہے، اس لئے اس کے اقتباس میں احتراز کر رہا ہوں، بہر حال، میں نے یہ نسبتاً طویل اقتباس قصداً پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس وقت برصغیر کی سطح پر صنف انشائیہ کے سب سے بڑے مبلغ اور نظریہ ساز ہیں اور کہا جاتا ہے کہ صنف انشائیہ کو اپنے صحیح مفہوم میں پہلے پہل انہوں نے ہی برتا ہے۔ وزیر آغا کے مندرجہ بالا بیان میں تین باتیں اہم ہیں۔

(۱) انہوں نے انشائیہ کا لفظ سب سے پہلے بھارت کے ایک رسالے میں دیکھا اور اسے رسالہ "ادب لطیف" کے ذریعہ مقبول بنانے کی کوشش کی۔

(۲) ان سے پہلے انشائیہ کا لفظ ڈاکٹر سید حسنین استعمال کر چکے تھے۔

(۳) تقسیم سے پہلے پرسنل یا لائٹ ایسے (LI-GHT ESSAY) کے لئے یہ لفظ اختر اورینوی نے استعمال کیا تھا۔

اس ضمن میں اپنی کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) وزیر آغا نے بھارت کے جس رسالے میں لفظ "انشائیہ" دیکھا، ممکن ہے اس میں ڈاکٹر سید محمد حسنین کا ہی مضمون چھپا ہو۔

(۲) ڈاکٹر سید محمد حسنین نے صنف انشائیہ پر پہلا تعارفی مضمون گیا (بہار) کے ماہنامہ "اشارہ" کے اکتوبر سنہ ۵۴ء کے شمارے میں شائع کرایا۔ یہی مضمون نسبتاً بہتر صورت میں ستمبر ۵۵ء کے "نگار" لکھنؤ میں چھپا۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین کی مرتب کردہ کتاب "صنف انشائیہ اور انشائیے" پہلی بار ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ اب تک اس کے پانچ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس میں صنف انشائیہ پر ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔

(۳) علی اکبر قاصد کے انشائیوں کا مجموعہ "ترنگ" ۱۹۴۴ء میں پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کے دیباچے میں اختر اورینوی نے پہلی بار پرسنل یا لائٹ ایسے (PERSONAL OR LIGHT ESSAY) کے لئے لفظ "انشائیہ" استعمال کیا۔ شاید یہ بتانے کی ضرورت نہ ہوگی کہ اختر اورینوی انگریزی سے اردو کی طرف آئے تھے، ان کا انگریزی ادبیات کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پرسنل یا لائٹ ایسے کے مغربی تصور سے کماحقہ آگاہ تھے۔

وزیر آغا نے اپنے کئی مضامین میں یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ مضامین جنہیں عام طور پر "انشائیہ" کا نام دیا جاتا ہے، وہ دراصل انشائیے نہیں ہیں۔ انہیں مضمون، طنزیہ مضمون، مزاحیہ مضمون کچھ بھی کہا جا سکتا ہے، مگر وہ انشائیہ کے ضروری اوصاف سے متصف نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سرسید، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم کے مضامین یا ابوالکلام آزاد کے "غبار خاطر" میں کہیں کہیں انشائیے کے تیور ضرور ملتے ہیں۔ لیکن وہ باقاعدہ انشائیے نہیں ہیں۔ وہ نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد کے "انشائیوں" کو بھی "انشائیے" نہیں مانتے۔ اس سلسلے میں مختلف طرح کے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ایک رائے ڈاکٹر سید محمد حسنین کی بھی ہے۔ جو شاید ادبی

ششدر غازیپوری

— تیسری قسط —

ربابِ آب
(سیلولر جیل)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے اٹوٹ رشتہ
نے والا یہ قید خانہ بحرۂ ہند کی گود میں سرزمین انڈمان و
بار کی راجدھانی پورٹ بلیر کے ساحل سمندر پر کھڑا
سیاہ کو شمع آزادی کے پروانوں پر ٹوٹے ہوئے ظلم و ستم
استانیں سناتا ہے۔ یہ عالمگیر شہرت یافتہ (بدنام)
خانہ جس کی تشکیل سات ونگس (seven wings)
شتمل تھی ۱۹۰۶ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچا تھا۔ ہر ایک
ے میں بے شمار سیلز تعمیر کئے گئے تھے۔ سیل کا مطلب
ل کال کوٹھری سے ہے۔ ایک سیل میں صرف ایک قیدی
اجاتا تھا یعنی ہر قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی جاتی
.. انہیں سیلز کی وجہ سے اس قید خانے کا نام سیلولر
ا پڑا۔

دور غلامی کی یہ بدنام عمارت جس کی اینٹ
ے پر خونچکاں تواریخ تحریر ہے۔ آج آزاد ہندوستان
شنل میموریل بن گئی ہے۔ اس طرح جنگ آزادی
سپاہیوں کی حب الوطنی کے جذبات کا بھرپور احترام
ہے۔ آج اس عمارت کی پیشانی سے کلنک کا ٹیکہ
کی آبلہ پائی کا حاصل منزل قومی اتحاد، یہ عمارت
یہاں کے معاشرے کو سماجی اور تہذیبی ایکتا کی ایک نئی
قوت عطا کر رہی ہے۔ یہاں حیات زنداں کی کھڑکیوں
کے سلاخوں سے آنکھیں لگا کر بہار کا نظارہ نہیں
کرتی بلکہ بہار سے ہم آغوش محو رقص ہے۔ باہمی ہم آہنگی
اور باہمی محبت مغنیہ بنی ہوئی ہیں۔ ظلم و ستم کا تانڈو دم
توڑ چکا ہے۔ تازیانوں کی سنسناہٹ زمانہ گذرا یہاں
سے رخصت ہو چکی ہے۔ یہاں کی سحر اب شب گزیدہ نہیں
رہی۔ یہاں کی باد صبا کلیوں کے پھول بننے کا مژدہ
گلشن گلشن، آنگن آنگن بے خوف و خطر سناتی پھرتی ہے۔

اس سیلولر جیل نے ظلم و ستم، بربریت اور انسانیت
سوز کاروبار کے دو ادوار دیکھے ہیں، پہلا دور فرنگی دور
حکومت کا اور دوسرا دور جاپانی دور حکومت کا۔ دور
اولیں یوں تو پورے برصغیر کے لئے حسرتناک، وحشتناک
اور اذیت ناک دور رہا ہے۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ
سرزمین انڈمان و نکوبار کے اس دور کی زحمت ایک
مخصوص نقطۂ نگاہ سے رحمت کا دور بھی ثابت ہوا ہے

ہستیوں کے مبارک اور معتبر قدم پڑے۔ جن کے طفیل
کئی تہذیبی اور اخلاقی اقدار معرض وجود میں آئے۔ اسی
دور میں لسانی ارتقا کا آغاز اور زبان دانی کو فروغ
حاصل ہوا۔ علاقائی بولیوں، علاقائی بھاشاؤں کی
دھنک یہاں کی فضاؤں میں اپنے جوہر دکھانے لگی۔
ان گنت روایات ارتقاء کی منزلیں طے کرنے لگیں۔ اردو،
ہندی، انگریزی، ملیالم، پنجابی، بنگالی زبانوں کی بازگشت
یہاں کی ہواؤں میں شیریں خمار بھرنے لگی۔ اس دور اور
اس کے حالات کے ہم مشکور و ممنون ہیں جن کے باعث ہمیں
ایک خوبصورت اور دلپذیر و دلنشیں ماحول نصیب
ہوا جو آج کے تہذیبی ارتقاء کے لئے معاون ثابت ہوا۔

اس دور میں برصغیر کے مختلف علاقوں سے
سیاسی قیدیوں کو یہاں لایا گیا۔ اس طرح انڈمانی
سرزمین پر مختلف مذاہب، مختلف عقائد، اور مختلف
ادب کی آمد خوشگوار ثابت ہوئی۔ ان سیاسی قیدیوں
میں ہر فرقے کے علماء، مدبر، موپلا تحریک کے علمبردار دانشور
بھی شامل تھے۔ جنہوں نے یہاں کے معاشرے کو سبھی
ستھری زبانوں اور صاف ستھرے ادب سے روشناس
کروایا۔ اردو زبان و ادب کے لئے تو یہ سنہرا دور یہاں
کے لئے ثابت ہوا۔ اس زبان کے بلند پایہ شعراء اور
ادباء بہ حیثیت زندانی یہاں تشریف فرما ہوئے جن
کی وجہ سے اردو یہاں کی عوامی زبان بن گئی۔ بھجن
کے روپ میں مندروں کی زینت بنی۔ بصورت اذان
مسجدوں کے میناروں سے پھوٹی۔ نانک کی لے بن
کر گردواروں کی زینت بنی اور مناجات کے روپ میں
گرجاؤں میں گونجی۔

علامہ فضل حق خیر آبادی، منیر شکوہ آبادی،
جعفر علی تھانیسری، مولانا لیاقت علی اکبر زماں اکبر آبادی،
احمد اللہ صادق پوری، یحییٰ علی جیسے مدبر علماء اور جید
شعراء ادباء و قابل ذکر ہیں۔ علامہ خیر آبادی کا زمانۂ
اسیری وہ زمانہ سمجھا جاتا ہے جب ذوقؔ دہلوی، اسد اللہ
خاں غالبؔ، مومن خاں مومنؔ حیات تھے۔ پورٹ بلیئر
سے نکلنے والا اول اردو جریدہ "جزیرہ" (جو اب دو
شمارے کے بعد بند ہو چکا ہے) میں شعیب شمسی نے
بعنوان "انڈمان میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء" کے
تحت غالب کے ایک خط کا اقتباس پیش کیا تھا جس
سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ فضل خیر آبادی غالب کے
حلقۂ احباب میں تھے۔ غالب نے وہ خط اپنے ایک
دوست جہاں داد خاں کو لکھا تھا۔ ملاحظہ کیجئے

"میاں خانصاحب آپ کلکتہ پہنچے تو مولوی فضل
الہی کا حال اچھی طرح دریافت کرکے مجھے لکھو کہ اس
نے رہائی کیوں نہیں پائی؟ وہاں جزیرے میں اس کا
کیا حال ہے؟ گذارا کس طرح ہوتا ہے؟"

مولانا فضل حق خیر آبادی کو فارسی اور اردو دونوں
زبانوں پر عبور حاصل تھی۔ سیلولر جیل میں انہوں نے جیل
سپرنٹنڈنٹ کی فارسی تصنیف "کتاب ہیئت" کا اردو
ترجمہ کیا "الشورۃ الہندیہ" کی تخلیق کی جو بعد میں تصنیف
طباعت کی تکمیل پہونچی جس میں انہوں نے ۱۸۵۷ء کی
جنگ آزادی کے المناک حادثات و واقعات کو قلم بند
کیا ہے۔

سیلولر جیل میں لکھی گئی دوسری کتاب "کالا پانی"
(اردو) جو ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی تھی، اس کے مصنف مولانا جع

جعفر علی تھانیسری ہیں۔ مولانا جعفر علی تھانیسری کبھی
مولانا فضل حق خیر آبادی کے ساتھ سزائے قید کاٹ
رہے تھے۔ اس کے علاوہ تھانیسری کی دوسری تصانیف
بھی اسی جیل میں معرضِ وجود آئیں: "علم الصیغہ" "تقویم
البلدان" قابل ذکر ہیں۔

دوسرا دور جاپانی دورِ حکومت تھا جس کا آغاز
۱۹۴۲ء میں ہوا۔ رنگون کا زوال ہو چکا تھا۔ رنگون
کی سرزمین پر جاپانی غالب آچکے تھے۔ دوسری جنگ
عظیم جاری و ساری تھی۔ اتحادی فوجیں پے در پے پسپا
ہو رہی تھیں۔ جاپانی افواج کا "رخ انڈمان نیکوبار
کے جزیروں کی طرف مڑ چکا تھا۔ ہواؤں سے بارودی
سر خارج ہونے لگی تھی۔ دہشت و ہراس کے آہنی
شکنجے دلوں کو مسلنے لگے تھے۔ جاپانی پن ڈوبیاں
ان جزیروں کے ارد گرد پھیلے سمندروں میں فعال
ہوا کرتی تھیں۔ دارورسن کی تشکیل کا تصور اذہان
میں ابھرنے لگا تھا۔ سرکاری ملازمین اور تجار راہ
فرار تلاش کرنے لگے تھے۔ فرنگی سرکار کی طرف سے
جزیروں کو چھوڑ کر مین لینڈ (Main Land) جانے
کا اعلان لوگوں میں ہو گیا تھا۔ دو بحری جہازوں کا
انتظام کیا گیا۔ بحری جہاز ایس۔ ایس مہاراجہ مسافروں
کی ایک بھاری کھیپ لے کر چاتھم جٹی سے ۲ جنوری
۱۹۴۲ء کو روانہ ہوا۔ جٹی پر چھوٹ گئے لوگ
ہراساں و پریشان اپنی بدقسمتی کا ماتم کرتے رہے
ان کو بھی ایک نیوی شپ "آلنگا" ۹ جنوری ۱۹۴۲ء
کو لے کر عازمِ سفر ہوا۔ پھر بھی کچھ لوگ جانے سے
محروم رہ گئے اور یاس و حسرت بھری نگاہوں سے
جانے والوں کو جن میں ان کے عزیز و اقارب تھے،
دیکھتے رہ گئے۔ خون کے آنسو بہاتے رہ گئے۔ اس
کے بعد کسی نہ کسی طرح گورکھا رجمنٹ کے نوجوانوں
اور انگریز افسران یہاں سے نکل جانے میں کامیاب
ہوئے۔ یہاں کے نظم و نسق کی ذمہ داری لوکل افسروں
کو سونپ دی گئی۔

یکم فروری ۱۹۴۲ء کو جاپانی بمبار طیارے
سرا نیزے پر آکر پہلا بم داغا۔ اس کا نشانہ ایرڈین
جٹی تھی۔ لیکن بم پانی میں جا گرا کوئی نقصان وجود میں
نہیں آیا۔ لیکن طیارے نے صورِ اسرافیل پھونک دیا
تھا۔ اور یہ آگاہی لوگوں کو دے دی کہ اس سرزمین
پر حشر سے پہلے حشر ٹوٹنے والا ہے۔ پورٹ بلیر کے علاقوں
کے باشندے اپنے نہایت مختصر خورد و نوش کے سامانوں
کے ساتھ جنگل خطوں کی بستیوں میں پناہ لینے پر
مجبور و بے بس ہوئے۔

۲۳ جنوری ۱۹۴۲ء کا دن ان جزیروں کی
تاریخ میں "کالا دن" سے موسوم ہو سکتا ہے۔ بڑا ہی
منحوس بدعا زدہ دن قرار پایا۔ اس دن آدھی رات کے
بعد جاپانی افواج بندوقوں کے دہانوں سے آگ کی بارش
کرتی ہوئی خشکی پر وارد ہوئیں۔ انہیں کسی مزاحمت کا سامنا
نہیں کرنا پڑا۔ ان کے بھاری بوٹوں کی بازگشت سے
انسانی آبادی تھرا اٹھی تھی۔ برٹش چیف کمشنر اور ان
کے معاون افسران منبری بنا لئے گئے۔ سیلولر جیل کے تمام
قیدیوں کو رہائی نصیب ہوئی۔ جاپانی سپاہی پورٹ
بلیر اور ملحقہ بستیوں کی گلی کوچوں میں گشت کرنے لگے
جیسے وہ آقا تھے اور سارے انڈمانی غلام۔ وہ کبھی

بھی گھروں میں داخل ہو کر اپنی پسند کی شئے حاصل کرنے لگے تھے۔

سیلولر جیل سے رہائی پائے کچھ قیدی نہایت ذلیل فطرت کے حامل تھے۔ جنہوں نے بعد میں یہاں کے باسیوں کے لئے اذیتوں اور زحمتوں کا حشر بپا کر دیا۔ ان کے ورغلانے پر جاپانی افسران نیز جاپانی سپاہی بے قصور لوگوں کو بھی اتحادیوں کے جاسوس قرار دیکر سیلولر جیل کی چھٹی ونگ کو بھر دیا۔ ایک بڑے پیمانے پر گرفتاریاں وجود میں آئیں۔ معصوم اور بے خطا لوگ اس نازیبا حرکت سے ہلاکت کے شکار ہونے لگے۔ جاپانیوں کی بربریت نے چنگیزی اور تیموری بربریت کو بھی مات دے ڈالی۔

بے بس قیدیوں سے نیزے کی نوک پر اقبال جرم کرایا جانے لگا۔ جس کسی نے اقبال جرم سے انحراف کیا اس کی زندگی جہنم سے بھی بدتر بنادی گئی۔ اقبال جرم کروانے میں جاپانی تمام انسانیت سوز ہتھکنڈے استعمال میں لاتے تھے۔ جاپانیوں کی بربریت اور جارحیت کا مظاہرہ اس قدر دلدوز، دلخراش اور اذیت ناک ہوتا تھا کہ جسے اگر آدم خور وحشی بھی دیکھتے تو اپنی آنکھوں سے تاب دید چھین لیتے تھے۔ قیدیوں کی تڑپ ان کی آہ و بکا باب سدرۃ المنتہیٰ کو جھنجھوڑ ڈالتی ہوگی شاید یہی وجہ تھی کہ ان ظالموں کے دو شہر اسی زمانے میں تباہی و بربادی کے عمیق غار میں دفن ہو گئے۔ خدا ظالموں کو کبھی نہیں بخشتا۔ جاپانی ظلم کا انجام ناگاساکی اور ہیروشیما کی ہلاکت کے روپ میں اجاگر ہوا۔ شاید جاپانی اس لاعلم تھے کہ ظلم کی کوئی اوقات نہیں ہوتی اور

خون ٹپکتا ہے تو جم جاتا ہے۔

جاپانیوں کا طرز ستم اپنی نوعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ ان کا زور و جبر جور و جفا اور ظلم و ستم کا تانڈو رقص یکساں طور پر جیل کے اندر باہر فضا تھا۔ ہر سو نفسا نفسی کا عالم طاری تھا۔ اس دھرتی پر زندگی کشکول گدائی تھامے زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ عروس تہذیب و تمدن ننگے سر اور ننگے پاؤں سڑکوں، گلیوں، کوچوں اور چوپالوں میں لڑکھڑا رہی کنواری عصمت و غیرت و عروس کاری کے جوالا مکھی کے دہانے پر کھڑی رحم و کرم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ بد دوشاسنوں کے ہاتھوں دروپدیوں کی ساریاں کھینچی جا رہی تھیں۔ راونوں کے ذریعہ سیتا کی بہنوں کا ہرن کیا جا رہا تھا۔ مریم کی بیٹیوں کی آبرو خطرے میں پڑی ہوئی تھی۔ جانے کتنے حسین تشنہ لب جام شہادت پی رہے تھے۔ یزیدیت قہقہے لگا رہی تھی۔ سناٹے چیخ رہے تھے ذرے ذرے سے کراہوں اور سسکیوں کی صدائیں پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر ریزے ریزے ہو رہی تھیں۔

خوف و دہشت کے سبب جس کسی نے ناکردہ جرم کا اعتراف کر لیا اس کا سر دھڑ سے جدا کر دیا جاتا تھا اور جس کسی نے بے بنیاد، غلط جھوٹے جاسوسی کے الزام سے انحراف کیا اس پر مظالم کی انتہا لازمی ہو جاتی۔ ان کے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے ناخنوں میں آگ میں تپے سرخ آہنی سوا دھنسایا جاتا تھا۔ ان کے جسم کے عضو عضو پر تیز دھار والے چاقوؤں سے زخم پیدا کر زخموں پر نمک پاشی کی جاتی تھی۔ انھیں زبردستی ننگے چبوترے پر ننگے دھڑ بٹھا دیا جاتا تھا۔ ان کے ہاتھوں

اور پانوؤں کو پھیلا کر آہنی کھمبوں میں باندھ دیا جاتا تھا۔ اور پھر جسم کے نرم و نازک حصوں کو جلتی موم بتی سے جلایا جاتا تھا۔ اس انسانیت سوز خونی بہیمانہ ٹارچر کے دوران بیداد گر، ظلم و ستم کے بندے جاپانی افسران قہقہے لگاتے تھے۔ ٹارچر کی مشق صبح سے شام تک جلتی رہتی تھی۔ اس ٹارچر کے بعد سخت جان قیدی کو پھر اس کے سیل میں بند کر دیا جاتا تھا۔ یہ شیطانی عمل اس وقت تک چلتا رہتا جب تک کہ قیدی جاں بحق نہ ہو جاتا تھا۔ اسی طرح عائد جرم سے انحراف کرنے والے اور اعتراف کرنے والے دونوں ہی موت کے نوالے بن جاتے تھے۔

آج بھی سیلولر جیل کی فصیل کے در و دیوار پر معصوموں، بے خطاؤں اور بے گناہوں کے پاک لہو سے دونوں غلام ادوار کی خونی داستانیں لکھی ہوئی پڑھی جا سکتی ہیں۔ انھیں داستانوں میں شامل ہے۔ ڈاکٹر دیوان سنگھ کی داستان، اردو اور پنجابی زبان کا رہ مایہ ناز شاعر ادیب بھی ظالم جاپانیوں کے ہاتھوں لقمۂ اجل بنا دیا گیا۔ سیلولر جیل کی آنکھوں کی پلکوں پر آج بھی خون کے آنسوؤں کے قطرے لرزاں ہو جاتے ہیں۔ جب یہ اسے وہ بات یاد آجاتی ہے ڈاکٹر دیوان سنگھ ایک قابل احترام معزز شخصیت کا نام تھا۔ دوران ٹارچر میں انہوں نے جاپانیوں کو للکارتے ہوئے کہا تھا۔ "لعینو! معصوم و بے خطا لوگوں کو بخش دو میں تمام تر الزامات اپنے سر لیتا ہوں۔ میری جان لے لو۔" لیکن شیطان سیرت جاپانیوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ٹارچر جاری رہا۔ لوگ لقمۂ اجل بنتے رہے۔ ڈاکٹر دیوان سنگھ بھی ان میں سے ایک تھے۔

(اس کے بعد کی دو قسطوں میں فرنگیوں اور جاپانیوں کے طرز ستم کی جھلکیاں افسانوی ہیئت و اسلوب میں پیش کی جائینگی) مسٹر

— حواشی —

۱۔ A REGIME OF FEHRS AND TEHRS.

مصنف جناب پی۔ جی۔ لال ریٹائرڈ ایجوکیشن آفیسر، ڈائریکٹریٹ آف ایجوکیشن، پورٹ بلیر

۲۔ ڈاکٹر دیوان سنگھ
مصنف جناب اقبال سنگھ
ریٹائرڈ ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو

۳۔ "جزیرہ" (سہ ماہی) جلد ایک۔ شمارہ ایک
دائرہ اردو ادب۔ پورٹ بلیر

دستخط

کمال کا نشہ

رؤف خیر
حیدرآباد

کچھ نفس کے غلام، نفس کے غلام ہیں
آقا نہیں جو ایک تو دس کے غلام ہیں
مینار کے اسیر، کلس کے غلام ہیں
ہم آج تک بھی حرص و ہوس کے غلام ہیں
آزادیوں کا ذکر ہے، شہرہ ہے نام ہے
آزادیِ کلی کا تصور ہی خام ہے

دست دعا کبھی لب فریاد بھی ہوئے؟
خانہ خراب کیا کبھی آباد بھی ہوئے؟
گنتی میں جو نہ آئے وہ تعداد بھی ہوئے؟
سچ کہنا۔ سچے معنوں میں آزاد بھی ہوئے؟
آزادی ایک دوجے کی آزادیوں سے ہے
آبادی ایک دوجے کی آبادیوں سے ہے

آزادی فساد تو حاصل ضرور ہے
اک شوق بے نہاد تو حاصل ضرور ہے
جرموں کی اپنے داد تو حاصل ضرور ہے
پرکھوں کی جائیداد تو حاصل ضرور ہے
بھرتا نہیں ہے جی ابھی مال و منال سے
اب کیا نکل سکیں گے تعصب کے جال سے

باپوؤں کے اور ماؤں کے قاتل ہمیں میں ہیں
پوشیدہ دھوپ چھاؤں کے قاتل ہمیں میں ہیں
سرسبز رہنماؤں کے قاتل ہمیں میں ہیں
زندہ — مہاتماؤں کے قاتل ہمیں میں ہیں
قاتل نے سر پہ شوق سے الزام لے لیا
ہم نے بھی اس کو خلعت و انعام دے دیا

بھائی ہی پھینک دیتا ہے بھائی کو کاٹ کے
کیا کہنے اس کی شان کے ہمت کے ٹھاٹ کے
الفاظ مٹ گئے ہیں اشوکا کی لاٹ کے
گھاٹے کے تجربے ہیں اسے گھاٹ گھاٹ کے
ہیں نیک کے اسیر کہ بد کے غلام ہیں
اہل جنوں بھی کیسی خرد کے غلام ہیں

آزادیوں کا لطف تو پابندیوں سے ہے
وہ خوش قدم کچھ اور حنا بندیوں سے ہے
آواز کی بقا بھی صدا بندیوں سے ہے
پینے کا جو مزہ ہے نشہ بندیوں سے ہے
ہے جام جم میں خیر نہ جام سفال میں
ہوتا تو ہے کمال کا نشہ کمال میں

سلیم انصاری
۵۵۹ موتی نالہ، نیاپل، جبلپور - ۴۸۲۰۰۲

نیا سقراط

میں بھی اس عہد کا ایک سقراط ہوں
روز پیتا ہوں
زہراب تنہائی کا
صبح سے شام تک
خود سے ملنے کی کوشش میں رہتا ہوں میں
اور شاید
یہی اک سبب ہے جو تنہا ہوں میں
مطمئن ہوں
کہ میں اس نئے عہد کا ایک سقراط ہوں
روز پیتا ہوں
زہراب تنہائی کا
اور زندہ ہوں میں

▲▲

ایک نظم تمہارے لئے

تمہارے نام کوئی نظم کہہ لوں
تمہارا کیا بھروسہ کب بچھڑ جاؤ
مجھے معلوم ہے
تم جس سمندر میں
سلگتی شام کی تنہائیوں کا عکس دیکھو گے
وہ میرا کچھ نہیں ہے
وہ یادیں
جو میری دہلیز سے تم چھین لائے تھے
اگر باقی بچیں تو
ڈوبتے سورج کی لاشہ پر
اس سمندر میں ڈبو دینا
جو میرا کچھ نہیں ہے

▲▲

ہجرت

یہ سناٹا
جو چھایا ہے فضا میں
پرندوں کو شجر آواز دے کر تھک گیا ہے
نہ جانے کیوں ؟
[illegible]

غزلیں

عبدالمتین نیازؔ

لوٹو گے میرے گھر کو اہلِ ستم کہاں تک
تم نے تو چھین لی ہے مجھ سے مری زباں تک

اس سانحے پہ یارب دل خون کیوں نہ ہوگا
سارے یقین والے پھر آ گئے گماں تک

دل میں اگر تڑپ ہو، اور واقعی طلب ہو
منزل کی گرد پہنچے خود اڑ کے کارواں تک

الجھے ہوئے ہیں رہبر اپنی سیاستوں میں
اور آگ آ گئی ہے داماں گلستاں تک

ہم ہیں بلندیوں کی ساری حدوں سے آگے
یعنی پہنچ ہماری پہنچی ہے لامکاں تک

خوش فکر پنچھیوں کو کوئی ذرا بتا دے
پرواز ہے تمہاری صیاد کے مکاں تک

سب نے نیازؔ صاحب کیا کیا بھریں اڑانیں
لیکن، کوئی نہ پہونچا غالب کے آسماں تک

●●

ہربنس لال بھوشن (موگا)

اشک برسے ہیں دیدۂ تر سے
بات گھر کی نکل گئی گھر سے

چھا گئی آسماں پہ کالی گھٹا
اب خدا جانے یہ کہاں برسے

بوجھ لے دے کے تھا دوپٹے کا
بوجھ وہ بھی اتر گیا سر سے

ہم کو مسجد بھی اتنی پیاری ہے
پیار اپنا اگر ہے مندر سے

کون جانے قلندری کے مزے
آؤ پوچھیں کسی قلندر سے

منزلیں بھی تلاش کر لیں گے
پہلے پیچھا چھڑا لیں رہبر سے

ہم کو موقع ملا اگر بھوشنؔ
دل کی کہہ دیں گے آج دلبر سے

●●

غزلیں

یوسف جمالؔ
زاج ٹانگ پور - ۷۷۰۰۱ (اڑیسہ)

سب قیدیوں کا روپ ہی یکسر بدل گیا
سیلاب ہو کے مثلِ سمندر بدل گیا

ٹکراؤ کی خبر سے جو تھا خوف کا سماں
تاروں کے ٹوٹنے سے تو منظر بدل گیا

مجھ کو سپاہیوں کی وفاداری پر تھا ناز
جنگ جیتنے کا وقت تھا لشکر بدل گیا

جسموں کی ہو شناخت، یہ ممکن نہیں رہا
تلوار کی وہ کاٹ تھی، ہر سر بدل گیا

بعد از فساد دیکھا جو اپنے مکان کو
اپنا ہی گھر تھا یا کہ میرا گھر بدل گیا

تھا مرا اعتماد، میری جان تھا مگر
میرے خلاف کس کی وہ مشورہ پر بدل گیا

"سو کھے جزیرے کی دعا" مقبول ہو گئی
یوسف جمالؔ، تیرا مقدر بدل گیا

●●

کوثر صدیقی
۸ - ۷۵، گنوری مین روڈ، بھوپال ۱۱

یہی نظامِ چمن ہے تو کیا کیا جائے
گلوں کے زخم کو کانٹوں سے سی دیا جائے

بدن کو ڈھانپ کے رکھنا بہت ضروری ہے
قبائے چاک میں پیوند سی لیا جائے

چھپا کے ریت میں منہ کوئی بچ نہیں سکتا
ہوا اُٹھی ہے تو سر بھی اٹھا لیا جائے

بہت دنوں سے میں خود کی تلاش کرتا ہوں
چلو کہ آج کہیں خود سے مل لیا جائے

عدالتوں کے لئے مسئلہ ہے یہ کوثرؔ
ہمارے ساتھ اب انصاف کیا کیا جائے

●●

غزلیں

مدہوش بلگرامی
۲۴۴ بہرا سوداگر مشرقی، ہردوئی۔ ۲۴۱۰۰۱

دل میں مکیں رہے کہ نظر میں مکیں رہے
جس کو جہاں سکون ملے وہ وہیں رہے
کرنا پڑی جہاں سے کنارہ کشی مجھے
جب لوگ اعتبار کے قابل نہیں رہے
یادوں کے قافلے بھی رہے خیمہ زن وہیں
ہم شہر آرزو میں جہاں بھی کہیں رہے
منزل انہیں کے نقش قدم چومتی رہی
ہر گام پر جو گردِ سفر کے امیں رہے
محفوظ اب کے دستِ جنوں سے بہار میں
دامن کوئی رہے نہ کوئی آستیں رہے
رنگینیٔ چمن سے رہے بے نیاز ہم ۔
جب تک ہمارے دل میں وہ جلوہ نشیں رہے
کیوں آج مجھ سے دُور وہ مدہوش ہو گئے
کل تک جو میرے قلب و جگر کے قریں رہے

●●

ڈاکٹر ساقی مچھلی شہری
جنتا میڈیکل اسٹور، میں روڈ، بھدوی
۲۲۱۴۰۱

حاصل وزیروں میں ہے اسے امتیاز بھی
داؤد کے گروہ سے ہے ساز باز بھی
اب تک حوالہ کیس میں شامل نہیں ہے وہ
حالانکہ ہے ثبوت بھی اس کا جواز بھی
اب تو فضا کی راہ بھی مخدوش ہو گئی
گرنے لگے زمیں پہ ہوائی جہاز بھی
کیا ہو نہیں رہا ہے پس زہد آج کل
پردے کا کام کرنے لگی ہے نماز بھی
ہے نامۂ سفر میں مرے جا بجا رقم
تکلیف دہ نشیب بھی خوش کن فراز بھی
جھانکا کبھی جو خود میں تو ہم پر کھلا یہ راز
محمود بھی ہمیں ہیں ہمیں ہیں ایاز بھی
بیباک شاعری میں ہے اپنی مثال آپ
ساقی کو خود پہ فخر بھی برحق ہے ناز بھی

●●

غزلیں

ابوالخیر نشتر
جنتی مسجد، بتیا۔ ٨٤٥٤٣٨

متاعِ شعر و سخن فکر و آگہی کیا ہے؟
اسے خبر ہی نہیں ذوقِ شاعری کیا ہے؟
حسین صبح کا منظر کہ چاندنی کا سفر
نظر ہو نور سے خالی تو دیدنی کیا ہے؟
شراب وقت کا نشہ اتر گیا، لیکن
یہ دیکھنا ہے کہ انجام خودسری کیا ہے؟
نوازنے کا سلیقہ ہوا ان ہواؤں کو
تو مصلحت کے چراغوں کی روشنی کیا ہے؟
یہ آگ دھوؤں کی تجارت یہ جبر و خوف کا راج
یہی ہے طرزِ سیاست تو رہزنی کیا ہے؟
زبان جن کی ترستی ہے قطرے قطرے کو
چمن میں ایسے پرندوں کی زندگی کیا ہے؟
ہزار سجدوں پہ سجدے ادا کرے کوئی
خداشناس نہ ہو دل تو بندگی کیا ہے؟
اجالے یاد کی سرحد پہ جلوہ گر ہیں مگر
کرن کرن کا تغافل یہ بے رخی کیا ہے؟
قدم قدم پہ توہم کی ظلمتیں، نشتر ؟

شبیر احمد قرار
بمبئی

کس امید پہ گھر سے نکلیں ہر منظر حیرانی ہے
شہر بھی رستہ بھول گیا اب جنگل بھی سیلانی ہے
شکر کے سجدے آخر کس دن پیشانی پر چمکیں گے
پیاسی فصل کا رونا تھا اب سر سے اونچا پانی ہے
دریا آب گنوا بیٹھا اب قطرے موج میں آئے ہیں
یہ بیچارے کیا جانیں کس آگ میں کتنا پانی ہے
دھم دھم، دھڑ دھڑ، دھائیں دھائیں ہائے یا اللہ
اب راون کے ہونٹوں پر یہ کیسی رام کہانی ہے
سر پہ فلک محلوں میں پگڑی تھام کے آنا جانا کیا
یوں بھی کچے گھر میں پتھر لمحوں کی من مانی ہے
تیرو میرا کی دنیا میں سونا، چاندی، مٹی، دھول
کندن لفظی سر آنکھوں پر ٹھوکر میں سلطانی ہے

غزلیں

امجد ناظری نظر
چپانگر، بھاگلپور (بہار)

زمانہ صورتِ دلدار کیوں ہے؟
یہ خاموشی سرِ بازار کیوں ہے؟
ادھر کچھ روز سے، ہاتھوں میں اپنے
بجائے شاخِ گل، تلوار کیوں ہے
مریضانِ وفا! کچھ تم ہی بولو!
مسیحا شہر کا بیمار کیوں ہے
یہاں ہر راستہ ہے صاف سیدھا
مگر ہر شخص کج رفتار کیوں ہے
ہنسی اب ہو گئی ہے زہر سی کیوں
تبسّم باعثِ آزار کیوں ہے
جو بستی چین سے سوتی تھی شب بھر
وہ بستی خوف سے دوچار کیوں ہے
بتاؤ بک گئے تم بھی نظر کیا؟
مقفل اب لبِ اظہار کیوں ہے

انور پانی پتی
موضع وڈا کی لدورا درگاہ چنتا چوک، بستی پار

ظاہر جس کا خوشبو رو تھا
باطن میں وہ بد خو تھا
آہوں کا وہ جادو تھا
آنکھوں میں جو آنسو تھا
رات اندھیری تھی لیکن
جھلمل کرتا جگنو تھا
پایا اس کو دست دراز
پاؤں میں جس کے گھنگھرو تھا
دل میں جس کی عظمت تھی
نام اسی کا اردو تھا
نگری جس کو راس نہ آئی
جنگل کا اک آہو تھا
انور کی وہ غزلیں تھیں
جن میں طنز کا پہلو تھا

غزلیں

انتصار علی منظر شاہ آبادی
بس اسٹینڈ، شاہ آباد ۔ ۲۴۱۱۲۴

بزرگوں کی مرے ہر سوچ کی تفسیر زندہ ہے
قلم ان کے نہ ہوں زندہ مگر تحریر زندہ ہے
نکالا جس نے دنیا کو جہالت کے اندھیرے سے
وہ سورج چھپ گیا اس کی مگر تنویر زندہ ہے
کھرچ ڈالو ہمیں تاریخ کے اوراق سے لیکن
نہیں مٹنے کے ہم جب تک زبانِ میر زندہ ہے
ابھی مشکل ہے ختم ہونا ہمارا عہد رفتہ میں
ابھی تک ذہن میں ماضی کی ہر تصویر زندہ ہے
مٹانے والو تم میرا نشاں کیسے مٹاؤ گے
میری تہذیب تو تعمیر در تعمیر زندہ ہے
خبر کر دو با آواز بلند اہل تشدد کو
ہر اک ہندی کے دل میں عظمتِ کشمیر زندہ ہے
خطائے غیر پر ہم تبصرہ کیسے کریں منظر
کہ جب دل میں ہمارے خود ابھی تقصیر زندہ ہے

قاری کھمریاوی
کھمریا ۔ بھدوہی ۔ ۲۲۱۳۰۶

رونے دھونے سے کیا حاصل ڈوبے یا اترائے جی
جیون تو ہے ساگر جیسا طوفاں آئے جائے جی
صبح کا پنچھی اڑتا جائے دور فضاؤں میں لیکن
شام ڈھلے تو لوٹ کے اپنے گھر آنگن میں آئے جی
خوابوں کے اک شیش محل میں یوں تو رات تمام ہوئی
دھوپ چڑھے جب آنکھ کھلی تو ہیں پیڑوں کے سائے جی
سونے، چاندی کے محلوں میں منہ کو چھپا کر رو لیتا
گاؤں کے بوڑھے برگد کی جب یاد کبھی آ جائے جی
گن گن کرتا باغ میں بھونرا پھولوں کے رس چوسے جب
کھینچ حیا کا آنچل گوری گھونگھٹ میں شرمائے جی
الٹے سیدھے لفظوں کو آخر ہمراز بنا سب بیٹھے
چھیڑ کے پیار کا نغمہ قاری من اپنا بہلائے جی

غزلیں

عادل حیات

اے ۵۹۵، امرپوری، نبی کریم، نئی دہلی ۵۵

اپنے سائے پہ وار کرتا ہے
میرے دل کو شکار کرتا ہے

ہجر کی شب میں ماتمی درپن
آنکھ کو آبشار کرتا ہے

کوئی سانسوں کو گن رہا ہے یہاں
کوئی آنسو شمار کرتا ہے

دستکیں دیتے ہیں کئی سائے
مجھ کو ماضی شکار کرتا ہے

کیوں خمیدہ ہے بے ثمر ڈالی
یوں کوئی سرسار کرتا ہے

بات کتنی ہو مستند عادل
کوئی کب اعتبار کرتا ہے

●●

آنند اختر

اس طرح میرے آگے کھڑا کون ہے
دہرِ فانی میں مجھ سے بڑا کون ہے

میں ازل سے ابد تک ترے ساتھ تھا
مدّتوں پھر زمیں پر رہا کون ہے

اپنے رشتے کی نازک حویلی میں وہ
تیرے میرے سوا تیسرا کون ہے

میں کبھی آؤں گا تیرے ہی چشم تلے
پہلے مجھ سے بتا تو میرا کون ہے

دیکھنا ٹوٹ جائے نہ میرا بھرم
سچ بتانا سہی راستا کون ہے

اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں سب
میرے جیسا تجھے چاہتا کون ہے

خون سڑکوں پہ بہتا ہوا دیکھ کر
میرے اندر یہ حیرت زدہ کون ہے

ان کو حاصل ہے شاہوں کی ہمدردیاں
ورنہ اختر یہاں پوچھتا کون ہے

●●

سید نفیس احمد سنبھلی
پنجو سرائے، سنبھل، مراد آباد

ندامت کے آنسو

اسد خاں نے ناظمہ سے کبھی کچھ نہ کہا جب بھی
س سے بات کرتے "بیٹی" ہی کہہ کر نرم لہجے میں بات کرتے.
مگر دلشاد اور وقار کو نہ جانے اس سے کیا بیر تھا؟ دونوں
بھائی اس سے بولتے تو زہر اگلتے۔ جب کے وہ بڑی تھی.
نشاد سے پانچ اور وقار سے سات برس بڑی۔ جب
قار چھوٹا تھا تو ناظمہ اسے گود میں لیتی تب کھانا بنتا ـــ
سکول جانے کے قابل ہوا تو اسے اسکول کے لئے تیار کرتی.
لبعہ نے دونوں بیٹوں کو کئی مرتبہ سمجھایا کہ وہ ناظمہ سے
چھا برتاؤ کیا کریں. لیکن دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جوں
دں وہ بڑے ہوتے گئے ان کے دلوں میں ناظمہ سے نفرت
وان چڑھتی گئی. نفرت کے خاروں نے انھیں زندگی کے چین
سکون سے محروم کر دیا۔ حسد کی آگ میں ہر وقت جلنے سے
ن کے رنگ سیاہ ہو گئے. تندرستی کو عجیب سا گھن لگ
جسم سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے. خدا کی ساری مخلوق
انھیں ناظمہ کے سوا کچھ دکھائی ہی نہ دیتا۔ ان کا بس
لتا تو پل بھر میں وہ اسے زندہ گور میں دبا دیتے ـــ مگر
ظمہ تھی کہ اسے بھائیوں کی فرقت ذرا گوارا نہ تھی۔ ان کے
تا میں وہ والدہ کی خفگی کا بھی شکار ہو جاتی۔ ایسی خفگی جس

کے پردے میں بیٹھی ممتا مسکراتی.

دلشاد نے دسویں جماعت کا امتحان دیا تو ناظمہ نے اس کے پاس ہونے کے لئے قرآن خوانی کرانے اور تین روزے رکھنے کی منّت مانی. جس دن پاس ہوا تو ناظمہ نے اپنے جوڑے ہوئے ایک ایک پیسے کی شیرنی منگوا کر خوشی خوشی سارے محلے میں تقسیم کرائی. کلام پاک ختم کرایا پھر اگلے دن سے روزے رکھنے شروع کر دیئے.

۲۲ر جون کا دن ناظمہ کا تیسرا روزہ تھا. گھڑی نے دن کا ایک بجا دیا تھا۔ مارے گرمی کے برا حال تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں بند پڑے تھے. کسی بشر تو کیا، چرند، پرند تک کی آواز سنائی نہ دیتی تھی. دلشاد نیکر، بنیان میں پڑا برآمدے میں سو رہا تھا۔ رابعہ ظہر کی نماز ادا کر چکی تو ناظمہ اپنی چارپائی سے اٹھی اور نماز ادا کرنے کے لئے وضو کرنے نل کے پاس نیم کے درخت کے سائے میں آ بیٹھی. تو رابعہ پڑوس میں ہمسری بیگم کی عیادت کے لئے چلی گئی. ناظمہ نماز ادا کر کے چوکی پر کھڑی الماری سے کلام پاک نکال رہی تھی کہ دلشاد لمبے لمبے، گہرے گہرے سانس لیتا، سانپ جیسی پھنکاریں مارتا ہوا نیند سے [illegible] اس نے کلام پاک لے کر بیٹھی ہوئی

ناظمہ کو گرم نگاہوں سے دیکھا اور حکمانہ انداز میں گرج کر بولا۔

"میری پینٹ دھو کے ڈال"

"ایک ہی پارہ پڑھ لوں ابھی دھو دوں گی"

"پہلے پینٹ دھو"

"خدمت کر! ابھی دھو دوں گی"

"جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کر"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور تلاوت کلام پاک کرنے لگی۔ خدا جانے اس نے کیا شے ایسی ناظمہ کے سر پہ ماری کہ اس کی فلک شگاف چیخ سن کر رابعہ دوڑی ہوئی گھر آئی دیکھا وہ خون سے تر بیٹھی رو رہی ہے۔ خون سر سے ایسے جاری ہے جیسے فوارہ جاری ہو۔ اس نے سر پہ ہاتھ رکھ کر خون روکنے کی ناکام کوشش کی۔ دلشاد کو خوب کوسا اور بُرا کہا۔ وہ وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ محلے کے لوگ گھر میں آگئے ناظمہ کو ڈاکٹر کے یہاں لے جا کر علاج کرایا۔ چار ٹانکے لگے شام کو اسد خاں نوکری سے لوٹے تو رابعہ نے دلشاد کی اس ذلیل حرکت کا ذکر کیا۔ مگر انہوں نے اسے کچھ نہ کہا۔ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"بہن بھائی کے جھگڑے میں کون بولے"

دلشاد جب گھر میں آیا تو رابعہ نے خوب بُرا کہا۔ مار نے کو آگے بڑھی تو اس نے والدہ کو گرم نگاہوں سے دیکھا۔ خوب بڑبڑایا۔ رابعہ نے اس سے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ مگر فاطمہ نے پھر بھی رابعہ سے کہا "چھوڑو جو ہونا تھا ہو گیا۔"

اسد خاں نے رابعہ سے نکاح کرنے کے بعد کرائے کا مکان چھوڑ دیا تھا۔ وہ اسی کے ہمراہ دو منزلہ مکان میں رہتے۔ دو منزلہ مکان اس کے پہلے شوہر کا تھا جسے اس نے اپنی حیات میں ہی اپنی لاڈلی ناظمہ کے نام لکھ دیا تھا اور ساٹھ بیگھے کاشت کی زمین بھی۔ اسد خاں کو اس تحریر کا ذرا بھی علم نہ تھا۔ وہ بدایوں کا رہنے والا؛ میرٹھ میں پوسٹ مین کے عہدے پر فائز تھا۔ زمین اور مکا کے لالچ میں اس نے رابعہ سے نکاح کیا پھر کرایہ کا مکا ترک کر کے اس کے ساتھ رہنے لگا۔ دلشاد اور وقا دونوں لڑکے اسی سے پیدا تھے۔ اس طرح رابعہ تین بچوں کی ماں تھی۔

رابعہ کا مکان پرانی وضع کا ایک بڑا مکان تھا جس کے اندرونی حصے میں ایک بڑا دالان، دائیں بائیں جانب دو کوٹھری جن میں ہر وقت تاریکی غالب رہتی۔ دالان کے آگے ایک بڑا برآمدہ، پھر آنگن، جس کے آگے بائیں جانب چھوٹے چھوٹے دو کمرے اور ایک بڑا برآمدہ، کچن، اسٹور، باتھ روم وغیرہ لائن سے بنے تھے۔

ایک مرتبہ شام کے وقت وقار نے کسی بات پر خفا ہو کر ناظمہ کے منہ پر ایسا تھپڑ مارا کہ اس کا پھول سا چہرہ کملا گیا۔ نرگسی آنکھوں کے پلکوں پر آنسو اس طرح دکھائی دیئے جیسے پھول کی پتی پر شبنم کے قطرے۔ اس کا داہنا رخسار اس طرح سرخ دکھائی دیا جیسے سارے جسم کا لہو اسی اعضا میں گردش کر رہا ہو۔ رابعہ نے وقار کو پکڑ کر خوب مارا جو اسد خاں کی برہمی کا سبب بنا۔ انہوں نے گھر میں کئی دن تک کھانا نہ کھایا اور نہ رابعہ سے گفتگو کی۔ وہ دونوں بیٹوں کو لے کر الگ کمرے میں سوتے۔

دونوں بیٹوں کی بڑھتی ہوئی نفرت سے رابعہ تنگ تھی۔ وہ دونوں کو سمجھانے کی کوشش کرتی مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ باپ سے بھی لگے رہتے۔ جب

مایوس ہوگئی تو اس نے ناظمہ کو خود سے ایک پل کے لئے بھی
جدا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ دونوں کی جانب سے ہر وقت خوف
لگا رہتا نہ جانے کس پل کیا کر بیٹھیں۔ وہ میکے جاتی تو ناظمہ
کو اپنے ہمراہ لے جاتی۔ ماشاء اللہ وہ جوان ہوگئی۔ اس کا
گورا رنگ، درمیانی قد، اونچی پیشانی، کھڑی ناک، نرگسی
آنکھیں، بھرے ہوئے رخسار، گلابی لب، لمبی سیاہ زلفیں،
مستانہ چال ماحول کو متاثر کرتیں۔ رابعہ نے اس کی شادی
کرنے کا عزم کر لیا۔ رفتہ رفتہ جہیز کی تیاری شروع کر دی۔

اسد خاں روز شام کو تفریح کرنے بیٹوں کے ہمراہ
چلے جاتے وہ ایک پارک میں بیٹھ کر ان سے نہ جانے کیا کیا
باتیں کرتے۔ رابعہ جب انہیں جہیز کا کوئی سامان دکھاتی تو
تینوں جل جاتے۔ رسماً اسد خاں کہتے۔ "اچھا ہے۔" دلشاد
اور وقار کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھتی جس کی
تپش سے ان کی آنکھیں تک سرخ ہو جاتیں۔ خدا جانے کیا
کیا بڑبڑانے لگتے کوئی سُن نہ پاتا۔

ایک دن اسد خاں حسب دستور دونوں بیٹوں
کے ہمراہ تفریح کو گئے تھے۔ رابعہ اور ناظمہ گھر میں تھیں۔ شہر کے
مشہور وکیل انور علی جو ناظمہ کے مرحوم والد کے دوست تھے
رابعہ کے پاس آئے اور اپنے بیٹے کی ناظمہ کے ساتھ شادی
کی بات کرنے لگے۔ رابعہ نے انہیں کوئی اطمینان بخش جواب نہ دیا
تو وہ مایوس لہجے میں رابعہ سے بولے۔

"خیر، اس سلسلے میں اسد خاں سے بات کروں گا۔"

"نہیں، بھائی صاحب! نہیں۔" اس نے گھبرا کر کہا

"کیوں؟" انہوں نے تعجب سے دریافت کیا۔

تب رابعہ نے رو رو کر گھریلو حالات پر روشنی
ڈالی۔ دلشاد، وقار اور اسد خاں کے طور طریقوں کی خوب
مذمت کی۔

انہیں یہ سن کر بہت دکھ ہوا۔ جب وہ جانے
لگے تو رابعہ نے ان سے کہا۔

"ذرا سوچ لوں، ویسے رشتہ مجھے منظور ہے۔"

رابعہ نے ناظمہ کے جہیز پر اور توجہ دی۔ اس کا
خیال تھا۔ ناظمہ کی جلد شادی ہو جانے سے وہ دلشاد
اور وقار کے قہر سے نجات پا جائے گی۔ پھر اتنا اچھا رشتہ
بھی کہیں نہ ملے گا۔ لڑکا ڈاکٹر اور والدین کا اکلوتا۔ ہر
طرح کا آرام ہے۔ ناظمہ خوش رہے گی۔ اس نے ناظمہ کو بر
اس کے ماموں کے یہاں بھیج دیا۔ اسد خاں کو مرحوم وحید
خاں اور انور علی کے مراسم کا کوئی علم نہ تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ اسد خاں صبح ہی دونوں بیٹوں
ہمراہ کسی ضروری کام کا بہانہ بنا کر گھر سے نکل گئے تھے۔ ا
شام کے چار بجے تک بھی واپس نہ آئے تھے۔ رابعہ گھر
تنہا تھی۔ گھڑی نے دن کے گیارہ بجا دیئے تھے۔ اچانک
دروازے پر کسی نے دستک دی۔ رابعہ دوڑی ہوئی گئی
— دیکھا — انور علی کھڑے ہیں۔ بسلام علیک ہوئی۔ رابعہ
نے مسکرا کر کہا۔

"آیئے! بھائی صاحب! تشریف لایئے۔"

"نہیں، بھابی صاحبہ! میں چل رہا ہوں۔ آپ سے
کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

"کیا؟"

"آپ ذرا دیر کے لئے گھر تشریف لائیں۔"

"اچھا میں ابھی آتی ہوں۔"

انور علی چلے گئے تو رابعہ مکان کو قفل لگا کر قریب
کلومیٹر دور رکشا میں بیٹھ کر ان کے بنگلے پر دن کے ایک

بجے پہونچی تو انور علی نے اس سے بند کرے میں گفتگو شروع کی۔

بھائی صاحب! آج صبح اسد خاں اپنے دونوں بیٹوں کے ہمراہ تشریف لائے تھے وہ کہتے تھے۔۔ ناظمہ کے نام مکان اور ساٹھ بیگہ کاشت کی زمین ہے۔ شادی کے بعد مکان اور زمین کا مالک اس کا شوہر ہو جائے گا۔ ایسی ترکیب بتاؤ کہ زمین اور مکان دلشاد اور وقار کو مل جائے۔ وہ دونوں بیٹوں سے برہم ہو کر کہہ رہے تھے۔ ۔۔۔ مارو، پیٹو مت، اس ناگن کو خاموشی سے زہر دیدو میں نے تو رابعہ سے شادی ہی اس مکان اور زمین کی وجہ سے کی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ اس ناگن کے نام ہے۔"

"پھر۔۔ آپ نے کیا کہا ؟" اس نے دوپٹہ سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کل دلشاد اور وقار کو تنہا بلایا ہے ۔۔ مناسب سمجھو تو آپ بھی آجانا۔ مگر ان کو خبر نہ ہو۔"

دونوں میں کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ رابعہ روتی جاتی اور اسد خاں کو برا بھلا کہتی جاتی جس نے دونوں بیٹوں کے دل میں بہن سے نفرت بھر دی تھی۔ اسد خاں کی ذمیل ذہنیت کو وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ جس نے دو معصوم دلوں میں لالچ اور حسد کی آگ سلگا دی تھی جس نے دونوں کی سوجھ بوجھ کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔ انور علی نے دلشاد اور وقار کے ذہن و دل پر پڑے لالچ کے پردوں کو اٹھانے کا عزم کر لیا تھا۔ وہ رابعہ سے مستقبل کے لئے کوئی پلان مرتب کرتے رہے پھر رابعہ دن کے تین بجے اپنے گھر چلی گئی۔

۵ر اگست کی صبح تھی اسد خاں اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے تو دلشاد اور وقار بھی گھر سے بغیر کچھ کہے نہ جانے کہاں چلے گئے۔ رابعہ نے صدر دروازے کو قفل لگایا اور آسمان کی جانب منہ کر کے ہاتھ پھیلا کر دعا مانگی۔ پھر وہ بھی چلی گئی۔ دونوں بھائی انور علی کے یہاں آئے۔ انہوں نے دونوں سے ناظمہ کے ساتھ کئے گئے ظلموں کی تفصیل سنی۔ اس وقت بارش کی گرتی ہلکی ہلکی پھوار ایسی محسوس ہو رہی تھی جیسے آسمان ان کے ظلم سن کر اشک ریزی کر رہا ہو۔ یکے بعد دیگرے اپنے اپنے ظلموں کو فخریہ بیان کرتے تو آسمان گرج گرج کر ان کو ڈانٹتا۔ کئی مرتبہ تو ان کی باتیں سن کر انور علی کی بھی آنکھیں نم ہوئیں۔ ان کی بکواس سے کلیجہ لرز رہا تھا۔ اس لئے وہ ان کی زیادہ بکواس نہ سن سکتے تھے۔ اور انہوں نے دلشاد اور وقار کو سمجھانا شروع کیا۔

"سنو بیٹو! بڑی بہن ماں کے رتبے میں ہوتی ہے اور ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہے۔ جو بہن تمہاری خوشی پر اپنے جوڑے ہوئے ایک ایک پیسے کو قربان کر سکتی ہے کیا وہ تمہیں زمین اور مکان نہیں دے سکتی ہے! تم نے زمین اور مکان کے لالچ میں بہن کے سر سے خون بہایا۔ کیا خدا تمہیں کبھی معاف کر دے گا ؟ ہرگز نہیں! تم دونوں قانونی، مذہبی، اور سماجی ہر پہلو سے مجرم ہوا۔ تمہارے باپ نے تمہارے دل و دماغ پر لالچ کا گندہ پردہ ڈال دیا ہے۔ جس نے تمہارے قلب سیاہ کر دیئے ہیں۔ قبر میں جاؤ گے تو تمہارا باپ تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ اور نہ یہ زمین و مکان! جس بہن کی گود میں کھیل کر تم جوان ہوئے اسی کے ساتھ یہ سلوک! توبہ، توبہ، جاؤ اس بہن سے معافی مانگو۔ ابھی وقت ہے۔"

انور علی ان کو سمجھا رہے تھے اور غصے میں اس طرح

سہیل جامعی
بخشی اینڈ بخشی، کٹکی بازار، دربھنگہ

اجنبی ۔۔۔۔؟

پہلی ملاقات اس سے اسٹاف کوارٹر میں ہوئی جہاں وہ ہماری ضرورتوں کا سامان لے کر آیا تھا۔ دراصل میرے پاپا ان دنوں بیمار تھے اور وہ پاپا کی شفقت سے اس قدر مانوس تھا کہ انہیں ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتا اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کالج سے گھر تک بے چین نظر آتا۔

پاپا کی علالت نے اس کی آمد میں مستقبل اضافہ کر دیا ۔۔ اور وہ جلد ہی ممی ہی سے نہیں ہم سب سے گھل مل گیا ۔۔ پھر روز کا آنا اس کا معمول بن گیا۔

ادھر کافی دنوں سے میں نے محسوس کیا کہ وہ جب بھی آتا وقت کا زیادہ تر حصّہ میرے پاس بیٹھ کر گزارتا۔ تمام لوگوں کی موجودگی میں میں نے جس بات پر دھیان نہیں دیا وہ اچانک ایک دن تنہائی میں اُجاگر ہو گیا۔ دراصل وہ بولتا کم تھا لیکن لفظوں کی تہہ میں بہت کچھ کہنے کی کوشش کرتا ۔۔ یکایک میں اس کی ان کہی زبان سمجھنے ہی نہ لگی بلکہ اس زبان میں جواب بھی دینے لگی ۔۔ پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ رمیش اور میرے درمیان کوئی چیز پنپنے لگی ہے۔

جب دل میں کچھ نہ تھا تو سب کچھ یکساں لگتا تھا۔ لیکن جیسے ہی کچھ کا اضافہ ہوا تو دل کے کسی حصہ میں اسے اوروں کی نگاہوں سے بچانے کی خواہش جاگ اٹھی۔ اب جب بھی رمیش آتا موقع ملتے ہی سر گوشیوں میں باتیں کرنے لگتا ویسے باتیں تو بہت عام ہوتی تھیں۔ گھر کی، کالج کی اور دوستوں کی۔ لیکن سر گوشیوں میں وہ کچھ خاص لگتی تھی۔

کچھ دنوں تک جب اس کی آمد کا سلسلہ بنا رہا اسی درمیان ایک دن میں ممی کے ساتھ باہر نکل رہی تھی کہ پڑوس کی رفعت آنٹی راستہ میں انہیں روک کر بول پڑی۔

" ارے فیروزہ! ایک بات پوچھوں، ان دنوں اکثر ایک نئے لڑکے کو تمہارے یہاں آتے جاتے دیکھتی ہوں کیا وہ تمہارا رشتہ دار ہے؟"

" نہیں تو باجی! وہ تو اپنے مذہب کا بھی نہیں ہے۔"

" اچھا ۔۔۔۔ اچھا! دراصل شام کو اکثر آپ کے یہاں وہ بیٹھا رہتا ہے اس لئے میں نے سوچا شاید وہ آپ کے رشتہ دار ہوں۔"

"وہ تو شہلا کے دوست ہیں" ممی نے یہ بات کچھ
ـا انداز سے کہی کہ بے چاری مرجھائی صورت لئے لوٹ
ہیں۔ اس سے آگے نہ وہ کچھ پوچھنے کی ہمت جٹا سکی
ر نہ ممی ہی کچھ بولی۔

البتہ میں ان کی بات سے قدرے مطمئن اسے ہری
جھنڈی سمجھ اپنی رفتار کچھ اور تیز کر دی لیکن اتنا ضرور
ظ رکھتی کہ تمام باتوں کے ساتھ اپنی پڑھائی پر بھی
را دھیان رکھتی اور ہمیشہ کی طرح رمیش سے اپنے
بلم سولو کرانے کی کوشش کرتی رہی۔ البتہ رمیش
ھنے پڑھانے کے درمیان بیچ بیچ میں کاغذ کی چھوٹی
چھوٹی پرچیوں پر کچھ فقرے لکھ کر پکڑا دیتا جسے دیکھ
میں اندر تک لرز جاتی اس کے جانے کے بعد ان
روں کے الفاظ ـــــ اور ان میں چھپے مفہوم میرے
ہا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے اور میں سارے دن انہیں
الجھی رہتی۔

انہیں سب باتوں کو لے کر میرے اندر اپنی بنتی
رہی تھی بھرپور اور رنگین۔ پھر ان دنوں مجھے کسی
ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ لگتا جیسے میں اپنے
پ میں مکمل ہو گئی ہوں۔ دنیا سے بے خبر اپنی دنیا میں
ہر لمحہ کھوئی رہتی۔

دن گزرتے رہے اور میں اپنے آپ میں کھوئی۔
شام رمیش کے پاس بیٹھ کر گزارتی رہی ـــــ اسی
میان ایک دن باتوں ہی باتوں میں نے ڈھکے چھپے
لفظوں میں کچھ سوچ نتیجہ کی تہہ تک پہنچ اسے دوستی
حد سے آگے بڑھنے سے روکتے ہوئے اُسے لال جھنڈی
دکھا دی۔

بس اتنی سی بات اس کے دل میں اتنی اتر گئی کہ
اچانک اس نے ہمارے گھر آنا ہی چھوڑ دیا۔ اس دن
کے بعد ہر شام اتنی اداس ہو گئی کہ مجھ سے کاٹے نہیں کٹتی
میں سوچنے لگی آخر میں نے کون سی غلط بات کہہ دی اتنا
ہی تو کہا تھا کہ "رمیش! بس دوستی کی حد تک ہی سوچنا
اس کے آگے کی ہر سوچ ہمارے لئے نہ تو موافق ہوگا اور
نہ ہی میری نظر میں صحیح ؟"

ایک دن کالج سے گھر پہنچی تو دیکھا رمیش سر پر
ہاتھ رکھے سوچ کی غار میں دفن خاموش کرسی پر بیٹھا ہے
اور پاس بیٹھی ممی ہلکے ہلکے اس کا سر دبا رہی ہیں۔ مجھ پر
نظر پڑتے ہی ممی میری فطری انداز میں بول پڑیں۔
"شہلا! دیکھو اس پگلے کو پتہ نہیں تم نے اس سے
کیا کہہ دیا کہ چار دنوں سے نہ تو کالج ہی گیا اور نہ ہی کچھ
کھایا پیا ہے۔ مجھے تو کل شام کو محسوس ہوا تبھی آج اُسے
ہوسٹل سے پکڑ لائی ہوں۔ اپنے ساتھ اس کا بھی کھانا
لگا دینا۔

پھر ممی نے خود بیٹھ کر بڑی شفقت سے خوشامد
کر کے اسے کھانا کھلایا۔ میں خاموش بس دیکھتی رہی۔ البتہ
کھانے کے بعد میرے روکنے کے باوجود رمیش ٹھہرا نہیں۔ ممی
کے تئیں شکرگذاری کے بوجھ سے جھکا جھکا سا ہی لوٹ گیا۔

حالات کو معمول پر آنے میں کچھ وقت لگا پھر
رمیش ایک دو دن چھوڑ کر آنے لگا اور آتا بھی تو
پڑھائی کے علاوہ کوئی دوسرے موضوع کو چھیڑتا بھی
نہیں البتہ آہستہ آہستہ اس کی غیر حاضری میں
اضافہ ہونے لگا پھر جب آتا تو ممی سے اپنی غیر حاضری
پر شرمندگی ظاہر کرتا ہوا آئندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ

کر دینا دامن بچا لیتا۔ جس دن وہ نہ آتا میں اپنے اندر شدت کی بے چینی محسوس کرنے لگتی۔

کچھ دنوں تک تو یونہی موسم گزرتا رہا لیکن پھر ایک دن موقع دیکھ کر رمیش مجھ سے مخاطب ہو کر بول پڑا۔

" شہلا! انٹر ریلیجن میرج کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔"

" کیا مطلب ؟"

" مطلب بالکل واضح اور صاف ہے۔ ہندو مسلم شادی۔

" کتنا اچھا ہوتا کہ مذہبوں کے الگ الگ نام انسانوں کے زبان پر نہ آئے ہوتے۔"

" شہلا! یہ میری بات کا جواب نہیں ہے؟"

وہ سچ کہہ رہا تھا در اصل میں جواب دینے سے اپنا دامن بچانا چاہ رہی تھی۔ پھر میں ٹالتے ہوئے اس سے پوچھ بیٹھی۔

" یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

" اس لئے کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟"

وہ بڑی بے باکی سے بولی۔

" رمیش! میں نے اشاروں میں پہلے بھی تمہیں روکا تھا اور آج پھر کہہ رہی ہوں۔" اپنے تئیں شادی ناممکن ہے۔"

اتنا سن کر اس کا چہرہ مرجھا گیا لیکن پھر پورے عزم کے ساتھ مجھ سے بول پڑا۔

" کیا تم نہیں جانتی تھی کہ میرا اور تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

" جانتی ہوں، محسوس کرتی ہوں، یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ محبت ہے لیکن انکار اس لئے کیا ہے کہ مجھے تم سے اتنا گہرا پیار ہے جتنا تمہیں مجھ سے۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ محبت حقیقی ہے۔ صرف جنسی کشش نہیں ـــ رمیش! مجھے تمہاری محبت نے ہی یہ جواب دینے پر مجبور کیا ہے۔ اب ہم ایک دوسرے ہی تو نہیں جانتے ایک دوسرے کے خاندان اور ماحول سے بھی واقف ہیں۔ ہماری بات چیت ہر روز مجھے تم سے ہی نہیں بلکہ تمہارے والدین، بہن بھائی، دوستوں اور پڑوسیوں سے بھی آشنا کراتے رہے ہیں۔"

" شہلا! میں ایک آزاد گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں میری بہن کا شوہر کرسچین ہے۔"

جبھی تو کہہ رہی ہوں کہ تم آج بھی اس بہن کی یاد میں تڑپتے رہتے ہیں اور جب ان کا نام آتا ہے تو تمہارا چہرہ گمبھیر ہو جاتا ہے۔ کتنا عجیب لگتا ہوگا تمہیں جب تم ان سے چاہ کر بھی نہیں مل پاتے ہوگے ـــ پھر تم تو یہ بھی جانتے ہو کہ ہندوستانی سماج میں رہنے والے گھرانے دھرم کے رواجی پہلو سے زیادہ لگاؤ رکھتے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ اگر ہماری شادی ہو بھی گئی تو تمہارے خاندان والے چاہ کر بھی تمہیں سماج کے خوف اور دوستوں کے چھوٹ جانے کے ڈر سے واپس نہ لیں گے۔

" واپس جانے کا ذکر کس نے کیا ہے؟ وہ پوری طرح رندھی ہوئی آواز میں بولا

" رمیش! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ شوہر کو صرف بیوی کی ہی ضرورت نہیں ہوتی۔ ماں باپ، بہن بھائی، دوست اور پڑوسی بھی ضروری ہوتے ہیں۔ ایک دن آئے گا جب تمہیں ماں کے آنچل کی یاد ستائے گی۔ باپ کی شفقت

آنکھوں کے سامنے گھرے گی۔ بہن بھائیوں کی جانی پہچانی پیار بھری آوازیں تمہارے کانوں میں گونجیں گی اور وہ سب دور ہوں گے ـــ بہت دور! اس وقت ان سب کا پیار میں تمہیں کہاں سے لاکر دوں گی؟ میں تو صرف اپنے آپ کو ہی تمہارے نذر کرسکتی ہوں۔ میرا خاندان تمہیں قبول کر تمہارا خاندان تو نہیں بن سکتا ـــ میں یہ سب جانتے ہوئے تم سے کیسے چھین لوں؟ اپنے رمیش کو! اس سے کیسے محروم کردوں، ان سب کے پیار سے جو اسے بچپن سے ملا ہے۔ میں اپنی اکیلی پیار کی خاطر تمام چاہنے والوں کی خوشیوں کا گلا نہیں گھونٹ سکتی۔ یہ مجھے کسی بھی قیمت پر منظور نہیں رمیش؟ میں نے تم سے محبت کی ہے! صرف دوستی کی ہی بنیاد نہیں ڈالی۔ پھر محبت قربانی کا ہی تو دوسرا نام ہے۔ سمجھ رہے ہو نا رمیش! میں کیا کہہ رہی ہوں؟

وہ سمجھ رہا تھا اور میرے پیار کو دل کی گہرائی سے قبول کرچکا تھا۔ جبھی تو طویل خاموشی کے غبار سے نکلتے ہوئے مسکراکر اپنے ہاتھوں کو میرے ہاتھوں کے درمیان رکھ اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا کچھ بھی نہیں لیکن سچائی ہم دونوں پر عیاں ہوچکی تھی جسے اس کی خاموش نگاہوں نے قبول کرلیا ـــ بالکل منجمد، بالکل خاموش کبھی نہ بھولنے والی بات۔

دہلی

● بقیہ :- ندامت کے آنسو ـــ

کانپ رہے تھے جیسے تھالی میں رکھا ہوا پارہ۔ دلشاد اور وقار نیچے گردن کئے اس طرح بیٹھے تھے جیسے وہ اپنے گناہ کے بوجھ سے زمین میں سمائے جاتے ہوں۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ان کے دلوں اور دماغوں پر پڑے ہوئے بدبودار پردوں میں آگ لگ گئی تھی وہ سب جل کر خاک ہوگئے تھے۔ ندامت کے آنسو نے حسد کی آگ کو سرد کردیا تھا۔ ان کے آنسو نے ان کے دلوں کو دھو دیا تھا وہ اب پاک وصاف ہوگئے تھے۔ جوں ہی وہ کھڑے ہوئے سامنے رابعہ کھڑی دکھائی دی۔ انہوں نے پہلے والدہ سے معافی مانگی۔ پھر بریلی چلے گئے اور ایک ہفتہ بعد ناظمہ کو لے کر گھر آگئے۔

شام کو اسدخاں ڈیوٹی سے آئے تو انھوں نے تینوں بہن بھائیوں کو ایک ہی دسترخوان پر ناشتہ کرتے دیکھا تو جل گئے فوراً باہر چلے گئے اور آج تک نہیں لوٹے۔

دلشاد اور وقار نے ناظمہ کی شادی النور علی کے لڑکے سے کردی۔ انھوں نے بہن کو ڈولی میں بٹھایا۔ پھر بہن کی فرقت میں خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

دہلی

بقیہ :- تبصرہ کا

وہ مکمل مسلمان بن سکیں۔ اس مجموعے کی ہر رباعی قابل قدر ہے اور افادی ہے۔ بچوں کے لئے یہ کتاب بڑی افادی ہے۔ ہر گھر میں بچوں کے لئے ایسی کتابیں رہنی چاہئے کیونکہ بچے نثر کی بجائے نظموں، یا دوسری شعری تخلیقات کو زیادہ رغبت سے پسند کرتے ہیں۔ رباعی تو مختصر ہوتی ہیں اس لئے وہ بچوں کو جلد ہی ذہن نشین ہوجائیں گے۔ مرکز کے ذریعہ چلائے گئے تمام مکاتب میں اسے رائج کرنے کے ساتھ ساتھ مدارس بھی بچوں کو اسے پڑھائیں۔

● سید ابوالفیض، سیدا بادی

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے)

م کتاب :- **خموشی بول اٹھی ہے** (شعری مجموعہ)
نلیق کار :- عبدالاحد ساز
شر :- قلم پبلی کیشنز بمبئی
تم کار :- ۷۰ بابو گھوٹنے اسٹریٹ بمبئی ۴۰۰۰۰۲
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بمبئی، دہلی، علی گڈھ
قیمت :- ۴۰ روپیہ ▲ صفحات :- ۱۹۲

عبدالاحد ساز نئی نسل کے نوجوان شاعر ہیں
یوتھائی صدی سے گلشن سخن کی آبیاری کر رہے ہیں
وشی بول اٹھی" موصوف کی پہلی پیش کش ہے جو
کی فنی و فکری بصیرت و بصارت اور گہرائی و گیرائی کا پتہ
یا ہے۔ ساتھ ہی ان کے مختصر مدت میں صاحب کتاب
نے کی دیرینہ خواہشوں کی تکمیل کرتی ہے۔ ان کے
زعزم سفر ہے اور ایک نہ ایک دن بقول ان کے
کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا ؎

اک عمر گذاریں گے سر نوک قلم ساز
اک شعر کسی دل میں چبھو جائیں گے اک دن

"خطا ترسیل" کے تحت مجھے ان کے خیالات سے
بعض حصے سے اعتراض اور بعض کا اعتراف ہے مگر مشورتاً
یہ کہنا چاہوں گا کہ وہ اس پر خود بھی عمل پیرا ہوں اور اپنی
کتاب و کلام پر نظر ثانی اپنے اظہار کردہ خیالات و افکار
کے تحت کریں۔ مثلاً ہماری جدید شاعری جسے اب صرف
'عصری شاعری' کہنا زیادہ مناسب لگتا ہے اپنے دائرہ
سفر کی ایک بڑی قوس و قزح پوری کر کے متوازن ہو چلی
ہے..... دونوں سمتوں میں اپنی ترسیل و تفہیم چاہتی
ہے"۔ ادب کا تخلیق کار ہمارے معاشرے کا ہی ایک فرد
ہوتا ہے اس لئے ادب ہر عہد میں اپنے عصری تقاضوں کی تکمیل
کرتا ہے۔ اس طرح وہ عصری ادب ہوتا ہی ہے۔ شاعری
بھی ادب کا ایک حصہ ہے اس لئے لازماً وہ اس سے جدا
نہیں ہے۔ رہا سوال جدیدیت یا جدید اور روایت پسندی
یا روایت کا یا روایت کا تو یہ تقاضۂ وقت اور تقاضۂ فطر
ہے۔ لوگوں نے جدیدیت کے معنی کو تنگ نظری پر محمول
کر لیا ہے۔ جدت پسندی انسانی فطرت ہے اور جدیدیت
کا ثمرہ۔ جدید شاعری یا جدید نثری ادب نہ تو بے سمتی کا
شکار ہے اور نہ بے معنگی کا۔ یہ شجر ممنوعہ نہیں آئیے خود سے
پڑھئے، پرکھئے اور قریب سے دیکھئے۔ آج کا جدید ادب جیسا

حسن، صوتی ہم آہنگی و کشش، فنی شعور، فکر کی گہرائی و گیرائی، پرواز اور معنویت کی وسعت غرض وہ سب کچھ رکھتا ہے جو ایک معیاری ادب کے لئے ضروری ہے۔ ادب خواہ شعری ہو یا نثری اسے صرف نشاط آگیں ہونا ضروری نہیں ادب کا مقصد اپنے قاری کو کچھ شئے افادی دینا ہوتا ہے۔ اس نظریئے کے پیش نظر ساز صاحب سے گذارش کروں گا کہ وہ اپنی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ غزلوں نظموں پر نظر ثانی کرتے رہیں۔ اسے اور باوزن بنائیں۔ غزل گوئی تک بندی نہیں ہے۔ خون کی اک اک بوند سوختہ کرنے کے بعد ایک شعر جنم لیتا ہے اور اس کی آراستگی کے لئے ادب، فن، منطق و فلسفہ نیز مذہبیات و سیاسیات کے عمیق مطالعہ اور واقعات و حادثات عالم نظر وا رکھنے کی ضرورت ہے جس کی عدم موجودگی میں شعر شعر نہیں ہوتا۔ فن کے متعلق ساز کا یہ شعر عمدہ اور حقیقت پر مبنی ہے ؎

دلدار نہیں پردۂ فن بند قبا ہے
اک جنبش انگشت کہ مہتاب کھلیں گے

ساز نے اپنے مجموعہ میں ۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کی منتخب نظموں اور غزلوں کو سن تخلیق کے ساتھ شامل کر کے قارئین و ناقدین فن کے لئے اپنے فن کے تدریجی ارتقاء کو پرکھنے کا مکمل موقعہ فراہم کر دیا ہے۔ ان کے فن کی بالیدگی، شعور کی پختگی، فنی بصیرت و بصارت معنویت گیرائی و گہرائی وقت کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے۔ ان کی بہتری غزلوں میں موسیقیت و نغمگیت بدرجہ اتم ہے۔ بعض اشعار تو اپنے دلکش و روح پرور اور حقائق پر مبنی ہیں کہ دل جھوم اٹھتا ہے۔ نظمیں خوب سے خوب تر اور تا فراتی ہیں جن میں نظم نگاری کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ اس دور میں جب کہ اچھے نظم گو شعراء کا قحط الرجال ہے ساز اگر اپنی پوری توجہ نظم نگاری پر مبذول کرنے کی زحمت گوارا کریں تو جلد ہی افق نظم کے تابندہ ستارے بن کر چمکیں گے کیونکہ ان کی نظموں میں نظم گوئی کی جملہ خصوصیات و اجبات بدرجہ اتم موجود ہیں۔

کتاب کی کتابت، طباعت صاف ستھری اور مغلیات سے پاک ہے۔ کاغذ عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔ میں ساز کو ان کی اس تخلیقی کاوش و پیشکش پر دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ اور دعا ہے کہ ؎

اللہ کرے ہو زور قلم اور زیادہ

● سید ابوالفیض سید آبادی، گیا

تخلیق :۔ گنج معانی (شعری تخلیق)

تخلیق کار :۔ تلوک چند محروم

ناشر :۔ محروم میموریل سوسائٹی، نئی دہلی

مرکز دستیابی :۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، راؤز ایونیوئی دہلی ۔۲ ۱۱۰۰۰ ○ قیمت :۔ ۱۵۰ روپے

تلوک چند محروم کی ذات گرامی اور شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے محروم بہ حیثیت فرد، استاد اور شاعر اپنی گوناں گوں خصوصیات اور انفرادیت کے سبب اپنے عہد اور مابعد عہد ہنوز زندہ جاوید ہیں اور رہیں گے۔ اصلاح معاشرہ ہندوستانی تہذیب و روایات، صلح و محبت کی تلقین، قومی یکجہتی ہندوستان کی جنگ آزادی، نئی نسل کی ذہنی و فکری آراستگی جیسے اہم موضوعات میں اردو شاعری کی خدمات کا تذکرہ جب بھی کیا جائے گا تو وہ تذکرہ اس نام نامی کے بغیر مکمل نہ ہوگا۔ مختصراً یہ کہنا نعلی بیجا نہ ہوگا کہ محروم کی شاعری ہماری زندگی کے تمام تر پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں جو اردو زبان و

ادب کے گنے چنے شعراء کے یہاں ملیں گی ۔
محروم کی شاعری کا یہ تیسرا ایڈیشن "گنج معانی" کے نام سے ان کے فرزند ارجمند جگن ناتھ آزاد نے ۱۹۹۵ء میں مرتب کرکے اردو زبان و ادب کے پروانوں کے سامنے پیش کیا۔ آزاد اس کے لئے قابل مبارکباد ہیں اور اردو شاعری کے پروانے ان کے تاحشر ممنون ہیں کیوں کہ انہوں نے اس مجموعے میں محروم کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام کو شامل کرکے اسے جامعیت عطا کی ہے ۔
گنج معانی کا ہر شعر اپنے اندر صوری، صوتی، معنوی خوبیوں افادیت، سخن گستری، آفاق گیری اور رموز و حکمت کا خزینہ بیش بہا رکھتا ہے ۔ ہندی اور اردو کی آمیزش نے اسے گنگا جمنی تہذیب کا نمونہ بناکر خواص و عام میں مقبولیت اور ابدیت عطا کی ہے ۔ اردو شاعری میں نظیر اور محروم ہی ایسے شعراء ہیں جن کے کلام کو عوامی مقبولیت حاصل ہے ۔ فضا بندی، اظہار کی بے باکی و برجستگی، تسلسل بیان، روانی اور زبان کی چاشنی، سہل و عام فہم زبان کے استعمال میں تو یہ یکتائے روزگار ہیں ۔ "گنج معانی" کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مطالعہ ہر ذوق مکتب کے قاری کو آسودگی بخشتا ہے ۔ ۵۹۶ صفحات پر محیط شعری مجموعہ از اول تا آخر اپنے قاری کو نہ تو کبھی ذہنی تکان نہ ہی بوریت کا احساس تک ہونے دیتے ہیں ۔ صفحہ اول سے جوں جوں آگے بڑھئے اشعار کا تسلسل بیان اور الفاظ کی جادوگری قاری کو شراب مطالعہ سے لطف اندوز کرتے ہوئے اتنا مخمور کر دیتا ہے کہ آخری صفحہ پر ہی ہوش آتا ہے ۔ یہ اعزاز انفرادی ہے اور کسی شاعر کو ہے ۔
اس کتاب پر مشفق اردو عبدالقادر کے مربوط تعارفی مقالہ اور جگن ناتھ آزاد کے مقالے کے علاوہ اکبر الہ آبادی کا قطعہ تحسین ۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کا نوٹ جوش ملسیانی کا خیال، حفیظ جالندھری اور اعجاز حسین کے جامعہ نوٹس اس کلام کے شایان شان ہیں ۔
طباعت، کتابت اور کاغذ عمدہ ہے ۔ قیمت مناسب ہے ۔ گنج معانی کو قومی سطح پر اکیڈمی ایوارڈ کی اول مستحق ہے ۔

● سید ابوالفیض سیدابادی ، گیا

تخلیق :- بچوں کی رباعیاں (شعری تخلیق)
شاعر :- عادل اسیری دہلوی
ناشر :- مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶
صفحات :- ۳۲ ۔ قیمت :- ۶ روپے

"بچوں کی رباعیاں" عادل اسیر کی شعری پیشکش ہے اب تک میرے مطالعے میں بچوں کی کہانیاں، نظمیں اور قطعات آئے ہیں ۔ اس طرح میرا یہ دعوی ہے کہ ادب اطفال میں عادل کی یہ پہلی کامیاب کوشش ہے ۔ مخمور سعیدی نے بجا طور پر اسے ادب اطفال میں ایک اضافہ قرار دیا ہے ۔ مشمولہ رباعیات جہاں ایک طرف آسان، سہیل اور عام فہم زبان میں ہیں وہیں ان کے اندر تمام ترفنی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں ۔ انہوں نے آسان و عام فہم زبان نیز سادہ اسلوب میں اخلاق نکات، قرآنی فرمودات اور احادیث کے ایسے نکات جس میں جن سے بچوں کی زندگی بن سنور اور سدھر سکے بچوں کو ذہن نشین کرانے کی سعی کامیاب کی ہے جس سے مستقبل میں ایک صالح معاشرے کی تعمیر ہو سکے اور



چیف ایڈیٹر

مسعود منظر



ایڈیٹر

جمیل منظر



خوشنویسی: سید

خیالات

غزلیں

غزلیں

غزلیں

محترم علی جواد زیدی نے مجھے مندرجہ ذیل خط لکھتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ خط [illegible] صرف آپ سے اور آپ جیسے نوجوان دانشوروں سے آواز بلند گفتگو ہے [illegible] تک پہنچانے کے لئے جو باتیں مجھے سوجھی گئی ہے اس کی صورت میری دانست میں یہی تھی کہ [illegible] تحریر کو مکتوبات کی قطار سے نکال کر بیانات کے ضمن میں رکھا جائے چنانچہ محترم زیدی سے معذرت کے [illegible] رہا ہوں ۔ اُمید ہے قارئین سہیل ان خیالات سے روشنی حاصل کریں گے ۔

مسعود منظر

محترم

آپ کی خواہش کے مطابق آزادِ اظہار کے عنوان سے ایک نظم بھیج رہا ہوں ۔ خالص روایت [illegible] جدت نگاری اور تجربہ پرستی کے ساتھ ساتھ نقالی کا جو دَور چل رہا ہے اس میں ترسیل و [illegible] کا تصور دب کے رہ گیا ہے ۔ جب کہنے کی بات ذہن میں ہو تو زمانہ خود لفظ بخش دیتا ہے ۔ پرانی [illegible] افتادہ اور بار بار کھنگالی ہوئی لفظیات میں ربت کے گھروندے بنانے سے کام نہیں چل [illegible] کی سیاست ، اقتصادی بے حالی ، انسانی مجبوری نے سارے منظرنامے کو بنیادی طور پر آفاقی [illegible] ایسی بے چینی اور ناعاقبت اندیشی کو جنم دیا ہے جسے ہمارے دانشور پوری گرفت میں نہیں [illegible] ۔ الفاظ اپنے معنی کھوتے جا رہے ہیں ۔ ہم انہیں کے سہارے چل رہے ہیں ۔ آفاقی اصلیت اور کیفیت [illegible] ہیں ۔ یہ اصل مسئلہ ہے ۔

کیا یہ وہی دنیا ہے جو ورثہ جانئیے ہماری آزادی کے وقت تھی ؟ عالمی سطح پر یو ۔ این ۔ او ایک بے جان [illegible] ہو کر رہ گیا ہے ۔ محدود جنگیں جاری ہیں ۔ کہیں سفید و سیاہ کا جھگڑا ، کہیں سرحدوں کا ، دہشت پسندی [illegible] ہے ۔ بے حساب اخلاق دشمنی ہے ، رشوت اور ملکی پیمانے پر مافیا ہے ۔ بین الاقوامی سطح پر یہی حال [illegible] دو تیسرے ملکوں میں نہیں بلکہ ہر ملک اس کی زد میں ہے ۔ ایک عدم استقلال کی [illegible] پیدا کر رہے ہیں ۔ سب کی ضرب کہیں نہ کہیں عوام پر پڑ رہی ہے ۔ ان کی [illegible] کیوں ہو رہا ہے ۔ کیا ان حالات میں ادیب پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے ۔ [illegible] ؟ نظریات تو سب بکھر گئے ہیں ، [illegible]

[illegible]

شعور

تخلیق، تنظیم اور تحریک

ہمارے بعض اہل قلم اور تخلیق کار یہ سمجھتے ہیں کہ فن کار کا کام صرف شعر و ادب کی تخلیق کرنا ہے، اسے تنظیم اور تحریک سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ ایک مغالطہ ہے اس میں سہل انگاری اور گریز کا پہلو بھی ہے۔ فن کار ایک مساعد صورت حال میں بہتر تخلیقات پیش کر سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ اپنی تخلیق کو معیار بخشنے اور اسے [illegible] بنانے کے لئے کہیں نہ کہیں سے اس پر یہ ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے کہ وہ اپنے حسب حال ماحول تیار کرے۔ فن کار معاشرے کا مجہول اور [illegible] ہوتا۔ ایسا نہیں ہے کہ جسے جس حالت میں رکھا جائے وہ رہ جائے اور اسی حالت میں تخلیق فن کرتا ہے۔ دانشور فن کار نہ صرف اپنی تخلیق کے لئے بلکہ اس کی قرأت کے لئے اچھا ماحول چاہتا ہے۔ تنظیم سے لکھنے لکھانے کی تحریک ہوتی ہے زبان اور ادب و شعر کو زندہ رہنے اور پنپنے کے لئے عمدہ اور سازگار ماحول ملتا ہے۔ جب تک فن کار اس ماحول کی ساخت و پرداخت کے لئے کوشش نہیں کرتا اس کی تخلیق کی معنویت بھی محدود رہتے ہوتے معدوم ہو جاتی ہے۔ یہ تصور کہ تنظیم و تحریک ادب کو ایک مخصوص حد بندی میں محصور کر دیتی ہے سراسر غلط ہے۔ دراصل ہم یہاں تحریک و تنظیم سے ایک ایسی فضا مراد لے رہے ہیں جس میں فن سانس لے سکیں۔ مخصوص سیاسی وابستگی اور نظریاتی فرمانبرداری اور ہے اور تخلیق کے کھلی فضا اور شعر و ادب کے لئے زندہ اور متحرک ماحول کی کوشش اور بات ہے۔

ادب کو زندہ رکھنے اور قاری تک پہنچانے نیز اس کے گہرے اثرات کے لئے [illegible] تنظیم و تحریک ناگزیر ہے۔ اچھا ماحول ہی اچھے ادب کا ضامن ہو سکتا ہے [illegible] جاسکتا ہے۔

مسعود منظر

محمد حسن
٧-د ماڈل ٹاؤن۔ دہلی ۹۔

نکہتِ بادِ بہاری ۱

(جنوری ۱۹۸۰ کا سفرنامہ)

۵ جنوری

۶ بجے صبح دہلی سے روانگی۔ ٹرین میں دو اہم ملاقاتیں۔

پہلی ملاقات ایک ڈاکٹر سے ہوئی جو ہارورڈ سے فارغ التحصیل تھے اور پبلک ہیلتھ کے بارے میں بہت سی باتیں بتاتے تھے۔ بنیادی بات تناؤ کا خاتمہ ہے جسے وہ لوگ بے فکری کہتے تھے۔ بعض ایسے واقعات ہوئے جن سے وہ روحانیت کے بہت قائل ہو چکے تھے۔

دوسری ملاقات سی بی آئی کے ایک نوجوان پولس افسر سے ہوئی جس نے چودھری چرن سنگھ پر حملہ کرنے والے نوجوان کو گرفتار کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس سے زیادہ HARDENED مجرم اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ یہ کم عمر غریب گھر کا پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ جس کے بیوی کے پہلا بچہ اس کی گرفتاری کے بعد پیدا ہوا تھا اور پولس والوں نے اس کے اندر ترس اور ہمدردی پیدا کرنی چاہی اور ناکام رہے کہ وہ [illegible] [illegible] تھا۔ اور کہتا تھا کہ چرن سنگھ کو قتل کرنا نہایت ضروری ہے وہ جنتا پارٹی کو توڑنا چاہتا تھا اور کہتا تھا کہ جیل سے چھوٹنے کے بعد بھی ہم اسے ماریں گے ضرور —

یہ پولس افسر خود بھی عجیب و غریب شخص تھا کہتا تھا کہ ۱۹۷۱ء کے بعد آج سویا ہوں۔ ریلوے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی سو گیا تھا اور دو بجے دن تک سوتا رہا کروٹ تک نہیں بدلی۔ اس نے بتایا کہ اس کی شادی اس سے کہیں زیادہ امیر گھرانے میں ہوئی ہے۔ مگر بیوی نے یہ شکایت تک نہ کی کہ وہ اسے عیش و آرام فراہم نہیں کر سکا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ انگریزی میں ایم۔ اے ہے اور اچھے نمبر سے پاس ہوا ہے مگر سول سروس میں نہ آ سکا اور اسے ترقی نہیں ملی ڈاکٹر نے یہ تشخیص کی کہ اس کے نیند نہ آنے کا سبب بیوی کی طرف اس کے احساس جرم یا احساس کمتری کی وجہ سے ہے اور ملازمت میں اپنے کو نا آسودہ پانے کی سبب سے ہے۔

راستے میں گاڑی ایک جگہ گاؤں میں رک گئی کیونکہ [illegible] [illegible]

روشن نے گاؤں والوں سے کہا کہ ہم تو آپ کے مہمان
ہیں گاؤں والوں نے پورے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ والوں
کو جی کھول کر بعض کو جگ میں بعض کو ادک سے۔ گنے کا
رس پلایا۔ سب روشن کی کارگزاری کے قائل ہوئے حتیٰ کہ
کنڈکٹر اور ٹکٹ چیکر نے بھی گنے کا رس پیا اور روشن
کی تعریف کی۔

اسی رات کو پٹنہ پہنچ گئے۔ اسی گاڑی میں پروفیسر
مختار الدین احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ زبانی
امتحان لینے لکھنؤ جا رہے تھے رسالہ 'عصری ادب' کے
خریدار بنے رقم ادا کی۔ پٹنہ پہنچنے پر اسٹیشن ہی پر
وہاب اشرفی مل گئے انھوں نے اپنے ہمراہ لے جا کر
الیسرا ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۲ میں ٹھہرایا۔

۶ جنوری ——— تقریبات شاد عظیم آبادی
کا آغاز۔ غلام سرور، تقی رحیم، حبیب الرحمٰن اور معین
احسن جذبی سے ملاقات ہوئی۔

مزار شاد کی مرمت ہو گئی ہے مزار شاد پر حاضری
دی۔

جے پرکاش نرائن کا خصوصی پیغام پڑھ کر سنایا
گیا اور سید ابا بوذر نے اردو کا رسم خط دیوناگری میں
کرنے کی بات کہی جس کا خاصہ سخت جواب غلام سرور
صاحب نے دیا۔ میں نے بھی اپنی تقریر میں اس کی طرف
اشارہ کیا۔ تقی رحیم صاحب ٹھیٹھ میں بولے مگر ایک
بات اچھی کہہ گئے کہ جو لوگ شاد کی قبر پر منوں گوبر پھینکتے
ہیں وہ بھی ان سے کسی سے کم محبت نہیں کرتے مگر چونکہ
وہ خود اسی گوبر میں زندگی گزارتے ہیں اس لئے وہ اسی
[illegible] اس کی ذمہ داری خود شاد پر بھی ہے اور

ان کے معاشرے پر بھی کہ انھوں نے شاد منزل [illegible]
مگر اس کے ارد گرد رہنے بسنے والے لوگوں سے کوئی
رشتہ نہ جوڑا کہ وہ گوبر سے شکل پاتے اور ان کے فن
کا جوہر پہچاننے کے لئے کافی علم حاصل کر پاتے۔

شام کے جلسے میں کلیم الدین احمد صاحب سے
ملاقات ہوئی اور بہار اردو اکیڈمی کی کارگزاریوں کا [illegible]
ہوا اور کتابوں کا اجرا کیا گیا ان میں کلیات شاد
کی جلدیں اور قاضی عبدالودود صاحب کے مضامین کے
مجموعے بھی تھے کتابوں کا اشتیاق ہے انہی [illegible]
میں شاد کے پوتے نقی احمد ارشاد نے تقریریں کیں۔

۷ جنوری ——— جے پرکاش نرائن سے ملاقات
ان کے ڈرائنگ روم میں لینن، بدھ اور گاندھی
کی تصاویر دیکھیں۔ کدم کنواں والے مکان میں وہ
بیٹھے تھے ان کے سکریٹری سید ابابوذر [illegible]
ایک کمرے میں ڈیالیسس کی مشین لگی ہوئی تھی میں
اردو کا معاملہ جے پرکاش جی کے سامنے پیش کیا ان کا
رویہ اس بارے میں نہایت ہمدردانہ تھا۔ میں نے
روشن نے جے پی کے ساتھ تصویریں کھنچوائیں۔ اردو
کے بارے میں ان کا بیان میں نے یہاں کے انگریزی
اخبارات میں شائع بھی کروا دیا۔

یہاں سے جلسہ گاہ گیا ادبی نشست کا پہلا
اجلاس تھا صدارت عطا کاکوی صاحب کی تھی [illegible]
میں نے مقالہ پڑھا عنوان تھا "لہجے کا شاعر — شاد"
واقعی شاد کی فنکارانہ اہمیت کا احساس اس سے
نہیں ہوا تھا۔ جلسے میں نقی احمد ارشاد نے نہایت
عمدہ مقالہ پڑھا مقالات کے بعد کلام شاد [illegible]

[illegible] الرحمٰن اور میرے مقالات پر بغیر میرا نام لئے
کچھ معترضانہ والا لہجہ اختیار کیا حالانکہ وہ
جلسے کی کارروائی چلا رہے تھے اور انھیں اس قسم کا
رویہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہاب اشرفی نے فوراً بولنے
کی اجازت مانگی اور ان اعتراضات کو رد کیا اور تشکیلی
تنقید اور سماجیاتی تنقید کے مفاہیم اور دونوں کے رشتوں
پر روشنی ڈالی۔ عطا کاکوی صاحب کے بہت ہی دلچسپ
خطبے پر جلسہ ختم ہوا۔

سہ پہر کے جلسے کی صدارت کلیم الدین احمد صاحب
نے کی۔ جلسے کے بعد ان کے ہمراہ ان کے گھر گئے۔ وہاں
چائے پی۔ کلام حیدری بھی ساتھ تھے اردو کی کتابیں
اور اخبار چھاپنے کے لئے ایک لمیٹیڈ کمپنی قائم کرنے
کی بات کر رہے تھے۔ سہ پہر کے اجلاس میں وہاب
اشرفی کے علاوہ دو ایک اور مقالے بھی اچھے تھے۔

رات کو سری کرشنا ہال میں مشاعرہ تھا۔
روم کے طرز کے ایمفی تھیٹر کے طرز پر کھردرے
سیمنٹ اور کنکریٹ کا گول گنبد بڑا دل کش تھا گورنر
نے افتتاح کیا اور جسٹس علی احمد صاحب نے صدارت
کی مشاعرے میں تقریباً سبھی شاعر ہوٹ کئے گئے
بعض ایسے بھی تھے جنھیں پڑھنے سے پہلے ہی ہوٹ
کر دیا گیا۔ بشیر بدر البتہ کامیاب رہے۔ جذبی اور
تاباں بھی۔ یہ دونوں سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے۔
دونوں میں شراب پینے کے بعد جھگڑا ہو گیا۔ وجہ
تنازعہ یہ تھی کہ تاباں نے علی گڑھ کے مسئلے پر پدم شری
واپس کیا تھا اور اسے جذبی محض ایک سیاسی اسٹنٹ
قرار دے رہے تھے۔

[illegible] جنوری

صبح قاضی عبدالودود صاحب کے یہاں گیا۔
مسعود میاں کی گاڑی میں یونیورسٹی گیا وہاں عطا
کاکوی صاحب کی صدارت میں میرے اعزاز میں جلسہ
تھا۔ قمر اعظم ہاشمی، شمیم احمد اور احمد یوسف سے ملاقات
ہوئی۔ دو رات قبل جو موسیقی کی محفل ہوئی تھی اس
میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کی مس بہل نے
شاد کی خوبصورت غزل بڑی خوبصورتی سے گائی
تھی۔ البتہ استاد بلال احمد خاں نہیں جمے۔ ۸ کو یونیورسٹی
سے واپسی پر اویس احمد دوراں صاحب سے نکسل واد
پر گفتگو ہوئی۔ سوویت روس کا سوشل امپیریلزم بھی
زیر بحث آیا۔ صبح کو رضوان احمد صاحب نے عظیم آباد
ایکسپریس کی طرف سے انٹرویو اردو بلٹز کی طرف سے
بھی انٹرویو لیا گیا۔ سہ پہر کو ریڈیو والوں کی دعوت
پر وہاں گیا اور اپنا انٹرویو ریکارڈ کرایا۔ وہاں سے
انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پہنچا جو اس
کو [illegible] لائبریری میں تھا۔ سہیل عظیم آبادی کرتا
دھرتا تھے جن کے بارے میں یہ شبہ بھی ظاہر کیا گیا
کہ وہ ہر حکومت کے انفارمر رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔
وہاں سے اردو گورنمنٹ لائبریری کے استقبالیئے میں
پہنچا۔ عبدالمغنی صاحب اور ہارون رشید صاحب
نے بڑی توصیفی تقریریں کیں۔

ہارون رشید صاحب نے اپنے ایک دوست
کی گاڑی میں عطا کاکوی، سہیل عظیم آبادی اور دو ایک
اور حضرات کے ساتھ پٹنہ سٹی کے مشاعرے میں پہنچا
دیا۔ یہاں اویس احمد دوراں اور [illegible] صاحبان

نے بڑی اچھی غزلیں پڑھیں۔ کلیم عاجز صاحب کی
غزلیں بھی خوب تھیں۔

۹ر جنوری ـــــ

قاضی عبدالودود صاحب کے یہاں گئے اور وہاں
سے خدابخش لائبریری پہنچے وہاں عابد رضا بیدار صاحب
کے بعض نادر مخطوطے اور قدیم مغل تصاویر کا البم دکھایا
دیوان حافظ کا ایک مخطوطہ بھی دکھایا جس سے ہمایوں
سے شاہجہاں تک مختلف مغل بادشاہوں نے فال
دیکھی تھی۔

مشہور مورخ محمد عسکری صاحب بھی یہاں
مطالعے میں محو نظر آئے۔ ان کے بارے میں بعض دلچسپ
باتیں معلوم ہوئیں کہ ایک نہایت شکستہ حال سائکل
پر سوار رہتے ہیں۔ اور فلم دیکھنے کا شوق ہے۔ قطار
میں لگ کر سب سے ارزاں کلاس کا ٹکٹ لیتے ہیں۔
راستے میں اگر اچھی گھاس مل جائے تو اسے توڑ کر
یا خرید کر اپنے گھر میں پلی ہوئی گائے کے لئے مٹھی میں
دبائے دبائے گھر لے جاتے ہیں۔ ایک بار سائکل کا
چالان ہوا تو انہوں نے پولس والوں سے کہا کہ
" سائکل لے جاؤ، مجھے کیوں لے جاتے ہو۔" پولس
والے ذمانے، تھانے دار ان کا شاگرد تھا اس نے
عزت کے ساتھ بری کر دیا۔ ان کی یہ بھی خصوصیت
ہے کہ کبھی اپنی شناخت IDENTITY ظاہر نہیں کرتے

سہ پہر کو بدنام نظر سے ملاقات ہوئی معلوم
ہوا کہ ان کے والد سخت مذہبی تھے۔ پانچ برس کی
عمر میں بدنام نظر کے غیر مذہبی خیالات ظاہر کرنے پر
انھیں گھر ہی سے نہیں اپنے شہر سے دور نکلنے میں ایک
پوسٹن میں داخل کرا دیا اور یہ وہیں پڑھتے رہے
بارہ برس وہیں زیر مطالعہ رہے۔

رات کو گاڑی سے ہم لوگ پٹنہ سے رانچی کے
لئے روانہ ہوئے۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: خیالات

اندازہ ہوا۔ نورجہاں ثروت نے غزلیں اور نظمیں
دونوں کامیابی سے کہی ہیں۔ وہ عام ڈگر سے ہٹ کر چلنے
کی کوشش کرتی ہیں اور اپنے کلام کی ایک خاص سطح
برابر برقرار رکھتی ہیں۔ اس مجموعے میں شامل کلام ایک
بالغ ذہن کی تخلیق ہے۔

کتاب سلیقے سے مرتب کی گئی ہے اور ظاہری
تزئین و آرائش کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے، جو
کتاب کے معنوی محاسن کے شایان شان ہے۔

پرنٹر پبلشر ابن منظر نے نبیل آرٹ پریس
شاہ گنج پٹنہ ۔۶ سے چھپوا کر دفتر سہیل
ریلوے سائیڈ روڈ، گیا سے شائع کیا

براہ کرم جوابی امور کے لئے
ہمیشہ ڈاک ٹکٹ ارسال
کریں۔ (ادارہ)

مظہر امام

دہلی

خیالات ۸۵

• پروفیسر وہاب اشرفی
تاریخ ادبیات عالم جلد اول ودوم

وہاب اشرفی کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ کلکتہ میں بی۔اے کے طالب علم تھے اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ ان کی ابتدائی محبتوں کا شامل تھا۔ انہوں نے ٹینی سن کی نظم - ENOCH ARDEN کا نہایت خوبصورت ترجمہ انہیں دنوں کیا تھا جسے میں نے اپنے تعریفی نوٹ کے ساتھ ماہنامہ "معاون" کلکتہ میں چھاپا تھا۔ وہاب اشرفی کی ذہانت و فطانت، ذوق لطیف اور حسِ مزاح نے مجھے شروع سے ہی متاثر کیا اور عمر کے تفاوت کے باوجود ان سے جو دوستانہ بے تکلفی قائم ہوئی، وہ آج تک برقرار ہے۔

وہاب اشرفی نے ادبی اور تدریسی محاذ پر کامیابی کی منزلیں تیزی سے طے کیں اور اب ان کا شمار اردو کے معدودے چند معتبر نقادوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے تحقیقی کام کی داد وہ قاضی عبدالودود سے بھی پا چکے ہیں۔

پروفیسر وہاب اشرفی کی "تاریخ ادبیات عالم" اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کی دو ضخیم جلدیں اب تک منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ یہ منصوبہ چھ جلدوں میں مکمل ہوگا۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ اس بڑے کام کا بیڑا وہاب اشرفی نے اٹھایا۔ اس کی پہلی جلد میں مصری، اشوری، یونانی، چینی، عراقی، کیلٹی، ہسپانوی، لاطینی، سنسکرت، پالی اور فرانسیسی ـــ اور دوسری جلد میں جرمن، امریکی، اسکینڈ نیویائی، تامل، فارسی، عربی کے چھ سات ہزار سال کے ادبی سرمائے کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ دوسری جلد میں مصری، یونانی، لاطینی اور سنسکرت ادب کے ان ادوار کے احوال بھی درج ہیں، جن کا احاطہ پہلی جلد میں نہیں ہو سکا تھا۔

وہاب اشرفی ایک وسیع المطالعہ اور فعال ادیب ہیں اور اپنے علمی اکتسابات کو شگفتہ اسلوب اور دلآویز زبان میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ عالمی شعر و ادب کے مختلف ظواہر کو اور اس کی نیرنگیوں کو اس دلکش پیرائے میں بیان کرنا ہر ایک کے

بس کی بات نہیں۔ یہ کتاب اس نوعیت کی تاریخ نہیں ہے کہ کون شاعر اور ادیب کب پیدا ہوا، کیسی زندگی جیا، کون کون سی کتابیں لکھیں، بلکہ وہاب اشرفی نے دنیا کے مختلف ادب کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے الگ اور دور ہونے کے باوجود کن کن ممالک کے شعروادب کے کون کون سے گوشے اتصال اور یگانگت کے رشتے میں منسلک ہیں۔ ان میں کتنی مماثلیں ہیں اور ان قربتوں میں دوریوں کے کتنے پہلو ہیں۔

دنیا کے کسی ایک علاقے کی ادبی تاریخ کو بھی پچاس، ساٹھ، سو صفحات میں سمیٹنا مشکل ہی نہیں محال ہے۔ لیکن وہاب اشرفی نے پورے سمندر کو نہ سہی، سمندر کے ایک حصے کو کوزے میں بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انسانی جذبات کی نوعیت ہر ملک میں یکساں ہے۔ محبت، نفرت، وفا، بے وفائی، ہمدردی، ظلم، صلح و جنگ، فتح و شکست، رنج و غم — یہ سارے موضوعات ادبی تخلیقی سرگرمیوں کے محرک رہتے ہیں۔ لیکن ہر ملک کا لکھنے والا اپنی زمین کی بوباس سے بھی اپنے مشام ادب کو معطر رکھتا ہے۔ میں ہمیشہ اس بات کا قائل رہا ہوں کہ ہم اردو والوں کو دوسرے ممالک کے تجربے سے اور اس کے سود و زیاں سے استفادہ کرنا چاہئے بڑا ادب پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم دوسروں کے ادب کی ہواؤں میں بھی سانس لیں۔ ہمیں اپنی اجتماعی اور اخلاقی سرحدوں کو وسعت دینی چاہئے، ایسے ادب کو انسانی تہذیب کا حصہ بنانے کے لئے جغرافیائی حد بندیوں سے اوپر اٹھنا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر وہاب اشرفی کی "تاریخ ادبیات عالم" کا مطالعہ ہمیں کئی طرح سے فیضان پہنچا سکتا ہے۔ یہ کتاب ان سوالوں تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے کہ مشرق اور مغرب کے ادب کا فرق کیا محض سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کا فرق ہے؟ یا کیا اس کا تعلق محض ادبی مذاق سے ہے؟ یا حقیقت تک رسائی کے لئے دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔

ہر ملک کی اپنی کچھ مخصوص اخلاقی اور تہذیبی قدریں ہوتی ہیں جو شعروادب اور فنون لطیفہ کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، کسی ملک کی ادبیات کی تاریخ سے وہاں کے لوگوں کی فکر کے دھاروں، ان کے ادبی مذاق اور زندگی کی بابت ان کے رویوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ادب اور ادبی تاریخ کو ایک کل کی حیثیت سے دیکھنے کا عمل ہمیں وہاب اشرفی کے یہاں نظر آتا ہے ہر چند جغرافیائی، نسلی، طبعی اختلافات و تضادات نے دوریاں بھی پیدا کی ہیں، لیکن ان کے باوجود بہت سے معاملات میں انسان ایک ہی طرح سوچتا رہا ہے بہت سی آفاقی سچائیاں ہیں جو قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ "تاریخ ادبیات عالم" انہی سچائیوں کی بازیافت کی ایک مستحسن کوشش ہے!

● شہریار

شہریار اس دور کے ایک نہایت بالغ نظر شاعر ہیں، جو زندگی کی آرزوؤں اور امنگوں اور ان کی ناکامیوں اور محرومیوں دونوں کا یکساں ادراک رکھتے ہیں۔ روحانی قربتوں اور فاصلوں کا ایسا حسین

اظہار شہریار کے علاوہ اردو کی نئی شاعری میں کم کم ہی ملے گا۔ اگر خواب کا ذرہ بھی ہو تو وہ دیواروں میں کھڑکی کی روزن نکال لیتے ہیں اور اپنی نیند کی کرچیاں بھی سنبھال کر رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری اس سمندر کی طرح ہے جو اوپر اوپر پرسکون دکھائی دیتا ہے، لیکن جس کی گہرائیاں پرشور طوفان کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کے زندہ اور تازہ موضوعات ہمارے عہد کی معنویت کو اجاگر کرتے ہیں۔

شہریار زبان کے تخلیقی استعمال کا ہنر جانتے ہیں۔ اس لئے ان کے برتے ہوئے لفظوں میں ایک خاص طرح کی چمک پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی شاعری نیز شعور اور تجربے کی علامتی مصوری کے باوصف کہیں اجنبیت کا احساس نہیں دلاتی۔

شہریار کو بھیڑ سے الگ رہ کر قدم نے اور قدم نے کا حوصلہ اپنی شعر گوئی کے آغاز سے ہی تھا۔ اور اپنی چالیس سالہ مشق سخن کے باوجود ان کی تخلیقی توانائی آج بھی اسی طرح برقرار ہے۔

● عروج زیدی : زندہ کتبے

عروج زیدی کی شاعری فنی استقامت اور فکری صلابت کی تابندہ مثال ہے۔ زندگی کے تجربات اور حادثات کا پراثر اظہار ان کے کلام میں ہوا ہے۔ ان کے اشعار میں دل گداختگی اور بے ساختگی اور لہجے میں ایک خاص شائستگی اور دلنوازی ہے۔ مگر وہ نثر کے بھی مزاج داں ہیں۔ جناب عروج زیدی کی کتاب "زندہ کتبے" کو میں ایک وقیع تصنیف شمار کرتا ہوں۔ جن شخصیتوں پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے، ان کے کردار کی تمام خوبیوں کو شگفتہ دلچسپ انداز میں [illegible] دونوں نثر کے ذریعہ کمال خوبی سے [illegible] ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ ہمارے یہاں اردو میں لکھنے والے بہت ہیں، لیکن اردو لکھنے والے خال خال ہیں۔ عروج زیدی جیسی اردو لکھنے والے اب باقیات الصالحات میں ہیں۔

(یہ نوٹ مرحوم کی زندگی میں لکھا گیا تھا)

● ہمت رائے شرما: شہاب ثاقب

"شہاب ثاقب" ایک ایسے شاعر کا مجموعہ کلام ہے جس کی آنکھیں گرد و پیش کے احوال کو اچھی طرح دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ہمت رائے شرما نہ صرف لہجے کے اعتبار سے پختہ کار ہیں، بلکہ وہ زندگی کی رنگا رنگی اور بوقلمونی کا براہ راست تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ عہد شناسی اور حالات فہمی نے انہیں دردمندانہ احساس بخشا ہے جو مجروح دل کی ترجمانی کرنے پر قادر ہے۔ ہمت رائے شرما کے یہاں جذبۂ احساس کی ترتیب و ترسیل کے سلسلے میں نیاپن اور تازگی ملتی ہے۔ ان کا کلام فنی اسقام سے پاک، غیر پیچیدہ اور روایت چشیدہ ہے۔

● نور جہاں ثروت : بے نام شجر

"بے نام شجر" ایک ایسی شاعرہ کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جسے جذبات پر بھی قابو ہے اور زبان و بیان پر بھی، لیکن جس نے اپنے تجربات، محسوسات اور مشاہدات کے بے محابا اظہار میں کسی روورعایت سے کام نہیں لیا ہے۔ مجھے اس مجموعے میں سچی شاعری کے نمونے نظر آئے اور اس کے مطالعے سے شاعرہ کے جینوئن (genuine) ہونے کا

بقیہ صفحہ

شرر غازیپوری

(قسط ۱۲)

رباب آتش

زمیں کھا گئی ....

یہ اس وقت کی بات ہے جب مادرِ ہند کے پاؤں میں غلامی کی آہنی زنجیر روحِ ہندوستان کو گھائل کر رہی تھی. فرنگی بربریت اور جارحیت آزدہے کی طرح منہ کھولے ہماری غیرت وخودی کو نگل رہی تھی. ہمارے اذہان اور ہمارے تفکرات پر جبر کے سخت پہرے بٹھا دیئے گئے تھے. ہماری زبانوں کو برطانوی حکومت کے نادر شاہی اور چنگیزی رویئے نے سنسر کی قینچی کا خوف دیگر بند کرا دیا تھا. ہم سے ہمارے لوح و قلم چھین لئے گئے تھے. پھر بھی ان نامساعد حالات کے نیزوں کے سائے تلے کچھ جیالے، کچھ شخصیتیں ایسی بھی تھیں جنہوں نے اپنی انگلیاں لہو میں ڈبولی تھیں جن کی بے خوف تحریکیں جنگِ آزادی کی لو بڑھا رہی تھیں. جنگِ آزادی کو لبیک کہنے والے جوانمردوں سے اندمان کی دھرتی آباد ہو چکی تھی.

انھیں جوانمردوں کے شریکِ حال تھا،

شیر علی. جس کی رگوں میں پنجابی خون دوڑ رہا تھا. عمر قید سے عہد وفا کر لینے والا وہ نوجوان قیدی ہوپ ٹاؤن (پورٹ بلیر) میں دامنِ ہیریٹ میں ایک شکستہ بیرک میں اپنی سانسوں کو یہاں کی فضاؤں میں ایک ایک کر کے چھوڑ رہا تھا. جو بعد ایک خونچکاں مگر قابلِ تحسین و داد کہانی کا مرکزی کردار بنا. جس دن کہانی نے جنم لیا اس سے دو روز قبل اسکو پٹیالہ (پنجاب) سے اس کی ماں کا آخری خط ملا. جسے پڑھ کر اسکے سینے میں انتقام کا ایک شعلہ جوالامکھی بن جانے کے لئے بیتاب ہو گیا اور باہر نکل کر پل بھر میں برطانوی ایوانوں کو بھسم کر دینے کے لئے مچلنے لگا. اس کی رگوں میں دوڑتا ہوا لہو آتش فشاں کا ابلتا ہوا لاوا بن گیا. وہ گھائل ناگ بن گیا اس نے طے کر لیا اس کا کاٹا پانی نہیں مانگے گا. ماں کے خط نے سوئے ہوئے شیر کو جگا دیا تھا. اب اس کے آہنی پنجوں سے اس کے شکار کے بچ جانے کی قطعی گنجائش

نہیں کتی ضد کچھ اسی مفہوم کا تھا۔

عزیزی شیر!

میری دعاؤں اور اثر کے مابین دشمنی کا سلسلہ
نہ جانے کب سے ہے پھر بھی میں رحمتِ خداوندی کی منکر
نہیں اس لئے میری نیک دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔
بیٹے شیر علی! وہ دن تو تمہیں یاد ہی ہوگا جس
دن فرنگی سرکار نے تمہارے باپ کو اپنی بہیمانہ سازش
میں جکڑا۔ اس لئے کہ تمہارا باپ اپنی دھرتی کو فرنگیوں
کے ناپاک قدموں سے نجات دلانے کا حامی تھا۔ وہ بھارت
ماں کی گردن میں پڑا ہوا غلامی کے طوق کو ریزہ ریزہ کر دینا
چاہتا تھا۔ وہ دیس کا سچا پوت تھا۔ اس کا دل حب وطن
کی شراب سے چھلکتا ہوا جام تھا۔ فرنگیوں کو اس سے
پرخاش تھی۔ لہٰذا اس کے خلاف سازش قتل رچی گئی۔
فرنگیوں کی یزیدی عدالت نے جھوٹی گواہی پر اسے قاتل
ٹھہرا دیا اور وہ پھانسی کے تختے سے ابدی پیمان وفا باندھ
لیا۔

میری مانگ کا سیندور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر
ہواؤں میں بکھر گیا۔
میری چوڑیوں کی کھنک گونگی ہو گئی۔
میری مانگ بے نور ہو گئی
میری کلائی سونی ہو گئی
میں نے اپنے دو بیٹوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر
اپنے آنسوؤں کو کفن پہنا دیا۔
لیکن جب تم دونوں بھائی جوانی کی حد میں
داخل ہوئے تو
میں تمہارے جذباتی ارادوں پر انکش نہ لگا سکی

تمہارے ضمیر کو تھپکی دیکر سلا نہ سکی۔
تمہاری غیور فطرت کو بزدلی کا لبادہ اوڑھا
نہ سکی۔
اور تم دونوں بھائی اپنی بندوقیں لے کر
نکل پڑے ضمیر فروش جھوٹے گواہ (جعفر)
کی تلاش میں
نہ جانے کہاں کہاں بھٹکے۔
کس کس کے دروازے کھٹکھٹائے۔
نہ جانے کتنے آگ کے دریاؤں کو پار کئے
آخر کش وہ ملحد تمہیں دستیاب ہو ہی گیا۔
اور تمہارے بڑے بھائی نے
اس نابکار کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا ہی دیا۔
خون کے بدلے خون سے لے لیا۔
تم دونوں پکڑے گئے
پھر فرنگیوں کی عدالت نے قانون کے ترازو
میں تولا۔
بڑے بھائی نے ہنستے ہنستے پھانسی کے پھندے
سے یارانہ جوڑا۔
اور تمہیں ماں کی نظروں سے دور بہت دور
سات سمندر پار
کسی جزیرے میں پھینک دیا گیا
جسے کالا پانی کہتے ہیں
میری مانگ تو پہلے ہی اُجڑ گئی تھی
میری کوکھ بھی اُجڑ گئی
میں حصارِ تنہائی کی سنگی دیواروں میں چن دی
گئی۔

ظالم فرنگیوں نے میرے ہاتھوں میں کشکول
گدائی تھما دیا۔
لیکن میں نے گداگری کو اپنے پاؤں کی جوتیوں
پر رکھ لیا۔
میں سنیاسن بنی لیکن سنیاسن بنا
بازار سے گذری لیکن خریدار نہ بنی
میں نے خدا کو قتل نہیں کیا
تلوار کی دھار پر چلی
لیکن پانوؤں کو لہولہان نہ ہونے دیا
اپنے پانوؤں کی پائلوں کی جھنکار لوگوں کے
کانوں تک نہیں پہنچنے دیا۔
اپنے ضمیر کی چتا نہیں جلائی
میں گھونگھٹ میں جلتی رہی
گھونگھٹ کا سودا نہیں کیا
بھیڑ میں تھی لیکن کسی ہاتھ کو اپنے دوپٹے کی
طرف بڑھنے نہیں دیا۔
میری سوتی یا جاگتی آنکھوں میں کبھی کوئی پرایا
سپنا در نہیں پایا۔
چلچلاتی دھوپ کی چادر اپنے سر پر تانے زندگی
کا سفر طے کرتی رہی۔
سفر کا اکیلا پن ڈسنے چلا تو
اپنے پانوؤں کے آبلوں کو اپنا ہمسفر بنا لیا
بوقت شام اپنی دہلیز پر
اپنے سہاگ اور اپنے بیٹوں کے پانوؤں کے نشان
سے باتیں کرتی پیار کرتی سو جاتی، رات کی
کالی چادر سر سے پانوں تک تان کر

میں نے کسی کی صبح درخشاں سے روشنی کی بھیک
نہیں مانگی۔
اور نہ ہی
اپنی راتوں کے چیختے چلاتے سناٹوں سے
کوئی شکایت کی
ہمیشہ میرے ہونٹوں پر ایک شعر تھرکتا رہا ہے
اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے
اب تو زندگی کی آخری سرحد دو چار قدم اور رہ
گئی ہے۔ اب تو اس دنیا کو خدا حافظ کہنے والی
ہوں۔
آخر میں میں تمہیں آگاہ کر رہی ہوں کہ وہ فرنگی
ملعون لارڈ
جس نے میرے آکاش سے چاند ستارے
اس کنارے سے اس کنارے
نوچ لئے۔
میری خوشیوں کے حلقوم پر خنجر پھیرا
انڈمان کے دورے پر جا رہا ہے
ہو سکے تو اسے اس کی کالی کرتوتوں کی سزا دینا۔
اس فرعون کے لئے موسیٰ بن جانا
اس راون کے لئے رام بن کر اٹھنا
اس کے وجود کے در و دیوار ہلا دینا
ورنہ اس کے وجود سے
نہ جانے کتنے ہندوستانی گلستاں دھواں
دھواں ہو جائیں گے۔
لاکھوں مکاں مکیں کو ترس جائیں گے

لاکھوں بستیاں ویران ہو جائیں گی
لاکھوں کوکھیں بنجر ہو جائیں گی

گیتا میں لکھا ہے
باپ اور اتیاچار کو سنسار سے مٹانا ویر پرش
کا کرتبیہ ہوتا ہے:

قرآن کہتا ہے
اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے
ساتھ رہو۔ شیطان تمہارا دشمن ہے۔ اس
کا دشمن بن کر رہو۔

بیٹے!
جہاد اس جنگ کو کہتے ہیں جو حق کے لئے باطل کے
خلاف لڑی جائے۔ فساد اس جنگ کو کہتے ہیں
جو کرسی کے لئے اور اقتدار کے لئے لڑی جائے۔
یہ تھا ماں کا خط بیٹے کے نام جس نے بیٹے کے
جسم میں ایک بے مثال توانائی بھر دی۔ اس کے
دست بازو کو ایک نئی قوت عطا کر دی۔ شیر علی
نے عزم کیا۔

" ماں تمہارے دودھ کی قسم میں شیطان کو لاحول
کی تلوار سے ہلاک کروں گا۔ ابا اور بھیا کی طرح جام شہادت
نوش کروں گا۔ انشاء اللہ "

دو دن بعد فرنگی لارڈ بڑی آن بان کے ساتھ
جزیرۂ انڈمان میں وارد ہوا ماونٹ ہیریٹ (جو ہوپ
ٹاؤن میں ہے اور جزائر انڈمان و نیکوبار کی سب سے
اونچی دوسری پہاڑی ہے) پر اس کے استقبالیہ جشن
کا اہتمام ہوا تھا۔ مقررہ وقت پر وہ وہاں پہونچا
اپنے ماتحتوں اور گارڈوں کے نرغے میں۔ کئی اونچے عہدیدار

بھی اس کے ہمراہ تھے۔ بعد اختتام جشن جب وہ لوٹا۔
ہوپ ٹاؤن کی جیٹی پر اس کی موت شیر علی کے روپ میں
موجود تھی (شیر علی بگھی بیڑوں کے کھولنے باندھنے کی ڈیوٹی
سرانجام دیا کرتا تھا) جوں ہی فرنگی لارڈ اس کے قریب
پہونچا کھچاک کی آواز کے ساتھ شیر علی کی رامپوری
چھری اس کے سینے میں دل کے مقام پر پیوست ہو گئی۔
چاروں طرف حیرت و استعجاب کی چادر تن گئی۔ شیر علی
ہونٹوں پر فاتح مسکراہٹ لئے فرنگی لارڈ کے تڑپنے
کا تماشا کھڑے کھڑے دیکھتا رہا۔
اسے کی موت پسند نہ ہوئی۔ فرنگی لارڈ کی
روح اس کے جسم سے پرواز کر گئی۔ شیر علی گرفتار
کر لیا گیا۔ قانون نے موت کا فیصلہ صادر کیا۔ شیر علی
پابہ زنجیر وائپر جزیرہ پر لایا گیا۔ (وائپر ایک چھوٹا سا
جزیرہ ہے جو پورٹ بلیر سے دو ڈھائی کیلومیٹر دوری
پر واقع ہے۔ غیر آباد ہے۔ دو چار سرکاری ملازمین ناریل
اور سپاری کے باغیچوں کی پاسبانی پر معمور ہیں۔
وہیں سرکاری کوارٹرس میں رہتے ہیں۔ انگریزی دور حکومت
میں یہاں ایک پھانسی گھر بنا تھا جو آج کھنڈر میں تبدیل
ہو چکا ہے۔ صرف اس کی یاد باقی رہ گئی ہے۔ جو دیکھنے
والوں کے ذہن و دماغ اور احساسات پر غم و وحشت کی
سینکڑوں خراشیں کھینچ دیتی ہے۔

اس پھانسی گھر میں شیر علی نے مسکراتے ہوئے پھانسی
کے پھندے کو لبیک کہا۔ اپنی ماں کو دیا ہوا وعدہ نبھایا۔
دودھ کا حق ادا کر دیا۔ اپنے باپ اور بھائی کے خون ناحق
کا بدلہ لے لیا۔ اپنا نام بھی شہیدان وطن میں لکھوا لیا۔ اس
پر یہ دھرتی رہتی دنیا تک ناز فرماتی رہے گی۔ اور ہم سرد

کرشن موہن
دہلی

یہ دُھندلکے یہ خلش

کچھ منحنی لکیریں، کچھ ملگجے دھندلکے
کچھ نقش ہلکے ہلکے
ژولیدگی ہے طاری، دل گرد سے اٹا ہے
تقدیر نے مجھے کیوں کرب دروں دیا ہے
چھایا ہوا ہے مجھ پر
اک انتشار سنگین
گم ہو چکا ہے دل کا کیف و قرار رنگین
میرا شباب رعنا کیوں درد آشنا ہے
میں سوچتا رہا ہوں
ناخوف فکر و غم سے جیسے کہ اپنے دل کو میں نوچتا رہا ہوں
احساس کی خلش نے بے حال کر دیا ہے
پامال کر دیا ہے
اک وہ بھی تھا زمانہ جب آس کی پھبن تھی نظروں میں جلوہ افگن
اب یاس کی چبھن ہے، شام و سحر چلن ہے
اک مستقل تھکن ہے
گویا دلِ حزیں میں اٹکے ہوئے ہیں کانٹے
[illegible]

اب زندگی میں کوئی تابندگی نہیں ہے
چھائی ہوئی ہے ظلمت
اُمید و آرزو میں پائندگی نہیں ہے
ہے اضطراب دائم
یہ زندگی نہیں ہے۔

❖

غزلیں

صابر فخرالدین
بنگلور

دوستی دشمنی پہ ختم ہوئی
چاہ دل کی لگی پہ ختم ہوئی

رات آئی تو دن کی ساری خوشی
رات کی سرخوشی پہ ختم ہوئی

جب ہوئی خود سے آگہی تو خرد
میری دیوانگی پہ ختم ہوئی

رہبروؤں کی تلاش اور طلب
سوچ کی کجروی پہ ختم ہوئی

زندگی جس کا نام تھا صابر
موت کی آگہی پہ ختم ہوئی



لوگ تو آسمان دیکھیں گے
ہم زمیں کی اٹھان دیکھیں گے

رہ کے پر امن چھت کے نیچے لوگ
ٹوٹتا خاندان دیکھیں گے

کچھ پرندوں کے پر کتر کر وہ
ان کی اونچی اڑان دیکھیں گے

منزلوں سے پرے پہنچ کر ہم
منزلوں کی تکان دیکھیں گے

ہاتھ میں جب کمان آئے گی
باندھ کر اک نشان دیکھیں گے

سچ کی دنیا کو پھاند کر صابر
جھوٹ کی آن بان دیکھیں گے



غزلیں

شباب للت

۹۔ ہائیڈے دلی، چوڑا میدان۔ شملہ ۱۷۱۰۰۴

ہر سفر میں بن کے میری رہنما چلتی رہی
آگے آگے میرے پرکھوں کی دعا چلتی رہی

جاں گسل تھا گو بہت ہی راستا چلتی رہی
ہم قدم میرے کوئی جانِ وفا چلتی رہی

پا گئے قاتل تو دامانِ سیاست میں پناہ
بے گناہوں پر مگر تیغِ جفا چلتی رہی

نغمگی چھائی تھی ہر سو تم رفیقِ شب تھے جب
باندھ کر پازیب پیروں میں ہوا چلتی رہی

وہ گیا تو وادیِ قلب و نظر میں دور تک
ایک پرچھائیں سی بے آواز پا چلتی رہی

حلقۂ گرداب سے نکلی نہ تب تک دل کی ناؤ
زیرِ دریا جب تلک موجِ انا چلتی رہی

زندگی کو آپ کی تقلید راس آئی مگر
احتیاطاً رکھ کے تھوڑا فاصلا چلتی رہی

معجزہ سمجھو کہ اپنا آشیانہ بچ گیا
ورنہ شب بھر تیز طوفانی ہوا چلتی رہی

آپ سے اک موڑ پر پھر بھی تصادم ہو گیا
زندگی تو بچ بچا کر راستا چلتی رہی

دشتِ تنہائی کی ظلمت میں مری آوارگی
لے کے تیری یاد کا روشن دیا چلتی رہی

راہِ منزل سے نہ بھٹکے گی نئی پیڑھی شباب
دیکھ کر جب تک ہمارے نقشِ پا چلتی رہی

کرشن پرویز

کھرڑ (روپڑ) ۱۴۰۳۰۱

وہ بھی خاموش تھا بس بتوں کی طرح
منہ کو کھولے ہوئے سیپیوں کی طرح

بھیڑ کچھ دیر تھی حادثہ جب ہوا
لوگ پھر چھٹ گئے بادلوں کی طرح

کیوں نہ مل پائیں گے؟ دو کنارے نہیں
ہم تو مل جائیں گے پانیوں کی طرح

غم کے ویران جنگل میں دل کا دیا
ٹمٹماتا رہا جگنوؤں کی طرح

اور کچھ بھی تقاضہ نہیں آپ سے
صرف ملتے رہیں دوستوں کی طرح

دوست احباب کیا جو تھے ہم کو عزیز
سب بدلتے رہے موسموں کی طرح

مل نہ پایا کہیں ان کا نام و نشاں
جن کو چاہا کبھی پاگلوں کی طرح

دو لکیروں کے باقی نشاں رہ گئے
بہہ گئے رخ پہ جب آنسوؤں کی طرح

سنگ دل جن کو پرویز سمجھے تھے ہم
نرم نازک تھا وہ تو پروں کی طرح

ساقی مچھلی شہری

غزلیں

وہ معتبر ہو کہ نامعتبر نہیں آیا
پڑا جو وقت کبھی کوئی نظر نہیں آیا
تمام عمر رہا جس کا انتظار مجھے
وہ ایک لمحۂ خوشی کا ادھر نہیں آیا
زمانہ جینے سے مصروفِ خواب ہے شاید
مری فغاں میں ابھی تک اثر نہیں آیا
نہ کھل سکا مرے سینے میں آرزو کا کنول
کہ اب کے موسمِ گل جوش پر نہیں آیا
وطن پہ جان لٹانے کی آرزو تھی بہت
تمام عمر میں وہ دن مگر نہیں آیا
نہ جانے کیسی کشش ہے زمیں کے اندر
کہ جو گیا وہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا
حیات جینے سے ہم بھی گزار دیں ساقی
ہمارے ہاتھ کبھی اتنا زر نہیں آیا



جگنو کو جمالِ مہ و اختر نہ ملے گا
اک بوند کے پیاسے کو سمندر نہ ملے گا
قیمت جسے معلوم ہے خود اپنی انا کی
وہ تخت نشینوں سے کبھی جھک کر نہ ملے گا
ملنا ہے اگر اس سے تو جا ڈوب جا اس میں
اندر وہ ملے گا، تجھے باہر نہ ملے گا
ہر آن تجھے قتل تو وہ کرتے رہیں گے
لیکن کفِ احباب میں خنجر نہ ملے گا
اس دور کے انسان کو جتنا بھی ٹٹولو
گردن کبھی مل جائے مگر سر نہ ملے گا
ہے وادیٔ کشمیر سے کبھی بڑھ کے مرا دل
تم برف یہاں پاؤ گے پتھر نہ ملے گا
سوچا ہے کہ ہم خود ہی کبھی ڈھونڈ کے دیکھیں
سنتے ہیں کہ ساقی سا سخنور نہ ملے گا



آس پانے کی، اپنا کھونے تک
بات چلتی رہتی ہے ایسا ہونے تک
اپنی بربادیاں [illegible] کیسے
ہم [illegible] نے تک
رات [illegible] ہے جتنی ہو
عمر اس کی ہے صبح ہونے تک
خود سری ہی نہیں تو یہ کیا ہے
پھل کی امید بیج بونے تک
سرکشی کبھی عزیز ہوتی ہے
عمر بچوں کی پختہ ہونے تک
دورِ حاضر میں رہ گئے ساقی
ہم مسلمان چادر ڈھونے تک

غزلیں

راز اعظمی، ایڈیٹر
"نئے زاویئے" گورکھپور

میں ہوں خود فصلِ گل کا نشا نہیں ہوں
لٹا بیٹھوں چمن ایسا نہیں ہوں

ستمگاروں کی بستی پھونک دیتا
میں شبنم ہوں کوئی شعلہ نہیں ہوں

خدا تو ہر جگہ ہے ساتھ میرے
تمہارے شہر میں تنہا نہیں ہوں

مرے ہمراہ ہیں ماں کی دعائیں
حوادث سے کبھی ہارا نہیں ہوں

میرا ابھی تو نہیں اے ہم نشینو!
بلا سے میں اگر اچھا نہیں ہوں

مرے احباب کو ہے راز حیرت
زمانے کی طرح بدلا نہیں ہوں

••

انیس الحق انیسی
مخصوص پور، گرہ کچہری، چمپا نگر، بھاگلپور

تو مت کسی بشر میں کوئی شر تلاش کر
ہر آدمی میں حسن کا جوہر تلاش کر

دو دن کی زندگی ہے گذر نے دے چین سے
اے شعلۂ فتن نہ مرا گھر تلاش کر

جس دَر کے بعد پھر نہ کسی دَر پہ سر جھکے
اک ایسا سر خمی کے لیے دَر تلاش کر

دیر و حرم نہ صرف کلیسا میں جا کے ڈھونڈ
اس کو تو اپنے دل کے بھی اندر تلاش کر

اسباب شرط ہے یہاں دار السبب ہے یہ
تو اپنا رزق گھر سے نکل کر تلاش کر

الفاظ کے معانی کی گہرائیوں میں ڈوب
شاعر ہے تو تو فکر کا منظر تلاش کر

کیوں کھو رہا ہے وقت کو ساحل پہ اے انیسؔ
دریا کی تہہ میں ڈوب کے گوہر تلاش کر

••

غزلیں

اظہر نیر
بریولیا۔ نوری اردو اکیڈمی، واپا کالونی سری، دربھنگہ

وسیلے سبھی پیار کے کٹ گئے
بہت سارے خانوں میں ہم بٹ گئے

کسی نے جو سچ کا سہارا لیا
اسی بات پر کتنے سر کٹ گئے

اچانک زمیں پر پرندے گرے
ہواؤں کے چلتے ہی پر کٹ گئے

جہاں آمنا سامنا ہو گیا
شکایت کے بادل وہیں چھٹ گئے

وہ آئے تو روشن ہوئے بام و در
اندھیرے جو تھے خود بخود چھٹ گئے

میں اظہر ذرا سا جو اونچا ہوا
یہ احباب کے میرے قد گھٹ گئے

٭

اندر بھٹناگر نکہت
۸-۶/۶ سیکٹر ۱۶، روہنی، دہلی ۱۱۰۰۸۵

بدن کو چھوڑ کے بن جاؤں گا دھواں یارو
مجھے تلاش کرو گے کہاں کہاں یارو

ابھی تو جاگ رہے ہیں دیئے جھروکوں میں
ابھی تو رات کے باقی ہیں کچھ نشاں یارو

مجھے کھنڈر ہی سمجھ لو جنوں کے محلوں کا
مرا وجود ہے اک ایسی داستاں یارو

اسے دلوں کی طرح کون توڑ سکتا ہے
سمے سراب ہے اور وہ بھی بے کراں یارو

ہمارے ساتھ چلا ہے قدم قدم یہ بھی
ہمارے غم کی طرح ہے یہ آسماں یارو
ہر ایک دھن کی جبیں سے لہو ٹپکتا ہے
یہاں تو بول بھی سانسوں پہ ہے گراں یارو
مری رگوں میں یہ رہ رہ کے جھانکتے کیا ہو

مرے وجود میں کچھ بھی نہیں نہاں یارو
یہ کیسا شور ہے نکہت جو میرے پیچھے ہے
میں اپنے آپ کو سمجھا تھا رائیگاں یارو

• بنگالی کہانی .. ستیہ جیت رے
• مترجم .. رام پرکاش راہی

لاکھ پتی

اسے غصہ آرہا تھا۔ تنگ آکر آخر اس نے بہرے کو بلانے کے لئے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ کچھ دیر سے اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا کمپارٹمنٹ اتنا ٹھنڈا نہ تھا جتنا ہونا چاہئے تھا۔ پھر بھی اسے تعجب ہوا کہ دوسرے تین مسافر خراٹے لے رہے تھے۔ ترتیب بابو سمجھ نہ پایا کہ ایسا کیوں تھا۔ بیشک بنیادی مسئلہ یہی تھا کہ ریلوے والوں کی بے انصافی کے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ گویا یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی کہ سب لوگ کھٹے میں پڑے ہوئے تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی

آجایئے، اندر

دروازے کا کواڑ ایک طرف ہٹا اور ایک بہرہ وارد ہوا۔

" کمرے کا درجۂ حرارت کیا ہے ؟" تردیب بابو نے زور سے سوال کیا۔

" سر، مجھے معلوم نہیں "

" کیوں ؟ " تم کیوں نہیں جانتے ؟ آخر کیوں ائیر کنڈیشنڈ ڈبے میں بکنگ کرائے اور پھر بھی گرمی تڑپے کیا اس بارے میں تمہاری کوئی ذمہ داری ہے ؟

بہرہ کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ بیوقوفوں کی طرح سکتے ہوئے دیکھتا ہی رہ گیا۔

تردیب بابو کی آواز سے اوپر کے برتھ پر سویا مدراسی بابو جاگ گیا۔ ایسے میں تردیب بابو کو اپنا غصہ پینا ہی پڑا۔

" تم جا سکتے ہو، لیکن صبح ٹھیک ساڑھے چھ بجے میرے لئے چائے کا ایک پیالہ ضرور لے آنا۔"

" بہت اچھا سر! "

بہرہ چلا گیا۔ تردیب بابو نے دروازہ بند کیا اور بستر پر لیٹ گئے۔ اسے ایسی دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا اگر وہ ہوائی جہاز سے سفر کرتا۔ اس جیسے شخص کو تو کلکتہ سے رانچی جیسی جگہ تک جانے کے لئے عام طور سے ہوائی سفر ہی کرنا چاہئے تھا۔ لیکن تردیب بابو کے دل میں ہوائی سفر کے بارے میں ایک خوف سمایا ہوا تھا۔ بارہ سال

پہلے اسے بمبئی تک ہوائی سفر کرنا پڑا تھا۔ یہ اس کے لئے ایک ہولناک تجربہ تھا۔ اس دن موسم بڑا خراب تھا۔ ہوائی جہاز کے اڑان بھرتے ہی جو جھٹکے شروع ہوئے تھے وہ ہوائی اڈے پر اترنے تک بدستور رہے تھے۔ تردیب بابو نے اس دن سے قسم کھائی تھی کہ وہ آئندہ ہوائی جہاز میں سفر نہیں کرے گا۔ اس موقع پر جب اسے رانچی جانا پڑا تو اس نے رانچی ایکسپریس میں بکنگ کرائی تھی۔ لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ ایئر کنڈیشنڈ ڈبے میں بھی آسائش کا خیال چھوڑنا پڑے گا۔ اس تاریک کمرے میں تردیب بابو نے آنکھیں بند کیں اور اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔

اسے بچپن کی یادیں آنے لگیں۔ رانچی میں ہی اس کا جنم ہوا تھا۔ اس کا باپ آدی ناتھ چودھری ایک مشہور ڈاکٹر تھا۔ اسکول کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد تردیب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کلکتہ چلا گیا تھا وہاں اس نے چچا کے گھر رہائش اختیار کی اور پڑھتے پڑھتے گریجویٹ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ایک مارواڑی دوست نے اسے اپنا کاروبار شروع کرنے کا مشورہ دیا۔ آغاز ذرا سا تھا۔ بچی کھچی دھاتوں کی خرید و فروخت نے اسے بتایا کہ قسمت کی دیوی یقیناً اس پر مہربان ہونے والی ہے۔ پیسہ دھڑا دھڑ آنے لگا۔ وہ کلکتہ میں مقیم رہا اگرچہ اس کے والدین رانچی میں ہی رہتے تھے۔

پہلے پہل اس نے سردار شنکر روڈ پر ایک فلیٹ لے لیا۔ آمدنی بڑھنے لگی تو ہیر بگشتی روڈ پر ایک دو منزلہ مکان لے لیا۔ والدین سے اس کا لگاؤ برابر رہا وہ سال میں ایک بار رانچی جا کر ماں باپ کے ساتھ کم سے کم ایک ہفتہ ضرور گزارتا۔ والدین کے کہنے پر ۲۶ سال کی عمر میں اس نے شادی کر لی دو ایک سال بعد اس کے ایک لڑکا ہوا جو ان دنوں امریکہ میں زیر تعلیم تھا۔ تردیب بابو کے اور کوئی اولاد نہ تھی۔ تین سال پیشتر اس کی بیوی سورگ باشی ہو گئی تھی۔ ۱۹۷۲ء میں اس کی ماں اور ۱۹۷۶ء میں اس کا باپ بھی چل بسے۔ رانچی والا مکان ایک نوکر اور ایک مالی کی دیکھ بھال میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ تردیب بابو ان دونوں کو دس سال سے باقاعدہ تنخواہ دیتا آ رہا تھا۔ مکان کو اپنے پاس رکھنے کا مدعا یہی تھا کہ کبھی کبھی وہاں جا کر چند دنوں کے لئے آرام کر لیا جائے لیکن اس کی زندگی اس قدر مصروف تھی کہ اسے وہاں جانے کا موقعہ شاذ و نادر ہی ملتا تھا۔ اور یہ بھی ایک اڑچن تھی کہ وہاں تین دن کے لئے جانا بھی کم از کم پانچ ہزار روپے کا نقصان اٹھانے کے برابر تھا۔ جس شخص کا مشغلہ صرف یہی تھا کہ زندگی بھر پیسہ کمایا جائے۔ اس کے لئے تعطیل کر کے لطف اٹھانے کا سوال ہی نہ تھا۔ آج تردیب ایک لاکھ پتی تھا اور اس اعتقاد کی تردید کا زندہ ثبوت کہ بنگالی لوگ تجارتی کاروبار میں ترقی نہیں کر سکتے۔

اب کے اس کا رانچی جانا بھی ایک بیوپاری سلسلے میں تھا۔ وہاں لاکھ کے کاروبار میں بڑے امکانات تھے۔ تردیب بابو ان امکانات کی کھوج کرنے جا رہا تھا۔ اس کا ارادہ اپنے مکان ہی میں رہنے کا تھا اور اس کا خیال تھا کہ دو دن میں ہی وہ اپنا کام ختم کرے گا اس نے پرشانت سرکار کو یہ خط لکھا تھا کہ وہ اس کے نوکر کو کہہ کر سارا اہتمام کروا لے۔ وہ تردیب کا بچپن کا دوست تھا۔ اور ان دنوں رانچی کا ایک مشنری اسکول میں پڑھا تھا۔ یہ کوئی باقاعدہ رسم و راہ کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی ترد

بالو جانتا تھا کہ اگر وہ پرشانت سے کہے گا تو وہ ضرور
اپنے پرانے دوست کا کام کروا دے گا۔

تردیب بالو کا دماغ ایک خیال سے دوسرے خیال
کی طرف چلتا گیا۔ اسے کب نیند آگئی کہہ نہیں سکتا تھا
اور نہ ہی اسے یہ احساس ہوا کہ نیند میں بھی وہ دوسرے
مسافروں کے ساتھ خراٹوں کی راگنی میں برابر
کا شریک ہو گیا تھا۔

رانچی ایکسپریس کے پہنچنے کا ٹھیک وقت صبح سوا
سات بجے تھا۔ پرشانت سرکار اپنے دوست کا استقبال
کرنے کے لئے دس منٹ پیشتر ہی اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ وہ اسکول
کے دنوں تردیب عرف مونٹو، کے بہت قریب رہا تھا۔
تردیب کے کلکتہ چلے جانے کے بعد بھی ان کی آپس میں خط و
کتابت باقاعدہ رہی تھی۔ لیکن کالج چھوڑنے کے فوراً بعد
ان کی رسم و راہ کم ہونے لگی۔ اس کا الزام زیادہ تر تردیب
پر ہی عائد ہوتا تھا۔ جب کبھی وہ ماں باپ سے ملنے کے
لئے آتا پرشانت کو اطلاع تک نہ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ
وہ اکثر بات جیت کرنے کو ہل ۔ پرشانت اول تو
یہ سمجھ ہی نہ پاتا کہ اس کے دوست کے مزاج میں اتنی تبدیلی
کیوں آگئی۔ بعد میں اسے اخباروں کے ذریعے سے یہ
معلوم ہوا کہ تردیب ایک اہم بیوپاری بن گیا ہے۔ لہٰذا
وہ پرشانت کی پہنچ سے باہر تھا۔ وہ تو ایک الگ طبقے
کا آدمی ہو گیا تھا۔ یہ بات تو اس چھوٹے سے خط کے خشک
اور عامیانہ لہجے سے ظاہر ہو گئی تھی جو تردیب نے اسے
لکھا تھا۔

اپنے دوست کے مزاج میں اتنی تبدیلی دیکھ کر پرشانت
بالو اداس ہو گیا۔ آج کا لاکھ پتی ٹی۔ چودھری واقعی
اس کھلنڈرے مونٹو سے بالکل مختلف تھا جو کبھی پہلے
نہ تھا۔ کیا لوگ وقت گزرنے پر بالکل بدل جاتے ہیں؟ یہ
حقیقت تھی کہ تردیب بالو کا مالی مرتبہ حیرت انگیز حد تک
بدل گیا تھا۔ لیکن پرشانت بالو ایسا آدمی نہیں تھا جو
لوگوں کو ان کے مال و دولت سے پہچانتے ہیں۔ اس کے
کردار کا یہ پہلو اسے اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملا
تھا۔ پرشانت کا باپ پرتھ سرکار گاندھی جی کے اصولوں
کا پیروکار تھا۔ پرشانت کی اپنی زندگی میں کوئی بڑی واردات
نہیں ہوئی تھی۔ آخر ایک اسکول ٹیچر کی زندگی میں نئے
نئے ہنگامے پیدا ہونے کی گنجائش ہی کم تھی۔ اس لئے
اب بھی اسے بچپن کے دنوں کا منٹو کہہ کر پکارا جا سکتا
تھا۔ لیکن کیا تردیب کے بارے میں بھی ایسا کہا جا سکتا
تھا؟ پرشانت اس کی اصلیت پر پہنچنے کا انتظار
کر رہا تھا۔ سوچنے لگا اگر تردیب دکھاوے کا پتلا
بن گیا ہے تو اس کے ساتھ گزر بسر مشکل ہو جائے گی۔

گاڑی دس منٹ لیٹ تھی۔ ادھر اس کا آنا تھوڑی
دیر کے لئے تھا۔ اس لئے تردیب بالو ایک سوٹ کیس اور
ایک فلاسک کے علاوہ اور کچھ نہیں لایا تھا۔ اس کے
منع کرنے پر بھی پرشانت بالو نے تردیب کے ہاتھ سے
سوٹ کیس لے لیا۔ پھر دونوں ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف
چل دیئے۔

• کیا تمہیں زیادہ دیر تو انتظار نہیں کرنا پڑا؟
تردیب چودھری نے کہا۔

" بس کوئی بیس منٹ "

" مجھے آپ کے اسٹیشن پر آنے کی توقع نہ تھی۔
کوئی خاص ضرورت ہی تو نہ تھی۔ آخر میں کوئی پہلی بار ر

آرہا تھا۔"

پرشانت بابو مسکرادیا اور بولا کچھ نہیں۔ دوست نے جو تکلف آمیز لہجہ اختیار کیا تھا اسے وہ ضرور بھانپ گیا۔

"کیا یہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے؟" تردیپ بابو نے پوچھا۔

"ہاں۔ تمام اہتمام ہوچکا ہے۔ تمہارا مالی اور چنتامنی دونوں اپنے مالک کے گھر واپس آنے کے بارے میں جان کر چہک چہک سے رہے ہیں۔"

چنتامنی وہاں باورچی اور چوکیدار کا کام کرتا تھا۔

کیا وہ گھر اب بھی رہنے کے قابل ہے یا بھوت بسیرا بنا ہوا ہے؟

پرشانت بابو پھر مسکرادیا۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد بولا۔

"اس کے بھوت بسیرا ہونے کے بارے میں تو میں یہ نہیں جانتا لیکن ایک بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک رات میں وہاں سے گزر رہا تھا کہ میں نے ایک لڑکے کو تمہارے باغیچے میں کھیلتے ہوئے دیکھا۔"

"ارے رات کو!"

ہاں۔ کافی دیر ہوچکی تھی۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں چونک اٹھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے جا سال کا مونٹو وہاں لوٹ آیا ہو۔"

"کچھ بھی ہو۔ یہ کوئی بھوت پریت کا سلسلہ نہیں ہوسکتا۔ میرے باپ نے یہ مکان بنوایا تھا جو لوگ یہاں رہے، یہاں مرے، میں سب کے بارے میں جانتا ہوں۔ میں تو زیادہ سے زیادہ یہ جانتا ہوں کہ کیا نوکروں نے مکان کو صاف ستھرا رکھا ہوا ہے؟"

"مکان بالکل بے داغ ہے۔ کل میں نے خود میں دیکھا تھا۔ اب تمہیں کیا کرنا ہے اور کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"آج دوپہر کے کھانے کے بعد مجھے "نام کن" جانا ہے۔ وہاں مجھے مہیشور جبین سے ملنا ہے جو لاکھ کا بیوپار کرتا ہے۔ ملاقات کا وقت اڑھائی بجے طے ہے۔"

"بہت اچھا، جو ٹیکسی ہم ابھی پکڑنے والے ہیں تم اسے ہی استعمال میں لاسکتے ہو۔ یہ کھانے کے بعد آجائے گی اور تمہیں نام کن لے جائے گی۔ وہاں پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔"

دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں پرشانت سرکار نے بات چھیڑی۔

"تم یہاں کب تک رہو گے"

"اگر میں آج جبین سے بات چیت پوری نہ کرسکا تو کل پھر اسے ملنا ہوگا۔ تب میں ایک دن ٹھیر کے کلکتہ واپس جاؤں گا۔"

"تم کافی بدل گئے ہو۔ تم سے بات کرنے میں تامل سا محسوس ہوتا ہے۔"

"جو کہنا ہے براہ راست کہو۔ ادھر ادھر کی ہانکنا ٹھیک نہیں۔ اگر لوگ ایسا کریں تو مجھے بدگمانی ہونے لگتی ہے۔"

"اصل میں کوئی بڑی بات نہیں۔ بس ایک گذارش

ہے۔ اگر تم ہاں کرو تو بچپن کا یہ دوست بہت شکر گذار ہوگا۔

" وہ کیا بات ہے ؟"

" تمہیں فادر ولیم تو یاد ہوگا !"

" ولیم ؟ وِلّی ۔ وہ سرخ داڑھی والا ؟"

" ہاں سرخ داڑھی ۔ لگ بھگ پانچ سال پہلے اس نے غریب بچوں کے لئے ایک اسکول کھولا تھا۔ ہر طرح کے بچے وہاں جاتے ہیں۔ چاہے وہ ہندو ہوں مسلمان ہوں، عیسائی ہوں۔ اس کو چلانے میں فادر ولیم نے بڑی محنت کی ہے۔ اس کی بڑی خواہش ہے کہ تم اس کے اسکول کو دیکھو آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ تم جاؤ گے تو اس کی بڑی حوصلہ افزائی ہوگی ؟"

" وہاں جانے سے تو یہ ہوگا کہ خیرات طلب کی جائے گی ؟"

" کیا مطلب ہے تمہارا ؟"

" اس بلاوے کی اصل وجہ کیا تم نہیں جانتے ؟ ایک نیا اسکول ہے۔ اسے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اور کوئی دولت مند شخص ہاتھ آجائے تو خیرات کا کشکول بھی حاضر کر دیا جاتا ہے۔ اگر مجھے اپنا روپیہ پیسہ خیرات میں ہی دینا ہے تو یہ کام میں بڑھاپے میں کروں گا جب اگلے جہان کی سوچ بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اب اس کا وقت نہیں۔ اب تو بچت کرنے کا وقت ہے۔ اگر پتہ چل جائے کہ میں پیار سے دینے والا ہوں تو مدد چاہنے کی ایسی درخواستوں کا کوئی انت ہی نہ ہوگا۔ اس لئے تم ایسی درخواست مت کرو۔ میں اس پر دھیان دینے کا نہیں۔ مجھے یقین ہے اگر تم فادر ولیم کو اس بارے میں بتاؤ گے تو وہ سمجھ جائے گا۔ اپنا کاروباری پروگرام پورا کرنے کے علاوہ میں کچھ آرام کرنا چاہتا ہوں جو مجھے کلکتہ میں زیادہ میسر نہیں آتا۔"

" بہت اچھا "

پرشانت کو اس روکھے جواب کی توقع نہ تھی۔ شاید یہ ایک قدرتی بات تھی۔ یہ شخص اب وہ مونٹو نہیں تھا۔ جسے کبھی وہ جانتا تھا۔ وہ اجنبی تھا۔

اس گھر کو دیکھ کر، جہاں وہ پیدا ہوا تھا، تردیب بابو میں ظاہری پن کم ہو گیا اور وہ خوش وخرم دکھائی دینے لگا۔ پرشانت کو ایک دوسری گزارش کرنے کا موقع مل گیا۔

" تم نے میری ایک تجویز تو نامنظور کر دی لیکن یہ بات تو نہیں ماننی پڑے گی۔ میری بیوی نے بڑی تاکید کے ساتھ کہا ہے کہ تمہیں رات کے کھانے کے لئے اپنے گھر لے جاؤں۔ ہم لوگ امیر تو نہیں ہیں لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے گھر میں کوئی بھی خیرات کا کشکول لے کر تمہارے آگے نہیں آئے گا۔"

تردیب بابو نے اس کی دعوت فوراً قبول کرلی۔ کیا یہ محض رحم وکرم سے تھا؟ پرشانت اس معاملے پر زیادہ غور نہیں کرنا چاہا۔ اسے بہت سے کام کرنے تھے۔ بازار سے ہو کر اسے گھر جانا تھا اور غسل کرنا تھا پھر کھانا کھا کر اسکول میں حاضری دینی تھی۔

جدا ہوتے ہوئے پرشانت بابو نے ترديب سے کہا۔ " میں آٹھ بجے کے قریب تمہیں خود لینے کے لئے آؤں گا اور وعدہ کرتا ہوں کہ دس بجے تک تمہیں واپس بھی چھوڑ جاؤں گا۔"

اس دن ایک بار پھر یہ ثابت ہو گیا کہ ترديب جو دھری کی غیر معمولی شخصیت اور پھرتی سے بات چیت کرنے کی صلاحیت ہی اس کی کامیابی کے لئے ذمہ دار تھیں۔ اس کے

رانچی آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے کاروبار میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہوا کیونکہ اب وہ لاکھوں کے بیوپار کو پروان چڑھانا چاہتا تھا۔ بے شک اس میں الجھنیں بھی تھیں لیکن مزید آمدنی کی صورت پیدا ہونے کے پیش نظر یہ الجھنیں بھی ہیچ سی لگتی تھیں۔

تردیب بابو شام کو پانچ بجے کے قریب گھر لوٹا جہاں چائے کا پیالہ اس کے لئے تیار تھا۔ پھر وہ مکان میں گھومنے لگا۔ ہر چیز کو دھیان سے دیکھا۔ یہیں وہ پیدا ہوا تھا۔ نچلی منزل ہی میں بیٹھک، کھانے کا کمرہ، مہمان خانہ اور کچن تھے۔ دوسری منزل پر سونے کے دو کمرے غسل خانہ اور مغرب کی طرف رخ کرتا ہوا بند برآمدہ تھا۔ سونے کا چھوٹا کمرہ اس کا اپنا تھا۔

کمرہ اسے اور بھی چھوٹا دکھائی دینے لگا۔ شاید اس لئے کہ جسمانی طور سے وہ بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے بستر کو غور سے دیکھا اور اسی کمرے میں سونے کا فیصلہ کیا۔ جیتا منی نے تو اسے ایکبار پہلے ہی کہا تھا لیکن اس وقت وہ فیصلہ نہ کر پایا تھا۔

اپنے دوست کے ساتھ روانہ ہونے کے پہلے اس نے نوکر کو بلایا اور اسے چھوٹے کمرے میں بستر لگا دینے کو کہا۔

پرشانت سرکار کی بیوی نہ صرف ایک سگھڑ عورت تھی بلکہ وہ کھانا تیار کرنے میں بھی بڑی ماہر تھی۔ رات کا کھانا بڑا کامیاب رہا۔ پرشانت بابو نے اپنے دوست کو اچھا کھلانے پلانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ گوشت اور مچھلی کے ایک سے زیادہ پکوان تھے۔ ان کے علاوہ پلاؤ، پوریاں اور مٹھائیاں بھی تھیں۔ تردیب بابو نے ہر چیز مزے مزے سے کھائی۔ لیکن کھانے کے بعد وہ دس منٹ سے زیادہ نہ ٹھہرا۔ پرشانت بابو کو اس سے یہ دریافت کرنے کا ذرا بھی موقعہ نہ ملا کہ اب سماج میں اس کی کیا پوزیشن ہے اور وہ وہاں تک کیونکر پہنچ گیا۔

تردیب بابو ساڑھے دس بجے اپنے گھر واپس آ گیا۔ اس کا مکان ایک کسی قدر خاموش علاقے میں تھا۔ جب وہ گھر پہنچا وہاں بالکل خاموشی تھی۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا اسے اپنے قدموں کی چاپ بھی غیر معمولی طور سے اونچی سنائی دینے لگی۔

اس کا بستر اسی کمرے میں لگا ہوا تھا جہاں اس نے بچپن گزارا تھا۔ کھانے کے بعد بھی سونے کا وقت نہیں تھا۔ تردیب نے برآمدے میں آرام کرسی میں بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔

ابھی آدھا گھنٹہ ہی نہیں ہوا تھا کہ اس کی تمام تھکاوٹ جا چکی تھی۔ اسے تازگی اور راحت کا احساس ہوا۔

آسمان میں پیلا پیلا چاند تھا جس کی روشنی میں وہ وہاں کے ایک ننگے پیڑ کی کالی کالی شاخیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے سانسوں تک کی آواز سن رہا تھا جیسے دھرتی پر صرف یہی ایک آواز رہ گئی ہو۔

کیا یہی ایک آواز تھی؟

نہیں کسی اور چیز کی آواز بھی اس میں شامل ہو گئی تھی۔ یہ آواز دھیمی تھی۔ پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ یہ کہاں سے آ رہی ہے۔

تردیب بابو نے اسے دھیان سے سنا۔ ایک چھوٹا سا لڑکا ایک گیت بول رہا تھا جو کہ ایک جانا پہچانا نرسری گیت تھا اور جسے تردیب فوراً تاڑ گیا۔ آواز اب بھی دھیمی تھی لیکن الفاظ صاف تھے یعنی!

بابا بلیک شیپ
ہیو یو اینی وول

اسے لگا جیسے یہ فقرے اس کے ذہن کے ایک
کونے میں دبکے پڑے تھے اور اس آواز نے انہیں یادوں کے
ڈھیرے سے باہر نکلنے پر مائل کر دیا تھا۔

وہ آواز اور بھی دھیمی ہو گئی۔ تردیب بابو اُٹھ
بیٹھا۔ اپنے پیچھے کی طرف دیکھنا فضول تھا۔ زندگی میں
مستقبل ہی کام کی چیز ہے، ماضی نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ
ابھی اسے اور بھی زیادہ دولت اکٹھی کرنی ہے۔ سماج
میں اور بھی ابھرنا ہے۔ اور کروڑپتی بننا ہے۔ ماضی کا تصور
انسان کو کمزور کر دیتا ہے جبکہ آئندہ کی سوچ اسے
نئی قوت دیتا ہے۔

وہ کمرے میں چلا گیا۔ بھویں تن گئیں۔ بجلی چلی گئی
تھی۔ بستر کے پاس رکھی میز پر ایک موم بتی جھلملا رہی
تھی۔ اس کی مدھم روشنی میں بھی وہ صاف دیکھ سکتا تھا
کہ بستر ٹھیک سے نہیں لگایا گیا۔ بستر کی چادر اور تکئے کے
غلاف میں سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے اسے سیدھا
کیا اور کرتا اتار دیا۔ بستر پر لیٹ گیا۔ ایسے میں موم بتی
کا جلنا کیا ضروری تھا پھونک مار کر اسے بجھا دیا —
بجھتے موم بتی کی تیکھی بدبو کچھ دیر تک کمرے میں بسی
رہی اور پھر چھٹ گئی۔ کھڑکی کھلی تھی جس میں سے
وہ آسمان دیکھ سکتا تھا۔ چاندنی زیادہ چمکیلی
لگ رہی تھی۔ جہاں وہ لیٹا تھا دروازہ اس کے
سامنے تھا اور وہ بھی کھلا تھا۔ برآمدے کا کچھ
حصہ اور سیڑھیاں دکھائی دے رہے تھے۔ سیڑھیوں
کی طرف دیکھنے کی کوئی اصل وجہ نہ تھی لیکن کچھ
ایسی چیز تھی جس کی وجہ سے ادھر دیکھنا ہی پڑا۔ اور
یہ تھی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ننگے پیروں کی عجیب
غریب آہٹ!

دراصل اوپر کوئی آیا نہیں اور آواز بھی زینے
کے بیچ میں گم ہو گئی۔ تردیب بابو اپنے آپ کو بیوقوف
سمجھنے لگا۔ یہ معاملہ سب اس کی سوچ کا ہی چکر
تھا۔ اس نے اپنے ذہن سے تمام فضول خیالات
نکال دیئے اور پختہ ارادے کے ساتھ آنکھیں موند
لیں۔ نیچے کھانے کے کمرے میں لٹکا ہوا جاپانی کلاک
گیارہ بجا رہا تھا۔ یہ کلاک تو بند ہو چکا تھا لیکن
آج صبح تردیب نے اسے چالو کر دیا تھا۔

آنکھیں بند کر لینے پر کبھی تردیب کو ایسی چیزیں
دکھائی دینے لگیں جیسی چھوٹی چھوٹی ٹوٹی ہوئی
تصویریں، ایک خواب کے الگ الگ ٹکڑے وغیرہ
اس کا خیال تھا کہ اسے جلد ہی نیند آجائے گی۔ جس
طرح راگی گانا شروع کرنے سے پہلے اپنے آپ میں
دھیرے دھیرے گنگنانے لگتا ہے۔ یہ ٹوٹے پھوٹے
خواب نیند آنے کا پتہ دیتے ہیں۔

لیکن وہ ابھی تک سو نہ پایا تھا۔ آنکھیں بند
ہونے کے باوجود اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ کوئی
اس کے کمرے میں داخل ہوا ہے۔ نہیں! یہ محض اس کی
چھٹی حس ہی نہ تھی۔ اس کے کان وہی چیز بتا رہے تھے۔
اسے واقعی کسی کے سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ ایسے
لگا جیسے کوئی سیڑھیوں کو پھلانگتے ہوئے آیا ہے اور کمرے
میں دم لے رہا ہے۔

تردیب بابو نے آنکھیں کھول دیں، اسے یقین

کے ساتھ کہ وہ اس شخص کو واقعی دیکھ سکے گا اور یہ کوئی اس کی نقول نہ تھی۔ دروازے میں ایک لڑکا کھڑا تھا جس نے اپنا دایاں دروازے کی کنڈی پر رکھا ہوا تھا اس کے بایاں پاؤں تھوڑا سا اٹھا ہوا تھا۔ گویا کسی دوسرے شخص کا کمرے میں ہونا اسے آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔

تردیب بابو کو ایسا محسوس ہوا جیسے ایک ٹھنڈی کپکپی اس کی ٹانگوں سے اوپر اٹھ کر ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی سر تک پہنچ رہی ہے! پرشانت نے بھی تو بتایا تھا کہ اس نے باغیچے میں ایک لڑکا دیکھا تھا چھوٹا سا.... اس کے بچپن کا مونٹو!!

اس کے ہاتھ پاؤں جم سے گئے۔ کنپٹی کی رگ دھک دھک کرنے لگی۔ اسے محسوس ہوا وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ بڑھتی ہوئی دہشت سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

لڑکا ایک قدم آگے بڑھا۔ اس کے کاسنی رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اوہ! یہ تو وہی قمیض ہے!! بے خیالی میں پہنچنے سے پہلے تردیب بابو نے میٹھی میٹھی چھوکروں جیسی آواز میں یہ سوال سنا۔ "میرے بستر میں کون سو رہا ہے؟"

تردیب بابو حسب معمول صبح ساڑھے چھ بجے جاگ اٹھا۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ رات کو کب اسے ہوش آیا اور کب اسے پھر سے نیند آگئی!

پرشانت نے کہا تھا کہ وہ ساڑھے سات بجے صبح تردیب کے ساتھ ناشتہ کرے گا۔ تردیب کے لئے اپنے حسب معمول کام کاج کی طرف دھیان دینا ناممکن ہو گیا۔ گئی رات جو کچھ ہوا تھا اس نے اسے جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اس کی زندگی میں پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔

وہ نرسری گیت جو اس نے پچھلی رات سنا تھا وہی تھا جو اس نے بچپن میں کلاس میں سنایا تھا اور انعام بھی حاصل کیا تھا۔ دوسرا انعام پرشانت کو ملا تھا جو اس کو اچھا نہ لگا تھا۔

"کیا خوب رہتا اگر ہم دونوں کو پہلا انعام مل جاتا؟" اس نے بڑے پیار سے اپنے دوست منٹو سے کہا تھا۔

گئی رات جو لڑکا اس کے کمرے میں آیا تھا اس کا چہرہ اس نے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ قمیض اس نے ضرور دیکھی تھی جو اس نے پہن رکھی تھی۔ یہ وہی کاسنی رنگ کی قمیض تھی جو اسے پھوپھی نے دی تھی۔ یہ تو اس کی من پسند قمیض تھی۔ جب وہ پہلی بار پہن کر اسکول گیا تھا تو منٹو نے کہا تھا "بھگوان بھلی کرے! ارے تم تو ایک یوروپی لڑکا لگ رہے ہو"

پچھلی رات کے واقعے کا مطلب صاف تھا۔ آج کا تردیب چودھری وہ مونٹو نہیں تھا جو کبھی ہوا کرتا تھا۔ وہ تو اس کا بھوت تھا جو اس رات آیا تھا اور اسے بتایا گیا تھا کہ نیا تردیب چودھری..... وہ لاکھ پتی.... ایک ناگوار بدبو تھا جسے برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔

تردیب نے رات کی واردات کے بارے میں پرشانت سے کچھ نہ کہا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ تردیب ابھی ذہنی تناؤ میں ہے اور پریشان ہے۔ شاید اسی وجہ سے تھوڑی دیر بعد پرشانت بول اٹھا: "کیا پریشانی ہے؟ کیا تم رات ٹھیک سے سو نہیں پائے؟"

"ارے نہیں! میرا مطلب ہے کہ میں نے اپنا سارا

کام ختم کر دیا ہے۔ کیا آج ہم فادر ولیم کے اسکول نہیں جا سکتے
"بہت عمدہ خیال ہے۔" پرشانت نے مسرت بھرے
لہجے میں کہا۔ لیکن اسے اپنی مسکراہٹ چھپانی ہی پڑی۔
اس کا منصوبہ بہت کامیاب رہا۔ واپسی پر اسے اپنے
پڑوسی کے گھر جانا ضروری تھا تاکہ اس کے بیٹے بالو کو
یہ بتا سکے کہ کئی رات اس کا نرسری گیت الاپنا اور اداکاری
کرنا بالکل مکمل ثابت ہوئے اور چنتامنی نے جو اس
معاملے میں جو رول ادا کیا تھا اس کے لئے اسے اچھی خاصی
ٹپ بھی دینی ہوگی۔

نسیم بن آسی
مغلسرائے

پھر سفر بے سمت ہوا

وہ جو کسی پیڑ کی چھاتی پر اگنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کبھی کبھی دیوار کے اندر، کھپریل میں منڈیر پر، اور کنوئیں کی جگت میں سے نکل آتا ہے۔ کچھ اس طرح جیسے اس کی تخلیق کے لئے ساری خوراک وہیں جمع ہے۔ لیکن اس کا پیپل ہمیشہ اس کے اندر اگتا رہا ہے۔ اس کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ کوئی آندھی یا طوفان بھی اسے وہاں سے ہٹا نہیں سکتا ہے۔ ایک کو لوگ باہر سے دیکھ سکتے ہیں، دوسرے کو نہیں۔ شاید اس لئے کہ اس کے پیپل کی زرخیزی اس کے اندر ہے۔ اور پہلے کی باہر۔ لیکن اسے کیا پتہ تھا بعد میں اس کی جڑیں اوپر ہوں گی اور پورا درخت اس کے اندر۔ جب کسی نے چاہا، اوپر ہی اوپر اڑا لیا۔۔۔۔

وہ چوراہے کے پاس آیا تو اسے وہی چہرے نظر آئے جن سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ یا تھا تو بس یوں ہی سا۔ وہاں کچھ لوگوں نے اسے رسمی سلام بھی کیا۔ اس پر بھی وہ خوش ہو گیا۔ اور اک عجیب فخر سے اس کی گردن اونچی ہو گئی۔ سامنے ہی نگر پالیکا کا دفتر تھا۔ جس کی عمارت کے اوپر ہندی اور اردو میں نگر پالیکا لکھا ہوا تھا۔ جیسے جمہوریت ہو یا نہ ہو، جگہوں کے ناموں میں ضرور جمہوریت ہونی چاہئے۔

نگر پالیکا کی لان میں یوکلپٹس کا پیڑ اسی طرح کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ نگر پالیکا کے اندر داخل ہونے پر احاطے میں چیئرمین کی جیپ کھڑی دیکھ کر اسے اطمینان ہوا۔ یوکلپٹس کے نیچے پانچ چھ جھاڑو لئے والی عورتیں اور مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ اور پان کی پیک آس پاس گندگی کر رہے تھے۔ شاید یوکلپٹس غلط لگ گیا تھا یا غلط لوگ یہاں چلے آئے تھے۔ کوئی حسین جوڑا اس کے نیچے نظر آتا۔ یوکلپٹس اپنے وجود کو رو رہا تھا۔

یوکلپٹس کے علاوہ یہاں ہریالی کے نام پر کچھ نہ تھا۔ کیاریوں کی مٹیاں کب کی سوکھی پڑی۔ کس کو فرصت تھی جو ان میں کوئی پیڑ پودا لگاتا۔ پودوں کی جگہ چیئرمین کی جیپ دندناتی ہوئی آکر کھڑی ہو جاتی جس کے سامنے چیئرمین کے نام کا پلیٹ لگا۔ کبھی کبھی کسی افسر کی جیپ آدھمکتی۔ اور کچھ دیر کے آس پاس کے ماحول میں سناٹا چھا جاتا۔ جہاں

ردی پیتے ادھر ادھر بھاگتے نظر آتے ۔ اور دفتر کا سارا
ملہ متحرک ہو اٹھتا ۔ گیٹ سے باہر دور کھڑے لوگ
ندازہ لگاتے کہ آج کچھ ہونے والا ہے ۔ لیکن ہوتا ہواتا
پہ بھی نہ تھا ۔ صرف کچھ دیر چائے پان کا دور چلتا ،
ہقہے لگتے اور بس ۔۔! ان قہقہوں سے بر آمدے میں
ھڑے اپنے کاموں سے آئے لوگوں کا دم گھٹنے لگتا
یادہ دیر ہونے پر وہ رہ رہ کر اپنی گھڑیاں دیکھتے اور کسی
منفی جذبہ کے تحت ناگفتابہ الفاظ استعمال کرتے جن میں
ن بہن کو ہاتھی گھوڑا اور گدھوں سے منسوب کر دیا
یاتا ۔ اس پر بھی ان کا کام نہ ہوتا ۔ اس لئے کہ ان
ے کاموں میں کوئی افسر حائل ہو گیا ہوتا تھا اور دفتر
ے آدمی صرف اسی کے دُم کے پیچھے لگے رہتے تھے ۔

چیئرمین کے کمرے سے ملحق ایک پرائیویٹ کمرہ
تھا جس کے دروازے پر ہرے رنگ کا پردا لٹکا رہتا
تھا ۔ چیئرمین اور افسر کے درمیان ساری پرائیویٹ گفتگو
سی کمرے میں ہوتی ۔ جب تک ممبر اپنی کرسیوں پر
بیٹھے اونگھتے رہتے ۔

لوگ یوکلپٹس کے نیچے کھڑے کھڑے بور ہو رہے
تھے ۔ اس لئے وہ نگر پالیکا کے برآمدے میں آ گئے تھے جہاں
لوگ چیئرمین کے کمرہ میں جانے کے لئے حسب معمول اپنی باری
کا انتظار کر رہے تھے ۔ کچھ لوگ کھڑکیوں میں سے تاک
جھانک کر رہے تھے جن میں سے کلرک اپنی کرسیوں پر
بیٹھے خوش گپوں میں مصروف تھے ۔ وہ یا تو بیکار تھے یا
کام زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کا دل کام میں نہیں لگ رہا
تھا ۔ چیئرمین کے دروازہ کے پاس جو لوگ اندر جانے کی
کوشش کر رہے تھے ۔ انہیں ادھیڑ عمر کا چپراسی خاکی

قمیض اور پاجامہ پہنے اندر جانے سے منع کر رہا تھا ۔ وہ
اندر جانے کے لئے آگے بڑھا جب ہی اس نے روک دیا

" ابھی اندر لوگ ہیں ؟"

" کون لوگ ؟"

" بڑے بڑے نیتا ہیں "

ساری دنیا کے چپراسی ایک ہی جیسے ہوتے ہیں جو
ہر جگہ لوگوں کو اندر جانے سے منع کرتے ہیں ۔ اس نے کاغذ
کے ایک پرزے پر اپنا نام لکھ کر چپراسی کو تھما دیا جسے لے کر
وہ اندر چلا گیا ۔ کچھ ہی دیر بعد چیئرمین نے اسے اندر بلا لیا ۔ کمرے
میں دونوں طرف کرسیاں لگی ہوئی تھیں ۔ جن پر ممبر بیٹھے ہوئے
تھے ۔ سامنے چیئرمین کی بڑی سی میز تھی جس کے دونوں طرف
پلاسٹک کے پھولوں کے گلدان رکھے ہوئے تھے ۔ ان کی
مصنوعی خوشبو ہی سے لوگوں کے سام معطر ہو رہے تھے ۔
میز پر ایک طرف کالے رنگ کا ٹیلی فون بھی تھا ۔ جو بہت
تھک جانے کی وجہ سے اس وقت آرام کر رہا تھا ۔ جب
ہی کریم ملکی اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا ۔

" آؤ یار ! بیٹھو !"

" شکریہ ! میں کھڑا ہی ٹھیک ہوں "

پھر اس کی نگاہیں چیئرمین کے چہرہ پر جم گئیں جس
کے گندمی رنگ پر سرخی آ گئی تھی ۔ رنگ کھلتا ہوا ہو تو
سفید کھادی کا کرتا اور پاجامہ لوگوں کو اور بھی اپنی طرف
متوجہ کرتا ہے ۔ وہ اپنے اسی لباس سے نمایاں نظر
آ رہے تھے ۔ سر کی بناوٹ گول نہ ہو کر چہرے کی طرح کچھ لمبی
تھی ۔ جس پر کھدر کی سفید ٹوپی کسی لنگا کبوتر کی طرح نظر
آ رہی تھی ۔ عمر کوئی چالیس کے پیٹے میں تھی ۔ اس وقت وہ موڈ
میں تھے ۔ جس سے بات کرتے وقت چہرے پر ہنسی اور مسکراہٹ

آجانا قدرتی بات تھی۔

"کہیے کیسے آنا ہوا؟"

اس نے ان کے سامنے کاغذ پر لکھی ہوئی درخواست رکھ دی۔ چیئرمین نے درخواست پڑھنے کے بعد اسے میز پر پیپر ویٹ سے دبا دیا۔

"ذرا انجینئر صاحب کو بلاؤ۔" انہوں نے چپراسی کی طرف دیکھا جو دروازے پر کھڑا کسی حکم کا منتظر تھا۔

کمرے میں کچھ دیر کے لئے سکوت چھا گیا جسے مدھو سونکر نے توڑا۔

"چیئرمین صاحب! جب لوگ خود ہی آجائیں گے تو کیا رہ جائے گا۔ عوام کے رہنما کی حیثیت سے آپ لوگوں کو خود جا کر دیکھنا چاہئے۔ کہاں کیا ہونا ہے اور کہاں کیا نہیں ہو رہا ہے۔"

"ہم اخبار کے لوگوں کو تو کچھ کرنا نہیں ہے سوائے جھوٹی سچی خبریں چھاپنے کے۔ یہاں تو صبح ہوتے ہی دروازے پر پچاسوں جوتے نظر آتے ہیں۔"

اس بات پر کچھ لوگ مسکرائے۔ لیکن زیادہ تر لوگوں نے کھل کر اپنے پھیپھڑوں کو صاف کیا جس سے ان کے اندر کا خون ان کے چہروں پر نظر آنے لگا۔

کچھ ہی دیر بعد سفید بش شرٹ، سفید پتلون اور کرکٹ کے کھلاڑیوں جیسی کیپ لگائے ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا جس سے چیئرمین مخاطب ہوئے۔

"انجینئر صاحب! دیکھئے یہ درخواست ہے۔ جنک پوری میں ابھی تک سڑک نہیں بنی۔"

"لیکن سر! آپ نے تو کہا تھا، بجٹ پاس ہونے کے بعد اس پر کام شروع ہوگا۔" چیئرمین ٹوپی اتار کر سر کھجانے لگا۔ شاید اس میں کوئی جواب آگیا تھا۔ چیئرمین نے درخواست اپنی فائل میں رکھ لی۔

"اب آپ جائیں۔"

"اور بجٹ کا انتظار کریں۔" کسی نے جملہ مکمل کیا۔

"کیوں چیئرمین صاحب یہی مطلب ہے نا؟"

ایک بار پھر کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

بورڈ کی ایک بار نہیں، کئی بار تشکیل ہوئی تھی۔

کتنے چیئرمین آئے اور گئے۔ لیکن جنک پوری تک وہ کچی سڑک جیسے پہلے تھی اسی طرح اب بھی نظر آرہی تھی۔ برسات کے دنوں میں تھوڑی سی بارش ہونے پر کیچڑ بھرے گڑھے کسی بدنما دھبوں کی طرح نظر آتے۔ اور تو اور۔ جب آسمان زیادہ مہربان ہوتا، وہ سڑک سویز نہر میں تبدیل ہو جاتی اور لوگ ادھر ادھر کشتیوں کی طرف دیکھنے لگتے۔ جو انہیں کہیں نظر بھی نہ آتیں۔ برسات کا پانی سڑک سے ہوتا مکانوں میں داخل ہو جاتا۔ پھر ان کے سورما جو لاکھوں کی تعداد میں ان کی کوکھ سے پیدا ہو جاتے اور دن میں بھی انسانوں کو کاٹ لیتے جس سے ملیریا پھیل جاتا۔ اور لوگ بیمار ہو کر صحت یاب ہونے کے لئے انتظار کرتے رہتے۔

وہ باہر آنے کے لئے دروازہ کے پاس آیا تو اس وقت بھی لوگ اندر جانے کے لئے وہاں کھڑے تھے۔ اور چپراسی انہیں اندر جانے سے منع کر رہا تھا۔ جس کے باعث اس کی لوگوں سے نوک جھونک ہو رہی تھی۔ اسے دروازہ پر کھڑے لوگوں پر رحم آیا جو کسی دریوزہ گر کی طرح اندر جانے کی بھیک مانگ رہے تھے۔ جو انہیں مل بھی نہیں رہی تھی۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ جب ہی اس کی

[illegible] تھی

[illegible] ہوتا [illegible]

[illegible] خیال کرتے ہوئے [illegible]

[illegible] یہاں تو ...

[illegible] اپنے ملبے پائیدان کا خیال آگیا جو اس کے

[illegible] بے ترتیب جملے بن رہے تھے۔

[illegible] ہے، تو آپ شام تک کو آجائیے گا۔"

اس کی نگاہیں پھر [illegible] پر ٹھہر گئی جو سامنے

[illegible] تھا۔ اس پر چڑھتے ہوئے

[illegible] پڑ رہی تھی، جس نے اس کے صاف [illegible]

[illegible] جسم سے کوئی روشنی پھوٹ رہی تھی۔

[illegible] مکانوں، ایک قبرستان۔ کچھ خالی

[illegible] اور [illegible] کی ایک چھوٹی سی بستی سے گزرنے

[illegible] آگیا جہاں کچھ لوگ بجلی کے کھمبے کے

[illegible] ایک گندی نالی کے پاس کھڑے

[illegible] تھے۔ اور ان کا دھواں

[illegible] صاف کر رہا

[illegible] ایک [illegible] جنگل

[illegible]

پھر وہ سیدھا [illegible]

[illegible] اللہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

دیکھے [illegible] دوسرے [illegible]

[illegible]

نالیاں تھیں وہاں [illegible]

ہونے کے باعث [illegible]

صفائی نہیں ہو رہی تھی [illegible]

نہیں [illegible]

کے باہر انہیں [illegible]

ہو گئے تھے۔ [illegible]

کرنے۔ اور ان کے [illegible]

[illegible]

دور ہی سے [illegible]

اور صرف [illegible]

جا رہی [illegible]

[illegible]

[illegible] چائے اور پان کی دوکان پر لوگوں کا جمگھٹا لگا [illegible] لوگ چائے کی چسکی لیتے اور دور ہی سے نگر پالیکا دفتر کا نظارہ بھی کرتے۔ کون آرہا ہے، کون جا رہا [illegible] سب یہیں سے نظر آجاتا تھا۔ پھر آنے والوں سے [illegible] کی ساری رپورٹ بھی مل جاتی تھی۔

موجودہ چیرمین سے پہلے جو لوگ بورڈ کی کرسی پر [illegible] ہوئے تھے۔ ان میں اکثر نے اپنی ہلتی ہوئی جڑوں کو [illegible] کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن چیرمین [illegible] [illegible] تھے کہ ایک تو انکی عمر زیادہ نہیں تھی۔ جس کے [illegible] ان کی دنیاوی آلودگی میں ملوث ہونے کا اندیشہ [illegible] تھا۔ دوسرے انہیں عوام کی خدمت کا موقع نہیں ملا [illegible] یہی وجہ تھی۔ نئے چیرمین کے حلف لینے والے دن [illegible] نے پورب کی طرف آسمان کے افق پر کوئی بڑا سا سُرخ [illegible] ابھرتا ہوا دیکھا تھا جس کی روشنی دور دور تک پھیل [illegible] تھی۔

اس دن بجٹ پاس کرنے کے لئے بورڈ کی میٹنگ [illegible] والی تھی۔ جس سے اس کے اندر وٹامن بی اپنا کام [illegible] لگا۔ وہ ٹھیک گیارہ بجے نگر پالیکا پہنچ گیا۔ ہوائیں [illegible] چل رہی تھیں جس کے باعث یوکلپٹس کی پتیاں ہل [illegible] تھیں۔ نگر پالیکا کے گیٹ کے پاس چیرمین کی جیپ [illegible] اندر میں چار آدمی بیٹھے تھے۔ اخبار نویس این۔ کے [illegible] سنگھ، مدھو سونکر، آغا غل اور یونس خاں اپنی فائلیں [illegible] جیپ کے پاس کھڑے تھے۔ جب ہی سب لوگ چیرمین [illegible] کے ساتھ ایک بڑے ہال میں چلے گئے۔ جس میں تین طرف کرسیاں اور میزیں لگی ہوئی تھیں۔ شمال کی طرف ایک بڑی [illegible] سی میز چیرمین کی تھی۔ جہاں وہ ایک اونچی سی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ادھر پریس گیلری کے پاس گہما گہمی بڑھ گئی۔

"پہلے آپ"

"نہیں پہلے آپ"

وہی حیض بیض۔ پہلے آغا گل، اس کے بعد مدھو سونکر، پھر این۔ کے سنگھ۔ کرسی پر بیٹھے۔ یونس خاں کو کرسی نہیں ملی۔ اس لئے وہ پیچھے پڑی بنچ ہی پر بیٹھ گیا۔ جب ہی کسی ممبر نے سگریٹ سلگا لیا۔ جس کا دھواں لوگوں کی آنکھوں میں گھسنے لگا۔ اس پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا۔

"یہ اپنا ڈرائنگ روم نہیں ہے، سری مان جی!"

وہ ممبر جو آرام سے اپنے پیروں کو پھیلائے سگریٹ پی رہا تھا اٹھ کر باہر، برآمدے میں چلا گیا۔ کچھ ممبر باتیں کرتے ہوئے زور زور سے چلا رہے تھے جس سے میٹنگ ہال مچھلی بازار میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اسی وقت ایک ممبر چیرمین کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور ان سے کچھ کہنے لگا۔

"ذرا زور سے کہئے۔ چیرمین نے اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"لیکن اتنا زور سے بھی نہیں کہ چھت اڑ جائے؟"

قہ۔۔۔قہ۔۔۔قہ۔۔۔۔۔

اک کنارے بیٹھے کسی ممبر نے میز تھپتھپایا۔

"آپ لوگ صرف گپ شپ ہی کریں گے یا کچھ کام کی باتیں بھی ہوں گی؟"

اس پر پورے ہال میں سکوت چھا گیا

چپراسی نے حاضری رجسٹر ممبروں کے سامنے رکھ دیا۔ "پہلے آپ لوگ [illegible]

اس پر مخالف ممبر بھڑک اٹھے ۔

" اصل حاضری رجسٹر کہاں ہے ؟ فرضی رجسٹر پر ہم لوگ دستخط نہیں کریں گے ۔"

" وہ تو ای ۔ او ۔ صاحب کے پاس ہے ۔ اور وہ کئی ہفتوں سے لاپتہ ہیں ۔"

" وہ اپنی دوسری بیوی کے پاس لکھنؤ گئے ہوں گے ۔ ایک بار پھر ہال قہقہوں سے گونج اٹھا ۔

" پھر ان کو آنے دیجئے ۔"

" ہم لوگ کب تک ان کا انتظار کریں گے ۔ عوام کے مسائل کا معاملہ ہے ۔"

" تم بیٹھ جاؤ ۔ ٹانگ مت اڑاؤ ۔" کوئی سکیا پہلوان کھڑا ہو گیا ۔

پورا ہال شور شرابہ سے بھر گیا ۔ اور لوگ ایک دوسرے کی ماں بہن کی بوٹیوں تک پہنچ گئے ۔ پھر ہاتھا پائی جسے دیکھنے کے لئے باہر کھڑے لوگ کھڑکیوں میں سے تاک جھانک کرنے لگے ۔

جب ہی چیرمین کی میز پر رکھی گھنٹی بجی ۔ ٹرن ... ٹرن ... ٹرن

ہال میں پھر کوئی مردہ لیٹ گیا ۔ اور لوگ ایک دوسرے کی طرف بیوقوفوں کی طرح دیکھنے لگے ۔ وہ کہنے کے لئے کچھ سوچتے ۔ پھر چپ ہو جاتے ۔ جب ہی ایک ممبر نے ہمت کی ۔

" آخر ہم لوگ یہاں کب تک بیٹھے رہیں گے ۔ یہاں کوئی الف لیلیٰ کی داستان سننے تو آئے نہیں ہیں ۔"

" لیکن سوال اصل رجسٹر کا ہے ۔"

آخر بورڈ کی میٹنگ بغیر کسی فیصلہ کے ختم ہو گئی ۔

وہ نگر پالیکا کے احاطے سے باہر آ گیا ۔ اب اس کا دماغ خالی تھا ۔ کسی نے انگلیاں ڈال کر اس کا سارا خون نچوڑ لیا تھا ۔ جس سے اس کے کل پرزے اپنا کام کرنا چھوڑ دیئے تھے ۔ اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا ۔ کہیں وہ بھی تو غائب نہیں ہے ؟ وہ اپنے دل و دماغ کو واپس لانے کے لئے سامنے کی دوا کی دکان کی طرف مڑ گیا ——

دوپہر کے بعد سورج اپنے مرکز سے الگ ہو گیا تھا اور سڑک دھوپ میں اکیلی ننگی لیٹی تھی ۔ کوئی رکشا ، سائیکل یا اسکوٹر اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا ۔ صرف اکا دکا آدمی کہیں کہیں نظر آ رہے تھے ۔ جو ماحول کی اداسی دور کرنے میں معاون بھی نہیں ہو رہے تھے ۔ اس نے کرتے کی دائیں جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے رومال نکال کر اس پانی کو جذب کرنے لگا جو اندر کی گرمی سے اس کے چہرہ پر آ کر پھیل گیا تھا ۔

سامنے وہ عمارت بھی تھی جسے چیرمین اپنے سالے کے نام پر تعمیر کرا رہے تھے ۔ عمارت شاندار تھی اور اسے مکمل کرنے میں راجگیر اور مزدور مصروف تھے ۔ جب وہ چیرمین نہیں تھے ، ان کے پاس وہی کھٹارا سائیکل تھی جس پر وہ کھڑکھڑ کرتے رہتے تھے ۔ لیکن اب ان کے پاس ایمبیسڈر کار کے علاوہ وہ سب کچھ تھا جو وہ چاہتے تھے ۔

رات وہ جب اپنے بستر پر گیا ، اس وقت بھی اس کے حواس پر سڑک سوار تھی اور وہ سوتے میں بھی ننگی سڑک پر چل رہا تھا ۔ جب ہی کوئی پاگل ہاتھی آ گیا اور اس کی آنکھیں کھل گئیں ۔ اور وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا ۔ لیکن اس کے اندر لگا ہوا پیپل اپنے اسی آن بان کے

ساتھ کھڑا تھا۔ جس میں پہلے سے بھی زیادہ شاخیں نکل
آئی تھیں جو جاڑا، گرمی، برسات تینوں موسموں کے
حملوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھیں۔ پھر کب نیند
آئی اور کب وہ سویا۔ اس کا اسے پتہ بھی نہ چلا۔ بیچ
میں اس نے صرف ایکبار بڑبڑایا تھا۔

سڑک..... سڑک..... سڑک

بچے تو خیر اسی طرح بے سدھ سوتے رہے، لیکن
بیوی چونک کر جاگ گئی۔ اور اس کی طرف پریشان
کن نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ "کیا ہوا ــــ؟"

"کچھ نہیں۔"

"ارے ابھی تم ــــ"

"سو جاؤ۔ بکواس مت کرو۔"

ای۔ او۔ کے انتظار میں ایک ایک لمحہ اس کے
ذہن پر بھاری ہو رہا تھا۔ جانے وہ کہاں مر کھپ گیا تھا
کوئی ایک ہفتہ بعد ای۔ او کے آنے کی خبر نے کسی ٹھنڈی
ہوا کے جھونکے کا کام کیا۔ اس کی نگاہوں میں ای۔ او
کے ساتھ وہ رجسٹر بھی تھا جسے وہ اپنے ساتھ لے کر
آنے والے تھے۔ جب ہی پیپل کی جڑیں واسو دیو پر لگٹ
ہو گئیں۔ اٹھاؤ گانڈیو، دیکھتے کیا ہو ــــ اس نے
گانڈیو اٹھا لیا۔

یہ تروینی کے سنگم پر جوگ اشنان کا دن تھا۔
جہاں گنگا جمنا اور سرسوتی ایک ساتھ ملتی ہیں۔ اس
دن اس میں کوئی نہالے تو اس کے سب روگ دور ہو
جاتے ہیں۔ اور اس کے سارے پاپ کٹ جاتے ہیں۔
یہ دن بارہ سال کے انتظار کے بعد آتا ہے۔ جب
سورج کے گرد گھومتے ہوئے نو سیارے ایک قطار
میں آجاتے ہیں اور طلوع ہوتے ہوئے سورج کی پہلی
کرن سنگم پر پڑتی ہے۔

کمرہ کشادہ تھا۔ اور اس کے دونوں طرف
قیمتی صوفہ سیٹ لگے تھے۔ بیچ میں مائکہ کی ایک
چھوٹی میز تھی جس پر فامور کے ٹرے میں چائے کے
سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ کمرے کے چھت تو سفید
ہی تھی۔ لیکن دیواروں کو ہلکے پیلے رنگ میں آئل پینٹ
کیا گیا تھا۔ جس پر ہاتھ کے بنائے ہوئے کئی پورٹریٹ
آویزاں تھے۔ اسے محسوس ہوا، جیسے وہ یکا یک
گوارنیکا میں آگیا ہو۔

چیئرمین مائکہ کی ایک مسہری پر نیم دراز
تھے۔ لیکن اسے دیکھتے ہی وہ دیواروں پر آویزاں
پورٹریٹ کی طرف دیکھنے لگے جس میں ان کے مطلب
کی کوئی چیز بھی نہ تھی۔ صبح سے بیسیوں تو آئے ہوں
گے۔ جنہیں وہ جواب دیتے تھک چکے تھے ــــ اور
اب یہ ــــ

ای۔ او۔ صاحب ان کے پاس ہی ایک صوفہ
میں دھنسے پڑے تھے اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے
کر اس کے دھوؤں کے مرغولے بنا رہے تھے۔ جس میں ان
کا گورا لیکن ادھیڑ چہرہ اور سر کے سفید بالو اور بھی دھندلے
نظر آ رہے تھے۔ وہ ہلکے سلیٹی رنگ کی بوشرٹ اور پتلون
پہنے ہوئے تھے۔ اور اس عمر میں بھی اپنے کلین شیو کے
ساتھ جوان بننے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اب تو ای۔ او۔ صاحب آ ہی گئے ہیں۔ اور ان
کے ساتھ حاضری کا وہ رجسٹر بھی ہوگا۔" اس نے خود ہی
بات شروع کی۔

"ہوں۔"

یہ ای۔ او صاحب کی آواز تھی۔ جو کوئی معنی رکھتی تھی۔ وہ بات چیت کے دوران اکثر "ہوں" کہنے کے عادی تھے۔ جس سے ان کی نخوت چھلکتی تھی۔ اور وہ "ہوں" ایسے ہی نہیں کہتے تھے۔ اس کی وجہ تھی۔ ان بدعنوانیوں اور غلط کاریوں کے خلاف جانے کئی تحریری شکائتیں حکام کے پاس جا چکی تھیں۔ اس کے باوجود وہ نگر پالیکا پر چھائے ہوئے تھے۔ خود کھاؤ اور دوسروں کو بھی کھلاؤ کے باعث وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔

جب ہی چیئرمین کی نگاہیں، ان کے مفہوم سے عاری چہرہ پر مرکوز ہو گئیں۔

"ای۔ او صاحب تو آ گئے ہیں، لیکن بجٹ میں روپئے نہیں ہیں۔"

اب سے پہلے جو خون اس کے جسم میں پڑا کہیں آرام کر رہا تھا۔ وہ یکایک اس کے شریانوں میں خود آیا۔ اور وہ چیئرمین کو ایسی نگاہیں سے دیکھنے لگا، جس میں یقین اور اعتبار اضافی حیثیت بن کر رہ گئے تھے۔

اصل میں اس سے غلطی یہ ہوگی کہ اس کا دل چیئرمین کے معصوم اور بھولے بھالے چہرہ پر آ گیا تھا۔ اور اس نے گلابی کاغذ پر ہرے رنگ کی سیاہی سے انہیں محبت بھرا خط لکھ دیا — ایک بات اور — ان کی موسیقی پہلوں کے مقابلہ میں جدید تھی جس میں سر تال کا کوئی جال نہیں تھا۔ اس میں صرف بے ہنگم آوازوں کا شور رہتا جس کے باعث بھیڑ ان کی طرف اپنے آپ متوجہ ہو گئی اور وہ ان کے ساتھ سنگت کے لئے طبلہ لے کر بیٹھ گیا — اسے محسوس ہوا، وہ ابتک اینٹ کی کسی

بہت پرانی دیوار کے سامنے بولتا رہا ہے — وہ وہاں سے ہٹے گا نہیں تو دیوار اس کے اوپر گر جائے گی۔

شہرِ خیال

● آپ کے اداریوں کے متعلق ایک بات تحیر آفریں یہ ہے کہ آپ ایک مدت سے ادب کا ایک نیا زاویہ پیش کرکے اس پر ناصحانہ دلائل کیساتھ اپنا مقصد نگاہ پیش کرتے ہیں۔ آپ کا حسنِ تلاش فنکاران قلم کے لئے بہت کارآمد ہوتا ہے، نیز نابالغ نگاہ والوں کی راہ کشائی تو کرتا ہی ہے بالغ مزاج لوگوں کے لئے بھی کبھی کبھی چونکا دینے والا ہوتا ہے۔

——— فیروز نظامی ، لکھنؤ

● آپ کا خط ملا۔

میں بہت بیمار ہوگیا تھا۔ اب اچھا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ اپنی روزی روٹی حاصل کرکے بائیں بازو کی سیاست کرنا کس قدر مشکل ہے۔ ہر ہر قدم پر بائیں بازو کی سیاست کرنے والوں کے راستوں پر روڑے اٹکائے جارہے ہیں۔ ان کا قتل کیا جارہا ہے۔ خود آپ وکالت کرکے کتنی مشکلوں سے "سہیل" کو اپنا خونِ جگر پلا کر اس کی آبیاری کر رہے ہیں۔ آپ کے اس قربانی کی قیمت کون چکا سکتا ہے۔ آپ کے والد محترم ادریس سنبھاروی نے کتنی گرانقدر خدمات خاموشی کے ساتھ انجام دی ہیں۔ آپ اپنے والد مرحوم کی شاندار روایت کو نہ صرف زندہ رکھے ہوئے ہیں بلکہ جو کما کر لاتے ہیں اس میں کسی طرح اپنی اور بال بچوں کی پرورش کرکے جو بے حد ضروری ہے، سہیل کے ذریعہ آگے کی طرف بڑھا رہے ہیں۔ "سہیل" میں "نمود" کے عنوان سے قیمتی اداریئے لکھ کر ادیبوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کر رہے ہیں —— "جدیدیت" کے تاریک دور میں "سہیل" کے ذریعہ آپ نے بڑی جوانمردی وپامردی اور دور اندیشی و پختہ سیاسی، ادبی و تاریخی شعور کے ساتھ ترقی پسندی کو اب تک DEFFEND کیا ہے۔ کیا یہ معمولی بات ہے؟ اس کی قیمت کون چکائے گا؟

موجودہ بہار میں سید علیم اللہ حالی کا نام بھی معتبر ہے وفا ملک پوری نے بھی اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ ان کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن جرایل۔ این متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور اس کے بعد ایم۔ پی اور ایم۔ پی سے وزیر صحت ہوئے وہ اردو میں کتابیں لکھ کر ہوئے۔ میں کتنے نام گنواؤں؟ آخر یہ اردو والے اتنے ناسمجھ اور بے حس و بے عمل کیوں ہیں؟

ان کو سمجھانے کے لئے آسمان سے فرشتوں کی فوج
ے گی؟ کیا ان کے دردناک مسائل کو دوسرے حل کریں
؟ دوسروں کا منہ وہ کب تک تکتے رہیں گے؟ میں آخر
ں اقبال، ان کے استاد داغ دہلوی اور شاد عظیم آبادی
یک ایک شعر لکھ کر اپنی داستان جو بہت پرسوز اور
زردہ ہے ختم کر رہا ہوں۔ پہلے داغ دہلوی کا شعر ان کے
مد اقبال کا اور تب شاد عظیم آبادی کا۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(داغ)

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے
(اقبال)

یہ بزم مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
(شاد عظیم آبادی)

—— اویس احمد دوراں، لکھنؤ

● ماہنامہ سہیل شمارہ ۵ موصول ہوا۔ قبل کے
مارے غالباً ڈاک کے ڈاکوؤں کی نذر ہو گئے جن
متعلق کسی شاعر نے یوں کہا ہے۔

"بیٹھ کے پہلو میں جو دل کو چرائے کوئی
ایسی چوری کا پتہ خاک لگائے کوئی

سابقہ شماروں کی طرح اس مرتبہ بھی آپ کا
اریہ بعنوان "نمود" قابل توجہ اور فکر انگیز ہے۔ آپ
بہار کے اردو داں ادیبوں اور دانشوروں کی سرد
[illegible] احساس

دلاتے ہوئے اردو کی زبوں حالی اور بے حسی کو مدنظر
رکھتے ہوئے اسے بہار کا المیہ قرار دیا ہے۔ اردو زبان
کے ساتھ اس ملک میں بہت کچھ برا بھلا ہوا ہے اور ہو
رہا ہے۔ صرف ایک صوبہ کا اسے المیہ قرار نہ دیں۔ تفصیل
میں جانے کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی موجودہ صورتحال میں
خصوصاً ہمارے اردو دانشوروں نے اس سے مایوسی
کا اظہار کیا ہے۔ اور ہمت چھوڑ دی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اردو اجارہ داری کی شکار
ہو کر رہ گئی ہے۔ واقعی آپ کا اداریہ ذہن کو پوری طرح
سے جھنجھوڑتا ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ اردو سے تعلق
رکھنے والے اداروں، تنظیموں اور اکاڈمیوں کی طرف سے
ان اہم اردو کے ستونوں کے لئے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ
نہیں کرتے ہیں اور تماشائی بنے رہتے ہیں۔ دوسرے
ہمارے قلم کار (اپنی تخلیقات کے علاوہ) اپنے ہم عصروں
کو بھی بغیر کسی PRETUDICE کے پڑھنے کی عادت
نہیں ڈالتے ہیں اور قصداً اجنبی پن کا مظاہرہ کرتے ہیں!

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

—— سلطان احمد ساحل

سہیل نمبر۔ اور خلوص نامہ ـــ دو نوازشیں
آپ نے ایک ساتھ کیں۔ بلا شک خدمت زبان و
ادب کی یہ صورتیں بھی زریں حروف میں رقم کرنے کے
لائق ہیں۔

منظر صاحب! سرورق تا ورق آخر، ہر نکتہ،
ہر منظر فکر انگیز و دیدہ زیب ہے۔ بطور خاص
'نمو' کے ذریعہ تجربہ اور تخلیق کے تعلق سے
جس طرح آپ نے حقیقت کو زبان عطا کی ہے
اس سے یقیناً تخلیق ادب کی معیار سازی میں
اضافہ ہوگا۔

الله کرے زور قلم اور زیادہ

پروفیسر قمر رئیس کا مقالہ" ترقی پسندی۔
ـــ راستے اور منزلیں" ۔ "Basic History
- of Progressive Writers Asso-
ciation ۔ سے آگاہ کرنے کے پہلو بہ پہلو اس کے
عہد بہ عہد (Movement) سے لے کر بیسویں
صدی کی آخری دہائی تک کا عمیق جائزہ پیش کرتا ہے۔

جناب شور غازیپوری کا "رباب آب" یعنی سفرنامہ
'انڈمان و نکوبار' بے حد معلوماتی اور کامیاب ہے۔ یہ
کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ موصوف نے سفرنامے کے روپ
میں خوبصورت چترکاری کی ہے!

جناب مظہر امام کے خیالات کا سلسلہ اچھا
ہے۔

جناب عبدالقیوم ابدالی کا غزلیات پر مشتمل
تجزیاتی و تنقیدی مقالہ" ایک خط خورشید اکبر کے
نام" صاحب مقالہ کی تنقیدی بصیرت و شعوری جانچ
پرکھ کے بہتر شعور کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتا ہے

پیش نظر شمارے کا اکلوتا افسانہ "تانک"
موجودہ معاشرے کی سچائی کو بے حد کامیابی کے ساتھ
بیان کرتا ہے۔

منظوم حصے میں "عہد عکاس غزلیں" کے
ساتھ ساتھ دیگر غزلیات بھی معیاری ہیں۔ بالخصوص
پروفیسر عنوان چشتی کی غزل "رسیلی ہوتی ہے، من
بسیا اور من بھاون ہوتی ہے۔ ساتھ ہی زبان و بیان
اور لب و لہجہ کے اعتبار سے بھی خالص ہندوستانی اور
اس دھرتی کی سوندھی سگندھ لگتی ہے۔

ـــ نسیم اختر، بنارس

Regd, P. & T. G. Y. (H O.) -04/97

R. N. I, Regd, No. 3

The SOHAIL Monthly River Side Road, Gaya - 823001

16 years of Publication

Phone :



